۱۹۴۳ء

اعمال نامہ

یعنی

سر سیّد رضا علی کے، ٹی، سی، بی، ای - ایم، ایل، اے

کے

سوانح حیات خود موصوف کے قلم سے

حیدرآباد بک ڈپو، حیدرآباد دکن

[illegible]

طبع اوّل

دسمبر ۱۹۴۳ء

قیمت مجلّد آٹھ روپے

(آغا شرخوش حسن لباس نے دیال پرنٹنگ پریس دِلّی میں چھپوا کر ہندوستانی پبلیشرز دِلّی سے شائع کیا)

مولف کي آدھی تصوير ۱۹۴۰ء

احسان مند بیٹے کی طرف سے عقیدت کے دو پھول ماں کی قبر پر

رضا علی

اعمال نامہ کے چند فقرے

۱ "ماں کو اولاد سے جو محبت ہوتی ہے وہ دُنیا میں آپ ہی اپنی نظیر ہے۔" صفحہ ۱۷

۲ "اگر انسان اوس تعلق کو تھوڑا بہت سمجھنا چاہے جو خالق کو اپنی مخلوق کے ساتھ ہے تو دُنیا میں اوس کی سب سے بڑی سب سے قوی اور سب سے اچھی مثال ماں کی مامتا ہے۔" صفحہ ۱۷

۳ "والدہ صاحبہ کو خدا نے عجیب و غریب دل و دماغ دیا تھا، اون کا اس درجہ وقار تھا کہ دادا صاحب کے انتقال کے بعد اکثر معاملات میں بزرگ خاندان وہ سمجھی جاتی تھیں۔" صفحہ ۲۰۵

۴ "ماں کو اولاد کے ساتھ جو محبت ہوتی ہے اوس میں حضرت رب العلمین کی وہ شان جلوہ گر ہے جسے اندھا بھی دیکھ سکتا ہے۔" صفحہ ۳۹۰

۵ "بعض آدمیوں کی زندگی کی تشکیل میں عورت کا بڑا حصہ ہوتا ہے، میرا بھی شمار اونہیں میں ہے، والدہ صاحبہ کے احسانات کا تھوڑا بہت تذکرہ کر چکا ہوں۔" صفحہ ۲۰۵ -

فہرستِ تصاویر

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ

گیارھواں باب

حسن و محبت

بارھواں باب

اردو شاعری اور ادب

اردو کی ادبی حیثیت

مضمون	صفحہ

صحت نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۰	۳	شاہجہاں	اکبر
۱۱	۱۳	پچاس	پچاسی
۲۲	۳	چھٹے	پانچویں
۳۳	۱۱	کریا نادرہ کے ساتھ	کریا ناظرہ کا
۳۵	۱۰ و ۱۲	شیخ سید احمد	شیخ احمد
۳۵	۱۱	عالمگیر خان	جہانگیر خان
۳۹	۱۲	گلے خارے خمارے	گل خار خمار
۴۴	۲۰	ہیں	ہے
۷۲	۶	بیل کی	بیل
۹۹	۱۴	شرما	شروان
۱۰۴	۶	کامدانی	تن زیب
۱۴۱	۲	ہوجائے	ہوجائے گا
۱۵۳	۵	کیا تھا	کیا تھا مخالفوں نے
۱۶۹	۱۲	مقصد	قصد
۲۰۱	۶	بارے	بار
۲۴۰	۲	اوس	اوس وقت
۲۹۰	۱۶	دسمبر	جنوری
۳۰۷	۲۱	سی آئی ڈی	سی آئی اِی
۳۷۳	۸	کلیر	اجمیر
۳۷۸	۲۰	سنہ ۱۲۳۹ ہجری	سنہ ۱۲۳۶ ہجری
۴۱۵	۱۶	صفی	صفدر
۴۱۷	۱	ہوتا	آتا
۴۶۴	۶	اوران	ملزموں

نوٹ:۔ صفحہ ۵۱۱ پر سوویٹ روس اور چین کے تعلقات کے سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ موجودہ جنگ ابھی تک روس اور جاپان کے درمیان نہیں ہے ؛

دیباچہ

لُطف ہے کون سی کہانی میں
آپ بیتی کہوں کہ جگ بیتی
(محمد ہادی رسوا)

۱۔ میں نے یہ تہیہ کر کے قلم اُٹھایا تھا کہ واقعات کو اصلی صورت میں پیش کروں گا اور موجودہ فن تجدید شباب (Rejuvenation) کے ماہروں کی طرح یہ ہرگز جائز نہ رکھوں گا کہ آنکھیں ماتھے پر پہونچ جائیں، نیچے کا ہونٹ ٹھوڑی پر پڑا ہو یا دونوں کان گلے کا ہار ہو جائیں حقیقت نگاری بڑا مُشکل کام ہے بالخصوص جب انسان اپنی کہانی لکھنے خود بیٹھے۔ میری تمام تر کوشش یہ رہی ہے کہ انصاف سے کام لوں کسی تصویر کا رنگ پھیکا پڑنے نہ زیادہ گہرا ہونے پائے، انسان خود ہی بے ڈول ہو اور نک سک سے ٹھیک نہ ہو تو میرا قصور نہیں ہے۔ اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادلِ ناخواستہ مجھے ایسے واقعات بھی لکھنے پڑے جن کے ظاہر نہ کرنے سے میں اخفائے حق کے الزام کا مُلزم قرار پاتا۔ اپنی زندگی یا اپنے زمانہ کے واقعات لکھنے پر کوئی شخص مجبور نہیں ہے البتہ ہر شخص کو اپنی کہانی لکھتے وقت دو باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔ ایک یہ کہ سچے واقعات پورے طور سے بیان کر دئے جائیں اخفائے حق نہ کیا جائے نہ کوئی بات ادھوری چھوڑی جائے، دنیا میں وہ سچی بات بڑی مخدوش ہے جو آدھی ظاہر کی جائے اور آدھی چھپا ڈالی جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مشہور انگریزی مثل کو کہ خواہش تخیل کی ماں ہے اپنے اوپر صادق نہ ہونے دے اگر خواہش نے تخیل پر غلبہ حاصل کر لیا اور لکھنے والے نے واقعات کی صورت مسخ کرنی شروع کر دی تو آپ بیتی سچا نامۂ اعمال ہونے کے بجائے افسانہ یا ناول بن جائے گی۔ میرے نزدیک اپنے لکھے ہوئے سوانح حیات کی سب سے بڑی صفت یہ ہونی چاہیئے کہ اگر مرتبہ کراماً کاتبین بھی سامنے آکر بہ آواز بلند پڑھ لیں تو لکھنے والے کو آنکھ نیچی نہ کرنی پڑے۔ اسی مُناسبت سے میں نے اس کتاب کا نام **"اعمال نامہ"** رکھا ہے، اتنا فرق ضرور ہے کہ فرشتوں کا لکھا ہوا نامۂ اعمال دفتر کا دفتر ہوگا۔ ان اوراق کو اُس کا مختصر اور بہت مختصر چربہ سمجھئے یا مرقع کہئے۔

۲۔ ہر شخص کے بیان کی طرز اور اپنا مفہوم ادا کرنے کا طریقہ جُداگانہ ہوتا ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ انگلستان کے مُورّخوں اور سوانح نگاروں کی طرح واقعات سے خاطر خواہ نتیجہ پہلے نکال لیا جائے اور پھر واقعات کو توڑ مروڑ کر اس طرح پیش کیا جائے جس سے پڑھنے والوں کو یہ خیال پیدا ہو کہ مُورّخ کی بڑائے صائب اور خیالات صحیح ہیں انگریز مورخوں نے شہنشاہ عالمگیر کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اُس کا حال ساری دنیا پر روشن ہے۔ رائے سازی (پراپیگنڈا) نے تو یورپ کی ۱۹۱۴ء-۱۸ء کی جنگ عظیم کے زمانہ سے زور پکڑا ہے

مگر مغربی سوانح نگاری کی صدیوں سے یہ افسوسناک خصوصیت رہی ہے کہ اخباروں کے ایڈیٹروں کی طرح یورپ کے مورخ اور ادیب بھی یہ چاہتے ہیں کہ اُن کی تصانیف کے پڑھنے والے واقعات کو اُن کی نظر سے دیکھیں مسلمانوں میں تاریخ۔ تذکرے۔ سفرنامے۔ سوانح حیات اور دیگر حالات لکھنے کا رواج تھا بہت سے بادشاہوں نے بھی اپنے تزک لکھے ہیں اُن سب میں بڑی کمی یہ ہے کہ واقعات کا تو پتہ چلتا ہے مگر اُس دَور کے عام حالات مثلاً رسم و رواج۔ طرز معاشرت۔ اقتصادی نظام۔ اخلاق و عادات اور عوام کے خیالات و جذبات سے پڑھنے والے کو بہت کم آگاہی ہوتی ہے بلکہ عام حالت تو یہ ہے کہ یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ خود مُصنّف یا مؤلف کی رائے اُن اہم مسائل پر جن کا تذکرہ اُس نے کیا ہے کیا تھی۔ المختصر انگریز سوانح نگاروں کے یہاں رنگ آمیزی اس قدر گہری ہے کہ بسا اوقات زید کی تصویر اُس کی اصلی صورت سے میل نہیں کھاتی۔ ہمارے یہاں رنگ اس قدر پھیکا ہوتا ہے کہ انسان کے خال و خط تصویر میں نمایاں نہیں ہوتے میں نے دونوں باغوں کے کانٹے ہٹا کر پھول چننے کی کوشش کی ہے۔ چمن ہند کے پھول تو جانے پہچانے ہیں۔ خوشبو کا کیا کہنا۔ لیکن ہماری کھینچی ہوئی تصویروں کی طرح رنگ ذرا پھیکا ہے۔ گلزار انگلستان کے پھولوں کا رنگ بڑا شوخ اور دل فریب ہے جی یہی چاہتا ہے کہ دیکھا کیجیے مگر خوشبو نام کو نہیں۔ میرے گلدستہ میں دونوں قسم کے پھول ملیں گے۔ میں نے حقیقت نگاری کو ملحوظ رکھا ہے۔ مغربی ممالک میں سوانح حیات لکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ بیتی کے ساتھ ساتھ جگ بیتی بھی بیان کی جاتی ہے دنیا میں واقعات کا سلسلہ بسا اوقات ایسا مربوط ہوتا ہے کہ اپنی کہانی اُسی صورت میں پوری ہو سکتی ہے جب دوسروں کے حالات بھی درج کر دیے جائیں میں نے اسی طریقہ پر عمل کیا ہے۔ اس سلسلہ میں اور متعلقہ واقعات کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ جہاں عام حالات اور دوسروں کے خیالات آزادی سے درج کیے ہیں وہاں خود اپنی رائے اور رجحانات کے اظہار میں بھی بخل سے کام نہیں لیا ہے نہ واقعات کو اپنی رائے کا ماتحت ہونے دیا ہے نہ اپنی رائے کو واقعات کا تابع بنانا گوارا کیا ہے یہ تو میرا ذاتی خیال ہے مگر رائے ٹھیک وہی ہوتی ہے جو پنچ قائم کریں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس سبھا کے پنچ یعنی اُردو کے ادیب انشا پرداز اور سخن فہم حضرات کیا فیصلہ دیتے ہیں آج سے ساٹھ برس پہلے کپلنگ Kipling نے جو گیت گایا تھا کہ پورب پورب اور پچھم پچھم ہے اور یہ دونوں جُڑواں ماں جائے کبھی بغلگیر نہ ہوں گے ممکن ہے کہ اس کا اطلاق سیاسیات پر آج بھی ہوتا ہو مگر میں نے مقدور بھر کوشش کی ہے کہ اپنے ہم وطنوں کے سامنے نغمۂ زندگی اس طرح پیش کروں کہ میری کمزور آواز پر مشرق اور مغرب دونوں کے سازوں کے تار مل جائیں۔

۳۔ کہا جاتا ہے کہ اُردو زبان میں جامعیت اور وسعت نہیں معمولی خیالات کو تو اُردو الفاظ کا لباس پہنایا جا سکتا ہے مگر زبان میں اتنی سمائی نہیں ہے کہ دقیق علمی۔ اقتصادی۔ معاشرتی اور سیاسی مطالب اُس میں ادا ہو سکیں ان مطالب کو اُردو کے لفظوں کا جامہ پہنا دو عریانی پھر بھی باقی رہتی ہے۔ ممکن ہے یہ اعتراض درست ہو انسان کے سارے کام غیر مکمل ہیں زبان اس کلّیہ سے کس طرح مستثنیٰ ہو سکتی ہے

پھر اُردو کی حالت تو یہ ہے کہ زبان کی حیثیت سے دُنیا میں آئے ابھی پورے تین سو برس بھی نہیں ہوئے۔ فزکس کیمسٹری یا یوں کہو کہ بالعموم سائنس کی تلمیحات اگر آپ ڈھونڈنا چاہیں تو عربی زبان کے ثقیل اور غیر مانوس مرکبات گھڑنے پڑیں گے جن کے اصطلاحی معنی سے خود عرب بھی واقف نہ ہوں گے۔ میرے نزدیک اس سے بہتر یہ ہے کہ انگریزی کی اصطلاحات کو اُردو میں رواج دیا جائے۔ ممکن ہے کہ میری تجویز سے مذہبی جذبات کو ٹھیس لگے مگر عملی قوت سے کام لینے اور خیالی پُلاؤ پکانے میں بڑا فرق ہے۔ ملکی حالات کی طرف سے کوئی آنکھیں بند کرلے تو دوسری بات ہے ورنہ عقل اور عمل دونوں کا اقتضا یہ ہے کہ پاؤں اُسی قدر پھیلائے جائیں جتنی چادر میں گنجائش ہو۔ رہی چادر کی گنجائش اُس کا حال یہ ہے کہ سائنس کی تلمیحات کے سوا جن کی مدد سے یورُپ کی قومیں آج آسمان میں تھگلی لگانا چاہتی ہیں اور کوئی مضمون ایسا نہیں ہے جس کے بحث مباحثے یا اظہارِ خیال سے اُردو قاصر ہو۔ تعلیم یافتہ نوجوان کہیں گے کہ نہیں صاحب اُردو میں اہلیت ہے مگر محدود۔ ہم تو بغیر انگریزی کا سہارا ڈھونڈے دس قدم بھی نہیں چل سکتے۔ جواب یہ ہے کہ مصرعہ۔ سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست۔ اگر آپ اپنی مادری زبان میں اپنا مطلب بلاتکلف ادا نہیں کرسکتے تو یہ آپ کی کمیٔ استعداد کا ثبوت ہے اُردو کی بے بضاعتی کی دلیل نہیں ہے۔

۴۔ فارسی ایشیا کی زبانوں میں سب سے زیادہ شیریں زبان سمجھی جاتی ہے۔ جامعیت میں عربی کی ہم پلہ ہے۔ فارسی میں باپ کا القاب قبلہ وکعبہ، بیٹے کا لختِ جگر اور نورِ چشم، بڑے بھائی کا اخوی معظم اور چھوٹے بھائی کا برادر بہ جاں برابر ہے۔ انصاف شرط ہے۔ دیکھئے اظہارِ حقیقت فارسی کے ان معنی خیز الفاظ سے ہوتا ہے یا انگریزی کے مائی ڈیر سے۔ انگریزی میں القاب کی طرح عزیزوں کے لئے ایسے الفاظ ہیں جو بظاہر مشین کے ڈھلے معلوم ہوتے ہیں مگر مشین کی ڈھلی ہوئی اکثر نامکمل چیزوں کی طرح سب میں ایک ہی نقص موجود ہے یعنی رشتہ داری کا پتہ بتانے کے بجائے ہر لفظ کا مفہوم ایک طبقہ کا طبقہ ہے۔ بھاوج۔ سالی۔ سلہج۔ نند۔ دیورانی۔ جیٹھانی ان چھ مختلف رشتہ داروں کے لئے تنہا ایک لفظ سِسٹر اِن لا ہے۔ بھائی کی بیوی بھی سِسٹر اِن لا ہے۔ اور بیوی کی بہن کا بھی یہی خطاب ہے۔ سالا، بہنوئی، ساڑھو، دیور اور نندوئی سب کے سب برادر اِن لا ہیں۔ چچا، ماموں، پھوپھا اور خالو سب اَنکل کہلاتے ہیں۔ دادا اور نانا دونوں کے لئے ایک لفظ گرینڈ فادر ہے۔ دادی اور نانی دونوں گرینڈ مدر کہلائی جاتی ہیں۔ لفظ کل پر جو ہماری زبان میں دی روز اور فردا دونوں پر عائد ہوتا ہے اعتراض کیا جاتا ہے۔ مجھے تسلیم ہے کہ یہ لفظ ذرا بے کل سا ہے کاش ہمارے پاس کوئی ادارہ ایسا ہوتا جو کل کی کل ٹھیک کرسکتا مگر پھر بھی فقرہ کی ترکیب اور فعل کے استعمال سے معلوم ہوسکتا ہے کہ گذرا ہوا دن مقصود ہے یا آنے والا دن۔ مگر سِسٹر اِن لا صاحبہ ایسی پہیلی ہیں جن کو بغیر اَتے پتے کے کوئی نہیں بوجھ سکتا۔ ہر ملک کی زبان

اُس کی تہذیب و تمدن کا آئینہ ہوتی ہے۔ زید کا بیٹا خالد کی بیٹی سے شادی کرلے تو زید اور خالد سمدھی ہوجائیں گے۔ فارسی میں اس رشتہ کے لئے ہم سلک کا لفظ ہے مگر انگریزی میں کوئی لفظ نہیں ہے اور ہوتا کیسے۔ یورپ میں زید اور خالد کے درمیان سوائے اِس کے کہ دونوں بابا آدم کی اولاد ہیں اور کوئی رشتہ نہیں مانا جاتا۔ سچ تو یہ ہے کہ اُردو میں فارسی کی شیرینی عربی کی جامعیت سنسکرت کی بلاغت اور ہندی کی سادگی موجود ہے۔ جتنا وقت انگریزی زبان کے پڑھنے میں صرف کیا جاتا ہے اگر اُس کا دسواں حصہ بھی اُردو زبان کی تحصیل میں لگایا جائے تو اُردو کی بے بضاعتی کی شکایت جو فی الحقیقت خالی ظرف کی آواز یعنی خود انگریزی داں طبقہ کی اپنی کم مائگی کا اعتراف ہے ہرگز باقی نہ رہے۔ خودستائی نہ سمجھی جائے تو اتنا اور کہہ دوں کہ میں تقریر اور تحریر میں انگریزی کے اُن الفاظ کے سوا جو اُردو میں کھپ گئے ہیں خالص اپنی زبان کے لفظ بولتا اور لکھتا ہوں اور اظہارِ خیال کے لئے مجھے اُردو الفاظ کی بالعموم تلاش نہیں کرنی پڑتی ہیں عربی فارسی یا ہندی اور عام فہم سنسکرت الفاظ میں امتیاز نہیں کرتا بلکہ میری کوشش یہ رہی ہے کہ فارسی عربی الفاظ کی بجائے اگر چبھتا ہوا ہندی لفظ مل جائے تو اُسے استعمال کرکے یہ ثبوت دوں کہ میرا جنم بھوم ہندوستان ہے عرب یا ایران نہیں ہے۔ کٹھن کو دشوار پر ترجیح دیتا ہوں۔ روپ میں جو ادا ہے وہ خوبصورتی میں نہیں پاتا۔ چھبیلا میری آنکھوں کو طرحدار سے زیادہ بھلا معلوم ہوتا ہے مگر میرے پاس ہندی الفاظ کا ذخیرہ محدود ہے۔ عربی فارسی الفاظ زبان پر چڑھے ہوئے ہیں۔ ہندی الفاظ اگر اُردو میں کھپ جائیں تو کیا کہنا۔ بہرحال سنسکرت کے وہی الفاظ لینا چاہتا ہوں جن کی کھپت ہے۔ ٹھونسنا ہرگز نہیں چاہتا۔

۵۔ علامہ اقبال کا مشہور شعر ہے ؎

اُٹھائے کچھ ورق لالے نے کچھ نرگس نے کچھ گُل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

پہلا مصرعہ تو اقبال ہی کو زیب دیتا تھا اِس جگہ وہ مصرعہ لکھنا چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ میرے خیالات پریشاں اِس قابل کہاں کہ کوئی اُن پر دھیان دے کہتے ڈرتا ہوں مگر ہاں دل میں یہ تمنا ضرور ہے کہ:- مصرعہ۔ چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہو داستاں میری

رضا علی

نئی دہلی۔ ۲۱ نومبر ۱۹۴۳ء

سیاسی حلقوں میں دن رات بڑی سرگرمی سے بحث مباحثہ ہوتا ہے کہ ہمارا ملک کب آزاد ہوگا۔ میرا جواب سُن لیجئے مُلکِ ہند اُس وقت آزاد ہوگا جب ہمارے کاپی نویس دو سو سے زیادہ صفحے کی کتابوں کی صحیح کتابت اور مطبعے صحیح طباعت کرنے کے قابل ہوجائیں گے۔ یعنی جب کتابوں کے ساتھ صحت نامہ چھاپنے کی ضرورت باقی نہ رہے گی اب آپ خود اندازہ کرلیجئے کہ کتنی مدت لگے گی۔

ر۔ ع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نہ پوچھ نامۂ اعمال کی دل آویزی
تمام عمر کا قصہ لکھا ہوا پایا
(محمد ہادی رسوا)

پہلا باب

بزرگوں کی مشہد سے ہندوستان میں آمد

خدا کی قدرت کے جلوے دیکھنے ہوں تو کشمیر جائیے۔ یا شمالی ایران کے صوبہ خراسان کی سیر کیجئے۔ خراسان کا صدر مقام مشہد ہے۔ مناظرِ قدرت کی دل فریبیوں اور اسلامی تاریخ کے متعدد اہم واقعات کا مرکز ہونے کے علاوہ مشہد کو یہ عظمت بھی حاصل ہے کہ وہاں حضرت امام علی رضا کا مزار ہے۔

میرا خاندان رضوی ہے اور ہم امام علی رضا کی اولادیں ہیں، جن کے ساتھ مامون الرشید نے از راہِ عقیدت اپنی بیٹی کا عقد کر دیا تھا۔ عباسیوں کو یہ مناکحت ناگوار گذری۔ بنی فاطمہ کو وہ اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ جس قدر وقار امام علی رضا کا مامون کی نظر میں بڑھتا گیا اُن عباسیوں کی سازشیں جو اپنے کو خلافت

کا وارث سمجھتے تھے گہری ہوتی گئیں۔ بالآخر زہر دے کر اس مقدس زندگی کا صفر ۲۰۲ھ ہجری میں خاتمہ کر دیا۔

ہمارے جدِ امجد سید محمد اکرم صاحب مشہد کے رہنے والے تھے۔ ہمایوں بادشاہ ۱۵۴۰ء میں شیر شاہ سے شکست کھا کر مدد کے لئے شاہِ ایران کے پاس پہونچے، اور ایرانی فوج کی مدد سے واپسی پر دوبارہ ہندوستان پر قابض ہوئے۔ ہمایوں کے دوسرے دور میں سید محمد اکرم ہندوستان آئے اور آگرہ میں جو اس وقت دارالسلطنت تھا قیام کیا۔ یہ ٹھیک نہ معلوم ہو سکا کہ موصوف مشہد واپس گئے یا نہیں۔ یہ ثابت ہے کہ آگرہ میں عرصہ تک قیام پذیر رہے۔ اُن کے پوتے سید محمد ابراہیم جو مشہد میں پیدا ہوئے تھے شاہجہاں کے عہد میں ہندوستان آئے۔ اور عرصہ تک آگرہ میں قاضی رہے۔ وہیں وفات پائی۔ جہاں آپ کا مزار اب تک موجود ہے۔

قاضی سید عبدالرزاق صاحب قاضی سید محمد ابراہیم کے بیٹے قاضی سید عبدالرزاق بذریعہ فرمان شاہی عہدۂ قضا پر مقرر ہوئے اور سرکار سنبھل میں اس نواح کے قاضی قرار پائے۔ جو مرادآباد سے دس بارہ میل جنوب میں واقع ہے۔ ان اطراف کی سب سے بڑی آبادی قصبہ کندرکھی میں تھی۔ جس سے ڈیڑھ میل فاصلہ پر موضع ہریانہ تھا۔ یہ گاؤں اب بھی موجود ہے۔ اس نواح میں جاٹوں اور بیشتر اہیروں[1] کی آبادی تھی۔ جو بڑے سرکش تھے۔ قاضی سید عبدالرزاق آگرہ سے اُن لوگوں کی ایک جماعت ساتھ لائے تھے جو کارِ خدمت انجام دیتے تھے۔ ساتھیوں کی صحیح تعداد تو نہیں معلوم ہو سکی۔ مگر بالتحقیق اتنا معلوم ہوا ہے کہ قاضی صاحب کے ساتھ آگرہ سے حجام۔ نساب اور گورکن آئے تھے۔ اس زمانے کے بزرگ اللہ والے ہوتے تھے۔ اس اہتمام کو دیکھئے کہ جہاں اصلاح بنانے کے لئے حجام اور نسب نامہ پڑھنے کے لئے نساب کو ہمراہ لائے۔ وہاں انجام پر نظر رکھ کر قبر کھودنے والے کو بھی ساتھ لے لیا۔ قاضی صاحب کے ان تینوں ساتھیوں کی اولاد اس وقت تک کندرکھی میں موجود ہے اور سادات کی خدمت انجام دیتی ہے۔

---

[1] اہیر وہی قوم ہے جس کو دوآبے و نیز دیگر اضلاع میں اہیر کہتے ہیں۔

کلو حجام اور بچا حجام دونوں بڑے خدمتی تھے۔ کلو کی ذہنیت قدرے فلسفیانہ تھی۔ سوائے اصلاح بنانے کے اور وہ بھی اُس طرح جس طرح کلو کا مزاج چاہے اور کوئی بات ایسی نہ تھی جس کے بارہ میں کلو کا دماغ شکوک اور شبہات سے خالی ہو۔ تاہم حکم کی تعمیل اپنا فرض سمجھتا تھا۔ بچا حجام بڑا مستعد۔ خوش مزاج اور موقعہ شناس تھا۔ پڑھا لکھا ہوتا تو اُس دَور کے کسی رئیس کا آسانی مصاحب ہو سکتا تھا۔ جسین رائے نساب اپنے وقت میں بڑا دیدار وجوان ہوگا۔ جب میں نے دیکھا ہے آدھے کے قریب سر سفید تھا، چھ فٹ کا قد۔ بھاری چہرہ۔ سکھوں کی سی لمبی ڈاڑھی خوب چڑھی ہوئی۔ دوہرا بدن۔ سانولا رنگ۔ چوڑی چکلی ہڈی۔ سر پر خاکی رنگ کی خوب بڑی اور شاندار پگڑی۔ طرّہ نکلا ہوا۔ جب صاف کپڑے پہن کر دادا صاحب کے سلام کو آتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ فوج کا کوئی جمعدار رخصت پر آیا ہے۔ نسب نامہ پڑھنے کا کام محبوب رائے نساب کے سپرد تھا۔ میانہ قد اور گوری رنگت کا آدمی تھا۔ غریب سے غریب سیّد کی بات کا بھی ہاتھ جوڑ کر اور حضور کہہ کر جواب دیتا تھا۔ اگر بی۔ اے فیل ہوتا تو کسی چھوٹی ریاست میں اے۔ ڈی۔ سی کی جگہ کے لئے موزوں تھا۔ ہمارے نسّاب جن کو بھاٹ بھی کہتے ہیں سب مسلمان ہیں۔ مگر رائے ہر مرد کے نام کا جزو ہوتا ہے۔ اب اس خاندان کا بزرگ مقصود رائے ہے۔ بڑا سلیقہ شعار اور تمیز دار ہے۔ سادات کندرکھی کی باہمی فریق بندی کے باعث باہمہ اور بے ہمہ ہونا اُس کا طریق کار ہے۔

کندرکھی کے آس پاس اہر اور جاٹ قاضی صاحب کے اس نواح میں سکونت اختیار کرنے سے غیر مطمئن تھے اور شرارتیں شروع کر دیں۔ اس موقعہ پر رستم خاں دکھنی نے جو اپنے زمانہ کا بہادر افسر اور سرکار سنبھل کا عامل تھا۔ اپنی فطرت کے مطابق بہادری اور جوانمردی سے کام لیا اور جاٹوں اور اہروں کو پے در پے شکستیں دے کر اس علاقہ سے نکال دیا۔ بہت سے اہر اور جاٹ اُس رقبہ میں آباد ہو گئے جو اب تحصیل حسن پور کے نام سے مشہور ہے۔ اور اصلی کندرکھی اور ہریانہ کی یاد میں اُنھوں نے اپنی نئی جائے سکونت یعنی تحصیل حسن پور میں دو موضع آباد کئے جن میں سے ایک کا کندرکھی اور دوسرے کا نام ہریانہ رکھا۔ قاضی صاحب کے علاقے کے بچے کھچے سرکش سیونڈارہ چلے گئے۔ جہاں

وہ اب تک سکونت پذیر ہیں۔ قاضی صاحب کے اس نواح میں آنے سے پہلے کچھ تھوڑی سی فوج
بھی کندرکھی میں رہتی تھی قصبہ کے جنوب میں ایک جگہ گڑھی کے نام سے مشہور ہے جہاں بڑی بڑی اینٹیں اب
بھی پائی جاتی ہیں۔ اینٹوں کی شکل و ساخت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دورِ شاہجہانی سے بہت
پہلے کی ہیں۔ گڑھی میں پختہ مکانات بنے ہوئے تھے جن میں فوج کے سپاہی رہتے تھے۔

رستم خاں دکھنی

شہنشاہ شاہجہاں کا زمانہ تھا۔ رستم خاں دکھنی نے مراد آباد کی بناء ڈالی اور شہر کا نام
اپنے نام پر رستم نگر رکھا۔ جہاں پناہ کی خدمت میں پرچہ گذرا کہ رستم خاں کی خودسری و مطلق العنانی
اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ نیا شہر بنایا ہے اور اپنے نام پر اُس کا نام رکھا ہے۔ طلبی ہوئی وہ بھی بڑے
ہوش گوش کا آدمی تھا۔ بہت سے ہدیئے اور تحفے لے کر حاضر ہوا۔ ظلِ سبحانی نے دریافت فرمایا
سنا ہے تم نیا شہر بنا رہے ہو کیا نام رکھا ہے۔ عرض کیا اہیروں اور جاٹوں کا علاقہ ہے۔ تمام رعایا
خوش و خرم ہے اور ہر وقت جہاں پناہ کے ترقی اقبال کی دعائیں مانگتی ہے۔ مگر بعض اہیر اور جاٹ
مفسد ہیں۔ موقعہ تاکتے رہتے ہیں۔ آج ملک میں ہر شخص کی زبان پر چھوٹے صاحبِ عالم کی بہادری
اور ہمتِ عالی کا ذکر ہے۔ اس مناسبت سے شہر کا نام مراد آباد رکھا ہے۔ شہنشاہ جواب سُن کر بہت
خوش ہوئے اور انعام و اکرام دے کر اس حاضر جواب اور خوش تدبیر عامل کو رخصت کیا۔

قاضی سید عبدالرزاق صاحب بڑے صاحبِ علم بزرگ تھے۔ عہدۂ قضا کے فرائض بڑی
آزادی سے انجام دیتے تھے۔ موصوف نے کندرکھی میں پختہ مسجد[1] تعمیر کی اور قصبہ سے آدھ میل کے

---

[1] مذہب کی جو بے توقیری اُس زمانہ میں ہوئی جب سلطنتِ مغلیہ کا چاند گہن میں تھا اُس کی یہ مسجد عبرت ناک مثال
ہے۔ خانۂ خدا کے صحن کو اُن سید صاحبان نے جن کے مکانات مسجد کے شرق میں تھے اپنے مکانوں میں شامل کر لیا۔
میرے بچپن میں مسجد کا صحن اسقدر تنگ تھا کہ عید بقرعید میں سارے نمازی اُس میں نہ آسکتے تھے۔ خدا والد صاحب
کی رُوح پر رحمت نازل کرے سنہ ۱۹۰۲ء میں اُنھوں نے اپنے مردانہ مکان کا اندرونی حصہ جس پر عمارت بنی ہوئی تھی
صحنِ مسجد میں شامل کر دیا اور چودھری غلام مرتضیٰ صاحب سے ایک اور مکان جو ہمارے مردانہ مکان کے شمال میں تھا خرید کر
اس کا بھی اندرونی حصہ مسجد کو دے دیا۔ خدا کے فضل سے اب مسجد کا صحن خاصا بڑا ہے۔

فاصلہ پر جو گاؤں آباد کیا تھا اُس کا نام قاضی پورہ ہے۔ قاضی پورہ کے جنوب میں ایک بلند مقام پر چھوٹی اینٹیں اب تک ملتی ہیں، بزرگوں سے سنا ہے کہ اس جگہ قاضی صاحب کے مکانات تھے قاضی صاحب نماز قصبہ کی مسجد میں پڑھا کرتے تھے۔ ایک دن فجر کی نماز کے بعد مسجد میں کلام مجید کی تلاوت کر رہے تھے۔ غلام نے پیچھے سے تلوار کا وار کیا۔ کاری زخم سر پر آیا اور اُسی زخم سے شہادت پائی۔ مسجد کوفہ میں عبدالرحمٰن ابن ملجم کی تلوار علی مرتضیٰ کے سر اقدس پر اُس وقت پڑی جب وہ سر بسجدہ تھے۔ پوتے نے ہزار برس بعد دادا کی سنت خدا کے گھر میں بعد نماز کلام الٰہی کی تلاوت میں غلام کی تلوار سے کاری زخم کھا کر ادا کی۔ قاضی صاحب کا مزار قصبہ کے بیچوں بیچ ایک کھلی ہوئی جگہ میں واقع اور سادات کا زیارت گاہ ہے۔ ہر تقریب کے موقعہ پر دولھا یا لڑکا مزار پر سلام کے لئے ضرور جاتا ہے۔ دولھا یا لڑکا جس کی تقریب ہورات کے وقت گھوڑے پر سوار برادری کے سب سیّدوں کے حلقے میں زیارت پر حاضر ہوتا ہے۔ جلوس کے ساتھ حسب حیثیت روشنی ہوتی ہے چبوترہ کے قریب گھوڑے سے اُتر کر عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ مزار پر حاضر ہوتا ہے۔ اور از راہِ عقیدت فاتحہ پڑھتا ہے۔ میرے نزدیک یہ رسم بڑی اچھی اور دل لبھانے والی ہے۔ بزرگوں کی حیاتِ زرّیں کے نقوش اُس وقت تک ہی محفوظ رہ سکتے ہیں۔ جب تک ہم میں اُن نقوش کو زمانہ کی دستبرد سے بچانے کی اہلیت موجود ہے۔ جن بزرگوں کی دینی خدمات آج ہمارے راستہ میں چراغِ ہدایت کا کام دے رہی ہیں اور جن کے مزار اجمیر۔ نظام الدین۔ آگرہ۔ پاک پٹن۔ پیران کلیر۔ اور دوسرے مقامات میں واقع ہیں۔ اُن سب کی یاد قایم رکھنا ہمارا فرض ہے۔ عرس محفلِ سماع۔ نذر و نیاز۔ مجلسِ عزا محفلِ میلاد۔ یا جو اہلِ حاجت وہاں جاتے ہیں اُن کی امداد پر کسی ذی ہوش مسلمان کو اعتراض نہیں ہوسکتا۔ البتہ خدا کے سوا کسی اور سے معبودیت کے رشتے ناتے جوڑنا میرے نزدیک اسلامی تعلیم کے بالکل منافی ہے۔ خواہ وہ قبر پرستی یا تعزیہ پرستی کی صورت اختیار کرے۔ خواہ پیر پرستی یا مولانا و مجتہد پرستی کے بھیس میں ظاہر ہو۔

قاضی عبدالرزاق کا مذہب یہ تحقیق نہ ہو سکا کہ قاضی سید عبدالرزاق صاحب سنّی تھے یا شیعہ۔ شیعوں کا

دعویٰ ہے کہ وہ شیعہ تھے بستّی کہتے ہیں کہ سنی تھے۔ قرینہ یہ ہے کہ قاضی صاحب سنّی المذہب تھے۔ دکن کی اسلامی حکومتوں کا مذہب اُس زمانہ میں ضرور شیعہ تھا۔ مگر علاوہ اُن حضرات کے جن کا ایران سے آنے کا تانتا لگا ہوا تھا شیعوں کی تعداد شاہجہانی دَور کے شمالی ہند میں زیادہ نہ تھی[۱]۔ ایک دلیل یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ قاضی صاحب عہدۂ قضا پر مامور تھے۔ اگر شیعہ ہوتے تو اس عہدہ پر اُن کا تقرر عمل میں نہ آتا۔ میری ناچیز رائے میں قاضی ہونے سے موصوف کا سنّی ہونا لازم نہیں قرار پاتا۔ قاضی نور اللہ صاحب شوستری شیعوں کے بڑے مشہور عالم تھے۔ اب تو اُن کے مزار پر شیعوں کا بڑا بھاری اجتماع اجمیر اور پیران کلیر کے عرس کی ریس میں ہر سال ہوتا ہے۔ وہ اپنے زمانے کے زبردست شیعہ عالم تھے اور عہدۂ قضا کے فرائض بھی انجام دیتے تھے حقیقت یہ ہے کہ اُس زمانہ کے بزرگ بڑے روشن خیال اور روادار تھے۔ اُن کا مرتبہ مدح صحابہ اور تبرا کے جھگڑوں میں پڑ کر مسلمانوں میں باہمی منافرت پیدا کرنے اور اس طرح اپنے حلوے مانڈے کی فکر کرنے سے بہت ارفع و اعلیٰ تھا۔ قاضی سید عبد الرزاق صاحب کے مذہبی وقار و عظمت کی اس سے بہتر اور کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ آج تین سو برس گزرنے کے باوجود مرحوم کو شیعہ اور سنّی دونوں اپنانا چاہتے ہیں۔ میرے بچپن میں قاضی صاحب کا پختہ مزار ٹوٹا پڑا تھا۔ پچاس برس ہوئے قصبہ کے معزز حضرات نے مولوی ابوالحسن صاحب مرحوم کی زیر سرپرستی اور میرے بڑے چچا میر فدا علی صاحب مرحوم کے زیر اہتمام چندہ جمع کرکے مزار کو از سر نو تعمیر کرایا اور مزار کے پڑوس میں

---

[۱] سید کمال الدین حیدر اپنی کتاب موسومہ سوانحات سلاطین اودھ" میں لکھتے ہیں" دوسرا امر حسنات دینی یہ ہوا کہ لکھنؤ میں مومنین برائے نام شیعہ تھے اور اپنی عدم واقفیت سے اعمالِ خلاف بھی کرتے تھے۔ عوام ضروریاتِ مذہب سے آگاہ نہ تھے، اور بعض جو از راہِ علم واقف تھے طریقہ ہدایت پند و وعظ و جماعتِ نماز علیٰ رؤس الاشہاد نہ کہہ سکتے تھے۔ ہر چند اپنے ایمان میں کامل تھے۔ یہ ترقی شریعت محمدی کی فقط مرزا حسن رضا خاں کی جہت سے ہوئی" آگے چل کر مصنف نے غفران مآب مولوی سید دلدار علی صاحب مجتہد کی جد و جہد کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ غالباً ۱۸۹۶ء میں طبع ہوئی تھی۔ دیکھو سوانح سلاطین اودھ جلد اول صفحہ ۱۱۳ طبع سوم مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ۔

جو لوگ رہتے ہیں اُن کے آرام کے لئے ایک پختہ کنواں بھی بنوا دیا۔

ددھیال کے حالات

دادا صاحب کا نام میر ہادی علی تھا۔ مراد آباد میں تعلیم حاصل کی۔ خاندانی مذہب شیعہ تھا۔ مگر اغلب ہے کہ زمانۂ طالب علمی میں دادا صاحب نے سنی مذہب اختیار کیا تھا۔ تفضیلیہ سنی تھے۔ امیر معاویہ کو بُرا اور اسلام میں تفرقہ کا بانی سمجھتے تھے۔ میری آنکھوں دیکھی بات ہے۔ محرم میں جتنا روپیہ وہ اکیلے خرچ کرتے تھے قصبے کے سارے شیعہ مل کر بھی اتنا خرچ نہ کرتے تھے۔ بڑے روشن خیال تھے۔ دادا صاحب کے بڑے بیٹے میرے والد سید واحد علی آخر ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ جب غدر شروع ہوا ہے تو والد کی عمر چھ مہینے کی تھی۔ دادا صاحب نے ۱۸۷۰ء میں بڑے بیٹے کو انگریزی تعلیم دلائی اور گو توقعات پوری نہ ہوئیں پھر بھی دوسرے بیٹے یعنی میرے چچا میر فدا علی کو بھی گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخل کرا دیا۔ میرے پردادا میر قاسم علی کی بہت تھوڑی زمینداری تھی۔ زمینداری گذر کے لئے ناکافی تھی۔ اس لئے کھیتی بھی کرتے تھے۔ خاندان میں علم تھا، مگر خود اس دولت سے محروم تھے۔ قدرت نے اس کمی کو اولاد کے معاملے میں ان کے ساتھ فیاضانہ سلوک کر کے پورا کر دیا تھا۔ تین بیٹے تھے اور پانچ بیٹیاں۔

بڑے بیٹے میر ہاشم علی۔ منجھلے میرے دادا میر ہادی علی اور چھوٹے میر علی حسن تھے۔ پردادا صاحب کے بھائی میر الٰہی بخش خوش حال تھے۔ جنھوں نے دادا صاحب کو بیٹے کی طرح پالا اور پرورش کیا۔ میر الٰہی بخش کے اولاد نہ تھی اور اُن کا ترکہ دادا صاحب کو ملا۔ قصبے میں میرے دادا میر ہادی علی پہلے شخص تھے جنھوں نے کھنڈسار کا کاروبار پچھتر سال ہوئے شروع کیا۔ یہ پُرانے طریقے کی شکر سازی کا کارخانہ تھا، جسے کھنڈسار کہتے ہیں۔ یکے بعد دیگرے چار کڑھاؤ ایک قطار میں مٹی کے گارے سے نصب کئے جاتے تھے۔ نیچے بھٹی میں آگ جلائی جاتی تھی۔ سب سے بڑے کڑھاؤ میں جس کو گنجہ (فارسی لفظ ہے بمعنی ذخیرہ) کہتے ہیں اُوکھ کا رس بھرا جاتا تھا۔ وہ ذرا گرم ہو جاتا تو دوسرے کڑھاؤ میں ڈالا جاتا، اسی طرح رس ایک کڑھاؤ سے دوسرے کڑھاؤ میں منتقل کیا جاتا۔ تا آنکہ سب سے چھوٹے کڑھاؤ میں جس کا نام پرچھا ہے پہنچنے تک خوب گاڑھا

ہو جاتا تھا۔ پھر وہ ایک چھوٹے سے حوض میں ڈالا جاتا اور اس میں سے مٹی کے بڑے گھڑوں میں جن کو کلسہ کہتے ہیں بھرا جاتا۔

ایک ہفتے میں وہ گاڑھا رس کلسوں میں جم جاتا اور راب تیار ہو جاتی۔ راب سے شکر تیار کی جاتی۔ رس کڑھاؤ میں پہونچنے سے شکر تیار ہونے تک ساری کارروائی ایسی ہی طولانی تھی جیسی اگلے وقتوں کے معشوق کی زلف۔ یا عشاق کی داستانِ ہجر۔ یا لیجسلیٹو اسمبلی کے کسی غیر سرکاری ممبر کے پیش کردہ بل کا پیش ہونے سے پاس ہونے تک کا قضیۂ دراز۔ عام طور سے دسمبر میں کھنڈسار شروع ہوتی اور شروع اپریل سے آخر مئی تک شکر بنانے کا کام جاری رہتا۔ گویا پانچ یا چھ مہینے لگ جاتے تھے۔ دادا صاحب نے کھنڈسار کی تجارت میں خوب روپیہ کمایا اور خوب خرچ کیا۔

ننھیال کے حالات

میری ننھیال موضع نگریا سادات ضلع بریلی میں تھی اور میرے لئے یہ فخر کی بات ہے کہ میں باپ کی طرف سے قصباتی اور ماں کی طرف سے دیہاتی ہوں۔ میری یاد کی بات ہے جب دیہاتی اور قصباتی لوگ شہر والوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے اس کے سبب دو تھے۔ ایک تو یہ کہ شہر والے رشتہ داری کرنے میں عموماً حسب نسب کا خیال کم رکھتے ہیں۔ برخلاف اس کے دیہاتی اور قصباتی شرفا رشتہ ناتہ کرنے میں سب سے پہلے شرافتِ نسبی کو ڈھونڈھتے ہیں۔ میرے نانا کی بڑی بہن کی شادی ۳۵ یا ۳۶ سال کی عمر میں محض اس وجہ سے ہوئی کہ بریلی کے اُن دیہات میں جہاں میرے ننھیال والوں کے شادی بیاہ ہوتے تھے کوئی اچھا بر نہ مل سکا۔ دوسرا سبب اپنے کو اونچا سمجھنے کا یہ تھا کہ ہم دیہاتیوں کی نظر میں شہر والے مہمان داری سے گھبراتے ہیں۔ گاؤں یا قصبے میں کسی کے یہاں مہمان آجائے تو میزبان کی باچھیں کھل جاتی ہیں اور وہ ہمیشہ مہمان کو اپنے سے اچھا کھانا کھلاتا ہے۔ شہر والوں کے لئے یہ مشہور تھا کہ اگر کوئی دیہاتی دوست ٹھہرنے کی نیت سے شہری دوست کے گھر جائے تو بسا اوقات تو وہ اندر سے یہی کہلوا دیتے ہیں کہ صاحبِ خانہ موجود نہیں ہیں۔ اگر بدرجۂ مجبوری گھر میں سے نکلے یا مردانہ مکان میں بیٹھے مل بھی گئے تو پہلا سوال یہی ہوتا ہے "جناب کب تشریف

لائے اور قیام کہاں ہے؟" اس کے سوا یہ بھی بدگمانی تھی کہ شہر کے میزبان دیہاتی مہمانوں کو یہ سمجھ کر کہ اُن کو نیک و بد کے امتیاز کا زیادہ سلیقہ نہیں ہے، بہت معمولی کھانا کھلاتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ نہ سب دیہاتی خوش خلق اور متواضع ہوتے ہیں نہ سب شہری اکل کھرے اور مہمانوں سے آنکھ چرانے والے ہوتے ہیں۔ مجھے دونوں زندگیوں کا تجربہ ہے۔ قصبے میں پیدا ہوا۔ وہیں پلا بڑھا۔ پچاس برس سے شہری زندگی بسر کر رہا ہوں۔ میرا خیال یہ ہے کہ دیہاتی شرفا کو شہر میں کسی کا مہمان ہو کر جو تکلیف ہوتی ہے وہ بیشتر اُن کے اپنے احساسِ کمتری Inferiority Complex کے باعث ہوتی ہے۔ شہریوں کے مقابلے میں دیہاتی ایسے ہی ذکی الحس (Sensetive) ہوتے ہیں۔ جیسے انگریزوں کے مقابلے میں ہم ہندوستانی موقع ہاتھ آجانے پر شہری دیہاتیوں کا مذاق اُڑانے سے نہیں چُوکتے۔ مثل مشہور ہے طعام بیار تا دہقانیاں برخیزند۔ یعنی کھانا لاؤ تاکہ دیہاتی یہاں سے غائب ہو جائیں۔ اس مثل سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ملک میں دیہاتی مدت دراز سے ضرورت سے زیادہ خوددار اور شہری خوش تدبیر و باخبر رہے ہیں اور خوش تدبیری نے دیہاتی سادگی سے موقع ہاتھ آنے پر کام نکالا ہے۔

میرے نانا کا نام میراں برکات حسین تھا۔ اُن کے والد میراں ذوالفقار علی اپنے زمانے میں اس نواح میں بہت اثر رکھتے تھے۔ بڑے خوش نویس تھے۔ علمی استعداد بھی اچھی تھی۔ میراں ذوالفقار علی کے بھائی میراں ناظم علی نے ترکِ دنیا کر کے درویشی اختیار کر لی تھی اور میاں ناظم علی شاہ کے نام سے مشہور تھے۔ میاں چراغ علی شاہ کے مرید تھے۔ مرید و مرشد دونوں کا عرس قصبہ سنیتھل (Senthal) ضلع بریلی میں اب بھی ہوتا ہے۔ میری ننھیال کا سلسلۂ نسب امام جعفر صادق سے ملتا ہے جو امام ابوحنیفہ کے اُستاد تھے اور علوم معقول و منقول میں اپنے زمانے میں فردِ فرید تھے۔ نانا صاحب ضبطیٔ اودھ سے پہلے واجد علی شاہ بادشاہِ اودھ کی فوج میں افسر تھے۔ اودھ کی ضبطی پر وطن چلے آئے۔ اور گھر کا کاروبار سنبھالا۔

ہندوستان میں سادات کے کچھ خاندانوں کا خطاب میراں رہا ہے۔ آنریبل میراں محمد شاہ

سندھ لیجسلیٹو اسمبلی کے صدر رہیں۔ میراں سید حسین خنگ سوار جن کا مزار تارا گڈھ میں اجمیر کے قریب ہے۔ خواجہ معین الدین کے ہم عصر اور اپنے زمانے کے نامور بزرگ تھے۔ میرے ننھیالی بزرگوں کو شاہجہاں نے جاگیر عطا کی تھی۔ فرمان کا عکس درج کیا جاتا ہے۔

بچھو کے کاٹے کا علاج عمل سے

نانا صاحب کے پانچ بیٹیاں تھیں۔ بیٹا کوئی زندہ نہیں رہا بیٹیوں میں سب سے بڑی میری والدہ تھیں عاشورہ بانو نام تھا۔ میری چھوٹی خالہ فیاض بانو بفضلہ زندہ ہیں۔ والدہ کی باقی بہنوں کا انتقال ہو گیا۔ میں نے اپنی عمر میں کوئی بات ایسی نہیں دیکھی۔ جس کو مافوق العادت کہا جا سکے۔ البتہ نانا صاحب عمل کے ذریعے سانپ اور بچھو کے کاٹے کا زہر اُتارتے تھے۔ سانپ کا کاٹا کوئی مریض میری موجودگی میں اُن کے پاس نہیں آیا۔ مگر بچھو کے کاٹے دو مریضوں کا علاج اُنھوں نے میرے سامنے کیا ہے۔ طریقہ علاج یہ تھا کہ بچھو کا کاٹا مریض اوٹ میں ان کے قریب آکر کہتا۔ میراں گھر میں گیا۔ وہ فوراً سمجھ جاتے اور پوچھتے کون ہے؟ وہ جواب دیتا، حاجت مند۔ اُس سے یہ معلوم کرتے کہ کہاں کاٹا ہے۔ فرض کیجئے پاؤں میں کاٹا ہے تو فرماتے گھٹنا دونوں ہاتھوں سے پکڑلو۔ پھر دعا پڑھنے کے بعد کہتے ہاتھ ہٹالو۔ کیا حال ہے۔ وہ کہتا درد نیچے اُتر آیا۔ اسی طرح عمل پڑھکر اُس سے دریافت کرتے جاتے۔ تین چار مرتبہ کے عمل پڑھے جانے سے درد بالکل جاتا رہتا تھا۔ یا یہ کہوں کہ حاجت مند کہتا کہ اب درد نہیں ہے۔ غالباً اُن کو یہ عمل اُن کے چچا میاں ناظم علی شاہ نے بتایا تھا۔ نانا صاحب کے بڑے بھائی میراں علی حسن کا رنگ بڑا سُرخ سفید تھا۔ اولاد نہ تھی۔ اچھا کھانا کھانے اور کھلانے میں موصوف کو بڑا لطف آتا تھا۔ اگر کسی کے یہاں دعوت ہوتی اور کھانا اُن کے مزاج کے موافق نہ ہوتا تو دو ٹوک بات کہہ دینے میں اُن کو تامل نہ ہوتا تھا۔ حکام رس اور بڑے صاحب اثر تھے۔ ۱۹۱۸ء میں وفات پائی۔ بیٹی بیٹا کوئی نہیں چھوڑا۔

میری پیدائش

میں ۱۴ مئی ۱۹۱۸ء کو قصبہ کنڈرکھی میں پیدا ہوا۔ میری پیدائش کے ایک سال پہلے دادا جان نے پختہ دو منزل کا مکان بنایا تھا۔ دو منزلہ ہونے کے باعث یہ

مکان سادات کے سب مکانوں سے اونچا تھا۔ اسی مکان میں میری پیدائش ہوئی۔ میرے بچپن میں اس مکان کو لوگ عموماً میر ہادی علی کا محل کہتے تھے۔ مکان بہت بڑا نہیں ہے۔ دادا صاحب کے چار بیٹے تھے اور وہ خوب بڑا مکان بنانا چاہتے تھے۔ مگر زمین نہ مل سکی۔ اس مکان کے دو طرف راستہ ہے۔ توسیع کی گنجائش صرف پورب کی جانب تھی۔ پورب میں میرے والد کی نانی (دادا صاحب کی خوش دامن) کا مکان تھا وہ بڑے طنطنے کی بی بی تھیں۔ اُن کی بیٹی یعنی میری دادی صاحبہ کا کئی برس پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ دادا نے سو جتن کئے کہ وہ اپنا مکان فروخت کر دیں منگی قیمت دینے پر تیار تھے۔ مگر وہ کسی طرح مکان بیچنے یا دینے پر راضی نہیں ہوئیں۔ دادا صاحب نے یہ بھی کہا کہ آپ قیمت نہ لیجئے آپ کا مکان کچا ہے۔ مجھے زمین کی ضرورت ہے۔ میں آپ کو دوسری جگہ آپ کے گھر سے اچھا مکان بنوائے دیتا ہوں۔ نانی صاحبہ نے جواب دیا تم امیر ہو گئے تو اپنے گھر کے۔ امیروں کے پڑوسی کیا غریب نہیں ہوتے۔ جب سے میرے میاں (خاوند) مرے ہیں ہر جمعرات کو فاتحہ اس گھر میں دلواتی ہوں اور جب تک جیتی ہوں اسی گھر میں فاتحہ دلاؤں گی۔ نہ دینا تھا پر نانی صاحبہ نے اپنا گھر نہ دیا۔ مجبوراً جگہ کی کمی کے باعث دادا صاحب کو دو منزل کا مکان بنانا پڑا۔ پرنانی صاحبہ کا انتقال ۱۸۹۲ء میں ہوا تخمیناً پچاس برس کی عمر ہوئی۔

میں اپنے والدین کی پہلی اولاد، دادا کا اکلوتا پوتا اور نانا نانی کا اکلوتا نواسہ تھا۔ دنیا کی سب ماؤں کو اولاد آنکھ کا تارا ہوتی ہے۔ لیکن خدا بخشے والدہ صاحبہ کو جو محبت مجھ سے تھی اُس کی مثالیں اپنی زندگی میں تین چار سے زیادہ میں نے نہیں دیکھیں۔ میرا حافظہ اچھا ہے۔ بعض باتیں اُس زمانے کی بھی یاد ہیں جب میری عمر چار اور پانچ سال کے درمیان تھی۔ میرا خیال ہے کہ میں نکھ چڑھا بچہ نہ تھا۔ مگر ددھیال اور ننھیال کی محبت اور ماں کے لاڈ پیار نے تنک مزاج بنا دیا تھا۔ والدہ صاحبہ جب کسی عزیز کے یہاں جاتی تھیں تو میں دوسرے کے گھر جا کر کسی سے بات چیت نہ کرتا تھا۔ نہ کھانا کھاتا تھا اور نہ رفع حاجت کے لئے دوسرے کے گھر

جائے ضرور جاتا تھا۔ اور تو اور دوسرے کے گھر پانی پینے میں بھی مجھے تامل ہوتا تھا۔ اپنے گھر کے سوا ہر گھر کو غیر یعنی پرایا گھر سمجھتا تھا۔ جب والدہ صاحبہ نے دیکھا کہ عزیزوں میں ان کے تشریف لے جانے سے مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ تو انھوں نے رشتہ داروں کے یہاں آنا جانا ترک کر دیا۔ بیاہ شادی وغیرہ تقریبوں کے سوا کہیں نہ جاتی تھیں اور جہاں تقریب میں جاتی تھیں۔ وہاں سے بھی جلد واپس چلی آتی تھیں تاکہ رُضل (میرا پیار کا نام تھا) کو تکلیف نہ ہو۔ ماں کو جو محبت اولاد سے ہوتی ہے۔ وہ خالق کی قدرت کا عجیب وغریب کرشمہ ہے۔ اگر ایسی محبت نہ ہو تو یہ گوشت کا لوتھڑا کیسے پلے کیسے بڑھے اور کیسے پروان چڑھے۔

اگر میں عبدالجلیل ہوتا

دادا صاحب نے میرا نام محمد عبدالجلیل تجویز کیا تھا۔ سرسید احمد خاں علیہ الرحمتہ کے ہمعصر اور بڑے روشن خیال تھے۔ میرے والد کو انگریزی تعلیم دلائی۔ حالانکہ اُس زمانے میں انگریزی پڑھنا کفر سمجھا جاتا تھا۔ والد صاحب کی انگریزی قابلیت اپنے ہم جماعت طلبا میں غالباً سب سے اچھی تھی۔ میری پیدائش سے ایک دو سال پہلے کندرکھی میں بیمار ہوئے تو گورنمنٹ ہائی اسکول مرادآباد کے انگریز ہیڈ ماسٹر مسٹر بونو (Mr Bonand) اپنے شاگرد کو دیکھنے کندرکھی آئے جو اُس زمانے میں (غدر کو فرو ہوئے ابھی سترہ اٹھارہ سال ہی گزرے تھے) انگریزوں اور ہندوستانیوں کے باہمی تعلقات کے لحاظ سے بڑی غیر معمولی بات تھی۔ مگر انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کی بجائے والد صاحب کو اردو کے اخباروں میں مضامین لکھنے میں لطف آنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دفعہ انٹرنس کے امتحان میں ناکامیاب ہو کر پڑھنا چھوڑ دیا۔ کوشش کرتے تو اُس زمانے میں سرکاری ملازمت ملنا دشوار نہ تھا۔ مگر دادا صاحب کی خوشحالی کے بھروسے پر اس طرف توجہ نہ کی۔ سارا وقت مضمون نگاری اور شعر گوئی میں صرف ہوتا تھا۔ وکالت کا امتحان پاس کر لیتے تو قرینہ یہ ہے کہ کامیاب وکیل ہوتے۔ بیس برس بعد جب اسیسر مقرر ہوئے تو سشن کے مقدمات میں گواہوں پر پُرمغز جرح کرتے تھے۔ اور مقدمات میں ججوں کو معقول دلائل کے ساتھ بے لاگ رائے دیتے تھے۔ بابو سیتا چرن مکرجی الہ آباد ہائی کورٹ کے نامور وکیل تھے۔ صرف

نگریا سادات پرگنہ میرگنج ضلع بریلی

۶ نوامبر ۱۸۸۷ء

عزیزم فدا علی سلمہ اللہ تعالے   بعد دعاے ترقی درجات
کے مطالعہ کرو کارڈ تمہارا مرسلہ ۴ نوامبر کا آج ۶ تاریخ کو تیسرے
دن مجھکو ملا حال معلوم ہوا کمال خوشی و خرمی حاصل ہوئی
مینے کندرکی سے بریلی اکر ایک خط جناب خالو صاحب کی خدمت
مین کندرکی بھیجا تھا چونکہ اوسکے جواب سے محروم رہی لہذا دوسرا
خط وہان بھیجنا نامناسب سمجھا تمہارے پاس ایک کارڈ
تمہارے بھائی نے یہان سے بھیجا تھا مگر چونکہ وہ اوسی روز
بریلی جانے والے تھے اور وہان قیام ایک ہفتہ کا ارادہ تھا
لہذا خط پر بریلی کا مقام تحریر تھا باین غرض کہ اگر تم اونکو
مرادآباد سے خط بھیجو تو بریلی ملجاوے تمہارا کوئی خط ابھی تک

بریلی یا نگر یا نہیں ایا ورنہ یہاں سے ضرور جواب بہیجا جاتا اب

تم ہنہیہ دار اپنی خیر و عافیت سے اطلاع دیتے رہو -

اگر تمہارے بہائی کا جوتا طیار ہوگیا ہو تو اوسکی

قیمت سے مطلع کرو کہ بہیجکر منگا لیا جائے -

رضا علی کا سلام قبول ہو اور اوسکی نوشت خواند

قرار واقع نہیں ہوتی از جانب جناب والد ماجد والدہ صاحبہ

دعا درازی عمر راقمہ

عاشورہ بانو

فوجداری کی وکالت کرتے تھے بسنہ ۱۹۱۱ء میں سشن کے ایک مقدمہ میں مراد آباد آئے۔ برسبیل تذکرہ سیتا بابو نے کہا میرا کام تو آدھا رہ گیا ہے۔ ایک اسیسر گواہانِ ثبوت پر ایسی جرح کرتے ہیں جیسے کوئی وکیل بیرسٹر کرے۔ بعد کو معلوم ہوا کہ وہ اسیسر جن کو سیتا بابو خراجِ تحسین ادا کر رہے تھے۔ والد صاحب تھے۔ زیادہ تر اُن کی جرح کے باعث سیتا بابو کو کامیابی ہوئی۔ اور ملزم نے بریت پائی۔ دادا صاحب نے بڑے بیٹے کو بڑے ارمانوں سے انگریزی پڑھائی تھی۔ جب والد صاحب نے کاروبار کی طرف بھی توجہ نہ کی اور لکھنڈ سار کے کام سے بھی الگ تھلگ ہی رہے تو دادا صاحب پر افسردگی چھا گئی۔

چاہتے تھے کہ مجھے عربی پڑھائیں اور میں مولوی بنوں۔ اسی مناسبت سے میرا نام محمد عبدالجلیل رکھنا چاہتے تھے۔ مگر والدہ صاحبہ کو یہ نام پسند نہ آیا۔ فرمایا کہ یہ تو بڈھوں کا سا نام ہے۔ میں اپنے بچے کا نام عبدالجلیل نہ رکھوں گی۔ والدہ صاحبہ نے میرا نام رضا علی رکھا۔ دادا صاحب اپنی رائے پر قائم رہے۔ والدہ صاحبہ فرمایا کرتی تھیں کہ دادا صاحب مجھے گود میں لے کر اچھالتے اور فرماتے کہ محمد عبدالجلیل کیسا اچھا نام ہے۔ میرا پوتا مولوی ہوگا لوگ اُسے مولوی محمد عبدالجلیل کہہ کر پکاریں گے۔ بالآخر ماں کی ممتا نے دادا کی شفقت پر غلبہ پایا اور مجھے رضا علی نام ملا۔ والدہ صاحبہ اُردو بہت اچھی لکھتی تھیں۔ کسی قدر فارسی بھی جانتی تھیں۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتی تھیں۔ تبرکاً ایک خط کا فوٹو جو مرحومہ نے ۱۸۹۶ء میں میرے بڑے چچا میر فدا علی کے نام بھیجا تھا درج کیا جاتا ہے۔ میری نانی صاحبہ پڑھ سکتی تھیں۔ مگر لکھنا نہیں جانتی تھیں۔ سوز۔ مرثیہ پڑھتی تھیں۔ اسی لئے پڑھنے کا شوق ہوا۔ دادی صاحبہ کا انتقال میری پیدائش سے بہت پہلے ہو گیا تھا۔

بعض عالموں کی کتابت سے ناواقفیت

مذہبی جذبہ بھی عجیب چیز ہے۔ نانی صاحبہ نے پڑھنا اسی جذبہ کے باعث شروع کیا۔ عرصہ دراز سے ترکستان اور وسطی ایشیا سے مسلمان نوجوان ہمارے ملک کی درسگاہوں میں علوم عربی کی تحصیل کے لئے آتے ہیں بہت سے فارغ التحصیل ہو کر وطن واپس چلے جاتے ہیں۔ مگر بعض ایسے بھی ہیں جو ہندوستان میں رہ کر اپنی زندگی درس و تدریس کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ اور ہمارے عربی مدارس میں معلمی

اور استادوں کے اہم فرائض انجام دیتے ہیں۔ غالباً یہ تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ وسطی ایشیا کے ان علماء میں بعض ایسے بھی ہیں جو لکھنا مطلق نہیں جانتے صرف ونحو۔ فقہ وحدیث کی انتہائی کتابیں پڑھاتے ہیں۔ مگر سند یا فتوے پر دستخط نہیں کرسکتے۔ خدا مہر لگانے کے طریقہ کا بھلا کرے۔ ثبت مہر کے رواج نے بہت سے عالموں کی پردہ پوشی کی ہے۔ خدا ان مقدس ہستیوں کو عدالت میں جاکر شہادت دینے سے محفوظ رکھے۔ ورنہ اظہار پر انگوٹھے کا نشان بھری عدالت میں لگانا پڑے گا۔
ایسے حضرات پچھلے پچاس برس میں دیوبند اور دیگر مقامات میں موجود تھے۔ ممکن ہے اسلاف کی یادگار کوئی معلم کسی عربی مدرسہ میں اب بھی اس صفت سے متصف موجود ہو۔ لکھنے سے نا واقفیت کی وجہ یہ ہے کہ ان حضرات کے نزدیک لکھنا سیکھنا اور اپنے قلم سے عبارت لکھنا داخلِ فنِ دستکاری ہے۔ جو اہلِ علم کی شان کے منافی ہے۔ پڑھنے کو علم اور لکھنے کو فن قرار دے کر دونوں کے درمیان یہ خیالی تفریق جو ہرگز کسی امتیاز پر مبنی نہیں ہے۔ قائم کرنا ایسی انوکھی بات ہے جو دنیا کو عبرت و حیرت میں ڈالے گی۔ خوش نویسی داخلِ فن ہے۔ مگر لکھنا تو علم کا ایسا ہی جزو ہے جیسا پڑھنا۔ اب تو مختصر نویسی[1] (Short Handwriting) کا زمانہ ہے جس کی مدد سے کثیر الاشغال اشخاص کے وقت میں بہت بچت ہوجاتی ہے۔ آج سے پندرہ بیس برس پہلے خود ہمارے ملک کے رہنے والے بعض عالم ایسے تھے جن کا خط بہت کچا تھا۔ تحریر دیکھئے تو معلوم ہوتا تھا کہ کسی بچے نے کاغذ پر مشق کی ہے۔ املا کی غلطیاں بھی ہوتی تھیں۔ وجہ صاف ظاہر ہے جب لکھنے کی مزاولت نہ ہوگی تو خط بھی کچا رہے گا اور املا کی غلطیاں بھی ہوں گی۔ مجھے بڑی مسرت ہے کہ کتابت۔ املا اور اردو ادب کی طرف ہمارے علماء نے خاص توجہ کی ہے۔ اور ان کی جماعت میں اب اردو زبان کے صحافت نگار۔ انشا پرداز اور ادیبوں کی کمی نہیں ہے۔ ہر عہد کی اپج نرالی رہی ہے۔ گذشتہ دور میں تحریر سے لاپروائی۔ ہمارے بعض عالموں کی ہی خصوصیت نہیں تھی شیکسپیر کے زمانہ میں بھی بدخطی شرافت کی علامت سمجھی جاتی تھی۔

---

[1] اردو میں مختصر نویسی کی ابتدا تو ہوگئی ہے۔ مگر اس فن میں ترقی کی ابھی بہت گنجائش ہے۔

میرا بچپن اور دادا صاحب کی تیسری شادی

دادا صاحب نے پہلی بی بی کے انتقال کے بعد دوسری اور دوسری بی بی کی وفات کے بعد تیسری شادی کی۔ پہلی بی بی سے صرف میرے والد سید واحد علی پیدا ہوئے۔ دوسری بی بی سے تین بیٹے تھے۔ حاجی میر فدا علی۔ میر نثار حسین اور حاجی میر آلِ حسن۔ اُن تینوں میں سے اب کوئی زندہ نہیں ہے۔ مگر بفضلہ اُن کی اولاد موجود ہے۔ دادا صاحب کی تیسری شادی مجھے یاد ہے۔ بڑھاپے کی شادی عموماً اولاد کی مرضی کے خلاف ہوتی ہے۔ میں نے اس تیسری شادی کے خلاف گھر میں چرچے سُنے ہوں گے۔ غالباً اُسی کا اثر تھا کہ عین شادی کی شام کو میں ایک اونچی دیوار پر چڑھ گیا تھا۔ ہمارے مکان کے نیچے راستہ جاتا تھا جو کوئی جان پہچان کا آدمی اُدھر سے گزرتا تھا میں پوچھتا تھا "کیوں صاحب؟ آپ نے اپنے والد کی شادی دیکھی تھی؟" اگر کسی نے جواب نہ دیا تو میں بھی خاموش ہو گیا۔ اگر کوئی ہنس کر نفی میں جواب دیتا تو میں کہتا "واہ صاحب واہ، آپ نے اپنے والد کی بھی شادی نہیں دیکھی۔ میں تو آج اپنے دادا کی شادی میں جانے والا ہوں۔"

اس شادی کا نتیجہ اچھا نہ نکلا۔ تیسری بی بی سے دادا صاحب کے اولاد ہوئی مگر زندہ نہیں رہی۔ تین ساڑھے تین برس بعد دادا صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد دادی صاحبہ کے خاندان والوں نے اُن کو بہکا کر جو مقدمہ بازی شروع کرائی تو اُس کا دور اس وقت تک جاری رہا جب ۱۹۰۸ء میں میں نے وکالت شروع کی۔ میرے نزدیک اولاد کو ہرگز یہ اصرار کرنے کا حق نہیں ہے کہ رنڈوا باپ دوبارہ عقد نہ کرے۔ اسی کے ساتھ میری سختی سے یہ بھی رائے ہے کہ دوسری یا تیسری شادی کے وقت جانبین کی عمر کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ فریقین کی عمر میں آٹھ دس سال سے زیادہ کا فرق نہ ہونا چاہیئے۔ پندرہ بیس سال یا اس سے زیادہ فرق ہونے کی صورت میں خاندانی پیچیدگیوں، دشواریوں اور بدمزگیوں کا پیدا ہونا قدرتی بات ہے۔ یہ

---

[1] ہمارے خاندان میں نام سے پہلے لفظ میر استعمال کیا جاتا تھا۔ میرے دادا میر ہادی علی اور پردادا میر قاسم علی کہلاتے تھے۔ والد صاحب نے نام کے پہلے لفظِ سید بڑھا کر اس کو اپنے نام کا جزو کر لیا تھا۔ موصوف اپنا نام سید واحد علی لکھتے تھے۔

لازمی نہیں ہے کہ پچاس سال سے زیادہ عمر کا آدمی اپنے آپ سے دس برس کم عمر والی عورت سے شادی کرے تو کوئی جھگڑا پیش نہ آئے۔ جھگڑوں کا سدِ باب نہ ہوا ہے نہ ہوگا۔ مگر پچاس پچپن برس کی عمر کے رنڈوے کا (بالخصوص جب پہلی بی بی سے اولاد بھی ہو) بیس پچیس سال کی کنواری لڑکی سے بیاہ رچانا دیدہ و دانستہ سانپ کے منھ میں انگلی دینا ہے۔

پچاس سال پہلے ریل کا سفر

میری ننھیال موضع نگریا سادات ضلع بریلی میں تھی۔ کندرکھی سے نگریا سادات پچیس میل ہے۔ ریل اوس زمانے میں نہ تھی۔ بریلی سے مرادآباد تک تو ریل ۱۸۷۷ء میں کھل گئی تھی۔ مگر ریل چندوسی ہوکر جاتی تھی۔ اور اودھ روہیلکھنڈ ریلوے کی ڈاک گاڑی (میل ٹرین) اسی لین پر چلتی تھی۔ پہلے اور دوسرے درجہ میں اوس زمانے میں بھی تقریباً ایسا ہی آرام تھا جیسا اب ہے۔ بلکہ اوس وقت ان دونوں درجوں کی کھڑکیوں میں خس کی ٹٹی لگی ہوتی تھی۔ ایک پیچ کھولنے سے ٹٹی کے اوپر سے پانی بہنا شروع ہو جاتا تھا اور ساری ٹٹی کو تر کر دیتا تھا۔ ڈیوڑھے درجہ یعنی انٹر میں صرف بڑے درجے کے ہندوستانی سفر کرتے تھے۔ بہت اونچے درجے کے ہندوستانی دوسرے درجہ میں سفر کرتے تھے۔ مگر دوسرے درجے میں دو آنے سے لے کر آٹھ آنے تک گوری رنگت کے یوریشین حضرات (Eurasian) سے بدمزگی کا ہمیشہ احتمال رہتا تھا۔ اوس زمانے میں یوریشین حضرات کا دعویٰ یہ تھا کہ اونھوں نے ملک ہند کو فتح کیا تھا اور اپنے کو تمام اون حقوق کا مستحق سمجھتے تھے جو انگلستان سے آئے ہوئے انگریزوں کو ہمارے ملک میں حاصل تھے۔ پہلے درجہ میں سفر کرنے والے خالص انگریز اپنا وقار قایم رکھنے کے لئے ضروری سمجھتے تھے کہ ہندوستانیوں کے ساتھ سفر نہ کریں۔ اٹھارہ بیس برس گزرے پہلے درجے کا ایک انگریز مسافر درجہ میں مسٹر حسن امام کے پیٹ پر اس لئے بیٹھ گیا تھا کہ وہ کسی اور درجے میں چلے جائیں۔ میرے ذاتی تجربہ کا کوئی خاص واقعہ قابل تذکرہ نہیں ہے۔ میں ۱۹۱۲ء میں اپنے صوبے کی قانونی کونسل کا ممبر منتخب ہوا۔ اس ممبری سے مجھے فائدہ پہونچا ہو یا نقصان۔ مگر ریل کے سفر میں ضرور سہولت ہو گئی۔ میں ہر سال گرمی کے موسم

میں تین چار دفعہ اسمبلی یا سرکاری کمیٹیوں کے کام کے سلسلہ میں شملہ جاتا ہوں۔ پہلے درجہ میں کالکاتک اکثر انگریزوں کا ساتھ ہوتا ہے جب سے لڑائی شروع ہوئی ہے یہ حالت ہے کہ لفٹنٹ سے لیکر میجر کے عہدہ تک جو انگریز میرے ہم سفر ہوتے ہیں وہ عموماً سر (Sir) کہہ کر مجھے خطاب کرتے ہیں۔ میرا سر روئی کا گالا جیسا سفید ہے۔ ممکن ہے یہ اس کا اثر ہو۔ تاہم ناخوش گوار واقعات ہندوستانیوں کو ریل کے سفر میں اب بھی پیش آتے ہیں۔ ۱۹۔اکتوبر ۱۹۴۱ء کو لفٹنٹ ایچ۔ بی۔ جانسٹن (H. B. Jhonston) نے امرت سر کے اسٹیشن پر فرنٹیر میل کو تین مرتبہ زنجیر کھینچ کر ۵ منٹ روکے رکھا۔ اسٹیشن کے افسروں کے ساتھ مزاحمت کی اون کو اور لفٹنٹ احمد کو برا بھلا کہا۔ بات صرف اتنی تھی کہ لفٹنٹ احمد کو درجہ میں سونے کے لئے نیچے جگہ مل گئی تھی اور لفٹنٹ جانسٹن کو اسٹیشن والوں نے اوپر کی سیٹ دی تھی۔ مقدمہ قایم ہوا اور مجسٹریٹ نے دسمبر کے مہینے میں لفٹنٹ جانسٹن کو تین مہینے کی قید محض اور پچاس روپیہ جرمانہ کی سزا[1] دی۔ خبر میں یہ بھی درج تھا کہ لفٹنٹ جانسٹن نے اپنے کرتوت پر اظہار تاسف مجسٹریٹ کی عدالت میں کیا۔ پچاس سال پہلے مقدمہ قایم ہوتا اور انگریز ملزم کا اس طرح کی سزا پانا ناقابل قیاس تھا۔ یورشین حضرات جو دوسرے درجے میں سفر کرتے تھے عام طور پر ریلوے یا کسی اور سرکاری محکمہ کے ملازم ہوتے تھے۔ کرایہ پر انھیں اپنی گرہ سے ڈبل خرچ نہ کرنا پڑتا تھا۔ بلکہ پاس اون کے پاس ہوتا تھا۔ جیب میں پاس رکھتے تھے اور اوڑے اوڑے پھرتے تھے۔ ریل نئی نئی چلی تھی۔ اوس کے پہلے ہم ہندوستانی حسب حیثیت رتھ، بہلی، تانگے (جس کو رہڑو بھی کہتے تھے) اور بیل گاڑی میں سفر کرنے کے عادی تھے۔ دوسرے درجے کا کرایہ بھاری تھا۔ دوسرے درجے کا ٹکٹ خرید نا خوش حال ہندوستانیوں کو بھی کھلتا تھا۔ اوس پر طرہ یہ ہے کہ درجہ میں کوئی یورشین صاحب بہادر مل گئے تو تو تو میں میں ناگزیر تھی۔ یورشین

---

[1] دیکھو ہندوستان ٹائمز مورخہ ۱۹۔دسمبر ۱۹۴۱ء صفحہ ۸۔ یکم فروری ۱۹۴۲ء کو بر طبق اپیل خان بہادر شیخ منظہر الحق ایڈیشنل سشن جج امرت سر نے ملزم کی سزائے قید صرف اوس قدر رکھی جتنی وہ بھگت چکا تھا۔ بقیہ حکم سزا منسوخ کر دیا۔ دیکھو اخبار اسٹیٹسمین مورخہ ۳ فروری ۱۹۴۲ء

حضرات ہندوستانیوں کے ساتھ (ہم لوگوں کے لئے اس وقت نیٹیو کا لفظ رائج تھا) سفر کرنا اپنے لئے سخت توہین کا باعث سمجھتے تھے۔ اس لئے ہندوستانیوں کو دوسرے درجہ میں آنے سے مانع ہوتے تھے۔ بڑے اسٹیشنوں پر ٹکٹ کلکٹر یا اسٹیشن ماسٹر سے داد فریاد کی جاسکتی تھی ـــ مگر یوریشین حضرات تمام ریلوں اور ان کے انتظامی صیغوں پر چھائے ہوئے تھے۔ ٹکٹ کلکٹر اور اسٹیشن ماسٹر عموماً خود بھی یوریشین ہوتے تھے۔ وہ شکایت کیا سنتے

- ہم نے چاہا تھا کہ حاکم سے کریں گے فریاد
وہ بھی کم بخت ترا چاہنے والا نکلا!

ایک اور بات جس سے ہم ہندوستانیوں کو تکلیف ہوتی تھی یہ تھی کہ بہت سے اوّل اور دوسرے درجوں پر لکھا رہتا تھا کہ وہ درجہ یورپین حضرات کے لئے مخصوص ہیں۔ آج سے تیس برس پہلے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ دوسرے درجہ کے ڈبے میں سات آٹھ ہندوستانی لت پت داخل ہو رہے ہیں بمشکل سے بیٹھنے کو جگہ مل رہی ہے۔ اور برابر

یورپین کی اصطلاحی تعریف

کے درجہ میں جو یورپینوں کے لئے مخصوص تھا۔ ایک یا دو برائے نام گوری رنگت کے آدمی بڑے آرام اور اطمینان سے سفر کر رہے ہیں۔ انٹر بھی یورپینوں کے لئے مخصوص کر دئے جاتے تھے جس سے ہندوستانیوں کی تکلیف میں اور اضافہ ہو جاتا تھا۔ انٹر کے سفر میں ہر وہ شخص جو کوٹ پتلون پہنے اور انگریزی ٹوپی دیئے ہو یورپین سمجھا جاتا تھا۔ اس سے فائدہ بیشتر ہمارے ہندوستانی عیسائی بھائی اٹھاتے تھے۔

ایک قصہ یاد آیا۔ آج سے چالیس پینتالیس برس پہلے کی بات ہے علی گڈھ کالج کے ایک طالب علم جو خوب گورے چٹے اور کرکٹ ٹیم کا ممبر ہونے کے سبب کوٹ پتلون پہنتے اور ہیٹ لگاتے تھے ایک چھوٹے اسٹیشن پر دوسرے درجے میں داخل ہونا چاہتے تھے۔ اسباب میں لوٹا بھی تھا۔ پورے درجے پر ایک چار آنے والی رنگت کے صاحب بہادر نے قبضہ کر رکھا تھا وہ مانع آئے۔

علی گڈھ کا کھلاڑی دروازہ کھول اندر گھس گیا۔ اسباب رکھوایا اور ایک سیٹ پر پاؤں پھیلا کر بڑے آرام سے بیٹھ گیا۔ منٹ دو منٹ میں جب ریل چھوٹ گئی تو کھلاڑی صاحب اُٹھے۔ ہینڈ بیگ کھولا اُس میں سے آئینہ نکالا۔ پھر اُٹھ کر صاحب بہادر کے برابر جا کر بیٹھے۔ آئینہ اپنے چہرے کے سامنے رکھ کر اپنی صورت دیکھی۔ پھر آئینہ صاحب بہادر کی طرف بڑھا کر کہا یورپین صاحب ذرا آئینہ میں اپنی اور میری دونوں کی صورت دیکھئے اور پھر بتائیے کہ گوری رنگت آپ کی ہے یا میری۔ صاحب بہادر خون کے گھونٹ پی کر یہ کہہ کر خاموش ہو گئے کہ اس سے کیا ہوتا ہے۔ علی گڈھ کے طالب علم کی جرأت اور ہمت کی اُن کے دوستوں نے بڑی داد دی۔ اور وہ یقیناً اُس زمانہ میں تعریف کے مستحق تھے۔ مگر بڑی بات یہ تھی کہ خدا کے فضل سے لمبے تڑنگے اور ہاتھ پاؤں کے مضبوط تھے۔ اگر بات سے کام نہ چلتا تو یہ لات کے لئے بھی تیار تھے۔

اُس زمانہ کے ریل کے سفر میں بڑی بار ہم ہندوستانیوں کی یہ تھی اور ایک حد تک اب بھی ہے کہ عموماً ہمارا حریف ڈیل ڈول اور جسمانی طاقت میں ہم سے زیادہ قوی ہوتا ہے۔ ہاں تو اُس زمانہ کے شریف اور کھاتے پیتے ہندوستانی انٹر میں سفر کرتے تھے۔ بقیہ کے لئے تیسرا درجہ تھا۔ پائخانہ اُس عہد میں نہ انٹر میں تھا نہ تیسرے درجہ میں۔ اس معاملۂ خاص میں ان دونوں درجوں کے مسافروں کی بابت محکمہ ریلوے کا غالباً یہ خیال تھا کہ وہ ملکوتی صفات رکھتے ہیں۔ انسان صرف پہلے اور دوسرے درجے کے مسافر ہیں جن کی ضروریات کے لئے ہر درجہ میں غسل خانہ موجود تھا۔ لفظ غسل خانہ سے اصلی مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ جب ہم ہم تھے یعنی ہماری پُرانی تہذیب و شائستگی کا رواج تھا تو رفع حاجت کے لئے پائخانہ اور غسل کرنے کے لئے غسل خانہ ہوتا تھا۔ دونوں چیزیں علیحدہ علیحدہ ہوتی تھیں۔ مغربی تہذیب نے یہ کفایت شعاری نکالی ہے کہ جائے ضرور اور جائے غسل دونوں ایک کمرہ میں ہوتی ہیں۔ اور اس کمرہ کا نام جس میں یہ دونوں دھاریں بہتی ہیں غسل خانہ رکھ دیا ہے۔ ریلوے کے محکمے نے تو یہ جدت طرازی کی ہے کہ انگریزی مثل کی بموجب کہ زبان انسان کو اس لئے عطا کی گئی ہے کہ الفاظ کا ملبوس پہنا کر اپنا مطلب چھپا سکے۔ اس کمرہ

کا نام سنگھار کا کمرہ رکھدیا ہے۔

کندرکھی میں ریلوے اسٹیشن بنوانے کی تدابیر

کندرکھی سے مرادآباد بارہ میل ہے ۱۸۷۵-۷۶ء میں جب ریل کی سڑک تیار کی جارہی تھی۔
دادا صاحب اور قصبہ کے سر برآوردہ حضرات کو معلوم ہوا کہ ریلوے کا ارادہ کندرکھی میں اسٹیشن بنانے کا نہیں ہے۔ ریلوے کا خیال تھا کہ کندرکھی سے مرادآباد جانے والے مسافروں کی تعداد اتنی زیادہ نہ ہوگی کہ اسٹیشن کے اخراجات نکل آئیں۔ دادا صاحب اور اون کے ساتھیوں نے کوشش کرکے کندرکھی میں اسٹیشن بنوایا۔ اور اس بات کے ضامن ہوئے کہ چھ مہینہ تک اگر اسٹیشن کا خرچ زیادہ اور آمدنی کم ہو تو وہ کمی کو اپنی جیب سے پورا کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ مرادآباد جانے والے مسافروں کی تعداد کم تھی۔ اس لئے دادا صاحب اور اون کے احباب نے چندہ کرکے ایک رقم جمع کی۔ مزدور پیشہ لوگوں کو اُجرت دے کر ریل میں مرادآباد بھیجتے تھے۔ تیسرے درجہ کا مرادآباد کا کرایہ اوس زمانہ میں سات پیسے تھا (اب ٹھیک دوگنا یعنی ساڑھے تین آنے ہے) چندہ کی رقم سے مزدوروں کا مرادآباد تک کا ٹکٹ لیا جاتا تھا۔ مرادآباد سے وہ پیدل واپس آتے تھے۔ اور واپسی کا کرایہ یعنی سات پیسے اون کو بطور اجرت دیئے جاتے تھے۔ چھ مہینے تک یہ حالت قایم رہی۔ اور کندرکھی اسٹیشن کی آمدنی خرچ سے دوگنی ثابت ہوئی۔ مستقل طور سے جب اسٹیشن بن گیا تو اجیر لوگوں کو مرادآباد بھیجنا بند کردیا۔

تعجب ہے کہ اوس زمانہ میں بلکہ اوس کے بعد بعض والیانِ ملک نے اپنی ریاست میں یا ریل نہیں نکلنے دی یا اوس کی مخالفت کی۔ وہ کنویں کا مینڈک بنا اور سب سے الگ تھلگ رہنا چاہتے تھے۔ اون کو معلوم نہ تھا کہ چالیس پچاس سال کے بعد وہ زمانہ آجائے گا کہ بے تار کے تار چلیں گے اور انسان تختِ سلیماں پر اپنی وراثت کا حق ثابت کرکے اُڑا اُڑا پھرے گا۔ ان والیانِ ریاست کے مقابلے میں دادا صاحب اور ان کے ساتھیوں کی دُور اندیشی قابلِ داد ہے۔

۱۸۹۴ء[1] میں اودھ روہیلکھنڈ ریلوے کی مرادآباد اور بریلی کی وہ درمیانی شاخ کھُلی جو

[1] اس نوٹ کی عبارت صفحہ ۱۲۱ پر دیکھیے۔

رامپور ہوکر جاتی ہے۔ میری ننھیال نگریا سادات کا اسٹیشن اس شاخ پر واقع ہے۔ اب تو عرصہ دراز سے یہ شاخ اصلی لین (main line) کا کام دے رہی ہے۔ لکھنؤ اور سہارنپور کے درمیان جو ریلیں چلتی ہیں وہ اسی لین پر ہوکر گزرتی ہیں بہ ۱۹۲۰ء کے قبل کندرکھی سے نگریا کا سفر بصورت سقر تھا۔ والدہ صاحبہ ہر سال جاڑوں میں نگریا سادات جاتی اور مہینہ ڈیڑھ مہینہ وہاں رہتی تھیں۔ ہم بہلی یا پردہ دار تانگہ میں جاتے تھے۔ علی الصباح کندرکھی سے چل کر رات کے سات آٹھ بجے نگریا سادات پہونچتے تھے۔ دن کا کھانا ساتھ لے کر چلتے تھے۔ راستہ کچا تھا۔ بیچ میں رام گنگا پڑتی تھی۔ کچھ مقامات پر دونوں طرف آگ کے پودے ملتے تھے۔ آگ کا پھول جاڑوں میں آتا ہے۔ ان پھولوں کو دیکھ دیکھ کر ہمیشہ میرے سر میں درد ہو جاتا تھا۔ کبھی کبھی شاہ آباد ہو کر بھی جاتے تھے۔ جو ریاست رامپور کی ایک تحصیل ہے۔ اور جو کسی زمانہ میں کچھ عرصہ تک ریاست رامپور کا دار الحکومت بھی رہا ہے۔ اوس زمانہ میں مشہور تھا کہ کندرکھی کے جس سید کو کوئی ہم قوم بیٹی دینے پر آمادہ نہ ہو وہ شاہ آباد جا کر بیاہ رچائے اور بنّو لائے۔ ایک مرتبہ نگریا سادات کے راستہ میں موضع کھرسول پڑا۔ مؤذن نے ظہر کی اذان دی۔ بڑی بے ہنگم۔ کریہہ اور سخت آواز تھی۔ معلوم ہوتا تھا ہنگامۂ قیامت کی ابتدا اسی گاؤں سے ہوگی۔ اور حضرت اسرافیل یہیں سے صُور پھونکیں گے۔

ایک سال والدہ صاحبہ اپنے میکے گئیں۔ میری عمر پانچ چھ سال کی ہوگی۔ میری ایک خالہ مجھ سے عمر میں چار پانچ سال بڑی تھیں۔ ننھیال میں میری آؤ بھگت اور نانا نانی کا لاڈ پیار اون کو پسند نہ آیا۔ ایک دن کسی بات پر میرا اون کا جھگڑا ہو گیا۔ مجھے سب بزرگوں کی چاہت نے دیدہ دلیر کر دیا تھا۔ سیدھا نانی صاحبہ کے پاس پہونچا اور خالہ کی شکایت کی۔ اُنھوں نے بیٹی کو سمجھایا

لہ (نوٹ متعلق صفحہ ۲۰) اس ریلوے کا انتظام گورنمنٹ نے اپنے ہاتھ میں رکھا تھا۔ کسی کمپنی کو ٹھیکہ نہیں دیا تھا۔ تعجب ہے کہ ہر بات گورنمنٹ کے ہاتھ میں ہونے کے باوجود انتظام خراب تھا۔ ریلوے کا مختصر انگریزی نام او۔آر۔آر تھا۔ لوگ طنزاً اُسے اولڈ اینڈ راٹن (Old and Rotten) یعنی سڑی بسی ریلوے کہتے تھے۔

کہ بھانجے سے لڑتی ہو۔ دیکھو وہ تو تمہارے گھر آیا ہے اوس کی خوب خاطر کرو۔ خالہ نے جل کر کہا ایسے لاڈلے ہیں تو اپنے گھر سے ہی کیوں نکلے۔"

میری بسم اللہ میری بسم اللہ چھٹے سال میں ہوئی اور میں نے پڑھنا شروع کردیا۔ بسم اللہ میاں جی عزیز الدین نے پڑھائی تھی۔ موصوف اوس مسجد کے امام بھی تھے جو دادا صاحب کے کھنڈسار کے کارخانہ کے قریب تھی۔ دادا صاحب نماز عموماً اسی مسجد میں پڑھتے تھے۔ مجھے بھی خیال ہوتا ہے اور سب رشتہ داروں کی زبانی سنا کہ میرا ذہن اور حافظہ اچھا تھا استاد مجھے ہونہار سمجھتے تھے۔ یہ خوب یاد ہے کہ جس دن صبح کو دیر سے سوکر اُٹھتا تھا غل شور کرتا اور روتا تھا کہ مجھے پہلے کیوں نہیں جگا یا مکتب جانے کو دیر ہو جائے گی۔ والدہ صاحبہ کی محبت اسے کب گوارا کرسکتی تھی کہ مجھے سوتے کو جگا دیں اور اس طرح میری نیند میں خلل پڑے۔ میں شریر بالکل نہیں تھا۔ چھ سات سال کی عمر میں گیارہ بارہ سال کے عمر کے لڑکے جیسی متانت تھی۔ اپنے ہم عمروں میں نہ کھیلتا تھا۔ اپنے سے پانچ چھ سال زیادہ عمر کے لڑکوں کے ساتھ کھیلنا مجھے پسند تھا۔ ایک شرارت ضرور کرتا تھا، ہمارا گھرانا دولت مند نہ تھا۔ مگر جب تک دادا صاحب زندہ رہے۔ فارغ البالی سے گزر ہوتی تھی۔ اُجلا خرچ تھا۔ میں اس تاک میں رہتا تھا کہ جو کھانا ہمارے گھر معمولاً پکتا تھا اوس میں آج کون چیز نہیں پکی ہے۔ مثلاً ایک وقت ترکاری نہ ہوتی تو میں والدہ صاحبہ سے کہتا کہ میرا جی تو شلجم کا قلیہ کھانے کو چاہتا ہے وہ سن کر بہت افسوس کرتی اور کہتی تھیں مجھے کیا معلوم تھا کہ میرا بچہ ترکاری کھائے گا۔ اب اوس کا جی میلا ہوگا۔ خبر نہیں پڑوس میں کہیں ترکاری پکی ہے یا نہیں[1]۔

دوسری حرکت میں یہ کرتا تھا کہ جب کوئی بات مجھے زیادہ ناگوار ہوتی تھی تو بھوک ہڑتال کر دیتا تھا۔ یعنی کھانا نہ کھاتا تھا۔ باپ اور ماں دونوں پریشان ہو جاتے تھے اور چاہتے تھے کہ میں فاقہ کشائی کروں۔ والد صاحب زیادہ لاڈ پیار کے قائل نہ تھے اون کا خیال تھا اور بجا خیال تھا کہ بیجا

---

[1] قصباتی زندگی کی یہ ایک پُرلطف شان ہے کہ اگر کوئی چیز اپنے گھر نہ پکی ہو تو پڑوس کے عزیزوں کے یہاں سے منگوا لینے میں تامل نہیں ہوتا۔

نازبرداری سے بچّے بگڑ جاتے ہیں۔ مگر والدہ صاحبہ میری ہڑتال کے زمانہ میں کانٹوں پر لوٹتی تھیں عزیزوں کو بلاتی تھیں کہ رضل کو سمجھاؤ۔ والد صاحب سے جھڑپ ہو جاتی تھی کہ بچہ بھوکا ہے۔ اور تمہارے کان پر جوں نہیں چلتی۔ جب تک میں کھانا نہ کھاتا خود بھی فاقہ سے رہتی تھیں۔ اب یہ باتیں یاد کرکے ہاتھ ملتا ہوں اور اپنے کو ملامت کرتا ہوں۔ سچ ہے قدرِ ہر نعمت است بعد زوال۔ ترجمہ۔ نعمت کی قدر اوس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ نعمت ہم سے چھن جائے۔

کندرکھی کے حالات

نقش ہے سنگِ آستاں پہ ترے ۔۔۔۔۔۔ داستاں اپنی جبہ سائی کی (سالک)

مسلمانوں کے خاندان

کندرکھی میں بہت سے شریف خاندان آباد ہیں۔ شرفا میں سب سے بڑی آبادی سیدوں کی ہے۔ ایک زمانے میں شیخ بھی خوش حال تھے۔ مقدمہ بازی کا چسکا پڑ گیا اور جائداد کا بڑا حصہ اسی چسکے کی نذر ہوا۔ میرے بچپن میں مولوی عبدالحکیم صاحب شیخوں میں بڑے ذی استعداد آدمی تھے۔ طبابت بھی کرتے تھے۔ غیر مقلد تھے۔ برادری میں ان کی بڑی عزت تھی۔ ایک دن مولوی صاحب نے اپنے ایک ناخواندہ عزیز سے جو کھیتی کرکے اپنا اور اپنے کنبہ کا پیٹ پالتے تھے اور جن کی پہونچ صرف ہل بیل۔ پھاوڑے اور کدال تک تھی۔ کہا میں نے آپ کو کبھی نماز پڑھتے نہیں دیکھا۔ اگر نماز آتی ہو تو پڑھئے۔ نہ آتی ہو تو میں آپ کو سکھا دوں۔ جاہل عزیز کچھ دیر تک مولوی صاحب کا منھ تکتے رہے پھر نظریں نیچی کرکے بولے :-
"مولوی جی تم سے ہمارے گھرانے کا نام ہے۔ تم جو کہوگے میں کروں گا۔ مگر مولوی جی مجھ سے یہ کبھی نہیں ہوگا کہ سر نیچے کروں اور چوتڑ اوپر" (سجدے سے مراد تھی) مغلوں کے خاندان میں آدمی تو زیادہ نہ تھے مگر تھے سب پڑھے لکھے۔ مرزا منوّر بیگ دادا صاحب کے ہم عمر تھے اور رکھنڈسار کا کاروبار کرتے تھے۔ مرزا نظر بیگ صاحب نائب تحصیلدار تھے۔ جب میں وکالت کرتا تھا پنشن لے چکے تھے اور کندرکھی میں رہتے تھے۔ سادات میں حکیم سید حسین صاحب بڑے اچھے طبیب تھے۔ عربی اور

فارسی کی استعداد اچھی تھی۔ طبابت میں اس قدر شغف تھا کہ میں نے اپنے بچپن میں موصوف کو شیخ بو علی سینا کی مشہور کتاب قانون کے ضروری مقامات بہ آواز بلند حفظ کرتے سُنا ہے۔ موصوف خان بہادر سید ضیا الحسن صاحب پنشن یافتہ جج لکھنؤ چیف کورٹ کے حقیقی چچا تھے۔ حکیم صاحب کے بڑے بھائی مولوی ابوالحسن صاحب نے غدر کے بعد وکالت کا امتحان پاس کیا۔ مرادآباد میں وکالت کرتے تھے اور وہیں کی سکونت اختیار کر لی تھی۔ موصوف کے تین بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے مولوی سید حسن صاحب مرادآباد کے نامور وکیل تھے۔ جن کا تذکرہ کسی دوسری جگہ کیا جائیگا۔ دوسرے بیٹے مولوی نور الحسن صاحب عرف نوشہ میاں جائداد کا انتظام کرتے ہیں۔ تیسرے بیٹے خان بہادر سید ضیا الحسن لکھنؤ چیف کورٹ کے پنشن یافتہ جج ہیں۔ یہ دونوں بھائی مرادآباد میں رہتے ہیں۔ مولوی ہدایت علی صاحب اسی خاندان کے ایک نامور بزرگ تھے۔ جن کا زمانہ آج سے سو سوا سو برس پہلے تھا۔ عربی کے جیّد عالم اور فارسی کے اچھے انشا پرداز تھے۔ خوش فکر شاعر تھے۔ تمکین تخلص تھا۔ شعر فارسی میں کہتے تھے۔ اون کا ضخیم فارسی دیوان خود اون کے قلم کا لکھا ہوا موجود ہے۔ اور میں نے اشعار کا انتخاب اصل دیوان سے کیا ہے۔ افسوس ہے کہ چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ بزرگوں کے ادبی ذخیروں کے تحفظ کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اون کو طبع کرا دیا جائے۔ ورنہ وہ زمانہ کی دستبرد سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ مولوی صاحب عرصہ تک منصف رہے۔ پنشن لینے کے بعد کندرکھی میں رہتے تھے۔ اور علمی اور ادبی مشاغل میں اون کا وقت گزرتا تھا۔ فارسی شعراء کے کلام کا انتخاب چار ضخیم جلدوں میں خود اون کے قلم کا لکھا ہوا موجود ہے۔ کتاب کا نام "ہدایت الشعراء" ہے۔ کیسے افسوس کی بات ہے کہ چاروں جلدیں اسوقت تک غیر مطبوعہ ہیں۔ اگر اشاعت کا انتظام جلد نہ ہوا تو تلف ہو جائیں گی۔ فارسی شعراء اساتذہ کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ ان کے کلام کا انتخاب کرنا موجودہ زمانہ میں بھی کچھ آسان کام نہیں ہے۔ مگر یہ یاد رہے کہ آج سے سوا سو برس پہلے چھپی ہوئی کتابیں بہت کم ملتی تھیں۔ اوس زمانہ میں شعراء ایران و ہند کا کلام بہم پہنچانا بجائے خود نہایت دقت طلب تھا۔ مگر تعجب اس پر

ہوتا ہے کہ مولوی ہدایت علی کا انتخاب معمولی انتخاب نہیں ہے بلکہ موصوف نے تمام تر یہ التزام رکھا ہے کہ مشہور فارسی جملوں، محاوروں اور مخصوص طرزِ ادا کے متعلق اساتذہ نے جو جو اشعار لکھے ہیں اور استعارے باندھے ہیں یا تشبیہیں دی ہیں اون سب کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے۔ ان چاروں جلدوں میں سے ایک جلد میری نظر سے گزری ہے۔ پُرانے بانس کے کاغذ پر جو اپنی پائداری کے لئے مشہور ہے۔ یہ جلد جس میں چھ سو چالیس صفحے ہیں اوّل سے آخر تک ایک قلم اور روشنائی کی لکھی ہوئی ہے۔ صرف ایک صفحہ پر جو میں نے اچانک کھولا جن شاعروں کا کلام درج تھا اون کے نام یہ ہیں۔ انوری، مولانا روم، شوکت، کمالِ خجند، حافظ، سلمان، رضا، شفائی، عرفی، وحید، محتشم، ہاتفی، کاتبی، جامی۔ نمونہ کے طور پر موصوف کے دیوان سے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں،

رنگ و بُو باز دو گل و گلزار پیش روئے تو — نیست بیجا یار گر رشکِ چمن گویم ترا

گرچہ صائب غزلے گفت ازیں بہ تمکیں — غزلے بہتر ازیں در ہمہ دیوان تو نیست

بر زمیں از دودِ آہم آسمانِ دیگر ست — از غبارِ خاطرِ من سایہ بانِ دیگر ست

قاصدش پیغامِ صلح آورد من بوسم لبش — زانکہ ایں پیغامِ شیریں از زبانِ دیگر ست

آں صیدِ خلق گردد و ما صیدِ چشمِ تو — نسبت چساں دہیم بہ چشمت غزالہ را

غالب کا اعتراض تمکین پر

مولوی ہدایت علی اس پایہ کے شاعر تھے کہ غالب نے اپنے ایک خط[1] میں اون کا تذکرہ کیا ہے۔ مرزا سے کسی ہندی شاعر کے فارسی کلام کے بارے میں کلمۂ خیر کی توقع رکھنا ایسا ہی بعید از قیاس ہے جیسا راجہ اندر کا پریوں کے اکھاڑے میں اہنسا پر وعظ دینے کے لئے مہاتما گاندھی کو مدعو کرنا۔ مرزا کسی ہندی شاعر کے فارسی کلام کو قابلِ سند نہ سمجھتے تھے۔ اس کلیہ میں اُنھوں نے صرف دو مستثنیات قرار دئے تھے ایک امیر خسرو اور دوسرے وہ خود۔ چودھری عبد الغفور سرور کے نام ایک خط[2] میں فرماتے ہیں "بہرحال حضرت کو یہ معلوم ہے کہ میں اہلِ زبان کا پیرو اور ہندیوں میں سوائے امیر خسرو دہلوی کے سب کا منکر ہوں۔ جب تک قدما یا متاخرین میں مثل صائب و کلیم و اسیر و حزیں کے کلام میں

---

[1] دیکھو ادبی خطوط غالب - مرتبہ مرزا محمد عسکری بی اے مطبوعہ انوار المطابع لکھنؤ صفحہ ۸۶ [2] ایضاً صفحہ ۱۷

کوئی لفظ یا ترکیب نہیں دیکھ لیتا اوس کو نظم اور نثر میں نہیں لکھتا۔"

حد سے بڑھی ہوئی خودستائی کے باعث مرزا چاروں طرف سے حریفوں اور رقیبوں کے نرغہ میں آ گئے۔ کلکتہ میں اعتراضات کی بوچھاڑ ہوئی۔ خود دہلی میں اون پر چوٹیں ہونے لگیں۔ جن حضرات نے برہانِ قاطع کو مرتب کیا یہ سمجھنا چاہیئے کہ مرزا کے مقابلہ کے لئے اوبھوں نے حریفوں کی فوج آراستہ کی تھی مرزا نے قاطع برہان لکھ کر حریفوں کے وار کو نہ صرف روکا بلکہ غنیم کے لشکر میں گھس کر اپنے حملوں کی تیزی کو اور بڑھا دیا معلوم ہوتا ہے اس جنگ میں مولوی ہدایت علی تمکین نے مرزا کے مخالفوں کا ساتھ دیا۔ مرزا کی ذہنیت یہ تھی کہ اون کے عقیدت مندوں کا اون کی خدمت میں یہ عرض کرنا کہ۔ مصرعہ

تمھیں چاہوں تمہارے چاہنے والوں کو بھی چاہوں

کافی نہ تھا۔ بلکہ مرزا سے اظہارِ عقیدت کے ساتھ اون کے حریفوں کو لچر اور پوچ کہنا بھی ہر فارسی داں کا مرزا کی نظر میں فرض تھا۔ یہ بڑا سخت امتحان تھا جس میں گنے چنے عقیدت کیشوں کے سوا اور کوئی پورا نہ اُترا تمکین کے بارے میں مرزا لکھتے ہیں: "مولوی ہدایت علی تمکین کا آج تک میں نے نام نہیں سنا تھا۔ چھپے ہوئے رستم ہیں۔ صائب اگرچہ اصفہانی نژاد تھا۔ مگر وارد شاہجہان آباد تھا۔ انتقام کشیدن و انتقام گرفتن دونوں بول گیا۔ مولوی صاحب لچ فارسی بولتے ہیں ملاحول ولا قوۃ الا باللہ۔" یہ عجب لطف ہے کہ صائب کو مرزا مسلم الثبوت شاعر بھی مانتے ہیں۔ اور انتقام کشیدن اور انتقام گرفتن کے بارہ میں تعریض بھی کرتے ہیں۔ قرینہ یہ ہے کہ برہان قاطع کے ترتیب دینے والوں نے دونوں محاوروں کو صحیح مانا تھا۔ بس پھر کیا تھا مرزا نے مصرعہ۔ باطل ست آنچہ مدعی گوید۔ پر عمل کیا اور تنہا تمکین کی ہی خبر نہیں لی۔ بلکہ صائب پر بھی اعتراض جڑ دیا۔ اگر ہندوستان آنے کے قصور میں صائب درجہ اُستادی سے گر گئے تو پھر معقولیت اور مذاقِ سلیم۔ زبان دانی کا تاج اون بزرگوں کے سر پر کس طرح رکھ سکتے ہیں۔ جو مرزا کی طرح ہندوستان میں پیدا ہوئے پلے بڑھے۔ جن کی ساری تعلیم ہندوستان میں ہوئی اور جن کو ایران کی بجائے کبھی خلیج ایران کے

ورشن بھی میسر نہیں ہوئے۔ مرزا خفگی میں جو چاہیں فرمائیں۔ انتقام کشیدن اور انتقام گرفتن دونوں کی سند صائب کے علاوہ اور ایرانی اساتذہ کے کلام میں بھی موجود ہے۔

شعر۔ انتقامِ خویش خونِ بے گناہاں می کشد
نیستم آگہ کہ بعد از من چہ بر قاتل گذشت (سلیم)

شعر۔ نیکی برائے اہل کرم چوں قبول نیست
نتواں زخصمِ خویش گرفت انتقامِ خویش (طاہر وحید)

شعر۔ انتقام از خصم نگرفتن صفائے باطن ست
صیقلِ آئینہ باشد دل زکیں بر داشتن (سفید بلخی)

حاجی سید علی رضا صاحب کی بھی اُن کے علم و فضل کے سبب بڑی عزت تھی طبابت کرتے تھے۔ بڑے ذہین تھے۔ مگر طبابت کو مستقل پیشہ نہیں بنایا۔ سادات میں تیسرے طبیب حکیم سید محمد حسین صاحب تھے۔ جن کے مجرب نسخوں اور دواؤں کی قدر تھی۔ مفتی غلام مرتضیٰ صاحب اور میر نیاز حسین صاحب ایک دوسرے کے حریف سمجھے جاتے تھے۔ مفتی صاحب بڑے سلیم الطبع تھے۔ برادری میں بہت کم آتے جاتے تھے۔ میر نیاز حسین خوش فکر شاعر تھے۔ مگر سارا وقت ہجویں لکھنے میں صرف کرتے تھے۔ مولوی سید محمد حسن صاحب علم و فضل میں قصبہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ پہلے رامپور اور پھر پٹیالہ میں ملازم رہے۔ معمولی بات چیت میں عربی کے غیر معروف اور مشکل الفاظ بولنے کے عادی تھے۔ موصوف کا تعلق اُس خاندان سے تھا جو سرسی سے آکر کندرکھی میں آباد ہو گیا ہے۔ بقیہ سید صاحبان جن کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ قاضی عبدالرزاق صاحب کی اولاد میں تھے، چودھری غلام مرتضیٰ صاحب بڑے خوش مزاج اور مہمان نواز بزرگ تھے۔ جب میں کندرکھی آتا تھا تو کبھی کبھی میرے لئے خاص چیزیں پکوا کر بھیجتے تھے

بڑی عمر ہوئی آٹھ سال ہونے آئے نوّے برس کی عمر میں اُنھوں نے وفات پائی۔

کندرکھی کے ہندو

ویش قوم میں لالہ منالال صاحب اور لالہ سوبھارام صاحب ممتاز تھے۔ اوس عہد کے سب شریف ہندوؤں اور مسلمانوں کے رہنے سہنے اور بول چال کے طریقے ملتے جلتے تھے۔ لالہ منّالال صاحب کی طرزِ گفتگو سے معلوم ہوتا تھا کہ غدر کے بعد کی اُجڑی ہوئی دہلی کے رہنے والے ہیں۔ کایستھوں کے دو معزز خاندان تھے ایک خاندان قصبہ میں پچھم طرف رہتا تھا اور دوسرا پورب طرف۔ پُوربی خاندان کا پیشہ سرکاری ملازمت تھا۔ پچھم کے خاندان کے کرتا دھرتا لالہ بلاقی چند تھے۔ میرے ہوش کے پہلے اون کا انتقال ہوگیا تھا۔ اون کے بھائی لالہ بلدیو سہائے صاحب میرے بچپن میں زندہ تھے۔ پورے کا پورا خاندان کندرکھی کی سکونت ترک کرکے مرادآباد چلا گیا تھا اور شہر میں سکونت رکھتا تھا۔ لالہ بلاقی چند اور لالہ بلدیو سہائے اپنے زمانہ میں ضلع کے سب سے بڑے زمینداروں میں تھے۔ کندرکھی میں بہت بڑا خاندانی مکان اب بھی موجود ہے۔ دونوں صاحبوں کے پوتے اب موجود ہیں۔ جیسے جیسے بیٹے پوتوں کی تعداد بڑھتی گئی جائداد گھٹتی گئی۔ یہ ہم ہندو مسلمانوں کے قانونِ وراثت کا لازمی نتیجہ ہے۔ فرض کیجئے زید کے پاس خاصی بڑی زمینداری ہے۔ جس کی آمدنی بیس ہزار روپیہ سالانہ ہے۔ اگر زید کے بیس پوتے ہوئے اور یہ زمینداری بحصّہ مساوی پوتوں کے درمیان تقسیم ہوگئی تو ہر پوتے کی آمدنی ہزار روپیہ سالانہ ہوگی۔ یعنی تخمیناً اسّی روپیہ ماہوار۔ اگر زید مسلمان ہے اور اوس کے بیٹیاں پوتیاں بھی ہیں تو آمدنی اور بھی کم ہو جائے گی۔ اس تذکرہ سے میری غرض یہ نہیں ہے کہ کسی مذہب کے قانونِ وراثت کا سُقم ثابت کیا جائے۔ مقصود صرف یہ جتانا ہے کہ آئندہ فلاکت کا سدِّباب اوس وقت ہو سکتا ہے جب یا آئندہ ضبطِ تولید کا قانونی انتظام کیا جائے۔ یا گورنمنٹ ہر خاندان کے کُل مردوں اور عورتوں کو اون کی قابلیت کے بموجب افراد کاسبہ بنانے کی ذمہ داری اپنے اوپر لے۔

میر ہادی علی صاحب

میرے دادا میر ہادی علی صاحب جہاں اقبال مند اور صاحب حوصلہ تھے

زندہ دل بھی تھے۔ کند رکھی میں جو صاحب کمال آتا تھا اوس کے ساتھ سلوک کرتے تھے۔ مجالسِ محرم
و میلاد شریف کی عقیدت مندانہ شرکت اون کو محفلِ رقص و سرود میں جانے سے مانع نہ ہوتی تھی۔
اور کیوں مانع ہوتی۔ سچ تو یہ ہے کہ شعر

زندگی زندہ دلی کا نام ہے　　　　مُردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

اپنے یہاں کی تقریبوں میں دل بستگی کا سامان ضرور کرتے تھے۔ میری ختنہ اور منجھلے چچا صاحب
کی شادی میں رقص و سُرود کی خوب خوب محفلیں ہوئیں۔ طائفوں (گانے والیوں) کا انتظام اون کے
دوست میر ذاکر حسین صاحب کرتے تھے۔ زنانی محفل میں بریلی اور رامپور کی ڈومنیاں ناچتی گاتی
تھیں۔ نواب کلب علی خاں کے زمانے میں رامپور میں بے نظیر کا میلہ ہوتا تھا۔ دادا صاحب
اس میں ضرور جاتے تھے۔ اور دو تین بیٹوں کو اور مجھکو ساتھ لے جاتے تھے۔ میری عمر چھ سال
کے قریب ہوگی۔ مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے میلہ بہت اچھا ہوتا تھا۔ یہ وہی میلہ ہے جس کی
نسبت داغ نے اپنی مثنوی "فریادِ داغ" میں کہا ہے۔

آ گیا بے نظیر کا میلا　　　　دلِ پابندِ وضع کُھل کھیلا

دادا صاحب اولاد کی تعلیم کی طرف سے غافل نہ تھے۔ موصوف نے مرزا نظیر بیگ اور
دیگر عمائد سے مشورہ کر کے مرادآباد سے ایک صاحب کو بلایا۔ جن کا نام مولوی محمد حسین مقتول
تھا۔ مولوی صاحب محلہ کسرول کے رہنے والے تھے۔ فارسی اور اُردو کی استعداد بہت اچھی
تھی۔ شاعری بھی کرتے تھے۔ انگریزی داں بھی تھے۔ چار شاگرد تو ہمارے گھر کے تھے۔ یعنی تینوں
چچا اور میں۔ پانچویں عزیز بیگ مرزا نظیر بیگ کے بیٹے۔ اِن کے سوا قصبہ کے اور ہندو مسلمان
شرفانے جو ایک یا دو روپیہ ماہوار مولوی صاحب کو دے سکتے تھے اپنے لڑکوں کو بھیجنا شروع
کر دیا۔ اس طرح مولوی صاحب کو تیس ۳۰ روپے ماہوار سے زائد آمدنی ہو جاتی تھی۔ یہ آمدنی کم نہ
تھی۔ اوس زمانہ کا ایک روپیہ آج کے سوا دو یا ڈھائی روپے کی برابر تھا۔ کھانا پہلے مرزا نظیر بیگ
صاحب کے ذمہ تھا۔ پھر دادا صاحب نے اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ مولوی صاحب کھانے کے بڑے شوقین

تھے۔ جب خفا ہو جاتے تھے تو کہتے تھے بارہ برس ہوئے جب میں چودھری دھیان سنگھ صاحب کے یہاں پڑھاتا تھا تو ایسی مزہ دار بریانی ملتی تھی کہ آج تک اوس کی ڈکار آجاتی ہے۔ آپ اسے ناجائز مبالغہ کہیں مگر میں تو سمجھتا ہوں مولوی صاحب شاعر تھے اس لئے کبھی کبھی اون کی بات چیت میں بھی شاعرانہ تخیل کی شان موجود ہوتی تھی۔

یہ سب اہتمام اس لئے کیا گیا کہ میرے بڑے چچا میر فدا علی اور مرزا صاحب کے بڑے بیٹے عزیز بیگ انگریزی اتنی سیکھ لیں کہ اون کا داخلہ گورنمنٹ ہائی اسکول میں ہو جائے۔ کچھ دن بعد

دادا صاحب کی وفات اور ترکہ کی تقسیم

چچا صاحب کا داخلہ چوتھے درجہ میں جس کو اب ساتواں درجہ کہتے ہیں ہو گیا۔ اُسی سال بدقسمتی سے دادا صاحب نے وفات پائی۔ دادا صاحب کی تجہیز و تکفین شیعوں کے طریقہ پر ہوئی۔ حالانکہ وہ سنی المذہب تھے۔ بیٹے۔ بیوی اور سارا خاندان شیعہ تھا۔ مُردہ بدست زندہ کی یہ پہلی مثال نہ تھی مرزا اسد اللہ خاں غالب شیعہ تھے۔ مفتی محمد عباس صاحب مجتہد لکھنؤ کی سوانح عمری میں[1]

[1] دیکھو تجلیات یعنی سوانح حیات مفتی محمد عباس صاحب مرحوم مؤلفہ مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ حصہ دوم صفحات ۱۹۳ لغایت ۲۰۱ مرزا غالب نے جو خطوط مفتی صاحب کو بھیجے اون کی یہ توجیہہ ہو سکتی ہے کہ مفتی صاحب فارسی کے بہت بڑے ادیب تھے۔ اس لئے قاطع برہان مرزا نے مفتی صاحب کی خدمت میں موصوف کی تائید حاصل کرنے کے لئے بھیجی تھی۔ مگر تجلیات کے صفحہ ۱۹۷ پر وہ خط ہے جو مرزا نے سلطان العلما مولوی سید محمد صاحب مجتہد کی خدمت میں اپنے عقیدہ کے اظہار اور سلطان العلماء کی رائے معلوم کرنے کی غرض سے بھیجا تھا۔ اوس زمانے میں ایک مسئلہ نے بڑی اہمیت اختیار کر لی تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ خالق حضرت خاتم الانبیاء کا مثل پیدا کرنے پر قادر ہے یا نہیں۔ غالب کے خط کی عبارت یہ ہے "درین ہنگام در شہر دو دانشمند باہم درآویختہ اند۔ یکے می سرائد کہ آفریدگار ہمتائے حضرت خاتم الانبیا علیہ وآلہ السلام می تواند آفرید۔ واین یکے میفرماید کہ ممتنع ذاتی و محال اتفاقی است۔ بندہ چوں ہمیں عقیدت دارد نظمے در گیرندہ بدیں مدعا سر انجام دادہ است۔" ترجمہ۔ آج کل دہلی کے دو بزرگ باہم جھگڑ رہے ہیں۔ ایک صاحب الاپتے ہیں کہ خالق اکبر حضرت خاتم المرسلین کا مثل پیدا کر سکتا ہے۔ دوسرے

غالب کے خطوط مفتی صاحب اور سلطان العلمار مولوی سید محمد صاحب مجتہد کے نام موجود ہیں۔ مرزا کے کلام سے بھی عقائد کا پتہ چلتا ہے۔ مگر سسرال کا مذہب سنی تھا۔ نواب ضیار الدین احمد خاں صاحب

صاحب فرماتے ہیں کہ خدا نے اپنی ذات کے لئے یہ امر ممنوع قرار دیا ہے۔ اس لئے خدا کی ذات کے لئے حضرت خاتم الانبیار کا مثل پیدا کرنا محال ہے۔ اس عاجز کا بھی یہی عقیدہ ہے اور غور و خوض کے بعد اس مطلب کے حل میں ایک نظم کہی ہے" غالب کی نظم بھی تجلیات میں موجود ہے۔ اوس عہد کے سب سے بڑے اور ممتاز شیعہ مجتہد کو عقائد کے بارے میں خط لکھنا اور مجتہد موصوف سے مسئلہ دریافت کرنا کہ جناب باری حضرت خاتم المرسلین کا مثل پیدا کرنے پر قادر ہے کہ نہیں۔ یہ سب ایسے واقعات ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ غالب کا مذہب کیا تھا۔ سلطان العلمار نے جو جواب غالب کو بھیجا تھا اوس کا ایک فقرہ قابلِ تذکرہ ہے۔ فرماتے ہیں" لکن ایں مسئلہ از علم کلام است و خوض دریں فن بر غیر خواص حرام" اس فقرہ کا ترجمہ یہ ہے: لیکن یہ مسئلہ علمِ کلام کا مسئلہ ہے۔ اور جو لوگ اہلِ علم نہیں ہیں اون پر اس فن کے مسائل میں سوچ بچار کرنا حرام ہے" ممکن ہے بعض حضرات کا یہ خیال ہو کہ سلطان العلمار نے جواب میں غالب کے ساتھ غیر معمولی سختی برتی۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس فقرہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلطان العلمار سمجھتے تھے کہ مثل خاتم المرسلین اور اسی طرح کے بعض اور مسائل پر بحث و مباحثہ بے سود اور لاحاصل ہے۔ اور مناسب یہ ہے کہ ہم مسلمان ایسی بحثوں میں اپنا وقت ضائع کرنے کی بجائے اوس وقت کو کسی مفید کام میں لگائیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے مذہب کی تاریخ میں ایسے دور بھی گزرے ہیں جب بعض بزرگوں نے معقولی تحقیق تجسّس کی بجائے دماغی ڈنڈ پیلے ہیں۔ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ خالقِ اکبر اپنا مثل پیدا نہیں کرسکتا۔ بعض عاشقانِ رسول نے اس صفت کو ہادئی برحق کی ذات سے بھی متعلق کرنا چاہا حالانکہ عبد و معبود کا فرق قرآن مجید میں اس قدر صاف موجود ہے اور خود ہادئی برحق نے اپنی زندگی میں ڈنکے کی چوٹ اس قدر کھول کر بتایا ہے کہ شک و شبہ کی مطلق گنجائش نہیں ہے۔ غالب پر ہی کیا موقوف ہے محتشم کاشی نے اپنے ہفت بند میں حضرت علی کی تعریف اس طرح کی ہے۔ شعر

براميد مثلِ رویت دستِ نقاشِ ازل نقشہا بربست لیکن چوں تو کمتر یافتہ

شعر کی خوبی کا کیا کہنا۔ مگر شاعر نے جو کچھ کہا ہے وہ اسلامی تعلیم کے بالکل منافی ہے۔

کا دہلی میں بڑا اثر تھا۔ اون سے بھی زیادہ با اثر حکیم محمود خاں صاحب تھے۔ دہلی والوں نے اُن دونوں صاحبوں کے حکم کی تعمیل کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تجہیز و تکفین کے تمام مراسم اہلِ سنت کے موافق کئے گئے۔
دادا صاحب کا انتقال فروری ۱۸۸۳ء میں ہوا۔ کچھ دنوں تک ہمارا سب خاندان اُسی مکان میں رہتا رہا جس میں موصوف کی زندگی میں رہتا تھا یعنی پختہ دو منزلہ مکان میں۔ کھنڈسار کا کاروبار بھی شرکت میں رہا۔ پھر اختلافات شروع ہو گئے۔ میر ولایت حسین صاحب جو میرے چچا صاحبان کے حقیقی ماموں تھے کاروبار کی دیکھ بھال بحیثیت منتظم کے کرتے تھے۔ بھائی کے انتقال کے بعد اب میر علی حسن صاحب کو بھتیجے یاد آئے۔ دادا صاحب سے میر علی حسن کے مراسم اچھے تھے۔ لیکن دونوں بھائیوں میں گہرا میل جول نہ تھا۔ موصوف نے بھی انتظام میں اپنی ٹانگ اڑانا چاہی۔
والد صاحب کو کاروبار کا تجربہ نہ تھا۔ وہ دادا صاحب کے انتقال کے بعد کندرکھی میں رہتے تھے مگر انتظامی معاملات سے کچھ زیادہ تعلق نہ رکھتے تھے۔ ۱۸۸۹ء میں جائداد۔ مکانات اور جملہ کاروبار کی تقسیم چاروں بھائیوں میں برضامندی باہمی ہو گئی۔ والدہ جانتی تھیں کہ میرے والد کو کھنڈسار کے کاروبار سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اس لئے تقسیم میں اُنھوں نے اوس روپیہ کے بدلے میں جو کھنڈسار کی تجارت میں لگا ہوا تھا مکانات اور زینداری کو لینا پسند کیا۔ مرحومہ کی یہ رائے یقیناً صائب تھی پختہ دو منزلہ مکان اور مردانہ مکان والد صاحب کے حصہ میں آیا۔ زینداری جو والد صاحب کے حصہ میں آئی اوس کی آمدنی ہمارے خرچ کے لئے ناکافی تھی مجبوراً والدہ صاحبہ نے خرچ اُسی قدر رکھا جتنی ہماری آمدنی میں گنجائش تھی۔ اس کے باوجود میری تعلیم کو تمام باتوں پر مقدم رکھا

دوسرا باب

مکتب کی تعلیم سے علی گڈھ جانے تک

میری تعلیم | میرے پہلے اوستاد میاں جی عزیزالدین تھے۔ پھر تخمیناً دو سال تک فارسی منشی عشرت علی سے پڑھی۔ میرا سب خاندان موصوف کا شاگرد تھا۔ فارسی کی استعداد اچھی تھی۔ مگر لکیر کے فقیر تھے۔ فارسی کی درسی کتابوں کے ضروری مقامات اون کو زبانی یاد تھے۔ اگر کسی کتاب میں کوئی لفظ غلط چھپ جاتا یا متن اوس طرح نہ ہوتا جیسا موصوف کو یاد تھا تو بڑے فخر سے مطبع والوں کی فروگذاشتوں اور علمی ناداریوں سے شاگردوں کو مطلع کرتے۔ اور زمانہ کی بدمذاقی پر اظہارِ تاسّف فرماتے۔ صرف و نحو سے بالکل ناواقف تھے۔ اُردو کتابیں اوس دَور کے مکتبوں میں نہیں پڑھائی جاتی تھیں۔ اُردو عبارت لکھنا سکھانے کی طرف تو معلّموں کا کبھی خیال بھی نہ گیا ہوگا۔ منشی صاحب شاگردوں کو فارسی عبارت لکھنی بھی بہت کم بتاتے تھے۔ کتابت۔ خوشخطی اور عبارت نویسی کو وہ تعلیم کا اہم جزو نہیں سمجھتے تھے۔ آمدنامہ۔ کریما۔ مامقیماں اور حکایتِ لطیف موصوف نے مجھے پڑھائے تھے۔ کریما نادرہ کے ساتھ پڑھا تھا۔ ۱۸۸۴ء میں دادا صاحب کی وفات کے بعد والدہ صاحبہ نے میری تعلیم مولوی سید اسد حسین مرحوم ساکن کندرکھی کے سپرد کی اور ہمارے مردانہ مکان میں میرے لئے مکتب کھولا۔ مرحوم کی فارسی استعداد اچھی تھی۔ شعر بھی کہتے تھے۔ لائق تخلص تھا۔ اون کا ایک شعر یاد رہ گیا ہے۔ شعر

ارادہ تھا نجف جانے کا لائق   رہا شوال بھی خالی سفر سے

شعر میں کوئی خاص خوبی نہیں ہے۔ تبرکاً درج کر دیا ہے۔ اون کے انتقال کے بعد مکتب کے معلّم مولوی محمد حسین مقتول مقرر کئے گئے۔ موصوف کے اب وہ پُرانے ٹھاٹھ رخصت ہو چکے تھے۔ ہمارے مردانہ مکان میں جہاں مکتب تھا رہتے تھے اور کھانا اور تنخواہ ہمارے یہاں سے ملتی تھی۔ تنخواہ ٹھیک یاد نہیں رہی۔ غالباً چار روپے ماہوار تھی۔ اور لڑکے بھی پڑھتے تھے۔ اون سے پڑھائی کی فیس مولوی صاحب کو علیحدہ ملتی

تھی۔ موصوف بڑے ذکی الطبع، اُردو اور فارسی کی اچھی عبارت لکھنے والے اور بڑے خوشخط تھے۔ میں نے فارسی کی اونچی درسی کتابیں بشمول ابوالفضل وپنج رقعہ اون سے پڑھیں۔ فارسی اور اُردو کی عبارت لکھنا اور خوشخطی بھی اون سے سیکھی۔ اوس زمانہ کی میرے قلم کی لکھی ہوئی کاپیاں میرے پاس محفوظ ہیں اکتوبر ۱۸۸۹ء کی اپنی طرزِ تحریر اور خوشخطی کا ایک نمونہ درج کرتا ہوں۔ مولوی مقتول شاعر بھی تھے ایک غزل کے مقطع کا آخری مصرعہ یاد رہ گیا ہے

مصرعہ:- میں ہوں مقتول تُو قاتل ہے جہاں جانتا ہے

تخلّص نے مصرعہ میں جان ڈال دی ہے۔ میں نے مکتب میں اُردو کی کوئی کتاب نہیں پڑھی اوس زمانہ کے مکتبوں میں صرف فارسی عربی پڑھائی جاتی تھی۔ افسوس ہے کہ مولوی مقتول سے میں نے انگریزی پڑھنا شروع نہ کردی۔ والدہ صاحبہ نے تو فرمایا تھا۔ مگر مجھے اُردو فارسی میں لطف آنے لگا تھا۔ توجہ نہیں کی۔ والد صاحب نے قلمیں باندھنا اور رباغ لگانا شروع کردیا تھا۔ مجھے اُردو فارسی کی عبارت لکھتے دیکھکر خوش ہوتے تھے۔ مگر میری تعلیم کے معاملہ سے اتنی دلچسپی نہ تھی کہ وقت نکال کر اوسے جانچتے یا مجھے کوئی ہدایت فرماتے۔ مولوی مقتول کے عمرآباد چلے جانے کے بعد میرا نام کندرکھی کے اُردو اپر پرائمری مدرسہ میں درج کرادیا گیا۔ وہاں کی خاص تعلیم جس سے مجھکو فائدہ ہوا ریاضی تھی۔ میں نے جلد تیسرا درجہ جو ہمارے مدرسہ کا سب سے اونچا درجہ تھا پاس کرلیا پھر وظیفہ یعنی اسکالرشپ کے امتحان میں بیٹھا۔ وظیفہ کا امتحان لینے ڈپٹی انسپکٹر مدارس بابو جگناتھ آئے تھے۔ اور بلاری میں امتحان لیا گیا تھا۔ کچھ دن بعد خط آیا کہ میں کامیاب ہوا۔ اور اگر عمرآباد جاکر اُردو مڈل کے مدرسہ میں داخل ہوجاؤں تو مجھے دو روپے ماہوار وظیفہ ملے گا۔ میں نے وظیفہ لینے اور مڈل اسکول میں پڑھنے سے انکار کردیا۔ وجوہ ۱۸۹۵ء کے واقعات میں درج ہیں۔

تحت لفظ مرثیہ خوانی

اوسی زمانہ میں مجھے تحت لفظ مرثیہ خوانی کا شوق پیدا ہوا۔ دبیر انیس۔ مونس اور انس کے مطبوعہ مرثیوں کی جلدوں میں سے مرثیوں کا خود انتخاب کرکے اپنے قلم سے مرثیے نقل کرلیتا تھا۔ والد صاحب اور منجھلے چچا صاحب کا خط بہت اچھا تھا۔ وہ بھی میرے لئے مرثیوں کی نقل کردیتے تھے۔ ضمیر۔ خلیق۔ فصیح۔ اوج اور نفیس کے چیدہ مرثیے اور سلام بھی بعض رشتہ داروں کی شفقت سے مجھے مل گئے تھے۔ میں کندرکھی

ایضاً

آب چون در روغن افتد ناله خیزد از چراغ
صحبتِ ناجنس باشد منشاءِ آزار ها

اعتضادی

شعر مذکورہ بالا خبر میدہد کہ مجالستِ مدبّران زمان و مخذ زیان فراوان است احتراز از ایشان مرام ما بالفرض اگر بمصلحت همنشینی آن با عاقبت اندیشان موافق هم گردد آخر الامر پشیمانی و خرابی آرد — نیازمند ازلی سید رضا علی رضوی المشهدی

صحبتِ ناجنس گر موافق بود ایمن مباش
آب را دیدی که ماهی را بدام افگند و رفت

آب چون در روغن افتد ناله خیزد از چراغ
صحبت ناجنس باشد منشاء آزارها

اعتضادی

شعر مذکور بالا خبر میدہد کہ مجالست [illegible] — بالفرض اگر بمصلحت [illegible] آخر الامر [illegible]
صحبت ناجنس گر موافق بود ایمن مباش — آب را دیدی که ماهی را بدام افگند و رفت

میں مجلسیں پڑھتا تھا۔ قصبہ والوں نے پڑھنے کی داد دے کر میری ہمت اس قدر بڑھائی کہ میں نے مرادآباد جاکر بھی دو مجلسیں پڑھیں۔ بین اور رخصت کے سوا اور سب مضمون اچھے پڑھتا تھا۔ مرثیہ خوانی کا میرے ادبی مذاق پر بہت اثر ہوا۔ اپنے قلم سے مرثیہ۔ سلام۔ رباعی اور مخمّس کے نقل کرنے سے مرثیہ گو شعرار کے مدارج اور اون کے کلام کی خوبیوں میں مجھے امتیاز کا احساس ہونے لگا۔

عربی پڑھنے کے لئے مرادآباد جانا

کندرکھی کا سرکاری اُردو مدرسہ چھوڑنے کے بعد میں آٹھ دس مہینے بیکار رہا۔ اس عرصہ میں والدہ صاحبہ نے چند مرتبہ رائے دی کہ میں انگریزی پڑھنے کے لئے مرادآباد چلا جاؤں۔ مگر انگریزی تعلیم کی اہمیت کا اوس وقت تک مجھے اندازہ نہ تھا۔ مذہبی جوش سر پر سوار تھا۔ اس بیکاری کے زمانہ میں میرے تین شغل تھے۔ نماز پڑھنا۔ مرثیہ پڑھنا یا مرثیوں کی کتابت کرنا۔ اور سنّی شیعوں کے مذہبی مناظروں کی کتابیں پڑھنا۔ شیخ سید احمد ضلع سہارنپور کے ایک صاحب سنّی سے شیعہ ہوئے تھے اور ایک کتاب لکھی تھی غالبًا انوارالہدیٰ نام تھا۔ اوس کا جواب مولوی عالمگیر خاں نے دیا تھا۔ جواب الجواب شیخ سید احمد نے لکھا تھا۔ یہ سب کتابیں میں نے منگائی تھیں اور بڑے شوق سے پڑھتا تھا۔ اوس زمانہ میں اتنا شعور نہ تھا کہ فرقہ وارانہ مناظروں کا اسلام کی اصلی تعلیم سے اگر کچھ تعلق ہے تو اتنا بعید ہے کہ گڑے مُردے اوکھاڑنا۔ اِس زمانہ میں اسلام کے ساتھ دوستی نہیں بلکہ دشمنی ہے مسلمانوں اور آریوں کے مناظرہ کی بھی چند کتابیں میں نے پڑھی تھیں ــــ

رمضان المبارک کا مہینہ مئی جون میں پڑتا تھا۔ میں پورے روزے بڑی عقیدت سے رکھتا تھا۔ اوسی زمانہ میں چھوٹے چچا صاحب عربی پڑھنے مرادآباد گئے۔ میرے مذہبی جوش نے گوارا نہ کیا کہ وہ عربی پڑھیں اور میں اس دولت سے محروم رہ جاؤں۔ اکتوبر ۱۸۹۱ء میں میں نے والدہ صاحبہ سے اپنا عربی پڑھنے کا ارادہ ظاہر کیا اور آٹھ دس دن بعد مولوی بننے اور عربی پڑھنے کی غرض سے مرادآباد چلا گیا۔ مولوی سیّد رضا حسین صاحب محلہ سادات لانکڑی میں عربی کا درس طلبا کو دیتے تھے۔ نماز جمعہ میر سعادت علی مرحوم کی مسجد واقع محلّہ چوکھ پُل میں پڑھاتے

تھے اور مجالس میں حدیث خوانی کرتے تھے۔ نوگانوں سادات کے رہنے والے تھے۔ آدھی تنخواہ اون کو مرزا عابد علی بیگ صاحب دیتے تھے اور آدھی تنخواہ میر سعادت علی صاحب کے وقف سے ملتی تھی۔ میر سعادت علی غدر کے زمانہ میں تحصیلدار تھے۔ بیٹا کوئی نہ تھا۔ محلہ چوکھ پل میں خوب بڑا امام باڑہ بنایا اور اوس کے کونہ میں چھوٹی سی مسجد[1] تعمیر کی۔ امام باڑہ کے خرچ کے لئے زمینداری وقف کی اور متولی اپنی بیٹی یا داماد کو نہیں بنایا بلکہ مولوی محمد حسن صاحب کو جن کا تذکرہ کندرکھی کے حالات میں آچکا ہے متولی مقرر کیا۔

میرے مراد آباد جانے سے پہلے مولوی صاحب کا انتقال ہوچکا تھا اور ۱۸۹۱ء میں اون کے بیٹے مولوی مہدی حسن صاحب متولی تھے اب بھی موصوف متولی ہیں۔ جیسا اچھا انتظام اِس وقف کا ہے کاش اور اوقاف کا بھی ایسا ہی انتظام ہوتا۔ مولوی رضا حسین صاحب کے مکتب میں اور شیعہ طلبا بھی عربی کا درس لیتے تھے۔

عربی کا ناقص طریقہ تعلیم میں نے شوق میں عربی شروع تو کردی مگر جی نہ لگا۔ عربی کا طریقہ تعلیم نہایت قابلِ اعتراض ہے۔ کسی زبان کی تعلیم صرف ونحو سے شروع کرنا نہایت غلط اور دقیانوسی طریقہ ہے۔ طالب علم کو میزان منشعب رٹوانا اوس کے دماغی توازن میں خلل ڈالنا ہے۔ صرف ونحو کی اصلی غرض یہ ہے کہ زباں دانی میں مدد دے سکے۔ لیکن عربی کا طریقہ تعلیم ایسا ناقص ہے کہ صرف ونحو کی تعلیم میں بہت سا بیش قیمت زمانہ لگ جاتا ہے اور پانچ چھ سال پڑھنے کے بعد بھی طالب علم عربی کے سلیس جملے نہ بول سکتا ہے نہ لکھ سکتا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ جن ملکوں میں عربی بولی جاتی ہے مثلاً مصر وشام وعرب وہاں کے لئے پرانا طریقہ تعلیم زیادہ ناموزوں نہ ہو۔ مگر جہاں عربی نہیں بولی جاتی وہاں صرف ونحو سے ہرگز ابتدا

---

[1] نیت کا حال تو خدا کو معلوم ہے۔ مگر بہت سے پرجوش مسلمانوں کی اگلے زمانہ میں بھی یہ حالت تھی اور اب بھی ہے کہ اون کی کمائی میں خدا سے زیادہ اوس کے رسول اور رسول سے زیادہ آئمہ اور اولیا اللہ کا حصہ ہوتا ہے۔ شیعوں کی یہ حالت ہے کہ حاجیان بیت اللہ سے زائرین کربلا ونجف کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔

نہ کرنا چاہیئے بلکہ موجودہ طریقہ تعلیم کی بموجب پہلے آسان الفاظ سکھانا اور پھر اون الفاظ کو ملا کر چھوٹے چھوٹے آسان جملے اور فقرے بنانا ضروری ہے۔ پرانا طریقہ یہ ہے کہ گاڑی آگے ہے اور گھوڑا پیچھے۔ حالانکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ گھوڑا آگے ہو اور گاڑی پیچھے تاکہ گاڑی کو گھوڑا کھینچ سکے۔ نو دس مہینے میں بدشواری پنج گنج تک پہونچتے پہونچتے میرے صبر کا پیالہ لبریز ہو گیا اور مجھے عربی چھوڑنا پڑی۔

انگریزی تعلیم

کامل اس فرقۂ زہّاد سے اوٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے
(آزردہ)

مولوی محمد حسین مقتول سے میں نے بارہ سال کی عمر میں انگریزی پڑھنا شروع کی۔ مولوی مقتول کندرکھی سے چلے آنے کے بعد اپنے گھر پر پڑھاتے تھے اور میں صبح اور سہ پہر کو دونوں وقت اون کے گھر جا کر درس لیتا تھا۔ مجھے انگریزی پڑھنے کا خیال بہت دیر میں آیا۔ اگر چند سال پہلے شروع کی ہوتی تو بارہ تیرہ برس کی عمر میں انٹرنس پاس کر لیتا۔ انگریزی پڑھنے میں مجھے سب سے زیادہ دشواری دو باتوں میں پیش آئی۔ ایک تو حروف کی مختلف صورتیں ذہن نشین کرنے میں اور دوسرے الفاظ کے ہجے یاد رکھنے میں۔ میرا زیادہ وقت پڑھنے میں صرف ہوتا تھا۔ لکھنے کا موقعہ نسبتاً کم ملتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی کا خط کچّا رہ گیا۔ میری انگریزی کی تحریر صاف ہوتی ہے مگر حروف اور الفاظ سڈول نہیں ہوتے۔ اردو فارسی خط برا نہیں ہے۔ مرادآباد میں مختلف لوگوں سے ملنے جلنے کے باعث میرے خیالات میں وسعت اور طبیعت میں رواداری پیدا ہو گئی۔

گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخلہ

ستمبر ۱۸۹۳ء میں میرے والد کے دوست پنڈت پرتاپ کشن صاحب مجھے گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخل کرانے لے گئے۔ پنڈت صاحب میرے والد کے بڑے دوست اور اخبار رہبر کے مالک تھے۔ اس اخبار کے ایڈیٹوریل مضمون اکثر والد صاحب کے لکھے ہوئے ہوتے تھے۔ بابو رام چرن داس نے

جو پانچویں درجہ کو پڑھاتے تھے۔ میرا امتحان لے کر یہ رائے ظاہر کی کہ میری انگریزی کمزور ہے اور میں ساتویں یا زیادہ سے زیادہ چھٹے درجہ کے قابل ہوں۔ مجھے سخت صدمہ ہوا۔ اور پنڈت صاحب کے ساتھ ماسٹر کنوّمل کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ماسٹر صاحب میرے والد کے ہم جماعت رہ چکے تھے اون کی سفارش کا یہ نتیجہ ہوا کہ بابو رام چرن داس نے مجھے داخل تو کرلیا۔ لیکن دو ٹوک بات مجھے بتادی، فرمایا "لڑکے بابو کنومل کے کہنے سے میں تجھے داخل تو کئے لیتا ہوں۔ مگر تیری انگریزی ساتویں درجہ کی قابل ہے تو امتحان میں فیل ہوجائے گا۔" تین مہینے بعد ششماہی امتحان ہوا تو کل درجہ[1] میں میرا تیسرا نمبر آیا۔ پہلا نمبر غلام حیدر خاں کا تھا۔ دوسرا محمد عمر کا اور تیسرا میرا۔ اپریل ۱۸۹۴ء کے سالانہ امتحان میں میرا دوسرا نمبر آیا۔ زمانہ کی اولٹ پھیر دیکھئے کہ جس درجہ کا نام میرے زمانہ میں پانچواں درجہ تھا۔ اب اوسے چھٹا درجہ کہتے ہیں۔ میرے زمانہ میں میٹرکیولیشن کو پہلا درجہ کہتے تھے اب اوس کا نام دسواں درجہ ہے۔

مولوی قیام الدین احمد صاحب

اِس زمانہ میں میری ملاقات جن طلبا سے ہوئی اون میں قیام الدین احمد خاص طور سے قابلِ تذکرہ ہیں۔ موصوف مرادآباد کے مشہور وکیل مولوی عبد الرب صاحب کے بھتیجے تھے۔ جب میرا داخلہ اسکول میں ہوا ہے تو انگریزی مڈل یعنی اوس زمانہ کا تیسرا درجہ پاس کر چکے تھے۔ فارسی کی استعداد بہت اچھی تھی۔ انگریزی خاصی لکھتے تھے اور لکھنے کی بہ نسبت انگریزی بولنے میں زیادہ مہارت تھی۔ میرے نہایت ہی عزیز دوست تھے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ ہمارے مراسم رشتہ داروں کے سے تھے۔ بڑے متواضع اور خوش خلق آدمی تھے۔ دوستوں سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے تھے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کبھی اون کو کسی نوکر سے بھی سخت کلامی کرتے سنا ہو۔ ۱۸۹۶ء میں ایک دولت مند خاتون سے جو اون کی رشتہ دار تھیں، شادی ہوئی۔ وہ چھپرایوں کی رہنے والی ہیں اور خدا کے فضل سے زندہ ہیں۔ میں اکثر چھپرایوں جاتا تھا اور مولوی قیام الدین اکثر

[1] درجہ میں دو دفعات تھیں یعنی (الف) اور (ب)۔ میں دفعہ (ب) میں تھا۔ دفعہ (الف) کو بابو کالکا پرشاد پڑھاتے تھے۔

کندرکی آتے تھے۔ پہلی مرتبہ میری دعوت پر جون ۱۸۹۴ء میں چھوٹے چچا مرحوم کی شادی میں کندرکی آئے تھے۔ مرحوم کے احسانات میں کبھی نہ بھولوں گا۔ ان احسانات میں مالی مدد بھی شامل تھی۔ جون ۱۹۲۴ء میں مختصر علالت کے بعد وہاں پہونچ گئے جہاں ہم سب کو جانا ہے۔ مرحوم کے چچازاد بھائی عزیزی عبدالسلام مرادآباد اور بچھرایوں دونوں جگہ رہتے ہیں۔ مولوی قیام الدین کی اہلیہ مجھ سے عمر میں بڑی ہیں۔ میں اون کو بھابی کہتا ہوں اور عبدالسلام کو ایسا ہی سمجھتا ہوں جیسا اپنے چچازاد بھائیوں کو۔

اسکول کی تعلیم اور شادی کی تجویز

چوتھے درجہ کے سالانہ امتحان میں میرا دوسرا نمبر اور انگریزی میں پہلا نمبر آیا۔ ۱۸۹۶ء میں میں نے انگریزی مڈل کا امتحان اوّل درجہ (فرسٹ ڈویژن) میں پاس کیا۔ اوس زمانہ میں چالیس طلباء کو جو مڈل کے امتحان میں صوبہ میں سب سے اونچے نمبر پر پاس ہوں محکمہ سررشتہ تعلیم چار روپے ماہوار کا وظیفہ یا اسکالرشپ بربنائے قابلیت دیتا تھا۔ مجھکو بھی یہ وظیفہ ملا۔ صوبہ میں میرا نمبر بائیسواں تھا۔

شیخ سعدی نے سچ فرمایا ہے "ہر جا کہ گلے ست خارے ست و با خمر خمارے ست" اکلوتا بیٹا ہونے میں جہاں بہت سے فائدے ہیں تھوڑا سا نقصان بھی ضرور ہے۔ والدہ صاحبہ نے میری منگنی ۱۸۹۰ء میں کر دی تھی۔ جون ۱۸۹۶ء میں انگریزی مڈل کا نتیجہ معلوم کرنے کے لئے مرادآباد دو تین دن کے لئے گیا تھا۔ وہاں سے جو واپس آیا تو دیکھا بڑی چہل پہل ہے، کنبہ کی بی بیاں جمع ہیں۔ اور ہمارے گھر گانا ہو رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ میری شادی طے پا گئی ہے۔ اور تاریخ مقرر ہونے والی ہے۔ میرا ماتھا ٹھنکا اور یہ رائے میں نے قائم کی کہ اگر اِس وقت میں شادی پر راضی ہو گیا تو بی، اے پاس کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ اور انٹرنس پاس کرنے کے بعد اپنا اور بیوی کا پیٹ پالنے کے لئے جو نوکری مل جائے وہ کرنا پڑے گی۔ مرادآباد کے احباب کی صحبتوں اور بالخصوص قیام الدین احمد کے اثر نے میرے دل میں اُمنگیں پیدا کر دی تھیں۔ اور یہی مصرعہ۔ خاک از تودہ کلاں بردار (ترجمہ۔ ایک مٹھی مٹی کی بھی ضرورت ہو تو

مٹی کے بڑے ڈھیر میں سے اوٹھانا چاہیئے) پر عمل کرنے کا پہلے سے تہیّہ کرچکا تھا۔ والدہ سے میں نے عرض کیا کہ مجھے شادی کرنے میں عذر نہیں ہے مگر یہ وقت ٹھیک نہیں ہے۔ چار برس ٹھہر جائیے میں ایف۔ اے کرلوں اوس کے بعد آپ جو حکم دیں گی تعمیل کروں گا۔ والدہ صاحبہ کو میرا اعتراض ناگوار گزرا۔ مگر والد صاحب نے سکوت اختیار کیا اور مجھے قابلِ الزام نہ سمجھا۔ اوس زمانہ کی باتیں یاد کرتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ رسم و رواج کی زنجیر بھی کیسی کڑی ہوتی ہے۔ ہماری برادری یعنی سادات میں ہر شخص مجھ پر اونگلی اوٹھاتا تھا۔ کہ کیسا لڑکا ہے۔ خدا کے فضل سے ماں باپ موجود ہیں۔ پھر بھی شادی کے بارے میں اپنی رائے لگاتا ہے۔ کنبہ کی ایک بڑی بوڑھی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ چودھویں صدی ہے۔ دیکھئے آگے چل کر کیا ہوتا ہے۔ ہمارے خاندان کے کسی لڑکے نے اپنے رشتہ ناتے کے معاملہ میں آج تک مُنھ نہیں کھولا تھا۔ غرضکہ میں ایسا ملزم تھا جس کے خلاف برادری کے ہر شخص کو بغیر پورے حالات معلوم کئے فیصلہ صادر کرنے کا حق حاصل تھا۔ میں سماجی۔ مذہبی اور سیاسی معاملات میں لڑکپن سے انتہا پسند رہا ہوں۔ میری سماجی بغاوت کو (فی الحقیقت وہ بغاوت نہ تھی) ابھی پورے چھیالیس برس بھی نہیں ہوئے گو معاشرتی اصلاح کی رفتار بہت مدھی ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ جو حقوق اوس زمانہ میں لڑکوں کو حاصل نہ تھے وہ آج تعلیم یافتہ لڑکیوں کو حاصل ہیں۔ اقتضائے وقت کی لہر سمندر کی موج سے کم زوردار نہیں ہوتی۔ جو شخص انگلستان کے بادشاہ کینوٹ کی طرح اس لہر یا موج کو بازردی کا حکم دے گا اوسے خود پچھتانا پڑے گا۔

ناناصاحب کی وفات

شادی کی مصیبت سے چھٹکارا ہونے کے تین مہینے پہلے ایک اور حادثہ ہوچکا تھا۔ ۲۸ر فروری ۱۸۹۶ء کو نانا صاحب نے نگر یا سادات میں وفات پائی۔ نانا صاحب کا طریقہ تھا کہ قرض لے کر جائداد خریدتے۔ اور رفتہ رفتہ قرضہ پس انداز سے ادا کردیتے تھے۔ انتقال کے وقت بھی قرضہ تھا۔ بیٹا کوئی نہ تھا۔ بیٹیاں اپنے گھر کی ہوتی ہیں۔ نانی صاحبہ دل کی بڑی صاف مگر کانوں کی کچی تھیں بیٹیوں کے شوہروں میں اختلافات

پیدا ہوئے۔ مجھے معہ والدہ صاحبہ کے نگریاسادات جانے اور وہاں رہنے کی ضرورت اس لئے پڑی کہ علاوہ اُس جائداد کے جو نانا صاحب کے ترکہ سے والدہ کو ملی تھی۔ دادا صاحب نے بھی اپنے روپے سے نگریاسادات کے قرب میں والدہ کے نام جائداد خرید کردی تھی۔ میں نے دو تین مہینے تک ان سب جائدادوں کا انتظام کیا۔ مجھے یہ دیکھکر بڑی حیرت ہوئی کہ نانا صاحب کی خوش معاملگی پر کاشت کاروں کو اس قدر بھروسہ تھا کہ عموماً رسیدیں موصوف سے نہ لیتے تھے بلکہ جو لگان ادا کرتے تھے اُس کا حساب میں درج ہو جانا کاشتکاروں کے اطمینان کے لئے کافی تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے کسی کاشتکار نے میرے سامنے یہ نہیں کہا کہ جتنے لگان کی ادائگی حساب میں درج تھی اُس سے زیادہ لگان وہ ادا کر چکا ہے۔

اودھ کے حالات ضبطی سے پہلے

شخصی طرز حکومت کو بُرا کہنا اور جمہوریت کو سراہنا ہمارے زمانہ کے رسم ورواج (فیشن) میں داخل ہے۔ مغربی تعلیم اور مغربی اقتدار کا اثر ہے کہ جسے دیکھئے آزادی کا دلدادہ ہے۔ مگر جو چیز جمہوریت اور آزادی سے بھی زیادہ مقدّم ہے اُس کا احساس ابھی تک ملک میں کم ہے، وہ چیز مساوات ہے۔ جس ملک کے باشندوں کو بالکل برابر درجہ کے سیاسی۔ اقتصادی۔ معاشرتی و دیگر حقوق حاصل نہ ہوں اور جہاں نسلی امتیازات موجود ہوں وہاں کی مخلوق کا آزادی اور جمہوریت کو سراہنا اور شخصی حکومت کی مذمّت کرنا مضحکہ انگیز فعل ہے کیا کوئی حق پسند آدمی ایمانداری سے یہ کہہ سکتا ہے کہ یونائیٹڈ اسٹیٹس (امریکہ) میں حبشیوں کو وہی حقوق حاصل ہیں جو جمہوریت نے گوری آبادی کو دے ہیں۔ کسی جزو آبادی کو قانوناً بعض حقوق سے محروم رکھنا نہایت قابلِ اعتراض بات ہے۔ اس کی مثالیں بہت سے ملکوں میں ملینگی جو انگریزی سلطنت کا اہم جزو ہیں۔ مگر سب کے لئے برائے نام یکساں قانون بنا کر بعض طبقوں کو اُس قانون کے فائدہ سے محروم رکھنا اور بھی زیادہ قابلِ اعتراض ہے۔ اس طریقۂ حکومت کی جیتی جاگتی مثال امریکہ ہے۔ شخصی طرزِ حکومت کی سب سے آخری مثال اودھ کی سلطنت تھی۔ جس کا خاتمہ

لارڈ ڈلہوزی کے ہاتھوں ہوا۔ انگریز مورخ جو کچھ کہیں مگر ہمارے وہ بزرگ جنہوں نے واجد علی شاہ کا دَور دیکھا تھا اور جو ضبطی سے پہلے کے حالات سے واقف تھے سلطنت اودھ کو مُلک کے لئے مُفید اور آخری فرماں روا کو اُن حالات کے ماتحت جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے عمال نے اودھ میں پیدا کر رکھے تھے، معذور اور مجبور سمجھتے تھے۔ میں نے اس کتاب میں کسی جگہ شمس العلماٗ مولوی نذیر احمد صاحب کی رائے کا تذکرہ کیا ہے۔ فوجی ملازمت کے تعلق سے نانا صاحب بھی عرصہ تک اودھ میں رہے تھے اور ضبطی سے پہلے رعایا کی خوشحالی کا تذکرہ اکثر فرماتے تھے، اُس دَور کا لکھنؤ علوم و فنون کا مرکز تھا۔ خود واجد علی شاہ کو فن عمارت میں یدطولیٰ حاصل تھا۔ لکھنؤ کے علاوہ جب جلا وطن کر کے کلکتہ بھیجے گئے تو وہاں بھی اچھی اچھی عمارتیں مٹیا برج میں بنائیں۔ ہر فن کے اساتذہ اس فرمانروا کے عہد میں موجود تھے۔ ناسخ اور آتش جیسے باکمال شعراء نے دلّی کی ٹکسالی اُردو پر صفائی اور شستگی کی مُہر لگا کر ثابت کر دیا کہ زبان پر سندی ٹھپّا لگانے کا حق لکھنؤ کو بھی ویسا ہی حاصل ہے جیسا دہلی کو ہے۔

مرثیہ گوئی میں انیس اور دبیر کا درجہ

شیخ ناسخ نے حکیم مہدی کی معزولی کی جو تاریخ کہی تھی وہ میں نے نانا صاحب کی زبانی سُنی تھی۔ آخری شعر یاد رہ گیا ہے۔ شعر

از جائے حکیم ہشت بر گیر ــــ سہ مرتبہ نصف نصف کم کُن

ترجمہ: حکیم کی ح کے آٹھ عدد لے کر تین مرتبہ آدھے آدھے کر ڈالو ۱۲۴۸ھ نکلتے ہیں۔ میر انیس اور مرزا دبیر کی مجالس کے قصّے نانا صاحب بڑے جوش سے بیان کرتے تھے۔ مجھے اتنا شعور نہ تھا کہ اُن باتوں کو لکھ لیتا، ورنہ آج بڑے کام آتیں۔ فرماتے تھے کہ لکھنؤ کی آبادی دو جماعتوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ ایک جماعت انیسیوں کی تھی اور دوسری دبیریوں کی۔ ایک ہی مجلس میں ان دونوں صاحبانِ کمال کا پڑھنا ناممکن تھا۔ پہلے پیچھے پڑھنے کی بحث کے علاوہ دونوں فریقوں کو اپنے اپنے مقتدی (ہیرو) کی مدح و ستائش میں اس قدر مبالغہ تھا کہ اگر میر صاحب اور مرزا صاحب

ایک ہی مجلس میں اپنا اپنا کلام پڑھتے تو خونریزی کی نوبت یقیناً پہونچ جاتی۔ اودھ کی ضبطی تک انیس و دبیر دونوں بالکل ہم رتبہ شاعر سمجھے جاتے تھے۔ بلکہ نانا صاحب کے ارشاد سے معلوم ہوا کہ اہلِ لکھنؤ کی نظر میں تھوڑی بہت ترجیح اگر کسی کو تھی تو دبیر کو تھی۔ انیس کے ایک شعر سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں۔ شعر

عالم ہے مکدّر، کوئی دل صاف نہیں ہے
اس عہد میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے

ایک انگریز ادیب اور حافظ شیرازی

کسی شاعر کے تخیل کی بلند پروازی کو حقیقت سمجھنا اور کسی واقعہ کے اثبات میں بطور سند پیش کرنا اصول درایت کے خلاف ہے ممکن ہے میرے شوخ طبع اہلِ وطن میری ناچیز رائے کو اُسی قسم کی تنقید قرار دیں۔ جس کا ارتکاب ایک فارسی داں انگریز ناقد سخن نے کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ انگلستان کے ایک بزرگ فارسی خوب جانتے تھے اور حافظ کے اشعار پڑھ کر اُن کی خوبیوں کا اظہار کیا کرتے تھے۔ ایک دن عالمِ ذوق میں اپنے ایک ہندوستانی دوست کو بتانے لگے کہ معلوم ہوتا ہے حافظ کو علمِ تاریخ سے زیادہ واقفیت نہ تھی۔ دوست نے پوچھا، آپ نے یہ رائے کس بنیاد پر قائم کی، فرمایا، حافظ نے خود اقبال کیا ہے۔ کیا آپ نے حافظ کا یہ شعر نہیں پڑھا۔ شعر

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

ترجمہ:- میں نے سکندر و دارا کی داستان نہیں پڑھی ہے۔ مجھے تو صرف عشق و محبت کی کہانی میں لطف آتا ہے۔

مغربی ممالک کے ناقد خاص خاص واقعات یا مثالوں سے جو قاعدہ کلیہ بعض اوقات قائم کرتے ہیں اُس کی یہ عبرتناک مثال ہے۔ جس سے ہم سب کو بچنا چاہیئے۔ تاہم یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ انیس و دبیر اور ان دونوں خاندانوں کے اہلِ کمال جب ضرورت سمجھتے تھے اپنے

حریفوں اور پبلک کے اعتراضات اور شبہات کا جواب بڑی خوبی سے اپنے اظہار کمال کے سلسلہ میں مرثیوں میں درج کردیتے تھے۔ وحید کے بارہ میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں کہ جو مرثیے پڑھتے ہیں اُن کے مصنف یہ خود نہیں ہیں بلکہ انیس کا کلام خاندانی تعلق کے باعث ہاتھ آگیا ہے۔ ساری بلند پروازی اُس کے بل بوتہ پر ہے۔ وحید اپنے ایک مشہور مرثیہ میں اس اعتراض کا جواب دیتے ہیں۔

بے جرم و خطا مجھ سے عداوت جو ہے مطلوب　　جویا ہیں کہ ہاتھ آئے کوئی نقص تو ہے خوب

سنتے ہیں زباں سے جو مری نظم خوش اسلوب　　وہ میرے بزرگوں کی طرف کرتے ہیں منسوب

ادنیٰ کی تصانیف پہ اعلیٰ کا گماں ہے

میں خوش ہوں کہ اس میں مری تکمیل عیاں ہے

شائقینِ ادب کے لئے یہ امر موجبِ طمانیت ہے کہ زمانہ نے مرے پیچھے غالب کی وہ قدر کی جس کے وہ مستحق تھے۔ انیس کی تو اُن کی زندگی میں بھی وہ قدر تھی جس کی مثال ہمارے ملک کی شاعری میں نہیں ملتی۔ شیریں زبانی۔ بیساختگی اور قادر الکلامی کے علاوہ میر صاحب ایسے غیور تھے جیسے قدیم یونان کے بعض نامور فلسفی۔ ایک مثال اُن کی خودداری اور عزتِ نفس کی سُنئے۔ واجد علی شاہ کا دور ہے۔ شعر و شاعری کا چرچا ہے۔ فنِ مرثیہ گوئی کا عالمِ شباب ہے۔ دہلی کے اہلِ کمال اور آفتابِ علم و سخن زمین کی سیماب وار بیقراری سے اس درجہ مجبور ہوئے ہیں کہ قانون اجرامِ فلکی کے خلاف مگر قانونِ عالمِ اسباب کی متابعت میں کچھ کچھ کر پچھم سے پورب جاچکے ہیں یا جارہے ہیں۔ کچھ فرخ آباد پہونچے۔ بہتوں نے قدردان بادشاہوں کے سایہ میں لکھنؤ میں پناہ پائی۔ کچھ نے یہ سمجھ کر کہ بقول آتش۔ شعر

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے

ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہیں

پٹنہ عظیم آباد اور مرشد آباد میں ڈیرے ڈالے۔

شاہی مجلس واجد علی شاہ کے حکم سے مجلس منعقد ہوتی ہے۔ ظلِ الٰہی کا ایما ہے کہ نظم اُن کی مدح وثنا سے شروع ہو۔ رُباعی پڑھیئے۔ سلام پڑھیئے۔ مرثیہ پڑھیئے یا مرثیہ کا سوتیلا بھائی مسدس پڑھیئے۔ اتنا یاد رہے کہ اگر دُنیا سنبھالنی ہے تو بانیٔ مجلس کا ذکرِ خیر ضرور کیجیے۔ حکومت زندہ کرامت ہوتی ہے۔ بڑے بڑے کامل مرثیہ گو جن کی فکرِ ثنائے اہلبیتِ اطہار کی ڈیوڑھی کے سوا کسی دنیاوی طاقت کا دَر نہ جھانکا تھا۔ بر سرِ منبر امام حسنؑ کی سخاوت اور خُلق سے پہلے شاہِ اودھ کی فیاضی اور حسینؑ ابن علیؑ اور عباسؑ علمدار کی شجاعت سے پہلے واجد علی شاہ کی بہادری کو (جسکی قلعی چند سال بعد تمام دنیا پر کُھل گئی) سراہ رہے ہیں۔ انیسؔ کی باری آتی ہے۔ میر حسنؔ کے پوتے اور خلیقؔ کے بیٹے کے لئے یہ سخت امتحان کا وقت تھا۔ منبر پر بیٹھتے ہیں مگر خاموش ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ادھر اُدھر دیکھتے ہیں رومال کھول کر ایک سلام اور ایک مرثیہ نکالتے ہیں۔ سب آنکھیں میر صاحب پر لگی ہوئی ہیں لیجیئے وہ پڑھنا شروع کر دیا۔ مطلع مُلاحظہ ہو۔

غیر کی مدح کروں شہ کا ثنا خواں ہو کر
مجرئی اپنی ہوا کھوؤں سُلیماں ہو کر

حق کی قوت بڑی زبردست قوت ہے۔ سب سے پہلے واجد علی شاہ کی زبان سے بیساختہ سبحان اللہ، سبحان اللہ نکلتا ہے۔ بادشاہ کو غیر قرار دے کر اُن کی تعریف سے انکار اپنے سلیمان اقلیمِ سخن ہونے کا بادشاہ کی موجودگی میں اعلان۔ ساتھ ساتھ بادشاہ سے اچھُتی سی معذرت۔ مگر ایسی معذرت کہ خودداری کا پہلو نکلتا رہے۔ کس کس خوبی کی داد دی جائے، اودھ کی چھوٹی سی اسلامی حکومت نے کیسے کیسے صاحبِ کمال پیدا کئے۔ یہ عہدِ کمال مریض کی مَوت سے پہلے کا سنبھالا تھا یا چراغ گُل ہونے سے پہلے اُس کی بھڑک تھی۔ جہاں انیسؔ کی بےمثل جُرأت کا فسانہ دنیا کو یاد رہے گا وہاں واجد علی شاہ کی مُنصفی بھی قابلِ داد ہے کہ مدّاحِ اہلبیت اور حسان بن ثابت کے معنوی شاگرد نے بھری مجلس میں شاہی تخت

ہلا دیا۔ تاج کے ہیرے موتیوں کو بے آب کر ڈالا۔ پھر بھی کلمۂ حق بادشاہ کی زبان پر جاری ہو گیا اسے بادشاہ کی حق پسندی کہیئے یا انیسؔ کا افسوں سمجھئے یا معجزۂ آلِ نبی[1] قرار دیجئے۔ جو چاہے سمجھ لیجئے، مگر یہ داستانیں اُس وقت تک نہیں مٹ سکتیں جب تک خود ہماری زبان نہ مٹ جائے۔ سچ تو یہ ہے انیسؔ کی جتنی قدر کی جائے کم ہے۔

مجلس کا مزید ثبوت

بعض حضرات کا خیال ہے کہ شاہی مجلس میں انیسؔ نے جو سلام پڑھا تھا وہ مونسؔ کا کہا ہوا ہے۔ مونسؔ کے مرثیوں کی مطبوعہ جلد میں یہ سلام موجود ہے۔ بعض جدّت طراز طبیعتیں اس نتیجہ پر پہونچی ہیں کہ مجلس کا افسانہ سب ڈھکوسلا ہے۔ نہ بادشاہ نے انیسؔ و دبیرؔ کا کلام سُننے کی غرض سے مجلس منعقد کی نہ دبیرؔ نے مجلس پڑھی نہ انیسؔ نے۔ بلکہ انیسیوں نے اپنے مقتدیٰ (ہیرو) کی شان بڑھانے کے لئے مجلس کا قصّہ گھڑھ لیا ہے۔ میرے نزدیک جب کسی واقعہ کے بارہ میں شہادت متضاد ہو کچھ لوگ یہ کہیں کہ ایک واقعہ ظہور پذیر ہوا اور کچھ لوگ اُس سے انکار کریں تو اثباتی شہادت انکاری شہادت پر قابلِ ترجیح ہے۔ ترجیح کے وجوہ صاف ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جو حضرات کسی امر کے واقع ہونے سے انکار کریں، بہت ممکن ہے کہ وہ اُس وقت موجود نہ ہوں یا اُس بات کی طرف خاص توجّہ نہ کی ہو۔ اگر اوّل شب میں چندر گرہن ہو اور گہن معمولی ہو تو بہت سے آدمیوں کو پتہ نہیں چلتا کہ چاند گہن میں ہے۔ اگر دوسرے دن عدالتوں میں چھٹی[2] ہونے کے باعث سُنا بھی، کہ رات چاند گہن میں تھا تو یہ بات کسے یاد رہے گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ جس زمانہ میں مجلس ہوئی اب اُس عہد کا کوئی آدمی زندہ نہیں ہے جو یہ کہے کہ بادشاہی مجلس نہیں

---

[1] اس نام کی ایک اردو کتاب جو نظم میں تھی میرے بچپن کے زمانہ میں بہت پڑھی جاتی تھی۔ کتب فروشوں کے یہاں اب بھی ملتی ہے۔

[2] ہمارے ملک میں ہندو بھائیوں کے عقائد کے احترام کے باعث جس رات کو چندر گرہن ہو اُس کے دوسرے دن سرکاری عدالتوں میں بالعموم چھٹی ہوتی ہے اور عدالتیں اور دفتر بند رہتے ہیں۔

ہوئی۔ ان دونوں باتوں کے علاوہ مولانا امجد علی اشہری نے اس واقعہ کا تذکرہ اپنی کتاب حیاتِ انیس[1] میں کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۳۲۵ہجری مطابق ۱۹۰۷ء میں لکھی گئی۔ کچھ زمانہ سرمایہ کے جمع کرنے میں بھی لگا ہوگا۔ مولانا اشہری نے تحقیق حالات کی غرض سے اپنے لکھنؤ جانے اور میر صاحب کے خاندان سے موصوف کے حالاتِ زندگی معلوم کرنے کا حال لکھا ہے۔ اُس وقت تک بہت سے ایسے حضرات زندہ موجود تھے جنھوں نے انیس و دبیر کا زمانہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ نانا صاحب کا انتقال ۱۸۹۶ء میں ہوا۔ مجلس کا ذکر کرتے موصوف کو میں نے اُس سے پہلے سُنا ہوگا۔ لکھنو کے حضرات کی زبان سے بھی میں نے اس مجلس کا حال سُنا۔ چودھری محمد علی صاحب تعلقہ دار امیر پور ضلع بارہ بنکی اتفاق سے اُس زمانہ میں دہلی میں موجود تھے جب میں اعمال نامہ کے ورق سیاہ کر رہا تھا۔ چودھری صاحب سے معلوم ہوا کہ اُن کے ماموں میر سید حسین صاحب تعلقہ دار پورائے نے اپنے ہوش میں انیس کو مجالس پڑھتے دیکھا تھا۔ نیز میر سید حسین نے بادشاہی مجلس میں میر انیس کے سلام پڑھنے کا حال اپنے بزرگوں سے سُنا تھا۔ چودھری صاحب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بادشاہی مجلس میں مرزا دبیر یہ کہہ کر منبر پر گئے تھے کہ میر صاحب محض مرثیہ گو اور ذاکر ہی نہیں آلِ رسول بھی ہیں میں ان کی پیش خوانی کرونگا اور ایک رُباعی واجد علی شاہ کی تعریف میں پڑھی۔ اُس کے بعد بڑی شان سے اپنا مرثیہ پڑھا اور خوب رقّت ہوئی۔ رہا اِس سلام کا مونس کے مطبوعہ مرثیوں کی جلد میں موجود ہونا، یہ کوئی دقّت طلب مسئلہ نہیں ہے۔ انیس کے متعدد مرثیہ مونس اور اُنس کے نام سے چھپے ہیں۔ بعض حضرات کو تو یہاں تک بدگمانی ہے کہ انیس کا غیر مطبوعہ کلام اب بھی اُنکے خاندان میں موجود ہے۔ بموقعہ محل سے اُسے نکال لیتے اور معرکۃ الآرا مجالس میں اپنے نام سے پڑھتے ہیں۔ اس بدگُمانی کا وحید مرحوم نے جو جواب دیا تھا اُس کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ میری ناچیز رائے یہ ہے کہ گو سلام مونس کے کلام میں موجود ہو لیکن بعض اور اشعار بھی زبانِ حال سے

---

[1] حیات انیس مؤلفہ مولانا سید امجد علی اشہری مطبوعہ مطبع آگرہ اخبار صفحہ ۲۹

پکار رہے ہیں کہ گو باغبان کی غلطی سے ہم کچھ دنوں مونس کے باغ میں رہے ۔ مگر در اصل ہم چمنِ انیس کے پھول ہیں ۔ اشعار ملاحظہ ہوں ۔

ابرِ نیساں نے جو دیکھا کرمِ دستِ حسینؑ　　پائے اقدس پہ لگا لوٹنے داماں ہو کر
خلد بھی حر نے لیا، حور بھی لی، کوثر بھی　　پڑ گیا لوٹ میں شبیر کا مہماں ہو کر
شاہ جب کہتے تھے بتلاؤ تو تقصیر مری　　سر جھکا لیتے تھے بید رو پشیماں ہو کر

غالب کی قدر مرنے کے بعد

غالب کو وہ مرتبہ اپنی زندگی میں نہ ملا جس کے وہ مستحق تھے ۔ مگر یہ کوئی نئی بات نہیں ہے ۔ دنیا میں اکثر ایسا ہوا ہے ، خواجو اپنے زمانہ میں فارسی داں دنیا پر ایسے چھائے تھے کہ معلوم ہوتا تھا اُن کا طوطی صدیوں بولے گا ۔ خود حافظ نے ان کا تذکرہ بڑے ادب سے کیا ہے اور اپنے کلام میں خراج تحسین ادا کیا ہے ۔ مگر آج خواجو کے نام سے بہت کم لوگ واقف ہیں ۔ بر خلاف اس کے ہر دل میں حافظ شیرازی کی جگہ ہے اور ہر لب پر اُن کے اشعار ہیں ۔ غالب کی قدر ہوئی ۔ مگر اُن کے مرنے کے بہت بعد ۔ اب اُن کو قبر میں چین کی نیند آئی ہوگی اور غالباً اپنا یہ شعر بھول گئے ہوں گے ۔ ؎

نہ ستایش کی تمنّا نہ صلہ کی پروا　　گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

بعض اوقات شاعروں کی وجدانی عالم کی پیشین گوئیاں بھی پوری ہوئی ہیں ۔ اسی ذیل میں غالب کے اس فارسی شعر کو شمار کرنا چاہیئے ۔ شعر

قدرِ شعرِ من بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن !
ایں مے از قحطِ خریداراں کہن خواہد شدن !

ترجمہ ۔ میرے اشعار کی قدر میرے بعد ہوگی ۔ اس وقت خریداروں کا اس قدر قحط ہے کہ میرے کلام کی شراب جب پرانی ہو جائے گی تب دنیا کو اُس کا مزہ آئے گا ۔

یہ سب تو ہوا مگر میرے نزدیک دو آدمیوں کے ساتھ زمانہ نے اُن کی حیثیت سے کم درجہ کا سلوک کیا ۔ مرثیہ گو شعراء میں علم و فضل کے اعتبار سے دبیر کا درجہ بہت بلند ہے ۔ شوکتِ الفاظ

کے باعث کلام میں عجب زور پیدا ہوگیا ہے۔ مضامین کی آمد کیا ہے دریا موجیں مار رہا ہے۔ انکی قوت متخیلہ نے بڑے انوکھے استعارے اور نازک تشبیہیں پیدا کی ہیں۔ ان استعاروں اور تشبیہوں نے اون کی مضمون آفرینی میں عجب بہار پیدا کر دی ہے۔ دوسرا شاعر جسکو دنیائے انجمن سخن میں اب تک وہ جگہ نہیں دی جسکا وہ مستحق تھا مومن ہے۔

دو شاعروں والی اکیلی صف

بظاہر زمانہ کا رجحان یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایک ہی وقت میں دو سے زیادہ اہلِ کمال موجود ہوں تو صرف دو چُن لئے جائیں اور بقیہ کے ساتھ سرد مہری برتی جائے۔ دہلی کے پہلے دور میں نظرِ انتخاب میر تقی میر اور مرزا رفیع سودا پر پڑی اور کسی کا چراغ نہ جلنے پایا۔ درد کا پُر درد نغمہ کسی نے سنا کسی نے نہ سنا۔ سوز کے کلام نے بھی وہ گرمی نہ پیدا کی جو فی الحقیقت اوس میں موجود ہے۔ انشا اور مصحفی کی معرکہ آرائیوں نے ناقدرانِ سخن کو اپنی طرف متوجہ رکھا۔ جرأت بھی ہمت کر کے میدان میں آئے مگر اون کے ساتھ بھی زمانہ نے وہی سلوک کیا جو بعد میں غالب اور ذوق کی موجودگی میں مومن کے ساتھ روا رکھا گیا۔ ناسخ اور آتش ہم رتبہ شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ اصغر علی خاں نسیم اور مظفر علی خاں اسیر بھی اوس عہد کے نامور شاعر تھے مگر نسیم کی ہوا بندھی نہ زمانہ کے مذاق نے اسیر کو اتنی آزادی دی کہ انجمن سخن میں آتش اور ناسخ کے پہلو بہ پہلو بیٹھ جاتے۔ آج سے پچاس پچپن برس پہلے دہلی اور لکھنؤ کے سب نامور شاعروں کو نواب کلب علی خاں مرحوم کی قدر دانی نے رام پور میں جمع کر لیا تھا۔ مگر مقبولیت عام داغ اور امیر ہی کو حاصل ہوئی۔ اسیر جلال تسلیم اور منیر بھی موجود تھے۔ مگر یہ دو شاعروں والی اکیلی صف جو میر و مرزا کے زمانہ میں اب سے دو سو پونے دو سو برس پہلے قائم ہوئی تھی بدستور قائم رہی۔ اور نواب کلب علی خاں کے عہد میں بھی اوس صف میں کسی تیسرے کو جگہ نہ ملی۔ غور سے دیکھئے تو لکھنؤ کی مرثیہ خوانی کے دورِ کمال میں زمانہ کی بدمذاقی کا گلہ کرنے والوں میں آپ کو مونس بھی نظر آئیں گے اون کے مرثیوں کی کئی چھپی ہوئی جلدیں موجود ہیں۔ انیس کی خصوصیات مونس کے کلام میں بھی موجود ہیں۔ بعض مرثیہ اس پایہ کے ہیں کہ اگر نام نہ معلوم ہو تو سننے والے کو یہ خیال ہوگا

کہ انیس کا کلام ہے۔ مونس کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔ شعر

کیا خبر مونس کہ بستر ہو گا کس جنگل میں کل
آج اس بستی میں آ نکلا فقیر اللہ کا

مگر عوام کے اسی رجحان کے ماتحت کہ اقلیم سخن میں دو بادشاہوں سے زیادہ کی حکومت بیک وقت نہ مانی جائے۔ مونس کا نام نہ چمکا۔ اون کے بھتیجے وحید کے مرثیے زبان کی صفائی اور بندش کی چستی کے لحاظ سے بہت اعلیٰ پایہ کے ہیں۔ جوانامرگ وحید اگر زندہ رہتے تو انیس ثانی ہوتے۔ زندہ تو ہیں اہل کمال کے ساتھ غفلت برتیں مگر اون کو فراموش نہیں کرتیں۔ بعض ادبی حلقے ساعی معلوم ہوتے ہیں کہ مومن کے ساتھ جو بے اعتنائی اگلوں نے برتی اوس کی تلافی کی جائے۔ اس سلسلہ میں نگار کا مومن نمبر بالخصوص قابل تذکرہ ہے۔

ادبی دنیا کی بھیڑ چال

دبیر کی طرف ابھی ملک کی توجہ نہیں معلوم ہوتی۔ ملک کے ادبی مذاق کی رفتار کو بھیڑ چال کہنا چاہیئے۔ بھیڑوں کے گلہ کا قاعدہ ہے کہ جدھر ایک یا دو آگے چلنے والی بھیڑیں جاتی ہیں باقی بھیڑیں بھی وہی راستہ چلتی ہیں۔ مولوی محمد حسین آزاد نے نظیر اکبر آبادی کے ساتھ بدسلوکی کی۔ انجمن شعر وسخن کے دروازہ پر دربان بن کر کھڑے ہوگئے۔ اور غریب نظیر کو نہ گھسنے دیا۔ مولانا شبلی کی کتاب موازنۂ انیس و دبیر" کا عوام پر یہ اثر ہوا کہ دبیر انیس کے ہم پلہ نہ رہے۔ مولانا شبلی موازنہ میں لکھتے ہیں" اردو علم ادب کی جو تاریخ لکھی جائے گی اوس کا سب سے عجیب تر واقعہ یہ ہو گا کہ مرزا دبیر کو ملک نے میر انیس کا مقابل بنایا اور اس کا فیصلہ نہ ہو سکا کہ ان دونوں حریفوں میں ترجیح کا تاج کس کے سر پر رکھا جائے"

موازنۂ انیس و دبیر

مولوی شبلی ایسے زبردست ادیب اور ناقد سخن تھے اور میں اون کی جامعیت سے اس درجہ متاثر ہوں کہ جو فیصلہ اونھوں نے کیا ہے اوس کی صحت کے تسلیم نہ کرنے کو ادبی بدعت سمجھتا ہوں۔ اگر میں اس بدعت کا ارتکاب کروں

تو اوس کی وجہ یہ ہے کہ موازنہ کے وقت انیس کا بلند اور بہت بلند اور دبیر کا پست اور بہت پست کلام اون کے پیش نظر تھا۔ موازنہ کا صحیح معیار یہ ہونا چاہیئے کہ ایک حریف کے بلند کلام کا دوسرے حریف کے بلند کلام سے اور پست کلام کا پست کلام سے مقابلہ کیا جائے۔ مقابلہ ہمرتبہ اشخاص یا اشیاء کا کیا جاسکتا ہے شہنشاہ عالمگیر کے بالمقابل غلام قادر روہیلہ کو لا کھڑا کرنا یا شہنشاہ اکبر کا میر جعفر نواب بنگالہ کو حریف قرار دینا کسی حالت میں جائز نہیں ہوسکتا نہ مرزا رفیع سودا اور ہدہد کو مقابلہ کے لئے ایک ہی صف میں جگہ دی جاسکتی ہے۔ کسی شاعر کا سارا کلام ہموار اور یک وزن نہیں ہوسکتا۔ بڑے سے بڑے شاعر کو لے لیجئے۔ اگر خود اوس کے بلند کلام کا پست کلام سے مقابلہ کیا جائے تو زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ دو آدمیوں کے کلام کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ شرط اور بھی ضروری ہے کہ مقابلہ ہم وزن چیزوں کے درمیان ہو۔ مولوی شبلی کی کتاب کی بڑی کمی تو یہ ہے کہ انیس کے کلام سے کتاب بھری پڑی ہے۔ کل کتاب ۲۸۴ صفحہ کی ہے۔ شروع کے بیس صفحوں میں عربی۔ فارسی اور اردو مرثیہ گوئی کا ذکر ہے۔ ۲۱۰ صفحے انیس کی نذر کئے گئے ہیں۔ دبیر کے حصہ میں صرف ۲۰ صفحے آئے ہیں۔ بقیہ صفحوں میں دونوں شاعروں کے کلام پر مولوی شبلی کی تنقید ہے۔ التزام یہ ہے کہ محض تنقید میں ہی نہیں بلکہ جہاں کلام نقل کیا ہے وہاں بھی جگہ جگہ انیس کو سراہا ہے اور اون کی بندشوں کی چستی۔ روانی۔ جذبات کے اظہار اور مناظر قدرت کی صحیح تصویر کھینچنے کے کمال کی جانب جابجا توجہ دلائی ہے۔ دبیر کے بہترین کلام کے ساتھ بھی اگر یہی فیاضی برتی جاتی تو غالباً دبیر کا پلّہ ہلکا نہ رہتا۔ اگر انیس کے بہترین کلام کا دبیر کے بہترین کلام سے مقابلہ کیا جائے تو میری ناچیز رائے میں ترجیح کا تاج بلا تامل کسی ایک کے سر پر رکھدینا دشوار کام ہوگا مولوی شبلی کو رائے قائم کرنے میں آسانی اس لئے ہوئی کہ موصوف نے نابرابر چیزوں کا مقابلہ کیا ہے اور جہاں انیس کا چیدہ کلام موازنہ میں درج کیا ہے۔ دبیر کا اوسی پایہ کا کلام منتخب نہیں کیا۔ سفر کی تکلیف اور گرمی کی شدت کا منظر دونوں صاحبوں نے اپنے کلام میں پیش کیا ہے۔ مولوی

شبلی نے میر انیسؔ کا بہت سا کلام موازنہ میں درج کیا ہے۔ جن میں سے دو بند یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

انیسؔ:—

وہ دن ہیں جن دنوں کوئی کرتا نہیں سفر — صحرا کے جانور بھی نہیں چھوڑتے ہیں گھر
رنج مسافرت میں ہیں سلطانِ بحر و بر — لب برگِ گُل سے خشک ہیں چہرہ عرق میں تر
آتی ہے خاک اُڑ کے یمین و یسار سے
گیسوئے مشکبار اٹے ہیں غبار سے

چلاتی ہے سکینہ کہ اچھے مرے چچا — محمل میں گھُٹ گئی مجھے پانی تو دو ذرا
بابا سے کہہ دو اب کہیں خیمہ کریں بپا — ٹھنڈی ہوا میں لے کے چلو تم پہ میں فدا
سایہ کسی جگہ ہے نہ چشمہ نہ آب ہے
تم تو ہوا میں ہو مری حالت خراب ہے

دبیرؔ کا کلام خود مجھے انیسؔ مرحوم سے بڑی عقیدت ہے اور میں موصوف کے کلام کا شیدائی ہوں۔ میرے نزدیک دونوں بند اس قابل ہیں کہ انیسؔ کے چیدہ کلام میں اون کو جگہ دی جائے۔ البتہ مجھے یہ شکایت ہے کہ اس مضمون پر دبیرؔ نے جو کچھ کہا ہے اوس کو موازنہ میں کسی سبب سے جگہ نہ ملی۔ دبیرؔ کے بھی دو بند سُن لیجئے۔

دبیرؔ:—

اب یوں کتب میں منزلِ آخر کا ہے بیاں — زہرا کا چاند اوّلِ شب کو ہوا رواں
منزل دراز۔ رات سیہ۔ راہ بے نشاں — جنگل مُہیب۔ خارِ مُغیلاں یہاں وہاں
تن غازیوں کے کانٹوں سے افگار ہو گئے
آلودہ خار سے گُلِ بے خار ہو گئے

سُنبل صفت قبا ہوئی ہر گُل کی تار تار — پلکوں کی طرح بھر گئے چشم زِرہ میں خار

زینب حسینؑ کے لئے ہو ہو کے بے قرار   کہتی تھی ڈھال روک لو مُنھ پر بہن نثار
کانٹے غضب ہیں باگ اُٹھائے ہوئے چلو
اکبر کو بھی سپر میں چھپائے ہوئے چلو

پہلے بند کے تیسرے اور چوتھے مصرعوں کے الفاظ اور ترتیب الفاظ قابلِ ملاحظہ ہیں۔ جب راستہ اچھا نہ ہو تو اندھیری رات کا سفر ہمیشہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ مگر جب راستہ کا نشان بھی نہ ہو اور اندھیری رات میں ایسے جنگل میں لمبا سفر کرنا پڑے جہاں کانٹے ہی کانٹے ہوں تو ان سب کیفیتوں اور حالتوں کے اظہار کے لئے اون الفاظ سے بہتر لفظ نہیں مل سکتے۔ جو دبیر نے منتخب کئے ہیں۔ ہر ہر لفظ سے منزل کی طوالت اور سفر کی صعوبت ٹپکتی ہے۔ پورا بند دبیر کی صنعت گری کی بڑی اچھی مثال ہے۔

دوسرے بند کے پہلے دو مصرعوں کی بلاغت کی تعریف کی جائے یا فصاحت کی۔ فارسی الفاظ میں ایک خاص قسم کا تناسب اور توازن موجود ہے۔ ترتیب کی ساخت نے عجب لطف پیدا کر دیا ہے۔ دونوں تشبیہیں کامل ہیں۔ گرمی کی شدّت اور راستہ کی دشواری کے باعث حضرت زینب جیسی سختی جھیلنے والی بہن سے بھی خاموش نہیں رہا جاتا۔ مگر اپنا خیال مطلق نہیں ہے۔ فکر یہ ہے کہ بھائی کو تکلیف نہ ہو۔ عرض کرتی ہیں مُنھ پر ڈھال روک لو۔ بیت کا آخری مصرعہ جس میں کانٹوں سے تحفظ کے لئے بھائی کو مشورہ دیتی ہیں کہ اکبر کو بھی سپر میں چھپائے ہوئے چلو۔ نہ صرف روزمرّہ کی بڑی نادر مثال ہے بلکہ اوس محبت کی کامل تصویر ہے جو پھوپی کو اوس بھتیجہ کے ساتھ ہو جس کو پھوپی نے بیٹے کی طرح پالا ہو۔

اس کتاب میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ میں انیس و دبیر کے کلام کی خوبیوں کا مقابلہ کرسکوں۔ انیس کی جو تعریف مولوی شبلی نے کی ہے اوس سے مجھے اتفاق ہے۔ مگر میرے نزدیک انیس کا رتبہ بڑھانے کے لئے دبیر کو اون کے اصلی مرتبہ سے گھٹانا بڑی ناانصافی اور بد ذوقی ہے۔ مولوی شبلی نے جو اعتراضات دبیر پر کئے ہیں اون کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے

دبیر کے کلام کے چند نمونے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولوی شبلی نے جب اپنی کتاب موازنہ لکھی تھی اوس وقت یہ کلام اون کے پیش نظر نہ تھا۔ دبیر کے چیدہ کلام کا میرے پاس کافی ذخیرہ موجود ہے۔ مگر اوس کو پیش کرنے کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے جس کا یہ محل نہیں ہے۔

حضرت علیؑ کی منقبت۔

خالق نے عطا کی شہِ مرداں کو یہ قدرت　　　لیں ان کی زباں سے جو ہو محتاجوں کو حاجت
گردوں نے بلندی لی۔ زمیں نے زر و دولت　　　یوسفؑ نے لیا حُسن سلیمانؑ نے حشمت
پر اِن کی قناعت ہے فزوں حدِّ بیاں سے
جز نام خدا آپ لیا کچھ نہ زباں سے

سارا بند بہت بلند ہے مگر ٹیپ کی زبان اور مضمون آفرینی دبیر کا حصہ ہے۔

حضرت عباسؑ کی مدح میں کہتے ہیں۔

دُنیائے دنی ان کا نشانِ کفِ پا ہے　　　لیکن وہ نشاں ہے کہ کفِ پا سے جُدا ہے
عُقبیٰ کی جو تعریف سُنا کرتے ہو کیا ہے　　　وہ اک رہِ باریک ہے۔ یہ راہ نُما ہے
لو سُن لو خلاصہ کہ یہ وہ خاصۂ حق ہے
بے اس کی گواہی کے نہ باطل ہے نہ حق ہے

شروع کے دو مصرعوں میں دنیا کا ممدوح کا نقشِ پا ہونا لیکن ایسا نقش جو پاؤں سے بالکل علیحدہ ہے بڑا نادر اسلوب بیان ہے۔ ٹیپ میں لفظ خلاصہ نے کیا مزہ دیا ہے۔ خاصانِ خدا کی اس سے زیادہ کیا تعریف ہوسکتی ہے کہ بغیر اون کی رہبری کے حق و باطل میں تمیز نہیں ہوسکتی۔

تلوار کی تعریف:۔

اُٹھی، گری بلند ہوئی، پست ہوگئی　　　پی پی کے مے کشوں کا لہو مست ہوگئی

اوٹھنا۔گرنا۔بلند وپست ہونا مستی کی علامت ہے۔جو مے کشوں کا خون پیئے گا وہ آپ ہی مست ہوگا۔

گرمی کا سماں :۔

چھالا ہے آفتاب کا گردوں کے پاؤں میں　　خود چھُپ رہی ہے دُھوپ درختوں کی چھاؤں میں

آفتاب کو چھالا قرار دینا بڑی دل آویز تشبیہہ ہے۔ دوسرے مصرعہ میں ایک بڑا نازک ایشیائی خیال قدرتی شاعری کے ملبوس میں جلوہ نما ہے۔ دبیر انگریزی نہیں جانتے تھے۔اس لئے اس انوکھی طرزِ ادا پر اور بھی قابلِ داد ہیں۔

گرمی کی شدّت میں فوّارہ کی حُسنِ تعلیل :۔

فوارہ کو نہ حوض میں گرمی سے کَل پڑی　　پانی کی بھی زبان دہن سے نکل پڑی

پہلے مصرعہ میں دعویٰ اور دوسرے مصرعہ میں ثبوت ہے۔ دوسرے مصرعہ کی بے ساختگی ملاحظہ ہو۔

دبیر کا ایک مرثیہ ہے جس کا مطلع ہے۔ "پرچم ہے کس عَلَم کا شعاع آفتاب کی"۔اس مرثیہ میں دبیر نے یہ روایت نظم کی ہے کہ عونؑ و محمّدؑ یوم عاشورہ اس بات کے خواہش مند تھے کہ فوجِ حسینی کا عَلَم اون کو ملے۔ یہ دونوں صاحبزادے جنابِ زینب کے بیٹے اور حضرت خاتم المرسلینؑ کے مشہور علمدار حضرت جعفر طیّار کے پوتے تھے۔جب امام حسینؑ نے عَلَم حضرت عباسؑ کو عطا کیا تو عونؑ و محمّدؑ کو ملال گزرا۔ دونوں بھائی ایک طرف او داس کھڑے ہیں عمر ابن سعد، شمر سے کہتا ہے کہ اب موقع ہے تو جا اور بہلا پھسلا کر عون و محمد کو میرے پاس لے آ۔ اگر وہ امام حسینؑ کی رفاقت چھوڑنے پر آمادہ ہوں تو ہم اون دونوں کو یزیدی فوج کا علمدار بنائیں گے۔شمر کو حضرت عباس کا عَلَم ملنا اس لئے بھی ناگوار ہوا تھا کہ وہ حضرت عباس کا ماموں ہونے کے تعلق سے پہلے کوشش کر چکا تھا کہ عباس امام حسین کا ساتھ چھوڑ دیں۔شمر عون و محمد کے قریب آتا ہے اوس کی اور عون و محمد کی گفتگو مرزا دبیر کے الفاظ میں ملاحظہ ہو۔

خم ہو کے[1] نیم قد یہ کیا شمر نے کلام — اے وارثانِ حیدرؑ و جعفرؑ[2] مرا سلام
یہ آن بان مان گئے رستمانِ شام — واللہ آج تم پہ ہے جرأت کا اختتام
یہ بانکپن نظر میں کھبا۔ جی میں گڑ گیا
سِکّہ دلوں میں آپ کی غیرت[3] کا پڑ گیا

حیراں ہیں سب یہ آپ کے ماموں نے کیا کیا — تم کو نہ حاملِ عَلَمِ مصطفیٰؐ کیا
منصب تمہارا[4] بھائی کو اپنے عطا کیا — لشکر سے اون کے آپ اٹھ آئے بجا کیا
سمجھیں نہ جب بزرگ تو خوردوں کو چارہ کیا
اُلفت خدا کی دین ہے اس میں اجارہ کیا

ہر قوم و ہر دیار کے یاں بھی ہیں کج کلاہ — رَن کی بساط۔ تیغ کا دم۔ رونقِ سپاہ
دُرِ نجف نہیں مگر ان میں خدا گواہ — فرمائیے جو آپ قدم رنجہ واہ واہ
جب ہاشمی کہیں کہ جگر ہم نبیؐ کے ہیں
چلّاؤں میں اِدھر بھی نواسے علیؑ کے ہیں

نعرہ کیا علیؑ کے نواسوں نے یک بیک — بس بس زیادہ منہ سے نہ اب واہیات بک
چُپ نابکار چُپ۔ سرک او بے ادب سرک — تیرے فریب و مکر سے اب کانپ اٹھے فلک

---

[1] قاعدہ ہے کہ اپنے سے زیادہ مرتبہ کے اشخاص سے آدمی جھک کر بات کرتا ہے۔

[2] یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ عون و محمد حضرت علی کے نواسے اور حضرت جعفر طیار کے پوتے ہونے کے باعث عَلَم پانے کا دوہرا استحقاق رکھتے تھے۔ شمر ایسی باتوں سے دونوں صاحبزادوں کو اشتعال دینا چاہتا ہے۔

[3] مطلب یہ ہے کہ آپ جو علیحدہ کھڑے ہیں آپ کی ناراضی بجا ہے۔ شمر نے مصلحتاً یہ فرض کر لیا ہے کہ دونوں بھائی امام حسینؑ سے ناراض ہیں۔ بہکانے کی غرض سے دونوں کی غیرت کی داد دیتا ہے۔

[4] جھوٹی ہمدردی ظاہر کر کے شمر بتا رہا ہے کہ حق تو آپ دونوں کا تھا۔ مگر امام حسینؑ نے بھائی کی محبت میں عباس کو عَلَم دے کر آپ دونوں کی حق تلفی کی۔

بہکا او نھیں خدا کو جو پہچانتے نہ ہوں
ظالم یہ اون سے کہہ جو تجھے جانتے نہ ہوں

ہم اور وہ ہیں ایک تجھے ہے خیال کیا — اون کو ملا ہیںؑ کو ملا قیل و قال کیا
یہ تو ہماری عین خوشی تھی ملال کیا — حکمِ امام میں ہو تفاوت محال کیا
اس رہنما پہ خضرؑ بھی الیاسؑ بھی نثار
ہم بھی، عَلَم بھی فوج بھی عباسؑ بھی نثار

او شمر کس شمار میں تو اور ترا یزید — اور کس قطار میں یہ صفِ لشکرِ پلید
شاہوں میں بندوبست تھا شدّاد کا شدید — آج اوس کی خاک تک بھی زمیں سے ہے ناپدید
نمرود کو خدائی کے دعوے سے کیا ملا؟
بندوں میں جس نے ترک خودی کی خدا ملا

دروازے اس چمن کے ہیں دو، اک سوا اک جدا — درباں ہے ایک دَر پہ حیات، ایک پر قضا
مشتاق سیر باغ کو عبرت کی ہے ندا — اک در سے آ تماشہ کو، اور ایک دَر سے جا
شاہ و گدا کا مسند و بستر سے کُوچ ہے
اک در سے داخلہ ہے اور اک در سے کُوچ ہے

شمر اپنا سا مُنھ لے کر واپس جاتا ہے۔ شمر کی ریشہ دوانی کی اطلاع خیمۂ عصمت میں ہوتی ہے

لہ عزیزوں میں باہم تھوڑی بہت شکایت بھی ہو تو غیر کے سامنے اوسے ظاہر نہیں ہونے دیتے۔

ٹہ دبیر نے ایک مصرعہ میں سچّے جذبات کی وہ مکمّل تصویر کھینچی ہے کہ دیکھا کیجئے۔ ٹیپ کے پہلے مصرعہ میں بتایا ہے کہ رہنما کی حیثیت سے امام حسین کا درجہ حضرت خضر اور حضرت الیاس سے کہیں اونچا ہے۔

سٹہ ہمارے مقدّس مذہب کی سچی تعلیم کیسے دل کش اور مختصر الفاظ میں بیان کر دی ہے۔

ٹکہ اس بند میں دنیا کی بے ثباتی اور انسان کے انجام کی عبرت انگیز تصویر ہے۔ عون و محمد شمر کو جواب دے رہے ہیں کہ دنیا کا یہ حال ہے اور تو ہمیں جاہ و منصب کا لالچ دینے آیا ہے۔

دونوں صاحبزادے بُلائے جاتے ہیں اوس وقت کا منظر ملاحظہ ہو۔

— شیروں سے ڈر کے بھاگ گیا شمرِ بدسگال　　جس طرح چوٹ کھا کے بھرے چوکڑی غزال
راہی حرم سرا کو ہوئے یہ مَلک خصال　　کچھ غصّہ کچھ حجاب کچھ افسوس کچھ ملال
چلنے میں شرم سو قدم آگے بڑھی ہوئی
مُنھ اوترا اوترا غصّہ سے تیوری چڑھی ہوئی

مولوی شبلی نے میر انیس کے ایک مشہور مرثیہ کے جس کا مطلع ہے "بخدا فارسِ میدانِ تہوّر تھا حُر" بہت سے بند موازنہ میں نقل کئے ہیں اور اون کا مقابلہ مرزا دبیر کے ایک مرثیہ سے کیا ہے جو حضرت حُر کے حال میں ہے۔ میرے نزدیک مناسب ہوتا اگر مولوی شبلی انیس کے مرثیہ کا دبیر کے اوس مرثیہ سے مقابلہ کرتے جو حضرت عون و حضرت محمد کے حال میں ہے۔ اور جس کے آٹھ بند میں نے اوپر نقل کئے ہیں۔ اِس مرثیہ میں دو سو تیس بند ہیں یہ سارا مرثیہ اوس شئے سے بھرا ہوا ہے جسے مولوی شبلی فصاحت کہتے ہیں۔ اگر کسی خاص مضمون پر کلام کی خوبی کو دیکھا جائے تو حضرت حُر کے حال میں سب سے اچھا مرثیہ مونس نے کہا ہے جس کا مطلع ہے "مجلس افروز ہے مذکورِ وفا داریٔ حُر" دبیر نے ہر رنگ اور ہر انداز میں مرثیے کہے ہیں۔ بہت سے مرثیے اوس رنگ میں بھی ہیں جو مولوی شبلی کو مرغوب ہے۔ میں اِس مرثیے کے جس کا مطلع ہے۔ "جب حرم قلعۂ شبیر کے برابر آئے" چند بند نقل کرتا ہوں۔ پورا مرثیہ پڑھنے کے قابل ہے۔ صاحبانِ ذوق و انصاف سارا مرثیہ پڑھنے کے بعد خود طے فرما سکتے ہیں کہ دبیر پر غیر فصیح ہونے کا الزام کس قدر بے بنیاد اور دور اُفتادہ ہے۔

جب حرم قلعۂ شبیر کے برابر آئے　　غُل ہوا کعبہ سے مولا مع لشکر آئے
کہا شبیر نے کہ ارمان دلی بر آئے　　میرے مولا۔ مرے سلطان۔ مرے سرور آئے
شانِ حق نُورِ خدا قدرتِ باری دیکھو!
جاؤ لوگو مرے آقا کی سواری دیکھو

روک دی سامنے دروازہ کے پردہ کی قنات		اور چلّائی یہ ہمسایوں کو وہ خوش اوقات
صاحبو جوڑ کے ہاتھوں کو میں کہتی ہوں یہ بات		جب اوترنے لگیں سادات رفیع الدرجات
پاؤں مَردوں کا نہ دروازہ سے بڑھنے دینا
اپنے لڑکوں کو بھی کوٹھے پہ نہ چڑھنے دینا

قافلہ کے ساتھ جو فوج کوفہ سے آئی ہے وہ اس طرح اظہار فخر کر رہی ہے۔

کوئی کہتا ہے بڑے شیر کو مارا ہیں نے		نہ کیا قتل سے سقّہ کے کنارا ہیں نے
ایک کہتا ہے کہ بدعت کی گوارا ہیں نے		سرِ ہم شکلِ نبیؐ تن سے اُتارا ہیں نے
کوئی کہتا ہے عجم اور عرب کو مارا
اِس نبیؐ زادے کو کیا مارا کہ سب کو مارا

شیریں کو جب معلوم ہوا کہ یہ لُٹا ہوا قافلہ اہل بیت نبوی کا ہے تو وہ گھبرا کر نکل آئی[1] دلبری کی بلاغت دیکھئے حضرت بانو کا یہ فرمانا کہ یہاں حضرت زینب کا ہم نام کوئی نہیں ہے بالکل سچی بات ہے۔

پاؤں ننگے میں نکل آئی ہوں مشتاقِ امام		ٹھنڈا ہوتا ہے وہاں گھر میں ضیافت کا طعام
بولیں بانو کوئی زینب کا نہیں یاں ہمنام		سبھی قیدی سبھی مظلوم سبھی ہیں ناکام
تیرا مہمان ہے صادق ترے گھر آئے گا
ذبح کر ڈالے گا گر کوئی تو سر آئے گا

پاؤں پر گر کے کہا سر تو اُٹھاؤ بی بی		ہائے کیا ہو گیا یہ جلد سناؤ بی بی
میرے آقا تو سلامت ہیں بتاؤ بی بی		علی اکبر کی ہوں مشتاق دکھاؤ بی بی
لو گنہگار نہ فرماؤ میں قربان گئی
علی اکبر کی تمھیں ماں ہو میں پہچان گئی[2]

---

[1] ایک روایت ہے کہ شام کو جانے سے پہلے شیریں نے امام حسین کو اپنے یہاں تشریف لانے کی دعوت دی تھی اور امام نے دعوت کو رد نہیں کیا تھا۔ [2] دونوں مرثیوں کی روایتیں ضعیف ہیں مگر اس وقت خوبیٔ کلام سے بحث ہے۔

جناب علی اکبرؑ کی میدان میں آمد:۔

نورِ نظرِ شاہ جو گھر سے نکل آیا　　حیران ہیں سب، چاند کدھر سے نکل آیا

حیرت نے استعارہ کی خوبی کو چار چاند لگا دئے ہیں

دبیرؔ کی رباعیاں بڑی دل کش اور فلسفۂ توحید سے معمور ہیں۔ اگرچہ یہ بحث طویل ہو گئی ہے۔ تاہم امید ہے کہ بعض رباعیوں سے جو ذیل میں لکھی جاتی ہیں ناظرین لطف اندوز ہوں گے۔

رُباعی

رحمت کا تری امیدوار آیا ہوں　　منھ ڈھانپے کفن سے شرمسار آیا ہوں
چلنے نہ دیا بارِ گنہ نے پیدل　　اس واسطے کاندھوں پہ سوار آیا ہوں

دیگر

یارب جبروتی تجھے زیبندہ ہے　　ہر تن ترے سجدے میں سرافگندہ ہے
توحید کا کلمہ ہی پڑھتا ہے دبیرؔ　　جو تیرے سوا ہے وہ ترا بندہ ہے

دیگر

بے دوست کے ہے زیست ندامت یہ ہے　　مر جائیں تو حسرت کی علامت یہ ہے
موقوف ہے دیدِ رفتگاں محشر پر　　محشر میں ہے دیر کیا قیامت یہ ہے

دیگر

خامہ بھی مری طرح سیہ کار نہیں　　یہ مشقِ گنہ کسی کو زنہار نہیں
گر خوفِ برابری نہ ہو صاف کہوں　　مجھ سا عاصی خدا سا غفار نہیں

دبیرؔ کی سیرت دبیرؔ بڑے سادہ مزاج اور مرنجان مرنج آدمی تھے۔ ساری عمر کبھی کسی سے اکڑ کر بات نہیں کی۔ منکسر المزاجی کے ساتھ بڑے فیاض تھے۔ مروت کا یہ عالم تھا کہ لوگوں کا چاروں طرف ہجوم رہتا تھا۔ کسی کی درخواست تھی کہ مجھے مرثیہ لکھ دیجئے۔ کوئی سلام لکھانے کی خاطر مرزا صاحب کا مجرائی بنا تھا۔ کوئی رباعی لکھا کر اپنے حواس خمسہ درست

کرنا چاہتا تھا۔ کوئی آنکھوں میں آنسو بھرے نوحہ کے لئے فریاد کرتا تھا۔ مرزا صاحب حتیٰ المقدور لوگوں کی فرمائشیں پوری کرتے تھے اور خود تکلیفیں اُٹھا کر دوسروں کے کام آتے تھے۔ مرجع خلائق بننے سے دبیر کا نام اوس زمانہ میں بحیثیت مخیر اور حاجت روا انسان کے روشن ہو گیا۔ مگر بحیثیت شاعر اُنھوں نے اپنے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ طبیعت ہر وقت یکساں حاضر نہیں رہتی۔ اعلیٰ شاعری کے لئے خواہ وہ مرثیہ ہو یا کوئی اور صنفِ شعر، یکسوئی لازمی ہے۔ جو شخص درخواست کو رد کرنا اپنے شعار کے خلاف سمجھے اور ہر کس و ناکس کی فرمائش پر مرثیہ۔ سلام۔ رباعی یا نوحہ لکھ ڈالے اوس کے کلام میں ہمواری کیسے قایم رہ سکتی ہے۔ مرزا صاحب کے مرثیوں کی دو مطبوعہ جلدیں تو میں نے اپنے لڑکپن میں دیکھی تھیں۔ غالباً بیس جلدیں اب اور چھپ گئی ہیں۔ کاش غالب کی طرح دبیر کو بھی اپنا بہترین کلام منتخب کرنے اور بقیہ کلام کو تلف کر دینے کا موقعہ مل جاتا پھر اون کی تعقیدوں اور بعض سُست بندشوں پر جو آئے دن اعتراض ہوتے رہتے ہیں اون سے دبیر کو اور اون قدر دانوں کو جو موصوف کا فنِ مرثیہ گوئی کے سب سے بڑے صاحبانِ کمال میں شمار کرتے ہیں نجات مل جاتی۔

مرزا دبیر کی نیک مزاجی اور تحمل کا ایک قصہ سنئے۔ سید اخلاق حسین بیرسٹر لکھنو نے جو غالی انیسئے ہیں یہ قصہ مجھ سے بیان کیا۔ اون کے نانا میر محمد افضل سیتا پور کے رہنے والے تھے غدر کے چند سال بعد مرزا دبیر ایک مجلس پڑھنے سیتا پور گئے۔ میر محمد افضل اوس زمانہ میں بالکل نوجوان تھے۔ صاحب استعداد ہونے کے ساتھ شعر و سخن کا بھی ذوق تھا۔ مرزا صاحب اون سے مل کر بہت خوش ہوئے اور ازراہِ شفقتِ بزرگانہ فرمایا میں آپ کو اپنے مرثیے بھیجوں گا جس مجلس میں چاہنا پڑھنا۔ میر محمد افضل نے کہا میرے پاس میر انیس کے ڈھیروں مرثیئے موجود ہیں۔ میں انیسیہ ہوں اور میر انیس کے سوا اور کسی کے مرثیئے نہیں پڑھتا۔ مرزا صاحب مسکرائے اور فرمایا "ہاں میاں بڑی اچھی بات ہے کہ آپ میر صاحب کا کلام پڑھتے ہیں۔ وہ اِسی مرتبہ کے مرثیہ گو ہیں۔ آپ اُنھیں کا کلام پڑھیں۔" کاش مرزا دبیر یا میر انیس کے اپنے قلم کے لکھے ہوئے

مرثیہ کی دولت میرے گھر ہوتی۔ نانا صاحب کے انتقال کے بعد جن جن زمینداریوں میں اور لوگ
بھی شریک تھے اون کا لمبردار میں مقرر ہوا۔ میرا میلانِ خاطر جائداد کے انتظام کی طرف مطلق نہ تھا۔
مگر لمبردار مقرر ہونے کے بعد لکھوائے۔ مصرعہ۔ گر نہ ستانی بہ ستم می رسد۔ مجھے نگریا سادات میں
ٹھہرنا اور انتظام کرنا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مرادآباد گورنمنٹ ہائی اسکول میں ڈیڑھ مہینہ دیر سے داخل
ہوا۔ دوسرے اور پہلے درجہ کو انگریزی نظم اور جبر مقابلہ بابو الیشان چندر بنرجی صاحب پڑھاتے
تھے۔ ترجمہ بھی خود درست کرتے تھے۔

بابو الیشان چندر بنرجی ہیڈ ماسٹر

بابو الیشان چندر بنرجی صاحب مرادآباد گورنمنٹ ہائی اسکول کے پہلے ہندوستانی ہیڈ ماسٹر تھے ۱۸۹۲ء
میں ہیڈ ماسٹر ہو کر مرادآباد آئے تھے۔ پنشن لینے کے بعد یہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہ بی۔ اے
یا ایم۔ اے نہیں تھے۔ اون کی طالب علمی کے زمانے میں کلکتہ یونیورسٹی ۱۸۵۶ء میں نئی نئی قایم
ہوئی تھی۔ مگر بابو صاحب کی قابلیت میں کلام نہ تھا۔ انگریزی کے بہت سے اشعار زبانی یاد تھے۔
میٹریکولیشن اور دوسرے درجہ کو (زمانہ کا اُلٹ پھیر دیکھئے اب پہلے درجہ کو دسواں اور دوسرے
کو نواں درجہ کہتے ہیں) انگریزی وہ خود پڑھاتے تھے۔ اُردو سے انگریزی میں ترجمہ کا گھنٹہ
بڑا پُرلطف ہوتا تھا۔ کیسا ہی اچھا ترجمہ کسی طالب علم نے کیا ہو بابو صاحب کاٹ کر پھینک دیتے
تھے۔ لڑکے تو شیطان کے کان کاٹتے ہیں۔ میری جماعت کے ایک دل چلے طالب علم نے یہ
غضب کیا کہ ایک ترجمہ میں اڈیسن کے جو انگریزی زبان کا مشہور ادیب ہے پورے فقرے
کے فقرے نقل کر دیئے۔ مگر بابو صاحب کی ناظر فدا رہمت قابلِ داد ہے اونھوں نے اڈیسن
کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جس کے تختۂ مشق ہم سب تھے۔ یعنی اڈیسن کی عبارت کو کاٹ چھانٹ
کر مولسری کے ہرے بھرے خوبصورت درخت کو آن کی آن میں بیساکھ جیٹھ کا جلا جھلسا بدنما ببر[1] کا

---

[1] جیٹھ کے مہینہ میں ببری کے سب پتے جھڑ جاتے ہیں اور ببر کے پیڑ سے زیادہ بدنما درخت اوس زمانہ میں اور کوئی نہیں ہوتا۔ صرف ٹھنڈ رہ جاتا ہے۔ برسات کی پہلی بھرن کے بعد کونپلیں پھوٹتی ہیں۔

پیڑ بناڈالا اپنے شاگردوں کو یاد رکھتے تھے اور اون کے عروج پر خوش ہوتے تھے ـــــ جب میں
مرادآباد میں وکالت کرتا تھا تو میری کامیابی کو دیکھ دیکھ ایسا ہی باغ باغ ہوتے تھے جیسا
میرا کوئی قریبی رشتہ دار۔ بابو صاحب کے انتقال کو پچیس سال سے زیادہ ہو گئے۔

مڈل پاس کرنے کے بعد مجھے اطمینان کی پڑھائی نصیب نہ ہوئی۔ بار بار نگریا سادات جانا
پڑتا تھا۔ بارے خدا خدا کر کے ۱۸۹۶ء میں نانا صاحب کی متروکہ جائداد ورثا میں تقسیم ہوگئی اور
منجھلے چچا میر نثار حسین کی مدد سے جن کو مجھ سے بڑی محبت تھی والدہ کے حصہ کی زمینداری فروخت
کر کے نانا صاحب کا وہ قرضہ جس کی ادائگی بوقت تقسیم والدہ کے ذمہ لگائی گئی تھی ادا کر دیا۔ جو
روپیہ بچا تھا وہ میری تعلیم میں کام آیا۔ نانا صاحب کے ایک ہندو دوست نے ازراہِ ہمدردی
فرمایا کہ قرضہ میں مسلمانوں کی زمینداریاں نیلام ہوتے تو اکثر دیکھی ہیں۔ مگر ایسا اتفاق بہت
کم ہوتا ہے کہ مورث کا قرضہ وارث جائداد بیچ کر ادا کر دیں۔ اُسی زمانہ میں لاہور سے مسلمانوں کا
انگریزی اخبار "پنجاب آبزور" ہفتہ وار نکلنا شروع ہوا تھا۔ والد صاحب نے یہ اخبار میرے نام
جاری کرا دیا۔ تاکہ انگریزی زبان سے میری واقفیت بڑھے۔ اوس زمانہ میں کلکتہ سے انگریزی
میں ہفتہ وار اخبار "مسلم کرانیکل" مسٹر عبدالحمید کی اِدارت میں نکلتا تھا۔ خاصا اچھا اخبار تھا۔ مگر
ہمارے صوبہ میں اوس اخبار کا نام جاننے والے بہت کم آدمی تھے۔

جنگ ٹرکی و یونان

۱۸۹۷ء کے موسم گرما میں ٹرکی اور یونان میں لڑائی چھڑی اور چھ
ہفتے کے اندر غازی ادھم پاشا نے یونانیوں کو شکست پر شکست دے
کر یونانی افواج کا خاتمہ کر دیا۔ میں اسکول کی سالانہ تعطیل میں کندرکھی چلا آیا تھا۔ پنڈت پرتاب کشن
کے پاس انگریزی کا ایڈوکیٹ اخبار آتا تھا جو بابو گنگا پرشاد ورما کی اِدارت میں لکھنؤ سے ہفتہ
میں دو بار نکلتا تھا۔ پنڈت صاحب براہِ کرم یہ اخبار میرے پاس کندرکھی بھیج دیا کرتے تھے۔
جس دن اخبار آتا تھا کندرکھی کے بیشتر معزز مسلمان جن کو لڑائی کی خبروں سے دلچسپی تھی ہمارے
مردانہ مکان میں جمع ہو جاتے تھے۔ اور والد کی موجودگی میں میں خبروں کا ترجمہ کر کے سب کو

سناتا تھا۔ حکیم سید حسین صاحب ٹرکی کے بڑے مداح اور ٹرکی کو دنیائے اسلام کا حامی سمجھتے تھے۔ سب مسلمانوں کو ٹرکی سے بڑی ہمدردی تھی۔ حکیم صاحب سے معلوم ہوا کہ ۱۸۷۸ء میں جب روس اور ٹرکی میں لڑائی ہو رہی تھی تب بھی میرے دادا صاحب اور حکیم صاحب ایک اُردو کا اخبار مراد آباد سے منگا کر اہلِ قصبہ کو خبریں سنایا کرتے تھے۔ جون کے مہینہ میں ایک دن اخبار میں پڑھا کہ زارِ روس کی تحریک پر لڑائی بند ہو گئی۔ ایڈوکیٹ میں جو خبر تھی اس کی سُرخی مجھے اب تک یاد ہے۔ The Tsar intercedes, the Sultan accedes

ترجمہ۔ زارِ روس بیچ میں پڑتے ہیں سلطان مان لیتے ہیں۔

سُلطان عبدالحمید خاں کی پالیسی اور انور پاشا کے کارنامے

سلطان عبدالحمید خاں مرحوم نے اور جو کچھ کیا ہو۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ۱۸۹۷ء میں ٹرکی کی زبردست فوجی قوّت کا جو ثبوت انھوں نے دیا اس کے اظہار سے انور پاشا تیرہ برس بعد قاصر رہے۔ افسوس ہے کہ جُوں جُوں عمر بڑھتی گئی سلطان کو حکومت کی ہوس زیادہ ہوتی گئی۔ دول یورپ کی دراز دستیوں کا جواب صرف یہ ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی قوم میں نئی رُوح پھونک کر اس کی تنظیم کرتے۔ مگر سلیمان اعظم کا جانشین تلوار اور نیزہ کی بجائے دول یورپ کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے اور اپنے ملک میں آزادی اور تنظیم کا گلا گھونٹنے کا عادی ہو گیا تھا۔ بھلا یوروپین بھیڑیوں کے آگے اس بوڑھی بھیڑ کی کیا چلتی نتیجہ یہ ہوا کہ ٹرکی کی پولیٹیکل حالت امیر عبدالرحمٰن خاں کے افغانستان کی طرح ہو گئی۔ اندرونی تحریک تنظیم کا سختی سے استیصال کرنے کا انجام یہ ہوا کہ ۱۹۰۹ء میں تخت سے ہاتھ دھونا پڑے۔ میں نہیں چاہتا کہ شہید انور پاشا کی خوبیاں دنیا پر ظاہر نہ ہوں۔ اس لئے یہ بتانا ضروری ہے کہ سلطان عبدالحمید خاں کو ایک یونان سے جنگ درپیش تھی۔ ۱۹۱۱ء میں بلقان کی ساری حکومتیں غریب ٹرکی پر ٹوٹ پڑیں۔ یہ ناممکن ہے کہ دول یورپ کو بلقانی حکومتوں کی سازش کا حال پہلے سے نہ معلوم ہو۔ غریب انور پاشا کس کس سے لڑتا تاہم شتلجہ لائن پر ترکوں نے جس طرح

داد شجاعت دی۔ اوس نے دنیا کو بتا دیا کہ قوم کی قوم میر مونس کے اس مصرعہ پر عامل ہے مصرعہ۔
ایسا مرنا تو حیاتِ ابدی ہے واللہ۔

دول یورپ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھیں کہ یورپ کے مریض[1] کا خاتمہ کب ہوتا ہے۔ اونھیں کیا غرض پڑی تھی کہ غریب ترکوں کی مدد کرتیں۔ اوس عالم دار وگیر میں ایک ترک نے پارلیمینٹ میں جو تقریر کی تھی اوس کا ایک فقرہ قابل تذکرہ ہے۔ اوس نے کہا تھا "یورپ والوں کا خیال ہے کہ ہم کو زندہ رہنے کا حق نہیں ہے۔ تجربہ سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ خیال صحیح ہے یا نہیں مگر دول یورپ کو یاد رہے کہ ہمیں ایک ایسا حق حاصل ہے جو کوئی قوم ہم سے نہیں چھین سکتی۔ وہ حق یہ ہے کہ تلوار ہاتھ میں لے کر میدان جنگ میں ہم سب کے سب اپنے سر کٹا دیں۔ ماریں اور مر جائیں"۔ اوس جوانمرد ترک نے جو کچھ کہا تھا اوس کی قوم نے کر دکھایا۔ شتلجہ لائن میں خون کی بارش ہوئی مگر لہو کے ہر قطرہ نے ترکی قوم کو نئی زندگی عطا کی۔ زندہ قوموں کے افراد بلکہ کثیر التعداد افراد کی موت کو میر انیس کے اِس شعر کا مصداق سمجھنا چاہیے۔ شعر

خود نویدِ زندگی لائی قضا میرے لئے
شمعِ کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لئے

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میں نے مڈل پاس کرنے کے بعد فارسی زبان کا مضمون چھوڑ دیا تھا میرا خیال تھا کہ مکتب کے پڑھے ہوئے کا انگریزی اسکول میں فارسی لینا تحصیل حاصل ہے۔ فارسی کی بجائے میں نے سائنس یعنی فزکس اور کیمسٹری لی تھی۔ سائنس کی تعلیم ہمارے اسکول میں دو برس پہلے جاری ہوئی تھی۔ بابو گرو چرن کیمسٹری میں الہ آباد یونیورسٹی سے ایم۔ اے پاس کر کے نئے نئے آئے تھے۔ موصوف بابو درگا چرن سنیجر بورڈنگ ہاؤس کے بیٹے تھے۔ اور سائنس کے استاد مقرر ہوئے تھے۔ مجھے سائنس پڑھنے میں لطف آتا تھا مگر نگریا سادات کے آنے جانے نے ساری خواندگی میں خلل ڈال رکھا تھا۔

انٹرنس کا امتحان اور آگرہ کا سفر

جوں توں کر کے مارچ ۱۸۹۵ء میں امتحان کے لئے ہم آگرہ روانہ ہوئے۔ اوس زمانہ میں انٹرنس کا امتحان مراد آباد

---

[1] دول یورپ نے ٹرکی کا نام یورپ کا مریض رکھا تھا۔ مسٹر گلیڈسٹن انگلستان کے مشہور وزیر اعظم ٹرکی کا حوالہ دیتے ہوئے اکثر یہ نیا استعارہ استعمال کرتے تھے۔

میں نہ ہوتا تھا۔ مراد آباد سے لڑکے ہر سال امتحان میں شرکت کے لئے بریلی جایا کرتے تھے۔ میں بریلی کے گلی کوچوں سے خوب واقف تھا۔ چاہتا تھا کہ ہم سب کسی نئی اور بڑی جگہ امتحان دینے جائیں۔ میری تحریک پر میرے ہم جماعت طلبا نے آگرہ جا کر امتحان میں شرکت کی خواہش ظاہر کی اور بابو ایشان چندر بنرجی نے ہماری بات مان لی۔ میں آگرہ میں منشی امداد علی صاحب کے یہاں ٹھیرا تھا جو اس وقت وہاں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ اصلی رہنے والے مراد آباد کے تھے۔ بڑے زندہ دل آدمی تھے۔ قیام کا انتظام قیام الدین نے کیا تھا۔ بالائی منزل پر ٹھیرنے کو جگہ ملی۔ آخر مارچ میں آگرہ میں وہ گرمی اور تپش تھی کہ مراد آباد کی مئی یاد آتی تھی۔ معلوم نہیں اکبر و جہانگیر نے آگرہ کو کیوں دارالسلطنت بنایا تھا۔ شاید راجپوتانہ کا قرب اور فوجی نقل و حرکت کی سہولت آگرہ کو اکبر آباد بنانے کا باعث ہوئی۔ آگرہ میں ہم سب طالب علموں نے تاج محل کی سیر کی۔ شاہجہاں کی صنعت گری کو ہم طالب علم کیا خاک سمجھتے۔ مگر آبدار اور نہایت خوبصورت تراشے ہوئے ہیرے سے جو چکا چوند نا آشنا آنکھوں میں پیدا ہوتی ہے وہی کیفیت اپنی بھی تھی۔ ہم تاج محل کی خوبی بیان نہ کر سکتے تھے مگر اتنا احساس ضرور تھا کہ تاج عجیب و غریب عمارت ہے۔ سر سید احمد خاں کے انتقال کی خبر ہم نے آگرہ میں سُنی تھی۔ خبر سن کر مجھے افسوس نہیں بلکہ صدمہ ہوا تھا۔

امریکی مصنّف اور اسلام

آگرہ سے میں نے واشنگٹن ارونگ Washington Irving کی دو کتابیں یعنی حضرت ختم المرسلینؐ اور خلفائے راشدین کی سوانح عمریاں خریدی تھیں۔ پہلی جلد میں سرورِ دو عالم کی تصویر بھی تھی۔ یہ تصویر مغرب کی اسلامی تعلیم سے ناواقفیت کا جیتا جاگتا مرقع تھی۔ یعنی تصویر میں رسولؐ کریم کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ ذرا اس ستم ظریفی کو دیکھئے خود تو غریب سرخ ہندیوں (Red Indians) کی نسل کا بیج کھو دیا۔ عیسائی پادریوں کے لئے مشہور ہے کہ ان کے ایک ہاتھ میں انجیل ہوتی ہے اور دوسرے ہاتھ میں نا برابری[1]۔ نسلی عصبیت اور مغربی اقتدار و ہمہ گیری کے بس کی پڑیا۔ اور دنیا کے سب سے بڑے صلح جو پیغمبر کی ذات پر حملہ۔ سوائے اس کے اور کیا کہا

[1] نا برابری کا لفظ میں نے عدم مساوات کے معنی میں استعمال کیا ہے اور کسی دوسری جگہ اس لفظ پر کسی قدر تفصیل سے بحث کی ہے۔

جائے کہ بقول حافظ۔ شعر

مشکلے دارم ز دانشمندِ مجلس باز پُرس　　توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند

ترجمہ۔ میں ایک دشواری میں پھنس گیا ہوں کاش اس مجلس کے جاننے والے بزرگ سے کوئی دریافت کرتا۔ کیوں جناب یہ کیا بات ہے کہ جو حضرات اوروں کو توبہ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں وہ خود توبہ کیوں نہیں کرتے۔

میں شکایت نہیں کرتا۔ دنیا کا قاعدہ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ جس کی لاٹھی اوس کی بھینس۔ البتہ اگلے زمانہ میں جو لوگ منافق ہوتے تھے وہ عیب کو عیب کی طرح کرتے اور بجائے فخر و ناز کرنے کے اپنے منافقانہ کرتوت کو چھپاتے تھے۔ مگر یہ دیکھ کر دل کباب ہوتا ہے کہ ہمارے زمانہ میں بعض قوموں نے منافقت کو فن لطیف بنا دیا ہے۔ اور سادہ دل قوموں پر ایسا ہی ہنستی ہیں جیسے نکٹا ناک والوں پر۔ اردنگ کی دونوں کتابیں میرے پاس اب بھی موجود ہیں۔ امتحان سے فارغ ہو کر میں نے اور بشارت اللہ نے جو محلہ کسر دل کے رہنے والے تھے آگرہ سے چلنے کی تیاری کی۔ میں نے اوس وقت تک ریل کا ٹائم ٹیبل نہیں دیکھا تھا نہ یہ معلوم تھا کہ ریلیں ٹائم ٹیبل بھی شائع کرتی ہیں۔ اگر شعور ہوتا تو اسٹیشن پر جا کر ریل کا وقت معلوم کر لیتے مگر یہ بھی نہ کیا۔ اِدھر اُدھر لوگوں سے پوچھ پاچھ کر کے رات کے تین بجے اسٹیشن پر جا دھمکے۔ اور چار گھنٹے تک اسٹیشن پر پڑے سوکھتے رہے۔ ہمیں ٹونڈلہ جانا تھا اور ٹونڈلہ والی ریل صبح کے سات بجے چلتی تھی۔ آج کل کے اسکول کے لڑکوں کو دیکھتا ہوں تو بڑی مسرت ہوتی ہے کہ میرے زمانہ کے لڑکوں سے کہیں زیادہ باخبر اور چوکس ہیں۔

آگرہ سے واپسی میں علی گڈھ ٹھہرا اور ابوالحسن کا مہمان ہوا۔ مراد آباد کے رہنے والے ہیں صاحب کے نام سے مشہور تھے اور ہر اعتبار سے اس خطاب کے مستحق تھے۔ علی گڈھ میں پڑھا۔ انگلستان گئے۔ بیرسٹری کی سند لے کر آئے۔ شاہجہاں پور اور مراد آباد میں بیرسٹری کی۔ علی گڈھ کالج اور یونیورسٹی میں مختلف عہدوں پر مامور رہے۔ دو برس ہوئے علی گڈھ کی خدمات سے سبکدوشی حاصل کی۔ مراد آباد میں رہتے ہیں۔ خدا کے فضل سے پابند صوم و صلوٰۃ ہو گئے ہیں۔ وضعداری کا آج بھی یہی

عالم ہے جو طالب علمی کے زمانہ میں تھا پچھلی صدی میں پہلا خط جو موصوف نے میرے نام لکھا تھا
اوس میں ڈیر رضا علی القاب لکھا تھا۔ آدھی صدی سے زیادہ گذر گئی۔ مگر خط و کتابت میں آج بھی
میں ڈیر رضا علی ہوں۔ لوگ کہتے ہیں دنیا ترقی کر رہی ہے۔ بات تو ٹھیک معلوم ہوتی ہے البتہ
ذرا سا شبہ مجھے یہ ہوتا ہے کہ آدھی صدی گذر جانے کے باوجود میں ڈیر رضا علی سے مائی ڈیر رضا علی
کے رتبہ کو نہ پہنچا۔ علی گڈھ میں تین چار روز قیام کیا۔ سب کچھ دیکھا بھالا اور اپریل میں کندرکھی
واپس پہنچ گیا۔ جون میں انٹرنس کا نتیجہ آیا۔ میں دوسرے درجہ (سکنڈ ڈویژن) میں پاس ہوا۔
نگریا سادات گیا اور علی گڈھ جانے کی تیاریاں کیں۔

علی گڈھ کالج میں داخلہ

چودہ جولائی ۱۸۹۵ء کو علی گڈھ پہنچا اور دوسرے دن کالج میں داخل ہو گیا۔ علی گڈھ سے مجھے وہ وظیفہ ملا جو ہونہار غریب
طلبا کو دیا جاتا ہے۔ کالج کی فیس کمرہ کا کرایہ اور کھانے پینے کا سب خرچ ملا کر اور رقم وظیفہ مجرا
کرنے کے بعد مجھے صرف سات روپے ماہوار کالج کو دینے پڑتے تھے۔ رہنے کو کچی بارگ میں
ستاون نمبر کا کمرہ ملا اور بی۔ اے پاس کرنے تک میں اسی کمرہ میں رہا۔ میں نے خدا کا شکر
ادا کیا اور بانیِ کالج کی روح کو دعا دی۔ جولائی کے آخر یا اگست کے شروع میں کالج کی
سالانہ تعطیل ہوئی میں کندرکھی پہنچا۔ والدہ نے شادی کا تقاضا پھر شروع کر دیا۔ پرانی
منگنی چھوٹ چکی تھی۔ والدہ چاہتی تھیں کہ کسی اور جگہ میری شادی ہو جائے۔ میں جانتا تھا کہ شادی
کرنا اپنے پاؤں میں کلہاڑی مارنا ہے۔ مگر ماں اور پھر ایسی ماں کے حکم سے سرتابی مشکل تھی۔ اگست
۱۸۹۵ء میں اوس لڑکی کی جس کے ساتھ پہلے میری منگنی ہوئی تھی۔ بارات آئی۔ لڑکی کے باپ کا گھر
ہمارے گھر کے بالکل قریب تھا۔ راستہ ہمارے دروازہ کے سامنے ہو کر جاتا تھا۔ والد صاحب مراد آباد
تشریف لے گئے تھے۔ رات کے بارہ بجے بارات ہمارے دروازہ پر پہنچی، ہمراہ ایک طائفہ بھی تھا۔
اودھر رنڈی نے ہمارے دروازہ پر یہ گیت شروع کیا۔ رات سجریوں پہ سیّاں مچلائے گئے۔ نائیں
کچھ دے گئے نائیں کچھ لے گئے۔ بالی عمریا میں داگ (داغ) لگائے گئے۔ اِدھر والدہ صاحبہ کے منہ سے

چیخ نکلی۔ اتنا روئیں کہ ہچکی بندھ گئی۔ میں پنکھا لے کر کھڑا ہوگیا۔ برسات کی گرمی تھی۔ زبان سے کچھ کہنے کا کیا موقع تھا۔ گھنٹہ بھر تک میں والدہ کو پنکھا جھلتا رہا۔ اب تک میں نے شادی کے مسئلہ کو ٹالا تھا اب مجھے معلوم ہوگیا کہ ماں کی خوشی کے لئے شادی کرنا اور ساتھ ساتھ اپنے مستقبل کو خطرہ میں ڈالنا میرا فرض ہے۔ صبح کو میں نے عرض کر دیا کہ میں حاضر ہوں، جہاں آپ میری شادی تجویز کریں گی مجھے عذر نہ ہوگا۔ مناسب یہ ہے کہ میرا نکاح کر دیجئے۔ تاکہ آپ کو اطمینان ہو جائے۔ رخصتی سال دو سال بعد ہو جائے گی۔ دشواری یہ تھی کہ سولہ سترہ برس پہلے ہماری برادری کے ایک صاحب جو شادی نہ کرنا چاہتے تھے۔ مگر ماں باپ کے اصرار سے مجبور تھے۔ عین بارات کے دن غائب ہو گئے تھے، پھر انھوں نے کبھی شادی نہیں کی۔ والدہ کو یہ خطرہ تھا کہ کہیں میں بھی ان صاحب کے نقش قدم پر نہ چلوں۔ والدہ کا یہ خیال بے بنیاد تھا۔ میں شادی کرنے کے خلاف نہ تھا۔ البتہ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد شادی کرنا چاہتا تھا تاکہ تعلیم میں خلل نہ پڑے۔

میرا نکاح والدہ صاحبہ نے میرا نکاح اپنے ایک عزیز کی لڑکی سے کرنا چاہا۔ میں یہ سمجھ کر کہ میری بیوی والدہ کی عزیزہ ہوگی تو ساس بہو کے جھگڑوں سے نجات ملے گی۔ راضی ہوگیا۔ اب دوسرا جھگڑا شروع ہوا۔ نکاح کے دن معلوم ہوا کہ والد صاحب اس رشتہ کے سخت مخالف ہیں اگر مجھے پہلے معلوم ہو جاتا تو میں اس جھگڑے میں نہ پڑتا۔ میں تو خود آزاد رہنا چاہتا تھا۔ اب صورت یہ تھی کہ سب برادری کو معلوم ہو چکا تھا کہ نکاح ہونے والا ہے۔ میں نے سوچا۔ ہرچہ باداباد۔ اب زیادہ بدنامی اٹھانا مناسب نہیں ہے۔ برادری کو اطلاع کرا دی کہ ۹ ستمبر ۱۸۹۸ء مطابق ۲۲ ربیع الثانی ۱۳۱۶ ہجری کی شام کو نکاح ہے۔ والد صاحب نکاح میں شریک نہیں ہوئے۔ بڑے چچا اور منجھلے چچا شریک ہوئے۔ اور ضروری انتظامات دونوں صاحبوں نے خود کئے۔ بھتیجے کی خاطر بھائی کی ناراضی برداشت کرنا ذرا مشکل کام ہے۔ دونوں صاحبوں کا ہمیشہ احسانمند رہوں گا۔ ددھیال پر ہی کیا موقوف ہے میں ننھیال والوں کی بھی آنکھ کا تارا تھا۔ بڑی خالہ کا ۱۸۹۸ء میں ان کا انتقال ہو چکا تھا، اور منجھلی خالہ مجھ سے ایسی ہی محبت کرتی تھیں جیسی ماں بیٹے سے کرتی

ہے۔ دونوں میں سے کسی کے اولاد نہ تھی۔ میں صبح کو ذرا دیر سے سو کر اوٹھتا تھا۔ نگر یا سادات کے مکان کا صحن بڑا تھا۔ علی الصباح صحن میں ایک طرف والدہ اور دوسری طرف منجھلی خالہ کوّے اُڑانے بیٹھ جاتی تھیں کہ کاتوں کاتوں سے میری آنکھ نہ کھلے۔ اگر کوئی میرے پلنگ کے قریب ہوکر گذرنا چاہتا تو اوس سے کہتیں ادھر سے نہ جاؤ رضی سو رہا ہے۔ آنکھ کھل جائے گی۔

تھوڑی جائداد کا غلط سہارا

کالج کھلنے میں ایک مہینے سے کم باقی تھا۔ نکاح سے فارغ ہوکر والدہ اور میں نگر یا سادات پہنچے۔ وہاں مجھے اوس جائداد کا انتظام کرنا تھا جو دادا صاحب نے والدہ کے نام خرید کر دی تھی۔ چاہتا تھا کہ وہ جائداد فروخت کر دی جائے۔ میرا خیال تھا کہ تھوڑی جائداد بڑی رکاوٹ ہوتی ہے۔ جائداد اتنی نہ تھی کہ میں مستقل کارندہ رکھ سکتا۔ اگر فروخت نہ کی جاتی تو نتیجہ یہ ہوتا کہ مجھے علی گڈھ سے سال میں چند مرتبہ نگر یا آنا پڑتا اور تعلیم میں خلل پڑتا۔ والدہ مجھے ہونہار سمجھتی تھیں مگر علی گڈھ کی تعلیم کا اوس وقت تک ہمارے خاندان والوں کو تجربہ نہ تھا۔ والد کی انگریزی تعلیم سے خاندان کو سوائے مایوسی کے اور کچھ حاصل نہ ہوا۔ دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ اس کا بھی امکان تھا کہ میں علی گڈھ میں کوئی امتحان پاس نہ کروں اور کچھ سال علی گڈھ رہ کر اور سارا روپیہ برباد کر کے جوں کا توں واپس چلا آؤں۔ والدہ کے پیشِ نظر جو امکانی خطرہ تھا وہ اوس وفورِ محبت کے باعث تھا جو ہر ماں کو بیٹے سے ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ان کو جائداد بیچنے میں تامل تھا۔ میں لڑکا ضرور تھا مگر ناسمجھ لڑکا نہیں تھا۔ حالات گردوپیش کا اندازہ کر کے میری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ اتفاق کی بات عین اُس وقت والدہ صاحبہ بھی وہاں تشریف لے آئیں اور میری یہ حالت دیکھ کر فرمایا۔ میرے بچے جائداد کیا چیز ہے۔ جان ایمان جو کچھ ہے تیرے لئے ہے۔ جو تیری سمجھ میں آئے کر۔ میں نے بکم و کاست اپنا خیال عرض کیا۔ ارشاد فرمایا ٹھیک ہے۔ جائداد بیچنے کا انتظام کرو۔ غرض کہ اکتوبر ۱۸۹۸ء میں منجھلے چچا میر نثار حسین کی کوشش اور مدد سے کل جائداد بیچ دی گئی اور بیشتر اسی روپیہ سے میں نے

علی گڈھ میں تعلیم پائی۔

پیشۂ معلمی سے میری بیزاری والد صاحب کے علاوہ کندرکھی کے سادات میں سے دو صاحبوں نے اور انگریزی پڑھی تھی۔ میر یاور حسین صاحب میرے والد کے ہم عمر تھے اور نور الہدیٰ صاحب مجھ سے عمر میں چودہ پندرہ سال بڑے تھے مگر دونوں صاحب لڑکوں کو انگریزی پڑھا کر گذر کرتے تھے۔ غالباً یہ شاہجہانی شغل اختیار کرنے کی وجہ یہ تھی کہ کندرکھی کا کوئی آدمی اوس وقت کسی بڑے سرکاری عہدہ پر مامور نہ تھا۔ جس کے اثر سے کندرکھی والوں کو سرکاری ملازمت مل سکتی۔ یہ بھی میں نے دیکھا کہ قصبہ کے جتنے آدمی اُردو مڈل پاس تھے وہ سب اردو مدارس میں مدرس مقرر ہوگئے تھے۔ ان سب باتوں کا مجھ پر یہ اثر ہوا کہ میں نے اپنے دل میں قطعی فیصلہ کرلیا کہ جو کچھ بھی ہو لڑکے پڑھانے کی نوکری کبھی نہ کروں گا۔ اُردو مدرسہ میں تیسرے درجہ کے امتحان کی کامیابی پر وظیفہ لینے سے انکار کا باعث بھی یہی جذبہ تھا۔ علی گڈھ جانے کے پہلے ہی اپنے دل میں عہد کرلیا تھا کہ میں دولت مند باپ کا بیٹا نہیں ہوں۔ علی گڈھ میں اوس طرح رہوں گا جس طرح غریب طالب علم رہتے ہیں مگر ٹیچ کے طور پر لڑکے پڑھا کر اپنا خرچ چلانے کا خیال کبھی دل میں نہ لاؤں گا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اصرار کیا تھا کہ والدہ صاحبہ اپنی ترکۂ پدری کی جائداد نیز وہ جائیداد جو دادا صاحب نے خرید کر ان کو دے دی تھی فروخت کردیں تاکہ مجھے خرچ کی طرف سے فی الجملہ اطمینان ہوجائے۔ ماں کو اولاد سے جو محبت ہوتی ہے وہ دنیا میں آپ ہی اپنی نظیر ہے۔ ہر مذہب اور دنیا کے رسم و رواج کے بموجب ماں باپ کا درجہ بہت بلند ہے۔ مگر میرے نزدیک اگر انسان اوس تعلق کو تھوڑا بہت سمجھنا چاہے جو خالق کو اپنی مخلوق کے ساتھ ہے تو دنیا میں اوس کی سب سے بڑی۔ سب سے قوی اور سب سے اچھی مثال ماں کی مامتا ہے۔ خدا غریق رحمت کرے۔ میری والدہ نے اشارتاً و کنایتاً بھی کبھی یہ نہیں کہا کہ تم لڑکوں کو پڑھا کر بھی علی گڈھ میں دس پندرہ روپیے ماہوار کما سکتے ہو۔ یہ طے کرنا مشکل ہے کہ معلمی کے خلاف جو رائے میں نے

قائم کی تھی وہ صحیح ہے یا نہیں۔ طلبا کو درس دینے کا شغل ہمارے مذہب کی رو سے بڑی فضیلت رکھتا ہے۔ یونانی فلسفی بھی اسی ذریعہ سے لوگوں کو اپنے اپنے فلسفۂ حیات و ممات کی حقیقت سمجھاتے تھے۔ گوتم بودھ نے بھی یہی طریقہ عوام کو معرفت شناسی کا راستہ دکھانے کے لئے اختیار کیا تھا یورپ اور امریکہ کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں کے پروفیسروں کی حیثیت اور وقار حکومت کے وزیروں سے کم نہیں ہے۔ میں یہ سب باتیں ماننے کے لئے تیار ہوں پھر بھی اس حقیقت سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ابتدائی تعلیم کے مدارس کے معلموں کی رفتار زندگی عام طور سے تیلی کے بیل کی جیسی ہوتی ہے۔ برسوں چلنے کے باوجود دونوں وہیں رہتے ہیں جہاں تھے۔ یہ کہنا بیجا ہوگا کہ سب معلم یکساں ہیں۔ میں ایسے اُستادوں سے بھی واقف ہوں جنہوں نے معمولی اسکولوں میں گمنام آسامیوں سے شروع کرکے نام پیدا کیا۔ لبعضوں نے ملک اور قوم کی خدمت بھی کی۔ مگر عام حالت وہی ہے جس کا تذکرہ میں نے کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ میاں جی کی عقل لڑکے لے جاتے ہیں۔ یہ بات سچ ہو یا نہ ہو اپنا تو یہ حال ہے کہ اگر ایک مرتبہ پھر زندگی شروع کرنے کا موقع ملے تو میاں جی۔ معلم۔ اُستاد یا ٹیچر کے پیشے کو میرا دور ہی سے سلام ہوگا۔

تیسرا باب

کانگریس کا سرکاری رزولیوشن۔ مسلمانوں کی بے بسی۔ وفاداری کا انعام
صوبجات متحدہ۔ بہار اور بنگال کا میرا دورہ

کالج یونین میں کانگریسی اخباروں کا داخلہ بند اکتوبر کے آخر میں کالج کھلنے پر میں علی گڈھ پہنچا۔ جب تک مراد آباد کے اسکول میں رہا فٹ بال اور ٹینس کھیلتا رہا۔ باقاعدہ کھیلنے والوں میں نہ تھا تاہم اکثر کھیلتا تھا۔ میرے پاس بہت سی یادداشتیں اور روزنامچے موجود ہیں۔ ۹ دسمبر ۱۸۹۷ء کی یادداشت جو مراد آباد میں لکھی تھی اوس کا ترجمہ یہ ہے "جس قدر وقت مل سکے پڑھنے لکھنے میں صرف کرنا چاہیئے۔ کھیل کے لئے صرف ایک گھنٹہ یعنی شام کے چار بجے سے پانچ بجے تک کافی ہے"۔ علی گڈھ میں کسی کھیل سے تعلق نہ رکھا۔ علی گڈھ کے کھلاڑیوں کے بہت سے قصے سُنے تھے۔ ڈر ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ فٹ بال وغیرہ کا شوق پڑھنے کے ذوق پر غالب آجائے۔ میری طبیعت کا ڈھنگ یہ ہے کہ جس کام میں لگ جاتا ہوں اوسے پورے انہماک کے ساتھ کرتا ہوں لیکن ایک وقت میں دو کام اس طرح انجام نہیں دے سکتا کہ نتیجہ خود میری نظر میں قابل اطمینان ہو۔ اب غور کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ غالباً جو کچھ ہوا بہتری اوسی میں تھی۔ مجھے اخبار اور کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ اس مناسبت سے بجائے فٹ بال اور کرکٹ کے میدان کے کالج یونین کو میں نے اپنی طبیعت کا جولاں گاہ بنایا۔ نومبر کا مہینہ تھا مجھے گھر سے آئے چند ہفتے گذرے تھے۔ ایک دن یونین میں اخبار پڑھنے کے لئے پہنچا۔ سب طالب علم خاموشی سے بیٹھے۔ اخبار اور رسالے پڑھ رہے تھے۔ یونین میں اوس زمانہ میں پنجاب آبزرور اور مسلم کرانیکل کے علاوہ (یہ دونوں مسلم اخبار تھے) الہ آباد کا پانیر۔ لکھنو کے انڈین ڈیلی ٹیلی گراف

اور ایڈووکیٹ۔ کلکتہ کے اسٹیٹس مین اور انگلش مین۔ دہلی کا مارننگ پوسٹ اور بمبئی کے ٹائمز آف انڈیا اور بمبئی گزٹ آتے تھے۔ بنگالی اور امرتا بازار پتریکا اور انڈین مرر اور ہندو اور ٹریبیون کا نام ہم نے سنا تھا مگر کانگریسی اخبار ہونے کے باعث ان میں سے کسی کو ہماری یونین میں باریابی کا شرف حاصل نہ تھا۔ یہ پالیسی غلط تھی۔ طلبا کو حریفوں کے خیالات اور دلائل سے بے خبر رکھنا گویا اس بات کو تسلیم کرنا ہے کہ وہ خیالات اور دلائل صحیح ہیں۔ اس کے سوا تجسّس انسان کی سرشت میں داخل ہے نوعمری میں یہ جذبہ اور بھی قوی ہوتا ہے۔ بغیر معقول وجوہ و دلائل کے طلباء سے یہ توقع رکھنا کہ وہ حکماً ایک سیاسی مسلک سے عقیدت اور دوسرے سیاسی مشرب سے مغائرت یا مخالفت رکھیں گے انتہائی کوتہ اندیشی ہے جس کا نتیجہ ہمیشہ الٹا ہوتا ہے۔ ساتھ ساتھ یہ امر بھی قابل تذکرہ ہے کہ کانگریسی اخبار بڑے منہ پھٹ تھے۔ جن کو بھولے سے بھی یہ احساس نہ ہوتا تھا کہ ایسے آدمی بھی ملک میں موجود ہیں جن کو سیاسی معاملات میں کانگریس سے اختلاف ہے۔ کانگریسی اخباروں کا مقصود دل آزاری ہو یا نہ ہو لیکن اس میں مطلق شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ ان کے مضامین سے مسلمانوں کی دل آزاری ہوتی تھی۔ سرسید اور ان کے رفقا کی طرف سے ان اخبار نویسوں کے دلوں میں ٹھکانا نہ تھا۔ برملا حقارت کا اظہار کرتے تھے۔ کانگریس والوں نے اس نکتہ کو آج کی گھڑی تک نہیں سمجھا ہے اور ۱۸۹۰ء میں تو نہ جانتے تھے اور نہ جاننا چاہتے تھے کہ ولیم پن (William Penn) کے بقول ملامت کرنے کا حق صرف ان ہی لوگوں کو حاصل ہے جو دل سے مدد کرنے کے لئے تیار ہوں۔ کانگریس والے علی گڈھ کی تحریک کو اسی طرح دبانا چاہتے تھے جس طرح تخمیناً چالیس برس بعد ۱۹۳۷ء میں پنڈت جواہر لال نہرو اور ان کے ہم خیال حضرات نے مسلم لیگ کا گلا گھونٹنا چاہا۔ غرض کہ یونین میں ایک اخبار اٹھا کر میں بھی پڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے ایک دوست سے جو کچھ فاصلہ پر بیٹھے ہوئے تھے خاصی بلند آواز میں سب کے سامنے بے تکلفی سے کہا "فلاں صاحب بڑے خرّانٹ ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ آج کل وہ کس ادھیڑ بن میں ہیں"۔ سارے طالب علم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگے۔ علمی ادارہ کی فضا۔ چاروں طرف الماریوں میں سے صدیوں پہلے کے فلسفی۔ ادیب محقق اور معرفت شناس

مصنف ہمارے حال کے نگراں۔ ہر شخص خاموشی سے مصروف مطالعہ۔ اس حالت میں ایک نووارد کی مُخلّی بالطبع رائے زنی۔ جو موجود تھے سب نے خیال کیا ہوگا کہ عجب ننھی منی انسان کالج میں آیا ہے۔ مجھے اپنی غلطی کا اوس وقت مطلق اندازہ نہ ہوا۔ کچھ عرصہ بعد جب سردار محمد حیات خاں سے راہ و رسم ہوئی تو انھوں نے مذاق میں میری اس جسارت کا تذکرہ کیا۔

علی گڈھ میں علمی مذاق کی بے قدری میرے زمانے میں علی گڈھ میں کرکٹ اور فٹ بال کھیلنے والوں کی خاص قدر تھی۔ ادبی مذاق پیدا کرنے یا طلبا کا علمی ذوق بڑھانے یا اون کی ہمت بندھانے کا خیال نہ اساتذہ کو تھا نہ ٹرسٹیوں کو۔ خود مسٹر بیک کھلم کھلا فرماتے تھے کہ رنجیت سنگھ جی (کرکٹ کے مشہور کھلاڑی جو بعد میں نوانگر کے مہاراجہ ہوئے) دادا بھائی نوروجی (پارلیمنٹ کے پہلے ہندوستانی ممبر) سے کہیں زیادہ قابل قدر ہیں۔ مسٹر بیک کے چہیتے طلبا سب کھلاڑی تھے۔ دوسرے نمبر پر وہ طالب علم آئے تھے جو انجمن الفرض کے لیے معقول چندہ جمع کر کے لاتے تھے۔ اون کی آؤ بھگت ایسی تو نہ تھی جیسی کھلاڑیوں کی تھی پھر بھی علی گڈھ کی دنیا میں وہ شانِ امتیازی رکھتے تھے۔ بس یوں سمجھیے کہ اب سے چالیس برس پہلے کے ہندوستان میں جو وقار اور اقتدار انگلستان سے آئے ہوئے انگریزوں کا تھا وہ کالج کی دنیا میں کھلاڑیوں کو حاصل تھا۔ چندہ جمع کرنے والوں کی حیثیت بجنسہ وہ تھی جو اوس زمانے میں یوریشین (Eurasian) جماعت کی تھی۔ بقیہ طلبا کی کالج میں وہی حالت تھی جو اوس وقت ملک میں عام ہندوستانیوں کی تھی۔ جن کے لیے یورپین اور یوریشین حلقوں نے نیٹیو (Native) کا لفظ اختراع کیا تھا۔ ادبی ذوق رکھنے والے طلبا کی موجودگی صرف روا رکھی جاتی تھی۔ وہ کسی تحسین و آفریں کے مستحق نہ سمجھے جاتے تھے۔ مولوی عزیز مرزا مرحوم اور خواجہ غلام الثقلین مرحوم اپنے اپنے دور کے بہترین علمی اور ادبی مذاق رکھنے والے طالب علم تھے۔ ہم عصر ان دونوں صاحبوں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ مگر کالج کے ارباب حل و عقد کی آنکھوں میں ہمیشہ کھٹکتے ہی رہے۔ غلام حسین مرحوم بھی جب تک علی گڈھ میں رہے موردِ عتاب ہی رہے۔ مولانا محمد علی کی جو تھوڑی بہت

قدر اون کی طالب علمی کے زمانے میں تھی وہ اون کی ذاتی قابلیت کے باعث نہ تھی۔ بلکہ مولانا شوکت علی (کرکٹ کے مشہور کپتان) کے بھائی ہونے کی وجہ سے تھی۔ جسم کی تربیت (Development) نہایت ضروری چیز ہے۔ مگر کھیل کود ذریعہ ہے ایک مقصد حاصل کرنے کا۔ اصلی مقصد دماغ کا صحیح نشو و نما اور اس کی تربیت اور صحت کو اچھی حالت میں رکھنا ہے جس کے حاصل کرنے کا کھیل کود۔ ورزش کسرت ایک ذریعہ ہے۔ اصل مقصد کو چھوڑ کر ذریعہ کو خود مقصد بنالینا بالکل غلط طریقہ ہے۔ مگر یہ طریقہ میرے زمانے میں علی گڈھ کی مقدس روایات میں داخل تھا۔ مسٹر بیک کی زبردست شخصیت نے اس مذموم طریقہ کے پھیلاؤ کو یہاں تک پہنچا دیا تھا کہ میرے زمانے میں ذوق ادب اور کھیل کود کی قدر و قیمت کا اپنی اپنی جگہ جائزہ لینے کے مبحث پر ایک سابق طالب علم نے انگریزی میں مضمون لکھا۔ تو بجائے نام لکھنے کے اپنا نام بڑے فخر سے Healthy Barbarian یعنی "تُسنڈا وحشی" مضمون کے آخر میں درج کیا۔ مسٹر مارسن نے ایک حد تک اور نواب محسن الملک نے اکثر و بیشتر طلبا کی قدر اون کی علمی قابلیت کے بموجب کی۔ دونوں کا یہ بڑا احسان ہے۔

سرسیّد کی جانشینی کا مسئلہ محسن الملک اور سید محمود

بزمِ اغیار ہے ڈر ہے نہ خفا تو ہو جائے
ورنہ اک آہ میں کھینچوں تو ابھی ہُو ہو جائے (برق)

سرسیّد کی وفات کے بعد سیّد محمود صاحب کی جو حالت تھی اوس کی سچی تصویر اس شعر میں موجود ہے۔ ۳۱۔ جنوری ۱۸۹۹ء کو ٹرسٹیان کالج کا جلسہ نواب محمد حیات[1] خاں صاحب کی صدارت میں ہوا۔ ایک طرف سید محمود۔ دوسری طرف محسن الملک موجود تھے میری یہ جسارت کہ برآمدہ میں پہنچ گیا۔ سید محمود نظیر اکبر آبادی کا یہ مصرعہ پڑھتے ہوئے اسٹریچی ہال سے نکل رہے تھے۔

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

---

[1] سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب کے والد۔

سارے ٹرسٹی ایسے ملول و مغموم تھے گویا جنازہ کے ساتھ جارہے ہیں۔ سید محمود کے پیچھے پیچھے محسن الملک تھے۔ چہرہ زرد۔ آنکھوں میں آنسو۔ بھرائی ہوئی آواز۔ قدم ڈلتے کہیں تھے پڑتا کہیں تھا۔ اون کے ذرا پیچھے نواب محمد حیات خاں صاحب اور خان بہادر ملک برکت علی خاں[1] صاحب اور خلیفہ محمد حسین صاحب تھے۔ تینوں حضرات سرسید کے سچے رفیق اور کالج کے بڑے معاون تھے۔ ان تینوں کے بعد مسٹر بیک جن کو بارہ سال پہلے سید محمود ولایت سے پرنسپلی کے عہدہ کے لئے منتخب کرکے لائے تھے۔ کچھ ٹرسٹی اسٹریچی ہال کے برآمدہ میں تھے۔ کچھ ہال سے نکل رہے تھے۔ ٹرسٹیوں نے اس ہنگامہ سے ذرا دیر پہلے سرسید علیہ الرحمۃ کی جگہ نواب محسن الملک کو کالج کا آنزیری سکرٹری منتخب کیا تھا۔ سید محمود فرماتے تھے کہ میں لائف جوائنٹ سکرٹری ہوں قواعد ٹرسٹیان کی رُو سے میرے موجود ہوتے تم محسن الملک یا کسی اور کو آنزیری سکرٹری نہیں بنا سکتے۔ سید محمود کی حالت زخمی شیر کی سی تھی۔ بپھرے ہوئے تھے اور جو منہ میں آتا تھا کہہ رہے تھے۔ سب اِدھر اُدھر دبک رہے تھے۔ شیر کا مقابلہ خود اس کے پرانے رفیق محسن الملک سے تھا۔ سارے ٹرسٹیوں کی کوشش تھی کہ جس طرح بن پڑے خوشامد درامد کرکے غضب آلودہ شیر کو چیتے کی طرح رام کریں۔ اس کوشش میں سب سے زیادہ نمایاں حصہ لینے والے مسٹر بیک معلوم ہوتے تھے۔ دوران گفتگو میں سید محمود مسٹر بیک کو تھیوڈر کہہ کر خطاب کرتے تھے۔ جس سے شیر برطانیہ اور معزول شیر علی گڈھ کے درمیان گہری دوستی اور انتہائی بے تکلفی کا پتہ چلتا تھا۔ شام کے پانچ بجے کا وقت تھا۔ جلسہ سارے دن رہا تھا۔ ٹرسٹیوں نے تو گتھی سلجھانے میں کوئی کمی نہیں کی تھی مگر سید محمود کی برہمی سے معلوم ہوتا تھا کہ سلجھنے کی بجائے گتھی میں اور پیچ پڑگئے ہیں۔ بالآخر اسی شخص کی سوجھ بوجھ کام آئی جس کی فراست وذکاوت اور ہوش مندی کا اب سے چند سال پہلے حیدرآباد میں ڈنکا بج رہا تھا۔ محسن الملک بڑھے اور سید محمود کے قدموں کی طرف جھکے۔ آن کی آن میں ایک سید کی ٹوپی دوسرے سید کے قدموں پر تھی۔

---

[1] سرسید کے بڑے مخلص رفیق تھے۔ شاہ جہاں پور کے رہنے والے تھے۔ پنجاب میں سکونت اختیار کرلی تھی۔

سید محمود نے ہاتھ پکڑ کر محسن الملک کو اٹھایا اور فرمایا "مہدی تو کیا کہتا ہے" محسن الملک کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا" میں یہ کہتا ہوں کہ اس وقت قوم کی کشتی کو ڈوبنے سے سوائے تمہارے اور کوئی نہیں بچا سکتا" سید محمود بولے "اچھا تو کہتا ہے تو میں راضی ہوں" سید محمود کی آواز میں افسوس کا ذرا سا بھی شائبہ نہ تھا۔ ہم سب محو حیرت تھے کہ :- ایں چہ می بینم بہ بیداری است یا رب یا بخواب - ٹرسٹیوں نے دن بھر سارے جتن کئے مگر بے سود۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر محسن الملک سید محمود کے جذبۂ شرافت سے استغاثہ نہ کرتے تو سید محمود معاملہ کو بغیر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے نہ چھوڑتے۔ جس سے کالج کو سخت نقصان پہنچتا۔ کالج کی مالی حالت بہت سقیم تھی۔ لارڈ الگین اور مسٹر لاٹوش (Mr. Latouche) قائم مقام لفٹنٹ گورنر کی توجہ اور سعی سے سر سید میموریل فنڈ کے چندہ کا جو کام شروع ہوا تھا اوس میں مقدمہ بازی سے بڑی کھنڈت پڑ جاتی۔ اور ٹرسٹیوں میں فریق بندی شروع ہو جاتی۔ جو حضرات محسن الملک کے حیدرآبادی دور کی تاریخ سے واقف ہیں ممکن ہے وہ کہیں کہ محسن الملک کا یہ عمل خلوص سے خالی تھا۔ آنسو بہانا اور پاؤں پر ٹوپی ڈال دینا شطرنج کی بساط پر شاطر کی چال تھی یا بازی گر کا شعبدہ تھا۔ یا ناٹک کا سوانگ تھا جیسا دوسری جگہ لکھا گیا ہے میں نے کئی سال تک محسن الملک کے قدموں میں تربیت پائی ہے اون کے کمرہ میں بغیر اطلاع کے چلا جاتا تھا۔ اور ایسی گستاخانہ باتیں کرتا تھا جس پر آج خود مجھے تعجب ہوتا ہے۔ محسن الملک نے وفات سے دو ہفتے پہلے جو خط خود اپنے قلم سے لکھ کر بھیجا وہ میرے نام تھا۔ محسن الملک کی کمزوریوں اور خوبیوں سے واقف ہونے کا موقع مجھ سے زیادہ مشکل سے موجودہ نسل کے کسی شخص کو ملا ہو گا۔ حیدرآباد میں محسن الملک نے جو کچھ کیا ہو۔ مگر میں اپنے علم و یقین سے کہتا ہوں کہ نو برس علی گڈھ میں رہ کر انھوں نے جو کچھ کیا وہ تمام تر خلوص اور سچائی پر مبنی تھا۔ اور اوس میں ذاتی وقار قائم کرنے یا بڑھانے یا کسی کو سبز باغ دکھا کر اپنی ذاتی غرض حاصل کرنے کا ہرگز ہرگز کوئی شائبہ نہ تھا۔ اگر کالج کو نقصان عظیم سے بچانے کے

لئے ضرورت ہوتی تو وہ سید محمود سے بہت کم درجہ کے ٹرسٹی کے پاؤں پکڑنے اور قدموں پر ٹوپی ڈالنے کے لئے تیار ہو جاتے[1]۔

محسن الملک کا آخری خط میرے نام

اوس خط کا فوٹو درج کیا جاتا ہے۔ عبارت حسب ذیل ہے۔ خط کی تاریخ یکم اکتوبر ۱۹۰۷ء ہے۔ میں نے اپنی ایل۔ ایل۔ بی کی کامیابی کا تار نواب صاحب کو بھیجا تھا۔ اوس کا یہ جواب ہے۔ خطوں میں عموماً اپنا نام محسن الملک لکھتے تھے۔ مگر مجھے جو خط بھیجتے تھے اوس میں خطاب کی بجائے اپنا اصلی نام مہدی علی تحریر فرماتے تھے۔

یکم اکتوبر شملہ North oak

عزیزی رضا علی۔ آپ کا تار مجھے یہاں ملا نہایت خوشی ہوئی۔ خدا مبارک کرے۔ میں آپ سے خفا تھا کہ اس عرصہ میں کوئی خط نہ لکھا مگر اب وہ خفگی جاتی رہی۔ اب یہ بتاؤ کہ کب سے غلامی کا طوق اوتارو گے۔ اور آزادی کا سہرا کب پہنو گے اور کہاں رہو گے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ضرور کامیاب ہو گے اور جو نیکی اور اعتدال تمھاری طبیعت میں ہے اوس کے لحاظ سے ضرور نیک نام رہو گے اور قوم کے سچے خادم ثابت ہو گے۔

رضا علی میری صحت بالکل بگڑ گئی ہے۔ اب چل چلاؤ کے دن قریب ہیں۔ میری صحت کی خرابی کا اندازہ اس سے کر سکتے ہو کہ دو من نو سیر میرا وزن تھا۔ اب صرف ایک من چونتیس سیر رہ گیا ہے۔ غذا بہت کم ہو گئی ہے۔ شاید مشکل سے آدھ پاؤ دودھ کھاتا ہوں گا۔ بدن میں رعشہ ہو گیا ہے۔ دانت رخصت ہو گئے ہیں۔ میں یہاں

---

[1] حیدرآباد کی شہرت کے باعث انگریز عموماً محسن الملک کو شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ مسٹر بیک اون کے خلاف تھے اور چاہتے تھے کہ سید محمود سکرٹری رہیں۔ خدا بخشے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کا یہ احسان قوم پر ہمیشہ رہے گا کہ انھوں نے جلسہ کی تاریخ سے پہلے مسٹر بیک کو محسن الملک کی تائید پر آمادہ کیا۔ صاحبزادہ صاحب کو مسٹر بیک بہت مانتے تھے۔

پندرہ بیس روز رہوں گا فقط۔

مہدی علی

چار درویش میری خوش قسمتی سے سید سجاد حیدر۔ سردار محمد حیات خاں۔ حیدر حسن مرحوم تینوں کچی بارگ میں رہتے تھے۔ بڑے صاحب مطالعہ تھے۔ کرکٹ۔ فٹ بال وغیرہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ تینوں حضرات علی گڈھ کی زندگی کے گہرے نقاد تھے۔ حیدر حسن اور سجاد حیدر بڑے بذلہ سنج تھے۔ محمد حیات کی شگفتگی مزاج کا اظہار خاص خاص دوستوں کی سوسائٹی میں ہوتا تھا۔ بظاہر وہ مدمّغ معلوم ہوتے تھے۔ جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ وہ بڑے خوددار تھے۔ اور عزتِ نفس کو تمام باتوں پر مقدم رکھتے تھے۔ لیکن بے تکلف دوستوں کے مجمع میں ان کی خوش طبعی کے جوہر کھلتے تھے۔ ۱۸۹۹ء کی بڑی تعطیل جولائی میں شروع ہوئی۔ ایف۔ اے (انٹرمیڈیٹ) کے امتحان کی تاریخ ۲ رجنوری ۱۹۰۰ء مقرر تھی۔ میں تعطیل میں گھر نہیں گیا۔ امتحان کی تیاری کے لئے علی گڈھ میں ٹھہر گیا۔ کندرکھی جانے میں یہ بھی خطرہ تھا کہ والدہ صاحبہ رخصتی کا تقاضا کرتیں۔ حیدر حسن۔ سجاد حیدر اور محمد حیات تینوں بی۔ اے میں تھے۔ یہ سب بھی تعطیل میں علی گڈھ ٹھیرے رہے۔ ہم سب ایک ہی بارگ میں رہتے تھے۔ کمرے قریب قریب تھے تعطیل میں گہرے مراسم ہوگئے۔ اوٹھنا بیٹھنا۔ کھانا پینا سب ساتھ ہوتا تھا۔ جب مراسم بڑھے تو مجھے ان تینوں کی قدر معلوم ہوئی۔ سجاد حیدر انگریزی اور اردو دونوں بڑی اچھی لکھتے اور بولتے تھے۔ انشا پردازی کی سنہری لڑیوں میں سوقع محل سے ہمیشہ لطافت اور بذلہ سنجی کے موتی پروتے تھے۔ مطالعہ کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ حیدر حسن کو ناولوں کا شوق تھا انگریزی زبان کا اچھا ناول شاید ہی کوئی پڑھنے سے باقی بچا ہو۔ سکندرہ کے رہنے والے تھے جب مجھ سے بے تکلفی ہوگئی تو مذہبی تذکروں میں یہ شعر سنایا کرتے تھے:۔

شعر

شیعہ ہمارے شہر میں اک نام کو نہیں
ہے رافضی سے پاک ہمارا سکندرہ

بڑے آزاد خیال تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم سب اسلامی فرقوں کے باہمی امتیاز کی حدود سے کہیں آگے نکل گئے تھے۔ محمد حیات کے مطالعہ میں بیشتر تاریخ۔ سیر۔ سفرنامے اور ادبی مذاق کی کتابیں رہتی تھیں۔ انگریزی خوب لکھتے تھے اور بولتے بھی خوب تھے۔ موصوف کا سیاسی رحجان اوس زمانہ میں کانگریس کی طرف تھا۔ اون پر ہی کیا موقوف ہے اکثر طلبا جو علمی ذوق یا سیاسی معاملات میں دلچسپی رکھتے تھے کانگریس کی عزت کرتے تھے اور جانتے تھے کہ ملکی پولٹیکل حقوق کے حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرنے والی جماعت کانگریس اور تنہا کانگریس ہے۔ دسمبر ۱۸۹۹ء میں لکھنؤ میں مسٹر رومیش چندر دت کی صدارت میں کانگریس کا اجلاس ہوا تو محمد حیات لکھنؤ جاکر اوس میں شریک ہوئے۔ اور ہفتوں تک ہم اون کی زبان سے اجلاس لکھنؤ کے حالات سنتے اور آپس میں پولٹیکل مسائل پر بحث مباحثہ کرتے رہے۔ میرا ارادہ تعطیل کے زمانہ میں علی گڈھ ٹھہر کر امتحان کی تیاری کرنے کا تھا۔ مگر یہ چار درویشوں کی انجمن ایسی قائم ہوئی کہ سارا وقت خوش گپی کی نذر ہوگیا۔ تعطیل ختم ہونے کے ذرا پہلے ایک روز کمرے میں جاکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ کتابوں کی الماری میں جابجا جالا لگا ہوا ہے۔ اب مجھے پریشانی ہوئی۔ امتحان کے صرف دو مہینے رہ گئے تھے۔ خدا کا نام لے کر تیاری شروع کردی۔ اور دوستوں سے ملنا جلنا بالکل چھوڑ دیا۔ میں اخبار پڑھنے کا عادی تھا۔ اور اوسی زمانہ میں جنوبی افریقہ کی لڑائی میں ڈچ قوم کے لوگ جن کو اوس زمانہ میں بور (Boer) کہتے تھے، بڑی بہادری سے لڑ رہے تھے اور انگریزی فوجوں کے چھکے چھڑا دئے تھے۔ سردار کچنر اور لارڈ رابرٹس کے جنوبی افریقہ جانے کی خبریں میں نے خود اخبار میں نہیں پڑھی۔ بلکہ کسی دوست کی زبانی سُنی تھی۔ اخبار بینی میں نے چھوڑ دی تھی۔ امتحان سے دو تین ہفتہ پہلے ہم کو تیاری کے لئے وقت دیا گیا اور پڑھائی ختم کردی گئی۔ میں روزانہ صبح کے ساڑھے نو بجے کھانا کھا کر صاحب باغ چلا جاتا تھا۔ دن بھر وہاں پڑھتا تھا اور مغرب کے وقت وہاں سے اپنے کمرہ پر واپس آتا تھا۔ وقت معینہ پر امتحان ہوا اور میں امتحان سے فارغ ہو کر کمندرکھی چلا گیا۔

الیف۔ اے میں کامیابی اور شادی

میں کند رکھی سوا برس بعد پہونچا تھا۔ والدہ صاحبہ نے رخصتی کا تقاضہ کیا۔ میں نے کہا کہ امتحان کا نتیجہ آجانے دیجئے۔ فرمانے لگیں کہ اس طرح جان چُرانے سے کام نہ چلے گا۔ جسے پلے باندھا ہے گھر لاکر بٹھاؤ۔ دیر لگانے میں کچھ فائدہ نہیں ہے۔ فروری کے تیسرے ہفتہ میں امتحان کا نتیجہ معلوم ہوا۔ سب سے پہلی اطلاع سجاّد حیدر کے خط سے ہوئی۔ جس میں اونھوں نے لکھا تھا کہ تم بیس بسے الیف۔ اے ہو گئے۔ انگریزی کا فقرہ یہ تھا You are an F.A. through and through جب والدہ نے دوبارہ رخصتی کا تقاضہ کیا تو میں اپنے دل میں مصرعہ

ہر چہ بادا باد ما کشتی درآب انداختیم

پڑھ کر راضی ہو گیا۔ اور رخصتی کی تاریخ ۱۱ر مارچ ۱۹۰۰ء مطابق ۹ر ذی قعدہ ۱۳۱۷ھ ہجری مقرر کر دی گئی۔ یہ تقریب بالکل سادہ طور پر منائی گئی۔ دوستوں میں سوائے مولوی قیام الدین احمد کے اور کسی کو مدعو نہیں کیا۔ عزیز بھی خاص خاص شریک تھے۔ والد صاحب کی ناراضی کے باعث رخصتی کے مراسم بڑے چچا میر فدا علی صاحب مرحوم کے مکان میں ادا کئے گئے۔ میرے تینوں چچا معہ اپنی بیویوں کے پہلے ہمارے اوس مکان میں رہتے تھے۔ جس میں نو دس برس پہلے مکتب تھا۔ مگر رخصتی سے چار برس پہلے زمین خرید کر ہمارے مکان کے قریب ایک پختہ بڑا مکان تعمیر کر لیا تھا۔ میری بیوی رخصتی کے بعد اوسی مکان میں آکر ٹھیریں۔ بہت سی شادیوں میں مجھے شرکت کا اتفاق ہوا ہے۔ مگر جیسی شادی میری تھی اس طرح کی شادی نہ اوس سے پہلے کبھی دیکھی تھی نہ اوس کے بعد آج تک دیکھی۔ والد صاحب خفا۔ خدمتی اور خدمت گزار اوداس۔ باراتی پریشان۔ برادری والے انگشت بدندان۔ والدہ صاحبہ کے چہرے پر ہنسی مگر دل میں دھکڑ پکڑ۔ میں دولہا تھا مگر یہ سب حالتیں دیکھ دیکھ کر حیران تھا کہ اس آغاز کا انجام کیا ہوگا۔ خدا مولوی قیام الدین احمد کی روح پر رحمت نازل کرے وہ البتہ میری ہمت بندھانے اور تسلّی دینے کے لئے موجود تھے۔ مجھے تو ظاہر یہی معلوم ہوتا تھا

۱۹۳۰ء صغیر رضا بیگم صاحبہ (مولف کی پہلی اہلیہ)

کہ میں ملزم نہیں بلکہ فی الحقیقت مجرم ہوں۔ مگر موصوف نے سمجھایا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے یہ سب جھگڑے چار دن میں ختم ہو جائیں گے۔ اگر تم کسی قابل ہو گئے تو موجودہ کلفت راحت کی صورت میں مبدّل ہو جائے گی۔ مولوی قیام الدین کے لئے سوائے اس کے اور کیا کہوں کہ میرے دم کی طرح میرے ساتھ تھے۔ شعر

بے کسی میں آنے والا جانے والا کون تھا
ہاں مگر اک دم غریب آتا رہا جاتا رہا (امیر مینائی)

میری بیوی کا نام صغیر فاطمہ تھا۔ والدہ صاحبہ کے پھوپی زاد بھائی کی بڑی بیٹی تھیں۔ جب رخصتی ہوئی ہے تو اتنا لکھنا پڑھنا سیکھ گئیں تھیں کہ معمولی خط لکھ پڑھ لیں۔ بڑی بُردبار اور نیک مزاج تھیں۔ اون کے والد کا نام سید شجاعت حسین تھا۔ بڑے خوش مزاج اور بذلہ سنج تھے۔ فارسی کی استعداد بہت اچھی تھی۔ گزر اوقات کا ذریعہ وہ جائداد تھی جو بزرگوں سے ترکہ میں ملی تھی۔ لیکن موصوف میں کاروبار کی قابلیت موجود تھی۔ اگر بمبئی میں پیدا ہوئے ہوتے تو کاروبار میں اچھی خاصی دولت پیدا کر لیتے۔ میرا خیال تھا کہ ان تعلقات کے باعث میری متاہل زندگی اطمینان اور مسرت کے ساتھ گزرے گی۔ مگر خدا ہمارے قدیم رسم ورواج اور روایات کا بھلا کرے۔ مصرعہ

خود غلط بود انچہ ما پنداشتم

شرفا میں بہت کم خاندان ایسے ہیں جہاں ساس بہو کے تعلقات خوش گوار ہوں۔ میرا گھر بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہ رہ سکا۔ اس کا ذکر آئندہ کسی اور باب میں ہوگا۔ رخصتی کے بعد میں تین دن گھر پر رہا اور پھر علی گڈھ چلا گیا۔

سر انٹانی میکڈانل اور مسلمان

وہ اٹھنے دیتے ہیں خود فتنہ ہائے بے حقیقت کو
کہ تا حاصل کریں اوس کے فرو کرنے کی لذت کو (اکبر)

مارچ سنہ ۱۹۰۰ء کے وسط میں علی گڈھ پہونچ کر میں بی۔ اے

میں داخل ہوگیا۔ بیں ایف۔اے دوسرے درجہ (سکنڈ ڈویژن) میں پاس ہوا تھا۔ اوس زمانہ میں ایسے طلبا کی تعداد جو دوسرے درجہ میں ایف۔اے پاس کریں بہت کم ہوتی تھی۔ اب مجھے دس روپے ماہوار کا وظیفہ بربنائے قابلیت ملا۔ ایف۔اے میں فارسی بدرجہ مجبوری لی تھی۔ بی۔اے میں تین مضامین کا لینا ضروری تھا۔ انگریزی لازمی تھی۔ اوس کے سوا میں نے جو دو اور مضمون لئے تھے اون میں ایک مضمون اقتصادیات (Economics) تھا اور دوسرا سیاسیات یعنی پولٹیکل سائنس۔ دونوں مضمون دلچسپ تھے۔ یہ زمانہ ہندوستان[1] میں انگریزی حکومت کے انتہائی عروج کا تھا۔ یہ سچ ہے کہ کانگریس ۱۸۸۵ء میں قایم ہوچکی تھی۔ مگر کانگریس کی ذہنیت کا حال اوس زمانہ میں بالکل یہ تھا کہ مصرعہ

محسنِ قوم بھی ہے خادم حکام بھی ہے

کانگریس کے سوا اور کوئی منظم پولٹیکل جماعت ملک میں نہ تھی۔ اگر برائے نام کچھ سیاسی انجمنیں یا سبھائیں تھیں تو اون کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ کانگریس محض تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی جماعت ہے۔ جو زمینداروں۔ تجارت پیشہ لوگوں۔ جنگجو طبقوں بلکہ عوام کی نیابت کا صحیح طور پر دعویٰ نہیں کرسکتی۔ زمینداروں کو اپنا ہم نوا بنانے کی غرض سے بندوبست استمراری (Perma-nent Settlement) کی توسیع کا رزولیوشن کانگریس کم وبیش ہر سال پاس کرتی تھی۔ مگر اس رزولیوشن کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ نہ کسی سیاست داں کو یہ امید تھی کہ انگریزی حکومت اس رزولیوشن پر کاربند ہوگی۔ علی گڈھ اوس وقت مسلم پولٹیکل تحریک کا مرکز تھا۔ اور عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ عرصۂ دراز تک علی گڈھ مسلمانوں کی تعلیمی۔ معاشرتی اور سیاسی اقدامات بلکہ تمام تر اسلامی ہندی جدوجہد کا مرکز رہے گا۔ اور اگر سر انٹانی میکڈانل مسلمانوں کو حقیر و

---

[1] مغلیہ عہد میں ہندوستان کے معنی جو کچھ ہوں۔ میرا مفہوم اس کتاب میں ہندوستان سے ملک ہند (انڈیا) ہے انگریز مورخ ہندوستان سے شمالی ہند مراد لیتے ہیں۔ جن صوبوں کو انگریز مورخ ہندوستان کہتے ہیں میں نے ان کے لئے شمالی ہند یا شمالی ہندوستان کے الفاظ استعمال کئے ہیں اور اس کتاب میں ہند اور ہندوستان دونوں مترادف الفاظ قرار دئے گئے ہیں۔

کمزور سمجھ کر اون کے حقوق میں دست اندازی نہ کرتے تو غالباً عرصہ تک علی گڈھ کی مرکزی حیثیت قائم رہتی۔ سر انٹانی میکڈانل ۱۸۹۵ء سے ۱۹۰۱ء تک ہمارے صوبہ کے لفٹنٹ گورنر رہے۔ بڑے قابل اور محنتی لفٹنٹ گورنر تھے۔ طاعون کے انسدادی احکام کے بارہ میں مشورہ کرنے کے لئے مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب کے پاس گنج مرادآباد گئے تھے۔ بحیثیت حاکم صوبہ موصوف زبردست سے لچتے اور کمزور پر غراتے تھے۔ ہندوستان سے پنشن لینے کے بعد لارڈ کا خطاب ملا۔ ۱۹۱۶ء میں موصوف نے ہمارے صوبہ میں اگزیکیوٹو کونسل قایم ہونے کی زبردست مخالفت کرکے ثابت کردیا کہ کانگریس والوں کا یہ خیال غلط تھا کہ میکڈانل صاحب ہمارے ملک کے دوست ہیں۔

شروع ۱۹۰۰ء میں طاعون (پلیگ) کے انسداد کے لئے جو قواعد صوبجات مغربی وشمالی[1] واودھ کی گورنمنٹ نے بنائے تھے وہ غیر معمولی طور پر سخت ثابت ہوئے اور کانپور میں بڑا بلوہ ہوا جس کے باعث اوس شہر کے ہندو مسلمانوں میں اتحاد قایم ہوا۔ کچھ دن بعد صوبہ کی گورنمنٹ نے اپنا وہ رزولیوشن مورخہ ۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء جاری کیا جس کو مسلمانوں میں سیاسی بیداری کا اصلی سبب اور آل انڈیا مسلم لیگ قایم ہونے کی بنیادی وجہ سمجھنا چاہیئے۔ اس رزولیوشن کے ذریعہ سے اہل معاملہ کو اختیار دیا گیا تھا کہ اپنے عرضی دعوے۔ جواب دعوے۔ استغاثے۔ عرضیاں وغیرہ بجائے اُردو رسم الخط میں لکھنے کے ہندی یعنی دیوناگری رسم خط میں لکھ کر پیش کرسکیں۔ کانپور کے بلوہ کے چندہی دن بعد اِس رزولیوشن کے جاری کرنے سے بہت سے لوگوں کو خیال ہوا کہ یہ ترکیب ہندو مسلمانوں میں نااتفاقی پیدا کرنے کے لئے کی گئی ہے۔ سر انٹانی میکڈانل بڑے قابل لفٹنٹ گورنر تھے۔ مگر کوئی بڑا عہدہ سنبھالنے کے لئے تنہا قابلیت کافی نہیں ہے۔ ذاتی قابلیت کے اعتبار سے ۱۸۵۸ء سے لے کر آج تک جتنے گورنر جنرل ملک معظم کی گورنمنٹ نے اس

---

[1] ۱۹۰۲ء میں سرحدی صوبہ قایم ہونے پر صوبجات مغربی وشمالی واودھ کا نام صوبجات متحدہ آگرہ واودھ قرار پایا۔ اختصار کا نام یو۔پی ٹھہرا۔

ملک میں بھیجے لارڈ کرزن غالباً اون سب میں قابل ترین تھے۔ ہندوستان آنے سے پہلے اپنے بارہ میں اون کا حُسنِ ظن تھا۔ کہ ایک دن انگلستان کے وزیر اعظم ہوں گے۔ تاہم اِس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جس ناعاقبت اندیشی سے اونھوں نے کام لیا اوس کے باعث ہند میں انگریزی حکومت کا زوال خود اون کے زمانہ میں شروع ہوگیا۔ اور وزارت عظمیٰ کے خواب کی تعبیر اُلٹی ہوگئی۔ سرانٹانی میکڈانل کو سابقہ مسلمانوں سے تھا جو اوس وقت تک انگریزی حکومت کو اپنا ملجا اور ماویٰ بلکہ مائی باپ سمجھتے تھے۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ جب کوئی طبقہ یا کسی ملک کی آبادی کا کوئی حصہ اوس ملک کی گورنمنٹ کا پورا وفادار اور خیرخواہ ہو اور گورنمنٹ اوس کے مفاد کو ٹھکرائے تو ولولہ وفاداری جس قدر مضبوط اور توقعات جس قدر اونچی ہوتی ہیں مایوسی اور ناامیدی بھی اوسی قدر گہری ہوتی ہے۔ بدیسی گورنمنٹ ہونے کی صورت میں وفادار طبقہ کی شکایت اوس کے لئے درس عبرت کا کام دیتی ہے۔ گورنمنٹ کی تائید میں بعض اوقات یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو عمل اوس سے نادانستہ سرزد ہوا ہو اور جس کی تلافی کے لئے گورنمنٹ تیار ہو اوس پر سخت گیری کرنا گورنمنٹ سے جھگڑا مول لینا ہے۔

سرانٹانی میکڈانل کی ہندونوازی اور ناگری والا رزولیوشن

سرانٹانی میکڈانل کی یہ حالت ہرگز نہ تھی۔ لفٹنٹ گورنر ہونے کے بعد جب وہ پہلی مرتبہ بنارس گئے اور تقریر کی تو عالمگیر[1] کے مظالم کا حوالہ دے کر اونھوں نے

---

[1] انگریز مورخ جلال الدین کو اکبر۔ نورالدین کو جہانگیر اور شہاب الدین کو شاہجہاں کہتے ہیں۔ یہاں تک کہ سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار سراج الدین کو جو فی الحقیقت انگریزوں کے پنشن خوار تھے بہادر شاہ کہنے میں اونھیں تامل نہیں ہے۔ نہ شہزادہ عالی گہر کو شاہ عالم کہنے میں عذر ہے۔ مگر عالمگیر کا حوالہ مرحوم کے شہزادگی کے نام یعنی اورنگ زیب سے ہمیشہ دیتے ہیں۔ مغلوں کے زمانہ میں بادشاہ کے تین نام ہوتے تھے۔ ایک اصلی نام۔ دوسرا شہزادگی کا نام اور تیسرا وہ نام جو بادشاہ تخت نشینی کے وقت اختیار کرتا تھا۔ مثلاً شہزادگی کا نام نورالدین کا سلیم اور شہاب الدین کا خرّم تھا۔ تخت نشینی کے وقت سلیم نے جہانگیر اور خرم نے شاہجہاں کا لقب اختیار کیا۔ اسی طرح (بقیہ مضمون صفحہ ۸۷ پر)

ہندو بھائیوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا۔ ناگری پرچارنی سبھا کے ایڈریس کے جواب میں لاٹ صاحب اپنی ہمدردی کا اظہار فرما چکے تھے۔ اِن حالات میں ۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء والے رزولیوشن سے مسلمان صرف ایک ہی نتیجہ نکال سکتے تھے اور وہی نتیجہ اونھوں نے نکالا۔ یعنی یہ کہ مسلمانوں کا گورنمنٹ کے حامی ہونے کے باعث لاٹ صاحب کو اون کے جذبات اور حسیات کو ٹھکرانے میں ذرا سا بھی تامل نہیں ہے۔ حامی کی قدردانی ہمیشہ اوس شخص یا جماعت کے ظرف و ہمت کی بقدر ہوتی ہے جس کی حمایت کی جائے۔ مگر اس حقیقت سے ہماری قوم ہنوز آگاہ نہ تھی۔ انگریزوں نے ہندوستان کی حکومت حاصل کرنے میں جو جوڑ توڑ کیے اوس سے تاریخ کے صفحے ناآشنا نہیں ہیں۔ تاہم ایسٹ انڈیا کمپنی سے تاج برطانیہ کی طرف حکومت منتقل ہونے کے بعد کوئی اہم مرحلہ ایسا پیش نہ آیا تھا جس سے مسلمانوں کی آنکھیں کھُلتیں۔ اب مسلمانوں کو یقین ہوگیا کہ گورنمنٹ نہ ہماری وفاداری کی قدر کرتی ہے نہ ہماری امداد کی پروا۔ اس یقین کی تائید میں اس سے زیادہ مضبوط اور کیا شہادت ہوسکتی تھی کہ سر سید احمد خاں علیہ الرحمتہ جو ہندوستان میں انگریزی گورنمنٹ کی وفاداری کا رکنِ اعظم تھے آخری وقت میں جو مضمون لکھ رہے تھے

(بقیہ مضمون نوٹ صفحہ ۸۶) تختِ نشینی کے وقت اورنگ زیب کا نام عالم گیر قرار پایا۔ اور فارسی کی کتابوں میں یہی نام درج ہے۔ رقعات عالم گیری اور فتاوئ عالمگیری کے نام سے سارا ملک واقف ہے۔ مگر تعجب ہے کہ انگریز مورخ اس جلیل القدر بادشاہ کو اوس کے شہزادگی کے نام یعنی اورنگ زیب سے یاد کرتے ہیں۔ اس کتاب میں مشہور انگریزی مثل کی بموجب بیلچہ کو بیلچہ یعنی عالم گیر کو عالم گیر کہا گیا ہے۔ ہمارے زمانہ کے انگریز مورخ تو اپنے اسلاف کے طریقہ کے خلاف بوناپارٹ کو نپولین کہتے ہیں۔ انگریزوں کی عالم گیر سے کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ حالانکہ نپولین کی فرماں روائی کا قریب قریب سارا زمانہ انگریزوں سے لڑنے میں صرف ہوا۔ امید ہے کہ آئندہ انگریز مورخ عالم گیر کے ساتھ وہ تنگ دلی اور زیادتی نہ برتیں گے۔ جس کا شکار شہنشاہ مرحوم اب تک رہے ہیں۔ عالم گیر کے سکوں پر یہ شعر لکھا جاتا تھا۔ شعر۔ سِکہ زد در جہاں چو مہرِ منیر ٭ شاہ اورنگ زیب عالم گیر۔ سونے کے سکوں پر مہرِ منیر اور چاندی کے سکوں پر بدرِ منیر مرقوم ہوتا تھا۔

اور جس کو مرتے وقت اونھوں نے ناتمام چھوڑا۔ وہ ناگری پرچارنی سبھا کے بے بنیاد اور فتنہ زا دعووں کے ابطال میں تھا۔ وفات سے چند مہینے پہلے سر سید کو یقین ہو گیا تھا کہ ناگری پرچارنی سبھا سے لاٹ صاحب کا سازباز رنگ لائے گا اور سر سید کا بہت سا وقت اردو کی حمایت میں صرف ہوتا تھا۔ سرکاری گزٹ میں رزولیوشن چھپتے ہی مسلمانوں میں آگ لگ گئی۔ جگہ جگہ احتجاجی جلسے ہوئے۔ خود علی گڈھ میں بہت بڑا جلسہ ہوا جس کی صدارت نواب لطف علی خاں صاحب رئیس طالب نگر نے فرمائی۔ علی گڈھ میں خاں بہادر شیخ عبداللہ صاحب کو وکالت شروع کئے ابھی پورے دو سال بھی نہیں ہوئے تھے۔ آج شیخ صاحب کے نام سے شمالی ہند کے مسلمان اس لئے واقف ہیں کہ اونھوں نے اور اون کی بیگم صاحبہ مرحومہ نے مسلم گرلس کالج بناکر قوم کی ایک شدید ضرورت کو پورا کیا۔ مگر موجودہ نسل شیخ صاحب کی اوس ان تھک کوشش سے واقف نہیں ہے۔ جو اونھوں نے اردو کی زبردست حمایت میں عرصہ تک جاری رکھی۔ اس جدوجہد میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب مرحوم اور ڈاکٹر سر ضیاءالدین احمد بھی شیخ صاحب کے معین تھے۔ ناگری رسم خط کا رواج بہار میں ہو چکا تھا۔ شیخ عبداللہ صاحب نے حالات معلوم کرنے اور اس تبدیلی کا جو اثر بہار میں ہوا تھا اوس سے واقفیت بہم پہونچانے کے لئے پٹنہ کا سفر کیا۔ محسن الملک مرحوم نہ صرف جیّد عالم تھے بلکہ اردو کے زبردست ادیب اور اپنے زمانہ کے بہترین مقرر تھے۔ سر سیّد کے جانشین ہونے کی حیثیت سے اُردو کو اغیار کے حملوں سے محفوظ رکھنا اون کا فرض تھا۔ تاہم جلیل القدر انگریزی حکام کی اون کی نظر میں اس قدر عظمت تھی اور پولیٹکل معاملات میں اس قدر غیر معمولی احتیاط برتتے تھے کہ اگر شیخ صاحب بیچ میں نہ پڑتے تو وہ اٹھارہ اپریل کے رزولیوشن کی کھلم کھلا مخالفت غالباً نہ کرتے۔ صلاح و مشورہ کے بعد یہ طے پایا کہ اضلاع میں رزولیوشن کی مخالفت میں جلسے کرائے جائیں جن میں تقریروں کا انتظام کیا جائے۔ احتجاجی رزولیوشن پاس کرائے جائیں۔ روئداد اخباروں میں شائع کرائی جائے۔ نیز رزولیوشنوں کے مضمون سے

لفٹنٹ گورنر اور وائسرائے کو بذریعہ تار مطلع کیا جائے۔

یو۔ پی کے بعض اضلاع کا دورہ

متھرا۔ آگرہ۔ فتح گڈھ۔ فتح پور۔ بنارس۔ الٰہ آباد۔ لکھنؤ۔ اور مرادآباد کا دورہ کرنے اور وہاں جلسے کرانے کا کام میری سپرد کیا گیا۔ میں نے ۹ مئی ۱۹۰۰ء کو ان مقامات کا دورہ شروع کیا۔ جن قصبات میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی مثلاً قائم گنج اور قنوج وہاں بھی میں پہونچا اور جلسے کرائے۔ قائم گنج ضلع فرخ آباد میں پٹھانوں کی بڑی آبادی تھی۔ وہاں فوج کے پنشن یافتہ افسروں یعنی دفعہ دار۔ جمعدار۔ صوبہ دار۔ رسالدار وغیرہ کی تعداد معقول تھی۔ وہ سب جلسہ میں موجود تھے۔ پانیر کو جو تار بھیجا گیا اوس کا ایک فقرہ نقل کرتا ہوں: "مسلمانان قائم گنج کا بہت بڑا جلسہ آج منعقد ہوا۔ ناگری رسم الخط کے رزولیوشن کی مخالفت نے پنشن یافتہ فوجی افسروں کو جو قصبہ کی آبادی کا سب سے اہم عنصر ہیں نیز بڑی تعداد میں عام اہل اسلام کو دوش بدوش کھڑا کر دیا ہے۔" بعد کو معلوم ہوا کہ قائم گنج کے پنشن یافتہ فوجی افسروں کی جلسہ میں شرکت پر لاٹ صاحب بہت جھنجھلائے۔ بنارس کے جلسہ منعقدہ ۳۰ مئی ۱۹۰۰ء میں پنڈت کدارناتھ صاحب بی۔ اے وکیل کی تقریر قابل تذکرہ ہے۔ پنڈت صاحب خوش بیان مقرر تھے دوران تقریر میں جو نہایت جامع تھی موصوف نے بتایا تھا کہ گورنمنٹ کے رزولیوشن کی مخالفت میں ہندوؤں کا آزاد اور روشن خیال طبقہ مسلمانوں کا ساتھی ہے۔ موصوف نے اس پر زور دیا تھا کہ طرز ادا اور جامعیت کے لحاظ سے اردو کو ہندی پر ہر طرح ترجیح ہے۔ اور اگر اردو کی جگہ ہندی کو دے دی گئی تو اوس سے ان صوبہ جات کی ترقی کو بڑا صدمہ پہونچے گا۔ سرکاری ملازمت میں منصفی اور سب ججی اور ڈپٹی کلکٹری کے عہدوں پر ہندو اکثریت میں ہیں اور قدرتی طور پر ادن کی یہ خواہش ہوگی کہ اہل معاملہ اور وکلا دیوناگری رسم خط استعمال کریں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اردو کی جگہ ہندی زبان اسی طرح لے لے گی جس طرح دن کے بعد رات آتی ہے۔ پنڈت صاحب نے افسوس ظاہر کیا تھا کہ سر انٹانی میکڈانل جیسے قابل اور ہمدرد لفٹنٹ گورنر کا ایسی بڑی تبدیلی کو

---

[۱] پنڈت صاحب کشمیری برہمن تھے۔ فارسی خوب جانتے تھے۔ جلسہ سے پہلے میری اون کی مفصل گفتگو ہو چکی تھی۔

منظور کرنا اِس امر کی دلیل ہے کہ اُنھوں نے حامیانِ اردو کے اعتراضات پر کافی غور و خوض نہیں کیا ہے۔ بنارس کے جلسہ کے صدر مرزا جمال الدین احمد آنریری مجسٹریٹ تھے۔

خفیہ پولس کی مجھ پر توجہات

علی گڈھ سے روانہ ہونے کے ایک ہفتہ بعد مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ میری نقل و حرکت خفیہ پولیس کے زیر نگرانی ہے۔ فتح گڈھ پہونچ کر اِس کا بیّن ثبوت بھی مل گیا۔ فتح گڈھ میں ایک دوست کے مکان پر کوتوال شہر سے ملاقات ہوئی۔ میرے دوست نے کوتوال سے میرا تعارف کرایا۔ اوس زمانہ میں کوتوال شہر عام طور پر فرعون بے سامان ہوتا تھا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور کپتان پولیس تک بہت کم لوگوں کی رسائی ہوتی تھی۔ جن حضرات کو اِن دونوں سرکاروں میں باریابی کا شرف حاصل ہوتا اون کی مجال نہ تھی کہ پولیس اور بالخصوص کوتوال کی شکایت کا ایک حرف بھی زبان پر لاسکیں فتح گڈھ کے کوتوال کو جب معلوم ہوا کہ میں اُردو کی تائید میں جلسہ کرانے والا ہوں تو مجھ سے فرمانے لگے کہ جلسہ کرانے کا آپ کو اختیار ہے۔ مگر جلسہ سے پہلے آپ کو مجسٹریٹ ضلع سے ضرور مل لینا چاہیئے۔ میں نے جواب دیا کہ میں جس کام کے لئے یہاں آیا ہوں اوس کا مجسٹریٹ ضلع سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں اپنا کام کروں گا۔ آپ اپنا کام کیجئے اور اگر ضرورت سمجھئے تو بحیثیت کوتوال مجسٹریٹ ضلع کو جلسہ کی اطلاع آپ دیجئے۔ کوتوال کا خواہ مخواہ مجھے مشورہ دینا پولیس کی معمولی دھونس تھی۔ جس پر میں نے مطلق توجہ نہیں کی۔ فتح گڈھ میں ۱۸ مئی ۱۹۰۰ء کو زبردست جلسہ ہوا جس کی صدارت مولوی محمد اسمٰعیل صاحب وکیل نے کی۔ اِن جلسوں کی زنجیر کی آخری کڑی میرے وطن کندرکھی تک پہونچی۔ جہاں آخری جلسہ ۹ رجون ۱۹۰۰ء کو میرے بڑے چچا میر فدا علی صاحب کی صدارت میں ہوا۔ جلسہ میں بہت سے ہندو حضرات بھی موجود تھے جن میں منشی بابو لال وکیل اور بابو کنج بہاری لال رئیس کندرکھی خاص طور پر قابل تذکرہ ہیں۔

بہار اور بنگال کا دورہ

علی گڈھ پہونچنے پر معلوم ہوا کہ جو اضلاع میری سپرد کئے گئے تھے اون میں جس کامیابی کے ساتھ جلسے ہوئے اوس کی علی گڈھ میں

قدر تھی۔ دنیا کا قاعدہ ہے کہ کام کرنے والے کے سپرد اور کام کیا جاتا ہے۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اوس زمانہ میں مسلمانوں کی سب سے بڑی منظم جماعت تھی۔ دسمبر ۱۸۹۹ء میں کانفرنس کا اجلاس کلکتہ میں جسٹس سید امیر علی کے زیر صدارت ہو چکا تھا۔ نواب محسن الملک کی خواہش تھی کہ دسمبر ۱۹۰۰ء کا اجلاس پٹنہ میں منعقد ہو۔ لیکن پٹنہ والوں کو کانفرنس سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ اس لئے مجھے پٹنہ بھیجا گیا کہ وہاں کی تعلیم یافتہ جماعت اور با اثر حضرات کو آمادہ کروں کہ کانفرنس کو پٹنہ میں اجلاس منعقد کرنے کی دعوت دیں۔ علی گڈھ چھوڑنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک بات کا اور تذکرہ کر دوں جس سے اوس زمانے کے مسلمانوں کی سیاسی غیر دانشمندی بے بسی اور پست ہمتی کا اندازہ ہو جائے گا اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ ۱۸ اپریل کے رزولیوشن کی مخالفت میں جو جلسہ علی گڈھ میں ہوا اوس کے صدر نواب لطف علی خاں صاحب تھے۔ اُردو کی حمایت میں ایک انجمن علی گڈھ میں اور دوسری لکھنؤ میں قایم ہو چکی تھی۔ مسلمانوں میں جو اضطراب اور ہیجان پیدا ہوا تھا اوس کا کچھ اثر گورنمنٹ پر نہ پڑا۔ بلکہ سر انٹانی میکڈانل کا طریقہ عمل سخت سے سخت تر ہو گیا۔ اب تک احتجاجی جلسوں کی روئداد کے تار پائنیر اور دوسرے اخباروں میں چھپتے تھے۔ مئی کے آخر میں پائنیر نے اعلان کیا کہ احتجاجی جلسوں کے تار آئندہ اوس کے کالموں میں نہ چھاپے جائیں گے۔ جون کے مہینہ میں نواب لطف علی خاں صاحب نے علی گڈھ کی انجمن تحفظ اُردو سے استعفےٰ دے دیا۔ حالات گردوپیش سے صاف ظاہر تھا کہ اگر سر انٹانی میکڈانل نے مسلمانوں کی اِس جائز تحریک اور شورش کو دبا دیا تو علی گڈھ کی سیاسی اہمیت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے گا۔ بڑی دقت یہ تھی کہ پولٹیکل قیادت وہی شخص کر سکتا تھا جو سر سید کا جانشین ہو۔ سر سید کے جانشین اس وقت نواب محسن الملک تھے۔ لیکن اپنی تربیت اور اور طرزِ طبیعت کے باعث محسن الملک کا کسی ایسی تحریک میں لیڈر ہونا جس میں گورنمنٹ یا لفٹنٹ گورنر سے تصادم لازم آئے۔ قوم کے لئے ہرگز مفید نہ تھا۔ یہ سچ ہے کہ سیاست دانی اور قابلیت میں محسن الملک اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ مگر سیاسی میدان میں کامیابی کی شرط اولین

جرأت وہمت ہے۔ میرے نزدیک سیاسی لیڈری کے ضروری اوصاف نواب وقار الملک میں موجود تھے۔ مگر محسن الملک کے جیتے جی وقار الملک کو یہ موقع نہ تھا کہ پولٹیکل معاملات کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ غرضکہ مسلمانوں کی بے بسی کا جو عالم ۱۹۰۶ء میں تھا اوس کو دیکھ کر یہ مصرعہ یاد آتا تھا۔

ہم ایسے ہیں کہ جیسے کسی کا خدا نہ ہو

ایجوکیشنل کانفرنس کی تیاریاں پٹنہ میں

جون ۱۹۰۶ء کے تیسرے ہفتہ میں نواب محسن الملک کا خط خان بہادر مولوی فضل امام کے نام لے کر میں پٹنہ پہونچا اور خان بہادر صاحب کے یہاں قیام کیا۔ موصوف بڑی خوبیوں کے آدمی تھے خوش مزاج۔ مہمان نواز۔ مغربی اور مشرقی دونوں تہذیبوں کے طریقوں سے واقف۔ شہری زندگی (civic life) سے دلچسپی۔ اخبار بینی کا شوق۔ انگریزی خوب بولتے تھے۔ میری بڑی خاطر تواضع کی۔ علی گڈھ میں تو بلا کی گرمی تھی۔ دن بھر لو چلتی تھی۔ مگر پٹنہ میں بارش شروع ہوگئی تھی۔ مولوی فضل امام رات کو اپنی کوٹھی کے برآمدہ میں سوتے تھے۔ رات بھر قلی چھت کا پنکھا کھینچتا تھا۔ وہ زمانہ بجلی کے پنکھوں کا نہ تھا۔ نہ پٹنہ میں بجلی تھی۔ موصوف کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ علی گڈھ کی تحریک سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہ سمجھ کر کہ کانفرنس کو دعوت دینے کا بار تنہا ایک شخص پر نہ پڑے۔ میں نے اس شہر کے عمائد اور با اثر حضرات کی خدمت میں آنا جانا اور کانفرنس کو پٹنہ میں مدعو کرنے کی ضرورت پر گفتگو کرنی شروع کر دی۔

امام برادران

سب سے پہلے مسٹر حسن امام سے ملا۔ مسٹر علی امام اوس زمانہ میں کسی بڑے مقدمہ میں گیا میں کام کر رہے تھے۔ جب وہ پٹنہ آئے تو اون سے مل کر مفصل بات چیت کی۔ مسٹر شرف الدین اپنے عہد کے بڑے کامیاب بیرسٹر تھے۔ مگر بڑے بھانجے (سر علی امام) کی بڑھتی اور جگمگاتی کامیابی کے آگے اون کی شہرت ماند پڑ چلی تھی۔ کوٹھی پر دوستوں کا مجمع رہتا تھا جو کم و بیش مصاحبت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ مولوی محمد یحییٰ صاحب

دیوانی کے نامور وکیل تھے۔ اون کے بیٹے مسٹر محمد سلیمان بیرسٹر نے بانکی پور اور پٹنہ کے عمائد سے میرا تعارف کرانے میں بہت مدد دی۔ خان بہادر سر فراز حسین خاں صاحب اوس وقت پٹنہ میونسپلٹی کے وائس چیرمین تھے۔ بادشاہ نواب صاحب اور منجھلے نواب صاحب اور چھوٹے نواب صاحب سب بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔ جن کی زندگی کو دیکھ کر اودھ کے بعض نامور مسلمان تعلقہ داروں کی شان و شوکت اور روایات یاد آتی تھیں اون کے والد نواب بہادر لطف علی خاں سی۔ آئی۔ ای پٹنہ کے مشہور رئیس تھے۔ تین بیٹے اور دو بیٹیاں وارث چھوڑے تقسیم میں ہر بیٹے کے حصہ میں تیس لاکھ اور ہر بیٹی کے حصہ میں پندرہ لاکھ نقد روپیہ آیا۔ اس کے علاوہ نواب بہادر نے جو جائداد ترکہ میں چھوڑی اوس کی سالانہ آمدنی تین لاکھ روپے تھی۔ جب فرصت ہوتی تھی تو بہ نظر استفادہ میں خان بہادر سید علی محمد صاحب شاد کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور موصوف مجھے اپنا کلام سنا کر میری عزت افزائی فرماتے تھے۔ الطاف نواب صاحب اور خورشید نواب صاحب کی خدمت میں بھی اکثر حاضر ہوتا تھا۔ ایک روز الطاف نواب صاحب سے گفتگو ہو رہی تھی۔ فرمانے لگے کانفرنس کو دعوت دینے کے لئے معقول رقم کی ضرورت ہے۔ اب تک چندہ میں کوئی بڑی رقم آئی یا نہیں میں نے کہا کیوں نہیں ایک ہزار روپیہ سر علی امام اور پانچ سو سے لے کر ایک ہزار تک مسٹر حسن امام دینے کے لئے تیار ہیں۔ اگر شہر کے رئیسوں نے بھی فیاضی سے کام لیا تو کانفرنس کا مدعو کرنا کچھ مشکل کام نہیں ہے۔ کہنے لگے وہ دونوں بھائی کما رہے ہیں جتنا چاہیں دے سکتے ہیں مگر شہر کے رئیسوں میں تو مجھے کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو ڈھائی سو تین سو روپے سے زیادہ دے سکے۔

میونسپلٹی کے وائس چیرمین کا انتخاب

اوسی زمانہ میں میونسپلٹی کی وائس چیرمینی کا انتخاب ہونے والا تھا اور مقابلہ مولوی فضل امام اور خان بہادر سر فراز حسین کے درمیان تھا۔ موجودہ وقت وائس چیرمین سر فراز حسین خاں صاحب تھے۔ مولوی فضل امام کی عمر اوس وقت پچاس سال کے قریب ہوگی۔ مگر جو دوادوش اور جدوجہد اونھوں نے کی اوس سے معلوم ہوتا تھا کہ جوانوں بلکہ نوجوانوں کی قوتِ عمل موصوف میں موجود ہے تاریخ مقررہ پر انتخا

ہوا۔ دونوں حریفوں کے ووٹ برابر برابر آئے اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ یعنی چیرمین نے اپنا ووٹ سرفراز حسین خاں صاحب کو دے کر اون کو کامیاب کرا دیا۔ مولوی فضل امام بھی گورنمنٹ کے خیرخواہ تھے اور سرکاری حکام سے خوش گوار تعلقات رکھتے تھے۔ انتخاب کے بعد اون کی شکایت پر مجسٹریٹ ضلع نے جواب دیا کہ سرفراز حسین خاں صاحب اس وقت وائس چیرمین ہیں۔ اگر میں اون کو ووٹ نہ دیتا تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ اپنی وائس چیرمینی کے زمانہ میں جو کام اونھوں نے کیا ہے وہ میری نظر میں یا قابل ملامت ہے یا قدر کی قابل نہیں ہے۔ شکست نے مولوی فضل امام کے جوش و خروش کو ٹھنڈا کر دیا۔ موصوف غالی شیعہ تھے۔ نواب محسن الملک نہ صرف شیعہ سے سُنی ہوئے تھے بلکہ آیات بیّنات کے مصنف ہونے کی حیثیت سے پُرجوش مذہبی حلقوں میں اون کا بڑا چرچا تھا۔ ایک مہینہ پٹنہ میں قیام کرنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ مولوی صاحب نواب صاحب سے خوش نہیں ہیں۔ اور دل سے نہیں چاہتے کہ کانفرنس کا اجلاس پٹنہ میں منعقد ہو۔ اس عرصہ میں مسٹر حسن امام سے میرے تعلقات بہت بڑھ گئے تھے۔ سر علی امام سے بھی جب وہ پٹنہ آتے تھے ملاقات ہوتی تھی۔ مگر وہ مہینہ میں پچیس دن باہر رہتے تھے۔ جولائی کے آخر میں پٹنہ کے عمائد کا جلسہ کانفرنس کو دسمبر ۱۹۰۵ء میں دعوت دینے کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے منعقد ہوا اور کثرت رائے سے یہ قرار پایا کہ اس سال کانفرنس کو مدعو نہ کیا جائے۔ مولوی فضل امام سے اس جلسہ میں کچھ مدد نہ ملی۔ سر علی امام نے کانفرنس کا اجلاس پٹنہ میں ہونے کی ضرورت پر بڑی زوردار تقریر کی۔ مگر کثرت رائے اُن کے خلاف رہی میں نے پانچ ہفتہ تک نہایت سخت جدوکد کی تھی۔ اس لئے جلسہ کا یہ فیصلہ مجھے سخت ناگوار گزرا اور میں نے اپنے دل میں یہ ٹھانی کہ جو کچھ بھی ہو میں اس ہار کو ہار نہ مانوں گا اور امام برادران کو آمادہ کروں گا کہ کانفرنس کو پٹنہ میں اجلاس منعقد کرنے کی دعوت دیں۔ میں نے سر علی امام اور مسٹر حسن امام سے دوبارہ گفتگو کی اور تمام حالات کو جانچنے کے بعد دونوں نے کانفرنس کو مدعو کرنے پر اپنی پُرخلوص آمادگی ظاہر کی۔ اب میرا پٹنہ میں زیادہ ٹھہرنا بیکار تھا مولوی فضل امام

کے یہاں سے اوٹھ کر مسٹر حسن امام کے یہاں چلا جانا نامناسب تھا۔ مگر یہ بھی ظاہر تھا کہ اگر کانفرنس کا اجلاس پٹنہ میں ہو سکتا تھا تو اوس کی صورت صرف یہ تھی کہ میں مسٹر حسن امام کے یہاں ٹھہروں۔ خوش قسمتی سے مجھے کلکتہ جانا تھا اور میں نے یہ طے کیا کہ کلکتہ سے واپسی میں مولوی فضل امام کے یہاں قیام نہ کروں گا۔

کلکتہ کے حالات

آخر جولائی میں میں کلکتہ پہونچا اور خاں بہادر مرزا شجاعت علی بیگ کا مہمان ہوا۔ مرزا صاحب کو ذاتی قابلیت نے عروج پر پہونچایا۔ موصوف نے اپنا دوسرا عقد ہر ہائی نس بیگم صاحبہ مرشد آباد کی بیوہ صاحب زادی سے کیا تھا اور کلکتہ میں اپنی بیوی اور خوش دامن یعنی ہر ہائی نس کے ساتھ امیرانہ شان سے رہتے تھے۔ اوس زمانہ میں کلکتہ کے مسلمان لیڈروں کی زندگی بہت عجیب و غریب تھی۔ ایک گروہ کے لیڈر مسٹر اے۔ الیف۔ ایم۔ رحمان تھے جو کلکتہ کے مشہور مسلمان لیڈر نواب عبدالطیف مرحوم کے صاحب زادہ تھے۔ دوسری جماعت کے لیڈر مسٹر ابوالحسن تھے۔ یہ دونوں صاحب کلکتہ میں عدالت ہائے خفیفہ کے جج تھے۔ مسٹر ابوالحسن پٹنہ کے رہنے والے اور خان بہادر مولوی خدا بخش[1] کے چھوٹے بھائی تھے۔ نواب امیر حسن خاں صاحب پریسیڈنسی مجسٹریٹ تھے اور مجسٹریٹی کے فرائض نہایت خوبی سے انجام دیتے تھے۔ اون کی بے مثل فراست کا ایک قصہ کلکتہ میں سنا تھا۔ کابل اور سرحد کے آدمی ہمارے ملک میں اب بھی تجارت کے لئے آتے ہیں اور اوس زمانہ میں بھی آتے تھے۔ کلکتہ میں اون کی خاصی معقول آبادی تھی۔ ایک کابلی کا لڑکا چوری کے الزام میں نواب صاحب کے اجلاس میں پیش ہوا۔ مقدمہ کی نوعیت ایسی تھی کہ برائے نام تو چوری کا الزام صحیح تھا۔ مگر

---

[1] مولوی خدا بخش خاں پہلے ریاست حیدر آباد میں ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے بعد ۱۸۹۵ء میں پٹنہ میں رہتے تھے اور وکالت کرتے تھے۔ موصوف نے پٹنہ میں اپنا کتب خانہ اور قلمی نسخے مجھے دکھائے تھے۔ سوائے کتابیں جمع کرنے کے اون کو کسی اور کام سے اون کو غرض نہ تھی۔ میں نے اون جیسا کتابوں کا عاشق کسی ہندستانی کو آج تک نہیں پایا۔ اوسی عشق اور دھن کا نتیجہ وہ بے نظیر کتب خانہ ہے جو آج پٹنہ میں خدا بخش خاں لائبریری کے نام سے اہل علم کا زیارت گاہ بن گیا ہے۔

درحقیقت ملزم کی نیت مجرمانہ نہ تھی ملزم کا باپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ عدالت میں اس لئے آیا تھا کہ دنگا فساد کرے۔ اور بیٹے کو جیل خانے نہ جانے دے۔ ثبوت کی شہادت اور ملزم کا بیان قلم بند کرنے کے بعد نواب صاحب نے کابلی سے کہا کہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ تم جیسے معزز باپ کا بیٹا ایسی ذلیل حرکت کرے۔ کابلی نے کہا ہم اس بدبخت سے بہت ناراض ہے اور اوس کو زدوکوب کرے گا۔ نواب صاحب نے لڑکے کو کابلی کے سپرد کرکے کہا لو یہ تمہارا لڑکا موجود ہے۔ بید لے کر ہمارے سامنے اس کو سزا دو اور ایک درجن بید لگاؤ۔ کابلی کی رگِ حمیت جوش میں آئی اور کہنے لگا آپ بڑا شریف مجسٹریٹ ہے۔ ہم اِس بدبخت کو ایک درجن سے بھی زیادہ بید مارے گا۔ چنانچہ وہیں عدالت میں کابلی نے اپنے ہاتھ سے بیٹے کو بید کی سزا دی اور اس طرح مقدمہ ختم ہوا۔ سر عبدالرحیم بیرسٹری کرتے تھے اور غالباً ڈپٹی لیگل ریمیمبرینسر کے عہدہ پر مامور تھے۔ جسٹس سید امیر علی کلکتہ کے سب سے مقتدر اور سب سے قابل مسلمان تھے۔ علی گڈھ تحریک سے اون کو دلچسپی تھی اور سالِ گذشتہ میں کانفرنس کا جو اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا تھا اوس کی صدارت موصوف نے کی تھی۔ سرسید میموریل فنڈ کا کام شمالی ہند میں ۱۸۹۸ء میں شروع ہو گیا تھا۔ جب علی گڈھ کی تحریک کلکتہ میں پھیلی اور کانفرنس کا اجلاس وہاں منعقد ہوا تو کلکتہ والوں نے بھی اپنے اپنے وعدوں کا اعلان کیا۔ مگر ان وعدوں کی تین چوتھائی سے زیادہ رقم ہنوز وصول نہیں ہوئی تھی۔ ہر ہائی نس بیگم صاحبہ مرشدآباد نے پانچ ہزار کا وعدہ کیا تھا۔ جس میں سے دو ہزار روپیہ مرزا شجاعت علی بیگ صاحب نے مجھ کو ادا کئے اور خواہش کی کہ میں نواب محسن الملک کو اس رقم کی ادائگی سے بذریعہ تار مطلع کر دوں۔ اگست کا مہینہ تھا اور دو تین دن بعد لکھنؤ میں اردو زبان و رسم الخط کی محافظت کے لئے مسلمانوں کا عظیم الشان اجتماع ہونے والا تھا جس کی صدارت خود نواب محسن الملک کرنے والے تھے۔ چنانچہ میں نے نواب صاحب کو بذریعہ تار دو ہزار روپیہ کی وصول یابی کی اطلاع کر دی۔

قومی کام اور کلکتہ والوں کی سرد مہری | قومی کاموں سے مسلمان لیڈروں کو جس قدر دلچسپی

تھی اوس کا اندازہ اِس واقعہ سے ہو گا کہ اگر کوئی جلسہ کلکتہ میں کیا جاتا تو معزز مسلمان اوس وقت تک شریک جلسہ نہ ہوتے تھے جب تک اون کے لانے کے لئے گھوڑا گاڑی کا انتظام نہ کیا جائے۔ میں نے جو جلسے کرائے اون میں شرکت کے لئے اکثر حاضرین کا کرایہ اوس رقم سے ادا کیا جو خرچ سفر کے لئے علی گڈھ کالج سے مجھے ملتی تھی۔ ملک اسپین کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک انگریزی مصنف نے لکھا ہے کہ اگر کسی جگہ پانچ ہسپانوی جمع ہو جائیں تو آن کی آن میں وہ اپنے کو ایسی دو جماعتوں میں منقسم کر لیں گے جس میں سے ہر جماعت میں دو دو ہسپانوی ہوں اور پانچواں ہسپانوی دونوں جماعتوں سے آزاد رہ کر اپنی تیسری پارٹی قائم کرے گا۔ اور اوس تیسری پارٹی کا خود اکیلا رکن ہو گا۔ یہی حالت ۱۹۰۰ئ کے کلکتہ کے مسلمانوں کی تھی۔ بڑی مشکل سے تین چار متقدر مسلمان ایسے مل سکتے تھے جو باہم متحد الخیال ہوں۔ کلکتہ میں بہت سے حضرات نے مجھ سے علی گڈھ کالج کے حالات اور علی گڈھ تحریک کے اغراض و مقاصد دریافت کرنا شروع کر دیئے۔ فرداً فرداً ہر شخص کے سوالات کا جواب دینے میں ہفتہ گزر جاتے۔ اس لئے میں نے علی گڈھ کے مختصر حالات انگریزی میں لکھ کر ایک پمفلٹ چھپوالیا۔ جس کا نام تھا۔ بنگال پریزیڈنسی کے مسلمانوں کی خدمت میں اپیل، یہ پمفلٹ میرے پاس اب بھی موجود ہے۔ یہ پہلا پمفلٹ تھا جس میں علی گڈھ کالج کے حالات شائع کئے گئے تھے۔

مولوی منظور النبی ڈپٹی مجسٹریٹ اور علی گڈھ کالج

مولوی منظور النبی صاحب فریدپور میں ڈپٹی مجسٹریٹ تھے۔ علی گڈھ کالج کے بڑے سچے ہمدرد تھے۔ نواب محسن الملک نے مجھے لکھا کہ فرید پور پہونچ کر اون کی مدد سے میں سرسید میموریل فنڈ کے لئے چندہ جمع کراؤں۔ میں فرید پور پہونچا اور مولوی صاحب مجھے ساتھ لے کر راج باڑی سب ڈویزن کو روانہ ہوگئے۔ اگست کا مہینہ تھا اور اِس مہینے میں شرقی بنگال کے مجسٹریٹ عام طور پر دورہ کرتے تھے۔ اِس دورے کے حالات کو میں کبھی نہ بھولوں گا۔ شمالی ہندوستان میں حکام دورہ کے لئے گھوڑے اور گھوڑا گاڑیاں استعمال کرتے

تھے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لئے پکی یا کچی سڑکیں ہوتی ہیں۔ بنگال میں حکام
دورہ دودخانی کشتی (Steam Launch) میں کرتے تھے اور ندیوں سے سڑکوں
کا کام لیا جاتا تھا۔ بارش اکثر ہوتی تھی۔ اور جب مینہہ نہ برستا تھا تو رات کو شبنم اس قدر گرتی تھی کہ
لوگ مغرب کے بعد چھتری لگا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے تھے تاکہ شبنم سے محفوظ رہ سکیں۔
راج باڑی میں جلسہ ہوا۔ جس میں پانچسو روپیہ کے قریب چندے کے وعدے ہوئے۔ کچھ روپیہ
نقد بھی وصول ہوا۔ دودخانی کشتی کی زندگی مجھ کو بہت پسند آئی۔ میں تین ہفتہ کے قریب مولوی
صاحب کا مہمان رہا۔ اور میری صحت بہت اچھی رہی۔ بخار وغیرہ کی شکایت مجھ کو نہیں ہوئی۔
بنگال کے لوگ بالعموم نحیف الجثہ اور کمزور ہوتے ہیں۔ افلاس اور ناداری کے مرض میں یوں تو
سارا ملک مبتلا ہے۔ مگر بنگال کے کاشتکاروں کی عزبت کی جو حالت میں نے دیکھی وہ ہمارے
صوبہ سے کہیں بدتر تھی جو تعلیم یافتہ بنگالی سرکاری ملازمتوں اور عہدوں پر قابض ہو گئے تھے
اون کی حالت البتہ اچھی تھی۔ مگر انگریزی داں اور غیر انگریزی داں جماعتوں کے درمیان ہمارے
صوبہ سے کہیں بڑھ چڑھ کر امتیاز تھا۔ مختار جو مقدمات کی پیروی کے لئے مولوی صاحب
کے اجلاس میں آتے تھے۔ اون کے طور طریق سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنا شمار خدا کے
خاص بندوں میں کرتے ہیں۔ یہ مختار سب کے سب بنگالی ہندو تھے۔ مجھے کسی مسلمان مختار
کا مولوی صاحب کی عدالت میں آنا یاد نہیں پڑتا۔ دورے سے فارغ ہو کر مولوی صاحب
فرید پور واپس آئے۔ اور فرید پور میں مسٹر کے۔ سی۔ ڈے (K.C. De) کی صدارت میں
علی گڈھ کی امداد کے لئے جلسہ کیا گیا۔ یہ وہی ڈے ہیں جو بعد کو بورڈ آف ریونیو کے ممبر ہوئے
جلسہ میں چندہ تو نہیں کیا گیا مگر چندے کی تحریک کو اوس سے مدد ضرور ملی۔ جس قدر چندہ
ضلع فرید پور میں مولوی صاحب کی کوشش سے ہوا تھا وہ سب موصوف نے میری موجودگی
میں نواب محسن الملک کے نام علی گڈھ بھیج دیا۔ مجھے ایسا یاد پڑتا ہے کہ چھ سو یا سات سو روپے
بھیجے تھے۔ میں فرید پور سے کلکتہ واپس آیا اور تین چار روز وہاں ٹھہر کر پٹنہ چلا گیا۔

سر علی امام اور علی گڈھ کالج سر علی امام کو میں نے اپنے پٹنہ پہونچنے کی اطلاع دے دی تھی اسٹیشن سے اوتر کر سیدھا اون کے یہاں پہونچا۔ سول اسٹیشن کا نام اوس زمانے میں بانکی پور تھا۔ سر علی امام مسٹر حسن امام اور اکثر بیرسٹر سول اسٹیشن میں رہتے تھے۔ سر علی امام کے والد شمس العلمار نواب امداد امام صاحب کی خدمت میں جولائی گذشتہ میں نیاز حاصل ہو چکا تھا۔ وہ جب بانکی پور آتے تھے تو بڑے بیٹے کے یہاں ٹھہرتے تھے۔ اس وجہ سے مجھے موصوف کی جامعیت سے واقف ہونے کا اس دفعہ زیادہ موقعہ ملا۔ موصوف کی عمر اوس زمانے میں ساٹھ سال سے زیادہ ہوگی۔ مگر صحت کے اعتبار سے ساٹھا سو پاٹھا کہلانے کے مستحق تھے۔ زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی میں جوان مات ہوتے تھے۔ علم و فضل میں اون کا درجہ بہت بلند تھا۔ عربی فارسی کے علاوہ انگریزی بھی خوب جانتے تھے۔ اون کی ذات میں بلا کی جامعیت موجود تھی۔ صاحب تصنیف تھے۔ شاعر تھے۔ فن زراعت میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ باغ اور درخت لگانے کا شوق تھا۔ طبیب بھی تھے۔ شکاری بھی تھے اور نشانہ بہت اچھا لگاتے تھے۔ اپنی کتاب معیار الحق مجھے عنایت فرمائی تھی۔ جو اب تک میرے پاس موجود ہے۔ اپنا یہ شعر فخریہ پڑھا کرتے تھے۔ شعر

امروز من نظامی و خاقانیم بہ دہر — نیورہ[1] زمن بہ گنجہ و شروا برابر ست

ترجمہ۔ میں اپنے زمانے کا نظامی اور خاقانی ہوں اور میری وجہ سے نیورہ کا وہی رتبہ ہے جو نظامی کا وطن ہونے کے باعث گنجہ کا اور خاقانی کا وطن ہونے کے باعث شروا کا تھا۔

نواب صاحب کا برتاؤ میرے ساتھ وہی تھا جو بزرگوں کا خوردوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ میرا نام لکڑ سونگھا[2] (یعنی لکڑی سونگھا کر اپنا تابع کرنے والا) رکھا تھا اور میری استعداد معلوم ہونے کے

---

[1] نواب امداد امام صاحب کے والد شمس العلمار مولوی وحید الدین کی سکونت نیورہ ضلع پٹنہ میں تھی حسن امام صاحب مجھے اپنے ساتھ نیورہ لے گئے تھے۔ وہاں جاکر کندرکھی کی تصویر میری آنکھوں میں پھر گئی۔

[2] نواب صاحب فرماتے تھے کہ کسی زمانہ میں کسی بستی میں ایک فقیر کا گذر ہوا۔ فقیر کے پاس ہرن کی شکل کی ایک

بعد اکثر اپنے اشعار مجھے سنایا کرتے تھے۔ میر انیسؔ کو لسان الحق کے خطاب سے یاد کرتے تھے اور اون کے کلام کے عاشق تھے۔ اس دفعہ کے قیام میں غلام مولیٰ مرحوم کی مدد سے کام کرنے والوں اور متوسط طبقہ کے بہت سے حضرات سے ملاقات ہوئی۔ غلام مولیٰ مولوی محمد یحییٰ صاحب وکیل کے بیٹے اور مسٹر محمد سلیمان مرحوم کے چھوٹے بھائی تھے۔ غلام مولیٰ ۱۹۰۲ء میں پڑھنے کے لئے علی گڈھ آئے تھے۔ اور میرے بڑے دوست تھے۔ افسوس ہے کہ عین عالم شباب میں وہ اس دنیا سے چل بسے۔ گو میں سر علی امام کے یہاں ٹھہرا تھا۔ مگر بہت سا وقت مسٹر حسن امام کے ساتھ گذرتا تھا۔ موصوف مقدمات میں باہر بھی جاتے تھے۔ مگر ایک یا دو دن کے بعد واپس چلے آتے تھے۔ سر علی امام اکثر و بیشتر باہر رہتے تھے۔ سر علی امام گذشتہ سال کی کلکتہ کانفرنس میں نواب محسن الملک سے مل چکے تھے اور اون کو علی گڈھ کے معاملات میں دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ مسٹر حسن امام علی گڈھ کے حالات سے زیادہ واقف نہ تھے اون کو جو کچھ دلچسپی تھی وہ زیادہ تر میری وجہ سے تھی بالآخر ستمبر کے مہینہ میں یہ طے ہوا کہ دونوں بھائیوں کی سرکردگی میں کام شروع کر دیا جائے۔ اور کانفرنس کو پٹنہ آنے کی دعوت ضرور دی جائے۔ چنانچہ دعوت کا باضابطہ خط نواب محسن الملک کی خدمت میں بھیج دیا گیا۔ اِدھر سے اطمینان ہونے کے بعد مجھ کو خیال آیا کہ پٹنہ کی کانفرنس کی صدارت کے لئے کسی ایسے مسلمان کو تجویز کیا جائے جو ممتاز اور صاحب اثر ہونے کے علاوہ دولت مند بھی ہو۔ سر احسن اللہ بہادر نواب ڈھاکہ کا نام اوس زمانہ میں نیک کاموں میں شرکت اور فیاضی کے ساتھ اون کی امداد کرنے کے لئے مشہور تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر نواب صاحب پٹنہ کانفرنس کی صدارت منظور کرلیں تو کانفرنس کو عظیم الشان کامیابی ہونے کے ماسوا ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ موصوف سے ایک

(بقیہ نوٹ صفحہ ۹۹) لکڑی تھی۔ فقیر لوگوں سے بات چیت کم کرتا تھا۔ مگر جس آدمی کو لکڑی سونگھا دیتا تھا وہ فقیر کا تابع فرمان ہو جاتا تھا اور فقیر اوس سے جو چاہتا تھا کام لیتا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ پٹنہ کے لوگ میرے کہنے سے اپنی آزاد مرضی کے خلاف کانفرنس کو مدعو کر رہے ہیں۔

معقول رقم سر سید میموریل فنڈ کے لئے مل جائے گی۔ میں نے نواب محسن الملک کو مفصل خط لکھا اور درخواست کی کہ وہ نواب سر احسن اللہ کے نام ایک خط لکھ کر میرے پاس کلکتہ بھیج دیں۔ تاکہ میں ڈھاکہ جاکر وہ خط خود سر احسن اللہ بہادر کی خدمت میں پیش کرسکوں محسن الملک کی عظمت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ میری بات درحقیقت مصرعہ۔ برات عاشقاں برشاخِ آہو۔ سے زیادہ وقعت نہ رکھتی تھی۔ بی۔ اے کے پہلے سال کے ناتجربہ کار طالب علم کو ہرگز یہ حق نہ تھا کہ کانفرنس جیسی مہتم بالشان انجمن کی صدارت کے لئے کسی خاص شخص کا نام جس سے اوس کی ذاتی واقفیت تک نہ تھی پیش کرے۔ میں اس کے لیے بالکل تیار تھا کہ نواب محسن الملک خط کے جواب میں میرا دماغ صحیح اور عقل درست کرنے کے لئے صرف ایک شعر یعنی

تو کارے زمیں را نکو ساختی		کہ باآسماں نیز پرداختی

لکھ بھیجیں۔ مگر محسن الملک اون معدودے چند لوگوں میں تھے جو ہمیشہ بات کی جانچ اوس کے حُسن و قبح کی بنیاد پر کرتے تھے۔ اور اس کی اون کو مطلق پروانہ تھی کہ بات کا کہنے والا کون ہے۔ جواب میں نواب صاحب نے مجھے حسبِ ذیل خط ڈھاکہ جاکر سر احسن اللہ کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے بھیجا۔

جناب نواب صاحب مخدوم مکرم مطاع اعظم جناب نواب خواجہ احسن اللہ خان صاحب دام مجدہم

بعد تسلیم و نیاز کے عرض ہے کہ مدتوں کے بعد جو پچھلی دسمبر میں میرا کلکتہ جانا ہوا اوس سے بڑی خوشی مجھے یہ تھی کہ آپ کی ملازمت نصیب ہوگی اور گو یہ دیرینہ تمنا پوری ہوئی مگر نہ ویسی جیسی دل کی آرزو تھی۔ جب تک کانفرنس کے جلسہ رہے مجھے بہت کم فرصت ملی۔ اوس کے بعد میں سخت بیمار ہوگیا۔ ورنہ میں کئی دفعہ آپ سے ملتا اور ضروری باتیں کرتا۔

ایک اور حسرت بھی دل میں رہ گئی کہ کلکتہ کے جلسہ کانفرنس میں آپ صدر انجمن نہ ہوئے اور مجھے چونکہ آپ کی خدمت میں نیاز نہ تھا میں آپ سے کچھ کہہ

نہ سکا۔ مگر پھر ایک موقعہ خدا نے دیا ہے کہ اگر آپ چاہیں تو میری دلی تمنا پوری ہو جائے۔ یعنی جو اجلاس کانفرنس کا اب کے پٹنہ میں بماہ دسمبر قرار پایا ہے اوس میں آپ تشریف لا دیں اور اوس کی پریسیڈنسی قبول فرمائیں۔ یہ نہ صرف میری تمنا اور خواہش ہے بلکہ تمام ممبران کانفرنس کی دلی خواہش کا میں اظہار کرتا ہوں اور اسی غرض سے میں سید رضا علی صاحب کو اپنی اور کانفرنس کی کمیٹی کی طرف سے نیابتاً آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ اپنی مہربانی اور الطاف بزرگانہ اور نیز قومی ہمدردی کے خیال سے اس درخواست کو قبول فرما کر ممنون و مشکور کریں گے۔ فقط

خادم قوم محسن الملک
آنریری سکریٹری محمدن اینگلو اورنٹیل ایجوکیشنل کانفرنس

مقام علی گڈھ مورخہ ۶ راکتوبر ۱۹۰۵ء

نواب سر احسن اللہ اور نواب زادہ سلیم اللہ یہ خط مل کر مجھے بڑی مسرت ہوئی اور میں پٹنہ سے کلکتہ روانہ ہو گیا۔ نواب سر احسن اللہ صاحب کو اطلاع کر دی تھی کہ میں فلاں وقت ڈھاکہ پہونچوں گا اور اون کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے نواب محسن الملک کا ایک خط میرے پاس ہے۔ گوالنڈو سے نرائن گنج تک اسٹیمر میں سفر کیا گو برسات ختم ہو چکی تھی مگر پدما میں پانی بہت تھا اور جب اسٹیمر ندی کے وسط میں پہونچا ہے تو کوئی کنارہ نظر نہ آتا تھا۔ یہ سفر مجھے نہایت پسند آیا۔ میں دوسرے درجہ (سیکنڈ کلاس) میں سفر کر رہا تھا۔ خط لکھنے کا سارا سامان ڈک پر موجود تھا۔ چنانچہ میں نے چند خطوط لکھے۔ جس میں سے ایک خط والدہ صاحبہ کے نام اور دوسرا بڑے چچا صاحب کے نام تھا۔ نرائن گنج سے ڈھاکہ تک ریل میں سفر کیا۔ ڈھاکہ اسٹیشن پر جب ریل سے اوترا تو نواب احسن اللہ کی طرف سے کوئی آدمی مجھے لینے کے لئے اسٹیشن پر موجود نہ تھا۔ میں سمجھا بسم اللہ غلط ہوئی۔ مگر

اب کیا ہو سکتا تھا بظاہر میں نواب محسن الملک کا نائب اور قاصد تھا۔ مگر جیسا میں بیان کر چکا ہوں اس سفر کی تمام ذمہ داری خود مجھ پر عاید ہوتی تھی۔ میں اسٹیشن سے ڈاک بنگلہ چلا گیا اور وہاں قیام کیا۔ ضروریات سے فارغ ہو کر نواب سر احسن اللہ کی کوٹھی پر حاضر ہوا۔ مگر موصوف سے ملاقات نہ ہو سکی اور وعدۂ فردا پر مجھے ٹال دیا گیا۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ ڈھاکہ کے حالات معلوم کئے بغیر میں نے یہاں آنے میں غلطی کی ہے۔ دنیا عالم اسباب ہے اور کوئی شخص غلطی سے مبرا نہیں ہے۔ تاہم میرا تجربہ یہ ہے کہ انسان جو غلطی کرے اُسے نباہ دے۔ میں نے نواب سر احسن اللہ کے خاندانی حالات معلوم کرنا شروع کئے اور تین باتوں کا مجھے پتہ چلا۔ ایک یہ کہ اون کے تعلقات اون کے بڑے بیٹے اور وارث یعنی نواب سلیم اللہ سے اچھے نہیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ نواب سر احسن اللہ پچھلے دو سال میں اپنی حیثیت سے کہیں زیادہ رقم چندوں میں دے چکے ہیں۔ تیسرے یہ کہ وہ سر سید احمد خاں کی تحریک اور علی گڈھ کو شبہ کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ یہ باتیں معلوم ہونے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ نواب سر احسن اللہ سے کوئی اُمید نہ رکھنا چاہیئے۔ مگر علی گڈھ کا فائدہ اس میں ہے کہ نواب سلیم اللہ سے مراسم بڑھائے جائیں تاکہ جب وہ اپنے باپ کے جانشین ہوں تو کالج کی فیاضی اور فراخ دلی سے مدد کریں۔ اوس کے بعد میں نواب سلیم اللہ سے ملا۔ بڑے زندہ دل۔ بے تکلف۔ خوش خُلق اور ہنس مُکھ آدمی تھے۔ بڑی گرم جوشی سے مجھ سے ملاقات کی اور کہا کہ گو قبلہ و کعبہ مجھ سے خوش نہیں ہیں تاہم میں مقدور بھر کوشش کروں گا کہ آپ سے اون کی ملاقات ہو جائے تاکہ آپ نواب محسن الملک کا خط پیش کر سکیں۔ یہ بھی فرمایا کہ آپ کبیدہ خاطر نہ ہو جئے۔ ڈھاکہ آئے ہیں تو یہاں کی سیر کیجئے اور میں خود اپنے ساتھ لے جا کر آپ کو ڈھاکہ کی سیر کراؤں گا۔ موصوف کے باعث میرا قیام ڈھاکہ میں بہت خوش گوار رہا۔ ۱۹۰۱ء کے ڈھاکہ کا صوبجات متحدہ کے کسی شہر سے مقابلہ کرنا آسان کام نہیں ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ اوس وقت کا ڈھاکہ شان و شوکت میں آگرہ سے کم تھا اور بریلی سے زیادہ نواب صاحب ڈھاکہ کے مکانات اور ڈرائنگ روم بھی نواب سلیم اللہ نے مجھے دکھائے۔ ڈرائنگ روم میں بعض سامان بہت اچھا تھا اور بعض سامان پُرانا اور

معمولی مگر نیا اور پُرانا فرنیچر دونوں اِس طرح پٹے پڑے تھے کہ ڈرائنگ روم کسی بڑے اور پُرانے اور زوصلہ مند کباڑی کی دوکان معلوم ہوتا تھا۔ نواب سلیم اللہ کی کوشش کے باوجود مجھے اون کے والد سے شرف ملاقات حاصل نہ ہو سکا۔ ڈھاکہ میں ڈھاک کے تین پات کی یادگار میرے پاس محسن الملک کا وہ خط ہے جو سر احسن اللہ کے نام تھا۔ نواب سلیم اللہ کا اصرار تھا کہ میں ڈھاکہ میں وہ تین ہفتہ ٹھیروں۔ مگر پانچ چھ روز قیام کر کے ڈھاکہ سے واپس چلا آیا چلتے وقت نواب سلیم اللہ نے مجھے اپنا فوٹو جو بورن اینڈ شیپرڈ (Bourne & Shepherd) کے کارخانہ کا کھنچا ہوا تھا عنایت کیا۔ فوٹو کی پشت پر بڑی محبت آمیز عبارت لکھی۔ کامدانی کا ایک اچھا تھان جس کی قیمت دو ڈھائی سو روپے تھی میری نذر کیا۔ اور مجھے اسٹیشن پر پہونچانے کے لئے اپنی گاڑی بھیجی۔ ڈاک بنگلہ کے خانساماں سے جب میں نے اپنا بل مانگا تو اوس نے کہا کہ آپ نواب سلیم اللہ صاحب کے مہمان ہیں اور موصوف نے حکم دے دیا ہے کہ بل آپ کو نہ دیا جائے چلتے وقت موصوف نے مجھ سے ڈھاکہ پھر آنے کا وعدہ لے لیا تھا۔ گو میری اون کی خط و کتابت کبھی کبھی ہوتی تھی مگر ڈھاکہ جانے کا موقع مجھے پھر نہ مل سکا۔

پٹنہ میں اجلاس کانفرنس کا التوا ڈھاکہ سے کلکتہ ہوتا ہوا پٹنہ پہونچا اور کانفرنس کے کام کے لئے باقاعدہ دفتر کھول دیا۔ ایک صاحب کو جو کسی دفتر میں ہیڈ کلرکی پر رہ چکے تھے دفتر کا سپرنٹنڈنٹ مقرر کیا اور مختلف اضلاع سے خط و کتابت شروع ہو گئی۔ بہار کے تمام ضلع کے مسلمانوں کو کانفرنس کے کام سے دلچسپی تھی اور سب چاہتے تھے کہ پٹنہ کا اجلاس کامیاب ہو۔ مولوی فضل امام صاحب خاموش تھے اون کی طرف سے کوئی بات ایسی نہیں ہوئی جس سے یہ ثابت ہوتا کہ وہ پٹنہ میں اجلاس ہونے کے مخالف ہیں۔ ۱۴ اکتوبر سے کام خوب زور شور سے شروع ہو گیا تھا اور امید تھی کہ پٹنہ کا اجلاس بڑا کامیاب رہے گا۔ مگر نومبر کے مہینہ میں شہر میں طاعون شروع ہو گیا اور جوں جوں سردی بڑھتی گئی طاعون زیادہ ہوتا گیا۔ پٹنہ والوں کی ہمت پر آفرین ہے کہ شہر میں مرض پھیلنے کے باوجود اونہوں نے اپنی جدوجہد برابر جاری رکھی۔ نواب محسن الملک سے میری خط و کتابت برابر جاری تھی اور میں موصوف کو پٹنہ کے حالات سے مطلع کرتا رہتا تھا۔ ۲ نومبر کو نواب صاحب کا تار آیا کہ پٹنہ میں طاعون ہونے کے باعث باہر کے لوگ کثیر تعداد میں وہاں جانے پر آمادہ نہ ہوں گے۔ لہٰذا کانفرنس کا اجلاس بجائے پٹنہ کے رامپور میں ہوگا۔ ۲۳ نومبر کو میں پٹنہ سے روانہ ہو کر دوسرے دن علی گڈھ پہنچ گیا۔

چوتھا باب

اونیسویں صدی کے آخر میں مسلمانوں کی سیاسی اور تعلیمی حالت لفٹنٹ گورنر کے ہاتھوں محسن الملک کی تحقیر۔ سرسید کے نامور ساتھی۔ لارڈ کرزن کا قہرمانی دور

دسمبر ۱۹۰۰ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس رام پور میں رام پور کے مدار المہام یعنی چیف منسٹر مولوی عبد الغفور صاحب تھے۔ مولوی صاحب صوبجات متحدہ میں ڈپٹی کلکٹر تھے مگر اون کی خدمات گورنمنٹ نے ریاست رام پور کو مستعار دے دی تھیں۔ مولوی صاحب علی گڈھ کالج اور علی گڈھ تحریک کے زبردست معاون تھے۔ نواب محسن الملک کی تحریک پر اونھوں نے کانفرنس کو رام پور میں مدعو کیا۔ صدارت کے لئے نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی منتخب کئے گئے۔ میری بہار اور بنگال کی ناچیز خدمات کا اعتراف اِس طرح کیا گیا کہ نواب محسن الملک نے مجھے اپنا آنریری پرائیویٹ سکرٹری مقرر فرمایا۔ دسمبر کے آخری ہفتہ میں نواب محسن الملک معہ احباب کے علی گڈھ سے روانہ ہوئے۔ اور راستہ میں چند گھنٹہ کے لئے مرادآباد میں قیام کیا۔ علی گڈھ کی کرکٹ ٹیم کے مشہور کپتان مسٹر عبد اللہ اوس زمانہ میں مرادآباد میونسپلٹی کے تنخواہ دار سیکرٹری تھے۔ اون کی کوشش سے قاضی امداد حسین صاحب کے دیوان خانہ میں ایک بڑا جلسہ منعقد ہوا۔ نواب محسن الملک نے ایک بڑی زبردست تقریر اس جلسہ میں کی۔ اوسی شام کو ہم سب مرادآباد سے روانہ ہو کر رام پور پہونچے۔ خاص باغ میں مہمانوں کی آسائش اور آرام کے لئے بہت بڑا کیمپ بنایا گیا تھا۔ خاص خاص مہمان کوٹھی میں ٹھہرے تھے۔ بقیہ حضرات ڈیروں میں ٹھہرائے

گئے تھے۔ نواب محسن الملک کا سکرٹری ہونے کے باعث مجھے بھی کوٹھی میں جگہ دی گئی تھی۔
کانفرنس کا یہ اجلاس بڑی شدومد سے ہوا تھا۔ نواب محسن الملک اور نواب عماد الملک کے
علاوہ حسبِ ذیل حضرات جو تحریک علی گڈھ کی روح رواں تھے اس جلسہ میں موجود تھے۔
نواب وقار الملک۔ نواب فتح نواز جنگ مولوی مہدی حسن۔ شمس العلما مولوی نذیر احمد شمس العلما
مولوی ذکاءاللہ۔ شمس العلما مولوی الطاف حسین حالی۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب
ہمارے بھائی مسٹر شوکت علی جو ہنوز مولانا نہیں ہوئے تھے۔ کانفرنس کے جلسے برابر تین
دن تک ہوتے رہے۔ شمس العلما مولوی نذیر احمد کا لکچر خاص طور سے قابلِ تذکرہ ہے،
ہز ہائی نس نواب حامد علی خاں صاحب مرحوم بھی ایک روز تھوڑی دیر کے لئے اجلاس
میں تشریف لائے تھے۔ مگر ڈائس پر جاکر بیٹھے نہیں جس عظیم الشان پنڈال میں کانفرنس
کا اجلاس ہو رہا تھا اوس کا چکر لگاکر واپس تشریف لے گئے۔ رات کو کھانے پر مولوی نذیر احمد
نے ہز ہائی نس کے اجلاس کانفرنس میں تشریف لانے اور چند منٹ کے لئے بھی جلسہ میں نہ
بیٹھنے کا خاص طور پر ذکر کیا۔ موصوف نے فرمایا "ہم سب ہز ہائی نس کے ممنون ہیں کہ اونھوں نے
کانفرنس کو مدعو کیا اور بڑی فیاضی سے سب لوگوں کو جو کانفرنس میں شریک ہوئے ہیں اپنا
مہمان بنایا۔ مگر تعجب ہے کہ چار نوابوں کی موجودگی کے باوجود ہز ہائی نس نے جلسہ میں چند منٹ
کے لئے بھی بیٹھنے کی زحمت نہ گوارا فرمائی"۔ یہ اجلاس بڑا کامیاب رہا۔ اور نواب عماد الملک نے
جو اڈریس بحیثیت صدر کے دیا تھا وہ ایسا پُرمغز تھا کہ آج بھی اوس کے مطالعہ سے نوجوان
فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ خاص باغ میں اوس وقت کوئی بڑی عمارت موجود نہ تھی۔ احاطہ کے
بیچ میں ایک کوٹھی تھی جس میں چھ سات مہمانوں سے زیادہ کی گنجائش نہ تھی۔ ایک بڑے کمرہ
میں بلیرڈ کی میز معہ بلیرڈ کے سامان کے موجود تھی۔ نواب محسن الملک کا سیکرٹری ہونے کی
حیثیت سے مجھے اون بزرگوں کی خدمت میں جو کانفرنس کی شرکت کے لئے تشریف لائے
تھے شرف ملازمت حاصل ہوا۔ اور اپنی عادت کے موافق میں نے اون کے سامنے بے تکلفانہ

اظہار خیال شروع کر دیا۔

مولوی نذیر احمد اور واجد علی شاہ

ہمارے بزرگوں کے دلوں میں شاہانِ اسلام کا جو احترام تھا اوس کی ایک مثال شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو۔ ایک روز شام کو کھانے کے بعد شاہانِ اودھ کا کچھ ذکر ہو رہا تھا۔ میں نے یہ جسارت کی کہ واجد علی شاہ مرحوم آخری شاہِ اودھ کی زندگی پر حقارت آمیز لہجہ میں کچھ اعتراضات شروع کر دیئے۔ میرے اعتراض سن کر مولوی نذیر احمد صاحب بگڑ گئے۔ موصوف کی آواز بھاری تھی۔ میری طرف ترش روئی سے مخاطب ہو کر بلند آواز میں جو اور بھی بھاری معلوم ہوتی تھی فرمانے لگے "میاں صاحب زادے آج تمہارا جو جی چاہے کہو مگر تم نے وہ صحبتیں نہیں دیکھی تھیں۔ اگر واجد علی شاہ کی ایک صحبت تمھیں دیکھنا نصیب ہوتی اور جو عیش و آرام اون کو ضبطیٔ اودھ تک نصیب تھا وہ ایک دن کے لئے بھی تم کو حاصل ہوتا تو تم دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے۔ یہ واجد علی شاہ ہی کا ظرف تھا کہ باوجود اون دل فریب مشاغل اور سامانِ عیش و عشرت کے جو اون کو حاصل تھے وہ سلطنت کا کاروبار بھی دیکھتے بھالتے تھے۔" میرا خیال آج بھی وہی ہے جس کا اظہار میں نے ۱۹۰۰ء میں مولوی نذیر احمد صاحب کے سامنے کیا تھا۔ تاہم موصوف کی اس قومی حمیّت سے میں بہت متاثر ہوا۔ دنیا میں ہر شخص جب غیروں کو اپنوں پر معترض ہوتے سُنے تو اپنوں کی حمایت کرنا اور اون کی طرف سے جواب دینا چاہتا ہے۔ مولوی صاحب غالباً ہم انگریزی دانوں کو غیر سمجھتے تھے اس لئے موصوف نے شاہِ اودھ کی حمایت کرنا اپنا فرض سمجھا۔

مسلمان لیڈروں کا ناواجب وفاداری

ہم کو علی گڈھ واپس آئے چند دن ہوئے تھے کہ ملکۂ وکٹوریہ نے وفات پائی۔ مسٹر تھیوڈر ماریسن خود یہ خبر طلباء کو سنانے کے لئے نکلے تھے اور جتنے بورڈنگ ہاؤس تھے اون سب میں گشت کر کے اونھوں نے اس واقعہ کی اطلاع طلباء کو دی تھی۔ مسٹر الفریڈ سندی

گورکھ پور کے ایک بیرسٹر تھے جو پائنیر میں اکثر مضامین لکھا کرتے تھے۔ مسٹر نندی کانگریسی تھے اور ایک زمانہ میں اون کی مسٹر بیک سے خوب سیاسی نوک جھوک اخبار پائنیر کے صفحوں میں رہتی تھی۔ مسٹر نندی نے نواب عماد الملک کے صدارتی خطبہ اور مسلمانوں کے سیاسی مسلک پر اخبار پائنیر میں اعتراضات کیئے۔ اون اعتراضات کا جواب نواب عماد الملک نے پائنیر میں دیا۔ مگر اون طلباء کو جن کو سیاسی معاملات سے دلچسپی تھی یہ دیکھکر تعجب ہوا کہ پارنیل اور اسٹیڈ اور اون کی پیرو جماعت کے لئے موصوف نے الفاظ Dark skinned Parnellites & steads استعمال کئے۔ حالانکہ پارنیل اور اسٹیڈ کا قصور اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ وہ چاہتے تھے کہ انگلستان محکوم ملکوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔ نواب عماد الملک کے تبحر اور علم و فضل کے باعث علی گڈھ کے سارے طالب علم اون کی بڑی عزت کرتے تھے۔ موصوف فارسی اور عربی کے عالم ہونے کے ساتھ ساتھ انگریزی کے زبردست انشا پرداز تھے۔ مگر اوس زمانہ کے بزرگوں کو مسلمانوں کی سیاسی منزلِ مقصود کا کچھ پتہ نہ تھا۔ سر سید کے انتقال کو ابھی پورے تین سال بھی نہ ہونے پائے تھے اور مسلمان بالعموم یہی سمجھتے تھے کہ اِس ملک میں اُون کے حقوق کا تحفظ انگریزی حکومت کے قیام پر منحصر ہے۔ سر انٹانی میکڈانل نے جو پالیسی اپنی لفٹنٹ گورنری میں برتی اوس سے اس خیال کا بطلان لازم آتا تھا۔ مگر گورنمنٹ پر آنکھیں بند کرکے بھروسہ کرنے کا جو سبق سر سید احمد خاں اور مسٹر بیک نے مسلمانوں کو عرصہ دراز تک پڑھایا تھا اوس کو یک قلم فراموش کرنا مشکل تھا۔

سر انٹانی میکڈانل اور محسن الملک

شروع اگست ۱۹۰۰ء میں لکھنؤ میں مسلمانوں کا عظیم الشان اجتماع اردو کی حفاظت اور رزولیشن مورخہ ۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء کی مخالفت میں ہوا تھا۔ نواب محسن الملک اس جلسہ کی صدارت کرنا نہیں چاہتے تھے مگر اوس زمانہ کے بڑے آدمی لفٹنٹ گورنر کی ناراضی سے اس قدر خائف و ہراساں تھے کہ کسی نے صدارت کی ہامی نہ بھری۔ مجبوراً بمصداق مصرعۂ قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند تھا۔

صاحب کو صدارت کرنی پڑی۔ صدارتی خطبہ بڑا زبردست تھا۔ اور گورنمنٹ کے رزولیوشن نے جس طرح اردو کو جسدِ بے جان کرنے کی کوشش کی تھی اوس کا حوالہ محسن الملک نے یہ شعر پڑھ کر دیا تھا۔

چل ساتھ کہ حسرت دلِ محروم سے نکلے
عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

اس شعر سے جلسہ میں بڑا جوش و خروش پیدا ہوا اور ایسا ہونا لازمی تھا۔ اگر کوئی زبردست سلطنت کسی قوم کی حکومت چھیننے کے بعد اوس کی زبان پر بھی حملہ کرے تو ظاہر ہے کہ وہ قوم بغیر سخت مقابلہ کئے اپنی تہذیب اور شائستگی کو خیرباد نہیں کہہ سکتی۔ معلوم نہیں خفیہ پولس نے گورنمنٹ میں کیا کیا رپورٹیں پہونچائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سر انٹانی میکڈانل نواب صاحب کے مخالف ہو گئے۔ ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے جس سے معلوم ہو گا کہ اوس زمانہ کے سب سے زبردست لفٹنٹ گورنر یعنی سر انٹانی میکڈانل کے اخلاق کیا تھے۔ جب موصوف کو علی گڈھ کالج کے سکرٹری سے بدگمانی ہوئی تو محسن الملک نے مارلین صاحب سے مشورہ کرنے کے بعد وہ ایڈریس جو منجانب کالج مختلف گورنر جنرلوں اور لفٹنٹ گورنروں کی خدمت میں پیش کئے گئے تھے اور جو جوابات اونھوں نے دئے تھے وہ سب سر انٹانی میکڈانل کے اطمینان کے لئے معہ ایک خط کے لاٹ صاحب کے پرائیویٹ سکرٹری کے نام بھیج دئے۔ مگر حسبِ ایما سر انٹانی میکڈانل سیکرٹری نے کاغذات کا وہ پارسل واپس کر دیا۔ مولوی اکبر حسین الہ آبادی کا شعر ہے۔ شعر۔

جو نہ ہونا چاہیئے جب تک نہ ہو کس طرح وہ ہو جو ہونا چاہیئے

مسلمان اپنی کمزوری اور بے بسی سے سخت آزردہ خاطر تھے اور جب پارسل کی واپسی کی خبر ذمہ دار مسلمانوں کو ہوئی تو اون مسلمانوں۔ نے بھی جو گورنمنٹ کی وفاداری کے لئے مشہور تھے یہ رائے قایم کی کہ مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے تحفظ کے لئے ایک پولٹیکل انجمن کا قایم ہونا ضروری ہے۔ ان حضرات میں پیش پیش نواب وقار الملک تھے۔ جن کی اصابت رائے

اور زبردست کیرکٹر پر مسلمانوں کو بڑا بھروسہ تھا۔ جب اخباروں میں یہ خبر چھپی کہ نواب محسن الملک نے انجمن تحفظ اُردو کی ممبری سے استعفیٰ دیدیا ہے تو مسلمانوں میں بے چینی اور زیادہ بڑھی۔

محسن الملک کا سکوت

اصل واقعہ یہ ہے کہ محسن الملک نے ممبری سے استعفیٰ نہیں دیا تھا۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ جب اُن کے استعفے کی خبر اخباروں میں شائع ہوئی تو اوس کی تردید کرنا اونھوں نے مناسب نہ سمجھا۔ محسن الملک اوس وقت مسلمانوں کے مسلمہ سیاسی لیڈر تھے۔ استعفے کی خبر پر اون کا سکوت اختیار کرنے اور اوس کی تردید نہ کرنے پر لوگوں کو بڑا تعجب ہوا۔ میں یہ ثابت کرنا نہیں چاہتا کہ محسن الملک مضبوط طبیعت اور نہ ہٹنے والی رائے کے آدمی تھے۔ یہ خوبی خدا نے اون کے ہم عصر اور جانشین نواب وقار الملک میں ودیعت کی تھی۔ مگر ساتھ ساتھ یہ بتا دینا بھی میرا فرض ہے کہ محسن الملک نے استعفے کی خبر کی تردید اس خیال سے نہیں کی کہ مبادا سر انٹانی میکڈانل کالج کے خلاف ہوجائیں سر انٹانی میکڈانل کو کانگریس والے روشن خیال اور ہندوستانیوں کے سیاسی دعووں سے ہمدردی رکھنے والا لفٹننٹ گورنر سمجھتے تھے۔ حقیقتاً یہ رائے غلط تھی۔ موصوف ہندوستانیوں کو اِس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ وہ اپنے ملک پر خود حکومت کرسکیں۔ مگر کانگریس کا اثر اِسقدر گہرا اور حلقۂ اثر اس قدر وسیع ہو گیا تھا کہ وہ کانگریس کی کھلم کھلا مخالفت قرین مصلحت نہیں سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کی حالت جداگانہ تھی۔ مسلمانوں کی نہ کوئی سیاسی انجمن تھی نہ قومی تنظیم۔ لفٹنٹ گورنر موصوف ہماری قومی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر یہ چاہتے تھے کہ ہماری قوم میں سیاسی بیداری کبھی نہ پیدا ہو اور وہ ہمیشہ گورنمنٹ کی مٹھی میں رہے۔

سر انٹانی میکڈانل کی کوتہ اندیشی اور مسلم لیگ کی بنا

خاص خاص حالات کے ماتحت بعض زبردست حاکم اور حکومتیں قومی جذبات کو کچھ عرصہ کے لئے دبا سکتی ہیں جیسا کہ سر انٹانی میکڈانل نے کیا۔ مگر یہ ناممکن ہے کہ کوئی حکومت قومی حقوق کو پامال کرکے پھلے پھولے۔ سر انٹانی میکڈانل نے جو بیج

۱۸ اپریل ۱۹۰۶ء کو بویا تھا۔ اوس نے رفتہ رفتہ چھ سال کے عرصہ میں زمین کے اندر جڑ پکڑی اور آخر دسمبر ۱۹۰۶ء میں ایک کمزور پودے کی صورت میں ڈھاکہ کی سرزمین پر ظاہر ہوا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس پودے کو وہ بڑا اور گھنا درخت سرسبز و شاداب نہ ہونے دے گا جس کا بیج دسمبر ۱۸۸۵ء میں بمبئی کی سرزمین پر انڈین نیشنل کانگریس کی صورت میں پھوٹا تھا۔ لندن ٹائمز نے تو اوس زمانہ میں یہاں تک لکھ دیا تھا کہ لیگ کے قیام کے معنی یہ ہیں کہ آئندہ وہ کانگریس کی مخالفت کیا کرے۔ انگریزی کی مثل ہے کہ خواہش تخیل کی ماں ہے۔ اگر ایک لفظ بدل دیا جائے تو حسب ذیل فارسی مصرعہ انگریزی مثل کا مفہوم پوری طرح ادا کرتا ہے۔ مصرعہ فکر ہر کس بقدر خواہشِ اوست۔ لندن ٹائمز نے جو کچھ خیالی پلاؤ پکایا ہو حقیقت یہ ہے کہ لیگ قائم کرنے سے بانیانِ لیگ کی غرض گورنمنٹ کو امداد دینا یا کانگریس کی مخالفت کرنا نہیں تھی۔ بلکہ اصل مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے حقوق کی جن کو ایک طرف گورنمنٹ اور دوسری طرف کانگریس پامال کر رہی تھی کما حقہ محافظت کی جائے۔ اور دراز دستی کا ہمت مردانہ کے ساتھ مقابلہ کیا جائے۔ خواہ وہ دراز دستی کانگریس کی طرف سے ہو یا گورنمنٹ کی طرف سے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اہم تعلیمی اور اقتصادی ضرورتوں سے ہم اس درجہ مجبور تھے کہ اوس بے لبسی کے عالم میں ہماری قوم کا میلان گورنمنٹ کی جانب ہونا تعجب کی بات نہ تھی۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہوتا ہے۔ سر انٹانی میکڈانل کے عہدۂ لفٹنٹ گورنری کی میعاد نومبر ۱۹۰۰ء میں پوری ہوتی تھی۔ انگریزی گورنمنٹ کے بعض افعال کا قدرت کے کرشموں کی طرح سمجھ میں آنا مشکل ہے موصوف کو ایک سال کی توسیع عطا ہوئی۔ جس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ گورنمنٹ کے نزدیک مسلمانوں کی وفاداری اور علی گڈھ والوں کی خیر خواہی اس شعر کی مصداق تھی۔ شعر

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے　　　گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

مگر تمام ملک میں ہیجان پھیل چکا تھا اور اوس کی روک تھام حکومت کے اختیار سے باہر تھی۔ اوس زمانہ کے اخباروں میں جو مباحثے مسلمانوں کے تحفظ حقوق اور سیاسی انجمن قائم کرنے کی ضرورت

پر ہوئے اوس کا مطالعہ مسلم سیاست کو سمجھنے کے لئے فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

پانیر میں میرا مضمون

میں اوس زمانہ میں بی اے کا طالب علم تھا۔ مگر اوس زمانہ کے حالات کا مجھ پر اتنا گہرا اثر تھا کہ اخبار پانیر مورخہ ۲۴ر نومبر ۱۹۰۱ء میں میں نے ایک طویل مضمون اسی بحث پر لکھا تھا۔ ضبطیٔ اودھ اور ہنگامۂ غدر ۱۸۵۷ء کے حالات دکھلانے اور ان دونوں اہم واقعات کا جو اثر مسلمانوں کی مالی اور اقتصادی حالت پر ہوا تھا اوس کی توضیح کرنے کے بعد مضمون کی عبارت حسب ذیل تھی۔

"مسلمان رہنماؤں نے گورنمنٹ کے شکوک و شبہات کو دور کرنے کے لئے جو گورنمنٹ کو مسلمانوں کی طرف سے غدر ۱۸۵۷ء کے واقعات کے سلسلہ میں پیدا ہو گئے تھے ایک ایسی انوکھی پالیسی اختیار کی جس کا مطلب بالاجمال یہ تھا کہ اون رہنماؤں نے عام مسلمانوں کے ذہن نشین کیا کہ سیاسی مسائل پر مردہ کی طرح خموشی اختیار کرو۔ سیاست بڑا خطرناک کھیل ہے کبھی بھولے سے بھی تم اس کھیل کے قریب نہ جاؤ۔ اس سیاسی درس کا یہ اثر ہوا کہ مسلمانوں کے دلوں سے حوصلہ مندی کے نقوش مٹ گئے۔ اور جب کبھی سیاسی حقوق طلبی کا وقت آیا تو عام مسلمانوں نے اپنے رہنماؤں کے حکم کے اتباع میں کبھی حرف شکوہ و شکایت زبان پر نہ آنے دیا۔ اور سکوت سے کام لیا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا اس حالت جمود میں ترقی ہوتی گئی۔ تا آنکہ سیاسی خاموشی حصول مقصد کا ایک ذریعہ ہونے کی بجائے اپنی جگہ پر خود ایک مقصد بن گئی اور مسلمانوں کو پولٹیکل معاملات سے کوئی سروکار نہ رہا۔ منجملہ اور خرابیوں کے اس پالیسی میں دو بڑی قباحتیں تھیں۔ ایک یہ کہ سیاسیات سے بے تعلقی کے باعث اون میں اظہار حق کی جرأت باقی نہ رہی اور اس طرح اون کی پولٹیکل امنگوں اور ولولوں کا خاتمہ ہوگیا۔ دوسری قباحت یہ ہوئی کہ گورنمنٹ کو مسلمانوں سے یہ توقعات پیدا ہو گئیں کہ مسلمان کوئی عمل ایسا نہ کریں گے جس کے کرنے والے اگر غیر مسلم فرقے یا غیر مسلم افراد ہوں تو اونہیں بالکل لائق برداشت اور ناقابل اعتراض خیال کیا جاتا ہے۔ ذرا ذرا سی بات میں ہمارے رہنما

اس اعلان کی ضرورت سمجھتے ہیں کہ مسلمان کانگریس سے علیحدہ ہیں۔ بعض انگریز مدبّرین کو روس کے ہندوستان پر حملہ کرنے کے خیال سے اتنا اضطراب پیدا نہیں ہوتا جتنی بے چینی ہمارے رہنماؤں کو اوس افواہ سے ہوتی ہے جو مسلمانوں کے کانگریس میں شرکت کا ارادہ رکھنے سے تعلق رکھتی ہو۔ تمام دنیا اس حقیقت سے واقف ہے کہ ایک جداگانہ قوم ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کے وجود کا انحصار کانگریس میں شریک نہ ہونے پر ہے۔ اس کے باوجود ہمارے رہنما موقع بے موقع اپنی پالیسی کا اعلان ایسے زور وشور سے کرتے ہیں جو بعض اوقات ہمارے ہندو بھائیوں کے خلاف اعلان جنگ کی حد تک پہونچ جاتا ہے۔"

اوس دور کے مسلمانوں کی ذہنیت

حالات حاضرہ اور مسلمانوں کی اخلاقی جرأت کی کمی پر بحث کرنے کے بعد مضمون میں بیان کیا گیا تھا: ۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء کے رزولیوشن کے خلاف جابجا جلسے کئے گئے۔ ہر پڑھے لکھے مسلمان کو یہ محسوس ہوا کہ اوس کے حق پر زبردست ضرب لگائی گئی ہے۔ اور اوس کو لازم ہے کہ اپنی شکایات گورنمنٹ تک پہونچائے۔ مسلمانوں نے ایک زبردست جلسہ منعقد کیا جس میں چھ سو نمایندے شمالی ہندوستان کے مختلف مقامات سے آکر شریک ہوئے۔ یہ نمایندے بااثر و صاحب حیثیت تھے۔ اپنا آئندہ کا پروگرام طے کرنے میں ان نمایندوں نے بڑے اعتدال سے کام لیا۔ اور کوئی بات ایسی نہ کی جو دستور اور آئین کے باہر ہو۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ جلسہ کے بعض ممتاز کارکنوں کو گورنمنٹ نے آنکھیں دکھائیں اور حیف کا مقام ہے کہ جس کام کو انجام دینے کا اونھوں نے بیڑا اوٹھایا تھا اوسے چھوڑ چھاڑ کر علیحدہ ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ وقتی جوش اور عارضی روح عمل ہم مسلمانانِ ہند کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہم مسلمانوں کو آج کل ایک سیاسی انجمن کی ضرورت کا بڑا احساس ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ احساس کتنے دنوں باقی رہے گا۔ اور باقی بھی رہے تو دوسرا سوال یہ ہے کہ ہم میں اوس سیاسی انجمن کو زندہ رکھنے کی اہلیت بھی ہے یا نہیں۔ بغیر

ہمّت و جرأت کے کوئی سیاسی تحریک کامیاب نہیں ہوسکتی۔ اور مجھے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ من حیث القوم یا توہم اخلاقی جرأت رکھتے ہی نہیں اور اگر رکھتے ہیں تو بہت کم۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کے دیوتا زندگی کے ہر ہر شعبہ میں مسلمانوں کو ذلیل کرانے سے بہت خوش ہوتے ہیں جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے۔ ہماری قوم کی اس غلامانہ ذہنیت کا سبب یہ ہے کہ ہم نے اپنے رہنماؤں کے اوس سبق پر اعتماد کرلیا ہے جو ان حضرات نے ہمیں پڑھایا اونھوں نے ہمیں یہ سبق پڑھایا کہ وہ جو کچھ کرتے ہیں ہمارے ہی فائدہ کے لئے کرتے ہیں اور حکومت بھی جو کچھ کرتی ہے وہ بھی عموماً ہمارے فائدہ ہی کے لئے کرتی ہے۔ یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ حکومت افراد کا مجموعہ ہے اور انسان کبھی غلطی سے مبرّا نہیں ہوسکتا۔ گذشتہ زمانہ کی ایسی مثالیں موجود ہیں جس میں صوبہ کے سب سے بڑے افسر کا رجحان ہندو مسلم دونوں قوموں میں سے ایک کی طرف ہوا ہے۔ ایسی صورت میں اگر حکومت کی بے اعتنائی کا شکار ہماری قوم ہوتی ہے تو مناسب اور قانونی ذرائع سے اظہار شکایت کرنے کی بجائے وہ حکومت پر بڑی سختی سے گھر میں بیٹھ کر نکتہ چینی کرتی ہے۔ سر انٹانی میکڈانل نے جو کچھ مسلمانوں کے ساتھ کیا اوس کے باوجود امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے ایک مسلمان ممبر[1] نے موصوف کے عہدہ کی میعاد میں توسیع چاہی۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ بھی ایک زبردست اسلامی درسگاہ[2] ہے جس پر مسلمان نازاں ہیں۔ جس نے تمام قوم کے احساسات کا لحاظ کئے بغیر یہ تجویز منظور کرلی ہے کہ سر انٹانی میکڈانل کی یادگار قائم کی جائے۔ اب غور کیجئے جن بزرگوں[3] نے یہ کارنمایاں کئے ہیں کیا اون سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ میدانِ عمل میں آکر جرأت کے ساتھ ایسے مسائل پر

---

[1] ممتاز الدولہ نواب فیاض علی خاں صاحب کی طرف اشارہ ہے جو اوس زمانہ میں امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے ممبر تھے۔ چند سال بعد کے سی۔ آئی۔ ای کا خطاب گورنمنٹ نے عطا کیا۔

[2] علی گڈھ کالج سے مطلب ہے جہاں سر انٹانی میکڈانل کی یادگار میکڈانل بورڈنگ ہاؤس کی صورت میں آج تک موجود ہے [3] گو جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے مگر مقصود نواب محسن الملک تھے۔

آزاد مشورہ دے سکیں گے جن کا تعلق مسلمانوں کی فلاح و بہبود سے ہو۔ سوچئے تو سہی اگر مسلمانوں کے تحفظ حقوق کے بارے میں کوئی بات اونھوں نے ایسی کی جس سے کوئی جلیل القدر حاکم ناراض ہوگیا تو کیا ہوگا۔ یہ ناممکن ہے کہ ہمارے رہنما کوئی بات ایسی کریں جس سے حکام والا قدر خفا ہو جائیں ۔" مختلف پہلوؤں سے یہ بتانے کے بعد کہ گو سیاسی انجمن کا قائم کرنا مسلمانوں کے تحفظ حقوق کے لئے سب سے بڑا اور اہم کام ہے۔ تاہم جب تک مسلمان اخلاقی جرأت سے کام لے کر لفٹننٹ گورنروں اور دیگر اعلیٰ حکام کی ناراضی کی پرواہ نہ کریں اوس وقت تک یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ یہ بیل منڈھے چڑھے گی۔ مضمون کے آخری فقرے یہ تھے۔

جیسا بوؤگے ویسا کاٹوگے

"صوبہ شمالی و مغربی و اودھ کے مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ سرانٹانی میکڈانل کے اعمال پر آزادی سے نکتہ چینی کرنے کے بجائے ڈر کے مارے جو تھوڑا سا بالوجہ مگر بیشتر بلا وجہ ہے نہ صرف چُپ چاپ بیٹھے ہیں۔ بلکہ طُرّہ یہ ہے کہ ساڑھے[1] تین سو میل کا دور و دراز سفر کرکے مسلمانوں کے ایک وفد نے لاٹ صاحب کو خوش کرنے کے لئے اون کی خدمت میں ایک ایڈریس پیش کیا۔ تعجب تو یہ ہے کہ پھر بھی مسلمانوں کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ ایک سیاسی انجمن قائم کریں۔ کوئی مرد معقول سیاسی انجمن کی ضرورت سے انکار نہیں کرسکتا۔ مگر سوال یہ ہے کہ مسلمانوں میں کچھ بُوتا بھی ہے اگر آپ میں اتنی سکت ہے کہ حکام بالا دست سے اختلافات پیدا ہوجانے کی صورت میں اون اختلافات کے نتائج کا مقابلہ ہمت مردانہ کے ساتھ کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اگر آپ وہ قربانیاں کرنے کے لئے آمادہ ہوں جو اس سلسلہ میں آپ کو لازماً

---

[1] ساڑھے تین سو میل کا سفر کرکے ٹرسٹیان علی گڈھ کالج کے ایک وفد نے نواب محسن الملک کی قیادت میں ایک رخصتی ایڈریس سر اینٹانی میکڈانل کی جناب میں بمقام الہ آباد پیش کیا۔ اس کے پہلے خیر مقدم اور الوداع کے ایڈریس علی گڈھ میں پیش ہوتے تھے اوس زمانہ میں بزرگوں کے ہاتھوں جو قومی ذلت ہماری ہوئی اوس کی نسبت سوائے اس کے اور کیا کہا جائے کہ مصرعہ ۔ اک افسانۂ بے کسی رہ گیا

کرنا پڑیں گی اور اگر آپ واقعی اپنی قوم کو سیاسی تعلیم دینا چاہتے ہیں تو آپ کو ایک سیاسی انجمن بالضرور بنانا چاہیئے۔ ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رکھئے کہ اگر تاریخ اپنے کو دوہرانے والی ہو یعنی اردو ناگری کے جلسہ کے بارے میں جس ہمّت سے آپ نے کام لیا اوس سے زیادہ ہمّت کا اظہار آپ کے بس کی بات نہ ہو تو اپنے معاملات کو گورنمنٹ ہاؤس الہ آباد کے مکین کے ہاتھ میں تن بہ تقدیر چھوڑ دیجیے۔ خواہ گورنمنٹ ہاؤس کا مکین آپ کی خوش قسمتی سے سر آکلنڈ کالون کے ڈھب کا انسان ہو یا آپ کی بدنصیبی سے سر انٹانی مکڈانل کے کینڈے کا آدمی ہو"

محسن الملک نے سکرٹری کے عہدہ سے استعفےٰ کیوں نہیں دیا

میرے خط کو پانیر جیسے اخبار کا اپنے کالموں میں جگہ دینا اس بات کی علامت تھی کہ آزاد خیال انگریزوں کو مسلمانوں کے ساتھ اون کی بے بسی میں ہمدردی تھی۔ اردو اخباروں میں میرے خط پر بہت سے مضمون شائع ہوئے۔ کلکتہ کے ہفتہ وار انگریزی اخبار مسلم کرانیکل نے جس کے ایڈیٹر مسٹر عبدالحمید تھے خط پر افتتاحیہ مقالہ لکھا۔ اس معاملہ میں محسن الملک نے جو کچھ کیا وہ میں تفصیل کے ساتھ بیان کر چکا ہوں۔ مگر اس ضمن میں دو باتیں قابلِ تذکرہ ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ اپنی طبیعت کی رفتار اور حیدرآبادی تربیت کے باعث محسن الملک کے لئے کسی جلیل القدر انگریز حاکم کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر اوس کی رائے سے اختلاف ظاہر کرنا بڑا دشوار کام تھا۔ اون کے ہم عصروں میں یہ صفت صرف وقار الملک اور مولوی سمیع اللہ خاں صاحب سی۔ ایم۔ جی میں تھی۔ مولوی سمیع اللہ خاں سرسید سے اہم نجی اختلافات پیدا ہو جانے کے باعث ۱۸۸۹ء میں کالج کی تولیت اور انتظام سے مستعفی ہو چکے تھے۔ رہے وقار الملک۔ وہ دیرینہ حیدرآبادی تعلقات کے سبب سے کسی میدان میں اپنے کو محسن الملک کا حریف بنانا اور اس طرح عوام کو چہ میگوئیوں کا موقع دینا نہیں چاہتے تھے۔ موصوف کو عزت نفس کا جس قدر پاس تھا اوس کی مثال میں نے اوس دور کے بزرگوں میں نہیں دیکھی۔ دوسری بات یہ تھی کہ محسن الملک کو یقین کامل تھا کہ سرسید کے رفقا میں کالج کے انتظام کے وہ نہ صرف سب سے زیادہ اہل ہیں بلکہ اوس طوفان میں اون کے سوا کوئی اور کالج کی کشتی کو پار

نہیں لگا سکتا۔ سر انٹانی میکڈانل کا مقابلہ کرنے کے لئے سکرٹری کے عہدہ سے دست بردار ہونا لازمی تھا۔ مگر کالج کے انتظام سے قطع تعلق کرنا وہ آگ بجھانے والے انجن کے اوس نگراں کے عمل کے برابر سمجھتے تھے جو اپنی آنکھوں سے کسی عمارت میں آگ لگتی دیکھے اور باوجود پانی کی افراط اور انجن کے اچھی حالت میں ہونے کے آگ نہ بجھائے۔ یہ فیصلہ کرنا آسان کام نہیں ہے کہ محسن الملک کی یہ رائے صحیح تھی یا غلط ۱۹۰۲ء میں دہلی دربار کے موقعہ پر ایجوکیشنل کانفرنس کا غیر معمولی کامیاب اجلاس آغا خاں کی علی گڈھ تحریک سے گہری دلچسپی۔ سرسید میموریل فنڈ کی کامیابی۔ چاروں طرف سے کالج پر روپیہ کی بارش ۱۹۰۵ء میں ملک معظم جارج پنجم کی بحیثیت پرنس آف ویلز اور ۱۹۰۶ء میں امیر حبیب اللہ خاں مرحوم کی کالج میں تشریف آوری یہ سب ایسے کھلے ہوئے واقعات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ محسن الملک کی رائے غلط نہ تھی۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ مان بھی لیا جائے کہ محسن الملک نے اپنی قومی خدمات کی نوعیت اور قدر وقیمت کا جو اندازہ کیا تھا وہ پورا صحیح نہ تھا تو بھی رائے عامہ کی عدالت کے روبرو محسن الملک اس لئے بھی ملزم نہیں قرار پا سکتے کہ اپنے بارہ میں جو رائے موصوف نے قایم کی تھی وہ سراسر نیک نیتی پر مبنی تھی۔ اور اوس میں کوئی ذاتی غرض مضمر نہ تھی۔ وہ وقار الملک کو ملا عبدالقادر بدایونی کے کینڈے کا آدمی سمجھتے تھے۔ وقار الملک راست بازی اور دیانت داری کا پتلا تھے۔ مگر محسن الملک کے نزدیک موقعہ شناسی۔ حاضر جوابی۔ شیریں بیانی اور شیریں گفتاری خوش مزاجی۔ سوجھ بوجھ۔ زبان کے جادو سے غیروں کو اپنا بنانا۔ مِل جُل کر کام کرنا اور دوسروں سے ٹکر لینے سے بچنا ایسے اوصاف تھے جن کو راست بازی اور دیانت داری پر ترجیح تھی۔ میری ناچیز رائے میں سر انٹانی میکڈانل کے معاملہ میں محسن الملک نے جو پالیسی برتی اوس سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو مسلمانوں کا مشہور وفد لارڈ منٹو کے پاس لے جاکر جو جواب محسن الملک نے حاصل کیا اور جس کو ہماری موجودہ سیاسی عمارت کا بنیادی پتھر سمجھنا چاہیئے۔ اوس نے ۱۹۰۰ء کی غلطی کے داغ کو اگر بالکل نہیں مٹا یا

تو اس قدر ضرور دھو دیا کہ اوس بدنما دھبہ کا نشان بڑے غور سے دیکھنے کے بعد نظر آتا ہے۔

محسن الملک کے حالات

دل و دماغ دنیا کا قاعدہ ہے کہ برابر درجہ کے دو ہم عصروں میں نسا اوقات مختلف خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ جو اوصاف ایک میں موجود ہوتے ہیں وہ دوسرے میں نہیں پائے جاتے۔ بعینہ یہی حالت محسن الملک اور وقار الملک کی تھی۔ یوں تو مجھے ان دونوں بزرگوں کی خدمت میں پہلے سے شرف ملازمت حاصل تھا مگر ۱۹۰۰ء سے ہر ایک کی وفات تک مجھے ہر دو صاحبوں کے کیرکٹر کو اصلی رنگ میں دیکھنے کے بے شمار موقعے حاصل ہوئے۔ دسمبر ۱۹۰۰ء کی بات ہے ایک دن میں نواب محسن الملک کی خدمت میں حاضر ہوا۔ موصوف نواب سر مزمل اللہ خاں مرحوم کی اوس کوٹھی میں رہتے تھے جہاں اب مزمل پیلیس کی عالی شان عمارت کھڑی ہے۔ محسن الملک کا دفتر بڑے کمرہ میں تھا جس کا دروازہ برآمدہ کی طرف تھا۔ میں چق اوٹھا کر اندر داخل ہوا۔ محسن الملک کمرہ میں نہ تھے۔ مگر عبدل دفتری موجود تھا میں نے عبدل سے دریافت کیا کیا نواب صاحب باہر تشریف لے گئے ہیں۔ برابر سنگار کا کمرہ تھا، وہاں سے آواز آئی۔ کون ہے۔ رضا علی یہیں چلا آ۔ میں نے سنگار کے کمرے میں جا کر دیکھا کہ کلن[1] نواب صاحب کو کپڑے پہنا رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر ہنس کر فرمانے لگے میں کپڑے پہن رہا ہوں مگر گھر کے بھنگی بہشتی سے کیا پردہ ہے۔ میں نے کسی جگہ بیان کیا ہے کہ میں موصوف کی خدمت میں مسائل حاضرہ نیز مذہبی و اخلاقی مسائل پر بحث میں گستاخانہ آزادی سے اپنا اظہار خیال کرتا تھا۔ خدا بخشے کیا دل و دماغ پایا تھا۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ[2] نے مرزا

---

[1] کلن محسن الملک کا منہ چڑھا خدمت گار اور جہانگیر خان چہیتا باورچی تھا۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد کلن کو صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے ملازم رکھ لیا تھا۔ عبدل ایجوکیشنل کانفرنس کا مستعد اور کارگزار دفتری تھا۔

[2] (دوسرے صفحہ پر)

رفیع سوداؔ کے حالات میں سوداؔ کے کلام پر جو تنقید کی ہے اوس میں لکھا ہے "آنکہ بین العوام شہرت پذیر است کہ قصیدہ اش بہ از غزل است حرفیست مہمل۔ بزعم فقیر غزلش بہ از قصیدہ اش وقصیدہ اش بہ از غزل"۔ ترجمہ۔ عام لوگوں میں جو یہ مشہور ہے کہ سوداؔ کا قصیدہ غزل سے اچھا ہوتا ہے یہ لغویات ہے۔ عاجز کی رائے میں غزل قصیدہ سے بڑھ چڑھ کر ہوتی تھی اور قصیدہ غزل سے بڑھ چڑھ کر ہوتا تھا"۔ یہی حالت محسن الملک کی تھی۔ دل سے اچھا دماغ اور دماغ سے اچھا دل قسّام ازل نے اون کو ودیعت فرمایا تھا۔ وہ شاعر نہ تھے۔ مگر بڑھاپے میں بھی طبیعت میں اس بلا کی شوخی تھی کہ ہم نوجوان رشک کرتے تھے۔ میں اکثر چھیڑتا اور کہا کرتا تھا۔ "آیات بیّنات میں نے نہیں پڑھی ہے۔ اگر ایک جلد مرحمت ہو جاتی تو میں بھی اپنے مذہبی عقائد ٹھیک کر لیتا"۔ میرا مطلب فوراً تاڑ جاتے تھے مگر بھلا وہ مجھ چھوکرے سے کب ہار ماننے والے تھے۔ کبھی جواب دیتے "کالج کے لئے دو لاکھ روپے دلوا دے میں خود اوس کا جواب لکھ کر تجھے دے دوں گا"۔ کبھی فرماتے "ارے کیا پڑھے گا آیات بیّنات میں کیا رکھا ہے۔ اب جس کام کے کرنے کا زمانہ ہے وہ کر"۔ لارڈ کرزن کے ایا سے علی گڈھ کالج کا وفد جس کے ممبر خان صاحب میر ولایت حسین۔ خان بہادر سید ابو محمد اور سید جلال الدین حیدر تھے ایران گیا اور وہاں سے لڑکوں کی کھیپ اپنے ساتھ لایا تو محسن الملک نے میری آئے دن کی زبان درازی کا جواب اس طرح دیا۔ ایک دن فرمانے لگے "رضا علی یہ نہ سمجھنا کہ میں نے محض ایرانی طلبا بلائے ہیں۔ ایک وفد مسقط بھیج کر کچھ خارجی لڑکوں کو بھی علی گڈھ میں پڑھنے کی دعوت دوں گا"۔

علوہمت جس علوہمتی سے احسان کرتے تھے اوس کی نظیر آج تک میں نے نہیں دیکھی ۱۹۰۵ء میں خان بہادر شیخ محمد مثنٰی نے بی اے پاس کیا وہ میرے بڑے خاص دوست ہیں۔ جب میں یونین کا وائس پریزیڈنٹ تھا تو وہ میرے سکرٹری تھے۔ ایک دن رات کے گیارہ بجے مصطفےٰ حسین رضوی۔ محمد مثنٰی اور میں نواب صاحب کی خدمت

---

[۱] دیکھو گلشنِ بے خار صفحہ ۱۰۰ مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۱۰ء

میں حاضر ہوئے۔ مئی یا جون کا مہینہ تھا۔ دیکھا کہ باہر صحن میں نواب صاحب پلنگ پر لیٹے ہیں سامنے چھوٹی میز پر ایک بڑا لیمپ رکھا ہوا ہے اور عربی اخبارات پڑھ رہے ہیں۔ ہم سب کو دیکھ کر فرمانے لگے۔ کہو کیسے آئے۔ میں نے عرض کی سلام کرنے کے لئے حاضر ہوئے ہیں۔ ارشاد کیا: "رات کے گیارہ بجے کسی بھلے آدمی سے ملنے کا بڑا اچھا وقت ہے۔ سلام روستائی بے غرض نیست کچھ مطلب ہوگا۔ کہو کیا بات ہے؟" میں نے جواب دیا سچ تو یہ ہے کہ غرض لے کر حاضر ہوئے ہیں۔ مثنیٰ بی۔ اے میں پاس ہو گئے۔ اب ان کے لئے ملازمت کا کوئی معقول انتظام فرما دیجئے۔ ارشاد کیا "تم نے کچھ سوچا ہے؟" ہم سب پہلے سے صلاح مشورہ کر کے گئے تھے۔ میں نے کہا اگر حضور ایک خط سر جیمس[1] لاٹوش کو لکھ دیں تو مثنیٰ کو ڈپٹی کلکٹری مل جائے۔ فرمایا "کل خط لکھ کر لے آنا میں دیکھ لوں گا۔" اس کے بعد بہت دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ دوسرے دن میں خط کا ٹائپ شدہ مسودہ تیار کر کے لے گیا اور میں نے مسودہ پڑھ کر سنانا چاہا۔ پوچھا یہ کیا کاغذ ہے۔ میں نے کہا لاٹ صاحب کے نام اوس خط کا مسودہ ہے جس کا رات تذکرہ تھا۔ ارشاد کیا یہ کون اہم دستاویز ہے جس کا مسودہ مجھ کو پڑھ کر سنانا چاہتے ہو۔ جاؤ کالج کے مہری کاغذ پر ٹائپ کرالو۔ میں دستخط کر دوں گا۔ کالج کے کاغذ پر ٹائپ ہونے کے بعد نواب صاحب نے بغیر پڑھے دستخط کر کے وہ خط میرے حوالہ کر دیا۔ اور چند مہینے میں محمد مثنیٰ کا تقرر ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر گزٹ میں شائع ہو گیا۔ مصطفٰے حسین رضوی یہ ترکیب دیکھ چکے تھے۔ دوسرے سال یعنی ۱۹۰۶ء میں جب وہ بی اے ہوئے تو اونھوں نے بھی نواب صاحب کو گھیرا۔ موصوف سے لاٹ صاحب کے نام خط لکھایا۔ اور وہ بھی ڈپٹی کلکٹر مقرر ہو گئے۔ میں نے اپنی ملازمت کے لئے نواب صاحب سے کبھی کوئی درخواست نہیں کی۔ اون کی دلی خواہش تھی کہ میں قانون کے آزاد پیشہ میں داخل ہوں اور سرکاری ملازمت کا طوق اپنی گردن میں نہ ڈالوں۔

تقریر | محسن الملک کا شمار دنیا کے سب سے بڑے مقرروں میں تھا۔ تقریر کرتے وقت

[1] نومبر ۱۹۰۱ء سے نومبر ۱۹۰۶ء تک سر جیمس لاٹوش یو۔ پی کے لفٹننٹ گورنر تھے کالج کے بڑے حامی و مددگار اور محسن الملک کے بڑے دوست تھے۔

اون کو حاضرین پر ایسا ہی اختیار اور قابو ہوتا تھا جیسا برتن بناتے وقت کمہار کو مٹی پر ہوتا ہے
جب چاہتے رولاتے اور جہاں چاہتے ہنساتے. سننے والوں کو بقول غالب یہی محسوس ہوتا
تھا کہ. شعر

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اوس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کشش | تحریر بھی بڑی زبردست ہوتی تھی. گفتگو کا انداز بڑا دل کش تھا. کشش کا یہ عالم
تھا کہ جس پارٹی یا دعوت میں موجود ہوتے وہاں سب کی آنکھیں اور کان
انھیں کی طرف لگے ہوتے تھے. اور بسا اوقات ہر شخص سمجھتا تھا گویا روئے سخن میری ہی طرف
ہے. بذلہ سنجی نے موصوف کی فطری خوش مزاجی کو اور اُجاگر کر دیا تھا. بقول شمس العلما آزاد "یہ معلوم
ہوتا تھا کہ چنبلی کے پھولوں کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہے". بلا کے ذکی الطبع تھے. معاملہ کی تہ کو پہونچنے
میں دیر نہ لگتی تھی. سچ تو یہ ہے کہ اونھوں نے تحریک علی گڈھ کو جو سرسید کے زمانہ میں صوبجات
متحدہ اور پنجاب تک محدود تھی نہ صرف سارے ملک کے عرض و طول میں پھیلایا بلکہ برہما۔
افغانستان اور ایران جیسے دُور دراز ممالک کو اوس کے دائرۂ اثر میں شامل کر لیا. مردم شناس
ایسے تھے کہ ہز ہائی نس آغا خاں. سر علی امام جسٹس شاہ دین. سر محمد شفیع. مہاراجہ محمود آباد. سر
عبدالرحیم. ان سب کو محسن الملک نے علی گڈھ تحریک کے ذریعہ سے جو اوس زمانہ میں مسلمانوں
کی واحد تحریک تھی ملک سے روشناس کرایا. اور جہاں موقع ملا آگے بڑھانے کی کوشش
کی محسن الملک معاملات میں رائے جلد قایم کرتے تھے اور جب یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ کسی معاملہ
میں جو رائے قایم کی ہے وہ صحیح نہیں ہے تو اوسے بدلنے میں تامل نہ ہوتا تھا. ہر شخص کو خواہ
امیر ہو یا غریب. ذی اثر ہو یا معمولی آدمی راضی اور خوش رکھنا چاہتے تھے. جن حضرات کو
میں جانتا تھا یا جانتا ہوں اون میں سب سے زیادہ مروّت میں نے محسن الملک کی آنکھیں
دیکھی. اگر کوئی شخص کھلی ہوئی ایسی درخواست کرتا جو قابل قبول نہ ہوتی تو محسن الملک اوس پر

بھی خاموشی اختیار کرتے۔ مگر اون کے لئے کسی سے یہ کہنا ناممکن تھا کہ تمہاری درخواست غلط اور بے جا ہے۔ اور میں اوسے منظور نہیں کر سکتا۔ اچھا کھاتے اور اچھا پہنتے تھے اور امیرانہ ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔

انگریزی دانی

محسن الملک ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔ انگریزی موصوف نے نہیں پڑھی تھی اور عام خیال یہ ہے کہ وہ انگریزی سے ناواقف تھے ۱۸۸۸ء میں جب ایک اہم پولٹیکل خدمت انجام دینے کی غرض سے حضور نظام نے اون کو لندن بھیجا تو انگلستان کے مشہور رسالہ "اونیسویں صدی" میں محسن الملک نے ایک مضمون چھپوایا جس کا مطالعہ آج بھی نوجوانوں کے لئے فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ جو خیالات اس مضمون میں درج تھے ظاہر ہے کہ وہ محسن الملک کے تھے۔ مگر عبارت کسی انگریزی کے انشا پرداز کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ محسن الملک انگریزی لکھ نہ سکتے تھے پڑھنے میں بھی تکلف ہوتا تھا مگر انگریزی اخباروں کے مضامین پڑھوا کر سنتے تھے اور اُردو میں ترجمہ کرانے کی مطلق ضرورت نہ ہوتی تھی۔ جو انگریز اردو سے ناواقف تھے اون سے بات چیت بھی انگریزی میں کرتے تھے۔ ملک معظم جارج پنجم بحیثیت پرنس آف ویلز معہ شہزادی ویلز کے جب ۱۹۰۵ء میں علی گڈھ تشریف لائے تو تمام ہندوستان کے انگریزی اخباروں کے نامہ نگار اوس موقع پر موجود تھے۔ تشریف آوری کے حالات سب سے اچھے اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ میں چھپے تھے طرزِ ادا بڑی دل فریب اور پُر زور تھی اور سچ تو یہ ہے کہ اِس اخبار کے نمائندہ نے اپنی جادو نگاری کا ثبوت دیا تھا۔ دوسرے دن رات کو محسن الملک کے یہاں ڈنر تھا جس میں نواب عماد الملک اور اون کے صاحبزادے سید مہدی حسن صاحب (اب نواب مہدی یار جنگ خطاب ہے) بھی شریک تھے۔ اس دعوت میں محسن الملک نے مجھ کو بھی مدعو کیا تھا۔ اخباروں کی رپورٹوں کا تذکرہ چھڑنے پر سول اینڈ ملٹری گزٹ کے مضمون کا حال معلوم ہوا۔ یہ مضمون تخمیناً پانچ کالم کا تھا۔ اور کھانے کے بعد نواب مہدی یار جنگ نے پڑھ کر سنایا محسن الملک

صرف ایک لفظ پر اٹکے۔ لفظ تو مجھے یاد نہیں رہا۔ مگر اتنا یاد ہے کہ اوس لفظ کے معنی نہ مجھے معلوم تھے نہ نوّاب مہدی یار جنگ کو۔ نواب عماد الملک نے اوس لفظ کا ترجمہ بتایا۔

وقار الملک کے حالات

خدا پر بھروسہ

وقار الملک کی علمی استعداد محسن الملک سے کم نہ تھی۔ تقریر پُر مغز ہوتی تھی مگر زبان کے چٹخارے کم ہوتے تھے۔ تحریر بڑی زبردست ہوتی تھی اور ہر مسئلہ کا تجزیہ بڑی قابلیت سے کرتے تھے۔ جس سے اون کی دلیل کا وزن اور بھاری ہوجاتا تھا۔ بڑے دین دار تھے۔ اللہ کی ذات پر ایسا پکا بھروسہ تھا کہ ستّر برس ہونے آئے سررشتہ داری کے زمانہ میں جب کلکٹر نے نماز ظہر پڑھنے کے لئے چند منٹ کی چھٹّی دینے سے انکار کیا تو انگریزی گورمنٹ کی ملازمت سے استعفےٰ دے دیا۔ حالانکہ سرکاری ملازمت ایسی ہی مستقل اور پائدار چیز ہے جیسی جائداد غیر منقولہ۔ مالک جائداد خود ہی اوسے فروخت کرڈالے یا عہدہ دار اپنی ملازمت سے استعفےٰ دے دے تو دوسری بات ہے۔ ورنہ دونوں دم کے ساتھ ہیں۔ اگر عہدہ دار پچپن سالہ میں آجائے تو بقدر آدھی تنخواہ کے پنشن ملتی ہے۔ خدا کے یہاں دیر ہوتی[1] اندھیر نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند سال انتظار کرنے کے بعد نواب سالار جنگ اول کے زمانہ میں حیدرآباد جانے کا موقع ملا۔ حیدرآباد کے کارناموں سے سارا مُلک واقف ہے۔ آقا

---

[1] پارسال میں نے اخبار میں ایک ادبی مضمون لکھا تھا جس کا ایک فقرہ تھا "خدا کے یہاں دیر ہو اندھیر نہیں ہے"۔ کاتب صاحب نے حروف علّت میں سے ایک حرف کو دوسرے حرف کی بجائے تبدیل کرنے میں کوئی حرج نہ سمجھا اور جب مضمون چھپا تو اوس میں واؤ کی جگہ یائے مجہول اس طرح درج تھی "خدا کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے"۔ محدود علم والی مخلوق کا غیر محدود علم والے خالق پر دیر کا مستقل الزام لگانا اوس وقت تک عقلاً صحیح نہیں قرار پاسکتا جب تک یہ ثابت نہ کردیا جائے کہ جزو کُل سے کم نہیں ہے۔ بلکہ کُل کی برابر ہے۔

کی جاں نثاری اور وفاداری کی ایسی بے بہا مثال قائم کی جو دوسروں کے لئے ہمیشہ قابلِ تقلید رہے گی۔ خدا نے غیر معمولی دماغ عطا کیا تھا۔ جتنی محنت زیادہ کرتے تھے اوسی قدر دماغ جلا پاتا تھا۔ اور کام کرنے کی قابلیت بڑھتی تھی۔ رائے قایم کرنے میں عجلت نہ کرتے تھے۔ مگر ہر مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو جانچنے کے بعد جس نتیجہ پر پہونچتے تھے اوس پر جمے رہتے تھے۔ قابلیت اور راست بازی (آخرالذکر صفت وہی ہے جس کو ریاستوں میں والیِ ملک کی وفاداری کہتے ہیں) دو مختلف اوصاف ہیں جن کا اجتماع آدمی کو فی الحقیقت انسان بنا دیتا ہے۔ وقار الملک میں دونوں صفتیں بدرجۂ اتم موجود تھیں اور یہی وجہ ہے کہ اہلِ حیدرآباد کے دلوں میں اون کی یاد آج بھی تازہ ہے۔ اور جب تک دنیا میں وفاداری۔ راست بازی۔ دیانت داری اور قابلیت کی قدر ہے نواب سالار جنگ اول کے نام کے ساتھ اون کا نام بھی زندہ رہے گا۔ شروع ۱۹۰۰ء میں وقار الملک نے مجھ سے جو کچھ فرمایا تھا اوسے میں کبھی نہ بھولوں گا۔ میرے دوست مولوی قیام الدین احمد اور میں ۱۹۰۰ء میں بچھراؤں سے مرادآباد

(بقیہ مضمون نوٹ صفحہ ۱۹) اگر جزو کا کل کی برابر ہونا ناممکن ہے تو مخلوق کو خالق کی مشیت اور وجوہ مشیت کا مکمل ادراک ہونا بھی ناممکن ہے۔ عقل کے گھوڑے دوڑانے میں اور امر الٰہی پر بغیر سوچے سمجھے (اور ہماری سمجھ محدود ہے) مستقل الزام عاید کرنے میں بڑا فرق ہے۔ انگریزی کی مثل ہے کہ کسی شے کا ذرا سا علم ہونا اور پورا علم نہ ہونا بڑی مخدوش چیز ہے۔ خدا کے یہاں دیر ہو کے یہ معنی ہیں کہ انسان کا علم محدود ہے۔ بہت ممکن ہے کہ جس چیز کو انسان دیر سمجھتا ہے وہ حقیقتاً دیر نہ ہو۔ کاتب صاحب نے خدا کے یہاں دیر ہے لکھ کر ذات باری تعالیٰ پر مستقل الزام عائد کر دیا جو عقلاً کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ کاتب کی یہ تحریف مجھے ایسی ہی شاق گذری جیسا شعرا کو اپنے کلام کا غلط پڑھا جانا ناگوار ہوتا ہے۔ میں نے ایڈیٹر کو خط لکھا جس میں تھوڑے سے تصرف کے بعد میر کا مشہور شعر اس طرح درج کر دیا ؎

سخت جاہل تھا جس نے پیسے رضا ۔۔۔ پیشہ کاتب کا اختیار کیا

خدا شاعروں اور مصنفوں کو کاتبوں کے دستِ تظلم سے محفوظ رکھے۔

جا رہے تھے۔ مراد آباد اور دہلی کے درمیان اوس زمانہ میں گجرولہ ہو کر ریل نہ تھی۔ بھیراؤں سے چل کر ہم نے امروہہ میں نواب وقارالملک کے یہاں قیام کیا۔ میری الیف۔ اے کی کامیابی کا حال سن کر وقارالملک بہت خوش ہوئے۔ پوچھا کتنے طالب علم امتحان میں بیٹھے تھے اور کتنے پاس ہوئے۔ اوس سال امتحان کا نتیجہ واقعی اچھا تھا۔ میں نے تعداد بتائی۔ فرمانے لگے امتحان کے نتیجہ کو بھینس کا مکھن سمجھنا چاہیئے۔ اگر بھینس کے دودھ میں مکھن خوب نکلتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نوکر بھینس کی خدمت بھی خوب کرتا ہے۔ چارہ بھی اچھی طرح کھلاتا ہے اور بنولے بھی کھانے کو دیتا ہے۔ یہی کیفیت امتحان کے نتیجہ کی ہے۔ اگر نتیجہ اچھا ہے تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ اوستاد قابل ہیں۔ محنت سے پڑھاتے ہیں اور طلبا بھی دل لگا کر پڑھتے ہیں۔ نواب صاحب بات کے بڑے پکّے تھے۔ محسن الملک کی وفات کے بعد مراد آباد میں تعزیتی جلسہ ہونے والا تھا۔ وقارالملک نے شرکت کا وعدہ کیا تھا۔ صبح کے دس بجے کی ٹرین سے امروہہ سے چلنے والے تھے۔ مگر کسی وجہ سے وہ ٹرین نہ مل سکی۔ وقارالملک نے یکّے سے پچیس میل کا سفر کیا اور وقت مقررہ پر تعزیتی جلسہ میں شریک ہوئے۔

سکرٹری کا نام اور پرنسپل کا حکم

۱۹۰۷ء میں جب علی گڈھ کا انتظام وقارالملک کے ہاتھ میں آیا تو سکرٹری کے عہدہ کے فرائض اس دھڑلّے سے انجام دئے کہ علی گڈھ کالج کی دوعملی کا جہاں سکرٹری کا نام اور پرنسپل کا حکم چلتا تھا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔ پرنسپل نے موقع دیکھ کر سر جان ہیوٹ کو جو اوس زمانہ میں لفٹننٹ گورنر تھے اون سے بھڑا دیا۔ مگر اوس درویش صفت نوآب نے جس نے تیس برس پہلے عالم شباب میں اپنے مذہب وضمیر پر ملازمت کو قربان کر دیا تھا اور جس نے حضرت آصف جاہ سادس جیسے مردم شناس فرماں روا کی بارگاہ سے وقارالدولہ وقارالملک کا با معنی خطاب پایا تھا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ بالآخر حق نے فتح پائی۔ معاملہ کی طوالت نے سر جان ہیوٹ کو اون کی غلطی پر متنبہ کیا۔ وہ بڑے دُور بین اور دانش مند لفٹننٹ گورنر تھے۔ معاملہ کی تہ کو پہنچ گئے

جو فیصلہ فریقین کی باہمی رضامندی سے ہوا اوس کی رو سے سکرٹری شیرِ قالین نہ رہا۔ بلکہ کالج کی اصلی زمامِ حکومت اوس کے ہاتھ میں آگئی۔ اس معاملہ میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب مرحوم نے جس طرح دل و جان سے وقار الملک کا ساتھ دیا اور آئندہ خطرات کا سدِّباب کرنے میں نواب صاحب کی امداد کی وہ صاحبزادہ صاحب کی نیک نیتی اور بیش قیمت خدمات کی کثیر التعداد مثالوں میں سے ایک مثال ہے۔

کان پور کی مسجد کان پور کی مسجد کا واقعہ ۱۹۱۳ء میں پیش آیا تو اس میں بھی وقار الملک نے مہاراجہ صاحب محمود آباد اور مولوی عبد الباری صاحب فرنگی محلی کے دوش بدوش خطروں کی مطلق پروا نہ کرکے قوم کی رہبری کی۔ کان پور کے معاملہ سے تھوڑا سا تعلق مجھے بھی تھا اور اوس زمانہ میں موصوف کے ساتھ کام کرنے کے باعث مجھے صحیح اندازہ ہوا کہ اون کی ذات میں کیسے کیسے اعلیٰ اوصاف جمع ہیں۔

آل انڈیا مسلم لیگ کی بنا آل انڈیا مسلم لیگ کو وجود میں لانے اور منظم جماعت بنانے میں بھی سب سے زیادہ ضروری خدمات وقار الملک نے انجام دیں۔ لیگ کے قائم ہونے کی اصلی وجہ اردو ہندی کا جھگڑا تھا جس کا مفصل تذکرہ کسی دوسری جگہ آچکا ہے۔ وقار الملک بظاہر خشک مزاج معلوم ہوتے تھے۔ لیکن متین ظرافت کا جوہر طبیعت میں موجود تھا۔ گفتگو میں لفاظی نہ ہوتی تھی۔ ظاہر و باطن یکساں تھا۔ مصلحتِ وقت کے ماتحت کوئی ایسی بات کہنا جو اون کے دل میں نہ ہو اپنے شعار کے خلاف سمجھتے تھے۔ چھوٹوں سے آپ برابر کا برتاؤ کرتے تھے۔ معمولی آدمیوں کی تعظیم کے لئے اوٹھ کھڑے ہو جاتے تھے۔ کسی بات کا آسانی سے وعدہ نہ کرتے تھے۔ مگر اون کا وعدہ پتھر کی لکیر ہوتا تھا۔ خرچ کے معاملہ میں محتاط تھے۔ مگر مہمان نوازی اور مذہبی کاموں میں خوب روپیہ خرچ کرتے تھے اور غریب رشتہ داروں کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔

دونوں بزرگوں کا موازنہ دونوں بزرگوں کا طریق کار اون کی طبیعتوں کی طرح مختلف

تھا۔ وقار الملک ہر مسئلہ کی جزئیات اور تفصیلات کو خود دیکھتے اور جانچتے تھے۔ جس کے باعث باوجود اس غیر معمولی محنت اور جفاکشی کے جس کے وہ عادی تھے۔ فیصلہ کرنے میں دیر لگ جاتی تھی۔ وہ ہر کام کو خود کرنا چاہتے تھے۔ برخلاف اس کے محسن الملک کی توجہ مسائل کے اہم پہلوؤں پر جاتی تھی۔ جزئیات کو دیکھنا بھالنا وہ بالعموم غیر ضروری سمجھتے تھے۔ خود کام کرنے سے زیادہ اوروں سے کام لینا جانتے تھے۔ ہندوستان کے جلیل القدر انگریزوں میں میں نے یہ صفت لارڈ ولنگڈن اور سرہارکرٹ بٹلر میں بدرجۂ اتم پائی۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کے والسرائے کی مصروفتیں اتنی زیادہ ہیں کہ امریکہ کے پریزیڈنٹ کے سوا اوس سے زیادہ عدیم الفرصت اور کثیر الاشغال حاکم دنیا میں اور کوئی نہیں ہے۔ تاہم لارڈ ولنگڈن کام کے ہجوم سے کبھی نہ گھبراتے تھے۔ سرہارکرٹ بٹلر بھی بڑے پُرآشوب زمانہ میں صوبجات متحدہ کے گورنر تھے۔ رولیٹ ایکٹ کی بدولت سارے ملک میں ہیجان ۱۹۱۹ء میں شروع ہو گیا تھا اور ہمارا صوبہ کئی سال تک پولٹیکل شورش کا مرکز رہا۔ اس کے باوجود میں نے سرہارکرٹ بٹلر کے چہرہ پر تردد اور تشویش کے آثار نہیں پائے۔ دونوں حضرات اپنے ماتحتوں سے کام لینا جانتے تھے جس کی وجہ سے اون کو خود جزئیات کی دیکھ بھال کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔

محسن الملک اور وقار الملک کے کارناموں کی جانچ اور تول کے وقت اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ وقار الملک کو ۱۹۰۷ء میں سرسید کی گدی پر قوم نے بٹھایا تھا ۱۸۹۸ء میں ہوا کا رُخ اور تھا۔ قوم تو متفقہ طور پر محسن الملک کو سرسید کا جانشین بنانا چاہتی تھی۔ لیکن حالات کچھ ایسے تھے کہ بغیر گورنمنٹ کے اثر اور انگریزوں کی امداد کے اون پر قابو پانے کی کوئی صورت نہ تھی۔ خفگی کی حالت میں محسن الملک اکثر استعفے کی دھمکی دیتے تھے۔ اور دو مرتبہ واقعًا استعفے دینے کی نوبت پہونچی۔ اُردو کی حمایت میں لکھنؤ کے جلسہ کے بعد جب سرانٹانی میکڈانل کی برہمی بڑھی تو اخیر اگست میں محسن الملک نے اپنا استعفے پیش کر دیا۔ استعفٰی لاٹ صاحب کے پاس بھیجا گیا۔ سرانٹانی میکڈانل کے دل میں چور تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے

کہ پبلک پر یہ ظاہر ہونے دیں کہ اون کے فعل سے بیزار ہو کر کالج کے معاملات سے محسن الملک نے دست کشی اختیار کی ہے۔ چنانچہ لاٹ صاحب نے استعفےٰ واپس بھیج دیا کہ خود ٹرسٹی اس امر کا فیصلہ کریں کہ استعفےٰ منظور کیا جائے یا محسن الملک سے اوس کے واپس لینے کی درخواست کی جائے۔ سر انٹانی میکڈانل کے پرائیویٹ سکرٹری کپتان ڈگلس نے لوکل گورنمنٹ کی پالیسی کا اظہار جو اُردو ناگری کی شورش سے پیدا ہوئی تھی۔ ان الفاظ میں کیا تھا۔ لفٹنٹ گورنر کا خیال ہے کہ بہ لحاظ اون تعلقات کے جو گورنمنٹ اور مدرستہ العلوم علی گڈھ کے درمیان قائم ہیں۔ یہ امر ٹرسٹیوں کے معتمد نائب کے لئے مناسب نہیں ہے کہ بغیر ٹرسٹیوں کی رائے سے گورنمنٹ کو مطلع کئے وہ ایک باضابطہ شورش کی روح رواں ہوں۔ جو گورنمنٹ کی ایک تجویز کے خلاف کی گئی ہو۔" ٹرسٹیوں کی متفقہ درخواست پر محسن الملک نے اپنا استعفےٰ واپس لے لیا۔ جس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ اونھوں نے آئندہ پولیٹکل معاملات سے اپنے کوئی تعلق نہ رکھنے کا اطمینان لفٹنٹ گورنر کو دلایا۔ دوسری مرتبہ محسن الملک نے استعفےٰ ۱۹۰۷ء میں طلبا کی ہڑتال سے متاثر ہو کر پیش کیا۔ یہ استعفےٰ سر جان ہیوٹ کے اصرار سے محسن الملک کو واپس لینا پڑا۔ یہ کتاب میرا اعمالنامہ ہے۔ علی گڈھ کالج یا مسلم یونیورسٹی کا کچا چٹھا نہیں ہے۔ تاہم میں یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ اگر محسن الملک کی طبیعت میں اوس سے آدھی بھی مضبوطی ہوتی جتنی وقار الملک یا نواب محمد علی یا صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے مزاج میں تھی تو غالبًا ہڑتال کی نوبت نہ آتی اور ہڑتال ہوتی بھی تو جلد ختم ہو جاتی۔ اور کالج پر اوس کا زیادہ مضر اثر نہ پڑتا۔ انگریزی کی مثل ہے کہ شکاری کتوں کو آلۂ شکار بنانا اور خرگوش کی حمایت میں اوس کے ساتھ ساتھ دوڑنا بہ یک وقت جائز نہیں ہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ہڑتال کے زمانہ میں محسن الملک نے انگریز پروفیسروں اور طلبا سے جو کچھ کہا اوس میں کسی طرح کی بدنیتی تھی یا دو رنگی برتنا چاہتے تھے۔ مگر خانۂ مروت خراب۔ اس کا کیا جواب ہے کہ جب دونوں فریقوں میں ہر ایک کو اوس کے حسبِ منشا فیصلہ صادر ہونے کی توقع ہو جائے تو معاملات کا

سلجھنے کی بجائے پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہو جانا لازمی ہے۔ خوش قسمتی سے وقارالملک کے زمانہ میں انگریزاسٹاف سے اختلاف ہونے کے سوا اورکوئی جھگڑا پیش نہیں آیا۔ مولانا محمد علی کا خیال تھا کہ محسن الملک نہیں چاہتے کہ علی گڈھ کالج میں پروفیسری کی جگہ پر اون کا تقرر ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ محسن الملک مولانا کے تقرر کے خلاف نہ تھے مگر انگریزی اسٹاف سے مولانا کے تعلقات ناخوش گوار ہونے کے باعث دونوں فریقوں کے درمیان اتحاد عمل کی کوئی ظاہری صورت نہ تھی۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب سے بھی مولانا کے تعلقات اچھے نہ تھے۔ بدرجہ مجبوری محسن الملک کو اس معاملہ میں خاموشی اختیار کرنا پڑی۔ کم وبیش پانچ سال تک وقارالملک بھی سکرٹری رہے اور یہ بات نظر انداز نہ کرنی چاہیئے کہ اون کے زمانہ میں بھی مولانا کا تقرر عمل میں نہ آیا۔

یہ بحث طویل ہوگئی۔ دونوں بزرگوں کی خصوصیات میں نے بلاکم وکاست بیان کردی ہیں۔ اگر مجھ سے دریافت کیا جائے کہ ہر بزرگ کی امتیازی خصوصیت کیا تھی تو میرا جواب یہ ہے کہ محسن الملک کی رائے میں ضرورت سے زیادہ لچک تھی اور وقارالملک کی رائے میں کہیں لوچ کا پتہ نہ تھا۔ عرف عام میں اوس آدمی کو جس میں اس درجہ لچک ہو کم زور اور اوس شخص کو جو اس طرح کا بے لوچ ہو عندی کہتے ہیں۔

بی۔ اے کی تعلیم

بی۔ اے کے پہلے سال کا بیشتر وقت اردو ناگری کے قضیہ اور بہار اور بنگال کے دورے کی نذر ہوا۔ جنوری ۱۹۰۱ء میں کالج کھلنے کے بعد میں نے باقاعدہ درجہ میں شرکت اور کتابوں کا مطالعہ شروع کیا۔ مارچ ۱۹۰۱ء میں کالج میں ایک بلوہ ہو چکا تھا جس کے باعث کالج کی فضا کچھ عرصہ تک مکدر رہ چکی تھی۔ نومبر ۱۹۰۱ء میں جب یونین کے انتخاب کا وقت قریب آیا تو مسٹر تھیوڈر مارلین نے یہ طے کیا کہ ایک سال کے لئے انتخاب کا حق طلبا سے چھین لیا جائے۔ اور بجائے انتخاب کے یونین کے عہدہ داروں کا تقرر بحیثیت پرنسپل خود مسٹر تھیوڈر مارلین کریں۔ چنانچہ موصوف نے محمد ظریف صاحب کو

جو ادبی مذاق رکھنے کے ساتھ نہایت خاموش طبیعت کے طالب علم تھے وائس پریسیڈنٹ مقرر کیا۔ سکرٹری کا نام اس وقت یاد نہیں رہا۔ کیبنٹ یعنی مجلسِ وزرا میں چھ ممبر ہوا کرتے تھے۔ ان چھ میں سے ایک جگہ پر مجھے وزیر مقرر کر کے موصوف نے میری عزت افزائی فرمائی۔ یہ تقرر مجھے اس وجہ سے گراں گزرا کہ اگر انتخاب عمل میں آتا تو یونین کے ممبر وائس پریسیڈنٹ یا کم از کم سکرٹری کے عہدہ کے لئے مجھے منتخب کرتے۔ میں اُس وقت بی۔اے کے دوسرے سال کا طالب علم تھا اور امتحان میں چند ماہ باقی تھے۔ محمد ظریف صاحب بہت اچھے آدمی تھے۔ مگر مجھ سے ایک درجہ نیچے تھے۔ ان سب امور کو پیشِ نظر رکھ کر میں نے کیبنٹ کی ممبری سے اپنا استعفیٰ سر تھیوڈر مارلین کی خدمت میں بھیج دیا۔ میری یہ ڈھٹائی موصوف کو ناگوار گذری اور دورانِ گفتگو میں اونچ نیچ سمجھا کر انھوں نے چاہا کہ میں اپنا استعفیٰ واپس لے لوں۔ مگر میں اپنی رائے پر قائم رہا۔ اور استعفیٰ میں نے واپس نہیں لیا۔ بی۔اے کا امتحان مارچ ۱۹۰۲ء میں ہونے والا تھا اور اب تک میں نے سرگرمی کے ساتھ امتحان کی تیاری شروع نہیں کی تھی۔ یونین کے قضیہ سے نجات پا کر میں نے امتحان کی تیاری شروع کر دی۔ بی۔اے کا امتحان اوس زمانے میں الہ آباد میں ہوا کرتا تھا۔ مگر الہ آباد میں طاعون کا زور شور ہونے کی وجہ سے یہ طے پایا کہ علی گڈھ کے طلبا امتحان میں بمقام لکھنؤ شرکت کریں۔ شیخ شوکت علی مرحوم میرے ہم جماعت اور دوست تھے۔ اور لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ اونھوں نے ہم سب کے قیام کا انتظام قیصر باغ میں کیا۔ اور محمد ادریس مرحوم۔ نصیر الدین حیدر۔ عبدالوہاب اور میں علی گڈھ سے روانہ ہو کر لکھنؤ پہونچے اور امتحان میں شریک ہوئے۔ امتحان کیننگ کالج میں ہوا۔ اوس زمانہ میں کالج جس عمارت میں تھا وہ قیصر باغ میں بارہ دری سے جانب شمال بنی ہوئی ہے۔ اِس جگہ سے کیننگ کالج منتقل ہونے کے بعد یہ عمارت مختلف اغراض کے لئے استعمال کی گئی۔ سر ہارکرٹ بٹلر کے زمانہ میں صوبہ کی کونسل کے جلسے اِسی عمارت میں ہوتے تھے۔ اوس کے بعد یہاں عجائب گھر قایم ہوا اور اب

کچھ عرصہ سے ہندوستانی موسیقی کالج یہاں براجمان ہے اور نئے اور پرانے شیدائیانِ موسیقی کی تانیں شام کے وقت اِس عمارت کے درو دیوار سے باہر نکل کر اُن تمام صاحبانِ ذوق کو لبھاتی ہیں جن کا گذر اس سڑک سے ہوتا ہے۔

رشوت لینے کے ڈھب

دورانِ سفر کا ایک قصہ یاد آیا جس کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ہم چار یا پانچ طلبا کا گروہ علی گڈھ سے لکھنؤ امتحان دینے کے لئے جارہا تھا۔ صبح کے وقت کانپور اسٹیشن پر اُترے۔ جہاں لکھنؤ جانے کے لئے ٹرین بدلی جاتی ہے۔ کتابوں کے علاوہ باورچی خانہ کا سامان اور برتن وغیرہ بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ٹکٹ کلکٹر نے ہم کو ٹوکا اور جب اوس کو یہ معلوم ہوا کہ ہم نے سامان کا محصول ادا نہیں کیا ہے تو اوس نے سامان تُلوایا۔ معلوم ہوا کہ جتنا سامان ہم بغیر محصول ادا کئے لے جا سکتے تھے۔ اس سے زیادہ سامان ہمارے ساتھ تھا۔ اِس دورے میں سفر اور قیام کا کُل انتظام میرے سپرد تھا۔ ٹکٹ کلکٹر مجھ کو ایک بنگالی بابو کے پاس لے گیا اور اوس کو بتایا کہ ہمارے پاس کتنا سامان زیادہ ہے۔ بنگالی بابو نے مجھ سے محصول مانگا اور میں نے وہ رقم ادا کردی۔ غالباً تین یا چار روپے دئے تھے۔ اُس نے رسید لکھ کر بے تکلّف میرے حوالہ کر دی۔ میں نے رسید دیکھی تو معلوم ہوا کہ جتنا سامان زیادہ تھا اوس کا ٹھیک نصف بنگالی بابو نے رسید میں درج کیا تھا۔ اور اسی طرح جو رقم میں نے اوس کو ادا کی تھی۔ وہ بھی ٹھیک آدھی رسید میں لکھی تھی۔ میں نے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے کہ جو رقم مجھ سے وصول کی ہے وہ پوری رسید میں نہیں لکھی بلکہ صرف آدھی رقم رسید میں درج کی ہے۔ بنگالی بابو کا حُلیہ مجھے آج تک یاد ہے۔ عینک لگائے ہوئے تھا۔ خوب بڑی ڈاڑھی تھی۔ ڈاڑھی کے بال کالے تھے۔ مگر کہیں کہیں سفیدی آگئی تھی۔ اِس دیانت کے پُتلے نے غور سے میری طرف دیکھ کر کہا، "آپ اطمینان رکھئیے اب آپ کو کوئی پریشان نہ کرے گا۔ اگر کوئی پوچھے یہ رسید دکھا دیجئے۔ وہ فوراً سمجھ لے گا کہ سامان کا محصول ادا کر دیا ہے، اور دوبارہ سامان تُلوانے کی ضرورت نہ پڑے گی۔" جی تو چاہتا تھا کہ فوراً اسٹیشن ماسٹر کے پاس

جاکر اِس بگلہ بھگت بنگالی کی پول کھولوں۔ مگر ریل کے وقت میں گنجائش کم تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر اس جھگڑے میں دیر لگی اور لکھنؤ والی ریل نکل گئی تو شیخ چلی کی رونکن کے پیچھے اصل سود سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اس لئے بدرجۂ مجبوری خاموشی اختیار کی۔

جنوبی افریقہ کی لڑائی

بی۔ اے کے امتحان سے فارغ ہوکر علی گڈھ آیا۔ اور پھر کندرکی چلا گیا۔ ننھیال سے جو جائداد والدہ صاحبہ کو ملی تھی اوس کے قضیے ابھی کُلیتاً طے نہ ہوئے تھے۔ اس ضرورت سے نگریا سادات جانا پڑا۔ اور جب تک امتحان کا نتیجہ معلوم نہ ہوا ایک سُوئی حاصل نہ ہوئی۔ مئی اور جون ۱۹۰۲ء میں میرا قیام نگریا سادات میں رہا۔ والدہ صاحبہ بھی وہاں تشریف فرما تھیں۔ بیشتر وقت انگریزی اخباروں کے مطالعہ میں صرف ہوتا تھا۔ اوس زمانہ میں دو مسئلے ایسے درپیش تھے جن میں مجھے خاص طور پر دلچسپی تھی۔ ایک تو جنوبی افریقہ کی لڑائی تھی جس میں بور قوم کے لوگوں نے جن کی کُل آبادی دس لاکھ سے زیادہ نہ تھی۔ انگلستان جیسی قہرمانی سلطنت کا ڈھائی برس تک ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ انگریزی سلطنت کی آبادی دولت، سامان حرب، ذرائع اور کچے سامان کے ذخیروں کا۔ اگر جنوبی افریقہ کے بوروں کی مفلوک الحالی سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا تھا کہ جو قومیں آزادی کی صحیح قدر جانتی ہیں اور اپنے حق پر ہونے کا یقین رکھتی ہیں وہ دراز دستی کے مقابلہ میں کوئی قربانی ایسی نہیں ہے جس کے پیش کرنے پر دل و جان سے آمادہ اور تیار نہ ہو جائیں۔ لارڈ رابرٹس (Lord Roberts) یہ سمجھ کر کہ بوروں کی قوت کا خاتمہ ہوگیا ہے جنوبی افریقہ سے انگلستان واپس جاچکے تھے۔ انگریزی فوج کی کمان سردار کچنر[1] کے ہاتھ میں تھی۔ بوروں کی فوجیں منتشر ہوچکی تھیں اور ان میں اتنی سکت باقی نہ تھی کہ کھلے میدان میں انگریزی فوجوں کا مقابلہ کرسکیں۔ مگر بور فوجوں کے چھوٹے چھوٹے گروہوں نے جس بے جگری سے ڈھائی سال تک لڑائی جاری رکھی۔ اوس کو دیکھ کر ہر منصف مزاج شخص کو میر تقی کا یہ شعر یاد آتا تھا۔

---

[1] ہندوستان آنے سے پہلے لارڈ کچنر مصر میں انگریزی فوجوں کے سب سے بڑے جرنیل تھے اور سردار کچنر کے نام سے مشہور تھے۔

شعر
شکست و فتح تو قسمت سے ہے دلے اے میرؔ
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

لارڈ کرزن کا یونیورسٹی کمیشن دوسری بات جس کی طرف تمام تعلیم یافتہ جماعت کی توجہ اُس زمانے میں مائل تھی۔ لارڈ کرزن کا مقرر کیا ہوا تعلیمی کمیشن تھا۔ جس کے صدر لارڈ کرزن کے دوست مسٹر ریلے تھے۔ جو بعد کو سر ٹامس ریلے (Sir Thomas Raleigh) ہوئے۔ بحیثیت وائسرائے ہندوستان آنے کے بعد لارڈ کرزن نے مسٹر ریلے کا تقرر گورنمنٹ کے مشیر قانونی (Law Member) کے عہدہ پر کیا تھا۔ لارڈ کرزن کو انگریزی اعلیٰ تعلیم کے مسئلہ میں بڑا انہماک تھا۔ اس بات کا اندازہ کرنا ذرا مشکل ہے کہ لارڈ کرزن نے یہ کمیشن اعلیٰ تعلیم کے پھیلاؤ کو ملک میں روکنے کے لئے مقرر کیا تھا۔ یا فی الحقیقت اون کی غرض یہ تھی کہ اعلیٰ تعلیم کا معیار بلند کیا جائے۔ اور جن خرابیوں کا اُس زمانے میں بنگال اور خصوصاً کلکتہ کے کالج شکار ہو رہے تھے اُن کا سدِّ باب کیا جائے۔ یہ تو ۱۹۰۰ء میں کلکتہ۔ ڈھاکہ اور پٹنہ میں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ بی۔اے تک تعلیم کے لئے کالج بنانے کو بعض ہوشیار اور باخبر بنگالی حضرات نے ذریعۂ معاش بنا رکھا تھا۔ اعلیٰ تعلیم کی مانگ اس قدر زیادہ تھی کہ اگر کوئی شخص کالج قائم کرتا تو الیف۔اے اور بی۔اے کے درجوں میں طلبا کی تعداد کافی سے زیادہ ہو جاتی تھی۔ ان طلبا سے جو فیس لی جاتی تھی اوس کی مجموعی تعداد اتنی ہوتی تھی کہ پروفیسروں کی تنخواہ جو عموماً پچاس روپے سے اسی روپے ماہوار تک ہوتی تھی ادا کرنے کے بعد ایک معقول رقم مہینہ کے مہینہ بانی کالج کو بچ رہتی تھی۔ کمیشن مقرر کئے جانے کے بعد مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ بنگال کے نجی کے کالجوں اور امدادی کالجوں کی حالت اس قدر خراب ہے کہ طلبا کے مہینوں تک غیر حاضر ہونے کے باوجود رجسٹر میں اون کی حاضری اس لئے درج کرلی جاتی ہے تاکہ کالج کے طالب علم ہونے کی حیثیت سے اون کو الیف۔اے اور بی۔اے کے امتحانات میں شرکت کا موقع مل سکے۔ جن طلبار کی

حاضری اس طرح درج کی جاتی تھی اون میں سے بعض دور دراز مقامات پر ملازمت کر کے تھوڑا بہت روپیہ کماتے اور اپنی گذر اوقات کرتے تھے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ گو لارڈ کرزن کوتاہ اندیش اور تنگ نظر وائسرائے تھے اور یہ نہیں چاہتے تھے کہ اعلیٰ تعلیم عام طور پر ملک میں اور بالخصوص بنگال میں اور پھیلے۔ تاہم تعلیمی کمیشن مقرر کرنے سے اون کی ایک غرض یہ بھی تھی کہ جو خرابیاں بنگال کے کالجوں میں پھیلی ہوئی تھیں وہ دُور کی جاسکیں۔ جو صاحب اس کمیشن کے ممبر مقرر ہوئے تھے وہ باستثنا نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کے سب کے سب انگریز تھے۔ بنگالیوں کے شورش کرنے پر لارڈ کرزن نے سر گرو داس بنرجی جج کلکتہ ہائی کورٹ کو بھی کمیشن کا ممبر مقرر کر دیا تھا۔ اور جو اختلافی رپورٹ بنرجی صاحب نے لکھی تھی وہ بڑی قابل قدر تھی۔ اور آج بھی پڑھنے کی قابل ہے۔ بنرجی صاحب نے اختلافی نوٹ میں لکھا تھا کہ اعلیٰ تعلیم کو بہتر بنانے کے لئے تعلیمی مثلث کے عمود کو اندھا دُھند اونچا کر دینا اوس وقت تک ملک کے لئے مفید نہیں ہو سکتا جب تک کہ قاعدہ کو جس پر عمود قائم ہے عمود کی اونچائی کے تناسب سے چوڑا نہ کیا جائے۔ عمود کی اونچائی بغیر قاعدہ کی چوڑائی کے ملک کے حق میں بجائے مفید ہونے کے مضر ثابت ہوگی۔

مولوی سید حسین صاحب بلگرامی نے اوس رپورٹ پر دستخط کر دئے تھے جو صدر اور بقیہ ممبروں کی طرف سے لکھی گئی تھی۔ غرضکہ ۱۹۰۲ء کے وسط میں میرا وقت ان دونوں مسائل کے مطالعہ میں صرف ہوتا تھا۔ آخر جون ۱۹۰۲ء میں نتیجہ آیا۔ جس سے مجھے دوسرے درجہ میں اپنے بی۔ اے پاس ہونے کا حال معلوم ہوا۔ قرضہ کی ادائگی اور بقیہ جائداد کے بارے میں جن انتظامات کی ضرورت تھی وہ جلدی جلدی میں نے منجھلے چچا میر نثار حسین صاحب کی مدد سے انجام دئے اور جولائی کے شروع میں کالج بند ہونے سے پہلے علی گڈھ پہونچ گیا۔

میں نے ایل۔ ایل۔ بی اور ایم۔ اے دونوں درجوں میں اپنا نام لکھایا۔ قانون کے

پروفیسر پہلے مولوی سید کرامت حسین صاحب تھے جو جنوری ۱۹۰۱ء میں الہ آباد ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ پروفیسری سے مولوی صاحب کے استعفیٰ دینے پر اون کی جگہ صاحب زادہ آفتاب احمد خاں صاحب کا تقرر شروع ۱۸۹۸ء میں ہوا تھا۔ ایم۔ اے کی تعلیم کا کالج میں خاطر خواہ انتظام نہ تھا۔ فارسی میں ایم۔ اے کرلینا آسانی سے ممکن تھا۔ مگر یہ سستی ڈگری حاصل کرنے پر میری طبیعت مائل نہ ہوئی۔ میں نے اقتصادیات میں ایم۔ اے کی ڈگری لینا چاہی۔ مضمون اقتصادیات کے سب سے بڑے ماہر اوس زمانہ میں ہمارے صوبہ میں سرتھیوڈر مارلیسن سمجھے جاتے تھے۔ مگر موصوف کی مصروفیات اس قدر زیادہ تھیں کہ وہ ایک طالب علم کی خاطر گھنٹہ یا دو گھنٹہ پڑھانے کا وقت نہ نکال سکتے تھے۔ اس لئے یہ طے پایا کہ مسٹر ٹول (TOWLE) جو سال ڈیڑھ سال پہلے ولایت سے علی گڈھ میں پروفیسر ہو کر آئے تھے۔ مجھے ہفتہ میں چار دن پڑھایا کریں۔ وظیفہ بربنائے قابلیت دینے کے بارے میں جو برتاؤ سرتھیوڈر مارلیسن نے میرے ساتھ کیا۔ اُس کا احسان مندی کے ساتھ تذکرہ کرنا میرا فرض ہے۔ موصوف نے چالیس روپے ماہوار کا اسکالرشپ مجھے عنایت فرمایا تھا۔ یہ بات یاد رہے کہ سرتھیوڈر مارلیسن سے یونین کی کیبنٹ سے استعفیٰ دے کر جو اختلاف میں نے پیدا کرلیا تھا اوسے ابھی پورا سال بھر نہیں ہوا تھا۔ سیاسی جذبہ کے ماتحت انگریز اس ملک میں کچھ بھی کریں مگر مجھے یہ کہنے میں ہرگز تامل نہیں ہے کہ جو مسائل سیاسی پہلو سے خالی ہوں اون میں انگریزوں کا شعار اور طریق کار عام طور پر انصاف پر مبنی ہوتا ہے۔

یونین کی وائس پریزیڈنٹی

نومبر ۱۹۰۲ء میں یونین کے انتخاب کا وقت آیا۔ یونین کا نام اوس وقت سڈلس یونین تھا اور یہ نام مسٹر سڈلس کی یادگار میں رکھا گیا تھا۔ مسٹر سڈلس علی گڈھ کالج کے پہلے پرنسپل تھے۔ قواعد کی رو سے یونین کا پریزیڈنٹ کالج کا پرنسپل ہوتا تھا۔ سب سے بڑا انتخابی عہدہ یونین کی وائس پریزیڈنٹی تھی۔ اوس کے بعد سکرٹری کی جگہ۔ ان دونوں عہدوں پر ہر سال بذریعہ انتخاب تقرر عمل میں آتا تھا۔ انتخاب

کے وقت پرنسپل یا سینیر پروفیسر موجود رہتے تھے اور انتخاب اون کی زیر نگرانی ہوتا تھا۔ انتخاب دو برس کے بعد ہورہا تھا۔ جیسا کہ اس سے قبل مذکور ہو چکا ہے بسلسلہ ۱۹۰۱ء میں کالج کی فضا مکدر ہونے کے باعث انتخاب کے حق سے طلبا ایک سال کے لئے محروم کردئے گئے تھے۔ نومبر ۱۹۰۲ء میں انتخاب ہوا۔ اور یونین کے ممبروں نے زبردست کثرت رائے سے مجھے وائس پریزیڈنٹ منتخب کیا۔ مجھے وائس پریزیڈنٹ مقرر ہو جانے سے مسرت ہوئی جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سر تھیوڈر مارلین کو معلوم ہو گیا کہ میرے زمانہ کے طلبا اور ساتھی میری بابت کیا رائے رکھتے ہیں اور مجھے کیسا سمجھتے ہیں۔ انجمن الفرض[1] اوس زمانہ کی ایک بڑی اہم اور مفید انجمن تھی۔ یہ انجمن اوس زمانہ میں قائم ہوئی تھی جب سر ٹامس آرنلڈ علی گڈھ کالج کے پروفیسر تھے۔ تحریک علی گڈھ سے حقیقی دلچسپی ہونے کے علاوہ موصوف اردو کی مشہور کہاوت جیسا دیس ویسا بھیس پر عمل کرتے تھے۔ کالج کے جلسوں میں بعض اوقات عبا و قبا پہن کر شریک ہوتے تھے۔ اور اون کی اِس ادا نے طلبا کو گرویدہ کرلیا تھا۔ میں ڈیڑھ سال پہلے انجمن الفرض کا خادم یعنی ممبر مقرر ہو چکا تھا۔ دسمبر ۱۹۰۲ء کے آخری ہفتہ میں دہلی میں دربار ہونے والا تھا اور انجمن الفرض نے یہ طے کیا تھا کہ دہلی میں انجمن مذکور کی سرگرمیوں اور دوکان کا انتظام دربار کے موقع پر میری سپرد کیا جائے اور میں جن خدام الفرض کو اپنا شریک کار بنانا چاہوں اون سے مدد لوں۔

---

[1] انجمن الفرض کے ممبر خادم کہلاتے تھے۔ بیشتر طلبا خواہ وہ خادم ہوں یا نہ ہوں سالانہ تعطیل کے زمانہ میں الفرض کے لئے چندہ جمع کرکے لاتے تھے۔ الفرض علی گڈھ میں نمائش یا کانفرنس کے اجلاس یا دوسرے اہم موقعوں پر علی گڈھ کے باہر اپنی دوکان لگاتی تھی اور حامیانِ کالج کی چائے سے تواضع کرتی تھی۔ متعدد حضرات چار آنے سے لیکر پچاس روپے تک حسبِ حیثیت یا حسبِ ہمت چائے نوشی کی قیمت ادا کرتے تھے۔ الفرض کی کتابوں کی بھی ایک دوکان تھی جہاں سے ضروری کتابیں اور پنسل قلم کاغذ وغیرہ طالب علم خرید سکتے تھے۔ الفرض کا جو سالانہ منافع ہوتا تھا اوس سے غریب طلبا کو علی گڈھ کالج میں پڑھنے کے لئے وظیفے دئے جاتے تھے۔ ابتدا میں الفرض کے امین یعنی سب سے بڑے عہدہ دار سر ٹامس آرنلڈ تھے۔ موصوف کے علی گڈھ چھوڑنے کے بعد اون کی جگہ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد صاحب امین مقرر ہوئے۔ افسوس ہے کہ کئی سال سے کتابوں کی دوکان بند پڑی ہے۔ امید ہے کہ اپنی وائس چانسلری کے زمانہ میں سر ضیاء الدین صاحب اس طرف توجہ فرمائیں گے۔

پانچواں باب

میرے زمانہ کا علی گڈھ۔ اوس دور کے پروفیسر۔ میرے ہم جماعت اور دیگر احباب

یونین کا انتخاب سنہ ۱۹ ءمیں۔ کالج کے خطابات

فارسی۔ عربی اور دینیات کے پروفیسر

سنہ ۱۸۹۶ء میں میرے علی گڈھ میں داخل ہونے کے قبل تصنیف وتالیف کا ذوق مولوی شبلی صاحب سے علی گڈھ چھڑا چکا تھا مسٹر آرنلڈ علی گڈھ سے لاہور جا چکے تھے۔ فارسی ہم کو مولوی عباس حسین صاحب پڑھاتے تھے۔ موصوف کی خشک صورت بلا کی ظرافت کی حامل تھی۔ ضلع جگت کے بڑے شائق تھے۔ درس شروع ہونے کے پہلے اور خالی وقت میں درس کے بعد شاگردوں سے ہمیشہ ضلع بولتے اور دوران درس میں بھی اگر موقع ہاتھ آجاتا تو ضلع بولنے سے نہ چوکتے تھے۔ رعایت لفظی اوسی طرح کی ہوتی تھی جس کی نوعیت ذیل کے شعر سے معلوم ہوگی ؎

کدو کی دوستی ایک دم میں توری   کہ ایسے بے گنوں کو کیا کریلے

مولوی صاحب شیعوں کے پیش نماز بھی تھے او شیعہ لڑکے اون کی امامت میں اکثر نماز پڑھتے تھے جمعہ کی نماز ہمیشہ شہر میں پڑھاتے تھے اون کا خیال تھا کہ ایک[1] مسجد میں دو جمعے نہیں ہوسکتے۔ قاری بہت اچھے تھے اون کے والد مولوی جعفر علی صاحب اپنے زمانہ کے بڑے مشہور قاری تھے۔

---

[1] خدا کا شکر ہے کہ سنی شیعہ دونوں یونیورسٹی کی مسجد میں نماز پڑھتے ہیں۔ سید صاحب کا قصد سنیوں اور شیعوں کے لئے علیحدہ علیحدہ مسجد بنانے کا تھا مگر خلیفہ سید محمد حسن صاحب وزیر پٹیالہ نے رائے دی کہ فرقہ وارانہ اختلاف کو کم کرنے کے لئے سارے مسلمانوں کی مسجد ایک ہونا چاہیئے سید صاحب نے اس رائے پر عمل کیا۔ خلیفہ صاحب بڑے روشن خیال اور ذی علم شیعہ تھے۔

کالج میں امیر حبیب اللہ خاں کی تشریف آوری

مولوی عباس حسین کی حاضر جوابی کا ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ امیر حبیب اللہ خاں مرحوم شاہ افغانستان ۱۶ر جنوری ۱۹۰۷ء کو کالج کے معائنہ کے لئے تشریف لائے۔ مخالفوں نے طلبائے کالج کی لامذہبی کی داستانیں سنا کر شاہ مرحوم کے کان بھر رکھے تھے۔ اعلیٰ حضرت طلبا کا امتحان خود لینا اور معلوم کرنا چاہتے تھے کہ دینیات کی تعلیم کا کیا حال ہے۔ سب سے پہلے شیعہ طلبا کی ایک جماعت مولوی عباس حسین کی قیادت میں پیش ہوئی۔ اعلیٰ حضرت نے ایک طالب علم سے دریافت فرمایا اسلام کے بنیادی اصول بیان کرو۔ اوس نے جواب دیا اول توحید۔ دوسرے عدل۔ تیسرے نبوّت۔ چوتھے امامت۔ پانچویں معاد۔ جواب سن کر جب اعلیٰ حضرت کو تعجب ہوا تو محسن الملک نے بتایا یہ جماعت شیعہ طلبا کی ہے۔ فرماں روائے افغانستان نے فرمایا سنّی طلبا کو پیش کرو۔ مولوی عباس حسین کو اس ارشاد سے موقع مل گیا۔ بہ ادب گذارش کی۔ خدا نے اعلیٰ حضرت کو بادشاہ بنایا ہے ظل اللہ کے نزدیک شیعہ سنّی دونوں یکساں ہیں۔ مولانا کی حاضر جوابی قابل داد تھی۔ مگر کابل کی بے گیاہ و بے آب پہاڑیوں کے ہیرے نے جو جواب دیا وہ حقیقتاً موتیوں میں تولنے قابل ہے۔ فرمایا "آخوند۔ مجھے شیعہ سنی بلکہ ساری رعایا یکساں عزیز ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ امتحان اوس وقت ہی قابلِ اطمینان ہو سکتا ہے جب امتحان لینے والے کی واقفیت امتحان دینے والے سے زیادہ ہو"۔۔۔ اعلیٰ حضرت کا لاجواب جواب سن کر مولانا خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد سنّی طلبا کی باری آئی اعلیٰ حضرت نے بہ اطمینان دینیات کا امتحان لیا۔ پھر ایک طالب علم کو اپنے قریب بلا کر کہا قرآن مجید میں سے کچھ یاد ہو تو پڑھ کر سناؤ۔ جس کا کلام پڑھ کر سنانے کی فرمائش تھی اوس کے کارخانے دیکھئے وہ طالب علم خوش الحان حافظ نکلا۔ اوس نے مصری لہجہ میں سورۂ آل عمران کا ایک رکوع پڑھ کر سنانا شروع کیا۔ اعلیٰ حضرت پر رقّت طاری ہو گئی اور یہ کیفیت ہوئی کہ رکوع ختم ہونے تک ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ پھر اعلیٰ حضرت اپنی کرسی سے اوٹھ کھڑے

ہوئے۔ بار بار بڑے جوش سے فرماتے تھے "بدگو جو کچھ کہتے ہیں جھوٹ ہے۔ غلط ہے۔ افترا ہے۔ بہتان ہے۔ اب علی گڈھ کی طرف سے مفتریوں کی زبان بند کرنے کے لئے سب سے پہلے میں موجود ہوں"

مولوی خلیل احمد صاحب عربی پڑھاتے تھے۔ سنبھل ضلع مرادآباد کے رہنے والے تھے۔ بڑے فاضل اجل تھے۔ تاریخی اور علمی معلومات کا ذخیرہ اس قدر وسیع تھا کہ گفتگو سے معلوم ہوتا تھا کہ تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے بغداد کی گلیوں میں گھوم کر ابھی واپس آئے ہیں۔ عروج کے زمانہ میں خلافت عباسیہ میں جو ممالک شامل تھے اون کے جغرافیہ کے ماہر تھے۔ مگر پنبہ دہن تھے۔ نہ خوش بیانی تھی نہ کلام میں روانی۔ پورانی کتابوں کے عاشق تھے۔ بعض اوقات اون کے پاس کتابوں پر شوربے کے دھبے بھی پڑ جاتے تھے۔ زمانہ کی بدمذاقی اسے بے احتیاطی اور پھوہڑپن پر محمول کرے۔ مجھے تو اس میں بھی اون کی سچی محبت کی جھلک نظر آتی ہے۔ خود کھاتے تھے تو کتابوں کو کیسے بھوکا رکھتے۔ صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ ازل میں تقسیم حسن کے وقت حاضر نہ تھے۔ بلکہ اوس وقت علم و فضل میں اپنے حصّہ کی تلاش میں مشغول تھے۔

مولوی عبد اللہ صاحب سنی دینیات کے ڈین (ناظم) تھے۔ مگر سنی شیعہ سب اون کے درس میں شریک ہوتے تھے۔ بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ لڑکوں کے دلوں میں جو شبہات دینیات کے درس کے وقت پیدا ہوتے تھے اون کو معلوم کرنے کا موصوف کو کبھی بھولے سے بھی خیال نہ آتا تھا۔ شبہات رفع کرنا تو بڑی چیز ہے۔ اگر کوئی لڑکا کوئی سوال کرتا تو اس اختصار کے ساتھ اوس کا جواب دے کر جیسا چالاک گواہ جرح کے سوال کو ٹالتا ہے اپنے بیان کا سلسلہ جاری رکھتے۔ یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیئے کہ مولوی صاحب قصداً گریز کرتے تھے۔ اون کے نزدیک جو کچھ جواب میں ارشاد فرماتے تھے وہ سائل کی تشفّی کے لئے بالکل کافی تھا۔ اگر پھر بھی سائل کو شک باقی رہ جائے تو اوس کا ذمہ دار وہ خود تھا۔ اصل یہ ہے کہ دینیات کی تعلیم اس زمانہ میں اون علما سے دلوانا جن کو طلبا کے شکوک و شبہات کا کچھ اندازہ نہیں ہے۔ اسلام میں

چرچ (CHURCH) قائم کرنے کی بنیاد ڈالتا ہے۔ ہم مسلمانوں کو شکر کرنا چاہیئے کہ ہمارے مذہب میں کبھی چرچ قائم نہیں ہوا۔ یہودیوں۔ عیسائیوں۔ ہندوؤں اور پارسیوں میں چرچ قائم ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہبی تعلیم کے اجارہ دار بطریق پادری برہمن اور دستور بن گئے۔ اسلامی عقائد کے بموجب عالم یا مجتہد کا کام ہے کہ نماز کے وقت امامت کرے۔ اپنے پیشہ کے فرائض (خواہ وہ درس و تدریس ہوں یا لوہار یا بڑھئی کا کام یا کاروبار تجارت) انجام دے اور لڑائی کے وقت لشکر اسلام کا سپاہی بن جائے۔ پیشہ ور پجاری یا پادریوں کی منظم جماعت قایم کرنا حق کی جستجو اور اسلامی تعلیم مساوات کے بالکل منافی ہے۔

کالج میں علما کا رسوخ اور اوس کے نتائج سر سید احمد خان علیہ الرحمتہ نے مولویوں کی کبھی پرواہ نہیں کی جس بات کو وہ حق سمجھتے اوس کو ڈنکے کی چوٹ کہتے تھے۔ نواب محسن الملک بڑے آزاد خیال فرقوں کی قید سے آزاد اور ٹھیٹ مسلمان تھے۔ اون کے مذہبی عقائد میرے دادا کے عقائد سے بہت ملتے جلتے تھے۔ مگر علی گڈھ کالج کی ضرورتوں نے اون کو کاسۂ گدائی لے کر بھیک مانگنے اور زبان حال سے یہ کہنے پر مجبور کیا۔ شعر

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

مولانا روم نے کیا سچی بات کہی ہے ؎

آں کہ شیراں را کند روباہ مزاج احتیاج است احتیاج است احتیاج

ترجمہ:۔ جانتے ہو وہ کیا چیز ہے جو شیروں میں لومڑی کی خصلت پیدا کر دے۔ وہ چیز اپنی حاجت ہے۔ اپنی حاجت ہے اپنی حاجت ہے۔

مالی امداد کا مسئلہ کالج کے لئے سر سید کی رحلت کے بعد موت و زیست کا مسئلہ تھا۔ مسلمان سر سید کے مذہبی عقائد سے بد دل تھے۔ محسن الملک قوم کی اور بالخصوص علما کی تالیف قلوب کرنا چاہتے تھے۔ یہ نہ کرتے تو سر سید میموریل فنڈ کی تحریک کیسے کامیاب ہوتی۔ بادلِ ناخواستہ

موصوف نے علما کی آؤ بھگت شروع کردی۔ وہ علما کو اپنا آلہ کار بنانا چاہتے تھے۔ مگر یہ بات اون کے ذہن میں بھی نہ تھی کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ کالج تو کمبل کو چھوڑنے پر آمادہ ہو جائے۔ مگر کمبل کالج کو نہ چھوڑے گا۔ نواب وقارالملک کے عہد میں علما کا رسوخ کالج میں بہت بڑھ گیا۔ موصوف نے جو کچھ کیا نہایت نیک نیتی سے کیا۔ مگر نتیجہ یہ ہوا کہ طلبا کی آزادیٔ خیال جستجوئے حق اور طلب راستی کی سوت جو سرسید کے آخر زمانہ میں پھوٹی تھی۔ اگر سوکھی نہیں تو اوس کی روانی میں بہت کمی ہوگئی۔ نواب اسحاق خاں صاحب کے زمانہ میں علما کے اقتدار و وقار کا آفتاب اگر نصف النہار پر نہیں پہونچا تو اوس دقیقہ پر ضرور پہونچ گیا جہاں سورج جون کے مہینہ میں دن کے گیارہ بجے پہونچتا ہے۔ موصوف بڑے جوشیلے مسلمان تھے اون کے دور میں کالج کی مسجد کی تزئین پر بھی ایک رقم کثیر خرچ ہوئی۔ میرے نزدیک اس کی بڑی ضرورت ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے طلبا کے دل سچی دین داری کے جذبات سے معمور ہوں۔ شعائر اسلام کی پابندی کے ساتھ ساتھ اصول دین کی حقیقت طلبا کے ذہن نشین کی جائے اور جو نوجوان مذہبی تحقیق و تفتیش کرنا چاہتے ہیں اون کی ہمت بڑھائی جائے اور ایسے علما کو یونیورسٹی میں آنے کی دعوت دی جائے جن کی صحبت میں طلبا کو طلب صادق کا ذوق پیدا ہو۔ جن کے وعظ و پند سے وہ مستفید ہوسکیں۔ اور جن کا طریق زندگی دیکھنے والوں کے لئے قابلِ مثال ہو۔ میری ناچیز رائے میں ایسے علما کو مدعو کرنا جن کو حقیقتاً یونیورسٹی سے کوئی لگاؤ نہیں ہے یا جن کو باعتبار اپنے علم و فضل یا کیرکٹر کے ملک میں کوئی خاص امتیازی درجہ حاصل نہیں ہے۔ خفتہ را خفتہ کے کند بیدار۔ والی مثل کو اپنے حال پر عائد کرنا ہے۔ نواب محمد علی صاحب کا زمانہ حضرت علی کی خلافت سے مشابہ تھا علاوہ اور مشکلات کے اون کو تحریک ترک موالات کا مقابلہ کرنا پڑا۔ بڑی دشواری یہ تھی کہ سرسید اور محسن الملک کے زمانہ میں کالج پر حملے علما کی طرف سے ہوتے تھے یا اون لوگوں کی طرف سے جو اپنی ذاتی اغراض کے ماتحت کالج کے مخالف ہوگئے تھے مگر اب اندرونی جنگ شروع ہوگئی۔ پہلے لڑائی غیروں سے تھی۔ اب اپنوں کا مقابلہ اپنوں سے تھا۔ کالج کو تحریک ترک موالات

سے جو نقصان پہونچا اوس کا ذکر ۱۹۲۰ء کے واقعات کے تحت میں کیا گیا ہے۔

دیگر مضامین کے پروفیسر

پروفیسر جادھب چندر چکرورتی ریاضی پڑھاتے تھے۔ شاگرد محبت اور عقیدت سے اون کو بابو صاحب کہتے تھے۔ بابو صاحب نے ایسا مزاج پایا تھا جیسے سوئٹزرلینڈ کے شہر جنیوا کی مشہور جھیل جس میں سوائے طوفان کے کوئی چیز تموج نہیں پیدا کر سکتی۔ ایف۔ اے کی پہلی جماعت کے طلبا کے ساتھ (جن کو مسٹر مارلین پیار میں سال اول کے وحشی کہا کرتے تھے) ایسا شریفانہ برتاؤ کرتے تھے۔ گویا ہم میں سے ہر طالب علم فارغ التحصیل ہونے کے بعد علمی تحقیق و تفتیش کے منازل طے کر رہا ہے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب ایف۔ اے کے طلبا کو منطق پڑھاتے تھے تیار ہو کر آتے تھے اور بڑی جاں فشانی سے درس دیتے تھے۔ اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ کوئی طالب علم منطق میں کم زور نہ رہ جائے۔ ریاضی پڑھانے میں بھی یہ گُر پیش نظر رکھتے تھے جو مضمون وہ پڑھاتے تھے اوس کے نتیجے ہمیشہ بہت اچھے رہتے تھے۔ ایف۔ اے میں میری ریاضی پر جو توجہ ڈاکٹر صاحب نے فرمائی اوس کے لئے میں ہمیشہ اون کا احسان مند رہوں گا۔ سب سے جونیر پروفیسر زماں مہدی خاں صاحب تھے جو تاریخ پڑھاتے تھے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کے انگلستان جانے کے بعد منطق کی تعلیم کا کام بھی زماں مہدی خاں صاحب کی سپرد کر دیا گیا تھا۔ مسٹر ٹینگ انگریزی کے پروفیسر تھے۔ مسٹر ٹول مسٹر گارڈنر برون اور مسٹر کارنا ۱۹۰۱ء میں پروفیسر مقرر ہو کر انگلستان سے آئے تھے۔ مسٹر کارنا اسکول کے ہیڈ ماسٹر بنائے گئے۔ بقیہ دو صاحبوں نے پروفیسری کی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۰۴ء میں زیادہ تنخواہ کی جگہ ملنے پر مسٹر ٹینگ علی گڈھ چھوڑ کر چلے گئے۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل تذکرہ ہے کہ ۱۸۹۹ء میں جب مسٹر بیک کا انتقال ہوا ہے تو مسٹر مارلین پروفیسری سے استعفیٰ دے چکے تھے۔ بیک صاحب کے انتقال کے بعد مارلین صاحب کو پرنسپلی کا عہدہ پیش کیا گیا جسے اونھوں نے منظور کر لیا۔ ان دونوں صاحبوں میں اختلاف کی وجہ یہ تھی کہ سر سید کے انتقال کے بعد بیک صاحب کالج کے تمام انتظامی صیغوں پر چھا گئے تھے۔ مارلین

صاحب کو اس پالیسی سے اتفاق نہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اون معاملات میں جو قانوناً سکرٹری اور ٹرسٹیوں کے اختیار میں ہیں پرنسپل کی طرف سے مداخلت نہ کی جائے۔

علی گڈھ کے میرے ہم جماعت اور دیگر احباب

گرچہ یاراں فارغند از یادِ ما   از من ایشاں را ہزاراں یاد باد

حافظ شیرازی

مذہبی رواداری

مذہبی رواداری جو میں نے اپنے زمانے کے علی گڈھ میں پائی اوس کی مثال نہ علی گڈھ جانے سے پہلے کہیں دیکھی تھی نہ علی گڈھ چھوڑنے کے بعد آج تک کہیں نظر آئی۔ اجنبیت کے باعث ہندو دھرم اور ہندو جاتی کے حالات سے علی گڈھ کے طلبا ناواقف تھے۔ یونیورسٹی کا زمانہ طالب علم کی عمر کا وہ زمانہ ہے جب دماغ کی نشوونما سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ سر تھیوڈر مارسین اپنے تجربہ کی بنیاد پر فرمایا کرتے تھے کہ طالب علم کے دماغ کے اٹھان کا تناسب یہ ہے کہ اگر ایف۔ اے کے دو سال میں ڈیڑھ فٹ کی بلندی پر پہونچنا ہے تو بی۔ اے کے دو سال کی بلندی ساڑھے تین اور چار فٹ کے درمیان ہوتی ہے۔ بی۔ اے کرنے کے بعد یہ تناسب پھر نیچے ڈھلتا ہے۔ اور ایم۔ اے کے دو سال کی اونچائی ایک سے لے کر ڈیڑھ فٹ تک ہوتی ہے زیادہ نہیں ہوتی۔ افسوس ہے کہ زندگی کے اس انمول دور میں نہ علی گڈھ کے مسلمان طالب علموں کو ہندوؤں کے اور نہ بنارس کے ہندو طلبا کو مسلمانوں کے مذہب، معاشرت، تہذیب و شائستگی اور روایات سے واقف ہونے کے ذرائع حاصل ہوتے ہیں۔ ناواقفیت اور کوتاہ اندیشی کی عینک لگا کر دیکھیے تو ہندو کی نظر میں ہر مسلمان عالمگیر نظر آئے گا اور مسلمان کی نگاہ میں ہر ہندو سیواجی معلوم ہوگا۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ کیفیت اوس وقت تک جاری رہے گی جب تک ہمارے کالجوں، اسکولوں، مدرسوں اور پاٹ شالوں میں تاریخ کی وہ کتابیں پڑھائی جائیں گی جو ایک خاص غرض سے تصنیف کی گئی تھیں۔ علی گڈھ

میں مختلف فرقوں کے طلبا کے تعلقات بڑے خوش گوار تھے سنّی۔شیعہ۔مقلد۔غیر مقلد کا مطلق کوئی امتیاز نہ تھا۔مولوی طفیل احمد صاحب اس وقت ہماری برادری کے بزرگوں میں ہیں۔۱۸۷۹ء میں پڑھنے کے لئے علی گڈھ گئے تھے اور ۱۸۸۹ء تک کالج میں تعلیم حاصل کی۔مولوی صاحب سے چار پانچ برس پہلے اون کے بڑے بھائی سید احمد حسین صاحب پڑھنے کے لئے علی گڈھ آچکے تھے۔مولوی صاحب نے علی گڈھ پہونچ کر بڑے بھائی سے دورانِ گفتگو میں شیعوں کے لئے رافضی کا لفظ استعمال کیا۔احمد حسین صاحب نے کہا اب منگلور کی اصطلاحیں چھوڑو۔یہ علی گڈھ ہے یہاں شیعوں کو شیعہ کہتے ہیں۔احمدی فرقہ نیا فرقہ تھا جس کے بارے میں ہم طالب علموں کو صرف اتنا معلوم تھا کہ اُس کے بانی مرزا غلام احمد صاحب قادیانی آریوں کے مقابلہ میں ناموس اسلام قایم رکھنے میں مشغول و مصروف ہیں۔احمدی طالب علم میرے زمانے میں کوئی نہ تھا۔اگر ہوتا تو غالباً اُس کے ساتھ بھی وہی برتاؤ کیا جاتا جو ہم ایک دوسرے کے ساتھ کرتے تھے۔ہم آپس میں یہ تذکرے بھی آزادی سے کرتے تھے کہ شیعوں کے بارے میں سنّی کیا رائے رکھتے ہیں۔ اور شیعہ سنّیوں کو کیسا سمجھتے ہیں۔رافضی اور خارجی کے لقب تو اتنے پُرانے ہوگئے تھے کہ بمصداق شعر

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو بُرا نہ مانے   تیرے صنم کدہ کے بُت ہوگئے پُرانے

اُن میں جدّت رہی تھی نہ لذّت۔کچھ دن پہلے غالباً مرادآباد میں میں نے یہ سُنا تھا کہ سنّی شیعوں کو کھٹمل اور شیعہ سنّیوں کو پسّو کہتے ہیں۔میں نے دوستوں اور ساتھیوں کو اس اہم انکشاف سے خبردار کیا اور دونوں خطابوں کو ہماری سوسائٹی میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔

میرے بعض ہم جماعت اور احباب

محمد ادریس صاحب میرے بڑے عزیز دوست تھے۔علی گڈھ میں شروع سے آخر تک میرا اور محمد ادریس مرحوم اور نصیر الدین حیدر کا ساتھ رہا۔عبد الوہاب صاحب (کالج میں اچھے خاصے بھلے آدمی تھے۔کالج چھوڑنے کے بعد اے۔ڈبلیو۔زبیری ہوگئے) امتیاز علی صاحب۔انتظار علی صاحب۔محمد سلطین صاحب۔محمود حسن خاں صاحب۔برکت علی صاحب بھی اوّل سے آخر تک ہمارے ہم جماعت رہے،

محمد ادریس بڑے شگفتہ مزاج آدمی تھے۔ ایل۔ ایل۔ بی پاس کرنے کے بعد وکالت شروع کئے چند مہینے ہی ہوئے تھے کہ ۱۹۰۷ء میں پیغام اجل آپہونچا۔ خدا غریق رحمت کرے نصیر الدین حیدر کے والد خان بہادر سید جلال الدین حیدر صاحب بنارس کے کوتوال تھے۔ سجاد حیدر صاحب یلدرم نصیر الدین کے بھائی ہیں۔ یلدرم اُردو کے نامور انشا پرداز ہیں۔ اُن دنوں ٹرکی کے والہ و شیدا تھے۔ ترکی زبان سے بھی کچھ واقفیت حاصل کرلی تھی۔ چند سال مہاراجہ صاحب محمود آباد کے سیکرٹری رہے۔ ڈپٹی کلکٹری سے پنشن لینے کے بعد اب موجودہ راجہ صاحب محمود آباد کے سکرٹری ہیں۔ نصیر الدین خان بہادر سید علی جان صاحب کی کوتوالی بنارس کے قصے سنایا کرتے تھے۔ وہ بڑے نامور کوتوال تھے۔ مجھے پہلی دفعہ ۱۹۰۰ء میں بنارس جانے کا اتفاق ہوا۔ اوس وقت تک سید علی جان کے کارنامے لوگوں کی زبان پر تھے۔ چھوٹے طبقہ کی عورتیں اون کے گیت بھی گاتی تھیں۔ کئی سال بعد مجھے جونپور میں موصوف سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ نصیر الدین کا انٹرنس کے امتحان میں سارے صوبہ میں دوسرا نمبر تھا مگر علی گڈھ کے ماحول میں پڑھنے والوں کی قدر نہ تھی۔ نصیر الدین پر اوس کا یہ اثر ہوا کہ پڑھنے لکھنے میں ڈھیل ڈال دی۔ اور پھر کسی امتحان میں کوئی امتیاز حاصل نہیں کیا۔ نصیر الدین تھوڑے دنوں تحصیلدار رہ کر ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔ چند سال انکم ٹیکس افسر رہے۔ چار سال ہوئے ڈپٹی کلکٹری سے پنشن لی۔ اب ٹونک میں ممبر مال ہیں۔ اونٹ پر سواری کرنے میں ممکن ہے اون کو یہ پوچھنے کا خیال کبھی آیا ہو کہ اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی ہے۔ عبد الوہاب محکمہ آبکاری میں پہلے انسپکٹر مقرر ہوئے۔ سولہ سترہ برس ہوئے الہ آباد میں اسسٹنٹ کمشنر تھے اور مجھ سے ملنے اکثر آتے تھے۔ اب پنشن لے لی ہے۔ دو برس ہوئے علی گڈھ سے مرادآباد واپس جاتے ہوئے کسی چھوٹے سے اسٹیشن پر ملاقات ہوئی تھی۔ سدا بہار پھول ہیں صورت سے سن وسال کا پتہ نہیں چلتا۔ عمر کی قید نہ ہوتی تو نہیں معلوم ابھی کتنے دنوں اور ملازمت کرتے۔ زمانہ ہوا امتیاز علی لکھنؤ میں تحصیلدار تھے۔ انتظار علی بنارس میں آبکاری کے انسپکٹر

تھے۔ اب پنشن لے لی ہو گی۔ اون کا لڑکا ہونہار ہے۔ محمد سبطین چوبیس گھنٹے میں سے بارہ چودہ گھنٹے پڑھنے والے طالب علموں میں تھے۔ فارسی کی دست گاہ اچھی تھی۔ شعر بھی کہتے تھے عرصہ دراز سے پرتاب گڈھ میں وکالت کرتے ہیں۔ محمود حسن خاں پڑھنے لکھنے میں محمد سبطین کے حریف تھے۔ شام کو بلا ناغہ فٹ بال بھی کھیلتے تھے۔ بھوپال میں کئی دفعہ ملاقات ہوئی۔ ریاست میں خاصا معقول عہدہ تھا۔ شادی بھی بھوپال میں کرلی ہے۔ غالبًا اون کی بیوی ہز ہائی نس نواب صاحب بھوپال کے خاندان کی ہیں۔ برکت علی پنجابی تھے۔ دراز قامت۔ دُبلے پتلے ہلکا گندمی رنگ۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ فٹ بال کھیلتے تھے اور پڑھنے میں دھیان تھا۔ ایک روز محمد ادریس مرحوم کو شرارت سُوجھی۔ برکت علی سے پوچھنے لگے۔ کیوں بھائی برکت علی پنجابی میں پیڑو کو کیا کہتے ہیں۔ برکت علی اردو بولتے تھے۔ مگر میرا خیال ہے اون کی مادری زبان پنجابی تھی۔ (خدا کانگرس کا بھلا کرے اوس کی بدولت سارے ملک کے مسلمانوں کی زبان اردو ہو جائے گی) پوچھنے لگے جی کیا کہا۔ ادریس نے کہا پیڑو کو پنجابی میں کیا کہتے ہیں۔ منٹ بھر تک برکت علی کچھ سوچتے رہے۔ پھر بڑے بھولے پن سے جواب دیا "جی ہمارے پنجاب میں نہیں ہوتا۔" سب ہنسنے لگے۔ غریب برکت علی کو آخر تک پتہ نہ چلا کہ ادریس مذاق کر رہے ہیں۔ پیڑو کے لفظ سے برکت علی ناواقف معلوم ہوتے تھے۔

سر منڈاتے ہی اولے پڑے

شاکر علی صاحب بیرسٹر ہیں اور گورکھپور میں بیرسٹری کرتے ہیں۔ وہ مجھ سے اور ادریس مرحوم سے ایک درجہ اوپر تھے۔ ادریس کے بڑے بھائی محمد ابراہیم صاحب سجاد حیدر کے دوست تھے۔ جب ادریس علی گڈھ آئے ہیں تو محمد ابراہیم کالج چھوڑ چکے تھے۔ مگر بھائی کا دوست ہونے کے تعلق سے جب ادریس علی گڈھ کالج میں داخل ہونے کے لئے آئے تو سجاد حیدر کے پاس ٹھہرے۔ ایک قصہ سناؤں جس سے معلوم ہو گا کہ اُس دور کے علی گڈھ کا کیا رنگ تھا۔ ۱۸۹۰ء کی بات ہے ادریس ابھی ابھی علی گڈھ پہونچے ہیں سجاد حیدر کے کمرے میں آکر بیٹھے ہیں کچھ

اور طالب علم بھی وہاں موجود ہیں جن میں شاکر علی بھی ہیں۔ شاکر بڑے تنٹ کھٹ تھے۔ ادریس سے پوچھا آپ کا نام۔ ادریس نے جواب دیا محمد ادریس۔ کہنے لگے بجا ہے۔ کوئی دومنٹ تک شاکر خاموش رہے۔ اوس کے بعد ایک چپت غریب ادریس کو رسید کیا۔ ادریس نے کوئی آدھا منٹ غور کیا کہ اس تواضع کا جواب زبان سے دوں یا ہاتھ سے۔ پھر سوچے کہ اگر تشدد کا جواب تشدد سے دیا تو شاکر کا تو کچھ نہ بگڑے گا اُن سے یہاں سب لوگ واقف ہیں۔ بدنامی میری ہوگی کہ آتے ہی ہاتھا پائی شروع کر دی۔ زہر کے گھونٹ پی کر ادریس نے بگڑ کر کہا "یہ کیا بدتمیزی ہے۔ مجھ سے آپ سے تو بے تکلفی نہیں ہے۔ ابھی ابھی پہلی ملاقات ہوئی ہے۔" شاکر نے مسکرا کر کہا "میں کب کہتا ہوں کہ میری تمہاری بے تکلفی ہے۔ اسی لئے تو میں نے یہ حرکت کی، اب بے تکلفی ہو جائے گی۔" شاکر کا خیال صحیح نکلا۔ اوس دن سے دونوں بے تکلف دوست ہو گئے۔ ہم سب کچی بارگ میں رہتے تھے۔ اب اوس کی جگہ عالی شان عمارت کھڑی ہے۔ جسے عثمانیہ ہوسٹل کہتے ہیں۔ کرکٹ کے کپتان علی حسن صاحب اور فٹ بال کے کپتان عبدالمجید خاں صاحب تھے۔ دونوں کو علی گڈھ سے بڑی محبت تھی۔ کرکٹ اور فٹ بال کی کپتانی اوس زمانے میں بڑی چیز تھی۔ ہر موقعہ پر دونوں صاحب پیش پیش رہتے تھے۔ پھر بھلا علی گڈھ چھوڑنے کی کیا جلدی تھی دونوں میں اپنی اپنی جگہ بڑی خوبیاں تھیں۔ علی حسن افیون کے صاحب ہو گئے تھے۔ متھرا کے سید رضا علی اور مسٹر شوکت علی (مولانا کا خطاب سترہ اٹھارہ برس بعد ملا) بھی افیون کے صاحب یعنی سب ڈپٹی اوپیم ایجنٹ تھے۔ پھر علی حسن پولیس میں چلے گئے۔ کپتان پولیس کے عہدہ سے پنشن لی۔ اب کسی ریاست میں پولیس کے انسپکٹر جنرل ہیں۔ عبدالمجید خاں سے دو برس ہوئے شملہ میں ملاقات ہوئی۔ ماشاء اللہ اون پر ساٹھا سو پاٹھا کی مثل صادق آتی ہے۔ ۳۵ سال کے بعد ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ مگر اُنھوں نے مجھ کو اور میں نے اون کو بلا تکلف پہچان لیا۔ کچھ دیر خوب لطف سے گذری۔ عرصہ دراز تک زراعتی بنکوں کے جن کو زمینداری بنک بھی کہتے ہیں (کوآپریٹو بنک) ذمہ وار افسر پنجاب اور ریاست حیدرآباد

میں رہے اور قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ اب بڑے پیمانہ پر ریاست بہاول پور میں کھیتی کرلی ہے۔ زمین کا ایک بہت بڑا قطعہ مل گیا ہے۔ اوس کے تردد کے سوا اور کوئی فکر نہیں ہے۔

ظفر عمر صاحب نئی بارگ میں رہتے تھے۔ فٹ بال خوب کھیلتے تھے۔ عبدالمجید خاں کے علی گڈھ چھوڑنے پر فٹ بال ٹیم کے کپتان ہوئے۔ سرسید میموریل فنڈ کی امداد کے لئے ایک آنہ فنڈ حکام کالج کی اجازت سے اونھوں نے قایم کیا تھا۔ کچھ دنوں ریاست بھوپال میں ملازمت کی پھر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس ہوئے۔ بڑے چہ کتنے افسر تھے۔ بدقسمتی سے ۱۹۱۶ء میں شکار میں حادثہ پیش آیا۔ جان کی توخیر رہی۔ مگر عمل جراحی کے بعد مولانا شبلی کی برادری میں داخل ہوگئے کپتان پولیس کے عہدہ سے پنشن لی۔ اب علی گڈھ میں قیام ہے۔ رات دن یونیورسٹی کی فلاح وبہبود کی فکر میں سرگرم رہتے ہیں۔ سرگزشت کی ایڈیٹری میں مرزا ابراہیم بیگ مرحوم کے جانشین ہیں۔ ظفر عمر سے رخصت ہونے سے پہلے ایک قصہ بھی سن لیجئے۔ ظفر عمر جب پیدا ہوئے تو ظفر علی نام رکھا گیا۔ اون کے والد کے کوئی شیعہ دوست ملنے آئے۔ اثنا ر گفتگو میں دوست نے بچہ کا نام دریافت کیا۔ نام معلوم ہونے پر کہنے لگے۔ یہ عجیب لطف ہے کہ سنی بھی نام اہلِ بیت ہی کے نام پر رکھتے ہیں۔ یہ معلوم نہ ہوسکا کہ یہ بات از راہِ طنز کہی تھی یا بطور خوش طبعی ظفر کے والد نے بگڑ کر کہا اگر یہ بات ہے تو آج سے میرے لڑکے کا نام ظفر عمر ہے۔ چنانچہ یہی نام قرار پایا۔

"بجا ارشاد ہوا" بدایوں کے اعزاز عالم صاحب بھی میرے ہم جماعت تھے۔ خاموش آدمی تھے۔ اور زیادہ وقت اپنے کمرے میں گذارتے تھے۔ محرم کی مجالس بالائے قلعہ ایک وکیل صاحب کے مکان پر ہوا کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ ہم پانچ چھ طالب علم مجلس کی شرکت کے لئے گئے۔ جگہ بھر چکی تھی۔ اتنی گنجائش نہ تھی کہ سب ایک جگہ بیٹھتے جس کو جہاں جگہ ملی بیٹھ گیا۔ اعزاز عالم نے اندر کے درجہ میں منبر کے سامنے جگہ تاکی اور ایک صاحب کے ٹھیک

آگے اطمینان سے جاکر بیٹھ گئے۔ وہ صاحب خوش مزاج معلوم ہوتے تھے۔ دریافت کرنے لگے جناب کا دولت خانہ کہاں ہے۔ اعزاز عالم نے پیچھے پھر کر جواب دیا بدایوں۔ یہ سن کر اون صاحب نے اس طرح سر ہلایا گویا وہ اس جواب کے متوقع تھے اور طنز آمیز لہجہ میں کہا، بجا ارشاد ہوا۔ کیوں نہ ہو" یہ تو آج سے چالیس بیالیس سال پہلے کی بات ہے کالج چھوڑنے کے بعد اونھوں نے محکمہ سر رشتہ تعلیم میں ملازمت کی اور چند سال ہوئے ہیڈ ماسٹری سے پنشن لی۔ اون کے بڑے بھائی اکرام عالم صاحب ہم سے ایک درجہ اوپر تھے۔ اوس زمانہ میں خشخاشی ڈاڑھی رکھتے تھے جو لبفضلہ اس وقت تک موجود ہے۔ دنیا کی رفتار میں فرق آیا ہو مگر اون کی ڈاڑھی آج بھی ایسی ہی کالی ہے جیسے کالا بھونرا — اکرام عالم پہلے بدایوں کے کامیاب وکیل تھے۔ آٹھ دس سال سے بریلی میں وکالت کرتے ہیں۔ دونوں بھائیوں نے اپنے لڑکوں کو بہت اچھی تعلیم دی ہے۔ خان بہادر مقصود علی خاں صاحب اور نعمت اللہ صاحب اور زماں مہدی خاں صاحب ہم سے تین درجے اوپر تھے۔ تینوں نے ۱۸۹۹ء میں بی۔ اے پاس کیا۔ مقصود علی خاں ڈپٹی کلکٹری کے امتحان مقابلہ میں جو سر انٹانی میکڈانل لفٹنٹ گورنر نے قایم کیا تھا بیٹھنے والے تھے۔ مگر کم عمری کے باعث گورنمنٹ نے اجازت نہ دی۔ دوسرے سال امتحان میں شریک ہوئے۔ اور پہلا نمبر آیا۔ ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے۔ چند سال ہوئے کلکٹری سے پنشن لی۔ نعمت اللہ نے علی گڈھ فیض آباد اور لکھنؤ میں وکالت کی۔ پھر الہ آباد ہائی کورٹ کی ججی پر تقرر ہوا۔ اپنے زمانہ کے قابل ترین ججوں میں تھے۔ صوبہ سرحد کی تحقیقاتی کمیٹی کے ممبر ہوئے اور بڑی بے لاگ رپورٹ لکھ کر پیش کی۔ تعجب ہے کہ موصوف کو نائٹ کا خطاب نہ ملا۔ جو عام طور پر چیف جسٹس کے سوا ایک یا دو اور تجربہ کار ججوں کو بھی گورنمنٹ دیتی ہے۔ خطابوں کی وقعت کم اور بہت کم ہو جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بسا اوقات گورنمنٹ کی بارگاہ سے غیر مستحقوں کو خطابات عطا ہوتے اور مستحق اون سے محروم رکھے جاتے ہیں۔ کلکتہ ہائی کورٹ کی ججی کے زمانہ میں

سید امیر علی مرحوم کے ساتھ بھی یہی طریقہ برتا گیا تھا۔ جب سے ہائی کورٹ کی ججی سے پنشن لی ہے نعمت اللہ لکھنؤ چیف کورٹ میں وکالت کرتے ہیں۔ ریاست کشمیر کی پریوی کونسل کی ممبری کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں۔ زماں مہدی خاں نے اپنے وطن پنجاب میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کے امتحان مقابلہ میں کامیابی حاصل کی۔ نیک نام اور زوردار افسر تھے۔ ڈپٹی کمشنر ہو گئے تھے۔ آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کا ۱۹۳۱ء کا سالانہ اجلاس روہتک میں آپ ہی کی مساعی جمیلہ کے باعث منعقد ہوا تھا۔ میری اون کی آخری ملاقات لاہور میں مارچ ۱۹۳۷ء میں ہوئی تھی۔ اوس وقت اون کا قصد پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کی ممبری کے لئے کھڑے ہونے کا تھا۔ علی گڈھ کے بڑے فدائی تھے۔ خدا غریق رحمت کرے۔

محمد فائق صاحب مرحوم اور سید ابو محمد صاحب (خان بہادر) مجھ سے ایک سال بعد کالج میں آئے تھے۔ محمد فائق بڑے میل جول کے آدمی تھے۔ خان بہادر مولوی مقبول عالم صاحب وکیل بنارس کے عزیز تھے۔ کالج میں ہر دل عزیز رہے۔ یونین کے سکرٹری منتخب ہوئے۔ وکالت کا امتحان پاس کر کے چند سال تک فیض آباد میں وکالت کی۔ قومی کاموں سے ہمیشہ لگاؤ رہتا تھا۔ مگر موت اچھے برے کا امتیاز نہیں کرتی۔ جوانی میں چل بسے۔ خدا اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ غالباً ابو محمد کی ڈاڑھی کے باعث اون کے ادبی ذوق کا صحیح اندازہ کرنے میں ہم عصروں کو دیر لگی۔ انگریزی ادب اور فارسی ادب دونوں میں اوس وقت بھی مذاقِ سلیم رکھتے تھے۔ یونین میں تقریر انگریزی میں کرتے تھے اور خوب بولتے تھے علی گڈھ کا جو وفد ۱۹۰۳ء میں ایران گیا تھا اوس کے ممبر تھے۔ میں نے اون کو علی گڈھ میں چھوڑا۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد کچھ دنوں تک تحصیلدار رہے۔ پھر ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔ ریاست رامپور میں تین سال تک وزیر مال رہے۔ پھر کلکٹری پر ترقی پائی۔ اور ہمارے صوبہ کے پبلک سروس کمیشن کے ممبر ہوئے۔ قلمی اور نادر کتابوں اور شاہی فرمانوں کے جمع کرنے کا شوق ہے۔ شہنشاہ عالمگیر سے اس بارہ میں اتفاق رائے نہیں رکھتے کہ تسکار کار بے کار ا ل

است۔ (یعنی شکار بے کاروں کا کام ہے)

ولایت علی بمبوق

ولایت علی مرحوم اور نواب علی صاحب غالباً ایک ساتھ علی گڈھ پہونچے۔ نواب علی خاموش آدمی ہیں۔ بارہ بنکی میں وکالت کرتے ہیں۔ ولایت علی نے بمبوق کلب قایم کیا اور خود بمبوق کے نام سے شہرت پائی۔ خوش طبعی اور لطیف بذلہ سنجی میں بمبوق اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ تحریر میں بلا کی شوخی ہوتی تھی۔ کامریڈ میں جو مضمون مرحوم نے لکھے تھے اون سب کو کشتِ زعفران سمجھنا چاہیئے۔ ناممکن ہے کہ آپ مضمون کی چار سطریں پڑھیں اور بغیر ختم کئے چھوڑ دیں۔ مثلاً بمبوق کا ایک مضمون پٹواری کے اوپر ہے۔ پٹواری کی شانِ زندگی یہ ہے کہ ہر بات اور ہر فعل ذومعنی ہو۔ مضمون میں بڑی خوبی سے دکھایا ہے کہ پٹواری کس طرح بہ یک وقت زمیں دار کا تابع دار۔ کاشت کار کا ہم درد۔ قانون گو کا معتمد۔ تحصیل دار کے یہاں کا حاضر باش اور حاکم پرگنہ کا مطیع اور فرماں بردار ہوتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اوس کے اندراجات غلط ہوتے ہیں اور وہ سوائے اپنے کسی کا دوست نہیں ہے۔ مگر لطف یہ ہے کہ کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ بمبوق کے سارے مضامین بڑے پُر لطف ہیں جن میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ مصرعہ

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

عین عالمِ شباب میں وہ سفر پیش آیا جو بالآخر سب کو پیش آنا ہے۔ مرحوم کا لڑکا انور جمال ہونہار اور صاحبِ سلیقہ ہے۔ صحافت نگاری شغل ہے۔

کالج یونین کا انتخاب ۱۹۱۰ء میں

سید مصطفےٰ حسین رضوی صاحب ۱۹۱۰ء میں علی گڈھ آئے۔ غضب کی جِدت پھرت تھی۔ کالج میں اوس زمانہ میں دو پارٹیاں تھیں۔ جن کے وجود کا احساس عام طلبا کو صرف یونین کے انتخابات کے زمانہ میں ہوتا تھا۔ مصطفےٰ حسین ایک پارٹی میں تھے۔ میں دوسری پارٹی میں تھا۔ میں جس پارٹی میں تھا اوس کا نام خواص کی پارٹی (Patrician) اور مصطفےٰ حسین

جس پارٹی میں تھے اوس کا نام عوام کی پارٹی (Plebian) تھا۔ یہ دونوں نام غلط تھے خواص اور عوام دونوں کے دونوں ہر ایک پارٹی میں تھے۔ دراصل ہر پارٹی کا نام وہ قرار پاتا ہے جس نام سے مخالف پارٹی اوس کو پکارتی ہے۔ جن حضرات کی نظر انگلستان کی تاریخ پر ہوگی۔ اون کو یاد ہوگا کہ ہِگ (Whig) اور ٹوری (Tory) پولٹیکل پارٹیوں نے یہ نام کس طرح پائے تھے۔ بعینہٖ یہی حالت ہمارے ناموں کی تھی۔ دسمبر ۱۹۰۵ء میں بڑے زور شور کا انتخاب ہوا اور ہم ہار گئے۔ کالج کے ایک اسسٹنٹ پروفیسر اور اسکول کے بہت سے ماسٹر اس انتخاب میں ووٹ دینے آئے تھے۔ اور تقریباً ان سب حضرات نے ووٹ ہماری پارٹی کے خلاف دیے۔ اصل بات یہ ہے کہ اس انتخاب میں یہ سوال نہ تھا کہ کس پارٹی کے امیدوار زیادہ موزوں ہیں۔ بلکہ عام طلبا کی طرف سے اس انتخاب میں اوس پالیسی کے خلاف اظہار ناراضگی کیا جا رہا تھا جو کرکٹ ٹیم کے کپتان اور ٹیم کے اور ممبروں کا اقتدار بڑھانے میں کالج کے سرکاری حلقوں میں عرصہ سے برتی جا رہی تھی۔ ہوت اور نہ ہوت دارم اور نہ دارم میں ہمیشہ جھگڑا رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ ہماری پارٹی میں سب سے زیادہ ووٹ عبدالحمید صاحب کے آئے تھے۔ جو یونین کی وائس پریزیڈنٹی کے امیدوار تھے۔ مرحوم مدراس کے رہنے والے تھے۔ بڑے خوش مزاج اور خوش خلق تھے۔ گوری چٹی رنگت۔ لمبا قد۔ بدن خوب گٹھا ہوا کالج میں اون کا لقب سولجر (فوجی سپاہی) تھا بڑے ہر دل عزیز تھے۔ مرحوم کے ایک سو آٹھ ووٹ تھے۔ میں وزارت (کیبنٹ) کی چھ جگہوں میں سے ایک کا امیدوار تھا۔ سولجر کے بعد سب سے زیادہ میرے ووٹ تھے۔ یعنی ایک سو تین۔ دوسری پارٹی کے امیدوار خواجہ غلام السبطین صاحب (خواجہ غلام الثقلین صاحب مرحوم کے چھوٹے بھائی) ساٹھ ستر ووٹ کی کثرت سے وائس پریسیڈنٹ منتخب ہوئے انتخاب کے زمانہ میں جن جن حربوں سے کام لیا جاتا ہے اوس کا بھی ایک قصہ سُن لیجئے۔ انتخاب سے دس دن پہلے میں بنگال کے دورے سے واپس آیا تھا۔ جو کامیابی

مولف فروری ۱۹۰۱ء میں

مجھے بنگال اور اوس کے پہلے اُردو ناگری کے جھگڑے میں صوبجات[1] متحدہ میں ہوئی تھی اوس کے باعث کالج میں میری کچھ تھوڑی بہت آؤبھگت ہونے لگی تھی۔ جس زمانہ میں دونوں پارٹیاں ووٹ حاصل کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھیں دورانِ تذکرہ میں میری زبان سے نکل گیا کہ ہمارے مخالفوں کو تمیز ہے نہ سلیقہ۔ وہ تو پہننے کے کپڑے مٹکوں میں رکھتے ہیں۔ بس پھر کیا تھا (مخالفوں کے لفظ سے غلط فہمی نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ بقول آتش مصرعہ۔ یہ قصّہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا) بات کا بتنگڑ بنا ڈالا۔ جب ہماری پارٹی کو شکست ہوئی تو ہمارے ایک ممتاز مخالف نے طنزاً کہا بنگال کی شہرت رضا علی کے کچھ کام نہ آئی۔ اب جو غور کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو جو شکست ہوئی وہ بجا ہوئی اور ہمارے مخالفوں کو جو کامیابی ہوئی، اوس کا وہ استحقاق رکھتے تھے۔ کالج کے پرنسپل کی پالیسی یہ ہونا چاہیئے کہ سب طلبا کے ساتھ انصاف اور ناطرف داری کا برتاؤ کرے۔ اگر کسی جماعت کی بے جا رُو رعایت کی جائے گی تو طلبا کی نظر میں پرنسپل کی وہ وقعت اور دل میں وہ اعتبار نہ رہے گا جو معلّم و متعلّم کے درمیان خوش گوار تعلقات قائم رہنے کا کُھلا راز ہے۔

اس کامیابی نے مصطفےٰ حسین رضوی کے دماغ کو چوتھے آسمان پر پہونچا دیا۔ اس طرح اکڑ کر چلتے تھے گویا سارا کالج اون کے ذاتی روپیہ سے بنا ہے۔ ہماری پارٹی اون سے متنفر تھی اور میں تو اون کی صورت سے بے زار تھا۔ لفظ رضوی کو مصطفےٰ نے اپنے نام کا جزو کر لیا تھا اون پر ہی کیا موقوف ہے۔ انگلستان کی تقلید میں اب ہم نہ سید ہیں نہ شیخ۔ نہ مغل ہیں نہ پٹھان۔ کچھ رضوی اور زیدی اور جعفری اور نقوی ہو گئے ہیں۔ کچھ صدیقی اور عثمانی اور قریشی اور زبیری بن گئے ہیں کچھ نے چغتائی اور تیموری کے بھیس میں نیا جنم لیا ہے۔ پٹھانوں کا طرۂ امتیاز اب تک خان رہا ہے جو اس قدر معزز لقب ہے کہ لفظ صاحب یا بہادر بڑھا کر

[1] اوس زمانہ میں ہمارے صوبہ کا نام صوبہ شمالی و مغربی و اودھ تھا۔ ۱۹۰۲ء میں جب صوبہ سرحد بنا تو اوس کا نام شمالی مغربی سرحدی صوبہ رکھا گیا اور ہمارے صوبہ کا نام صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ قرار پایا۔

اوسے گورنمنٹ نے اپنے خطابات کی فہرست میں شامل کرلیا ہے۔ اگر یہی لیل ونہار ہے تو وہ بھی پُرانی کیچلی چھوڑ نیا روپ بدلیں گے۔

قوم اور اڑنگ بڑنگ تڑنگ کے خطابات

قوم کا خطاب میرے زمانہ سے پہلے ایجاد ہوا تھا میرے زمانہ میں غالبًا ساتویں قوم کا ہمائے سعادت ہمارے سروں پر سایہ فگن تھا۔ قوم کا پیارا لقب اور اڑنگ[1] بڑنگ تڑنگ کے مہتم بالشان خطابات میری آنکھوں کے سامنے مستحقین کو عطا کئے گئے۔ قوم کا خطاب میرے زمانہ میں دو صاحبوں کو دیا گیا اور سچ تو یہ ہے کہ دونوں مجسّم قوم ہیں۔ دونوں نے سیاست میں نام حاصل کیا۔ قوم نمبر ایک، ایک بہت بڑی اسلامی ریاست کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ نقشِ دویم نے تحریک خلافت کے زمانہ میں قابلِ قدر خدمات انجام دیں اور ثابت کردیا کہ ذاتی مفاد کو قربان کرنے کے معاملہ میں مسلمان کسی اور قوم سے پیچھے نہیں ہیں۔ پھر کانگریس کے دَورِ حکومت میں ایک صوبہ میں وزیر رہے۔ اور بن باپ کی بچی یعنی ہندوستانی زبان کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس بچّی کی نگرانی اب بھی کرتے ہیں۔ خدا کرے مہاتما گاندھی کو کوئی نیا الہام ایسا نہ ہو جس کے باعث ولی کو یہ بچہ اپنی آغوش سے جدا کرنا پڑے۔ قوم نمبر ایک اور قوم نمبر دو دونوں بڑے جوشیلے اور سچّے مسلمان ہیں۔ آج دونوں کا دائرۂ عمل اس قدر مختلف ہے کہ باہمی ملاقات میں ایک دوسرے سے یہ کہہ سکتے ہیں۔ شعر

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوانِ عشق!　　او بہ صحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

---

[1] اڑنگ بڑنگ تڑنگ تینوں ایک ساتھ علی گڈھ آئے تھے۔ سواری سے اونز کر کچّی بارگ میں جس وقت تینوں پہونچے ہیں میں موجود تھا۔ اودھ کے کسی ضلع کے رہنے والے تھے اون کے والدین یافتہ رسالدار میجر تھے۔ پھبتی کے مصنف کا نام یاد نہیں رہا۔ اڑنگ (احمد حسین خان) اور بڑنگ (محمد عثمان خان) دونوں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ بڑنگ نے ۱۹۴۰ء میں وفات پائی۔ اڑنگ نے پنشن لے لی ہے اور بفضلہ تندرست ہیں۔ تڑنگ سے کالج چھوڑنے کے بعد ملاقات کی نوبت نہیں آئی۔

ترجمہ:- میں اور حضرتِ مجنوں لڑکپن میں ساتھ ساتھ عشق کا سبق پڑھتے تھے۔ اب وہ غریب جنگل جنگل مارا پھرتا ہے اور میری رسوائی گلی کوچہ میں ہو رہی ہے۔

دونوں یونیورسٹی کے والہ وشیدا ہیں اور اکثر علی گڈھ آتے رہتے ہیں۔ آج زمانہ اڑنگ بڑنگ تڑنگ کے خطابوں کی قدر نہ کرے۔ مگر صرف وہ خوش نصیب جنھوں نے ان تینوں بھائیوں کو دیکھا تھا ان خطابوں کی قدر کر سکتے ہیں۔ اڑنگ کا قد چھ فٹ سے اوپر تھا۔ بڑنگ بھائی سے ڈیڑھ انچ کم۔ اون سے ایک انچ کم تڑنگ۔ ہاتھ پاؤں کے خوب مضبوط۔ بڑی بڑی آنکھیں ایسی چمکتی تھیں جیسے اندھیری رات میں جگنو۔ چہرے کی گہری رنگت بھی لمبے قد پر کیا کھُلتی ہے۔ تینوں کا چہرہ پُر رعب تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی کسی مہم سے واپس آئے ہیں۔ ذرا ان تینوں کو برابر برابر کھڑا کیجیے اور اڑنگ بڑنگ تڑنگ بہ آواز بلند جلد جلد کہئے اگر سودا کے پُرشکوہ قصیدہ کے مطلع کا مزہ نہ آجائے تو بات نہیں۔

یہ پہیلی بھی بُوجھئے مصطفےٰ حسین نے رضوی کے نام سے شہرت پائی۔ ایک اور خطاب بھی موصوف کا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ جاننے والے اوسی خطاب سے اون کو جانتے ہیں۔ خطاب کا کیا تذکرہ کروں۔ خطاب بڑا نادر انوکھا تھا۔ ان چاروں لفظوں کا سر کاٹئے یا پاؤں اور پھر سر کو سر یا پاؤں کو پاؤں سے ملا دیجئے انہیں میں سے خطاب نکل آئے گا خطاب اٹکل پچو نہ تھا۔ بلکہ اوس کے ہر حرف میں وسیع معنی پنہاں تھے۔

علی گڈھ کی صحبتیں ہائے کیا زمانہ تھا اور کیا صحبتیں تھیں۔ شعر

کیا دن مزے کے تھے کہ جو راتوں کو صبح تک

میں تھا تری جناب تھی دستِ سوال تھا

ہماری صحبتوں میں معشوق ہی نہ تھا تو دستِ سوال کہاں سے پھیلاتے۔ مگر فرہاد کو کوہکنی میں اور قیس کو صحرا نوردی میں وہ لطف نہ آیا ہوگا جو ہمیں علی گڈھ میں حاصل تھا۔ اپریل کی چاندنی راتوں میں ہمارا ٹہلتے ہوئے قلعہ جانا۔ محمد حیات خاں کا تیری زلف نے لمبر داری لے کر تی نالا یا

ٹول کی۔ گانا اور ہم سب کا ترنم کے ساتھ مناجات[1] کے یہ شعر پڑھنا

اے خاصہ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے　　اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

جو دین بڑی دھوم سے نکلا تھا وطن سے　　پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

جو سماں بندھتا تھا اوس کا لطف کبھی گوہر جان اور نورجہاں کے گانے میں بھی نہ آیا مرادآباد کے خان بہادر قاضی شوکت حسین خاں جن کا ذکر کسی اور جگہ بھی ہے نواب مرزا خاں داغ کے شاگرد تھے کہتے تھے کہ ایک مرتبہ نواب کلب علی خاں مرحوم کی صحبتوں کا ذکر ہو رہا تھا داغ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ فرمانے لگے رام پور میں مجھے پچھتر روپیہ ماہوار ملتے تھے ایک نوکر تھا اور چھوٹا سا مکان۔ حیدرآباد میں اب ڈیڑھ ہزار روپیہ ماہوار مشاہرہ ہے خسروِ دکن کی قدر دانی سے نوکر چاکر سواری شکاری سب کچھ ہے۔ رہنے کے لئے محل عنایت ہوا ہے۔ بڑی شان و شوکت ہے۔ ملنے والوں کا ٹھٹھ لگا رہتا ہے۔ مگر۔ مصرعہ

وہ بات کو وہ کن کی گئی کو وہ کن کے ساتھ

کلب علی خانی دور کی تصویر آنکھوں میں پھرتی ہے۔ بعینہ یہی عالت میری ہے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے زندگی بڑے لطف سے کٹی اور کٹتی ہے[2] اور تو اور غالب کا یہ شعر

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا　　درد کی دوا پائی دردِ لا دوا پایا

پورے طور پر میرے حال پر صادق نہ آتا ہو۔ لیکن میری زندگی میں اوس کی بھی جھلک موجود ہے۔ میں شراب نہیں پیتا۔ مگر یہ کمی اس طرح پوری ہوئی کہ سیاسی زندگی میں اور خاص کر اس زمانے کی سیاسی زندگی میں بجائے خود ہر روز ایک بوتل کا نشہ ہوتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جینے کا مزہ بھی اوس ہی وقت تک ہے جب تک بقول ریاض انسان کی یہ حالت رہے کہ۔ مصرعہ

---

[1] مولانا حالی کی مشہور مناجات ہے

[2] کتاب کا یہ حصہ لیڈی رضا علی کے انتقال سے پہلے لکھا جا چکا تھا۔

نہ پیئے اور جھومتا جائے

یہ سب مزے چکھے اور خوب چکھے تاہم علی گڈھ کا لطف علی گڈھ کے ساتھ گیا۔ اور باتوں کو جانے دیجئے۔ تنہا ایک بات کو لیجئے علی گڈھ میں دوستی اور محبّت کے اندر کوئی ذاتی غرض پنہاں نہ تھی۔ علی گڈھ چھوڑنے کے بعد دوست بہت ملے مگر دوستی کا پتہ بہت کم چلا۔ زمانہ کی رفتار کہیئے یا ہماری پُرانی تہذیب و شائستگی کے زوال کا اثر۔ دوستی اور خود غرضی عموماً مترادف الفاظ ہو گئے ہیں۔ اکثر انگریزی داں اصحاب تو وضع داری کے نام پر ٹھٹھا مار کر ہنستے ہیں۔ مگر یاد رہے کہ وضع داری وہی جنس ہے جس کا نام انگریزی میں کیرکٹر ہے۔

مصطفٰے حسین رضوی جو بات کہنی مقصود تھی وہ رہ گئی مصطفٰے کا نام خطاب کے علاوہ رضوی مشہور رہا۔ میرا نام مڈل میں رضا علی تھا میٹریکولیشن میں ترقی کر کے سید رضا علی ہوا۔ الیف۔ اے میں انگریزی طریقوں سے متاثر ہو کر سید کو چھوڑا اور نام کے آخر میں رضوی کا دُم چھلاّ بڑھا لیا۔ الیف۔ اے کی سند میں میرا نام رضا علی رضوی درج ہے۔ مصطفٰے حسین نے جب رضویت کو اپنایا تو مجھے اس قدر گراں گزرا کہ میں نے لفظ رضوی[1] کو اپنے نام سے علیحدہ کر دیا۔ اور اگلا بھیس اختیار کر کے پھر سید رضا علی ہو گیا۔ یہ سب لڑکپن

---

[1] کہتے ہیں ایک خان صاحب محلہ کی مسجد میں بیچ کے در کے قریب داہنی طرف کھڑے ہو کر نماز ادا کیا کرتے تھے۔ یہ جگہ معین کر رکھی تھی کسی اور جگہ نماز نہ پڑھتے تھے۔ ایک دن نماز پڑھنے آئے تو دیکھا محلہ کے ایک صاحب جو محنت مزدوری کر کے گذر کرتے تھے خان صاحب کی جگہ کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے ہیں۔ خان صاحب کو بُرا معلوم ہوا۔ تھوڑی دیر انتظار کرتے رہے کہ جگہ خالی ہو تو نماز پڑھیں۔ ان صاحب نے دیر لگائی۔ پہلے تو غصہ میں خان صاحب کا ارادہ ہوا کہ گاندھی جی کی اہنسا کے بطلان کا ثبوت اپنے طرزِ عمل سے فوراً دیں مگر خدا کا گھر تھا خون کے گھونٹ پی کر خاموش ہو گئے جب وہ صاحب اطمینان سے نماز پڑھ کر چلے گئے تو خان صاحب اپنی مقررہ جگہ پر جا کر کھڑے ہوئے دونوں ہاتھ کانوں تک لا کر کہا "نیت کرتا ہوں میں پانسو رکعت نماز سنت کی ضد میں اس حرام زادے کی جو میری جگہ کھڑا تھا منہ میرا طرف کعبہ شریف کے اللہ اکبر!"

کی باتیں تھیں۔ کالج میں ہی وہ جذبہ منافرت جاتا رہا اور مصطفےٰ حسین میرے یار غار ہو گئے۔ خدا کے فضل سے یہ مراسم اب تک قائم ہیں مصطفےٰ حسین نواب محسن الملک کی سعی سے ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے۔ خیال تھا کہ کلکٹری تک ضرور پہونچیں گے۔ مگر اون کی طبیعت اور رائے کی آزادی ترقی کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ ساتھ ساتھ زندگی کی سادگی کی دھن نے ہاتھ پاؤں نکالے پھر یہ ہوا کہ جس قدر سادگی بڑھتی گئی مذہبی رنگ گہرا ہوتا گیا۔ نو دس برس ہوئے بجنور میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ کلکٹر خان بہادر سید اعجاز علی تھے مصطفےٰ دن میں گھنٹہ بھر کھڑے ہو کر چکی پیستے تھے بنگلہ میں رہتے تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ بنگلہ میں پاخانہ نہیں ہے۔ رفع حاجت کے لئے جنگل جاتے ہیں۔ اوس زمانہ میں ٹڈیوں نے ضلع بجنور کی زراعت کو بہت نقصان پہونچایا تھا۔ اعجاز علی نے اس بلا سے جنگ کرنے کے کام پر مصطفےٰ کو مامور کیا۔ ایسے کاموں میں موصوف کو خاص لطف آتا تھا۔ بڑے انہماک سے یہ خدمت انجام دی۔ اور ٹڈی والے ڈپٹی مشہور ہو گئے۔ دل کے بڑے اچھے ہیں ہمیشہ کفایت شعاری کو پیش نظر رکھا اور نیک کاموں میں روپیہ صرف کیا ۱۹۳۳ء میں ضلع بجنور میں گنگا کے کنارے ایک بڑا قطعہ آراضی لے کر سیدوں کے لئے ایک نو آبادی قائم کرنا چاہتے تھے۔ ضلع بجنور کے کچھ خود غرض سادات عظام نے اون کو سبز باغ دکھا رکھا تھا۔ اور انھیں حضرات کی تحریک سے جتنا سرمایہ مصطفےٰ کے پاس تھا سب کا سب اس کام میں لگانے کے لئے تیار تھے۔ اتفاق سے مجھے ایک مقدمہ میں بجنور جانا ہوا۔ مجھ سے مشورہ کیا۔ میں نے کہا کس خبط میں پڑے ہو۔ یہ لوگ تمھیں لوٹنا چاہتے ہیں۔ شکر ہے نو آبادی کے خیال سے درگذرے۔ اب پنشن ہو گئی ہے دو برس ہوئے آئے لکھنؤ میں مجھ سے ملنے آئے تھے۔ ڈاڑھی بڑھا لی ہے۔ جو کپڑا مل جائے پہن لیتے ہیں ثابت ہو یا پھٹا۔ سر پر بڑی بدنما پگیا تھی ایک کپڑا اوڑھے ہوئے تھے جس کو بغور دیکھنے سے قیاس ہوتا تھا کہ کسی زمانہ میں کمبل ہو گا۔ سامنے آ کر کھڑے ہو جائیں تو یہ خیال ہو کہ کوئی اہل حاجت ہے یا مجذوب۔ فقیر یا خفیہ پولیس کا افسر۔ بڑے کنبہ پرور ہیں۔

۱۹۱۶ء میں جوان بھائی کا انتقال ہوگیا۔ غلام حسین نام تھا بڑا سعید اور ہونہار نوجوان تھا۔ وکالت کرتا تھا۔ غلام حسین نے بہت سے بچے چھوڑے۔ جن کو مصطفےٰ نے اپنی اولاد کی طرح پرورش کیا۔

محمد یعقوب صاحب (سر محمد یعقوب) ایک درجہ مجھ سے اوپر تھے۔ علی گڈھ میں دو برس کے قریب میرے زمانہ میں رہے۔ پھر کالج چھوڑ دیا اور وکالت کا امتحان پاس کیا۔ کچھ عرصہ تک شاہجہاں پور میں وکالت کی۔ پھر مرادآباد چلے آئے۔ آٹھ برس تک مرادآباد میں میرا اون کا ساتھ رہا۔ منجملہ اور حضرات کے جو علی گڈھ میں میرے زمانہ میں تھے مسٹر ابوالحسن۔ مسٹر محمد محسن بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ سید آلِ حسن بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی اور سید وصال محمد بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی قابلِ تذکرہ ہیں۔ یہ چاروں صاحب میرے ساتھ مرادآباد میں وکالت کرتے تھے۔ مسعودالحسن بریلی کے رہنے والے تھے اون کے چچا سید حسین بھی فقرہ کسنے اور پھبتی اوڑانے میں کمال رکھتے تھے۔ کئی سال علی گڈھ میں رہے۔ مگر مسعودالحسن کی زبردست ظرافت اور شوخی مزاج نے تمام حریفوں پر غلبہ پایا۔ مسعودالحسن کا خطاب ٹامی تھا۔ لکھنے پڑھنے سے کچھ سروکار نہ تھا۔ مگر سوجھ بوجھ اس بلا کی تھی کہ اگر کالج چھوڑنے کے چند سال بعد ہی پیامِ اجل نہ آجاتا تو ٹامی مرحوم بہت سے ڈگری یافتہ بھائیوں کے لئے قابلِ تقلید نمونہ ہوتے۔ وفات کے وقت ضلع میرٹھ میں قائم مقام تحصیلدار تھے۔

چھٹا باب

دہلی دربار۔ سر تھیوڈر اور لیڈی مارلیسن سے میرے تعلقات۔ عربی تعلیم کی تجدید کی تحریک۔ ممتاز انگریز عربی کی تجدید پر زور دیتے اور انگریزی تعلیم سے کج رخی برتتے ہیں۔ طلبا کی دور اندیشی۔ سر تھیوڈر مارلیسن کے سیاسی رجحانات۔ شفیق اوستاد سے میرا سیاسی اختلاف۔ علی گڈھ سے میری روانگی

۱۹۰۲ء کا دہلی دربار

۱۹۰۲ء کے دربارِ دہلی کی جو تیاریاں ہوئی تھیں وہ شاید اس سے پہلے کسی دربار کو نصیب نہ ہوئی تھیں اور زمانے کی رفتار سے پتہ چلتا ہے کہ غالباً آئندہ بھی کسی دربار کو نصیب نہ ہوں۔ ۱۸۷۷ء کا شہنشاہی اجتماع لارڈ لٹن کے زمانے میں منعقد ہوا تھا۔ لارڈ لٹن بھی کنسر ویٹو پارٹی کے با اثر اور ممتاز رکن تھے، اور شان و شوکت۔ تزک و احتشام کے بھی ایسے ہی دل دادہ تھے جیسے لارڈ کرزن۔ تاریخ میں جو کچھ پڑھا اور بزرگوں سے جو کچھ سنا اوس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۷۷ء کا اجتماع گو بڑا شاندار تھا۔ مگر ۱۹۰۲ء کے دربار کے مقابلہ میں وہ پھیکا تھا۔ دسمبر ۱۹۱۱ء میں جو دربارِ تاج پوشی لارڈ ہارڈنگ کے عہد میں منعقد ہوا اور جس میں ملک معظم جارج پنجم خود تشریف فرما تھے میں اوس میں شریک تھا۔ اوس کی شان و شوکت ۱۹۰۲ء کے دربار سے بہت کم تھی۔ اور بہت سے حضرات جو ۱۹۱۱ء کے دربارِ تاج پوشی میں شریک تھے نو برس پہلے کے دربار اور لارڈ کرزن کی ہمہ گیری اور مستعدی کو یاد کر کے مولوی اکبر حسین مرحوم سے متفق الرائے تھے۔

ے ہزار شیخ نے داڑھی بڑھائی سن کی سی مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

بھلا محسن الملک کی سوجھ بوجھ اس بات کو کس طرح گوارا کر سکتی تھی کہ ۱۹۰۲ء کے دربار میں جہاں سارے والیانِ ملک تعلقدار، صنعت و حرفت کے کرتا دھرتا، سیاست داں، تعلیمی ماہر، انگریز حکام اور لارڈ کرزن اور لارڈ کچنر کی جیسی زبردست شخصیت کے وائسرائے اور کمانڈر انچیف موجود ہوں وہاں علی گڈھ کی اہم تحریک کو منظرِ عام پر نہ لایا جائے۔ اور اس موقعہ سے فائدہ نہ اُٹھایا جائے۔ موصوف نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس دہلی میں منعقد کیا۔ دہلی میں ایک زبردست استقبالیہ کمیٹی مقرر ہوئی۔ جس کے سکرٹری خان بہادر مولوی عبدالاحد مرحوم تھے۔ مسلمانوں میں اُس وقت سب سے زیادہ بااثر، ہر دل عزیز اور باخبر آدمی ہز ہائی نس آغا خاں تھے۔ وہ کانفرنس کے صدر قرار پائے۔ جلیل القدر حکام کے نام شرکتِ کانفرنس کے دعوت نامے بھیجے گئے۔ مہمان عربک کالج کی عمارت اور بورڈنگ ہاؤس میں ٹھہرائے گئے۔ احاطۂ بورڈنگ ہاؤس کے باہر جانبِ شمال بہت بڑا پنڈال بنایا گیا۔ جس میں چار پانچ ہزار آدمیوں کی نشست کا انتظام تھا۔ میں نے انجمن الفرض کا خوبصورت شامیانہ جس میں انجمن کی دوکان تھی بورڈنگ ہاؤس کے بیچوں بیچ نصب کیا۔ اور اُسے خوب سجا کر اچھا سامان شامیانہ کے اندر لگا دیا۔ کانفرنس کا یہ اجلاس جس شان و شوکت سے ہوا اور جو کامیابی محسن الملک کے ذاتی اثر کے باعث حاصل ہوئی۔ وہ کانفرنس کی تاریخ میں آپ ہی اپنی نظیر ہے۔ جلیل القدر اور عالی رتبہ مسلمان کانفرنس میں شریک ہوئے اور عربک کالج کے بورڈنگ ہاؤس میں ٹھہرے ان مہمانوں میں سر علی امام بھی تھے جو پٹنہ میں بیرسٹری کرتے تھے۔ موصوف نے کانفرنس کے اجلاس میں ایک اہم ریزولیوشن پیش کیا اور ریزولیوشن پیش کرتے وقت بڑی معرکتہ الآرا تقریر کی۔ ہز ہائی نس آغا خاں کا خطبۂ صدارت اس زمانے کے سیاست دانوں کی نظر میں پھیکا نظر آئے۔ مگر ۱۹۰۲ء میں جو قومی پالیسی مسلمانوں کی تھی اُس کی بڑی سچی اور اچھی

تصویر اس ایڈریس میں کھینچی گئی تھی بہت سے والیانِ ملک اور جلیل القدر حکام اور صوبوں کے گورنر مسلمانوں کی ہمت افزائی کے لئے اجلاس میں شریک ہوئے۔ لارڈ کچنر کا اجلاس کانفرنس میں آنا ایک بہت بڑا ہمت افزا واقعہ تھا جس کے تذکرے عرصہ تک علی گڈھ میں ہوتے رہے۔

لارڈ کرزن کا جلوس اور نظام حیدرآباد

لارڈ کرزن کا جلوس مجھے اب تک یاد ہے جامع مسجد کے تین طرف سیڑھیوں پر تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ شمالی دروازہ کی طرف جو سیڑھیاں ہیں میں نے جلوس وہاں سے دیکھا تھا۔ جامع مسجد کے منتظمین نے ٹکٹ فروخت کئے تھے۔ جو ٹکٹ میں نے خرید کیا تھا اوس کی قیمت غالباً ایک روپیہ تھی۔ پہلے ہاتھی پر لارڈ کرزن جیسے شاداں و فرحاں نظر آتے تھے۔ اُس خوشی کا اظہار شاید ڈیوک آف ویلنگٹن (Duke of Wellington) نے واٹرلو کی فتح کے بعد بھی نہ کیا ہو۔ اون کے پیچھے ڈیوک آف کاناٹ کا ہاتھی تھا۔ میر محبوب علی خان بہادر آصف جاہ سادس کی خواصی میں مہاراجہ سر کشن پرشاد تھے۔ نظام مرحوم کے چہرہ سے افسردگی ٹپکتی تھی۔ جلوس جب قلعہ سے روانہ ہوا ہے۔ تو نظام مرحوم نے اپنے چہرے کا رُخ بائیں طرف موڑ رکھا تھا مسجد کے سامنے سے جب جلوس کا گزر ہوا تب بھی چہرے کا یہی رُخ تھا اور میں نے سنا کہ جب جلوس ختم ہوا ہے تب بھی چہرے کا رُخ بائیں جانب تھا۔ نظام مرحوم کی افسردگی بالکل حق بجانب تھی۔ لارڈ کرزن نے برار کے معاملہ میں جس طرح دباؤ ڈال کر اون کی رضامندی (جو درحقیقت نارضامندی تھی) حاصل کی تھی۔ وہ والیانِ ملک کے لئے ہمیشہ سبق آموز رہے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی معاہدے کی صحیح تعبیر دو نا برابر فریقوں کے درمیان نہیں ہوسکتی۔ معاہدوں کی صحیح تعبیر اور رضامندی اور نارضامندی کا سوال اوس صورت ہی میں پیدا ہوسکتا ہے جب دونوں فریق اپنی اپنی تعبیر پر مصر رہنے اور رضامندی دینے یا نہ دینے کا حق رکھتے ہوں۔

اونچا ہاتھ اور نیچا ہاتھ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ انگریزی گورنمنٹ کے تعلقات پر جو والیانِ ریاست سے ہیں تنقید کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ تاہم یہ ظاہر ہے کہ ملک کے موجودہ حالات کے لحاظ سے یہ طے کرنا والیانِ ریاست کا فرض ہے کہ آئندہ اون کی پالیسی کیا ہوگی۔ ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں فیڈریشن کے دستور کے نفاذ پر مسلمانوں کو سخت اعتراض تھا اور یہ اعتراض بالکل بجا تھا۔ مگر میری ناچیز رائے میں فیڈریشن کے دستور کو منظور کرنے میں والیانِ ملک کو پس و پیش نہ کرنا چاہیئے تھا۔ اون کے حقوق کا کافی تحفظ دستورِ مذکور میں موجود تھا۔ آئندہ کا علم عالم الغیب کو ہے مگر بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن حالات میں ۱۹۳۵ء کا ایکٹ پاس ہوا تھا وہ حالات اب دوبارہ جمع نہ ہو سکیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ فیڈریشن کا دستور حیدرآباد جیسے بڑے ملک کے لئے جو رقبہ اور آبادی میں یورپ کی بہت سی حکومتوں سے کم نہیں ہے مناسب و مفید نہ ہو۔ حیدرآباد کی حالت جداگانہ ہے۔ مگر معمولی اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا جن میں رعایا کے حقوق کا کوئی آئینی تحفظ نہیں ہے۔ فیڈریشن کے نام سے کوسوں دور بھاگنا اوسی طرح کی کوتہ اندیشی ہے جس کا ثبوت بعض والیانِ ملک نے ریل اور نہروں کی اپنی ریاستوں میں نکالے جانے کی مخالفت کر کے دیا تھا اور جس پر اوہن والیانِ ملک کے جانشین آج کفِ افسوس ملتے ہیں۔ ملک ہند کی مرکزی گورنمنٹ کا دستور و آئین آئندہ جو کچھ ہو لیکن جب تک دستورِ مذکور کا تعلق صوبوں اور ریاستوں دونوں سے نہ ہو ایک ریاست کی دوسری ریاست سے کشمکش اور صوبوں اور ریاستوں کی باہمی رقابت کا دفعیہ ناممکن ہو جائے گا۔ ملک ہند کا تحفظ۔ خارجی پالیسی۔ ریلوں اور نہروں کا انتظام بدیسی ملکوں سے مال کی درآمد اور برآمد پر محصول کے بارہ میں معاہدے یہ سب مسائل ایسے ہیں جن کا صوبوں اور ریاستوں دونوں سے برابر کا تعلق ہے۔ دونوں کا ایک ہی جہاز میں سفر کرنے کے باوجود کسی ایک کا یہ سمجھنا کہ طوفان یا برف کی اون خوفناک

چٹانوں سے جو سمندر میں بہتی پھرتی ہیں وہ حصہ جہاز محفوظ رہے گا جس میں وہ سفر کر رہے ہیں بڑا غیر تشفی بخش اور افسوس ناک طریقہ استدلال ہے۔

دربار کے مفصل حالات بیان کرنے کا یہ محل نہیں ہے۔ مختصر یہ ہے کہ لارڈ کرزن کے دربار کو ملک ہند میں انگریزی اقبال کی معراج سمجھنا چاہیئے۔ دربار میں ہندوستانیوں کی جو حیثیت تھی اوس کی اکبر الہ آبادی نے جو تصویر کھینچی ہے وہ حقیقت کو ایسی دلفریب صنعت گری سے بے نقاب کرتی ہے کہ بجائے مزید حالات لکھنے کے میں اوس نظم کے چند شعر یہاں نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

از جلوۂ دربار دہلی

اکبر۔ سر میں شوق کا سودا دیکھا ۔۔۔ دہلی کو ہم نے بھی جا دیکھا
جمنا جی کے پاٹ کو دیکھا ۔۔۔ اچھے ستھرے گھاٹ کو دیکھا
سب سے اونچے لاٹ کو دیکھا ۔۔۔ حضرت ڈیوک کناٹ کو دیکھا
پلٹن اور رسالے دیکھے ۔۔۔ گورے دیکھے کالے دیکھے
ایک کا حصہ منّ و سلوےٰ ۔۔۔ ایک کا حصہ تھوڑا حلوےٰ
ایک کا حصہ بھیڑ اور بلوا ۔۔۔ میرا حصّہ دُور کا جلوا
اَوج برٹش راج کا دیکھا ۔۔۔ پُرخ کرزن مہراج کا دیکھا
اَوجِ بخت مُلاقی اون کا ۔۔۔ چرخِ ہفت طباقی اون کا
محفل اون کی ساقی اون کا ۔۔۔ آنکھیں میری باقی اون کا
ہے مشہور کوچہ و برزن ۔۔۔ ہال میں ناچیں لیڈی کرزن
گورقاعۂ اوجِ فلک تھی ۔۔۔ اس میں کہاں یہ نوک پلک تھی
اندر کی محفل کی جھلک تھی ۔۔۔ بزمِ عشرت صبح تلک تھی

دہلی کانفرنس میں انجمن الفرض کی طرف سے چائے کی دوکان کھولنے میں جو توقعات ہم کو تھیں وہ پوری نہ ہوئیں جس کی وجہ زیادہ تر یہ تھی کہ ہماری دوکان بورڈنگ ہاؤس کے احاطے کے اندر تھی۔ اور کانفرنس کا پنڈال احاطے کے باہر تھا۔ دولت مند اور خوش حال مسلمان گاڑیوں میں کانفرنس کے پنڈال تک آتے تھے اور جلسہ ختم ہونے پر باہر باہر واپس چلے جاتے تھے۔ اگر ہماری دوکان پنڈال کے قریب ہوتی تو ہم کو صاحبِ ثروت شرکا کانفرنس کو چائے پلانے اور اوس کے بعد چاندی کے سکوں کا جو بار اون کی جیبوں میں تھا اوس سے اون حضرات کو سبکدوش کرنے میں زیادہ آسانی ہوتی تاہم ہمارا منافع سات سو روپے کے قریب تھا۔

علی گڈھ منتھلی کالج سے جو ماہانہ رسالہ نکلتا تھا اوس کا نام علی گڈھ میگزین تھا سنہ ۱۹ء میں مسٹر ٹیننگ اس رسالہ کے اعزازی ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اور اونھوں نے رسالہ کا نام بجائے کالج میگزین کے علی گڈھ منتھلی رکھا مسٹر ٹیننگ کی فرمائش پر یونین کے ہفتہ وار مباحثوں کی روئداد لکھنا اور علی گڈھ منتھلی میں چھپنے کے لئے بھیجنا میں نے اپنے ذمہ لیا۔ مباحثوں کی روئداد انگریزی میں لکھی جاتی تھی۔ ہماری اوس دور کی زندگی کی جھلک علی گڈھ منتھلی میں بھی موجود تھی۔ یہ رسالہ گنگا جمنی تھا۔ یعنی نصف حصہ انگریزی میں شائع ہوتا تھا اور نصف اردو میں ——— اردو میں بھی بعض اوقات میں مضمون لکھتا تھا۔ ایک مضمون کا تذکرہ شاید بے محل نہ ہو۔ اُردو کا ایک ناول جس کا نام محل خانہ تھا ایڈیٹر نے جو غالباً اوس زمانہ میں خان صاحب میر ولایت حسین تھے میرے پاس ریویو لکھنے کے لئے بھیجا۔ میں نے ریویو[۱] لکھا اور تنہا محل خانہ پر ہی تقریظ نہیں کی بلکہ میرے مضمون میں ناول نویسی پر بھی ایک بسیط تنقید موجود تھی۔ ایڈیٹر نے میرے مضمون کو حسب ذیل نوٹ کے ساتھ شائع کیا تھا۔

---

[۱] دیکھو علی گڈھ منتھلی اکتوبر سنہ ۱۹۰۳ء صفحات ۱۰ لغایت ۳۰

چالیس برس پہلے کی ناول نویسی پر میرا مضمون

"ذیل کے مضمون میں ہمارے محترم دوست سید رضا علی صاحب بی اے نے محل خانہ پر ریویو کرتے ہوئے مروجہ ناول نویسی پر ایک بسیط بحث کی ہے اور بات تو یہ ہے کہ ریویو نویسی کا پوری طرح حق ادا کیا ہے۔ مصنف "محل خانہ" کو اس ریویو کے پڑھنے سے شکستہ خاطر نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ہمارے فاضل ریویورنے اون کے ناول کا نہایت ایمان داری اور حق پسندی کے ساتھ موازنہ کیا ہے۔ مضمون گو ہمارے معمولی مضامین سے کسی قدر طویل ہے۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ اس بحث کا اس سے کم صفحوں میں ختم کرنا بھی نامناسب اور ناممکن تھا۔ گو منتقلی کا معمولی حجم ہمیں مجبور کرتا ہے کہ اس مضمون کو دو حصّوں میں شائع کیا جائے۔ تاہم اس خیال سے کہ ناظرین کی دلچسپی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ ہم پورا مضمون اسی پرچہ میں شائع کرتے ہیں۔ ایڈیٹر"

آج سے چالیس برس پہلے کی لکھی ہوئی کتاب یا ریویو کا تذکرہ کرنا بے سود ہے۔ ریویو کی چند سطریں یہاں نقل کی جاتی ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ اُردو زبان کی پہونچ اور سمیٹ کے بارہ میں ڈگری یافتہ طالب علم کی حیثیت سے میرا کیا خیال تھا۔

"تیسرا نقص جو عام طور سے اردو ناولوں میں پایا جاتا ہے یہ ہے کہ اگر کوئی مصنف محنت و تکلیف گوارا کر کے اپنے کیرکٹروں کے خصوصیات میں کوئی بے لطفی نہ پیدا ہونے دے۔ تاہم وہ تکمیل کو نہیں پہونچتے۔ موزونیت تو بعض اوقات اون میں ہوتی ہے مگر اون کے مطالعہ سے دل بشاش نہیں ہوتا۔ ناظرین کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ قصّہ کے واقعات اون کے سامنے گذر رہے ہیں۔ اور ہر ایک جزوی واقعہ کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ بلکہ قصّہ قصّہ ہی معلوم ہوتا ہے۔ اردو ناولوں میں بہت کم مقامات ایسے ہوتے ہیں جہاں آدمی یہ بھول جائے کہ میں قصّہ پڑھ رہا ہوں اور جو کچھ میری آنکھوں کے سامنے ہے سب فرضی باتیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُردو ناول نویسی

مثل اُردو زبان کے ابھی اپنے گہوارے میں ہے۔ ہمارے مصنفین کو ابھی ناول لکھنے میں وہ مشق و مہارت نہیں ہوئی کہ ناظرین اون کی تصانیف کے مطالعہ میں ایسے منہمک ہوں کہ بالکل از خود فراموش ہو جائیں۔ ہمارے ناولوں کے کیرکٹر اگر موزوں ہوں تو بھی اُکھڑے اُکھڑے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ کن واقعات کی کمی و بیشی سے کیرکٹروں کا پھیکا پن دور ہو سکتا ہے۔ اس معاملہ کا تعلق مذاقِ سلیم سے ہے۔"

سرسید کی پالیسی کانگریس قایم ہونے کے بعد

میرے زمانہ میں علی گڈھ کی خصوصیت یہ تھی کہ گو علمی اور ادبی مذاق کی طرف اساتذہ یا منتظمین کالج کی توجہ نہ تھی تاہم سینکڑوں طلبا کے ایک جگہ رہنے سہنے۔ ملنے جُلنے اور مختلف مضامین پر تبادلۂ خیال کرنے کے باعث طلبا میں ہر چیز اور ہر مسئلہ کو صحیح طور پر جانچنے اور ٹھیک تو ازن کرنے کی وہ صلاحیت پیدا ہو جاتی تھی جس سے دوسرے کالجوں کے طلبا بالعموم ناواقف تھے۔ انگریز اوستادوں کے طلبا سے بے تکلف ملنے جُلنے کا یہ اثر تھا کہ ہمارے معمولی طالب علموں کو بھی انگریزوں کی عادات و خصائل اور انگریزی طرزِ معاشرت سے اچھی خاصی واقفیت ہو جاتی تھی۔ مخالفین علی گڈھ پر یہ الزام عائد کرتے تھے کہ علی گڈھ کے طلبا کی ذہنیت غلامانہ ہوتی ہے اور اون کو انگریزی حکومت کی پرستش کے طور و طریق زمانۂ طالب علمی سے ہی سکھائے جاتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ الزام صحیح نہ تھا۔ سرسید احمد خان مرحوم نے کانگریس کی مخالفت اس وجہ سے کی تھی کہ مسلمان تعداد میں غیر مسلموں سے بہت کم ہیں اگر اہلِ ملک کو حقوق دینے میں نمائندگی کے وہ اصول ہندوستان میں رائج کئے گئے۔ جن کا تجربہ انگلستان میں ہو چکا تھا تو مسلمان کہیں کے نہ رہیں گے۔ سرسید کی سب سے قوی دلیل یہ تھی کہ انگلستان میں وہ

لے یہ مضمون چالیس برس پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ اُردو زبان کی جامعیت اور وسعت کے بارہ میں آج جو میری رائے ہے وہ اوس خیال سے بہت مختلف ہے جس کا اظہار میں نے ۱۹۰۳ء میں کیا تھا۔

اختلافات موجود نہیں ہیں جو تفریق مذہب و نسل۔ رسم و رواج۔ عادات و خصائل۔ تہذیب و شائستگی اور قدیمی روایات کے باعث ہندوستان میں موجود ہیں۔ اگر اصول نمائندگی جو انگلستان میں رائج ہیں ملکِ ہند میں رائج کئے گئے تو مسلمان ہر معاملہ میں غیر مسلموں کے دستِ نگر ہو جائیں گے۔ بالفاظِ دیگر سر سیّد مرحوم جمہوری طرزِ حکومت کو ہندوستان کے لئے ناموزوں اور پُرخطر سمجھتے تھے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ کانگریس سے لگاڑ کے بعد مسلمانوں کے تعلقات گورنمنٹ سے خوش گوار رہیں ۱۸۸۵ء میں کانگریس کے قایم ہونے کے بعد حالات کی صورت یہ تھی کہ گورنمنٹ اور مسلمان دونوں کا فائدہ اس میں تھا کہ ایک دوسرے کا ساتھ دیں۔ حُسنِ اتفاق سے اسباب بھی ایسے مہیا ہو گئے تھے جن کے باعث اس پالیسی کو عملی جامہ پہنانا آسان تھا۔ اسلامی تحریک کا مرکز اوس زمانے میں یو۔ پی کا صوبہ اور اوس صوبہ میں بالخصوص علی گڑھ تھا۔ سر سید احمد خاں کی زبردست شخصیت نے ہر صوبہ کے مسلمانوں کا سیاسی اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ یو۔ پی کے لفٹنٹ گورنر اس زمانے میں سر آکلینڈ کالوِن تھے۔ جن کے خاندان کا ملکِ ہند سے عرصہ دراز تک تعلق رہا تھا۔ کالوِن صاحب سر سید کے خاص احباب میں تھے۔ کالج کے پرنسپل مسٹر بیک تھے۔ جن کو برائے نام تعلیمی معاملات سے اور درحقیقت سیاسی مسائل سے دل چسپی تھی۔ کالوِن صاحب اور بیک صاحب انڈین نیشنل کانگریس کی تحریک کو انگریزی حکومت کے لئے خوف ناک سمجھتے تھے۔ سر سید غدر ۱۸۵۷ء کے ہولناک واقعات بچشم خود دیکھ چکے تھے۔ موصوف کی جوں جوں عمر بڑھتی گئی اُون کا یہ یقین مستحکم ہوتا گیا کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود انگریزی حکومت کے قیام کے ساتھ وابستہ ہے۔ مثل مشہور ہے کہ ڈوبتا ہوا آدمی تنکے کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ سر سید کا خیال تھا کہ اگر مسلمان گورنمنٹ کے وفادار رہیں اور گورنمنٹ مسلمانوں کے ساتھ بھلائی کرے تو کانگریس کے لمبے چوڑے دعووں کو نہ کبھی ملک میں قبولیت حاصل ہو گی نہ انگلستان کے باشندے کانگریس کو

کبھی ملک کا صحیح نمائندہ سمجھیں گے مسٹر بیک بڑی سلجھی ہوئی طبیعت کے آدمی تھے۔ موصوف نے موقعہ سے فائدہ اُٹھا کر سر سید کی دور اندیشی اور سیاسی دانش مندی کے دن رات طار گا کر سر سیّد کی طبیعت میں ایسا دخل حاصل کر لیا کہ مرنے سے چند سال پہلے علی گڈھ کا واجب الاحترام سیاسی مقتدیٰ اہم پولٹیکل معاملات میں جس رائے کا اظہار کرتا تھا وہ آواز تو بے شک اوس مقتدیٰ کی ہوتی تھی مگر خیالات تقریباً تمام تر مسٹر بیک کے ہوتے تھے۔
یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اس پالیسی سے مسلمانوں کو فائدہ نہیں پہونچا۔ ہر زمانے کی سیاسی پالیسی اوس دور کے حالات کے ماتحت منضبط ہوتی ہے۔ پچاس پچپن برس پہلے کے حالات کو سنہ ۱۹۴۲ء کی عینک سے دیکھنا کسی طرح روا نہیں ہو سکتا۔ اوس زمانے کے مسلمان اور غیر مسلمان دونوں گروہ گورنمنٹ کے وفادار تھے۔ حکومت خود اختیاری یا آزادی کا تخیل ابھی ملک میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا مسلمانوں پر غلامانہ ذہنیت کی طعنہ زنی اون لوگوں کی خشت باری کی مترادف تھی جو خود شیشہ کے مکانوں میں رہتے ہوں۔

دو نئی انجمنیں۔ سر تھیوڈر اور لیڈی مارسین سے میرے تعلقات

بی۔ اے پاس کرنے کے بعد میرا مقصد یہ تھا کہ علی گڈھ کی سرگرمیوں کی زندگی سے کنارا کش ہو کر ایل۔ ایل۔ بی کے امتحان کی تیاری کروں۔ اور امتحان پاس کرنے کے بعد سوائے وکالت کے کسی اور بات سے سروکار نہ رکھوں۔ مگر افسوس ہے کہ یہ ارادہ ایسا ہی ناقابلِ عمل رہا جیسا ہر مسلمان کا وہ قصدِ حج بیت اللہ رہتا ہے جس قصد کے اندر استقلال نہ ہو۔ سنہ ۱۹۰۳ء میں سر تھیوڈر مارسین اور لیڈی مارسین سے وہ تعلقات ہو گئے جو اگلے وقتوں میں شفیق معلم اور عقیدت مند متعلم کے درمیان ہوتے تھے۔ لیڈی مارسین نے چند طلبا کو انگریزی میں ستھرے مذاق کی خطوط نویسی (Polite letter writing) سکھانے کے لئے ایک درجہ کھولا۔ سجاد حیدر۔ ابو محمد اعجاز علی محمد ظریف مرحوم۔ اور میں۔ فنِ خطوط نویسی میں لیڈی صاحبہ موصوفہ سے درس لیتے تھے۔

طریقہ تعلیم یہ تھا کہ ہفتہ میں ایک دن ہم سب لیڈی صاحبہ کے بنگلہ پر جمع ہوتے تھے۔ وہ پہلے سے ہم کو بتا دیتی تھیں کہ کس مضمون پر ہم کو خط لکھنا ہے اور کس کی طرف سے اور کس کے نام لکھنا ہے۔ کاپی میں خط لکھ کر ہم سب تاریخ معینہ سے ایک دو روز پہلے لیڈی صاحبہ کو بھیج دیتے تھے اور وہ بڑی توجّہ اور غور سے اصلاح دیتی تھیں۔ تاریخ معینہ پر ہم سب جاتے تھے اور ہر ایک کا لکھا ہوا خط پڑھ کر وہ سناتی تھیں اور جو اصلاح دیتی تھیں اُس کے وجوہ خط لکھنے والے کو سمجھاتی تھیں۔ میرے لکھے ہوئے خطوں کی کئی کاپیاں جن میں لیڈی ماریسن کے ہاتھ کی اصلاح سُرخ پنسل کی لکھی ہوئی ہے اب تک میرے پاس موجود ہیں میرے لکھے ہوئے خطوط پر لیڈی صاحبہ کو اکثر یہ اعتراض ہوتا تھا کہ اُن میں وہ خلق و انکسار موجود نہیں ہے جو شُستہ مذاق کے آدمی کی تحریر میں ہونا چاہیئے۔ بدقسمتی سے مجھے اپنی جگہ یہ بدگمانی تھی کہ لیڈی صاحبہ بجائے نستعلیق اور شائستہ خطوط نویسی کے ہم کو یہ تعلیم دے رہی ہیں کہ ہندوستانی جب انگریز کو خط لکھے تو اُسے کیا طرزِ ادا اختیار کرنی چاہیئے۔ اس بدگمانی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ موصوفہ کے مزاج کی رفتار شاہانہ واقع ہوئی تھی یعنی تو وہ پرنسپل کی بیوی۔ مگر چاہتی یہ تھیں کہ طلبا اون کے ساتھ وہی برتاؤ کریں جو اوس زمانے کے رئیس۔ کلکٹر و مجسٹریٹ ضلع کی میم کے ساتھ کرتے تھے۔

لطیفہ ایک قصّہ قابلِ تذکرہ ہے جس سے موصوفہ کے مزاج کا صحیح اندازہ غالباً ہو سکے گا ظہور دارڈ میں اوس زمانے میں اسکول کے چھوٹی عمر کے طالب علم رہتے تھے۔ مولوی سلیم صاحب ان بچّوں کو قرآن شریف پڑھانے اور نماز سکھاتے تھے۔ معمولی فقہی مسائل کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ ۱۹۰۳ء میں سر تھیوڈر ماریسن نے رخصت لی۔ اور مع لیڈی ماریسن کے ولایت گئے۔ میری خطوط نویسی کے بارے میں لیڈی صاحبہ کی رائے جو کچھ بھی تو مگر قرینہ یہ ہے کہ کالج والوں کی رائے میری خطوط نویسی کے بارے میں بُری نہ تھی۔ مولوی سلیم ایک دن میرے پاس آئے اور کہنے لگے۔ لیڈی ماریسن ولایت گئی ہیں۔ میرے حال

پر بڑا کرم فرماتی ہیں ۔ میں اُنھیں خط بھیجنا چاہتا ہوں میری طرف سے لیڈی صاحبہ کے نام ایک خط کا مسودہ کر دیجئے ۔ میں کسی سے صاف کرا کے بھیج دوں گا ۔ میں نے حسبِ فرمائش خط کا مسودہ تیار کیا اور خوشامد اور چاپلوسی کے وہ تمام الفاظ جو اوس وقت میرے ذہن میں آئے خط میں بے دریغ لکھ دیئے ۔ نومبر کے مہینہ میں پرنسپل صاحب اور لیڈی مارلین کی واپسی پر خطوط نویسی کے درجہ کا کام پھر شروع ہوا ۔ لیڈی صاحبہ مجھ سے فرمانے لگیں رضا علی تم انگریزی تو ٹھیک لکھتے ہو مگر ابھی تک تمہارے خطوط میں خلق کی وہ لچک نہیں آئی جو پڑھنے والے کو متاثر کر سکے ۔ اس دفعہ جب میں ولایت میں تھی تو مولوی سلیم نے مجھے ایک خط بھیجا تھا ۔ اگر خط مل گیا تو میں تم کو دکھاؤں گی ۔ اس خط سے تم کو معلوم ہو جائے گا کہ شستہ اور شگفتہ خطوط نویسی کیسی ہوتی ہے ۔ میں نے بمشکل ہنسی کو ضبط کر کے عرض کیا کہ ہاں اگر براہِ کرم وہ خط آپ مجھے دکھا دیں تو میں اوس سے استفادہ حاصل کروں ۔

اوسی زمانے میں سر تھیوڈر مارلین نے بھی ایک انجمن بنائی تھی جس کے صرف دو قواعد قابلِ تذکرہ ہیں ۔ پہلا قاعدہ یہ تھا کہ انجمن کا کوئی نام نہ تھا ۔ دوسرا قاعدہ یہ تھا کہ انجمن کا کوئی قاعدہ اور ضابطہ نہ تھا ۔ اس انجمن کے ممبر کم و بیش وہی تھے جو لیڈی مارلین سے شستہ خطوط نویسی سیکھتے تھے ۔ خاں صاحب میر ولایت حسین اور سید جلال الدین حیدر بھی کبھی کبھی اِس انجمن کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے ۔ انجمن کا اجلاس ہفتہ میں ایک مرتبہ شب کے نو بجے منعقد ہوتا تھا ۔ باری باری انجمن کا ہر ایک ممبر کسی مبحث پر جو سر تھیوڈر مارلین پہلے سے تجویز کر دیتے تھے مضمون لکھتا تھا ۔ جلسہ میں مضمون پڑھا جاتا تھا اور اوس کے بعد بحث ہوتی تھی ۔

لیڈی مارلین کے خطوط نویسی کے درجہ اور بے نام کی انجمن کی ممبری سے مجھے بہت فائدہ ہوا ۔ سر تھیوڈر مارلین اور لیڈی مارلین آج دنیا میں نہیں ہیں ۔ مگر اون دونوں نے جو احسانات مجھ پر کئے اون کا تذکرہ کرنا اور عقیدت کے پھول اون دونوں کی قبروں

پر چڑھانا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ سر تھیوڈر مارسین اپنے شاگردوں کا خیال عام طور پر اور چہیتے طالب علموں کا خیال خاص طور پر رکھتے تھے۔ اوس زمانے میں جو جلیل القدر انگریز انگلستان سے ہندوستان کا دورہ کرنے آتے تھے اون کے دورہ میں عام طور پر علی گڈھ بھی شامل ہوتا تھا۔ بسا اوقات وہ سر تھیوڈر مارسین کے مہمان ہوتے تھے۔ اور مارسین صاحب اون سے مجھے ملاتے تھے۔ کبھی کبھی اون کے ساتھ چائے پینے کے لئے بھی بُلالیتے تھے۔ پارلیمنٹ کے کئی ممبروں سے اوستادِ شفیق نے اپنے گھر پر میری ملاقات کرائی۔ سر مائکل ہکس بیچ (Sir Michael Hicks Beach) جو بعد میں (Lord St Aldwyn) ہوئے۔ لارڈ سالسبری وزیر اعظم انگلستان کے کابینہ (کیبنٹ) میں چانسلر آف دی اکسچیکر (وزیر مالیات) تھے جب ۱۹۰۳ء میں علی گڈھ آئے تو مارسین صاحب نے اون سے میری ملاقات کرائی۔ میں اقتصادیات میں ایم۔ اے کا طالب علم تھا اور حالات کے علاوہ سر مائیکل نے مجھ سے دریافت کیا کہ ایم۔ اے کے درسِ اقتصادیات میں کون کون کتابیں شامل ہیں اور جب میں نے نام بتائے تو سابق وزیر نے مارسین صاحب سے کہا کہ یہ مصنفین تو کم و بیش کہنہ ہو گئے ہیں۔ زمانہ حال کے مصنفوں کی کتابیں کیوں نہیں پڑھائی جاتیں۔ مارسین صاحب نے جواب دیا کہ درسی کتابیں الہ آباد یونیورسٹی مقرر کرتی ہے۔ جب مسلمانوں کی اپنی یونیورسٹی ہو جائے گی تو اونھیں اختیار ہوگا کہ کہ درس کے لئے جو کتابیں چاہیں مقرر کریں۔

محسن الملک کو مفتی عبدہ پر فوقیت

سر ڈینی سن راس (Sir Denison Ross) اس زمانے میں کلکتہ مدرسہ کے پرنسپل تھے اون سے بھی مارسین صاحب نے میری ملاقات کرائی تھی۔ سر ڈینی سن راس عربی کے بڑے عالم سمجھے جاتے تھے اور تمام ممالک اسلامی کا سفر کر چکے تھے جس میں ترکستان بھی شامل تھا۔ دورانِ گفتگو میں مارسین صاحب نے دریافت کیا آپ تمام اسلامی ممالک

سے واقف ہیں۔ آپ کے نزدیک آج اسلامی دنیا میں تہذیب و شائستگی (مسلم کلچر) کا سب سے بہتر نمونہ کون ہے۔ راس صاحب نے تھوڑے تامل کے بعد جواب دیا "محسن الملک"۔ مارلین صاحب نے دریافت کیا۔ کیا تہذیب و شائستگی میں آپ محسن الملک کا درجہ مفتی عبدہٗ سے بالاتر سمجھتے ہیں راس صاحب نے کہا میرے نزدیک محسن الملک آج اسلامی دنیا کے سب سے بڑے مقرر ہیں اور عام کلچر میں بھی مفتی عبدہٗ سے بالاتر ہیں۔

سنہ ۱۹۰۴ء کے شروع میں مارلین صاحب گورنر جنرل کی لیجسلیٹو کونسل کے جس کا نام اوس زمانے میں امپیریل لیجسلیٹو کونسل تھا ایڈیشنل ممبر مقرر ہوئے۔ تعلیمی کمیشن کی رپورٹ آنے کے بعد۔ لارڈ کرزن نے یہ طے کیا کہ یونیورسٹیوں کے اختیارات کو وسعت دینے کے لیے نئے بل کا پاس ہونا ضروری ہے۔ مارلین صاحب معہ لیڈی مارلین کے گرمیوں کی تعطیل میں شملہ جایا کرتے تھے۔ اور لارڈ کرزن اون سے واقف تھے۔ یونیورسٹی بل کے زبردست مخالف مسٹر گوکھلے تھے۔ جنھوں نے مختلف ملکی مسائل پر لارڈ کرزن کی مخالفت میں بڑی ہمت و جرأت سے کام لیا تھا۔ مارلین صاحب کونسل کے ایڈیشنل ممبر اس لیے مقرر کیے گئے تاکہ ماہر تعلیم ہونے کی حیثیت سے گورنمنٹ کے مخالفوں کے اعتراضات کا جواب کونسل میں دے سکیں۔ اس تقرر سے ہم طلبا کو ایسی خوشی ہوئی تھی جیسی کسی ہم درد۔ آزاد رائے اور قابل مسلمان کے تقرر سے ہوتی۔ کلکتہ جانے سے پہلے مارلین صاحب سے اور مجھ سے چند مرتبہ یونیورسٹی بل کے بارے میں گفتگو ہوئی اور موصوف نے مجھ سے فرمایا کہ مسائل حاضرہ دنیز یونیورسٹی بل پر اپنے خیالات سے وقتاً فوقتاً خط کے ذریعہ سے اون کو مطلع کرتا رہوں۔ میرے اور موصوف کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی وہ میرے پاس محفوظ ہے۔ مگر اوس کا تفصیلی تذکرہ طوالت سے خالی نہ ہوگا۔

یونین میں عربی تعلیم کی تجدید کے مسئلہ پر پُرجوش مباحثہ | علی گڈھ کالج کی دُنیا بھی ایک

چھوٹی سی ہندوستانی ریاست تھی جس میں ریاستوں کے سے توڑ جوڑ چلتے تھے۔ اور توڑ جوڑ
کرنے والوں کو لبا اوقات کامیابی ہوتی تھی۔ خدا بھلا کرے ایک طالب علم کا۔ بندۂ خدا
نے آؤ دیکھا نہ تاؤ یونین کے ہفتہ وار مباحثہ کے لئے ایک تجویز پیش کر دی۔ کہ یونین کی رائے
میں بڑا سرمایہ جمع کرنا اور اوس سرمایہ کی آمدنی کو علی گڈھ کالج میں عربی زبان و علوم کی
تجدید پر صرف کرنا مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے ازبس ضروری ہے۔ فروری سنہ ۱۹۰۶ء
میں اس مضمون پر یونین میں بڑے زور کا مباحثہ ہوا۔ میں نے اس تجویز کی سخت مخالفت
کی اور بتایا کہ اس تجویز کا تعلق سراسر مسلمانوں سے ہے۔ تاہم یہ عجیب و غریب بات ہے کہ
اس تجویز کے اختراع کرنے والے اسے آگے بڑھانے والے اور مسلمانوں کو اس کی طرف
متوجہ کرنے والے سب کے سب انگریز ہیں۔ اگر اس تجویز کو یونین نے پاس کر دیا تو انگریزی
زبان اور یورپین علوم و فنون کا تعلیمی مرکز ہونے کی بجائے علی گڈھ اپنا درجہ گھٹا کر اپنے
کو دیوبند۔ لکھنؤ اور سہارنپور کا حریف بنائے گا۔ عربی کی تعلیم جن جن مدارس میں ہو رہی
ہے وہ ہماری ضروریات پورا کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اگر مقامات مذکورۂ بالا کے عربی مدارس
کو روپیہ کی ضرورت ہو تو روپیہ سے اون مدارس کی امداد کرنا بے شک قوم کا فرض ہے۔
مگر آج دنیا[1] میں جو کچھ ہو رہا ہے اوس کو دیکھتے ہوئے علی گڈھ کالج کو عربی تعلیم کا مرکز بنانا
اور مسلمانوں کی گاڑھی کمائی کا روپیہ اس مقصد پر علی گڈھ میں خرچ کرنا قوم کو حج بیت اللہ
کرانے کے لئے ترکستان لے جانے کی برابر ہے۔ مذہب کی سچی خدمت یہ ہے کہ مسلمانوں
کی مالی حالت کو بہتر بنایا جائے۔ زمانہ نے ایسا پلٹا کھایا ہے کہ جو لوگ عبا در بر و عمامہ برسر

[1] جاپان اور روس میں اوس زمانے میں لڑائی ہو رہی تھی۔ اور بیسویں صدی کی سائنس اور آلات
حرب سے آراستہ اور مسلح ہونے کے باعث مستعد اور روشن خیال جاپان دقیانوسی زار اور قدامت پسند
روسی افواج کو خشکی اور تری میں شکست پر شکست دے رہا تھا۔ گو تاوان جنگ نہ ملا مگر اوس لڑائی میں جاپان
کو بڑی نمایاں فتح حاصل ہوئی۔

ہوں وہ بدقسمتی سے اسلام کی سچی خدمت نہیں کرسکتے۔ اسلام کی خدمت اگر کرسکتے ہیں تو وہی مسلمان کرسکتے ہیں جو مغربی علوم وفنون میں ید طولیٰ رکھتے ہوں۔ بقول مولوی نذیر احمد شعر

انھیں بندوں کے ہیں ایمان سچے یہی کافر ہیں مسلمان سچے

میں نے تقریر کی اور تالیوں کی بار بار گونج سے معلوم ہوتا تھا کہ میری تقریر حاضرین کو پسند آئی۔ معاملہ اتنا صاف تھا کہ بحث و دلائل کی زیادہ ضرورت نہ تھی۔ مجھے جلسہ کی توجہ صرف اس طرف دلانی تھی کہ دو اور دو چار اور ہمیشہ چار ہوتے ہیں۔ تجویز کے محرک اور اون کے ہم خیال حضرات کو یہ ثابت کرنا تھا کہ دو اور دو کا مجموعہ کبھی تین ہوتا ہے اور کبھی پانچ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بڑی زبردست کثرت رائے سے تجدید عربی کی تحریک کو جلسہ نے نامنظور کر دیا۔ میں سمجھتا تھا کہ یونین کے جلسہ کے ہاتھوں اس تجویز کی تجہیز و تکفین و تدفین ہوگئی۔ مگر میرا خیال غلط نکلا۔ یونین کے مباحثہ کا حال معلوم ہونے کے بعد سر تھیوڈر ماریسن نے مجھے ۱۳ مارچ ۱۹۰۸ء کو کلکتہ سے حسب ذیل خط لکھا جس کے الفاظ باوجود موصوف کے خوش مزاج و خوش خلق ہونے کے اون کی ناراضگی اور برہمی پر پردہ نہ ڈال سکے۔

ماریسن صاحب کا خط "تم سب علی گڈھ کے نوجوانوں نے جو انگریزی کے دیوانے ہو مجوزہ یونیورسٹی کو بڑا نقصان پہونچایا ہے۔ آغا خاں[1] اور بنگال کے تمام لوگوں نے علی گڈھ کے خلاف علم بغاوت بلند کر رکھا ہے اور کہتے ہیں کہ اگر مسلم یونیورسٹی کے یہی طور و طریق ہوں گے تو وہ یونیورسٹی سے باز آئے۔ وہ کوئی دوسرا امر کز ایسا چھانٹنا چاہتے ہیں جو اسلامی جذبات کی زیادہ صحیح طور پر نمائندگی کرسکے علی گڈھ کے دشمن جن میں سے ایک ——— ہیں بغلیں بجا رہے ہیں تم سب کی سرگرمیوں سے جو زہریلی فضا یہاں پیدا ہوگئی ہے اوس کے دور کرنے میں عرصہ لگے گا۔"

---

[1] ہز ہائی نس آغا خاں کی دھمکی کا ذکر مولوی محمد امین زبیری نے اپنی کتاب تذکرۂ محسن میں کیا ہے۔ دیکھو تذکرۂ محسن صفحہ ۱۱۱ مطبوعہ ۱۹۳۵ء۔

مارلین صاحب مسلمانوں کے سچے دوست تھے اور اون کی رائے قابلِ احترام ہے مگر یہ بات ماننا بڑا دشوار ہے کہ وہ مسلمانوں کی ضروریات کو خود مسلمانوں سے بہتر سمجھتے تھے

انگریزا خباروں کا عربی تعلیم کی تجدید پر زور دینا

سرڈینی سن راس عربی تعلیم کے بڑے دل دادہ تھے ۱۹۰۳ء کے آخر میں موصوف اور اون کے ہم خیال بعض انگریزوں نے بیٹھے بٹھائے یہ منصوبہ باندھا کہ علی گڈھ کالج مسلمانوں کا تعلیمی مرکز ہے۔ وہاں عربی کی تعلیم کا خاص انتظام کیا جائے۔ عربی زبان اور علوم کی تجدید کے لئے ایک بڑا سرمایہ قایم کیا جائے اور بجائے فزیکس کیمسٹری۔ اعلیٰ ریاضی۔ اقتصادیات۔ فلسفے اور دیگر اہم مضامین کے جو اوس زمانے کی یونیورسٹیوں کی نگرانی کے ماتحت بڑے بڑے کالجوں میں پڑھائے جاتے تھے۔ زیادہ زور عربی زبان اور اون علوم کی تحصیل پر دیا جائے جن کا ذخیرہ عربی میں موجود ہے۔ ۱۹۰۳ء کے آخر میں جب راس صاحب علی گڈھ آئے تھے تو غالبًا مارلین صاحب کے اشارے سے اس مسئلہ پر اونھوں نے میری رائے معلوم کی تھی۔ مارلین صاحب بھی دورانِ گفتگو میں موجود تھے۔ میں نے دونوں صاحبوں کو صاف اور صریح طور پر بتا دیا تھا کہ مسلمانوں کی سب سے اہم ضرورت اِس وقت یہ ہے کہ اون کی مالی اور اقتصادی حالت کو بہتر بنایا جائے۔ یہ غرض نہ عربی زبان کی تحصیل سے پوری ہوتی ہے نہ اون علوم کی تجدید سے جو عربی میں موجود ہیں۔ میں نے یہ بھی ظاہر کر دیا تھا کہ وہ اعلیٰ تعلیم جس کو انگریزی میں دماغ کو روشن کر دینے والی تعلیم یعنی لیبرل ایجوکیشن کہتے ہیں مسلمانوں کے لئے نہ صرف غیر مفید بلکہ مضر ہے۔ جس چیز کی مسلمانوں کو ضرورت ہے وہ ایسی اعلیٰ تعلیم ہے جس کے ذریعہ سے مسلمانوں کو یورپ کے علوم وفنون سے پوری واقفیت اور آگاہی ہو جائے تاکہ زندگی کی دوڑ میں وہ ہندوستان کی اور قوموں سے پیچھے نہ رہیں۔ میری رائے اوس وقت بھی یہی تھی اور آج بھی یہی ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم جس کو حاصل کرنے کے بعد نوجوان

میں اتنی اہلیت بھی نہ پیدا ہو کہ اپنا اور اپنی بیوی بچوں یا ماں باپ کا پیٹ پال سکے بڑی ناقص تعلیم ہے، جس سے مسلمانوں کو کوسوں دور رہنا چاہیئے، میرے بلا کم و کاست اظہار خیال سے نہ مارسین صاحب خوش ہوئے، نہ راس صاحب، شروع ۱۹۰۸ء میں امپیریل کونسل کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے مارسین صاحب کلکتہ گئے، موصوف نے کلکتہ سے مجھے لکھا کہ اخبار اسٹیٹسمین میں کچھ مضامین اعلیٰ عربی کی تعلیم تجدید پر نکلے ہیں، اسٹیٹسمین نے اپنے افتتاحیہ مضمون میں اون مضامین کی زبردست تائید کی ہے، تم اس معاملہ میں مستقل رائے رکھتے ہو، مناسب ہے کہ تم بھی اس بحث میں حصہ لو، موصوف نے اسٹیٹسمین کا افتتاحیہ مضمون بھی میرے پاس بھیج دیا تھا، میں اوس زمانہ میں ایل، ایل۔ بی کے امتحان کی تیاری میں مشغول تھا، اور قصد یہ تھا کہ کالج کی زندگی کی جو اور سرگرمیاں ہیں اون میں شرکت سے باز رہوں شفیق او ستاد کی فرمائش کو ٹالنا زیادہ دشوار نہ تھا، مگر عربی کی تجدید کے لئے جو کوششیں بڑے پیمانہ پر ہو رہی تھیں اون سے مجھے یقین ہو گیا کہ جس راستہ پر ڈاکٹر لیٹنر (Leitner) ۱۸۸۰ء میں پنجاب والوں کو چلانا چاہتے تھے اوسی ڈھرے پر مسلمانوں کے بعض نام نہاد انگریز بہی خواہ علی گڈھ کو ڈالنا چاہتے ہیں، میری ناچیز رائے میں یہ بڑا سخت خطرہ تھا، جس سے قوم کو آگاہ کر دینا اون افراد قوم کا نہایت اہم فرض تھا، جو آنے والے خطرات کی نوعیت اور وسعت سے واقف تھے، خدا کا نام لے کر میں نے مضمون لکھنا شروع کیا، مضمون کا عنوان تھا "عربی تعلیم کا احیاء" اور ۲۶ جنوری ۱۹۰۸ء کے اسٹیٹسمین میں شائع ہوا تھا، مضمون کے بعض حصوں کا ترجمہ ذیل میں درج ہے۔

اسٹیٹسمین اخبار میں میرا مضمون

"جذبات اور دلائل کا بسا اوقات تصادم ہوتا ہے مگر ان دونوں کا تخالف جیسا اس مسئلہ میں ہے مشکل سے کسی اور مسئلہ میں ہوگا، قرطبہ اور بغداد کے کارناموں کی یاد مسلمانوں کو ایسی عزیز ہے جیسا کہ ایک توہم پرست عورت اپنے تعویذ کو کلیجہ سے لگاتی ہے، سچ تو یہ ہے کہ

مسلمانوں کے اس ولولہ سے ہمدردی نہ کرنا سخت مشکل ہے، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ کھلے ہوئے واقعات کے وجود سے انکار کرنا اور بھی بڑی نادانی ہے، جو تجویز اس وقت پیش ہے اوس کی صورت بظاہر بڑی دل فریب معلوم ہوتی ہے، عربی علوم کا احیا، عربی علوم کی تجدید کیسی دل خوش کرنے والی باتیں ہیں، الفاظ تو بہت شاندار ہیں، لیکن ہم کو واقعات سے روگردانی نہ کرنا چاہیئے، ہماری قوم بڑی قوم ہے، اوس کی ضرورتیں مختلف اور تعداد میں کثیر ہیں اور وہ سب کی سب مساوی اہمیت نہیں رکھتیں، تعلیم کا لفظ نہایت وسیع ہے، سوال یہ ہے کہ ہماری قوم کس طرح تعلیم چاہتی ہے، میرے نزدیک ہم کو سب سے زیادہ ضرورت ایسی تعلیم کی ہے جو دنیا کے کاروبار میں مفید ثابت ہو، اور جو آئندہ نسلوں کو روٹی کمانے میں مدد دے سکے، بدقسمتی سے ہماری قوم اس وقت افلاس، جہالت اور توہمات کے گڑھے میں پڑی ہوئی ہے، اور ہم نے پکا ارادہ کرلیا ہے کہ ہم اوس کو گڑھے سے نکال کر اوس بلندی پر لے آئیں گے جس پر آج ہندوستان کی غیر مسلم جماعتیں پہونچ گئی ہیں، یہ ہمارا واحد مقصد ہے اور ہم نے اپنے آپ کو اس مقصد کے لئے وقف کردیا ہے، لہذا ہم ہر اوس چیز کا خیر مقدم کریں گے جو ہمیں اس مقصد تک پہنچائے، اور ہم ہر اوس بات کو سختی سے قابل اعتراض سمجھتے ہیں جو اس مقصد کے حاصل کرنے میں سدِ راہ ہو، ہمیں پوری طرح یقین ہے کہ وہ دوا جس کا نام عربی علوم کا احیا ہے، ہمارے افلاس اور جہالت کے مرکب مرض کو دور نہیں کرسکتی۔

اب تو یہ فیشن ہوگیا ہے کہ ہندوستانیوں پر یہ الزام لگایا جائے کہ وہ علم کو علم سمجھ کر حاصل نہیں کرتے، میں صاف کہتا ہوں کہ میرے نزدیک یہ الزام غلط ہے، مگر تھوڑی دیر کے لئے مان لیجئے کہ یہ الزام صحیح ہو تو اس میں کون بات قابل ملامت ہے، کیا آج دنیا میں کوئی قوم ایسی موجود ہے، جس نے حالاتِ گردوپیش سے علیحدہ رہ کر علم کو علم کے لئے حاصل کیا ہو، کیا آج یورپ میں کوئی قوم ایسی ہے جس نے استحصال علم محض دماغ کو جلا دینے

کے لئے کیا ہو۔ آج جرمنی، فرانس اور انگلستان میں ایشیائی زبانوں اور علوم کے ماہر موجود ہیں، مگر اون کے استحصال علم کی وجہ محض علم کی محبت نہیں ہے، بلکہ وہ خوش حالی اور دولت مندی ہے جو آج اون ملکوں کو حاصل ہے، اگر ایسا نہیں ہے تو اس کی کیا وجہ ہے کہ اسپین اور پرتگال کی طرح یورپ کے دوسرے ممالک جو خوش حالی اور مادی ترقی کی دوڑ میں انگلستان اور جرمنی سے پیچھے رہ گئے، پامر، میور، رائٹ اور میکس میولر علوم مشرقیہ کے جیسے عالم نہ پیدا کر سکے، دور کیوں جایئے خود ایشیا پر نظر ڈالئے، جب ہم تھے یعنی مسلمانوں کا شمار دنیا کی بڑی قوموں میں تھا تو کلچر ہماری لونڈی تھی، یورپ کے عظیم الشان کتب خانے آج بھی خاموشی سے اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ ہمارے بزرگوں نے علم کو محض علم کے لئے نہ صرف حاصل کیا بلکہ انسانی علم کی حدود کو بڑھا کر کہاں سے کہاں پہنچا دیا، مگر یہ حالت اوسی وقت تک قائم رہی جب تک اسلامی حکومتوں کا غلبہ رہا، جیسے ہی اسلامی حکومتوں کو اور قوموں نے نیچے گھسیٹا کلچر نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا، ان تمام باتوں سے ہم کو سبق عبرت حاصل کرنا چاہیئے اور یہ کبھی نہ بھولنا چاہیئے کہ کلچر دولت مندی، خوش حالی اور حکمرانی کی کنیز ہے۔

کلکتہ مدرسہ اور اورینٹل اسکول

عربی تعلیم کو پھیلا کر ہماری قوم میں نئی روح پھونکنے کا نظریہ نیا نہیں ہے، بلکہ یہ اوتنا ہی پرانا ہے جتنی اس ملک میں خود برطانوی حکومت ہے، کلکتہ مدرسہ اور لاہور کے اورینٹل اسکول کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ مان لیجئے کہ عربی کی اعلیٰ قابلیت رکھنے کے ساتھ ہمارے نوجوانوں کو انگریزی زبان سے بھی معمولی واقفیت حاصل ہو تو ہمارے نوجوان اس زمانہ کی دوڑ میں اون غیر مسلم نوجوانوں کا مقابلہ کس طرح کر سکتے ہیں، جنھوں نے اعلیٰ درجہ کی انگریزی تعلیم حاصل کی ہو۔ کاشغر، اور سمرقند، خیوا اور بخارا میں علوم مشرقی کے جید عالم آج بھی موجود ہیں، لیکن انھوں نے اپنی قوم کو اپنے علم سے کیا فائدہ پہنچایا، اور قوم کی مادی حالت کو کیا ترقی دی۔ میں صاف صاف کہتا ہوں کہ ہمیں علوم مشرقیہ

کے عالموں کی آج ضرورت نہیں ہے، بلکہ ایسے تعلیم یافتہ لوگوں کی ضرورت ہے جن میں
قوتِ عمل موجود ہو اور جو اپنے علم کے ذریعہ سے قوم کی مادی حالت بہتر بنا سکیں۔ آج ہم
اوس ملک میں نہیں رہتے جہاں ہارون الرشید اور مامون الرشید حکمراں تھے، یا جس ملک
کو دجلہ و فرات سیراب کرتے تھے، ہم تو اوس ملک میں رہتے ہیں جہاں گنگا اور جمنا بہتی
ہیں اور جہاں برطانوی حکومت برسرِ اقتدار ہے، ہمارے نزدیک جو شخص تیس یا چالیس
مسلمان لڑکوں کو ایک اعلی درجہ کے کالج میں اپنے خرچ سے تعلیم دلا سکے وہ قوم کا صحیح
معنی میں محسن ہے، اور ہماری نظر میں اوس کا رتبہ اوس آدمی سے کہیں زیادہ ہے جس کی
علوم مشرقیہ کے زبردست عالم ہونے کے باعث یورپ میں شہرت ہو۔ مسئلہ احیار تعلیم عربی
کے بارے میں ہمارا رویہ صاف اور کھلا ہوا ہے، ہم عربی تعلیم کے مخالف نہیں ہیں نہ
مخالف ہو سکتے ہیں، البتہ یہ ہم کو صاف نظر آرہا ہے کہ تعلیم کی اور بہت سی مفید شاخیں
ہیں جن کی ضرورت عربی تعلیم کی اہمیت سے کہیں زیادہ ہے، گذشتہ چند سال میں بہت
سے اسلامی کالج اور مدرسے قائم ہوئے ہیں، مگر ہر طرف سے یہی صدا آرہی ہے، کہ
پروفیسروں اور استادوں کی تعداد ناکافی ہے۔ آپ لاہور جایئے یا کراچی، کلکتہ کی
درس گاہوں کو دیکھیئے یا رنگون کی، بمبئی کے کالجوں کا معائنہ کیجئے یا مدراس کے کالجوں
کا، بلکہ خود علی گڑھ کالج آکر یہاں کی حالت اپنی آنکھ سے دیکھیئے تو آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ
ہر جگہ یہ ضرورت ہے کہ درس کے اختیاری مضامین کی تعداد بڑھائی جائے، اور درس
دینے کے لیئے اور زیادہ پروفیسر اور استاد مقرر کیئے جائیں، اب اگر اختیاری مضامین
کی تعداد میں اضافہ نہ کیا گیا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر اسلامی کالج میں عربی تعلیم
لازمی ہو جائے گی، اور تعلیم کے میدان میں ہم دوسری قوموں سے پیچھے رہ جائیں گے
یہ ایسا خطرہ ہے جس سے بچنے کے لیئے ہمیں سائنس اور دیگر ضروری مضامین کی تعلیم
کے لیئے کافی سرمایہ جمع کرنا چاہیئے، یہ بھی ملحوظ رہے کہ انجینیری، ڈاکٹری اور دیگر فنون

کے کالجوں میں مسلمان طلبا کی تعداد بہت کم ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان طلبا تعلیم کا خرچہ برداشت نہیں کر سکتے، ضرورت ہے کہ ایسے طلبا کو وظیفے دے کر فنون کی تعلیم دلائی جائے، ایسے حالات میں کیا یہ صحیح ہو سکتا ہے کہ مفید فنون کی تعلیم کے بجائے ہم اپنے گاڑھے پسینہ کی کمائی کا روپیہ عربی علوم کے احیا پر صرف کریں، جو اس زمانہ میں کسی طرح مفید نہیں ہو سکتے۔

زمانہ کے اور حالات کی تبدیلیوں کا اثر مسلمانوں نے یہی قبول کیا ہے، اب وہ زمانہ ہے، جب حقیر سے حقیر فرد کو بھی ترقی کے موقعے حاصل ہیں، ہر شخص کو حاصل ہے کہ اپنے کو بجائے نیاز مند یا خاکسار یا کمترین یا حقیر کہنے کے "میں" کہے، اور واحد متکلم کا صیغہ استعمال کرے، ہر شخص کو احساس ہے کہ یہ دور انفرادیت اور شخصیت کا ہے، اور ہر شخص کو اپنی حالت بہتر بنانے میں مصروف ہونا چاہیئے۔

ڈاکٹر لٹینر اور پنجاب یونیورسٹی

خدا کے لئے عربی تعلیم کی تجدید کا سبز باغ دکھا کر ہمارے راستہ میں رکاوٹ نہ ڈالئے، میں قوم کی توجہ اون الفاظ کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جو سر سید احمد خاں علیہ الرحمۃ نے ۱۸۸۴ء میں استعمال کئے تھے، جب موصوف ڈاکٹر لٹینر کے مقابلہ میں یہ ثابت کرنے میں مشغول تھے کہ پنجاب یونیورسٹی کو مشرقی علوم اور عربی و فارسی اور سنسکرت کی تعلیم پر زیادہ زور نہ دینا چاہیئے سر سید نے ایک زبردست مضمون میں لکھا تھا۔

"میں صاف صاف کہتا ہوں کہ جو شخص مشرقی ادب اور علوم کو میری قوم کے سامنے پیش کر کے چاہتا ہے کہ میری قوم اون کی تجدید کرے، وہ ہرگز ہمارا دوست نہیں ہے مشرقی علوم جو اب باقی رہ گئے ہیں وہ ہمارے راستہ میں بڑی رکاوٹ ہیں، بعض اشخاص اون کی تجدید کرنا چاہتے ہیں، میں دریافت کرتا ہوں کہ اس تجدید سے اون کا مقصد کیا ہے، بظاہر وہ ہمارے ساتھ بھلائی کرنا چاہتے ہیں، مگر مجھے تو ایسا معلوم

ہوتا ہے کہ اون کی غرض ہمیں نقصان پہنچانا ہے "

میرا مضمون طولانی تھا اور اس کے آخری فقرے حسب ذیل تھے۔

"میں یہ مضمون بغیر اون انگریز حضرات کا دلی شکریہ ادا کئے ختم نہیں کرسکتا جنھوں نے عربی تعلیم کی تجدید کے مسئلہ میں بڑی گہری دلچسپی ظاہر کی ہے، بدقسمتی سے ہماری قوم کا تعلیم یافتہ طبقہ انگریز دوستوں کی رائے سے اتفاق رائے نہیں رکھتا، بحالات موجودہ یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ ہم دونوں کے درمیان قریبی زمانے میں اتفاق رائے کی صورت پیدا ہوسکتی ہے، ہم عزم مصمم کرلیا ہے کہ جس تعلیمی پالیسی پر ہم کاربند ہیں، ہمیں آئندہ پچاس سال تک اوسی پر چلنا چاہیئے، پچاس سال گذرنے کے بعد اگر ہم نے دیکھا کہ جس تعلیمی کمی کا ہم اس وقت شکار ہیں وہ پوری ہوگئی ہے تب ہم غور کریں گے کہ ہماری مزید تعلیمی ضروریات کیا ہیں "

علی گڈھ میں عربی اور سائنس کی تعلیم کے غیر تشفی بخش نتائج

اس تمام بحث و مباحثہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ گو عربی تعلیم کا علی گڈھ میں خاص انتظام کیا گیا اور بیش قرار تنخواہ کا ایک پروفیسر یورپ سے بلایا گیا، تاہم سائنس کی تعلیم کے ساتھ بھی بے التفاتی نہیں برتی گئی، اوس کے لئے بڑا سرمایہ جمع کیا گیا اور مسلمان طلبا کو جو سائنس پڑھنا چاہتے تھے علی گڈھ کے بجائے دوسرے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخل ہونے کی ضرورت باقی نہیں رہی، سائنس کی تعلیم کے لئے جو علیحدہ عمارتیں علی گڈھ یونیورسٹی میں بنی ہیں اون کو دیکھ کر آنکھوں کو فرحت حاصل ہوتی ہے، مگر دل کو اطمینان نہیں ہوتا، عربی اور سائنس کی تعلیم علی گڈھ میں عرصہ سے جاری ہے، ہر سال اس تعلیم پر ایک رقم خطیر خرچ ہوتی ہے، مگر کیسے افسوس کی بات ہے کہ ابھی تک علی گڈھ یونیورسٹی سے کوئی طالب علم ایسا نہیں نکلا جس کو عربی زبان یا مغربی سائنس کا حقیقی معنی میں طالب کہا جا سکے، اور جس کے کمال کا تذکرہ ہمارے ملک کی بقیہ یونیورسٹیوں

میں ہو۔

لارڈ کرزن کے عہد کے ایکٹ

شروع ۱۹۰۴ء کے امپیریل لیجسلیٹیو کونسل کے سیشن میں یونیورسٹی بل کے علاوہ سرکاری رازوں کے تحفظ کا بل (Official Secrets Bill) بھی پاس ہوا، جو خط و کتابت میری اور سر تھیوڈر مارین کی اوس زمانہ میں ہوئی اوس میں جابجا اس بل کا تذکرہ ہے، میرے نزدیک یہ بل غیر ضروری تھا، اور مارین صاحب نے اس بل کے خلاف کونسل میں ووٹ دیا مگر اون کے آخری خط سے جو ۲۵ مارچ ۱۹۰۴ء کا لکھا ہوا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ گو مسٹر گوکھلے نے آخری وقت تک بل کی مخالفت کی اور اکثر ہندوستانی ممبروں نے اون کا ساتھ دیا تاہم دلائل کے اعتبار سے گورنمنٹ کا پلہ بھاری رہا، مارین صاحب نے اپنے خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ سلیکٹ کمیٹی میں بھی اخلاقی فتح گورنمنٹ ہی کی رہی، میں اوس زمانے میں اس بل کا مخالف کا مخالف تھا جس کے وجوہ میں نے دوران گفتگو میں مسٹر عبدالکریم خاں سے جو بعد میں گوالیار ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اور وزیر قانون ہوئے، بیان کئے تھے اب جو غور کرتا ہوں تو صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ سرکاری رازوں کے بل کا پاس کرنا فی نفسہ قابل اعتراض نہ ہو۔ لیکن بڑی خرابی اس ملک میں اوس وقت یہ تھی اور ایک حد تک اب بھی ہے کہ قانون کا نفاذ گورنمنٹ کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور لارڈ کرزن جیسی قدامت پسند طبیعت کا وائسرائے اگر چاہتا تو اس قانون کے نفاذ کے بعد اخباروں کی آزادی میں بڑی کھنڈت ڈال سکتا تھا، اسی کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ لارڈ کرزن نے اپنے عہد کی بقیہ میعاد کے اندر اس قانون کا استعمال ایسے طریقہ پر نہیں کیا جس کے اخباروں کو یا پبلک کو شکایت پیدا ہوتی، سچ تو ہے کہ گو سخت قوانین کا وضع کرنا کسی ہمدرد اور روشن خیال گورنمنٹ کے لئے جائز نہیں ہوسکتا، تاہم سخت قانون بنانے سے زیادہ پبلک کی فلاح و بہبود کا تعلق اوس ذہنیت سے ہے، جس کے ماتحت اوس سخت قانون کا نفاذ کیا جائے

اگر گورنمنٹ ہم درد اور پبلک کی خواہشات اور جذبات کا اثر قبول کرنے والی ہو تو وہ سخت قانون کتاب کے اوس حرف غلط کی طرح رہے گا جسے قلم زد نہ کیا جائے، برخلاف اس کے اگر گورنمنٹ ایسی ہو جو اپنا وقار قائم رکھنے یا بڑھانے کے لئے پبلک پر دھونس جمانا چاہے تو اوس سخت قانون کے نفاذ کے نتائج پبلک کے لئے خطرناک اور خود گورنمنٹ کے لئے غیر تشفی بخش ہوں گے، رہا یونیورسٹی بل وہ اچھا تھا یا بُرا، لارڈ کرزن کا لاڈلا تھا انگریز عہدہ داروں کی کونسل میں اوس وقت زبردست اکثریت تھی، بل مذکور کا پاس ہونا لازمی تھا، اور بالآخر وہ پاس ہو کر رہا۔ ایک بات البتہ عجیب و غریب معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ لارڈ کرزن کی اصلی غرض یہ تھی کہ یونیورسٹی ایکٹ کے نفاذ کے بعد کلکتہ اور بنگال کے کالجوں کی اصلاح ہو جائے، یہ غرض بڑی حد تک پوری نہ ہو سکی اور تو اور کلکتہ یونیورسٹی کمیشن جو چودہ برس بعد مقرر کیا گیا، اور جس نے طول طویل شہادت لینے کے بعد بڑی مبسوط رپورٹ لکھی وہ بھی کلکتہ یونیورسٹی سے اون مضر اثرات کے استیصال کرنے سے قاصر رہا، جن کی مسلسل موجودگی نے کلکتہ یونیورسٹی کو ہمارے ہندو بنگالی بھائیوں کی میراث بنا دیا ہے، بعض صوبوں نے اس کمیشن کی رپورٹ کی بنیاد پر ایسے شہروں میں یونیورسٹیاں قائم کیں، جہاں کے تمام مقامی موجودہ وقت کالج یونیورسٹی میں مدغم ہو گئے، مگر بمصرعہ

زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد

گو یہ ساری زحمتیں کلکتہ یونیورسٹی کی اصلاح کی خاطر برداشت کی گئی تھیں، تاہم سر آسوتوش مکرجی کی زبردست قیادت میں کلکتہ یونیورسٹی اپنی روش پر قائم رہی اور سیڈلر کمیشن کی رپورٹ کی طرف اوس نے کوئی خاص توجہ نہیں کی۔

اوس دور کی سیاسی حالت

مارچ ۱۹۰۴ء کے آخر میں کونسل کے سیشن سے فارغ ہو کر مارین صاحب علی گڈھ تشریف لائے، ہم سب کو نلم حاصل کرنے کے بعد اون کی علی گڈھ واپسی پر بڑی مسرت ہوئی، اور موصوف کو ایک

گارڈن پارٹی بڑے پیمانہ پر دی گئی۔ اس پارٹی میں مجھ سے اور موصوف سے حالاتِ حاضرہ پر مفصل گفتگو ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ علی گڈھ کے طالب علم پولیٹکل حالات سے واقف ہیں اور ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے اُسے دیکھتے سنتے اور اُس پر غور کرتے ہیں۔ اس لئے مجھے سخت تعجب ہوا۔ جب مارسین صاحب نے مجھ کو یہ بتایا کہ دکن میں بالخصوص ان اضلاع میں جہاں مرہٹوں کی آبادی ہے ایک پولیٹکل پارٹی ایسی موجود ہے جو انگریزوں کو ملکِ ہند سے نکالنا چاہتی ہے اور اس غرض کو حاصل کرنے کے لئے قوت اور تشدد کے استعمال کو بُرا نہیں سمجھتی۔ اُس زمانہ میں ملک کی سب آبادی انگریزی حکومت کی طرفدار تھی۔ تقسیم بنگال کی تجویز غالباً لارڈ کرزن کے ذہن میں تھی۔ مگر اُس کا حال کسی ہندوستانی کو معلوم نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ وائسرائے کی ایکزیکٹیو کونسل کے ممبروں کو بھی وائسرائے کی اس تجویز کا حال معلوم نہ تھا۔ ہمارے ملک میں جو لوگ طلبا کو سیاسیات سے بالکل علیحدہ رکھنا چاہتے ہیں اُن کے لئے یہ واقعہ نہایت سبق آموز ہے تعلیم ہرگز اُس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک طلبا کو تمام مسائل کے سمجھنے اور آزادانہ اور ہوشمندانہ طریقہ پر رائے قائم کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔ رائے قائم کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ طلبا درس و تدریس کو بالائے طاق اُٹھا رکھیں اور اپنا تمام وقت جلوس نکالنے جلسے کرنے اور کسی سیاسی مسئلہ کو پبلک میں مقبول یا نامقبول بنانے کی کوشش میں صرف کریں ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ایسے سیاسی مسائل بھی پیدا ہو سکتے ہیں اور بعض اوقات پیدا ہوتے ہیں۔ جن پر آزادی سے رائے ظاہر کرنے اور ان مسائل کو ہر دلعزیز بنانے کا حق طلبا سے نہیں چھینا جا سکتا۔ مگر ایسے موقعے شاذ و نادر پیش آتے ہیں اور چونکہ تعلیمی پالیسی کا قرار دینا اور اس میں تبدیلیاں کرنا اب اکثر و بیشتر ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے میرے نزدیک یہ مسئلہ کسی طویل بحث و مباحثہ کا محتاج نہیں ہے۔ ہر یونی ورسٹی کے کارکن اور کالجوں اور اسکولوں کے اربابِ حل و عقد جیسا مناسب سمجھیں گے

ضرورت اور مصلحتِ وقت کے مطابق عمل کریں گے۔

مسٹر گوکھلے کی تحقیر پر میرا احتجاج

مارلین صاحب نے مجھ سے جو کچھ فرمایا تھا اُسکی تائید مسٹر تلک اور اُن کے پیرووں کی پھیلائی ہوئی پولیٹکل تعلیم سے ہوتی تھی۔ دوران گفتگو میں مسٹر گوکھلے کا تذکرہ آیا جن کو لارڈ کرزن کا سب سے بڑا ہندوستانی مدمقابل سمجھنا چاہیئے۔ مسٹر گوکھلے نے ویلبی کمیشن (Welby Commission) کے سامنے جس آزادی اور قابلیت سے شہادت دی تھی اُس سے ثابت ہو گیا تھا کہ مسٹر دادا بھائی نوروجی کے بعد وہ ملکی مسائل کے سب سے بڑے ماہر ہیں سنہ ۱۹۲۴ء میں مسٹر چمن لال اور مسٹر گورسوامی نے جس طرح سر میلکم ہیلی کو لیجسلیٹو اسمبلی میں زچ کیا۔ اُن حالات سے موجودہ نسل ناواقف نہیں ہے۔ مسٹر گوکھلے اور لارڈ کرزن کا معرکہ اپنی نوعیت کا پہلا معرکہ تھا۔ ایک طرف ہندوستان کا وائسرائے تھا جس نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں بہترین تعلیم پائی تھی اور جو نہ صرف نہایت قابل اور ذی علم تھا بلکہ جس کو اپنے قابل اور ذی علم ہونے کا ضرورت سے زیادہ احساس تھا۔ لارڈ کرزن کا دماغ عرشِ معلّےٰ پر تھا۔ جس کا اندازہ ایک چھوٹی سی مثال سے ہو جائے گا۔ موصوف کے ہندوستان آنے سے پہلے کسی نے برسبیل تذکرہ اُن سے دریافت کیا کہ آپ نے کس یونیورسٹی میں تعلیم پائی ہے۔ کرزن نے جواب دیا بے لیَل (Balliol) میں۔ اس جواب سے جو تبختر ٹپکتا ہے اُس کا اندازہ وہ حضرات بخوبی کر سکتے ہیں جن کو انگلستان کی یونیورسٹیوں کے حالات معلوم ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ بے لیَل کوئی یونیورسٹی نہیں ہے بلکہ آکسفورڈ یونیورسٹی کا ایک کالج ہے۔ لارڈ کرزن بے لیَل کالج کے سابق طالب علم تھے اور اس پر اُن کو بڑا ناز تھا۔ اس تفاخر کو اُنہوں نے اس طرح ظاہر کیا کہ جب یونیورسٹی کا نام دریافت کیا گیا تو بجائے یونیورسٹی کا نام بتانے کے کالج کا نام بتایا۔ اس معرکہ کا دوسرا فریق ہندوستان کا وہ سپوت تھا جس کی پوری تعلیم خود ملک میں

ہوئی تھی۔ اور جس کو دنیا کے حالات سے واقفیت کے وہ موقعے اور ذریعے حاصل نہ تھے جن تک ایک دولت مند اور بااثر انگریز باپ کے بیٹے کی انگلستان میں آسانی سے پہونچ تھی۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی دھیان میں رکھنے کی ہے کہ ہندوستان کے اعلیٰ عہدہ داروں کی امداد کے لئے بیش قرار تنخواہ کے قابل سکرٹری موجود ہوتے ہیں جو کسی مسئلہ زیر بحث پر جتنا مواد موجود ہو سب مہیا کر کے اپنی مبسوط یادداشت کے ساتھ پیش کر دیتے ہیں اسی کے ساتھ جتنی یادداشتیں اور تحریریں سرکاری طور سے مسئلہ مذکورہ پر گورنمنٹ کے دفتروں میں موجود ہوں اُن سب تک سرکاری عہدہ داروں کی دسترس ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے غیر سرکاری ممبروں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ سوائے کتابوں اور اُن تحریروں کے جن کو خود گورنمنٹ نے شائع کر دیا ہو۔ اور کسی بات سے باخبر نہیں ہو سکتے پھر غیر سرکاری ممبر کے پاس نہ کوئی سکرٹری ہوتا ہے نہ پرسنل اسسٹنٹ۔ ہر بات کا کھوج خود ہی لگانا اور موٹی موٹی کتابوں کو پڑھ کر واقعاتِ متعلقہ کو خود ہی چھانٹنا پڑتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کونسل یا اسمبلی میں سرکاری عہدہ دار اور غیر سرکاری ممبر کا مقابلہ دو برابر والوں کا مقابلہ نہیں ہوتا بلکہ اس مقابلہ کی بنیاد نابرابر ہوتی ہے۔ اگر کسی دوڑ میں دو ایسے ہم عمر آدمی شریک ہوں جن کا قد اور وزن برابر ہو مگر اُن دونوں میں سے ایک کی کمر سے بیس سیر لوہا باندھ دیا جائے تو یہ دَوڑ کبھی برابر کی دَوڑ نہیں ہو سکتی۔ بعینہ یہی حالت مسٹر گوکھلے کی لارڈ کرزن کے مقابلہ میں تھی مگر صد ہزار آفرین ہے بے بس ہندوستان کے نمائندہ کی ہمّت پر۔ جس کے دلائل سلاست بیان۔ پُرزور ادائے مطلب اور واقفیت کے زبردست ذخیرہ نے تمام حق پسند اور مُنصف مزاج لوگوں کی نظر میں یہ ثابت کر دیا کہ گو کونسل میں انگریزوں کی کثرت کے باعث بظاہر لارڈ کرزن کی دلائل کا پلّہ بھاری معلوم ہوتا ہے۔ مگر اُس پلّہ کا حقیقی وزن گوکھلے کی بھاری بھرکم دلائل کے مقابلہ میں واقعتاً سُبک ہے۔ دورانِ گفتگو میں ماریسن صاحب سے

مسٹر گوکھلے کا تذکرہ آگیا۔ جو خط و کتابت میری اُستادِ شفیق سے اُس زمانہ میں ہوئی تھی جب وہ کلکتہ میں مقیم تھے۔ اُس میں مسٹر گوکھلے کا اکثر ذکر ہوتا تھا اور خطوں میں مارِیسن صاحب اور میں دونوں اپنے خیالات کا اظہار آزادی سے کرتے تھے جس میں نہ تلخی کا شائبہ ہوتا تھا نہ ناگواری کا۔ مگر اُس پارٹی میں مارِیسن صاحب نے اپنے معمول کے خلاف گوکھلے کے بارے میں تلخ اور ناگوار باتیں کہنا شروع کر دیں۔ مجھ کو موصوف کا لب و لہجہ پسند نہ آیا اور جو اعتراضات گوکھلے پر مارِیسن صاحب نے کئے تھے میں نے اُن کا جواب دینا شروع کر دیا۔ مارِیسن صاحب کو رد در رد ایک ایسے طالب علم کا جواب دینا اور پولٹیکل معاملات میں اختلاف کرنا جو بہت کچھ اُن کا ممنونِ احسان تھا میرے خیال میں موصوف کو خاص طور سے گراں گزرا۔ میری باتیں سُنکر اُستادِ شفیق نے گوکھلے کی نسبت نہ صرف حقارت آمیز بلکہ توہین آمیز الفاظ استعمال کئے۔ جس کا میں نے پہلے سے بھی زیادہ زور شور کا جواب دیا۔ مجھے افسوس ہے کہ اس گفتگو کا خاتمہ بدمزگی پر ہوا۔ گارڈن پارٹی میں جب میں اُستادِ شفیق سے رخصت ہوا تو حالات کا اندازہ کرتے ہوئے مجھے اس بات کا احساس تھا کہ مسٹر گوکھلے کے باعث جس ناخوش گواری کا گارڈن پارٹی میں مجھے سامنا کرنا پڑا تھا اُس کا اثر عرصہ تک میرا پیچھا نہ چھوڑے گا۔

بدمزگی کا اثر میری آیندہ زندگی پر

میرا خیال غلط نہ نکلا۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ کے امتحان کی کافی تیاری نہ کرسکنے کے باعث میں نے اُس سال امتحان میں شرکت کا قصد ترک کردیا تھا۔ اور یہ بات مارِیسن صاحب کو معلوم تھی۔ اگر میرے اور اُستادِ شفیق کے تعلقات ویسے ہی ہوتے جیسے عربی تعلیم کے مسئلہ پر اختلاف رائے پیدا ہونے سے پہلے تھے تو غالباً موصوف مجھے ڈپٹی کلکٹر کرادیتے اور میرے نجی مُعاملات نے جو صورت اختیار کر لی تھی اُس کے باعث میں تشکر اور امتنان کے ساتھ یہ عُہدہ منظور کر لیتا۔ انسان جتنی چاہے تدبیریں کرے۔ عقل کے گھوڑے

دوڑائے یا ناعاقبت اندیشی اور سوئے تدبیر سے کام لے بعض اوقات ظاہری واقعات کے اندر ایسے عجیب وغریب راز پنہاں ہوتے ہیں جو انسان کی سمجھ سے باہر ہیں۔ مجھے ڈپٹی کلکٹری مل جاتی اور فرض کر لیجیے کہ حکام بالا دست کی اور گورنمنٹ کی خوشنودی حاصل کر کے ملازمت کے اخیر زمانہ میں تین چار سال کے لئے حاکم ضلع یعنی مجسٹریٹ اور کلکٹر بھی ہو جاتا تو بھی اور باتوں کے علاوہ یہ بڑی کمی رہ جاتی کہ اپنے خیالاتِ پریشاں قلمبند کر کے اپنے اہلِ ملک کی خدمت میں پیش کرنے کی نوبت کبھی نہ آتی۔ مارین صاحب کی آزردگی کے باعث مجھے یہ توقع نہ تھی کہ موصوف کسی بڑی جگہ کے لئے میری سفارش کریں گے۔

دیسیوں اور بدیسیوں کی نظر میں قابلیّت کے مختلف معیار

یہ سمجھنا بڑی بھول ہے کہ قابلیّت کا معیار گورنمنٹ اور انگریزوں کے نزدیک بھی وہی ہونا چاہیئے جو ہم ہندوستانیوں کی نظر میں ہے بڑا فرق یہ ہے کہ دماغی اور ذہنی اوصاف کی تلاش کے علاوہ ہم ہندوستانی اپنی رائے قائم کرتے وقت یہ بات بھی دیکھتے ہیں کہ جس شخص کے کسی عہدہ پر تقرر کا سوال درپیش ہو آیا اُس کی طبیعت میں اتنی مضبوطی ہے یا نہیں کہ ملک اور قوم کے مفاد کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھے۔ برخلاف اس کے گورنمنٹ اور انگریز سب سے پہلے یہ بات دیکھتے ہیں کہ جس شخص کا تقرر عمل میں آئے اُس میں اتنی لچک ہو کہ گورنمنٹ کی عظیم الشان انتظامی اور اقتصادی مشین کا وہ ایک پُرزہ بن جائے جس سے مشین کے چلنے میں آسانی ہو اور کسی طرح کی رُکاوٹ پیش نہ آئے۔ ڈپٹی کلکٹری اتنا بڑا عہدہ نہیں ہے جس پر تقرر کرتے وقت خاص طور سے ان باتوں کا خیال رکھا جائے۔ مگر دشواری یہ ہے کہ اُن خاص حالات کے ماتحت جن میں اس ملک پر انگریزی حکومت قائم ہے عموماً تمام انگریزوں کی ذہنیت ایک خاص شکل اختیار کر لیتی ہے اور چونکہ اس ذہنیت سے اس ملک میں انگریزی حکومت کو استحکام پہونچتا ہے۔ لہٰذا ہندوؤں کے لئے سفارش یا اُن پر تقرر کرتے وقت انصاف کا معیار

اس معیار سے بہت مختلف اور کمتر ہوتا ہے جس کے پابند عام طور پر انگریز اپنی نج کی زندگی میں
پائے جاتے ہیں۔ نج کی زندگی میں انگریزوں کا اخلاقی معیار بلند اور کافی بلند ہے مگر
اُن مسائل کے بارہ میں جن کا تعلق قومی پالیسی سے ہے ایک رسمی اور تقلیدی دستور العمل
مقرر ہے جس پر حکمراں قوم کے افراد عمل کرتے ہیں۔ اگر کوئی انحراف کرے تو اُس کا وہی حشر
ہوتا ہے جو مسٹر مانٹیگو سابق وزیر ہند کا سنہ ۱۹۲۲ء میں ہوا۔ تاہم میں اُستاد شفیق کا
احسان مند ہوں کہ جب مسٹر ایل۔ جی۔ ایونس (L. G. Evans) ڈسٹرکٹ جج
سہارن پور نے اپنے اجلاس کی پیش کاری کے لئے ماریسن صاحب سے علی گڈھ کا ایک
تعلیم یافتہ نوجوان مانگا تو موصوف نے میری سفارش کی۔ جج صاحب نے ملاقات
(Interview) کے لئے مجھے بہ مقام مظفر نگر طلب کیا۔ میں مظفر نگر گیا
اور مولوی سیّد طفیل احمد صاحب کے یہاں جو اُس وقت سب رجسٹرار تھے ٹھیرا۔ جج صاحب
سے ملاقات ہوئی اور اُن کے سوالات کا جواب دینے کے بعد میں نے قرینہ سے معلوم کیا
کہ وہ مجھے اس جگہ کا اہل سمجھتے ہیں۔ جج صاحب نے مجھے یہ کہکر رخصت کیا کہ عنقریب
حکم تمہارے پاس پہونچے گا۔ مولوی طفیل احمد سے دورانِ قیام میں خوب گھل ملکر باتیں
ہوئیں۔ وہ اپنی زندگی کی سادگی کے باعث علی گڈھ کی دنیا میں مشہور تھے۔ اُن کا مہمان
ہو کر جب میں نے اُن کے طور طریق دیکھے تو دو باتوں کا مجھ پر خاص اثر ہوا۔ ایک تو موصوف
کی خوش مزاجی اور بذلہ سنجی تھی جو خدا کے فضل سے اُس وقت تک اُن کی رفیق ہے۔
دوسری بات یہ ہے کہ اُن کی قوتِ عمل بڑی زبردست تھی اور یہ صفت بھی اُن میں
اُس وقت تک موجود ہے۔ حالات معلوم کر کے موصوف کو تعجب ضرور ہوا کہ میں جج
کی پیش کاری جیسی چھوٹی جگہ منظور کرنے کے لئے تیار ہوں لیکن انہوں نے میرا عندیہ دریافت
کرنے کے بعد میری ہمت بڑھائی اور میرے ساتھ وہی برتاؤ کیا جو علی گڈھ کی برادری کے بڑے
بھائی چھوٹے بھائیوں کے ساتھ اب بھی کرتے ہیں اور اُس زمانہ میں خاص طور پر کرتے تھے

آکسفرڈ کی کرکٹ ٹیم

علی گڈھ کو خدا حافظ کہنے کے قبل ایک واقعہ اور بیان کردوں جو علی گڈھ کی کھلاڑی برادری کی دل چسپی کا باعث ہوگا جنوری سنہ ۱۹۰۳ء میں آکسفرڈ سے ایک کرکٹ ٹیم ہندوستان آئی تھی جس کا نام آکسفرڈ کے مستند کھلاڑیوں کی جماعت یعنی (Oxford Authentics cricket team) تھا۔ یہ ٹیم کالج کے فرسٹ الیون سے کرکٹ کھیلنے علی گڈھ آئی تھی۔ اس موقع پر علی گڈھ میں بڑا اجتماع ہوا تھا اور جو پرانے طالب علم کرکٹ سے دل چسپی رکھتے تھے وہ کھیل دیکھنے علی گڈھ آئے تھے۔ میں نے اپنے چچازاد بھائیوں یعنی شیدا علی مرحوم اور انصار حسین کو کھیل دیکھنے کے لئے مدعو کیا تھا۔ کھیل شروع ہوا اور آکسفرڈ کی ٹیم نے چالیس رن سے کم بنائے۔ شفقت حسین مرحوم نے اپنی بولنگ کے اس موقع پر عجیب و غریب کرتب دکھائے اس نتیجہ سے ہم اس لئے خوش تھے کہ یہ پہلا موقع تھا کہ آکسفرڈ کی ٹیم نے ہندوستان کی کسی میچ میں اتنے کم رن بنائے ہوں۔ مگر جب ہماری ٹیم کے کھیلنے کی باری آئی تو جہاں تک مجھے یاد ہے اس نے صرف تیرہ یا سترہ رن بنائے۔ بارش کی وجہ سے میچ ملتوی ہو گئی۔ اور ہم شکست کی خفت سے بچ گئے۔ تاہم معلوم ہو گیا کہ ہماری ٹیم انگلستان کی کسی اچھی ٹیم کی ہم پلہ نہیں ہے۔ کرکٹ کا کھلاڑی نہ ہونے کے باعث میں اس میچ کے بارہ میں کوئی ذاتی رائے قائم نہ کرسکا۔ مگر جاننے والوں نے اس وقت یہ رائے ظاہر کی تھی کہ گو ہمارے بولر بہت اچھے ہیں مگر وکٹ کے سامنے جم کر کھیلنے اور گیند کو وکٹ تک پہونچنے دینے کی کافی مہارت ہمارے کھیلنے والوں کو نہیں ہے۔ رات کو یونین میں مباحثہ (ڈی بیٹ) ہوا جس میں باہر کے مہمان بڑی کثرت سے شریک ہوئے۔ اسٹاف کے انگریز پروفیسر اور یورپین خواتین کی موجودگی سے مباحثہ کی دل چسپی میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ آکسفرڈ کے کھیلنے والے بھی موجود تھے۔ اور ان میں سے مسٹر سسل ہیڈلم نے تقریر بھی کی تھی۔ مباحثہ کا مضمون یہ تھا کہ اس انجمن کی رائے میں یورپین طرز معاشرت کا اختیار کرنا مسلمانوں کے لئے مضر ہے

اور کثرتِ رائے سے یہ تجویز منظور ہو گئی تھی۔ یونین کے پریزیڈنٹ کی حیثیت سے جلسہ کی صدارت مارلین صاحب نے فرمائی۔ مگر مباحثہ ختم ہونے سے کافی دیر پہلے اُٹھ کر چلے گئے اور مجھے صدارت کرنے کا موقع دیا۔ آکسفرڈ کی ٹیم نے اپنے دَورہ کے حالات ایک کتاب میں لکھ کر شائع کئے تھے جس میں یونین کے مباحثہ کا بھی تذکرہ تھا۔

مُظفّر نگر سے واپسی کے چند دن بعد ایونس صاحب کا خط ملا۔ جس میں لکھا تھا کہ اپریل کے دوسرے ہفتہ میں سہارن پور پہونچ کر میں اپنے عُہدہ کا چارج لے لوں۔ میرے ساتھیوں کو تعجب تھا کہ میں ملازمت کرنے اور ایسی چھوٹی جگہ کو منظور کرنے پر کیوں تیار ہو گیا۔ قبر کا حال مردہ جانتا ہے دوسروں کو اُس حال سے آگاہی نہیں ہو سکتی۔ والد صاحب کی ناراضگی کے باعث میری بیوی اُس وقت تک اپنے باپ ہی کے یہاں رہتی تھیں۔ میری حمیت نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ میکے میں رہیں اور میں بی۔اے ہو جانے کے باوجود اُن کا خرچ نہ برداشت کروں۔ اگر میں کالج کی زندگی کی مصروفیتوں میں مُبتلا نہ ہو جاتا تو دوسری بات تھی۔ مگر اب میرا فرض تھا کہ اپنی ذمّہ داری کے بار اپنے خُسر کے کندھوں پر نہ ڈالوں۔ مارلین صاحب اور اُن کی میم نے جو احسانات مجھ پر کئے ہیں اُن کا تذکرہ موقع بہ موقع میں نے کیا ہے۔ میں نے ۶ راپریل ۱۹۰۴ء کو علی گڈھ کالج کو بہ حیثیت طالب علم خدا حافظ کہا۔ میری روانگی سے ایک دن پہلے میرے دونوں شفیق اُستادوں یعنی سر تھیوڈر مارلین اور لیڈی مارلین نے مجھے رُخصتی لنچ دیا۔ جس میں کالج کے بعض اور پروفیسروں کو بھی مدعو کیا تھا۔ میں علی گڈھ سے کُندرکھی آیا اور تین روز وہاں ٹھیر کر سہارن پور روانہ ہو گیا۔

ساتواں باب

اہلِ دنیا سے میرا واسطہ۔ رشوت کی وبا۔ اُس زمانہ کے بعض حالات۔ ساس بہو کے تعلقات مُسلمان اور پردہ۔ شملہ ڈیپوٹیشن۔ ڈپٹی کلکٹری کی ناکام کوشش۔ بابو کی تعریف۔ امتحان کے لئے رخصت۔ پرنس آف ویلز کی علی گڈھ میں آمد۔ علی گڈھ کی ہڑتال مُسلمان اور مُردہ پرستی۔

شعر

کس طرح فریاد کرتے ہیں بتادو قاعدہ
اے اسیرانِ قفس میں نو گرفتاروں میں ہوں!

۱۰ اپریل ۱۹۰۸ء کو میں سہارن پور پہونچا۔ عبدالحکیم مرحوم کے یہاں جو کالج میں بھوٹان کے نام سے مشہور تھے قیام کیا۔ ۱۱ اپریل کو کچہری میں پہونچ کر منصرم سے ملا۔ منصرم مسٹر ایس۔ پی سانیال تھے۔ اُنہوں نے مجھے بتایا کہ پیشکار کی جگہ خالی نہیں ہے۔ مگر ایک منصفی میں منصرم کی جگہ خالی ہے۔ جس کی تنخواہ پچاس روپیہ ماہوار ہے۔ میرا تقرر منصرمی پر ہوگا۔ مگر جج صاحب پیشکار سے خوش نہیں ہیں۔ سردست اُس نے رخصت لے رکھی ہے۔ اور غالباً وہ واپس نہ آئے گا۔ فی الحال مجھے پیشکار کی جگہ قائم مقامی کرنا ہوگی اور جب پیشکار پنشن لیگا تو اُسکی جگہ میرا مستقل تقرر عمل میں آئیگا۔ مسٹر سانیال کی انگریزی قابلیت اچھی تھی اور ایونس صاحب کی ناک کا بال سمجھے جاتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ میرا تقرر اُن کی مرضی کے خلاف جج صاحب نے کیا تھا اوّل سے آخر تک اُن کے تعلقات میرے ساتھ بالکل باضابطہ اور سرکاری رہے۔ حالات معلوم ہو کر مجھے تھوڑی سی مایوسی ہوئی۔ مگر دوستوں سے مشورہ کرنے کے بعد میں نے منصفی کی مُستقل منصرمی اور قائم مقام پیش کاری پر اپنا تقرر منظور کر لیا۔ تین چار روز میں نے

اجلاس میں پیش کار کے ساتھ بیٹھ کر اُس کو پیشی کا کام کرتے دیکھا اور تھوڑا سا تجربہ حاصل ہونے کے بعد خود کام کرنا شروع کر دیا۔

کچہریوں میں رشوت کی وبا

سہارن پور آنے کے پہلے میں نے سُنا تھا کہ عدالتوں کے اہل کار خوب رشوت لیتے ہیں۔ لیکن خود اہل کاری کے فرائض انجام دینے سے پہلے مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ جو آدمی رشوت لینے کو بُرا سمجھے اُسے لوگ پرلے درجہ کا احمق سمجھتے ہیں۔ وکلا کو مِسلیں دکھانے کا پیشکار کا معمولی نذرانہ یا حق ایک روپیہ فی مِسل ہے۔ مقدمات میں جو رقم پیشکار کو ملتی ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔ خوش اخلاق اور مستعلیق پیشکار کو جو کسی طرح کی زیادتی روا نہ رکھتا ہو اور عرفِ عام میں بھلا آدمی کہلانے کا مستحق ہو فی مقدمہ دو روپے آسانی سے مل جاتے ہیں۔ متفرقہ مقدمات اور فوجداری کے اپیلوں میں یہ رقم فی مقدمہ دس روپے تک پہونچ جاتی ہے۔ گھونس (رشوت) کی رقم کا تعین کم و بیش مقدمہ کی نوعیت پر منحصر ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک مقدمہ میں ایک وکیل نے اپنے موکل کا یہ پیغام مجھ تک پہونچایا کہ اگر ایک متفرقہ حکم جج صاحب سے میں اُس مُوکل کی موافق دلوا دوں تو وہ مجھے سو روپے ادا کرے گا۔ میں نے وکیل مذکور سے کہا کہ افسوس ہے کہ باوجود بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی ہونے کے آپ کا اخلاقی معیار اس قدر پست ہے کہ رشوت دلوانے میں آپ کو کچھ پس و پیش نہیں ہے۔ جی میں تو آیا تھا کہ وکیل مذکور کی اس حرکت کا تذکرہ جج صاحب سے کردوں۔ مگر میں یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ اگر معاملہ کو بڑھایا جائے تو لوگ کہیں گے کہ نوجوان پیشکار اپنی دیانت داری کا ڈھنڈورا پیٹنا چاہتا ہے۔ تاہم میں نے منصرم سانیال سے ذکر کر دیا تھا۔ یہ عجب اتفاق ہے کہ جج صاحب نے وہ متفرقہ حکم اُس پست اخلاق وکیل کے مُوکل کے حق میں صادر کیا۔ میں نے وہ حکم محرر متفرقات کے پاس بھیج دیا۔ محرر کو دس پندرہ روپے غالباً مل گئے ہوں گے۔

سنہ ۱۹۰۴ء میں سہارنپور کی کیا حالت تھی

دیوانی کے چوٹی کے وکیل بابو نیمی داس اور بابو جوتی پرشاد تھے مسلمانوں میں بابو محمد جعفر کا کام دیوانی عدالتوں میں اچھا تھا۔ مولوی عبداللہ جان بھی دیوانی کے وکیل تھے۔ ایک زمانہ میں سُنا ہے کہ اُن کا کام بہت اچھا تھا۔ مگر سنہ ۱۹۰۴ء میں وکیلوں کی کثرت کے باعث اُن کی وکالت مدّھی پڑ گئی تھی۔ مولوی صاحب بڑے خوش مزاج اور بزلہ سنج تھے۔ سرسیّد علیہ الرحمۃ کی تحریک اور علی گڈھ کالج کے زبردست حامی تھے مولوی شہاب الدین علی گڈھ کالج کے بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی اور بڑے دیدارو جوان تھے۔ آہستہ آہستہ اُن کا کام بڑھ رہا تھا اور میرے سہارنپور چھوڑنے کے چند سال بعد وکیل سرکار (گورنمنٹ پلیڈر) ہو گئے تھے۔ اور بہت عرصہ تک، اس عہدہ کے فرائض خوبی سے انجام دئے۔ سنہ ۱۹۱۹ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے نفاذ کے بعد ہمارے صوبہ کی کونسل کے ممبر منتخب ہو گئے تھے۔ بیرسٹروں میں مسٹر وینسی ٹارٹ (Vansittart) پنڈت موہن لال اور مسٹر نہال چند قابلِ تذکرہ ہیں مسٹر وینسی ٹارٹ فوجداری عدالتوں میں کام کرتے تھے۔ بڑے ہنس مُکھ آدمی تھے مسٹر نہال چند کا بھی بیشتر کام فوجداری عدالتوں میں تھا۔ پنڈت موہن لال نے یہ گُر خوب سمجھ رکھا تھا کہ بیرسٹری کرنے سے مقصود روپیہ کمانا ہے۔ وہ فوجداری۔ دیوانی اور کلکٹری سب عدالتوں میں کام کرتے اور خوب روپیہ رولتے تھے۔ مسٹر بومن جی بیرسٹر کا کام بھی فوجداری عدالتوں میں اچھا تھا۔ بابو عبدالحکیم ججی میں مترجم تھے۔ اور بڑے میل جول کے آدمی تھے۔ اُن کے گھر پر اکثر وہ حضرات جمع ہوتے تھے جنہوں نے علی گڈھ میں تعلیم پائی تھی۔ منشی محمد صدیق مختاری کرتے تھے اور دیوبند کے رہنے والے تھے۔ انگریزی سے واقف نہ تھے اور فارسی کی دستگاہ بھی محدود تھی۔ کھڑی اُردو اُسی لب و لہجہ سے بولتے تھے جو ضلع سہارنپور کے قصبات اور دیہات کی خصوصیّت ہے۔ مگر بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ دل کے صاف بات کے

پکے۔ دوستوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ محمد نعیم خاں صاحب جو بعد کو خان بہادر ہوئے ضلع کے سب سے بڑے مسلمان رئیس تھے۔ اُن کی سادہ مزاجی اور خوش اخلاقی کے باعث شہر میں مرحوم کا خاص اثر تھا۔ بھلا جج کا پیشکار بے چارا کس گنتی میں آسکتا ہے۔ مگر محمد نعیم خاں صاحب مجھ سے ملنے میرے مکان پر آئے تھے۔

میری تنخواہ مجھے ستر روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ محلہ گول گنج میں مکان کرایہ پر لے لیا تھا مکان اچھا تھا۔ نیچے کی منزل گرمی کے دنوں میں آرام کی تھی۔ اوپر کی منزل کا صحن رات کو اُٹھنے بیٹھنے اور سونے کے کام آتا تھا۔ دروازہ کے قریب مردانہ بیٹھک تھی جو دوستوں سے ملاقات کے کام میں آتی تھی۔ وہ زمانہ اچھا تھا۔ مجھے یہ مکان عبدالحکیم مرحوم کی معرفت آٹھ روپے ماہوار کرایہ پر مل گیا تھا۔ اپنی مالی حالت کا بھی تھوڑا سا تذکرہ کردوں غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ میرے مکان سے گھوڑا گاڑی کا اڈا غالباً آدھ میل کے فاصلہ پر ہوگا۔ اڈا گورنمنٹ ہائی اسکول کے قریب تھا۔ میں دس بجے سے کچھ پہلے اپنے مکان سے اڈہ تک پیدل جاتا تھا اور وہاں سے گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر جج کی کچہری چلا جاتا تھا۔ گھوڑا گاڑی کا کرایہ فی سواری ایک آنہ تھا۔ تانگے اُس زمانہ میں نہ تھے اور یکہ میں سفر کرنا مجھے پسند نہ تھا۔ گرمی کے موسم میں مکان سے گھوڑا گاڑی کے اڈہ تک آنے میں تکلیف ہوتی تھی۔ مگر انسان پاؤں اُسی قدر پھیلا سکتا ہے جتنی چادر میں گنجائش ہو۔ اگر میں پوری گھوڑا گاڑی کرایہ کرتا اور مکان سے سوار ہو کر کچہری جاتا تو چار آنے کرایہ دینا پڑتا جس کی مجھ میں گنجائش نہ تھی۔ کچہری سے واپسی میں بھی ایک آنہ کرایہ دیکر اڈہ تک گاڑی میں اور وہاں سے اپنے گھر پیدل چلا آتا تھا۔ شروع مئی میں ایونس صاحب سشن کے مقدمات کی سماعت کے لئے دہرہ دون گئے۔ میں اُن کے ساتھ گیا اور سشن جج کے قیام کے لئے جو بنگلہ بنا ہوا تھا اُس میں قیام کیا۔ جج صاحب جوائنٹ مجسٹریٹ کے یہاں ٹھیرے تھے۔ قاعدہ کی رو سے مجھے سشن کے بنگلہ میں ٹھیرنے کا کوئی حق نہ تھا۔

مگر دہرہ دون میں میں کسی شخص سے واقف نہ تھا اور شاگرد پیشہ میں ٹھیرنا میں نے اپنے لئے باعثِ توہین سمجھا۔ غالباً نو یا دس مئی کو ہم دہرہ دون پہونچے تھے۔ اُس زمانہ میں دہرہ دون کے موسم کی یہ حالت تھی کہ رات کے وقت میں کوٹھی کے کمرے کے اندر سوتا تھا۔ کواڑ البتہ کھلے رہتے تھے۔ بارہ چودہ دن میں سیشن کے مقدمات ختم ہو گئے اور مئی کے اخیر میں مَیں ایونس صاحب کے ساتھ منصوری گیا۔ ایونس صاحب بڑے طنطنہ کے جج تھے انہوں نے ہائی کورٹ سے خط و کتابت کرکے یہ طے کرلیا تھا کہ ضلع دہرہ دون کے دیوانی اپیلوں کی سماعت وہ منصوری میں کرسکیں۔

سنہ ۱۹۰۴ء کی منصوری

منصوری میں میری ملاقات محمد یعقوب مرحوم اور محمد ایوب مرحوم سے ہوئی۔ جن کی لنڈھور میں عرصہ سے بہت بڑی دُکان تھی۔ محمد ایوّب نے علی گڈھ میں تعلیم پائی تھی۔ دونوں بھائی بڑے خوش اخلاق اور مہماں نواز تھے۔ مگر کاروبار کی طرف زیادہ توجّہ نہ تھی۔ بیشتر وقت دوستوں سے ملنے جُلنے میں گزرتا تھا۔ میں اس سے پہلے منصوری کبھی نہیں گیا تھا۔ کچہری کے کام سے جتنا وقت بچتا تھا وہ میں سیر میں صَرف کرتا تھا۔ اتوار کے دن منصوری سے باہر چلا جاتا تھا اور سارا دن دوستوں کے ساتھ بسر کرکے شام کے وقت منصوری واپس آجاتا تھا۔ جو مقامات میں نے اُس زمانہ میں دیکھے اُن میں کیمٹی کا آبشار بھی تھا۔ پانی کا دھارا تو کچھ بڑا نہ تھا مگر سفر خاصہ لمبا تھا اور آبشار تک پہونچنے میں ہم کو غالباً ڈیڑھ ہزار فٹ نیچے جانا پڑا ہوگا۔ ہم سب پانچ چھ آدمی تھے اور گھوڑوں پر سوار ہو کر گئے تھے۔ لنچ کے وقت تک خوب بھوک لگ آئی تھی اور پانی کے دھارہ کے پاس بیٹھکر ہم سب نے بڑے لطف کے ساتھ لنچ کھایا تھا۔ ایک روز ایونس صاحب نے مجھ سے دریافت کیا کہ منصوری میں تم نے کیا کیا دیکھا۔ جہاں جہاں گیا تھا اُن جگہوں کے نام میں نے موصوف کو بتائے کیمٹی آبشار کا نام سنکر اُن کو بڑا اچنبھا ہوا۔ غالباً پھٹکار سے اُن کو یہ توقع نہ تھی کہ

ایسا چھوٹا عہدہ دار ایسے مقامات دیکھنے کی تکلیف اور خرچ برداشت کرے گا جو منصوری سے دس بارہ میل ہیں۔ جج صاحب کا قیام منصوری میں دو ہفتہ سے زیادہ رہا۔ اور یہ تمام وقت میرا نہایت لطف سے گذرا۔ شام کے وقت عموماً میں چھ سات میل ٹہلتا تھا منصوری میں دو بڑے ہوٹل اُس زمانہ میں شارلیول اور سیوائے تھے۔ شارلیول جس کا منیجر ایک جرمن تھا منصوری کا سب سے بہتر ہوٹل تھا منصوری میں اونچے درجہ کے ہندوستانی بہت کم آتے تھے اور جو آتے تھے وہ کوٹھی کرایہ پر لے کر اپنے ٹھیرنے اور کھانے پینے کا انتظام کرتے تھے۔ سوائے نامور اور ممتاز حضرات کے اور کسی ہندوستانی کو ہوٹلوں میں ٹھیرنے کے لئے جگہ نہ ملتی تھی۔ جس کا اثر یہ تھا کہ ہندوستانی خود ہی ہوٹل کی جانب رُخ بہت کم کرتے تھے۔ ہمالیہ کلب منصوری کا سب سے بہتر اور بڑا کلب تھا۔

ججی خفیفہ منصوری کی منصرمی جون کے دوسرے ہفتہ میں جج صاحب منصوری سے سہارن پور واپس آئے۔ اگست ۱۹۰۴ء میں ججی خفیفہ دہرہ دون کے منصرم نے ایک مہینہ کی رخصت لی۔ اُس کی جگہ پر ایونس صاحب نے میرا تقرر کیا۔ دہرہ دون اور منصوری مجھے بہت پسند تھے۔ سہارن پور بھی اچھی جگہ ہے۔ مگر شہر کے رہنے والوں کو برسات میں مکھیاں بہت ستاتی ہیں۔ آب و ہوا کے لحاظ سے میرے نزدیک سہارن پور پر میرٹھ۔ بجنور۔ مُرادآباد۔ بریلی اور شاہ جہاں پور کو ترجیح ہے۔ اگست میں منصوری جاکر میں نے ججی خفیہ کی منصرمی کا چارج لے لیا۔ تنخواہ سو روپیہ ماہوار تھی۔ گرمی کے موسم میں جب جج خفیفہ مقدمات فیصل کرنے دہرہ دون جاتے تھے تو مجھے ایک روپیہ روز بھتّہ ملتا تھا۔ منصوری میں رہنے کے لئے کچہری کی عمارت میں دو کمرے ملے جو میری ضروریات کے لئے بالکل کافی تھے۔ منصرمی کے فرائض کو میں نے پیشکاری کے کام سے زیادہ خوش گوار پایا۔ دفتر کے وقت کے بعد رات کو گھر پہ کام کرنے کی ضرورت نہ پڑتی تھی سہارن پور کی

پیشکاری کے زمانہ میں میں دوسرے دن کے پیش ہونے والے مقدمات کی مسلیں پڑھکر تیاری کرتا تھا۔ تاکہ وقت کے وقت ضروری کاغذات کی تلاش نہ کرنا پڑے میضوری اور دہرہ دون کے قیام میں مجھے معلوم ہوا کہ رشوت کا یہاں بھی وہی دَور دَورہ ہے جو سہارن پور میں تھا۔ قاعدہ اور قانون کی پابندی ججی خفیفہ میں سہارن پور سے کم تھی۔ جس کے باعث اہلکاروں کو بالائی آمدنی میں اضافہ کرنے کا خوب موقع ملتا تھا۔ میرے طریقے دہرہ دون کے اہلِ معاملہ کو پسند نہ آئے۔ میں نے اس ایک مہینہ کے قیام میں دفتر کے کام میں سختی کے ساتھ قواعد کی پابندی کرائی۔ جس کا لازمی اثر یہ تھا کہ عملہ کی مطلق العنانی اور آمدنی میں کمی اور اہلِ معاملہ کے عملہ والوں سے بے تکلّفانہ تعلّقات میں رُکاوٹ شروع ہو گئی۔ جج خفیفہ کے پیش کار حافظ احسان الحق مرحوم تھے۔ بڑے میل جول کے آدمی تھے۔ منصفی کی وکالت کا امتحان پاس کرنے کے باوجود مرحوم نے ججی خفیفہ کی پیش کاری کو وکالت پر ترجیح دی۔ دہرہ دون کی عدالت خفیفہ کا جج اُس زمانہ میں انڈین سول سروس کا ایسا انگریز افسر ہوتا تھا جس کی مدّتِ ملازمت پانچ چھ سال ہو۔ حافظ صاحب اپنے کام میں بڑے ہوشیار اور مسلسل پندرہ سولہ برس سے دہرہ دون میں ججی خفیفہ کے پیش کار تھے اُنکی تجربہ کاری اور قانون دانی نئے جج کے لئے کارآمد ہوتی تھی۔ اُس زمانہ کی رفتارِ زندگی کو دیکھتے ہوئے حافظ صاحب کا پیش کاری کو وکالت پر ترجیح دینا قابلِ تعجب نہ تھا۔ وہ اپنے نفع نقصان کو خوب سمجھتے تھے۔ خفیفہ کا محرر اودے رام تھا جو پہاڑی علاقہ کا رہنے والا اور قوم کا برہمن تھا۔ معاملہ فہم اور کام میں نہایت تیز تھا۔ جب کچہری دہرہ دون آتی تھی تو ایک ایک دن میں ستّر ستّر اور اسّی اسّی مقدمے خفیفہ کے دائر ہوتے تھے۔ مگر اودے رام اپنا سارا کام دن کے دن نبٹا دیتا تھا۔ خفیفہ کے سربر آوردہ وکیل بابو جوتش سروپ اور پنڈت آنند نرائن تھے۔ بابو جوتش سروپ آریہ سماج کے بڑے سرگرم ممبر تھے جن کو تعلیمی اور سوشل اصلاح کے کاموں میں بڑا انہماک تھا۔ پنڈت آنند نرائن کشمیری برہمن تھے اور

اُس دور کے کشمیری حضرات کی طرح فارسی خوب جانتے تھے۔ اُردو بڑی اچھی بولتے تھے۔ بابو درگا پرشاد کی وکالت کا اُن کی عمر کی طرح آغازِ شباب تھا۔ موصوف انگریزی خوب بولتے تھے اور اُن کی بحث مختصر مگر معنی خیز ہوتی تھی۔ مسٹر ڈالیوال بیرسٹر سب عدالتوں میں کام کرتے تھے۔ زیادہ عمر میں انگلستان جاکر بیرسٹری کا امتحان پاس کیا تھا جس کا پتہ اُن کے لب لہجہ سے چلتا تھا۔ گھوڑوں کے شوقین تھے اور گھوڑے پر سوار ہو کر کچہری آتے تھے۔ منشی جانکی داس، اور منشی گنگارام اُردو داں وکیل تھے۔ منشی جانکی داس خفیفہ کے محرروں سے میل جول رکھ کر ایک حد تک اپنا کام نکال لیتے تھے۔ منشی گنگارام کو عزّتِ نفس کا بڑا خیال تھا۔ اُن کی سی خودداری میں نے اُس زمانہ کے اُردو داں وکیلوں میں بہت کم دیکھی۔ میں منصوری میں ایک مہینہ تک رہا۔ اور جہاں تک میرے امکان میں تھا میں نے قاعدہ قانون کی پابندی کرائی۔ خفیفہ کے جج اُس زمانہ میں مسٹر ایس۔ پی۔ او ڈانل تھے جو بعد کو ہمارے صوبہ کی گورنمنٹ کے چیف سکرٹری اور ایگزیکیوٹو کونسل کے ممبر ہوئے۔ مہینہ بھر بعد مستقل منصرم کی واپسی پر میں سہارن پور واپس گیا۔

مُلک کی رائے دیانت اور رشوت کے بارہ میں

سہارن پور پہونچ کر مجھے معلوم ہوا کہ منصوری کے ایک مہینہ کے قیام میں جس طرح میں نے قواعد وضوابط کی پابندی کرائی تھی اُس سے ایونس صاحب خوش ہیں۔ غالباً یہ بات بھی موصوف کے کان تک پہونچی تھی کہ میں نے دہرہ دون اور منصوری میں اُسی تدّین سے کام لیا جس کی توقع علی گڈھ کالج کے ایک گریجوئیٹ سے کی جاتی ہے۔ منصوری کی ججی خفیفہ کی یہ حالت تھی کہ خفیفہ میں پچاس مقدمات روزانہ بحساب اوسط دائر ہوتے تھے۔ جو شخص عرضی دعویٰ منصرم کے سامنے پیش کرنے آتا تھا وہ چار آنے فی عرضی دعویٰ منصرم کو رشوت دیتا تھا۔ سب ججی کا عرضی دعویٰ داخل کرنے کی صورت میں منصرم کا حق[1] ایک روپیہ کم سے کم ہوتا تھا۔ مسل کا مُعائنہ کرنے کے لئے کوئی وکیل مُعائنہ

---

[1] اس حاشیہ کی عبارت صفحہ ۲۰۱ پر پڑھیے۔

کی درخواست نہ دیتا تھا بلکہ سب جج کے مقدمات میں ایک روپیہ اور باقی مقدمات میں چار آنے سے لے کر آٹھ آنے تک منصرم کی نذر کر کے مسل کا معائنہ کر لیتا تھا۔ منصرم کے دفتر میں عرضی دعووں کے پیش کرنے کا وقت ساڑھے دس بجے سے بارہ بجے تک تھا۔ اگر کوئی شخص بارہ بجے کے بعد عرضی دعویٰ داخل کرنا چاہتا تو اوسے منصرم کو مزید نذرانہ دینا پڑتا تھا۔ خودستائی ہوتی ہے مگر حقیقت نگاری مجھے یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ میں نے اون تمام ناجائز رقوم کی ادائگی کے بارے سے اون اشخاص کو سبکدوش کر دیا تھا۔ جو مدعی یا مدعا علیہ کی حیثیت سے فریق مقدمہ ہوتے۔ اور اکثر عدالت میں آتے جاتے تھے۔ اگر کسی شخص کو فیصل شدہ مقدمہ کے بارے میں کوئی اطلاع حاصل کرنی ہو تو وہ باقاعدہ درخواست تلاش داخل کر کے مطلوبہ اطلاع حاصل کر سکتا ہے۔ ایسی درخواستیں میرے منصوری جانے سے پہلے جج خفیفہ کے دفتر میں ہر سال بیس پچیس سے زیادہ نہ گذرتی تھیں۔ ان میں کی اکثر درخواستیں وسط دسمبر میں گذرتی تھیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ درخواست تلاش دلانے والوں کا مقصد یہ تھا کہ سالانہ معائنہ کے وقت ڈسٹرکٹ جج سہارن پور کو یہ اعتراض کرنے کا موقع نہ ملے کہ تلاش کی سال بھر میں کوئی بھی درخواست نہیں گذری۔ میرے ایک مہینہ کے قیام میں تلاش کی درخواستوں کی تعداد پچاس سے زیادہ تھی۔ میرے طریق عمل کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مسلوں کے معائنے اور اور تلاش کی درخواستوں کی فیس میں بھاری اضافہ ہوا۔ ایک بات اور قابلِ تذکرہ ہے وہ یہ کہ میری نظر میں دیانت داری کوئی وصف نہیں بلکہ ایک اہم فرض ہے۔ جو ہر انسان کو ادا کرنا چاہئے۔ مگر تعجب یہ ہے کہ بجائے احسان مند ہونے کے پبلک دیانت دار اہل کار یا سرکاری افسر سے عموماً ناراض رہتی ہے۔ اس طرزِ عمل کی سب سے بڑی وجہ تو ہمارے ملک کی اخلاقی پستی ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ ہندوستان میں عرصہ دراز تک شخصی حکومت

لہ (مضمون حاشیہ صفحہ ۳۰۰) رشوت فرانس میں بھی عام ہے۔ مگر لطف یہ ہے کہ ہمارے ملک میں رشوت کی ان چھوٹی چھوٹی رقموں کا نام جو سرکاری دفتروں میں بغیر استحقاق کے لی جاتی ہیں حق ہے۔ مصرعہ۔ برعکس نہند نام زنگی کافور

ہونے کے باعث عوام کو نہ پابندئ وقت کا خیال ہے نہ اون کی زندگی کسی قومی نظم (ڈسپلن) کے ماتحت بسر ہوتی ہے جس شخص کا عدالتوں میں کام ہو وہ بلالحاظ قاعدہ اور ضابطہ کے یہ چاہتا ہے کہ اوس کی مرضی کی مطابق وہ کام ہو جائے۔ خواہ اس میں اوسے ایک کی جگہ دو روپے خرچ کرنے پڑیں۔ میرے لڑکپن میں پلس کا محکمہ رشوت ستانی کے لئے نہایت بدنام تھا۔ وجہ یہ تھی کہ پلس کے بہت سے تحقیقات کرنے والے افسر اصل ملزم کو چھوڑنے اور ناکردہ گناہ لوگوں کا چالان کرنے کی دھمکی دے کر قمیں وصول کرتے تھے۔ رشوت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ ہے کہ دینے والا خوشی سے جائز یا ناجائز کام کرانے کی عوض میں سرکاری افسر یا اہل کار کو رشوت دے۔ دفتروں کے اہل کار۔ ریلوے کے وہ اسٹیشن ماسٹر یا بابو جو پبلک کا مال اور سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجتے ہیں یا تجارت پیشہ لوگوں کو مال بھیجنے کے لئے مال کی گاڑیاں منگا کر دیتے ہیں۔ دیوانی اور فوجداری عدالتوں کے وہ حاکم جو مقدمات کا فیصلہ کرتے ہیں اور دیگر سرکاری افسر جن کو کسی ایسے معاملہ کے طے کرنے کا اختیار ہو جس میں کسی کو فائدہ یا نقصان پہونچا سکیں جو رشوت لیتے ہیں وہ اس اول الذکر مد میں آتے ہیں۔ اون کے حال پر میاں بی بی راضی تو کیا کرے گا قاضی کی مثل عائد ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس طرح کی رشوت لینے والوں کے خلاف شہادت بہم پہونچانا یا اون پر عدالت میں مقدمہ چلانا سخت دشوار ہوتا ہے۔ جس شخص نے روپیہ دے کر اپنا کام کرا لیا ہو اوسے کیا غرض پڑی ہے کہ خود بدنامی اوٹھائے دوسرے کو بدنام کرے۔ اور شہادت دینے کے سلسلہ میں کھچا کھچا پھرے۔ دوسری قسم کی رشوت وہ ہے جب دینے والا رشوت دینے پر راضی نہ ہو۔ مگر کسی خطرہ سے بچنے کے لئے اوسے اپنی مرضی کے خلاف روپیہ دینا پڑے۔ تعزیرات ہند میں رشوت کی جو تعریف ہے اگر اوسے پڑھا جائے تو ان دونوں قسموں کی ناجائز رقم میں کوئی فرق نہیں ہے۔ تاہم غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ دوسری قسم کی رشوت محض رشوت ہی نہیں ہے بلکہ استحصال بالجبر کا عنصر اوس میں غالب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اوس رشوت کی چیخ

چیخ کر شکایت کرتے ہیں۔ جو اون سے اون کی مرضی کے خلاف لی جائے اور پہلی قسم کی رشوت کو ایسی معمولی بات سمجھتے ہیں جس کا تذکرہ بھی کوئی نہیں کرتا۔ بہرنہج ان دونوں رشوتوں میں جو کا فرق ہو۔ مگر نوعیت کا کوئی فرق نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ ابھی تک ہمارے ملک میں اتنا احساس پیدا نہیں ہوا ہے کہ رشوت کو لوگ ایک بلا یا مصیبت سمجھیں۔

پولیس اور رشوت

میرا خیال ہے کہ پچھلے پچاس برس میں پولس کے محکمہ کی حالت بہت سُدھر گئی ہے۔ پولس کمیشن قائم ہونے کے پہلے تفتیش کرنے والے سب انسپکٹروں کو اصلی ملزم کو رشوت لے کر چھوڑ دینے اور اوس کی بجائے کسی بے گناہ کا چالان کر دینے میں زیادہ تامل نہ ہوتا تھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ جھوٹے چالان اب نہیں ہوتے مگر مجھے بڑی مسرت ہے کہ جھوٹے چالانوں کی تعداد اب بہت ہی کم ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ پولس کے ذمہ دار عہدوں پر اب بہت سے ہندوستانیوں کا تقرر ہو گیا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ معاملہ کی اصلیت کو جانچنے میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹوں اور ہندوستانی سپرنٹنڈنٹوں کو وہ دشواریاں پیش نہیں آتیں جو انگریز افسروں کے سدراہ ہوتی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ پولس کے سب انسپکٹروں۔ ہیڈ کانسٹیبلوں اور کانسٹیبلوں کی تنخواہ بڑھا دی گئی ہے۔ تنخواہ بڑھا دینے کا یہ لازمی نتیجہ نہیں ہے کہ تمام غیر دیانت دار افسر یا سرکاری ملازم ایمان دار ہو جائیں مگر ہر مہذب اور شائستہ گورنمنٹ کا فرض ہے کہ اپنے ملازم کو اتنی تنخواہ ضرور دے جو اوس کے اور اوس کے بیوی بچوں کے اخراجات کے لئے کافی ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ گورنمنٹ اپنے ہر ملازم کو ایمان دار نہیں بنا سکتی۔ مگر ملازم کی تنخواہ اتنی ضرور ہونی چاہیئے کہ اگر وہ ایمان دار رہنا چاہے تو ایمان دار رہ سکے۔ اور اپنی معمولی ضروریات کے باعث رشوت لینے پر مجبور نہ ہو۔ کسی فارسی شاعر نے ایمان داری کا مذاق اس طرح اوڑایا ہے۔ شعر

اے دیانت بر تو لعنت از تو رنجے یافتم
اے خیانت بر تو رحمت از تو گنجے یافتم

ترجمہ۔ ایمان داری کے اوپر لعنت ہو جس نے ہمیشہ مجھے تکلیف میں رکھا۔ خدا کرے رشوت کا بول بالا ہو جس نے مجھے مالا مال کر دیا۔

اس شعر میں جس ذہنیت کے آدمی کا تذکرہ ہے وہ رشوت لینے سے کبھی باز نہ آئے گا مگر یہاں اوس شخص سے بحث نہیں ہے جو ناجائز ذریعہ سے کمانا بُرا نہ سمجھے۔ اصولی بات یہ ہے کہ ہر حکومت کا فرض ہے کہ اپنے ملازموں کو اتنی تن خواہ دے کہ وہ بغیر تکلیف اوٹھائے زندگی بسر کر سکیں۔ عدالت ہائے دیوانی و فوج داری و مال کے دفتروں۔ ریل اور آب پاشی اور انجینیری کے محکموں (گورنمنٹ آف انڈیا کے سپلائی ڈپارٹمنٹ کا تذکرہ کرنا میں اس لئے غیر ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ عارضی محکمہ ہے جس سے لڑائی کے اختتام پر ملک کی گلو خلاصی ہو جائے گی۔) میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کی ملازمتیں دستِ غیب کا جیسا کارگر منتر ہیں افسوس ہے کہ اوس میں کچھ کمی نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ غالباً حالت بد سے بدتر ہو گئی ہے۔ ڈھائی برس کے دورانِ حکومت میں بعض کانگریسی گورنمنٹوں نے رشوت کی روک تھام کرنا چاہی۔ مگر مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ نتیجہ اولٹا ہوا۔ خود پولس کے ایک ذمہ دار افسر نے اوس زمانہ میں مجھ سے بطور مذاق کہا تھا کہ جس تفتیش میں پہلے ہم پچاس روپے لیتے تھے اب اوس میں سو لیتے ہیں۔ پچاس روپے اپنی گرہ میں رکھتے ہیں اور پچاس اوس کانگریس والے کو دیتے ہیں جس کا گاؤں یا تھانہ میں اثر ہو۔ جس افسر نے یہ بات مجھ سے کہی تھی وہ ایمان دار آدمی تھا اور جہاں تک مجھے معلوم ہے رشوت نہیں لیتا تھا۔ مگر جو بات اوس نے کہی اوس سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود اون کانگریسی وزارتوں کی نیک نیتی کے جو رشوت کو روکنا چاہتی تھیں اون کی جد و جہد کا عملی نتیجہ یہ ہوا کہ بمصرعہ

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

ساس بہو کے تعلقات سہارن پور میں میرے پاس کرایہ کا مکان موجود تھا جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اکتوبر ۱۹۰۸ء کے آخر میں میں کندرکی گیا

۱۹۱۱ء
دائیں سے بائیں کو - حمزہ علی، سید رضا علی، ہاجرہ خاتون (بیگم نقوی)

اور والدہ صاحبہ اور بیگم رضا علی کو اپنے ساتھ سہارن پور سے آیا۔ ساس بہو کے تعلقات ہمارے ملک میں عموماً خوش گوار نہیں ہوتے۔ مجھے بھی اس دشواری کا مقابلہ کرنا پڑا۔ بعض آدمیوں کی زندگی کی تشکیل میں عورت کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ میرا شمار بھی اونہیں میں ہے۔ والدہ صاحبہ کے احسانات کا تھوڑا بہت تذکرہ کر چکا ہوں۔ بیگم رضا علی انگریزی نہ جاننے کے باوجود اصلی معنی میں میری رفیق حیات تھیں۔ مرحومہ نے ہمیشہ میرے آرام کو اپنے آرام پر مقدم رکھا۔ روشن خیال اس درجہ تھیں کہ بغیر میری تحریک کے نور چشمی ہاجرہ خاتون کو ساتھ لے جا کر اسٹہویٹ گرلس کالج الہ آباد میں داخل کرا دیا۔ جہاں سے ہاجرہ نے ۱۹۲۵ء میں ایف۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۲۶ء میں پبلک سروس کمیشن کی ممبری پر تقرر ہو جانے کے باعث مجھے معہ بی بی بچوں کے الہ آباد چھوڑنا پڑا۔ افسوس ہے کہ ہاجرہ بی۔ اے کا امتحان نہ دے سکیں۔ مگر جتنی انگریزی تعلیم ہاجرہ نے حاصل کی وہ سب بیگم رضا علی کی کوشش کی بدولت تھی۔ مرحومہ مذہبی تعلیم کو سب باتوں پر مقدم سمجھتی تھیں۔ خاندانی تربیت کے ساتھ ہاجرہ اور حمزہ کی مذہبی تعلیم کا مرحومہ نے بچپن سے خاص انتظام کیا۔ ہاجرہ کو فارسی پڑھانے کے لئے ایک ایرانی خاتون کو جو اوس زمانہ میں الہ آباد میں رہتی تھیں مقرر کیا۔ برخوردار حمزہ علی کی فارسی اور اردو تعلیم کے لئے دو ذی علم مولویوں کا انتظام کیا۔ حمزہ کو جمناسٹک سکھانے کے لئے ایک اینگلو انڈین کو جو اس فن کا اوستاد تھا مقرر کیا۔ بیگم صاحبہ پہلے بھی پردہ کی سختی سے پابند نہ تھیں۔ مگر ۱۹۲۶ء میں شملہ جا کر پردہ چھوڑ دیا تھا۔ ایسی محسن ماں اور ایسی چاہنے والی بی بی کے باہمی تعلقات کی کشمکش کا تذکرہ کرنا میرے لئے تکلیف دہ ہے۔ مختصر یہ ہے کہ بیگم رضا علی کو اپنے کنبہ سے بڑی غیر معمولی محبت تھی۔ جتنا خیال اون کو اپنے میکہ والوں کا تھا اوس سے بیسواں حصہ بھی سسرال والوں کا ہوتا تو اس کشمکش میں بہت کمی ہو جاتی۔ والدہ صاحبہ کو خدا نے عجیب و غریب دل و دماغ دیا تھا۔ اون کا اس درجہ وقار تھا کہ دادا صاحب کے انتقال کے بعد اکثر معاملات میں بزرگ خاندان وہ سمجھی جاتی تھیں۔ قابلیت اور معاملہ فہمی کا یہ عالم تھا کہ معمولی ہندوستانی

ریاست کا انتظام کرسکتی تھیں۔ ذکی الحس ہونے کے ساتھ اپنی برتری کا احساس تھا، میری شادی عزیزوں میں ہوئی تھی۔ رشتہ داروں میں بیاہ شادی کرنے سے ہمیشہ پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ بھلا میرا گھران پیچیدگیوں سے کس طرح بچ سکتا تھا۔ میری پہلی شادی جن حالات میں ہوئی تھی اوس کا بیان ہو چکا ہے۔ دودھ کا جلا چھاچھ پھونک کر پیتا ہے۔ میں نے اپنے دونوں بچوں کی شادی غیروں میں کی ہے۔ میری لڑکی ہاجرہ خاتون کی شادی ۱۹۲۹ء میں ابوطالب نقوی سے ہوئی۔ طالب نے اوسی سال انڈین سول سروس کا امتحان پاس کیا تھا۔ طالب کے والد سید محمد کاظم صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی ہیں۔ ضلع الہ آباد کے رہنے والے اور میری طرح دیہاتی ہیں۔ شاید میری رائے طرف داری پر محمول کی جائے۔ مگر سچ بات کہنے میں تامل نہ ہونا چاہیئے۔ بھائی محمد کاظم صاحب جیسا مرنجان مرنج۔ سادہ مزاج — شریف طبع اور صاف دل انسان بغیر ڈھونڈھے نہ ملے گا۔ طالب آج کل علی گڈھ میں کلکٹر ہیں۔ جون ۱۹۴۲ء میں اون کو او۔ بی۔ ای کا خطاب ملا ہے۔ طالب ۱۹۳۱ء کے آخر میں انگلستان سے واپس آئے اور مرادآباد کی تعیناتی ہوئی۔ دو برس تک مرادآباد میں وہ میرے ساتھ رہے اوس زمانہ میں ایک روز میں نے طالب سے کہا تھا کہ اگر انگریزی گورنمنٹ کی پالیسی ہندوستانیوں کو گورنر بنانے کی ہوئی تو ایک دن سول سروس کی سیڑھی کے سب سے اوپر کے ڈنڈے پر پہونچنے کی تم بجا طور سے امید رکھ سکتے ہو" ۱۲ اپریل ۱۹۴۱ء کو برخوردار حمزہ علی کی شادی لائل پور ضلع پنجاب کے ایک معزز سید خاندان میں ہوئی۔ حمزہ کے خسر سید محمد شاہ صاحب کے انتقال کو کئی سال ہوئے۔ حمزہ کی بی بی انور جہاں میٹریکیولیشن پاس ہیں۔ اون کے بھائی سید غیاث احمد کو انڈین سول سروس کا امتحان پاس کئے چار سال ہوئے۔ آج کل جنٹ مجسٹریٹ ہیں۔ پرانی تہذیب کے پودے پر مغربی تہذیب کے پیوند کا قابل قدر نمونہ ہیں۔

مسلمان اور پردہ میں تو پردہ کی رسم کو اقتضائے زمانہ کے خلاف سمجھتا ہوں۔ مگر انور

(دھنی طرف) مسٹر ابوطالب نقوی
او-بی-ای، آئی-سی-ایس
(داماد مولف)

(بائیں طرف) سید حمزہ علی-بی-اے
(پسرمولف)

پردہ کرتی ہیں وہ اور حمزہ دونوں پردہ کو اچھا سمجھتے ہیں۔ پردہ رسم و رواج کا معاملہ ہے۔ مذہب سے اوس کا کچھ تعلق نہیں ہے۔ میرے نزدیک پردہ قائم رہنے والی چیز نہیں ہے۔ اکبر مرحوم کو تو اس معاملہ میں یہاں تک غلو تھا کہ جو پردہ نہ کرے وہ سمجھتے تھے کہ اوس کی عقل پر پردہ پڑ گیا ہے۔ بڑی دقت یہ ہے کہ اکبر مرحوم نے فرض کر لیا تھا اور بہت سے بزرگوں کا آج بھی یہی خیال ہے کہ بے پردگی اور بے حیائی مترادف الفاظ ہیں۔ میرے نزدیک یہ خیال غلط ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہماری بہنیں۔ بیٹیاں اور بہویں بال میں جا کر ناچیں۔ مغربی ممالک کے سارے طریقوں کی نقل کرنا ہمارے حق میں ایسا ہی مضر اور مخدوش ہوگا جیسا جمہوری دستور کا اختیار کرنا۔ بہت کم ہندوستانی شوہر یہ بات روا رکھیں گے کہ میاں دفتر میں کام کریں یا روٹی کمانے کی فکر میں مشغول ہوں اور بی بی اپنے کسی مرد دوست کے ساتھ سنیما جائیں یا سیر و تفریح میں وقت گزاریں۔ لیڈی رضا علی کی تربیت مغربی طریقہ کی ہوئی تھی۔ مگر میری عدم موجودگی میں مرحومہ اپنے کسی مرد دوست سے نہ ملتی تھیں۔ بے پردگی اور بے حیائی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ حیا عورت کا قدرتی زیور ہے جس کی خوبی میں ڈولی اور پالکی اور برقع کے ملمع سے کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ نہ حیا نہ سورج کو دیکھنے۔ تازہ ہوا میں سانس لینے اور اون اعلیٰ اوصاف اور دماغی قوتوں کو درجۂ تکمیل تک پہونچانے کی جد و جہد کرنے میں جو آفرینشِ عالم کی غرض معلوم ہوتی ہے حیا میں کوئی کمی واقع ہو سکتی ہے۔ پردہ میں بڑا نقصان یہ ہے کہ غریب یا متوسط درجہ کے آدمی کی لڑکیاں اوس تعلیم سے محروم رہ جاتی ہیں جو ان لڑکیوں کے اپنے بھائی حاصل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ تعلیم محض کتابیں پڑھ لینے کا نام نہیں ہے۔ کسی دار العلوم (یونیورسٹی) کی ڈگری سے وہ علم اور تجربہ کہیں زیادہ مفید اور قابل قدر ہے جو دنیا کو آنکھیں کھول کر دیکھنے۔ ملنے جلنے اچھے کاموں سے سبق اور خراب کاموں کے خطرناک نتائج سے عبرت حاصل کرنے میں ہوتا ہے۔ باوجود ناقص تعلیم کے شہنشاہِ اکبر کا شمار دنیا

کے جلیل القدر اور نام ور بادشاہوں میں ہے اور رہے گا۔ بعض اوقات مجھے خیال ہوتا ہے کہ اگر اکبر کو بھی گھر کی چہار دیواری میں اوسی طرح بند کر دیا جاتا جس طرح اب سے چالیس پچاس برس پہلے شریف اور معزز خاندانوں کی لڑکیاں تربیت پاتی اور زندگی بسر کرتی تھیں تو مغلیہ دور کی تاریخ کے ایک زرین باب کے لکھے جانے کی نوبت کبھی نہ آتی۔ اکبر اعظم کی زندگی کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر موقعے حاصل ہوں تو بغیر اعلیٰ تعلیم پائے بھی انسان بہت کچھ کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر لڑکی یا لڑکا اکبر اعظم نہیں ہو سکتا۔ مگر اس مغلیہ تاج دار کے کم علمی کے باوجود تھوڑا سا تجربہ حاصل کرنے کے بعد جو جو کارہائے نمایاں کئے اوس سے لڑکیاں اور لڑکے ہر ہر گاؤں۔ قصبے یا شہر میں فرض شناسی مستعدی۔ درگذر اور قوت عمل کا سبق سیکھ سکتے ہیں۔ پردہ کے بارے میں میری جو رائے ہے اوس سے حمزہ اور انور واقف ہیں۔ مگر جب دونوں اس رسم سے راضی ہیں تو مجھے قاضی بننے یا اون دونوں کو اپنی رائے سے متاثر کرنے کا ہرگز حق نہیں ہے۔ بیگم صاحبہ مرحومہ نے بھی پردہ اپنی آزاد مرضی سے چھوڑا تھا۔ میں نے اس معاملہ میں کبھی اون سے اصرار نہیں کیا۔ میری زندگی پر جو اثر لیڈی رضا علی مرحومہ نے ڈالا اوس کا تذکرہ کسی دوسری جگہ کیا جائے گا۔ یہاں اتنا کہنا کافی ہے کہ میں مرحومہ کو "میری سیتا" کہا کرتا تھا۔

ساس بہو کے تعلقات مغربی ملکوں میں

ہندوستانیوں اور انگریزوں میں معاشرتی (سوشیل) تعلقات کم ہونے سے ہمارے ملک میں عام خیال یہ ہے کہ انگریزوں میں ساس بہو کے جھگڑے نہیں ہوتے۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے اتنا ضرور سچ ہے کہ انگریزوں میں ساس بہو کے علیحدہ علیحدہ رہنے سے یہ جھگڑے کم ہوتے ہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان تمام جھگڑوں کی جڑ دو باتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہمارے ملک میں عموماً بیٹا شمع ہوتا ہے اور ماں پروانہ۔ بیوی کے آجانے سے ایک ہی معشوق کے دو عاشق ہو جاتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ماں کی محبت اور طرح کی ہوتی ہے

اور بیوی کی محبت اور طرح کی۔ مگر قانونِ قدرت پر انسان فتح حاصل نہیں کر سکتا۔ رشک کا مادہ محبت کی جان ہے۔ بہو کے آجانے سے ساس کو رشک پیدا ہوتا ہے۔ کہ لو مطلوب کا طالب میرے سوا ایک اور پیدا ہو گیا۔ بھلا ماں کو یہ کب گوارا ہو سکتا ہے کہ اوس کے جیتے جی بیٹے کو کوئی اور اپنا لے۔ مغربی ممالک میں ماں کے اس رشک سے زیادہ بدمزگی اس لئے پیدا نہیں ہوتی کہ بیٹے کی شادی کے بعد رسم و رواج کی بہ موجب ماں کا درجہ عاشق نمبر ایک سے گھٹ کر عاشق نمبر دو کا رہ جاتا ہے۔ یوروپ میں عاشق نمبر ایک بننے کا حق بہو ہی کو حاصل ہے۔ اس کے باوجود مغرب میں بھی ساس بہو کے تعلقات بسا اوقات خوش گوار نہیں ہوتے۔ جنوبی افریقہ میں میرے ایک دوست ڈچ نسل کے ہیں۔ اون کی قابلیت کا سارے ملک میں شہرہ ہے۔ بہت بڑے عہدہ پر ممتاز ہیں۔ ماں سے اون کو بھی ایسی ہی محبت ہے جیسی مجھے اپنی ماں سے تھی۔ موصوف کی عمر اڑتالیس سال کے قریب ہے۔ اب تک شادی محض اس لئے نہیں کی کہ ممکن ہے بیوی اور ماں میں نہ بنے۔ اون کی ماں بڑے دبدبہ اور طنطنہ کی خاتون ہیں۔ بہو آنے کی صورت میں دونوں کا نباہ ہونا یقیناً مشکل ہو گا۔ عام خیال یہ ہے کہ جب تک ماں زندہ ہیں میرے دوست شادی نہ کریں گے۔ آئے دن کے جھگڑے پیدا ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ساس بہو دونوں ایک ہی گھر میں رہتی ہیں۔ ایک گھر کا انتظام ایک ہی شخص کے ہاتھ میں رہ سکتا ہے۔ جہاں ایک گھر میں دو ایسے آدمی ہوں جن میں سے ہر ایک گھر کا انتظام کرنا اپنا استحقاق سمجھتا ہو وہاں بدمزگی پیدا ہونا لازمی ہے مغرب میں بہو ساس کے یہاں یا ساس بہو کے یہاں مہمان داخل جاتی ہے۔ اگر دونوں ایک ہی گھر میں رہیں تو وہاں بھی جوتیوں میں دال بٹے۔

ساس کی نظم اور میرا تصرف

میری قرابت دار ایک خاتون ہیں جو رشتہ میں بڑی اور عمر میں مجھ سے چھوٹی ہیں۔ چار برس ہوئے بڑے ارمانوں سے بیٹے کا جو میٹریکیولیشن پاس ہے بیاہ رچایا۔ کچھ دنوں بعد میں نے سنا کہ بہو سے ناراض

ہیں۔ دو برس ہوئے میری رشتہ دار سخت بیمار ہوئیں تو میں اونھیں دیکھنے گیا۔ میں سمجھا تھا کہ کچھ دیر مجھ سے باتیں کرکے اون کا جی بہلے گا۔ وہاں رنگ ہی اور دیکھا۔ بہو کا دُکھڑا مجھ سے لے بیٹھیں۔ ذرا ذرا سی بات کو اس تفصیل سے بیان کرتی تھیں کہ سننے والے کو جماہیاں آنے لگیں حاصل کلام یہ تھا کہ اس عہد میں اون سے زیادہ مظلوم اور بہو سے زیادہ ظالم کوئی نہیں ہے بہو کی ہجو میں نظمیں بھی لکھی ہیں۔ علالت کے باعث خود لکھنے سے معذور ہیں۔ مگر جو سامنے آجائے اوسے حکم ہوتا ہے کہ بیٹھو یہ نظم لکھ لو۔ بہت سی ہجائیہ نظمیں اونھیں زبانی بھی یاد تھیں۔ مجھے پڑھ کر سنائیں۔ غالباً مجھ سے داد چاہتی تھیں۔ مجھے دو دشواریوں کا سامنا تھا ایک تو ساس بہو کے جھگڑے میں دخل دینا بڑی نادانی ہے۔ دوسری دقت یہ تھی کہ اون کی بہو بھی میری رشتہ دار ہے۔ ساری داستان سن کر میں نے یہ رائے قایم کی کہ بہو بے وقوف ہے اور ساس زود رنج۔ بہو کی ہجو میں اشعار لکھ کر مجھے بھیجا کرتی تھیں۔ سال بھر ہوا بہو کی شکایت میں ایک نظم لکھ کر مجھے بھیجی۔ جواب میں اون کے شعروں میں اُلٹ پھیر کرکے میں نے حسب ذیل دو شعر اون کو لکھ بھیجے۔ تب سے شکایتی خطوط اور ہجو کی نظموں کی آمد بند ہے ؎

کیا لڑکی نے خود بیاہ کا پیغام دیا تھا بیٹے نے تو شادی کا تقاضہ نہ کیا تھا

انسان ہے اوس کے بھی تو ماں باپ ہیں بہن ہے لونڈی نہیں باندی نہیں بیٹے کی دولہن ہے

ہمارے ملک میں ساس بہوؤں کے جھگڑے کے انسداد کی میری سمجھ میں صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ کسی لڑکے کو ماں کے کہنے سے اوس وقت تک شادی نہ کرنا چاہیئے جب تک لڑکا خود اپنا اور اپنی بیوی کا خرچ اوٹھانے کے قابل نہ ہو جائے۔

میرے سہارن پور کے قیام کے زمانہ میں والد صاحب بھی ۱۹۰۴ء کے آخر یا ۱۹۰۵ء کے شروع میں سہارن پور تشریف لائے تھے۔ موصوف کے دوستوں کی سہارن پور میں کافی تعداد تھی۔ اس کے علاوہ اون کو پھلوں بالخصوص آموں کا بہت شوق تھا۔ بہت سا وقت دوستوں سے ملنے جلنے یا پھلوں اور مختلف آموں کے حالات دریافت کرنے میں صرف فرماتے تھے۔ ۱۹۰۵ء کے وسط میں

جج خفیفہ دہرہ دون کے منصرم نے پنشن پر جانے کے قبل ایک سال کی رخصت لی۔ ایونس صاحب نے اس جگہ پر میرا تقرر کیا اور میں نے منصوری جا کر منصرمی کا چارج لے لیا۔ والدہ صاحبہ اور بیگم رضا علی کچھ دن پہلے سہارن پور سے کندرکھی چلی گئی تھیں۔ میں چاہتا تھا کہ بیگم رضا علی کو منصوری بلاؤں۔ میری بچی ہاجرہ خاتون کی عمر اوس وقت ایک سال کے قریب تھی اور کندرکھی کی گرمی اوس کے لیئے باعث تکلیف تھی۔ مگر میری تن خواہ میں اتنی گنجائش نہ تھی کہ منصوری میں مکان کرایہ پر لے سکتا۔ میں خود کچہری کی عمارت میں دو کمروں میں رہتا تھا۔ مگر وہاں پردے کا انتظام نہ تھا اور میری بی بی اوس وقت تک پردہ کرتی تھیں۔ یہ ممکن تھا کہ جن کاروباری آدمیوں کے مقدمات کثرت سے عدالت میں رہتے تھے اون میں سے کسی سے ایک مکان لنڈھور میں سستے کرایہ پر لے لوں۔ مگر اول تو مجھے لنڈھور کی سکونت پسند نہ تھی۔ لنڈھور کے بیرڑوں کی کابک جیسے چھوٹے چھوٹے مکانات مجھے پسند نہ تھے۔ دوسری دشواری یہ تھی کہ کسی اہل معاملہ کا کرایہ دار ہونا مجھے منظور نہ تھا۔ وہ کرایہ میں میرے ساتھ ضرور رعایت کرتا۔ مگر یہ رعایت میرے لئے ارزاں بقیمت وگراں بہ علت ثابت ہوتی۔ لالہ منسارام لنڈھور کا اپنا ایک اچھا مکان پندرہ روپے ماہوار کرایہ پر مجھے دینے کے لئے تیار تھے۔ مگر اون کے اکثر معاملات عدالت میں رہتے تھے میں نے مکان لینے سے انکار کر دیا۔ اکتوبر ۱۹۰۵ء میں جب خفیفہ کی کچہری مستقل چھ مہینے کے لئے دہرہ دون گئی تو میں نے نئی بستی میں داروغہ عبدالاحد خاں کے دو مکانات پندرہ روپیہ ماہوار کرایہ پہ لئے اون میں ایک مکان زنانہ تھا اور دوسرا مردانہ۔ یہ مکانات خفیفہ کی کچہری سے صرف ایک فرلانگ کے فاصلہ پر واقع تھے میں اکتوبر کے آخر میں والدہ صاحبہ اور بیگم رضا علی کو لینے کندرکھی گیا۔ مگر والدہ صاحبہ نے دہرہ دون جانا پسند نہ کیا۔ بیگم رضا علی کی دادی اوس وقت زندہ تھیں۔ میں اون بزرگ بی بی کا ہمیشہ احسان مند رہوں گا کہ اونھوں نے وقت کے دقت والدہ صاحبہ کے انکار کرنے پر بیگم رضا علی کے ساتھ دہرہ دون جانا خوشی سے منظور کیا۔ دہرہ دون میں ہمارا قیام نہایت خوش گوار رہا۔ دہرہ میں جاڑے کا موسم بڑا

اچھا ہوتا ہے۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ تک رات کے وقت انگیٹھی جلانے کی ضرورت پڑتی ہے۔

ولی عہد برطانیہ کی علی گڈھ میں آمد

سنہ ۱۹۰۶ء کے شروع میں شہزادی ویلز سیاحت کے لئے دہرہ دون آئی تھیں۔ ہز رائل ہائی نس پرنس آف ویلز نے جو سنہ ۱۹۱۰ء میں شہنشاہ جارج پنجم ہوئے مع شہزادی ویلز کے سنہ ۱۹۰۵ء کے موسم سرما میں ہندوستان کا دورہ کیا تھا منصوری بہت خوب صورت جگہ ہے مشہور ہے کہ منصوری کو پہاڑی آبادیوں کی ملکہ ہونے کی عزت حاصل ہے۔ شہزادی ویلز کا پہاڑی آبادیوں کی ملکہ کے درشن کے لئے آنا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ پرنس آف ویلز اور شہزادی صاحبہ ہز ہائی نس آغا خاں کے اثر کے باعث ۸ مارچ سنہ ۱۹۰۶ء کو علی گڈھ کالج کے معائنہ کے لئے بھی تشریف لائے تھے۔ بیگم رضا علی کے اصرار سے میں بھی اوس موقع پر علی گڈھ گیا تھا۔ کالج کے دوستوں۔ بہی خواہوں اور پرانے طالب علموں کا بڑا بھاری اجتماع تھا شہزادہ صاحب اور شہزادی صاحبہ علی گڈھ تشریف لائے۔ بڑا زبردست خیر مقدم ہوا۔ گھومے پھرے سب کچھ دیکھا بھالا۔ کالج کے ٹرسٹیوں کے ساتھ لنچ کی دعوت کھائی اور شام کو (اوس موسم میں ساڑھے چار بجے شام ہوتی تھی) روانہ ہو گئے۔ رات کے وقت اسٹریچی ہال میں بڑا بھاری ڈنر تھا۔ ڈنر کے بعد محسن الملک نے جو تقریر کی وہ اس قابل تھی کہ اوس کا ایک ایک حرف لکھا جاتا۔ تقریر میں سر سید علیہ الرحمۃ کی عظمت و شان کا بیان تھا۔ اون کے رفیقوں اور ساتھیوں کی مساعی جمیلہ کا ذکر تھا۔ گورنمنٹ کے احسانات کا مع اظہار تشکر اعتراف تھا۔ والیان ملک اور بزرگانِ ملت کی بیش بہا امداد اور سر سید کی وفات کے بعد کالج کو یونیورسٹی کے درجہ تک پہونچانے کے جوش کی جو لہر ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑی تھی اوس کا فخریہ اظہار کرنے کے بعد آغا خاں نے جو مدد کالج کی دامے درمے سخنے قلمے کی تھی اوس کا فوٹو بڑی آب و تاب سے کھینچا۔ آغا خاں ڈنر میں موجود تھے اور محسن الملک کی برابر دائیں طرف بیٹھے ہوئے تھے۔ مسلمان یاد رکھیں یا نہ یاد رکھیں۔ مگر حقیقت یہ ہے

کہ بغیر آغا خاں کی امداد کے کالج کی مالی حالت کبھی اس قابل نہ ہوتی کہ وہ یونیورسٹی کے درجہ کو پہونچ سکتا۔ جو بے نظیر خدمت آغا خاں نے کالج کی کی تھی اور جس طرح اپنے ذاتی اثر کو کام میں لاکر موصوف نے اوس شہنشاہ کے بیٹے اور ولی عہد کو جس شہنشاہ کی حکومت ربع عالم پر ہے سر سید کے علمی جہاد کے نتائج کی زیارت کے لئے علی گڈھ کھینچ بلایا۔ یہ سارا مضمون اس قابل تھا کہ علی گڈھ والے اور علی گڈھ کے ہم درد اوسے نہایت شوق سے سنیں۔ مگر محسن الملک کی سحر بیانی نے بقول غالب۔ مصرعہ۔

ذکر اوس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

وہ سماں باندھا جس کو وہ حضرات تمام عمر نہیں بھول سکتے جو اوس دعوت میں موجود تھے ــــ محسن الملک کی عظمت کو دیکھئے سب کو سراہا۔ سب کی تعریف کی۔ مگر اپنی جلیل القدر خدمات کے بارہ میں ایک لفظ بھی اشارۃً یا کنایۃً نہیں کہا۔ تقریر کے دوران میں موقع بہ موقع تالیوں کی گونج کے باعث محسن الملک کو ایک ایک منٹ تک خاموشی اختیار کرنی پڑتی تھی۔ اپنا ذکر صرف اتنا کیا کہ آخر میں آغا خاں کی طرف مخاطب ہو کر یہ شعر پڑھا اور بیٹھ گئے۔ شعر

نہ می گویم دریں گلشن گل و باغ و بہار از من
بہار از یار و باغ از یار و گل از یار و یار از من

ترجمہ: "مجھے یہ کہنے کی جرأت نہیں ہو سکتی کہ اس باغ کے پھول۔ چمن اور بہار میری وجہ سے ہیں۔ پھول محبوب کی بہ دولت ہیں۔ چمن محبوب کی بہ دولت ہے۔ بہار محبوب کی بہ دولت ہے اور محبوب میرے دم سے ہے۔"

جہاں جہاں مصرعہ ثانی میں از یار کے الفاظ ہیں اون کو پڑھ کر آغا خاں کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے جاتے تھے اور جب یار از من پڑھا تو اپنے دہنے ہاتھ سے اپنا سینہ ٹھونکا۔ از من کے الفاظ زبان سے ابھی پورے نکلے بھی نہ تھے کہ تالیوں کا وہ شور بلند ہوا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اسٹریچی ہال کی چھت اوڑ جائے گی۔ میں نے دنیا کے بہت سے بڑے

بڑے مقرروں کو سنا ہے میرے نزدیک محسن الملک کی یہ تقریر موسیو بریاں کی اوس تقریر سے زیادہ زور دار تھی جو موسیو موصوف نے بہ حیثیت وزیر خارجہ دولت فرانس ۱۹۲۹ء کے لیگ آف نیشن کے سالانہ جلسہ میں کی تھی جس پر اون تمام ممالک کے وزرا نے جو جلسۂ مذکور میں موجود تھے موسیو بریاں کے پاس جاکر بڑی گرم جوشی سے اون سے ہاتھ ملایا تھا اور دلی مبارکباد دی تھی۔

۱۹۰۶ء کا شملہ ڈیپوٹیشن جنوری ۱۹۰۶ء میں امیر حبیب اللہ خاں مرحوم کی کالج میں تشریف آوری کا تذکرہ میں کسی دوسرے باب میں کرچکا ہوں یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو مسلمانان ہند کے نامی لیڈروں کا جو ڈیپوٹیشن لارڈ منٹو وائسرائے ہند کی خدمت میں بمقام شملہ پیش ہوا وہ محسن الملک کی زندگی کا سب سے بڑا سیاسی کارنامہ ہے برادران وطن طعنہ زن تھے اور اب بھی کہنے سے نہیں چوکتے کہ وہ ڈیپوٹیشن گورنمنٹ کے اشارہ سے مرتب کیا گیا تھا۔ لطف تو یہ ہے کہ بعض سادہ دل مسلمان بھی اس بات میں برادران وطن کے ہم نوا معلوم ہوتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے مان لیجئے کہ یہ اعتراض صحیح ہو تو بھی غریب مسلمان کس طرح مورد الزام قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ جیسا میں نے کسی دوسری جگہ کہا ہے۔ برادران وطن نے جن کی سب سے بڑی سیاسی انجمن انڈین نیشنل کانگریس تھی کبھی مسلمانوں کو منھ لگایا نہ مسلمانوں کے معروضات پر توجہ کی۔ جوں جوں پولٹیکل حقوق ملتے گئے۔ برادران وطن اون کو ہڑپ کرتے گئے کبھی بھولے سے بھی اون کو یہ خیال نہ ہوا کہ بدنصیب مسلمان بھی اس ملک میں رہتے ہیں۔ ہمارے صوبہ کی میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کو ۱۹۰۳ء تک صوبہ کی کونسل کے چند ممبروں کو منتخب کرنے کا حق حاصل تھا۔ مگر اونھوں نے کبھی کسی مسلمان ممبر کا انتخاب نہیں کیا۔ غالباً ۱۸۹۹ء یا ۱۹۰۱ء میں صوبہ کی کونسل نے ممتاز الدولہ نواب فیاض علی خاں صاحب کو انڈین لیجسلیٹو کونسل کا ممبر ضرور منتخب کیا تھا۔ مگر اس کی وجہ یہ تھی

---

[1] موسیو فرانسیسی زبان کا القاب ہے جو نام کے پہلے اوسی طرح استعمال ہوتا ہے جیسے انگریزی میں لفظ مسٹر۔

کہ آنریبل بابو سری رام صاحب اور آنریبل راجہ رام پال سنگھ صاحب دونوں میں سے ہر ایک کو اپنے اپنے انتخاب پر زبردست اصرار تھا۔ اس باہمی کش مکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہ لفحوائے۔ قرعۂ فال بہ نامِ من دیوانہ زدند۔ دونوں حضرات نواب فیاض علی خاں صاحب کو انڈین لیجسلیٹو کونسل میں بھیجنے کے لئے با دلِ ناخواستہ راضی ہو گئے۔ نواب صاحب اس وقت دنیا میں موجود نہیں ہیں اور مصرعہ

خدا مجنوں کو بخشے مر گیا اور ہم کو مرنا ہے

نواب صاحب بہت بڑے زمیں دار اور ذی وجاہت بزرگ تھے۔ مگر انگریزی کا ایک لفظ نہیں جانتے تھے۔ پولٹیکل معاملات میں آزادیٔ طبع کی یہ رفتار تھی کہ سر انٹالی میکڈانل مسلمانوں کے حقوق کے پامال کرنے والے جیسے لفٹنٹ گورنر کی توسیع میعاد کی تحریک اونھوں نے اوٹھائی تھی۔ ملک کی کسی ہائی کورٹ میں کوئی مسلمان جج اوس وقت موجود نہ تھا۔ میں برادرانِ وطن اور نادان مسلمان بھائیوں سے بہ ادب دریافت کرتا ہوں کہ ایسی صورت میں اگر مسلمانوں نے اپنے حقوق کا تحفظ چاہا اور تھوڑی دیر کے لئے مان لیجئے کہ حکومت کی بھی یہ خواہش تھی کہ مسلمان اپنی حق طلبی کریں تو کیا گناہ کیا۔ ہر کہ بر خود نہ پسندی بدیگراں هم مپسند۔ ایسا سچا مقولہ ہے جس کے ہر ہر لفظ میں سیکڑوں برس کا تجربہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ کیا میں بہ ادب یہ دریافت کرنے کا حق نہیں رکھتا کہ اگر ملک میں تین چوتھائی مسلمان اور ایک چوتھائی ہندو ہوتے اور ہندوؤں کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جاتا جو مسلمانوں کے ساتھ متواتر تیس چالیس برس تک کیا گیا تو کیا ہندو بھائی گورنمنٹ سے اعانت کے خواہاں نہ ہوتے۔ مسلمانوں کو الزام دینا بڑا آسان کام ہے جس میں نہ ہلدی لگتی ہے نہ پھٹکری مگر برادرانِ وطن اپنے سینوں پر ہاتھ رکھ کر میرے اس سوال کا جواب دیں کہ اگر وہ ہماری جگہ ہوتے تو کیا کرتے۔ شعر

وفا و جور کی اوس وقت قدر ہو معلوم　　　جو تو ہے یار وہ میں ہوں جو میں ہوں تو ہو جائے

مجھے افسوس ہے کہ اس کتاب میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کا پیش کردہ ایڈریس اور لارڈ منٹو کا جواب یہاں درج کرسکوں۔

قل ہو اللہ کا جواب

اس ایڈریس سے متعلق ایک واقعہ غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہو نواب محسن الملک کی فرمائش پر اس ایڈریس کا مسودہ نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی نے جو انگریزی زبان میں اپنے زمانہ کے بہترین مسلمان ادیب تھے تیار کیا تھا۔ محسن الملک کی اس فراخ دلی کو دیکھئے ایڈریس کا مسودہ میرے پاس منصوری بھیج کر مجھے لکھا "مسودہ بھیجتا ہوں اسے غور سے پڑھ لو اور اگر کوئی تبدیلی یا نئی بات تمہارے ذہن میں آئے تو بے تکلف مجھے اطلاع دو۔" مولوی حالی مرحوم نے مقدمہ شعر و شاعری میں ایک قصہ لکھا ہے۔ مولانا صدر الدین آزردہ کے مکان پر ایک روز بعض احباب جن میں مومن اور شیفتہ بھی تھے موجود تھے۔ میر کی مشہور غزل کا یہ شعر پڑھا گیا۔ شعر

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

شعر کی بے انتہا تعریف ہوئی اور طے پایا کہ ہر شخص اس قافیہ کو اپنی اپنی پہونچ کے موافق باندھ کر دکھائے۔ ہر شخص کاغذ اور قلم دوات لے کر ایک طرف بیٹھ گیا اور فکر شروع کر دی اتفاق سے ایک دوست آ پہونچے۔ مولانا سے دریافت کیا "حضرت کس فکر میں بیٹھے ہیں مولانا نے کہا قل ھو اللہ کا جواب لکھ رہا ہوں۔"[1] میرے لئے مولوی سید حسین کے مسودہ کو چھونا اوس سے بھی زیادہ دشوار تھا جتنا آزردہ کے لئے میر کے شعر کا جواب لکھنا تھا۔ میں نے جواب میں محسن الملک کا شکریہ ادا کیا اور لکھ دیا کہ کوئی نئی بات یا تبدیلی میری سمجھ میں نہیں آتی۔ ایڈریس کے جواب میں جو تقریر لارڈ منٹو نے کی اوس سے برادران وطن میں کھلبلی مچ گئی۔ آنریبل بابو سری رام صاحب اوس زمانہ میں ہمارے صوبہ کی طرف سے انڈین لیجسلیٹو

---

[1] دیکھو مقدمہ شعر و شاعری مصنفہ شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی مطبوعہ الناظر پریس لکھنؤ صفحہ ۱۰

کونسل کے منتخب شدہ ممبر تھے۔ موصوف سے میری پہلے کی شناسائی تھی۔ شروع اکتوبر میں موصوف سے منصوری میں ڈیپوٹیشن کے بارہ میں بات چیت ہوئی۔ وہ شملہ کے ڈیپوٹیشن اور لارڈ منٹو کے جواب کو ملک کے لئے نہایت مضر سمجھتے تھے۔ میں سرکاری ملازمت کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا تاہم میں نے دبی زبان سے کہا۔ "لارڈ منٹو کے جواب کے نتائج سے زیادہ قابل افسوس بات یہ ہے کہ حالات نے ایسی نازک صورت اختیار کرلی ہے کہ مسلمانوں کو گورنمنٹ سے اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے درخواست کرنی پڑی۔" اس بحث کو ختم کرنے کے پہلے ایک بات اور ہے جس کو صاف کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ جداگانہ قوم ہونے کا احساس مسلمانوں کو ۱۹۰۹ء میں انتخاب جداگانہ مل جانے کے بعد پیدا ہوا۔ یہ رائے صحیح نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غدر فرو ہونے اور ۱۸۸۵ء میں کانگریس قایم ہونے کے درمیان جو زمانہ گزرا اوس زمانہ میں برادرانِ وطن کے رنگ ڈھنگ سے مسلمانوں کو یہ احساس ہونے لگا کہ وہ ایک علیحدہ قوم ہیں۔ جن کے طور طریقے۔ مذہب۔ تاریخی روایات اور ضرورتیں جداگانہ ہیں۔ سرسید احمد خاں نے اپنی مختلف تحریروں اور تقریروں میں اس خیال کا اظہار کیا ہے۔ خود ۱۹۰۶ء کے ایڈریس میں مسلمانوں کی جداگانہ قوم ہونے کا تذکرہ نہایت روشن طور سے کیا گیا ہے۔ برادرانِ وطن کا یہ خیال ہرگز صحیح نہیں ہے کہ مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا احساس نیابت جداگانہ کا نتیجہ ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خود نیابتِ جداگانہ اوس روز افزوں احساس کا نتیجہ ہے جو مسلمانوں کو اپنے علیحدہ قوم ہونے کے بارہ میں کم از کم کانگریس کے قایم ہونے کی تاریخ سے پیدا ہوا۔

جداگانہ نیابت مرض نہیں علامت ہے

نیابت جداگانہ بجائے خود مرض نہیں ہے بلکہ اوس مرضِ مغائرت کی علامت ہے جس میں برادرانِ وطن کی سرد مہری اور غلبہ حاصل کرنے کی خواہش نے سارے ملک کو مبتلا کردیا ہے۔ علامت کو مستقل مرض سمجھنا اور اصل مرض کی طرف مطلق توجہ نہ کرنا بلکہ مرض کے

وجود سے انکار کرنا بڑی نا عاقبت اندیشی اور نادانی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ جب تک کانگریس والوں کی ذہنیت میں اصولی تبدیلی نہ ہوگی لیگ اور کانگریس کے درمیان کسی مفاہمت کا ہونا ایسا ہی دشوار ہے جیسا شمالی آئرلینڈ اور حکومت ایرا۔ (آئرلینڈ کا وہ حصہ جس کا مذہب کیتھولک ہے) کا مل جل کر سارے آئرلینڈ کے لئے ایک دستور اساسی قائم کرنا۔ ہم باعزت مفاہمت کے لئے جیسی دو برابر والوں میں ہوتی ہے تیار ہیں۔ مگر ہرگز ایسا سمجھوتہ نہیں چاہتے جس کا سنگ بنیاد کانگریس یا کسی اور سیاسی انجمن کی برتری اور ہماری کمتری ہو۔ ساری بات یہ ہے کہ ہم برابری چاہتے ہیں۔ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اوس کے لحاظ سے کانگریس والے زبان سے نہیں کہہ سکتے کہ ہمارا مطالبہ غلط ہے۔ اوپر کے دل سے ہاں ہاں کہتے ہیں۔ مگر در اصل وہ ہم کو برابر کے حقوق دینا نہیں چاہتے وہ تو ہمیں نوازنا چاہتے ہیں۔ کاش کانگریس والے سمجھتے کہ نوازنے کا دور رخصت ہوا۔ انگریز بھی ہندوستانیوں کو نوازنا[1] چاہتے ہیں۔ مگر ہندوستانی ان نوازشوں سے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ جب

[1] بزعم خود آج کانگریس نے اپنے کو ملک کی آزادی کا اجارہ دار قرار دے رکھا ہے۔ مسلمانوں نے اس بارہ میں جو جد و جہد کی ہے اوس کا ایک حرف زبان پر نہیں آتا۔ مولانا حالی کا ایک شعر سنیئے۔ مولانا نے انگریزوں کو خطاب کرتے ہوئے انگریزی حکومت کے اصلی چہرہ کو ان لفظوں میں بے نقاب کیا تھا۔ شعر

روسی ہوں یا تتاری ہم کو ستائیں گے کیا ... دیکھا ہے ہم نے برسوں لطف و کرم تمہارا

الفاظ لطف و کرم کی جامعیت ملاحظہ کیجئے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ شعر کانگریس کی پیدائش کے پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ کیا کانگریس کے کسی پریزیڈنٹ نے ایسی کھری بات ۱۹۱۹ء کے پہلے کبھی کہی تھی۔ مگر رائے سازی (پروپیگنڈا) کا زمانہ ہے۔ کانگریس والے جانتے ہیں کہ غلط بات کو بار بار رٹنے اور رٹوانے میں وہ طاقت ہے کہ بسا اوقات راست بازی اور حق کی قوت اوس سے عارضی طور پر مغلوب ہو جاتی ہے اگر ہمارا ملک کبھی آزاد ہوا اور آزادی کی سچی تاریخ لکھی گئی تو معلوم ہو جائے گا کہ حقیقی آزادی کا متمنی کون تھا اور آزادی کا نام بیچ میں لاکر سودا کون چکانا چاہتا تھا۔

کوشش میں انگلستان جیسی زبردست حکومت کو ناکامیابی ہوئی اوس میں ہمارے خلاف ہمارے
کانگریسی بھائیوں کو کامیابی ہوگی۔ میری ناچیز رائے میں۔ مصرعہ

ایں خیال است ومحال است وجنوں

ہم مفاہمت اور دوستی کے لئے تیار ہیں۔ مگر نوازے جانے پر کبھی راضی نہیں ہوسکتے۔ ۱۹۰۶ء
کے ایڈریس کا وہ فقرہ جس کا ذکر ابھی میں نے کیا ہے حسب ذیل ہے۔

"یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ہم مسلمان ایک جُدا فرقہ[1] ہیں اور عرصہ دراز سے ہماری
فلاح و بہبود کے مسائل ایسے رہے ہیں جن میں کبھی دوسرے فرقوں کا اشتراک نہیں رہا اور
مذکورۂ بالا مسائل کو اب تک اس وجہ سے نقصان پہونچا ہے کہ اون کو مؤثر طریقہ پر گورنمنٹ
کے سامنے پیش کرنے کا موقع ہم کو نہیں ملا۔ نوبت یہاں تک پہونچ گئی ہے کہ اون صوبوں
میں بھی جہاں مسلمانوں کی آبادی اکثریت میں ہے بالعموم اون کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جاتا
ہے گویا وہ آبادی کے ناقابل لحاظ اور مختصر اجزا ہیں۔ جن کے ساتھ بغیر انصاف کا خون کئے
تغافل برتا جاسکتا ہے۔ اس قسم کا برتاؤ ایک حد تک پنجاب میں اور بڑی نمایاں حد تک سندھ
اور مشرقی بنگال میں عرصہ دراز سے اب تک ہو رہا ہے۔"

روزہ کی تاریخ سہارن پور کے قیام تک میں رمضان شریف کے پورے روزے رکھتا
تھا۔ منصوری جاکر بھی کچھ دن تک اس وضع کو نباہا۔ مگر پہاڑ پر رہ کر بھوک
خوب لگتی ہے۔ ٹھالی آدمی ہو تو دوسری بات ہے کسی نہ کسی طرح دن کاٹ دے۔ یہاں یہ
حالت تھی کہ دن کے سات گھنٹے مجھے کام کرنا پڑتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے گنڈے دار
روزے رکھنے شروع کردئے۔ اوسی زمانہ میں ایک دن روزہ رکھا اتفاق کی بات کہ بارش
ہوئی اور خوب ٹھنڈ ہوگئی۔ میرا طریقہ بہت زمانہ سے یہ ہے کہ جتنے روزے رکھنے ہوں بغیر سحری
کھائے رکھتا ہوں۔ سوتے وقت چائے کی دو پیالیاں البتہ پی لیتا ہوں اوس روز دوپہر سے

---

[1] سرسید ایسے موقعوں پر ہمیشہ قوم کا لفظ استعمال کرتے تھے۔

آنتوں نے قل ھو اللہ پڑھنا شروع کر دی تعطیل کا دن تھا ایک دوست ملنے آگئے میں نے روزہ بہلانے کی غرض سے شطرنج کی بازی جمائی حسبِ معمول چال میں غور و خوض کے بعد چلتا تھا دو بازیاں کھیلیں یہ تو یاد نہیں رہا کہ کون جیتا اور کون ہارا۔ مگر اتنا جانتا ہوں کہ سہ پہر کو میرے سر میں اس شدت کا درد ہوا کہ آج تک یاد ہے۔ خیر جوں توں کرکے شام پکڑی۔ دوستوں سے بھوک کی تکلیف اور روزہ بہلانے کی غرض سے درد سر مول لینے کا حال بیان کیا۔ منشی ارتضیٰ علی اوس زمانہ میں دہرہ دون میں آب کاری کے انسپکٹر تھے۔ کاکوری جیسے مردم خیز خطّہ کے رہنے والے تھے۔ شعر خوب کہتے تھے۔ موصوف نے روزہ رکھنے کے واقعہ کو منظوم کیا اور مادہ تاریخ بھی نکالا۔ نظم تو یاد نہیں رہی۔ مگر آخری مصرعہ یہ تھا۔ مصرعہ

پئے تاریخ پوچھا کیا رضا کا پہلا روزہ ہے

الفاظ "کیا رضا کا پہلا روزہ ہے" سے ۱۳۲۴ھ نکلتے ہیں۔

انگریزوں اور ہندوستانیوں کے سوشیل تعلقات

مسٹر ایل۔ جی۔ ایونس عرصہ تک علی گڈھ میں ڈسٹرکٹ و سیشن جج رہے تھے اون کے بھائی مسٹر ایچ۔ ایف۔ ایونس سر انٹانی میکڈانل کی لفٹنٹ گورنری کے زمانہ میں چیف سکرٹری تھے اور عام خیال یہ تھا کہ لاٹ صاحب پر اون کا اثر ہے۔ مسٹر ایل۔ جی ایونس بڑے شریف طبع انگریز تھے۔ ایک واقعہ قابل تذکرہ ہے جس سے معلوم ہوگا کہ بیسویں صدی عیسوی کے شروع میں انگریزوں اور ہندوستانیوں کے تعلقات کیا تھے۔ میری طالب علمی کے زمانہ میں عام طور پر علی گڈھ میں یہ مشہور تھا کہ انڈین سول سروس کے انگریز افسروں میں جو اوس زمانہ میں علی گڈھ میں تعینات تھے مسٹر ایل۔ جی۔ ایونس ہی تنہا ایسے انگریز عہدہ دار تھے جو نواب محسن الملک سے بازدید کی ملاقات کے لئے آئے تھے۔ اوس زمانہ میں کلکٹر اور جج جیسے عہدہ دار ممتاز اور مشہور ہندوستانیوں کے مکان پر بازدید کی ملاقات کے لئے جانا نہ صرف غیر ضروری بلکہ اپنے لئے سبکی کا باعث سمجھتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ علی گڈھ کالج کے انگریز پروفیسر

طلبا سے ملنے جلنے میں وہ رکھ رکھاؤ اور تکلف نہ برتتے تھے جس کا اظہار انگریز افسر ہندوستانیوں سے ملنے جلنے میں عموماً کرتے تھے۔ انگریز پروفیسروں کے اس طریق عمل سے علی گڈھ کے طلبا کو یقیناً بہت فائدہ پہونچا۔ تاہم یہ سمجھنا درست نہ ہوگا کہ علی گڈھ تحریک کے نامور حضرات اور انگریز پروفیسروں کے درمیان سوشل تعلقات میں کسی طرح کی بے تکلفی تھی ۱۹۰۵ء میں نواب محسن الملک نے ایک موقع پر خود مجھ سے کہا تھا "تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں مارلین صاحب اور اون کی میم لنچ پر بلا لیتے ہیں۔ مجھے تو آج تک مارلین صاحب یا اون کی میم نے اپنے یہاں کھانے پر مدعو نہیں کیا" محسن الملک ایسے عالی حوصلہ اور اولی العزم شخص تھے کہ ممکن ہے بعض حضرات کو اون کی زبان سے ایسے الفاظ نکلنے پر تعجب ہو۔ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں تعجب کی کوئی بات نہ تھی۔ محسن الملک عرصہ دراز تک ملک کی سب سے بڑی ہندستانی ریاست میں جلیل القدر عہدوں پر ممتاز رہ چکے تھے اوس دور کے حیدرآباد میں اون انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان جو بڑے عہدوں پر مامور تھے سوشل تعلقات ایسے خوش گوار تھے جس کی مثال ملک کے کسی دوسرے حصہ میں موجود نہ تھی۔ حیدرآبادی زندگی میں محسن الملک انگریزوں کو دعوتیں کھلانے اور اون کے یہاں دعوتیں کھانے کے عادی تھے۔ علی گڈھ آکر اونھوں نے کچھ اور ہی طور طریقے دیکھے۔ یہاں سوشل تعلقات زیادہ تر انگریز پروفیسروں اور طلبا کے درمیان تھے۔ علی گڈھ کی زندگی حیدرآباد کی زندگی سے بہت مختلف تھی۔ ایسی صورت میں مارلین صاحب کی مہمان نوازی یا عدم مہمان نوازی کے بارہ میں محسن الملک نے جو کچھ مجھ سے فرمایا اوسے شکایت نہ سمجھنا چاہیئے۔ بلکہ وہ ایک ایسا اظہار رائے تھا جو روزمرہ کی زندگی میں موقع محل سے ہم سب کرتے ہیں اور جس رائے کے اظہار کا ہر فراخ حوصلہ اور کشادہ دل انسان کو حق حاصل ہے۔

ڈپٹی کلکٹری کی ناکام کوشش ۱۹۰۶ء کے شروع میں مسٹر ایل جی ایولنس سیشن کے مقدمات اور دیوانی کے اپیلوں کی سماعت کے لئے دہرہ دون

آئے۔ جب میں حاضر خدمت ہوا تو مجھ سے معمولی حالات دریافت کرنے کے بعد کہا تم جس جگہ پر نامزد ہو اوس کا شمار محرری کے صیغہ میں ہے۔ تمہارے لئے آئندہ انتہائی ترقی یہ ہے کہ ڈسٹرکٹ جج کے منصرم ہو جاؤ۔ تم جیسے نوجوان کا نصب العین اس سے بالاتر ہونا چاہئے۔ اگر تم پسند کرو تو میں ڈپٹی کلکٹری کے لئے تمہاری سفارش کرنے کو تیار ہوں۔ مسٹر کروک شینک میرے دوست ہیں۔ اون کو میں تمہارے بارہ میں لکھوں گا۔ مسٹر ہارڈی سے بھی میری واقفیت ہے۔ اون کے نام بھی میں تمہیں تعارف کا خط دے سکتا ہوں۔ میں نے جواب دیا اپریل میں ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان ہونے والا ہے۔ میں امتحان کی تیاری کے لئے رخصت لینے والا تھا اگر آپ کی عنایت سے ڈپٹی کلکٹری مل جائے تو میں امتحان میں شریک نہ ہوں۔ فرمانے لگے میں کوشش کروں گا اگر ڈپٹی کلکٹری مل جائے بہتر ہے۔ ورنہ دسمبر ۱۹۰۶ء میں ہائی کورٹ کی وکالت کے امتحان میں شریک ہو جانا۔ موصوف نے میری سفارش مسٹر کروک شینک سے کی اور اگست کے مہینہ میں ایک خط میرے پاس مسٹر ہارڈی کے نام بھیجا۔ اور مجھے لکھا کہ مسٹر کروک شینک اور مسٹر ہارڈی دونوں صاحبوں سے جا کر مل لو۔ میں نے اس مشورہ پر عمل کیا۔ اگست کے مہینہ میں الہ آباد جا کر مسٹر ہارڈی سے ملا۔ ملاقات کے وقت جو ٹائی میں لگائے ہوئے تھا وہ بیر بہوٹی جیسی سرخ تھی۔ موصوف نے میری ٹائی کو بہ غور دیکھا جس سے مجھکو پتہ چلا کہ ٹائی کے رنگ کو بہ حیثیت امیدوار وہ میرے اقتضاء حال کے موافق نہیں سمجھتے میں نے ایونس صاحب کا خط پیش کیا۔ معمولی حالات دریافت کرنے اور خط پڑھنے کے بعد ارشاد فرمایا تم منصرم ہو اگر میں تمہارا تقرر ڈپٹی کلکٹری پر کر دوں تو کیا ہائی کورٹ ڈپٹی کلکٹر کو ترقی دے کر ڈسٹرکٹ جج بنانے کے لئے تیار ہو جائے گی۔ اوس وقت تو مجھے پتہ نہ چلا۔ مگر بعد کو معلوم ہوا۔ یہ اشارہ ایک خاص واقعہ کی طرف تھا۔ کچھ عرصہ پہلے صوبہ کی گورنمنٹ نے

لہ و لہ مسٹر کروک شینک اوس زمانہ میں بورڈ آف ریوی نیو کے جونیر ممبر اور مسٹر ہارڈی سینیر ممبر تھے جو لوگ ملازمت میں ہوں اون کی ڈپٹی کلکٹری کے لئے نامزدگی بالعموم بورڈ آف ریوی نیو کرتا تھا۔

ایک کارگزار اور تجربہ کار اور کافی پورانے (سینیر) ڈپٹی کلکٹر کو ہائی کورٹ کی رائے کے خلاف ڈسٹرکٹ وسیشن جج کے عہدہ پر عارضی طور سے مقرر کر دیا تھا۔ ہائی کورٹ نے اس تقرر کے خلاف احتجاج کیا۔ بالآخر یہ معاملہ بصورت استصواب وزیر ہند کے پاس فیصلہ کے لئے بھیجا گیا۔ وزیر ہند اوس زمانہ میں غالباً مسٹر سینٹ جان براڈرک تھے۔ جن کا نام بعد کو لارڈ مڈلٹن ہوا۔ اوںھوں نے طے کیا کہ ڈسٹرکٹ ججی کے عہدہ کے لئے تقرر صیغۂ دیوانی کے کسی حاکم کا ہائی کورٹ کی سفارش پر عمل میں آئے خواہ وہ تقرر مستقل ہو یا عارضی۔ نیز محکمۂ مال کے کسی حاکم یعنی ڈپٹی کلکٹر کو ڈسٹرکٹ ججی کے عہدہ پر ترقی نہ دی جائے۔

جوتے اُتارنے کا مسئلہ

دوسری بات جس کے باعث مسٹر ہارڈی نے غالباً مجھے ڈپٹی کلکٹری کا اہل نہ سمجھا یہ تھی کہ میں انگریزی لباس پہن کر اون سے ملنے گیا تھا۔ میں اوس زمانہ میں معمولاً انگریزی لباس پہنتا تھا اور انگریز افسروں سے ملاقات کے وقت انگریزی رسم و رواج کے موافق ٹوپی اوتار لیتا تھا۔ شہنشاہیت پسند انگریز حکام عام طور پر چاہتے تھے کہ اون کے گھر اور دفتر کا ہندوستانی وہی احترام کریں جو خالق ذوالجلال کے حکم سے حضرت موسیٰ نے وادیٔ ایمن کا کیا تھا۔ یعنی انگریز حاکم کے دیدار کے جو ہندوستانی ملاقاتی خواہش مند ہوں وہ جوتے اوتار کر حاکم مذکور کے گھر یا دفتر میں داخل ہوں۔ عرصہ دراز تک اس مسئلہ کی شمالی ہندوستان میں بہت اہمیت رہی۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جو ہندوستانی

---

[1] مسٹر بیک نے اپنے زمانہ میں اس مسئلہ کا حل یہ چاہا تھا کہ علی گڈھ کے طلبہ مختلف رنگوں کی پگڑیاں باندھ کر درجوں میں آئیں۔ سید صاحب کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو وہ کالج تشریف لائے اور سب لڑکوں کو ایک جگہ جمع کر کے مسٹر بیک کی رائے سے سختی سے اختلاف کیا اور کہا میں ہرگز نہیں چاہتا کہ کالج کے درجوں میں طلبا کی رنگ برنگ کی پگڑیاں چمن کے مختلف رنگ کے پھولوں کے تختوں کا کام دیں۔ تم ہرگز پگڑیاں نہ پہنو۔ بلکہ انگریزوں سے ٹوپی اوتار کر ملاقات کرو۔ آج کانگریس والے جو جی میں آئے کہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے سوشیل تعلقات میں جو برابری حاصل کرنے کی کوشش سید صاحب (بقیہ مضمون صفحہ ۲۲۴ پر) نے

انگریزی لباس پہنتے تھے۔ اون سے بھی انگریز یہ توقع رکھتے تھے کہ ملاقات کے وقت بطور اظہار احترام
وہ جوتے اوتار دیں۔ مسٹر ہارڈی نے زبان سے تو کچھ نہ کہا مگر میرا خیال ہے کہ میرے برہنہ سر کو
(میں لڑکپن سے اب تک سر میں بائیں جانب انگریزی وضع کی مانگ نکالتا ہوں) اونھوں نے
پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا۔ ملاقات کے آخر میں مجھے معلوم ہوگیا کہ موصوف سے مجھے کسی
امداد کی توقع نہ رکھنی چاہیئے۔ مسٹر کروک شینک اوس زمانہ میں نینی تال میں تھے میں اون سے
ملنے نینی تال گیا۔ اگست کے آخر میں جب میں نینی تال پہونچا ہوں بڑی شدت کی بارش ہورہی
تھی۔ میں نے سیوائے ہوٹل اور میٹرا پول ہوٹل میں ٹھیرنا چاہا۔ مگر جواب ملا کہ ہوٹل سب پُر ہے
جگہ نہیں ہے۔ منصوری میں قیام کے باعث مجھے معلوم تھا کہ بالعموم ہوٹل والے یہ جواب ہندوستانی
کو اوس وقت دیتے ہیں جب اوسے ٹھیرانا منظور نہیں ہوتا۔ میں نے ایک یا دو اور ہوٹلوں میں
قسمت آزمائی کی اور بہ درجہ مجبوری آخر میں رائل ہوٹل کے منیجر کے پاس گیا۔ رائل ہوٹل کی
نسبت مشہور تھا کہ وہاں ہندوستانیوں کو ٹھیرنے کے لئے جگہ نہیں ملتی۔ میں نے منیجر سے کہا کہ
میں ایک ضروری کام سے یہاں آیا ہوں۔ بڑے زور کی بارش ہورہی ہے اور اسی حالت
میں نینی تال کے تمام ہوٹلوں کا چکر لگا چکا ہوں۔ ہر جگہ یہی جواب ملتا ہے کہ جگہ نہیں ہے۔ یہ
تو ناممکن ہے کہ کسی ہوٹل میں بھی کوئی کمرہ خالی نہ ہو۔ اگر میرا ہندوستانی ہونا قابل اعتراض ہے
تو میں چاہتا ہوں کہ ہوٹل والے بغیر ایرپھیر کے صاف بتائیں۔ منیجر انگریز تھا اوس کو میری صاف
گوئی سے گونہ پریشانی ہوئی۔ کچھ دیر سوچ کر بولا اور ہوٹلوں کا حال مجھے معلوم نہیں مگر میرا ہوٹل
حقیقتاً سب بھرا ہوا ہے تاہم میں آپ کے لئے ایک کمرہ کا انتظام کردوں گا بشرطیکہ آپ کھانا اپنے کمرہ
میں کھائیں۔ یہ جواب تسلی بخش نہ تھا۔ مگر مجبوری سب کچھ کرائی ہے۔ طوفان نوح سر پر کھڑا تھا۔ میں کہاں کہاں
مارا پھرتا۔ مجبوراً میں نے اس شرط کو منظور کرلیا اور رائل ہوٹل میں ٹھیر گیا۔ اتنا ضرور ہوا کہ میرا کمرہ ہمارے دیہات میں

(مضمون بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۳) نے کی اور اس معاملہ میں جس جرأت وہمت سے کام لیا اوس کی مثال کسی بڑے
کانگریسی لیڈر کی بھی زندگی میں نہ ملے گی۔

اچھوتوں کی آبادی کی طرح ایک کونہ میں واقع نہ تھا بلکہ ہوٹل کی اصلی عمارت میں تھا۔ جہاں انگریز ٹھہرتے تھے۔ دوسرے دن میں مسٹر کرک شینک سے ملنے گیا۔ موصوف میرے ساتھ خوش خلقی سے پیش آئے اور حالات معلوم کرنے کے بعد ازراہ ہمدردی کہا مسٹر ایونس نے آپ کی زبردست سفارش کی ہے مگر ڈپٹی کلکٹری کے لئے بہت سے امیدوار ہیں۔ بالعموم تجربہ کار اور کارگزار تحصیل داروں کو ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ پر ترقی دی جاتی ہے۔ میں آپ کو ڈپٹی کلکٹری کی اُمید نہیں دلا سکتا مگر آپ تحصیل داری منظور کریں تو میں آپ کے معاملہ پر غور کرنے کے لئے تیار ہوں۔ میں نے جواب دیا اگر آپ براہِ کرم تھوڑا سا وقت مرحمت فرمائیں تو میں قطعی فیصلہ کرکے مسٹر ایونس کے ذریعہ سے آپ کو جواب بھیج دوں گا کہ مجھے تحصیل داری منظور ہے یا نہیں۔ نینی تال[1] سے واپس آکر میں نے مسٹر ایونس سے سب حال بیان کیا۔ موصوف نے مجھے تحصیل داری منظور نہ کرنے اور ایل۔ ایل بی پاس کرکے وکالت کرنے کا مشورہ دیا۔

لفظ بابو کا محلِ استعمال میں رخصت کی درخواست بھیجنے والا تھا مگر ایک واقعہ اور ایسا پیش آیا جس سے مجھے یقین ہو گیا کہ میرے مزاج کی رفتار کو سرکاری ملازمت کے ماحول سے دُور کا لگاؤ بھی نہیں ہے۔ مسٹر اے۔ ڈبلو۔ آر۔ کول[2] اس زمانہ میں دہرہ دون اور منصوری کی عدالت خفیفہ کے جج تھے۔ ایک روز ایک سرکاری خط کا مسودہ میں نے مسٹر کول کی منظوری کے لئے پیش کیا جس میں کچھ تبدیلی موصوف نے اپنے قلم سے کی اور ایک یا دو باتوں کی بابت میں لکھا کہ پُرانی مسل دیکھ کر بعض اور امور بھی جو ان کے خیال میں ضروری تھے خط میں درج

---

[1] اس زمانہ میں نینی تال کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ پہاڑی عورتیں جن کا پیشہ عصمت فروشی تھا شام کے وقت بن سنور کر اور شوخ رنگ کے کپڑے پہن کر ملی تال اور تلی تال کے درمیان گشت کرتی اور شائقین کو اپنے گورے رنگ اور کوہستانی عشوہ و انداز سے گرویدہ کرتی تھیں۔ ان میں کی بعض گانا ناچنا بھی جانتی تھیں۔ اگر معشوق کا یہ تخیل صحیح ہے کہ۔ شعر

شاہد آں نیست کہ موئے و میانے دارد   بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

تو ان حسن فروشوں کے اعضا کا تناسب اور بوٹا سا قد آنکھ کو ضرور بھلا معلوم ہوتا تھا۔ مگر آنے دارد والی بات ان سے کوسوں دور تھی۔ اب بیس بائیس برس سے نینی تال ان حسن فروشوں کی گل گشت سے محفوظ ہے۔

[2] مسٹر کول انگریز سویلین تھے چند سال بعد ایڈیشنل جج مقرر ہو کر مراد آباد آئے تھے۔

کردئے جائیں۔ دو تین دن بعد پیشی کے وقت مجھ سے دریافت کیا۔ فلاں خط بھیجا گیا یا نہیں میں نے جواب دیا مسل آج ہی میرے پاس آئی ہے۔ آج ہی وہ خط روانہ ہو جائے گا۔ موصوف بگڑکر بولے بس عین مین یہ ویسی ہی بات ہے جیسی بابو لوگ کرتے ہیں۔ وہ خط ضروری تھا اور فوراً بھیج دینا چاہیے تھا۔ موصوف کا یہ ارشاد مجھے اس لئے شدّت سے گراں گزرا کہ علی گڈھ میں ہم سب لفظ بابو کو تہتک آمیز خطاب سمجھتے تھے جس کا استعمال انگریز افسر ہندوستانیوں کی تحقیر کے لئے کرتے ہیں۔ وکالت شروع کرنے کے بعد عرصہ تک میری یہ حالت رہی کہ کسی مؤکل کا لفظ بابو صاحب سے خطاب کرنا مجھے سخت بُرا معلوم ہوتا تھا۔ اور میں نے اپنے محرّروں (اوس زمانہ میں میرے پاس تین محرر تھے) کو ہدایت کردی تھی کہ مؤکلوں کو سمجھا دیں کہ مجھے سیّد صاحب کہیں۔ میر صاحب کہیں یا بہ درجۂ مجبوری مولوی صاحب کہیں (جس خطاب کا میں اپنے کو ہرگز مستحق نہیں سمجھتا تھا) مگر بابو[1] صاحب کہہ کر ہرگز خطاب نہ کریں۔ اس خطاب سے مجھے اس درجہ بیزاری تھی کہ اوس کی زد سے بچنے کے لئے میں نے معمولی دستخطوں میں بھی اپنے نام کے پہلے لفظ سیّد لکھنا لازم کرلیا تھا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ مسٹر کول کی بات مجھے ایسی ہی گراں گزری جیسا انڈین سول سروس کے کسی مقتدر انگریز عہدہ دار کو ٹامی کا خطاب بُرا معلوم ہو۔ میں نے دوسرے دن ہی چھ مہینے

---

[1] میرا شمار اون نادان نوجوانوں میں تھا جو یہ سمجھتے تھے (ممکن ہے بعض نوجوان اب بھی سمجھتے ہوں) کہ انگریزی تعلیم حاصل کرکے ہم انگریزوں کے ہم پلّہ ہو جائیں گے۔ مغربی طرز حکومت کے ماتحت نسلی امتیازات کا مٹنا اور حاکم و محکوم کا برابر ہونا بعید از قیاس ہے۔ برابری کا عملی سبق سوائے مذہب اسلام کے اور کہیں نہیں ملتا۔ صرف یہی نہیں کہ حضرت بلال اور حضرت زید کی خدمت کرنا جلیل القدر صحابی اپنے لئے باعث سعادت سمجھتے تھے بلکہ مساوات کی بڑی اچھی مثال خود ہمارے ملک ہندوستان میں غلاموں کے خاندان کی طویل اور نامور حکومت ہے سیاسی زندگی کی تنگ و دو سے یہ ثابت ہوا کہ جب تک اس ملک پر انگریزوں کا تسلّط ہے ہم سب کے سب ہندوستانی انگریزوں کی نظر میں بابو رہیں گے۔ تجربہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب مؤکل وکیل یا بیرسٹر کو بابو جی یا بابو صاحب کہہ کر خطاب کرتا ہے تو اس کی نیت توہین کرنے کی نہیں ہوتی بلکہ اس لفظ کو وہ بڑا معزز لقب سمجھتا ہے۔

کی رخصت کی درخواست مسٹر کول کی خدمت میں پیش کر دی۔ رخصت دینا بہ حیثیت ڈسٹرکٹ جج کے مسٹر ایونس کے اختیار میں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ایل۔ ایل۔ بی کے امتحان کی تیاری کے لئے میں رخصت لینا چاہتا ہوں۔ چنانچہ میری درخواست آخر نومبر ۱۹۰۶ء سے منظور ہو گئی۔

محمڈن بورڈنگ ہاؤس الہ آباد

کچھ دن کندرکی ٹھہر کر میں الہ آباد چلا گیا۔ اور محمڈن بورڈنگ ہاؤس میں قیام کیا۔ بورڈنگ ہاؤس کے بانی مولوی سمیع اللہ خاں صاحب مرحوم سی۔ ایم۔ جی تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۸۹ء میں جب سر سید سے نجی اختلافات کے باعث مولوی صاحب نے علی گڈھ کالج سے قطع تعلق کیا تو بے کاری کے شغل کی تلاش ہوئی۔ الہ آباد میں گو صوبہ کا سب بڑا کالج یعنی میور سنٹرل کالج موجود تھا۔ مگر مسلمان طلبا کے قیام کے لئے کوئی معقول بورڈنگ ہوس نہ تھا۔ مولوی سمیع اللہ خاں نے اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے میور سنٹرل کالج کی قدیم عمارت کے متصل جانب جنوب ایک قطعہ آراضی حاصل کر کے محمڈن بورڈنگ ہاؤس کی بنیاد ڈالی۔ وہ بڑی زبردست قوتِ عمل رکھتے تھے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ علی گڈھ کالج قائم کرنے میں اگر وہ ہمت مردانہ سے کام نہ لیتے اور جو کچھ چندہ ۱۸۷۲ء تک جمع ہوا تھا اوس کو فوراً کام میں نہ لگا دیتے تو غالباً علی گڈھ کالج ۱۸۷۵ء کی بجائے ۱۸۸۵ء میں بھی قایم نہ ہوتا۔ سر سید علیہ الرحمہ کی شاندار تجویزوں اور سر بہ فلک منصوبوں کی بابت اون کے بعض خالص دوستوں کا یہ خیال تھا کہ ان تجویزوں کا پورا ہونا اور ان منصوبوں کا عملی جامہ پہننا اردو کی وہ مشہور ضرب المثل یاد دلاتا ہے کہ نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔ مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کی علی گڈھ کالج سے علیحدگی ایسا واقعہ ہے جس پر مغربی تعلیمی جدوجہد کا مورخ ہمیشہ اظہار تاسف کرے گا۔ علی گڈھ کالج سے قطع تعلق کر کے جب مولوی سمیع اللہ خاں نے الہ آباد میں محمڈن بورڈنگ ہوس کی بنیاد ڈالی تو بعض حضرات نے یہ کہنا شروع کیا کہ دراصل یہ بورڈنگ ہوس نہیں ہے بلکہ مسجد ضرار[1] ہے جس کی تعمیر کا انتظام علی گڈھ کالج کی مخالفت میں ہو رہا ہے۔

[1] اس حاشیہ کا مضمون صفحہ ۲۲۸ پر پڑھیے۔

دلوں کے بھیدوں کا جاننے والا تو وہ علیم و بصیر ہے جو اپنے بندوں سے خاص حالات میں ایسے ایسے کام لیتا ہے جو دنیا کو حیرت میں ڈالتے ہیں۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ خدا بخشے مولوی سمیع اللہ خاں نے الہ آباد میں اسلامی بورڈنگ ہوس قایم کرکے اس صوبہ کے مسلمانوں کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا۔ اگر یہ بورڈنگ ہوس نہ ہوتا تو اون مسلمان طلبا میں جنھوں نے اس بورڈنگ ہوس میں رہ کر میور سنٹرل کالج میں تعلیم حاصل کی بہتیرے طلبا ایسے بھی تھے جو بورڈنگ ہوس نہ ہونے کی صورت میں اس مشہور کالج کی تعلیم سے محروم رہ جاتے۔ یہ بورڈنگ کچھ بڑا نہ تھا۔ مگر بیرونی مقامات کے جتنے طلبا میور سنٹرل کالج میں درس پاتے تھے اون کے لئے بورڈنگ ہوس میں کافی گنجائش تھی۔ میں میور کالج کا طالب علم نہ تھا۔ مگر ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان دینے آیا تھا۔ اس لئے بورڈنگ

(مضمون متعلق حاشیہ صفحہ ۲۲۷) ۱ھ ۹ ھ میں غزوۂ تبوک سے پہلے مدینہ کے بارہ منافقوں نے مل کر ابو عامر راہب کے مشورہ سے اپنی ایک مسجد الگ تعمیر کی تھی۔ اون کا مقصد یہ تھا کہ نماز کے بہانہ اس مسجد میں جمع ہونے اور سازشی جلسے کرنے کا موقع آسانی سے مل جائے گا۔ اور مسلمانوں کے باہم تفرقہ پیدا کرنے کی تدابیر ہاتھ آجائیں گی۔ سرور عالم تیس ہزار کے لشکر کے ساتھ مدینہ منورہ سے روانہ ہوکر جب ذی روان میں پہونچے جو مدینہ سے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کی مسافت پر واقع ہے تو منافقین نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنے مسجد بنانے کا حال بیان کیا اور درخواست کی کہ حضورؐ چل کر نماز ادا کریں تاکہ ہماری مسجد کو بھی خانۂ خدا ہونے کا مرتبہ حاصل ہو جائے۔ حضورؐ نے فرمایا میں حالت سفر میں ہوں لڑائی سے واپسی کے وقت دیکھا جائے گا۔ تبوک میں جس کی مسافت مدینہ سے چودہ پندرہ منزل تھی حضورؐ نے مع لشکر اسلام کے بیس روز قیام فرمایا مگر ہرقل یا غسانی مقابلہ پر نہ آئے بلکہ اوس دیار کے اکثر حاکموں نے جو اسلام کے دشمن تھے جزیہ ادا کرکے حضورؐ سے صلح کرلی۔ واپسی میں جب مدینہ قریب رہ گیا تو حضورؐ نے مالک ابن دخشم سالمی اور معن ابن عدی عجلی کو مدینہ بھیج کر منافقوں کی بنائی ہوئی مسجد کو مسمار کرادیا۔ کلام مجید میں مسجد ضرار کا تذکرہ ہے۔ ضرار کسی شخص کا نام نہ تھا بلکہ لفظ ضرار (ض کو زیر کے ساتھ پڑھئے) کے معنی ہیں نقصان پہونچانا۔ یہ مسجد خانۂ خدا نہ تھی بلکہ مسلمانوں کے حق میں پس کی ٹریا تھی۔ اس لئے خدائے ذوالجلال نے اپنے کلام پاک میں اس مسجد کو مسجد ضرار کہا ہے۔ منافق خانۂ عناد کو آباد کرنا چاہتے تھے خدا کے حکم سے برباد کر دیا گیا۔

ہوس کے منیجر مولوی عبدالغفور نے ایک کمرہ مجھے دے دیا۔ رخصت لے کر اور سارے جھگڑوں کو چھوڑ چھاڑ کر میں الہ آباد اس لئے آیا تھا کہ اطمینان کے ساتھ ایل۔ ایل۔ بی کی تیاری کر سکوں مگر۔ بہ ہر زمیں کہ رسیدیم آسماں پیداست۔ والی مثل یہاں بھی میرے حال پر صادق آئی۔ فروری ۱۹۰۷ء میں علی گڈھ میں وہ زبردست ہڑتال ہوئی جس کے باعث ٹرسٹیوں کو مجبوراً کالج بند کرنا پڑا۔

محسن الملک کے خطوط

میں نے ۱۹۰۷ء میں متعدد مضمون انگریزی اور زیادہ تر اردو اخباروں میں لکھے۔ جن میں ہڑتال کے اصلی وجوہ سے مفصل بحث کی بعض مختصر مضامین میں نے محسن الملک کی تائید میں بھی لکھے۔ تحقیقاتی کمیشن کی شہادت اور اُردو اخبارات کی سخت گیری نے موصوف کو نہایت افسردہ اور ملول کر رکھا تھا محسن الملک کے دو خط یہاں درج کئے جاتے ہیں جن سے معلوم ہو گا کہ اوس زمانہ میں موصوف کیسے بے چین تھے۔

بمبئی والٹن انیکس

۲ مئی ۱۹۰۷ء

عزیزمن رضا علی

میں یہاں آکر بیمار ہو گیا اور دس روز تک پلنگ پر سے نہ اوٹھ سکا۔ اب آپ کے آرٹیکل کا جو پانیر میں شائع ہوا تھا پورا ترجمہ دیکھا اوس نے بتا دیا کہ سچی محبت۔ سچی شرافت اور سچے دل کی صداقت کسے کہتے ہیں۔ جو اثر اوس کا میرے دل پر ہوا نہ اس وجہ سے کہ میں اوس کا مستحق تھا بلکہ اس خیال سے کہ دنیا میں محبت اور شرافت باقی ہے۔ وہ میرا ہی دل جانتا ہے۔ زیادہ کیا لکھوں بجز اس کے کہ شاد باشی و زندہ باشی فقط

مہدی علی

۱۴ ار جولائی ۱۹۰۷ء بمبئی

واٹسن اینکس ہوٹل

عزیزمن وحبیب من سید رضا علی

بہت دن ہوئے کہ آپ کا ایک خط آیا تھا جو میری بیماری کے لئے سب سے بہتر نسخہ تھا۔ بار بار میں نے اوسے پڑھا اور تمہاری سچی محبت اور بے نظیر سعادت مندی پر تعجب کرتا اور دل ہی دل میں خوش ہوتا رہا۔ میں بہت بیمار ہو گیا تھا اور ہفتوں پلنگ پر پڑا رہا۔ کوئی منشی اور محرر بھی ساتھ نہ تھا۔ اس لئے جواب میں تاخیر ہوئی۔ معاف فرمائیے۔

اب میں اچھا ہوں۔ ضعف بھی کم ہے۔ میری زندگی بھی عجب بے حیا ہے کہ مرنے کے قریب ہو جاتا ہوں مگر مرتا نہیں۔ ابھی کچھ دنوں جلنا اور کڑھنا اور صدمہ اوٹھانا باقی ہے۔ آرام کی موت اپنی قسمت میں نہیں ہے۔ کالج کی نیک نامی اور اوس کی ترقی پر اپنی خوشی کا مدار تھا اوس کی وہ حالت اب ہو گئی ہے کہ بجائے ترقی کے اب تنزل شروع ہوا اور اس شورش نے اور مدعیانِ ہم دردی نے اس قدر بدنام کر دیا ہے کہ اس کی تلافی نہایت مشکل ہے۔ آپ کا مضمون بھی میں نے دیکھا۔ مگر مزاج ایسے بگڑ گئے ہیں کہ ایسی دوائے تلخ کوئی پینا نہیں چاہتا اور پی کر اوگل دیتا ہے۔ میں تو اسے قومی بدنصیبی سمجھتا ہوں اور صبر کر بیٹھا ہوں فقط

مہدی علی

حرمان و یاس بھرے دو خط آپ پڑھ چکے۔ ایک خط اور پڑھئے جس سے محسن الملک کے کیرکٹر اور اصلی رنگ کا آپ کو اندازہ ہوگا۔ مئی ۱۹۰۵ء میں رخصت لے کر میں علی گڈھ اس لئے گیا تھا کہ اگر اور رخصت مل جائے تو تیاری کروں اور ایل۔ ایل۔ بی کے امتحان میں شریک ہو جاؤں۔ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی مرکزی کمیٹی کا ۲۶ مئی ۱۹۰۵ء کو جلسہ تھا میں

طالب علمی کے زمانہ میں مرکزی کمیٹی کا ممبر منتخب ہوگیا تھا یا کانگریسی زبان میں یوں کہوں کہ کانفرنس کی کھڑی کمیٹی (اسٹینڈنگ کمیٹی) میں میرا چناؤ ہوگیا تھا۔ جلسہ کا نوٹس میرے پاس بھی آیا۔ مگر قوم بازی[1] سے عاجز آکر میں جلسہ میں نہ گیا۔ بلکہ میں نے معذرت کا حسب ذیل خط نواب محسن الملک کی خدمت میں بھیجا۔

علی گڈھ۔ ۲۶ مئی ۱۹۰۵ء

جناب نواب صاحب قبلہ۔ میں نہایت ادب کے ساتھ جناب سے کانفرنس کی میٹنگ میں شریک نہ ہونے کی معافی چاہتا ہوں۔ میری حالت آج کل نہایت خراب ہے۔ ایل۔ ایل۔ بی کے امتحان کی فکر ہر وقت سر پر سوار رہتی ہے۔ اور رخصت مل گئی تو میں علی گڈھ ایک مہینہ رہوں گا اور حضور کو یقین دلاتا ہوں کہ ایک سے زیادہ مرتبہ حضور کی خدمت میں حاضر ہونے کی عزت حاصل کروں گا۔

مذہبی تعلیم کی تجویز کے متعلق جو کچھ میرا خیال ہے وہ میں تحریری رائے میں ظاہر کرچکا ہوں اور اس وقت سید مصطفےٰ حسین بھی میری طرف سے اوس تجویز کے متعلق کچھ کہیں گے۔

خاکسار

رضا علی

حسب ذیل عبارت اپنے قلم سے لکھ کر نواب صاحب نے وہ خط میرے پاس واپس بھیج دیا۔ ذرا اس ادا کو دیکھئے القاب آداب کچھ نہیں ہے۔ ہر لفظ سے برہمی ٹپک رہی ہے۔ مگر خفگی کا دل کش انداز یہ ہے کہ۔ مصرعہ

بگڑنے میں بھی بات اون کی بنا کی

---

[1] اگلے وقتوں کے اشغال مثلاً کبوتر بازی، مرغ بازی۔ بٹیر بازی۔ پتنگ بازی بڑے پُر لطف ہوتے تھے۔ علی گڈھ کی دنیا ان سب باتوں سے اجنبی تھی۔ اون کی جگہ قومی خدمت کا چرچا تھا جس کا اصطلاحی نام میرے زمانہ کے علی گڈھ میں قوم بازی تھا۔ یہ شغل تو بُرا نہ تھا۔ مگر تعلیم اور مطالعہ سے اوسے بڑا بیر تھا۔

فرماتے ہیں۔

"میرے لڑکے کی شادی نہیں ہے کہ آپ کے نہ آنے کا برا مانوں۔ آپ آتے اپنا فرض ادا کرتے۔ نہ آئے تو مجھ سے آپ کیوں معافی چاہتے ہیں۔ باقی رہا ملنا جلنا آپ کی خوشی چاہو ملو چاہو نہ ملو۔ فقط

مہدی علی

"باقی رہا ملنا جلنا۔ آپ کی خوشی۔ چاہو ملو چاہو نہ ملو" کی ترکیب نشتر سے کم نہیں ہے۔ بھلا مفتی عبدہ کے یہاں یہ تیر و نشتر کہاں ہیں۔ جواب پڑھ کر مجھ سے نہ رہا گیا۔ اور میں سیدھا جلسہ میں پہونچا۔ اب دوسری ادا دیکھئے۔ مجھے دیکھ کر فرمانے لگے "تم کیوں آئے میں نے تو صاف لکھ دیا تھا بھلا تمھیں اتنی فرصت کہاں ہے کہ ایسے معمولی جلسوں میں شریک ہو سکو"

ناراستی مصلحت آمیز کی مثال ۱۹۰۷ء میں صوبہ کے لفٹنٹ گورنر اور اپنے عہدہ کے لحاظ سے کالج کے پیٹرن (مربی) سرجان ہیوٹ تھے اون کی منظوری سے ٹرسٹیوں نے ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا۔ کمیشن کی صدارت کے لئے ایک قابل اور ذی اثر مسلمان کی ضرورت تھی۔ قرینہ یہ ہے کہ صدارت کے لئے نواب محسن الملک نے کئی ممتاز مسلمانوں کا نام بھیجا ہوگا اور اس میں کوئی قباحت نہ تھی۔ سر عبد الرؤف نے خود مجھ سے بیان کیا کہ ایک روز نواب صاحب نے بہ صیغۂ راز اون سے کہا "میں نے تمہارا نام کمیشن کی صدارت کے لئے گورنمنٹ میں بھیج دیا ہے۔ جواب کا انتظار ہے۔ اگر جواب آجکل میں آگیا تو تم کو فوراً کام شروع کر دینا ہوگا" سر عبد الرؤف کہتے تھے کہ "جب نواب صاحب نے مجھے اس قومی فرض کی سرانجام دہی کی عزت کا امیدوار کیا تو مجھے معلوم تھا کہ سر محمد رفیق کے تقرر کا خط آچکا ہے اور وہ نواب صاحب کی جیب میں موجود ہے" نواب صاحب اس جھگڑے کے صرف چند مہینے بعد تک زندہ رہے اور مجھے موقع نہ ملا کہ اصلی حالات اون سے دریافت کر سکتا۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ سر عبد الرؤف نے جو کچھ مجھ سے کہا وہ سچ تھا۔ یہ

بھی خلقِ خدا کی زبان پر ہے کہ نواب صاحب کی زندگی میں اور بھی اس طرح کے واقعات گذر چکے تھے۔ باوجود اوس گہری عقیدت کے جو مجھے نواب محسن الملک سے تھی اور باوجود اوس احترام کے جو موصوف کا میری نظر میں ہے اور جب تک زندہ ہوں رہے گا۔ میں نے سر عبد الرؤف والے معاملہ کو پسِ پشت ڈال دینا اور اوس کا ذکر نہ کرنا فرائض حقیقت نگاری کے خلاف سمجھا۔ سوال یہ ہے کہ نواب صاحب نے تقرر کا حط آجانے کے بعد ایسی بے بنیاد بات سر عبد الرؤف سے کیوں کہی۔ یہاں چند باتیں غور طلب ہیں۔ علی گڈھ کے جھگڑے نے نواب صاحب کو سخت پریشان کر رکھا تھا اُردو اخباروں میں برابر مضامین اون کے خلاف شائع ہو رہے تھے۔ کالج کے بہت سے سچے ہی خواہوں نے شہادت میں محسن الملک پر دل کھول کر اعتراض کئے۔ مسٹر محمد علی (اوس وقت تک مولانا نہیں ہوئے تھے) نے تو بے دریغ یہاں تک کہہ دیا کہ بڑی مصیبت یہ ہے کہ کالج کا پرنسپل جہامن چلا (Archbold) اور سکرٹری جہالودا (Archweak) ہے۔ یہ الفاظ ضرورت سے زیادہ سخت تھے۔ مگر مولانا محمد علی زبان کے چٹخاروں کے قائل تھے۔ پرنسپل کا نام آرچ بولڈ تھا۔ مولانا نے صنعت ایہام کے ذوق میں غریب محسن الملک کو جہالودا بنا ڈالا۔ مولانا کی تصانیف اور تقریروں میں صنعت ایہام کی مثالیں کثرت سے ملیں گی۔ بحیثیت صدر کانگریس مولانا نے جو خطبہ کوکاناڈا میں ۱۹۲۳ء میں دیا تھا اوس میں بھی اس صنعت کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ جہاں مسلمانوں کی آزادروی اور حق طلبی کا ثبوت اوس شہادت سے ملتا تھا جو گواہوں نے کمیشن کے سامنے ادا کی وہاں یہ پُردرد اور عبرت ناک منظر بھی تاریخ کے صفحوں میں یادگار رہے گا کہ بعض حضرات نے جن کے سروں پر محسن الملک کے احسانات کا ایسا بھاری بوجھ تھا کہ بہ ظاہر معلوم ہوتا تھا کہ وہ کبھی سر نہ اوٹھا سکیں گے۔ ایسے دل شکن لب و لہجہ اور جگر خراش الفاظ میں شہادت دی جس نے محسن الملک جیسے جوانوں بلکہ نوجوانوں کی ہمت والے انسان کو چار مہینے میں نوّے برس کا ایسا دل شکستہ، حسرت زدہ اور حرماں نصیب انسان بنا دیا جس کے ہونٹوں

کو حقیقی تبسم کی مسرت پھر کبھی میسر نہ ہوئی۔ یہ بھی سچ ہے کہ نواب صاحب عرصہ دراز تک حیدرآباد
میں رہ چکے تھے جہاں اوس زمانے میں ایک سے سائی اور دوسرے سے بدہائی بجائے
معیوب قرار دیئے جانے کے علامتِ دانائی و فرزانگی سمجھی جاتی تھی۔ بہت ممکن ہے کہ نواب
صاحب نے سر عبد الرؤف کی تائید حاصل کرنے کی غرض سے یہ بات اون سے کہہ دی ہو
مگر میرے نزدیک سب سے زیادہ قرینہ اِس کا ہے کہ یہ کمزوری نواب صاحب میں اون کے
اوس اعلیٰ وصف نے پیدا کر دی تھی جس کا نام مروّت ہے۔ مولوی حاؔلی نے ایک نظم میں
بتایا ہے کہ راست گوئی کے نتائج دنیا میں کیا کیا ہو سکتے ہیں۔ کاش کوئی قومی شاعر مروّت
کا چہرہ بے نقاب کر کے دُنیا کو دکھائے کہ بی مروّت خام بھی کیا کیا غضب ڈھاتی ہیں۔ نواب
صاحب میں مروّت اس قدر کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور یہ عادت اون کی طبیعت کا ایسا
لازمی اور ناقابلِ جُدائی جزو بن گئی تھی کہ میری ناچیز رائے میں وہ بے مروتی کو غالباً سب سے
بڑی اخلاقی بُرائی سمجھتے تھے وہ تو غدر کے بیس سال پہلے پیدا ہوئے تھے آج موجودہ نسل
میں بھی میں ایسے تعلیم یافتہ حضرات سے واقف ہوں جو بے مروتی کے الزام کو ایسا ہی خوفناک
سمجھتے ہیں جیسا ہمارے ملک کی نوجوان عورت بے عصمتی کو۔

مغربی تہذیب اور جواز کا فتویٰ

ہندوستان پر ہی کیا موقوف ہے۔ مغربی ملکوں میں بھی یہ کمزوری پائی جاتی ہے۔ میں جنوبی افریقہ
کی ایک جلیل القدر اور نامی گرامی ہستی کو اچھی طرح جانتا ہوں جن کے نام سے ہندوستان بھی
ناآشنا نہیں ہے۔ مگر یہ حضرت ناراستی مصلحت آمیز کو مروت پر بھینٹ چڑھانے میں مطلقاً
باک نہیں کرتے۔ خود میرے ساتھ اون کا ایک ایسا ہی معاملہ پیش آ چکا ہے جیسا سر عبد الرؤف
کو نواب محسن الملک کے ساتھ گذرا۔ جب میں جنوبی افریقہ میں ایجنٹ جنرل تھا (اب اس عہدہ
کا نام ہائی کمشنر ہو گیا ہے) میں نے جہانسبرگ میں ایک گارڈن پارٹی میں شرکت کے لئے شام
کے چار بجے آنے کی موصوف کو دعوت دی۔ اونھوں نے دعوت منظور کر لی اور چار بجے کی

بجائے تین بجے اوس ہوٹل میں تشریف لے آئے۔ جہاں گارڈن پارٹی ہونے والی تھی۔ میں بھی اوسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ سوا تین بجے میرا سکرٹری گھبرایا ہوا میرے کمرہ میں آیا اور کہا کہ فلاں صاحب تشریف لے آئے ہیں۔ میں نے کہا کہ پارٹی کا وقت تو چار بجے ہے۔ سکرٹری نے جواب دیا وہ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ خیال رہا کہ دعوت نامہ میں تین بجے کا وقت درج ہے میں تیار تھا فوراً نیچے اوترکر اوس جگہ جا رہا تھا جہاں پارٹی ہونے والی تھی کہ میں نے دیکھا میرے معزز مہمان برآمدہ میں ایک اور صاحب سے باتوں میں مشغول ہیں۔ مجھے دیکھ کر اوٹھے۔ بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ میرے معزز مہمان پارٹی میں شرکت کے لئے چالیس میل موٹر کا میری خاطر سفر کرکے پریٹوریا سے آئے تھے۔ میں نے شکریہ ادا کیا کہ ایسا مہمان کیوں نہ عزیز ہو جو میرے ساتھ یہ بے تکلفی برتے کہ وقت سے تخمیناً گھنٹہ بھر پہلے آجائے۔ فرمانے لگے "میرے قبل از وقت پہونچ جانے سے آپ کو کچھ تکلیف ہوئی ہو تو معاف کیجئے۔ مجھے یہ خیال رہا کہ پارٹی کا وقت تین بجے ہے۔ میں ان صاحب سے (دوسرے صاحب کی طرف جن سے باتیں کررہے تھے اشارہ کرکے بتایا) بات چیت کرکے تھوڑی دیر میں آتا ہوں"۔ چنانچہ ٹھیک چار بجے میرے مہمان پارٹی میں پہونچ گئے اور دو گھنٹے میرے اور مہمانوں سے ملنے اور ظرافت آمیز گفتگو میں صرف کئے۔ شام کو جب پارٹی ختم ہوگئی تو میرے سکرٹری نے مجھ کو بتایا کہ میرے معزز مہمان کو پارٹی کا ٹھیک وقت معلوم تھا مگر موصوف نے اون صاحب کو جن سے وہ گفتگو کررہے تھے تین بجے کا وقت ہوٹل میں ملاقات کے لئے دیا تھا۔ اور اس لئے گھنٹہ بھر پہلے آگئے تھے۔ مگر میرے معزز مہمان نہیں چاہتے تھے کہ اصلی واقعات کا حال مجھے معلوم ہو۔ اتنا اور کہہ دوں کہ میرے معزز مہمان بڑی رعایت مروت کے آدمی سمجھے جاتے ہیں اور اگر گڑ نہیں دے سکتے تو گڑ جیسی میٹھی بات کہہ دینے میں اون کو کبھی پس و پیش نہیں ہوتا۔ بالمختصر محسن الملک نے سر عبدالرؤف سے جو کچھ فرمایا اوس کی زیادہ چھان بین کرنا غیر ضروری ہے۔ میں تو ایسے موقعوں پر یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہوں۔ مصرعہ

خطائے بزرگاں گرفتن خطاست!

ترجمہ:- اپنے سے بڑوں کی غلطی پکڑنا بھی غلطی ہے۔

ہڑتال کے وجوہ کالج کی ہڑتال کے بہت سے وجوہ تھے۔ مگر میرے نزدیک سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مسٹر آرچبولڈ جن کا تقرر ٹرسٹیوں نے پرنسپلی کے عہدہ پر مسٹر مارلین کی بجائے کیا تھا۔ علی گڈھ کے حالات سے ناواقف تھے۔ مسٹر مارلین چاہتے تھے کہ اون کے جانشین مسٹر کارنا ہوں۔ مسٹر کارنا کئی سال تک ہمارے اسکول کے ہیڈ ماسٹر رہ چکے تھے۔ وہ بڑے صاف گو آدمی تھے۔ جن کو دل کی بات زبان پر لانے میں مطلق تامل نہ ہوتا تھا۔ ہمارے ملک کا سیاسی تعلق جب تک انگلستان سے رہے انگریز عہدہ داروں کے لئے ازبس ضروری ہے کہ صاف گوئی کے ساتھ محل شناسی کی صفت بھی اون میں موجود ہو۔ مسٹر کارنا کی طبیعت کو موقع شناسی سے کچھ واسطہ نہ تھا اور اون کی صاف گوئی بعض اوقات دریدہ دہنی کی حد کو پہونچ جاتی تھی۔ جو مضامین اوس زمانہ کے اردو اخبارات میں شائع ہوئے اون سے معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر کارنا درجہ میں بیٹھ کر طالب علموں کے سامنے اکثر کہا کرتے تھے "مسٹر بیک کو کالج سے سچی محبت تھی۔ مسٹر مارلین کو کالج سے محبت کا ادعا تھا۔ مجھے کالج سے نفرت ہے" نتیجہ یہ ہوا کہ جب مسٹر مارلین کے جانشین کا سوال اوٹھا تو مسٹر کارنا کے پرنسپل بنائے جانے کی بڑی زبردست مخالفت ہوئی اور مسٹر مارلین کے ایڑی چوٹی کا زور لگانے کے باوجود ٹرسٹیوں نے مسٹر کارنا کا تقرر پرنسپلی کے عہدہ پر کرنے سے انکار کردیا۔ مسٹر گارنر بروں میں ایسی انتظامی قابلیت نہ تھی کہ وہ پرنسپل کے عہدہ کو سنبھال سکتے۔ ٹول البتہ اس عہدہ کے اہل ہوسکتے تھے وہ نو وارد بھی نہ تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے وہ اور مسٹر تارنا ایک ہی سال میں کالج میں آئے تھے۔ مگر کسی وجہ سے اون کو مسٹر مارلین کی تائید حاصل نہ ہو سکی۔ اور کالج کے اون بہی خواہوں نے جو انگلستان میں مقیم تھے مسٹر آرچبولڈ سے ملاقات کرنے اور اون کے حالات معلوم کرنے کے بعد موصوف کی سفارش کی اور اون کا تقرر ہوگیا۔ مجھے دو تین مرتبہ مسٹر آرچبولڈ سے ملنے کا اتفاق

اوس زمانہ میں ہوا ہے۔ جب وہ کالج کے پرنسپل تھے مجھے اون سے اتنی زیادہ واقفیت نہ تھی کہ اون کے بارہ میں کوئی مستقل رائے ظاہر کرسکوں۔ مگر میرے نزدیک ۱۹۰۶ء میں علی گڈھ کا پرنسپل ایسے شخص کو مقرر کرنا جس کو ہندوستان کے حالات سے واقفیت تھی نہ مسلمانوں کی ضروریات اور کالج کی روایات کا کوئی تجربہ تھا۔ اصولاً بڑی بھاری غلطی تھی۔ اور ۱۹۰۷ء کی ہڑتال بیشتر اوسی غلطی کا نتیجہ تھی۔ تحقیقاتی کمیشن کے سامنے جو شہادت پیش ہوئی اوس سے محسن الملک کا دل ٹوٹ گیا سالہا سال تک قوم کی خدمت کرنے کے بعد یہ بات اون کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ قوم طوطے کی طرح آنکھیں بدل کر اون کی ساری پچھلی خدمات کو بھول جائے گی۔ اور نئی پود ہڑتال کی ذمہ داری اون کے سر تھوپے گی۔

مسلمان اور مُردہ پرستی

ہماری قومی خصوصیت یہ بتائی جاتی ہے کہ جب ہم کسی قومی خدمت کرنے والے سے خوش ہوتے ہیں تو معمولی تعریف پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اوسے چوتھے آسمان پر پہونچا دیتے ہیں۔ اسی طرح کسی بڑے سے بڑے قومی خدمت کرنے والے سے جب کسی بات پر قوم ناراض ہوتی ہے تو اس سخت گیری سے کام لیتی ہے کہ اوس لیڈر میں گویا سوائے برائیوں کے کوئی بھلائی موجود نہیں ہے۔ مولانا محمد علی مرحوم جن کے چٹکلوں میں ہمیشہ شوخی ہوتی تھی کہا کرتے تھے "ہم مسلمان مردہ پرست قوم ہیں یعنی اپنے لیڈروں کی قدر کرتے ہیں مگر اون کے مرنے کے بعد" اس ضمن میں یہ ظاہر کر دینا غالباً بے محل نہ ہوگا کہ جب سرسید علیہ الرحمہ کا انتقال ہوا ہے تو ایک زبردست رسالہ (پمفلٹ) زیر طبع تھا جس میں علی گڈھ کالج کے معاملات اور مالی انتظامات پر سختی سے اعتراضات کئے گئے تھے۔ جن حضرات کی طرف سے یہ رسالہ شائع ہونے والا تھا اون میں بہت سے سرسید مرحوم کے خالص دوست اور پرانے رفیق تھے۔ جن میں نواب وقار الملک بھی تھے۔ سرسید کے انتقال کے بعد اس رسالہ کی اشاعت بذریعہ تار روکی گئی۔ اگر رسالہ چند ہفتے پہلے شائع ہو گیا ہوتا تو اونیسویں صدی عیسوی کے سب سے بڑے مسلمان

مصلح کے دوستوں کی بے وفائی کا یہ داغ غالبًا قوم کے لئے شمع عبرت کا کام دیتا۔
خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جو شخص مسلمانوں کی خدمت کرنا چاہے اوسے سینکڑوں ہزاروں گوٹے اور پھولوں کے ہار پہننے۔ تحسین و آفرین کے نعروں میں ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کے جلوس کا مرکز بننے اور بسا اوقات عظیم الشان جلسوں میں مقرروں کی زبان سے اپنے بارہ میں ایسی تقریریں سننے کی عزت حاصل ہوگی جن میں اسّی فی صدی سے زیادہ مبالغہ اور بیس فی صدی سے کم اظہار حقیقت ہوگا۔ مگر ساتھ ساتھ قومی خادم کو جس کو قوم کے شریف جذبات عموماً مخدوم کا خطاب بخشتے ہیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ آزردہ ہو جانے کی حالت میں اوس کی پچھلی خدمات اوسے سخت سے سخت محاسبہ سے نہیں بچا سکتیں اور قوم کی نظر میں ایک غلطی اوس کی ساری عمر کی خدمتوں کو عارضی طور پر مغلوب کرنے کے لئے کافی ہے۔

آٹھواں باب

لارڈ کرزن کے حالات۔ لارڈ منٹو اور مسٹر مارلے کی سیاست

کانگریس کی نرم اور گرم پارٹیاں۔ ابتدائے وکالت

فوج داری اور دیوانی عدالتوں کے حکام

لارڈ کرزن لارڈ کرزن نے بہ حیثیت وائسرائے جو کچھ کیا اوسے نہ کبھی ہندوستانی بھول سکتے ہیں اور نہ غالباً انگریز بھولیں گے۔ موصوف تقرر کے وقت وزارت خارجہ کے پارلیمنٹری انڈر سکرٹری تھے۔ دنیا کے بیشتر ممالک کی سیر و سیاحت کر چکے تھے۔ بہت اچھے مقرر تھے محنت و جفاکشی کے عادی تھے۔ تعلیم۔ دولت۔ اثر اور ذاتی قابلیت یہ سب اوصاف اون میں مجتمع تھے اور ۱۸۹۸ء کے آخر میں جب وہ لارڈ ایلگن کی جگہ وائسرائے ہو کر بمبئی میں پہونچے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان میں اون کا دور نہایت کام یاب رہے گا اور ایک دن وہ وزارتِ عظمیٰ کے عہدہ پر فائز ہوں گے۔ موصوف میں غیر معمولی قوتِ عمل موجود تھی۔ جس کا اظہار مختلف صورتوں میں ہوا۔ صوبہ سرحد کی پنجاب سے علیحدگی۔ یونیورسٹیوں کی اصلاح زمیں داروں اور کاشت کاروں کے بارہ میں گورنمنٹ کی پالیسی۔ اور سرکاری مال گذاری کی تشخیص۔ قحط کی سختی کو کم کرنے کے لئے گورنمنٹ کا مجموعۂ قوانین۔ محکمۂ آثار قدیمہ کی بنا تقسیم بنگالہ۔ غرض کہ سیاسی۔ انتظامی۔ مالی اور تعلیمی سرگرمیوں کا مشکل کوئی صیغہ لارڈ کرزن کی جدوجہد سے بچا ہوگا۔ انگلستان کی سیاسی حالت نے بھی لارڈ کرزن کی مساعدت کی آئرلینڈ کے ہوم رول کے مسئلہ نے لبرل پارٹی کے پڑانچے اوڑا دئے تھے۔ مزدوروں کی جماعت

یعنی لیبر پارٹی ہنوز قائم نہیں ہوئی تھی اوس پرطرہ یہ ہوا کہ جنوبی افریقہ کی لڑائی کے دوران میں لارڈ سالسبری نے جو اوس وزیر اعظم تھے پارلیمنٹ کو برخاست کرکے دوبارہ انتخاب کرایا جس میں کنسرویٹو پارٹی کے ممبروں کی زبردست اکثریت منتخب ہوکر آئی۔ جمہوری طرز حکومت کی رُوح رواں فریق بندی (پارٹی سسٹم) ہے۔ اس طریق حکومت کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ گورنمنٹ اوس فریق کے ممبروں پر مشتمل ہوتی ہے جس کے ممبروں کی اکثریت انتخاب میں کامیاب ہوکر پارلیمنٹ میں آئی ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقۂ حکومت ہر ملک کے لئے موزوں نہیں ہوسکتا۔ مگر جن ملکوں نے اس طریقہ کا تجربہ عرصہ دراز تک کیا ہے اور جہاں نسلی، مذہبی اور معاشرتی اختلافات نہ ہونے کے باعث اس تجربہ میں کامیابی ہوئی ہے وہاں بھی یہ بڑی دقت ہے کہ اگر مخالف پارٹی کے ممبروں کی تعداد بہت کم ہو تو اکثریت والی پارٹی کے ممبر جو جی میں آتا ہے کرتے ہیں۔ اور اکثریت والی پارٹی کی فلاح و بہبود کو ملک کے مفاد پر مقدم رکھتے ہیں بعینہٖ یہی حالت کنسرویٹو پارٹی کی سنہ ۱۹۰۰ء سے لے کر سنہ ۱۹۰۵ء تک تھی۔ یہ عجب اتفاق تھا کہ لارڈ کرزن کو جس جس وزیر ہند سے سابقہ پڑا اون میں سے کوئی غیر معمولی قابلیت کا آدمی نہ تھا۔ لارڈ کرزن کے ابتدائی دور میں وزیر ہند لارڈ جارج ہیملٹن تھے۔ یہ ایک کہن سال اور فرسودہ خیال بزرگ تھے۔ جن کو یونینسٹ (اتحادی کنسرویٹو) پارٹی کی وفاداری کے صلہ میں لارڈ سالسبری نے وزیر ہند کا عہدہ عطا کیا تھا۔ بھلا لارڈ کرزن جیسے قابل اور نوجوان وائسرائے کی شوریدہ سری کی روک تھام یہ بڑے میاں کیسے کرسکتے تھے۔ دوسرے وزیر ہند جو لارڈ کرزن کی لغزشوں کو سیدھا کرسکتے تھے مسٹر سینٹ جان براڈرک تھے جو بعد کو لارڈ مڈلٹن ہوئے۔ موصوف پہلے وزیر جنگ تھے اور بہ حیثیت وزیر جنگ اونھوں نے ایک ایسی تجویز اصلاح فوج کے بارہ میں پیش کی جس کو اہل انگلستان نے بالعموم ناپسند کیا اور جس کے باعث موصوف کی بڑی کرکری ہوئی۔ موصوف کے خلاف شورش بڑھنے پر وزیر اعظم نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ وزارت جنگ کی خدمات

سے اون کو سبک دوش کیا جائے۔ اوس عہد میں وزارت ہند کا عہدہ بڑا پُرسکون عہدہ تھا۔ لہذا یہ پھولوں کی سیج مسٹر سینٹ جان براڈرک کے حوالہ کی گئی۔ ملک ہند کا طریق حکومت یہ ہے کہ وائسرائے کے موقع پر موجود رہنے کے باعث اوس کے اختیارات نہایت وسیع ہیں۔ تاہم قانوناً تمامی انتظامات کی ذمہ داری وزیر ہند پر عائد ہوتی ہے اور وزیر ہند پارلیمنٹ میں جملہ نظم و نسق کا اوسی طرح ذمہ دار ہے جس طرح تمام وزارت بہ حیثیت مجموعی انگلستان کی عام رائے یعنی انتخاب کرنے والوں کے روبرو جواب دہ ہے۔ قانونی صورت تو یہی ہے جو بیان کی گئی۔ مگر عملی حالت یہ ہے کہ وائسرائے اور وزیر ہند دونوں میں جو زیادہ باا ثر، قابل اور معاملات سے باخبر ہو وہ غالب ہو جاتا ہے اور دوسرا مغلوب۔ لارڈ کرزن جس جس وزیر ہند کے ماتحت ہوئے اوس پر حاوی رہے۔ اس کے برخلاف وہائٹ ہال میں بیٹھ کر مسٹر مارلے بے دغدغہ اور مسٹر مانٹیگو اکثر و بیشتر ہندوستان پر حکومت کرتے تھے۔ دونوں صاحبوں نے ہمارے ملک کی قابل قدر خدمات انجام دیں۔

انگلستان کی لبرل وزارت

دسمبر ۱۹۰۵ء کی لبرل وزارت کا شمار انگلستان کی سب سے بڑی مضبوط اور باخبر وزارتوں میں ہوتا ہے۔ وزیر اعظم سرہنری کیمبل بے نرمین تھے جنھوں نے ۱۸۹۹-۱۹۰۲ء کی خوں خوار اور طویل جنگ کے باوجود جس کے باعث انگریزوں اور بور قوم کے لوگوں کے تعلقات نہایت تلخ ہو گئے تھے۔ جنوبی افریقہ کو وہی درجہ آزادی دیا جو کینیڈا اور اسٹریلیا کو حاصل تھا۔ لبرل وزارت ۱۹۱۶ء تک قایم رہی اور سرہنری کیمبل بے نرمین کی وفات کے بعد وزیر اعظم مسٹر اسکوتھ ہوئے۔ مسٹر اسکوتھ کی وزارت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اوس نے دارالامرا (ہاؤس آف لارڈس) کے اوپر کے دو سب سے زہریلے دانت اکھاڑ پھینکے۔ ایک زہریلے دانت کے ذریعہ سے ہاؤس آف لارڈس کو انگلستان کے سالانہ بجٹ میں کاٹ چھانٹ کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ دوسرے زہریلے دانت سے ہاؤس آف لارڈس جب چاہتا اون بلوں کو مسموم کر دیتا جو ہاؤس آف کامنس نے پاس

گئے تھے۔ یہ نزاع کئی سال تک جاری رہی۔ اور مسٹر اسکوتھ کو ایک سے زیادہ مرتبہ ہاؤس آف کامنس کو برخاست کرکے نئے سرے سے عام انتخابات کرانے پڑے۔ مسٹر لائڈ جارج نے جو اوس زمانہ میں مسٹر اسکوتھ کا دست راست تھے اپنی مستعدی۔ اَن تھک جدو جہد اور گرما گرم تقریروں سے بڑا نام پیدا کیا۔ لارڈ مارلے کو وزیر اعظم اور متحدہ وزارت کی پوری تائید حاصل تھی۔ اس لئے وائسرائے کی ایگزیکیوٹو کونسل میں ایک ہندوستانی کا اور وزیر ہند کی کونسل میں دو ہندوستانیوں کا تقرر اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۰۹ء کا پارلیمنٹ سے پاس کرانا اگرچہ یہ سب بجائے خود اہم کام تھے۔ مگر لارڈ منٹو کا تعاون حاصل ہونے کے باعث لارڈ مارلے کو اون دشواریوں کا مقابلہ نہ کرنا پڑا۔ جو قدم قدم پر مسٹر مانٹیگو وزیر ہند کو آٹھ نو سال بعد پیش آئیں۔ سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ جو اصلاحات مسٹر مانٹیگو ہندوستان میں نافذ کرنا چاہتے تھے اون سے لارڈ چیمسفورڈ کی رضامندی ضروری تھی۔ لڑائی کا زمانہ تھا انگلستان میں قومی وزارت برسر اقتدار تھی جس کے کرتا دھرتا مسٹر لائڈ جارج تھے۔ مسٹر لائڈ جارج کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ انگلستان کو جنگ میں کامیابی ہو۔ دوسری آرزو جیسا ۱۹۲۰ء سے لے کر ۱۹۲۲ء تک واقعات سے ثابت ہوا یہ تھی کہ موصوف انگلستان کے وزیر اعظم رہیں۔ وائسرائے کے عہدہ پر لارڈ چیمسفورڈ کا تقرر ایسا معمہ ہے جو آج تک حل نہیں ہوا۔ دور اندیشی۔ بلند نظری اور فراخ حوصلگی کے بغیر کوئی وائسرائے اپنے عہدہ کے فرائض قابلِ اطمینان طور سے انجام نہیں دے سکتا۔ اور ان اوصاف کی لارڈ چیمسفورڈ کی ذات میں نمایاں کمی تھی۔ بلکہ بعض سویلین لفٹنٹ گورنروں میں یہ اوصاف لارڈ چیمسفورڈ سے کہیں زیادہ موجود تھے۔ موصوف اپنے سایہ سے بھڑکتے تھے اگر غدر کے بعد پنجاب کے لفٹنٹ گورنر ہوتے تو غالباً کام چلا لیتے۔ مگر دورانِ جنگ میں لارڈ چیمسفورڈ جیسے آدمی کو ہندوستان کا وائسرائے بنا کر بھیجنا وزارتِ انگلستان کی ناقابلِ عفو غلطی تھی۔ مسٹر مانٹیگو کو ایسے وائسرائے کو تھپکنے اور اہم معاملات میں اون کی رضامندی حاصل کرنے میں جن دشواریوں کا مقابلہ کرنا پڑا ہوگا اوس کا اندازہ ہر شخص بجائے خود کرسکتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ ہم ہندوستانی مسٹر مانٹیگو کے احسانات اور ذاتی قربانی کو کبھی نہیں بھول سکتے۔

تقسیم بنگالہ لارڈ کرزن کے دوبارہ وائسرائے مقرر ہو کر آنے کے زمانہ میں مسٹر سینٹ جان براڈرک وزیر ہند تھے۔ اسے لارڈ کرزن کی خوش قسمتی سمجھیے یا بدقسمتی تاہم واقعہ یہ ہے کہ جس طرح چُپ چُپاتے لارڈ کرزن نے تقسیم بنگالہ کی تجویز کو وزیر ہند سے منظور کرایا اور جس عجلت سے اس تجویز کو نافذ کیا۔ ان تمام معاملات کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا بے جا نہیں ہے کہ اگر بجائے مسٹر سینٹ جان براڈرک کے وزیر ہند کوئی ایسا شخص ہوتا جو انگلستان کی پبلک کی نظر میں مشتبہ نہ سمجھا جاتا اور جس کو اپنی اصابت رائے پر پورا بھروسہ ہوتا تو غالباً تقسیم بنگالہ کی تجویز اس آسانی اور عجلت سے منظور نہ ہو جاتی۔ میرے نزدیک یہ تجویز حقیقتاً ایسی لچر۔ لغو اور لچر نہ تھی جیسی کہ انگریزی گورنمنٹ کی کمزوریوں اور ناعاقبت اندیشی کے باعث وہ بالآخر ثابت ہوئی۔ جھٹ سے منگنی پٹ سے بیاہ والی مثل جنگی کارروائیوں کے بارہ میں دوران جنگ میں صادق آتی ہو۔ مگر اہم سیاسی مسائل کا جو غور و خوض کے محتاج ہیں اور جن کا تعلق پبلک کی فلاح و بہبود سے ہے شملہ کی بلندی پر بیٹھ کر بغیر ان لوگوں کو اظہار رائے کا موقع دیے جن کا تعلق براہِ راست اوس تجویز سے ہے قطعی فیصلہ کرنا ہرگز مدبرانہ یا دانشمندانہ عمل نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ تقسیم بنگالہ کی تجویز شرقی بنگال کے مسلمانوں کے حق میں مفید تھی۔ اور آخر وقت میں مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا تذکرہ برائے نام اپنی تجویز کو تقویت پہونچانے کی غرض سے لارڈ کرزن نے کیا مگر انگریزی گورنمنٹ نے جو پالیسی ابتدائے حکومت سے برتی۔ اوس نے بنگال کے مسلمانوں کو اس درجہ کمزور کر دیا تھا کہ وہ بے چارے نہ اپنی مدد کر سکے نہ گورنمنٹ کی تاہم نواب سر سلیم اللہ بہادر نے بڑی ہمت و جرأت سے کام لے کر تقسیم بنگالہ کی حمایت کی اور شرقی بنگال کے مسلمانوں کی حالت کو بہتر بنانا چاہا۔ ہمارے ملک کی موجودہ صدی کی تاریخ کا یہ عبرتناک واقعہ ہے کہ چھ سات برس بعد جب تقسیم بنگال کی تجویز منسوخ کی گئی تو اوس وقت اوس صوبہ کے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے مسئلہ کو گورنمنٹ نے قطعاً نظر انداز کر دیا۔

مسلمان کیوں جاگے؟ حقیقت یہ ہے کہ گذشتہ پچاس برس میں تین واقعات ایسے گزرے ہیں جنھوں نے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے جگا دیا۔
پہلا واقعہ صوبجات متحدہ میں سر انٹانی میکڈانل کی لفٹننٹ گورنری کے زمانہ میں اردو ناگری کے رزولیوشن مورخہ ۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء کا اجرا ہے۔ دوسرا سانحہ دسمبر ۱۹۱۱ء میں ملک معظم جارج پنجم کی زبان سے تقسیم بنگالہ کی تنسیخ کا اعلان ہے۔ تیسرا معاملہ گورنمنٹ کا وہ اصرار اور ضد ہے جس کا اظہار اون تجاویز کو نہ ماننے کے بارہ میں گورنمنٹ لے کیا۔ جن کا تعلق مسلم یونیورسٹی کے قایم ہونے سے تھا۔ اس سلسلہ میں مسلمانوں کو ہندو بھائیوں سے شکایت ہے کہ اوںھوں نے پنڈت مدن موہن مالوی صاحب کے زیر قیادت اون شرائط سے بہت کم شرائط ہندو یونیورسٹی بنانے کے لئے منظور کرلیں جو مسلمان حاصل کرنا چاہتے تھے۔ آج کانگریسی جماعت مسلمانوں کو الزام دیتی ہے کہ وہ ملکی مسائل میں ہندو بھائیوں کا ساتھ نہیں دیتے۔ کاش اس ساتھ سنگت کا خیال پنڈت مدن موہن مالوی صاحب اور ہندو بھائیوں کو بنارس ہندو یونیورسٹی کی شرائط منظور کرتے وقت ہوتا۔ مگر اوس موقع پر گورنمنٹ نے توڑ جوڑ سے کام لیا۔ جب مسلمانوں سے معاملہ نہ ہوا تو مالوی جی کے ذریعہ ہندوؤں سے ساز باز شروع کیا اور مسلمانوں کو زیادہ حقوق دینے سے انکار کرکے پنڈت صاحب کو کم حقوق لینے پر راضی کرلیا۔ بقول نکہت ؎

ہم سے توڑی رقیب سے جوڑی　　　واہ اس توڑ جوڑ کے صدقے

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ لارڈ کرزن کی دوسری تجویز کا تعلق ہندوستانیوں سے نہ تھا بلکہ جب ۱۹۰۵ء میں فوجی معاملات کے بارہ میں لارڈ کچنر اور لارڈ کرزن میں نزاع پیدا ہوئی تو مسٹر سینٹ جان براڈرک وزیر ہند نے اپنے عمل سے ثابت کردیا کہ دودھ کا جلا چھاچ پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ سوڈان اور جنوبی افریقہ کی کامیابیوں نے لارڈ کچنر کو انگلستان میں ایسا ہر دل عزیز بنا دیا تھا کہ وزیر ہند کا لارڈ کچنر کے مقابلہ میں لارڈ کرزن کا ساتھ

دینا بڑا دشوار کام تھا۔ جب وائسرائے اور کمانڈر انچیف کے درمیان نزاع شروع ہوئی تھی اوس وقت کنسرویٹو پارٹی کی جاں کنی کا عالم تھا مسٹر بالفور اور مسٹر جوزف چیمبرلین کے باہم محصول درآمد کے بارہ میں اہم اختلافات ڈیڑھ سال پہلے شروع ہو گئے تھے۔ ایسی صورت میں کنسرویٹو گورنمنٹ کو جو سسک رہی تھی لارڈ کچنر کی تجویز کو نامنظور کرکے ایک اور دھکا دینا کنسرویٹو گورنمنٹ کی مصلحتوں کے سراسر خلاف تھا۔ اور وزیر ہند کے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ لارڈ کچنر کا ساتھ دیں۔ انجام یہ ہوا کہ لارڈ کرزن کو استعفےٰ دینا پڑا بعض اوقات دو چیزیں انسان کے دماغی توازن پر مضر اثر ڈالتی ہیں۔ ایک چیز حد سے بڑھی ہوئی کام یابی ہے اور دوسری چیز پے در پے اور مسلسل ناکام یابی۔ لارڈ کرزن کو جو غیر معمولی کام یابی ہندوستان میں ہوئی تھی اوس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ کہیں ٹھوکر کھائیں ۱۹۰۵ء میں ایک بنگالی ایڈیٹر نے اپنی حقیقت نگاری اور تحقیق و تجسس میں اپنے انہماک کا اظہار اس طرح کیا تھا کہ وسیع صحرائے عرب کے بیچوں بیچ پانی کی جستجو کرنے اور اٹلانٹک سمندر کی تہ میں اون جنگلوں کا جن میں آگ لگ رہی ہو پتہ لگانے اور لارڈ کرزن کی ذات میں اگر کوئی محقق کسی خوبی کا موجود ہونا ثابت کردے تو وہ اوسے ماننے کے لئے تیار ہے۔ بہ حیثیت وائسرائے لارڈ کرزن کے ہفت سالہ عہدِ حکومت کی اس مختصر جملہ سے زیادہ شدید تنقید آج تک میری نظر سے نہیں گزری۔ بہت سے حضرات کا خیال ہے کہ ملک ہند میں انگریزی حکومت کے انحطاط کی بنا لارڈ کرزن کے زمانہ میں شروع ہوئی۔ مسٹر بالفور نے جو بعد کو لارڈ بالفور ہوئے مسٹر مارلے وزیر ہند سے کہا تھا[۱] "بہ حیثیت وزیر اعظم میں نے دو غلطیاں کیں۔ جن میں سے ایک یہ تھی کہ لارڈ کرزن کو دوبارہ وائسرائے بنا کر ہندوستان بھیجا"۔ یہ حیرت انگیز حقیقت ہے کہ ہمارے ہندو بھائیوں نے تقسیم بنگالہ کے معاملہ کو قومی مسئلہ بنا لیا تھا۔ حالانکہ آج وہی ہندو بھائی مسلمانوں کے پاکستان کو قومی مسئلہ بنانے پر معترض

---

[۱] دیکھو انڈیا منٹو اور مارلے مؤلفہ کاؤنٹس آف منٹو مطبوعہ میکملن کمپنی ۱۹۳۵ء صفحہ ۱۱۵

معلوم ہوتے ہیں۔ لارڈ کرزن نے جو کچھ کیا وہ موصوف کے عہد کی ہندوستانی تاریخ کے صفحات میں درج ہے۔ مگر بمصرعہ

عیب او جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

کے بمصداق یہ کہنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ محکمۂ آثار قدیمہ قائم کرکے قدیم عمارتوں کے تحفظ کا جو انتظام لارڈ کرزن نے کیا اوس کے لئے سب اہلِ ملک موصوف کو مستحق ستائش سمجھتے ہیں۔

پیشہ قانون کی کشش

۱۹۰۶ء کے آخر میں چھ مہینے کی رخصت لے کر الہ آباد اس لئے گیا تھا کہ ایل۔ ایل۔ بی کے امتحان کی تیاری کروں گا کسی اور بات سے علاقہ نہ رکھوں گا۔ ایک فارسی شاعر نے روپیہ کی تعریف میں کہا ہے۔ شعر

اے زر تو خدا نہ ولیکن بخدا ستارِ عیوب و قاضی الحاجاتی

ترجمہ :۔ "خدا کی قسم اے روپے تو خدا تو نہیں ہے مگر تو عیبوں کا چھپانے والا اور حاجتوں کا برلانے والا ہے"

شعر کی خوبی یہ ہے کہ خدا نہ ہونے کے باوجود جن دو صفتوں کا وجود روپے میں شاعر نے ثابت کیا ہے وہ دونوں اوصاف حق سبحانہ تعالیٰ کے ہیں۔ طالب علمی کے بیشتر زمانہ میں مجھے وظیفہ بربنائے قابلیت ملا۔ ایف۔ اے پاس کرنے کے بعد جب صوبجات متحدہ۔ بہار اور بنگال کا دورہ علی گڈھ کالج کی طرف سے کیا اوس کا معاوضہ سو روپے ماہوار کے حساب سے کالج نے مجھے دیا۔ منصرمی پر تقرر ہونے سے قوتِ لایموت کا انتظام ہو گیا تھا۔ مگر تنخواہ قلیل تھی۔ سب سے بڑی ضرورت یہ تھی کہ آمدنی بھی معقول ہو اور میری دنیاوی حیثیت اس قابل ہو کہ کچھ تھوڑی بہت قومی خدمت کر سکوں۔ قومی خدمت انجام دینے کے لئے صاحبِ حیثیت ہونا لازمی نہیں ہے۔ مسٹر دادا بھائی نوروجی اور مسٹر گوکھلے دونوں میں سے کوئی بھی دولت مند نہ تھا مگر ہم نے آنکھ کھول کر یہی دیکھا کہ کامیاب وکیل بیرسٹر روپیہ بھی خوب کماتے تھے اور قومی خدمات انجام دینے میں بھی پیش پیش رہتے تھے۔ مسٹر ڈبلیو۔ سی۔ بانرجی۔ پنڈت اجودھیا ناتھ۔

مسٹر بدرالدین طیب جی اور سر فیروز شاہ مہتا کی مثالیں ہماری آنکھوں کے سامنے تھیں اور میں اور میرے ساتھی انہیں بزرگوں کی تقلید کرنا چاہتے تھے۔ میرے بی۔ اے پاس ہونے کے بعد والد مرحوم نے بہت کوشش کی کہ کہیں سے اتنا روپیہ قرض مل جائے کہ وہ مجھے انگلستان بھیج سکیں مگر کامیابی نہ ہوئی۔ میرے ایک دوست نے جن کو خواجہ سلیم اللہ بہادر نواب ڈھاکہ سے میرے تعلقات کا علم تھا مشورہ دیا تھا کہ میں ڈھاکہ جا کر موصوف سے اس بارہ میں امداد چاہوں مگر مجھے اپنی ایل۔ ایل۔ بی کی کامیابی پر اس قدر بھروسہ تھا کہ کسی کے آگے دستِ سوال پھیلانا گوارا نہ کیا۔ ان سب حالات کا اقتضا تو یہ تھا کہ میں الہ آباد میں سوائے قانونی کتابوں کے مطالعہ کے اور کسی بات سے تعلق نہ رکھوں لیکن۔ مصرعہ

کہنے میں بات آتی ہے یہ کچھ گلہ نہیں

علی گڈھ کی تربیت کے باعث اپنی طبیعت کی رفتار یہ ہوگئی تھی کہ شعر

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے — خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر

بھلا علی گڈھ کالج کی ہڑتال کا مجھ سے کیا تعلق تھا۔ تاہم دو ڈھائی مہینے علی گڈھ کے معاملات سدھارنے کی نذر کئے۔ لارڈ منٹو وائسرائے اور مسٹر جان مارلے وزیر ہند تھے۔ مسودہ اصلاحات پر غور و خوض کی ابتدا لارڈ منٹو نے کر دی تھی۔ کانگریس میں فریق گرم اور فریق نرم کے باہم اختلافات شروع ہو گئے تھے۔ اِن اختلافات کو کم کرنے کی غرض سے دسمبر ۱۹۰۶ء میں جب کانگریس کا اجلاس کلکتہ میں ہوا تو اوس کے صدر مسٹر دادا بھائی نوروجی بنائے گئے۔ موصوف کا دونوں فریق یعنی گرم و نرم بڑا احترام کرتے تھے۔ گرینڈ اولڈ مین[1] کی صدارت کے باوجود مصالحت کی کوئی صورت نہ نکل سکی اور ملک میں جگہ جگہ دو پولٹیکل اکھاڑے قائم ہوگئے۔

کانگریس کی نرم اور گرم پارٹیاں | الہ آباد جہاں ۱۸۸۸ء میں پنڈت اجودھیا ناتھ کی

---

[1] ملکی سیاسی حلقوں میں مسٹر دادا بھائی نوروجی گرینڈ اولڈ مین (سیاسی جد و جہد کے باوا آدم) کے خطاب سے یاد کئے جاتے تھے۔

کوشش سے کانگریس کا اجلاس ہوچکا تھا۔ ہمارے صوبہ کی سیاسی جدوجہد کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ فریق نرم کی دعوت پر مسٹر گوکھلے نے الہ آباد آکر فروری ۱۹۰۷ء میں بمقام کائستھ پاٹ شالا دو لیکچر دیئے میں دونوں جلسوں میں موجود تھا۔ مسٹر گوکھلے انگریزی کے بڑے زبردست مقرر تھے جس خیال کا اظہار جن الفاظ میں کرتے تھے معلوم ہوتا تھا کہ اوس خیال کے اظہار کے لئے اون کے منتخب کردہ الفاظ سے بہتر الفاظ انگریزی زبان میں موجود نہیں ہیں۔ آواز زیادہ بلند نہ تھی۔ مگر دو ڈھائی ہزار آدمیوں تک اون کی آواز پہونچ سکتی تھی۔ گورے رنگ پر مرہٹی پگڑی خوب سجتی تھی۔ آواز میں شیرینی اور طرز بیان میں بڑی دلکشی تھی۔ میں نے موصوف سے ملاقات بھی کی تھی۔ اوس زمانہ میں ہندو مسلم اتحاد کا اون کو خاص طور سے خیال تھا۔ مجھ سے فرمایا تھا کہ ہندو بڑی غلطی یہ کرتے ہیں کہ بنگال۔ مدراس اور صوبجات متوسط میں جو حالت مسلمانوں کی ہے وہی حالت شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کی سمجھتے ہیں۔ اگر جنوبی ہند کے ہندو مسلمانوں کے اثر اور اقتدار کا صحیح اندازہ کرنا چاہتے ہیں تو اون کو شمالی ہند میں آکر دیکھنا چاہیئے۔ برخلاف اس کے مسلمان اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ جو اثر اون کا شمالی ہند میں ہے وہ سمجھتے ہیں کہ بقیہ صوبوں میں بھی مسلمانوں کا ایسا ہی اثر اور اقتدار ہے۔ بھلا فریق گرم کو یہ کب گوارا ہوسکتا تھا کہ فریق نرم کا سب سے زیادہ اثر والا لیڈر الہ آباد آکر عوام کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرے۔ اور ملک کی وہ سچی سیوا کرنے والی جماعت جس کے جذبہ حُبِ وطن پر متحدہ بنگال اور مہاراشٹر نے منظوری کی مُہر لگائی تھی بیٹھی منھ دیکھا کرے۔ تقسیم بنگالہ کے خلاف شورش کے سلسلہ میں بابو بپن چندر پال کی اوس زمانہ میں بڑی شہرت تھی۔ مسٹر پال الہ آباد بلائے گئے اور اونھوں نے کھلے میدان میں تین چار دھواں دھار تقریریں کیں۔ بعض جلسوں میں حاضرین کی تعداد سات آٹھ ہزار تک پہونچ جاتی تھی۔ صدارت کی خدمات ڈاکٹر سر بیندرا ناتھ سین نے انجام دی تھیں۔ گوکھلے کی تقریروں کو اگر بیلے۔ چنبیلی۔ اور مونگرے کی پھولوں کے خوبصورت ہاروں سے تشبیہہ دی جائے تو بپن بابو کے کرتب

اوس بازی گر کے تماشہ کا اثر رکھتے تھے جو خالی ٹوکری سب کو دکھا کر اوس پر چادر ڈھکتا ہے۔ اور تھوڑی دیر میں ٹوکری ہٹا کر کبھی ناظرین کو آم کا درخت دکھاتا ہے۔ کبھی گیندے اور سورج مکھی کے پھول۔ کبھی کٹھل، کبھی بڑھل اور کبھی خرگوش کا جوڑا۔ کچھ عقل کام نہ کرتی تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔ بپن بابو کا جادو ہر طرف کام کر رہا تھا۔ لوگ بیدار تھے۔ مگر خواب کا سا عالم معلوم ہوتا تھا۔ مقرر کی آواز بہت بلند اور سپاٹ دار تھی۔ وہ زمانہ لاوڈ اسپیکروں کا نہ تھا۔ اگر لاوڈ اسپیکر ہوتے بھی تو بپن بابو کو اون کی ضرورت نہ تھی۔ مسلمانوں میں احساس پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ بعض نوجوان مسلمانوں نے چاہا کہ ہماری قوم پیچھے نہ رہے۔ ہم سب نے مل کر مسٹر (مولانا ہونے کے آٹھ نو سال پہلے کی بات ہے) محمد علی کو مدعو کیا اور ریلوے تھیئٹر میں اون کی تقریر کرائی۔ بہت اچھا مجمع تھا۔ پنڈت مدن موہن مالوی صاحب بھی شریک تھے۔ محمد علی مرحوم کی تقریر میں بذلہ سنجی اور صاف گوئی دونوں باتیں موجود تھیں۔ پنڈت صاحب کو مرحوم کی صاف گوئی پر تعجب ہوا۔ ادھر تو اندرونی کش مکش بڑھ رہی تھی۔ اودھر لارڈ منٹو کو یہ تشویش تھی کہ بنگال کی شورش کو روکنے اور تشدد کی صورت اختیار کرنے سے باز رکھنے کے لئے کیا تدابیر عمل میں لائی جائیں۔ شورش کا مرکز و توں بنگال ہی نہیں تھے بلکہ پنجاب کالونائزیشن بل کے خلاف جس کو پنجاب لجیسلیٹو کونسل پاس کر چکی تھی۔ پنجاب کے بعض حصوں میں ہیجان برپا تھا اور لارڈ کچنر کمانڈر ان چیف کے ذریعہ سے لارڈ منٹو کو یہ خبریں پہونچی تھیں کہ ہندوستانی فوج میں باغیانہ خیالات پھیلانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ انگلستان کی خوش قسمتی نے بسا اوقات آڑے وقت میں انگریزی سلطنت کی رفاقت کی ہے۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت خود ملک ہند پر انگریزوں کا تسلّط ہے۔ اہل انگلستان نے ایسٹ انڈیا کمپنی ہمارے ملک سے تجارت کرنے کے لئے قایم کی تھی۔ مگر تقدیر کمپنی کے سر پر کھڑی ہنستی۔ ہمت بندھاتی اور کہتی تھی۔ شعر

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال   کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

لارڈ منٹو کی سیاست | لارڈ کرزن کی غلطیوں نے تو انگریزی حکومت کی جڑیں ہندوستان

میں ہلادی تھیں۔ مگر یہ بھی انگلستان کی خوش قسمتی تھی کہ اگست ۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن کے مستعفی ہونے پر مسٹر بالفور ڈوزیراعظم نے لارڈ منٹو کو وائسرائے مقرر کیا۔ لارڈ منٹو کینیڈا کے گورنر جنرل رہ چکے تھے اور اون خوبیوں سے متصف تھے جو عموماً انگلستان کے لائق امرا میں پائی جاتی ہیں۔ ہندوستان آکر موصوف نے اپنا مقولہ جس پر وہ عامل تھے۔ یہ قرار دیا کہ مضبوط آدمی وہ ہے جو کمزور کہلائے جانے کے الزام سے نہ ڈرے۔ شرقی بنگال میں سر بیم فیلڈ فلر نے اودھم مچا رکھا تھا۔ فلر صاحب ہمارے صوبہ کے سویلین تھے۔ اور ملازمت کے ابتدائی زمانہ میں علی گڈھ میں تعینات رہ چکے تھے۔ دُھن کے پکے تھے۔ لارڈ کرزن نے اونہیں اپنے گوں کا آدمی پاکر مشرقی بنگال کا لفٹننٹ گورنر بنایا اور وہ کام لینا چاہا جو شہنشاہ عالمگیر نے میر جملہ سپہ سالار سے لیا تھا۔ لارڈ کرزن کو اگر اپنی حکومت کے دور ثانی پورا کرنے کا موقعہ مل جاتا تو اون کی اور فلر صاحب کی وہی مثل ہوتی کہ مصرعہ

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

مگر لارڈ منٹو کی موجودگی نے سارا کھیل بگاڑ دیا۔ سراج گنج کے اسکولوں کے بعض طلبا کا طریق عمل حکومت کے نزدیک نہایت قابلِ اعتراض تھا۔ فلر صاحب نے کلکتہ یونیورسٹی کے سنڈیکیٹ سے درخواست کی کہ ان اسکولوں کا الحاق توڑ دیا جائے۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے لاٹ صاحب کو متنبہ کیا کہ اگر یہ معاملہ سنڈیکیٹ میں پیش ہوا تو تقسیم بنگالہ اور شرقی بنگال کی موجودہ حکومت پر طرح طرح کے اعتراض ہوں گے جو شورش کی تقویت کا باعث ہوں گے مناسب یہ ہے کہ فلر صاحب اپنی وہ درخواست واپس لے لیں جو موصوف نے سنڈیکیٹ سے اسکولوں کا الحاق توڑنے کے بارہ میں کی تھی۔ جب یونیورسٹی نئے قواعد بنائے گی تو اس کا لحاظ رکھا جائے گا کہ اسکول پولٹیکل تحریکوں میں عملی شرکت کرنے سے باز رہیں۔ فلر صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ جواب دیا کہ یا گورنمنٹ آف انڈیا اپنے حکم کی نظر ثانی کرے یا اون کا استعفیٰ منظور کرے۔ لارڈ منٹو روز روز کی جھک جھک سے تنگ آگئے تھے۔ موصوف نے فلر صاحب

کا استعفےٰ منظور کرلیا اور مسٹر مارے نے لارڈ منٹو کی رائے سے اتفاق کیا[1]۔ ملکی حکومت کی باگ انڈین سول سروس کے ہاتھ میں تھی۔ فلر صاحب کے استعفےٰ کی منظوری پر سول سروس میں برہمی پھیلی۔ سول سروس کے اقتدار کا اندازہ اس بات سے ہوگا کہ جب فلر صاحب نے لندن میں مسٹر مارے وزیر ہند سے ملاقات کی تو دورانِ گفتگو میں وزیر ہند سے صاف کہا، میں نے تو یہ سمجھ کر استعفےٰ دیا تھا کہ وائسرائے میرا استعفےٰ منظور کرنے پر آمادہ نہ ہوں گے[2]۔ ان تمام حالات کے باوجود مسٹر مارے سر بیم فیلڈ فلر کا اپنی کونسل کی ممبری پر تقرر کرنا چاہتے تھے۔ مگر اس مغرور مزاج شخص نے جون ۱۹۰۸ء میں لندن ٹائمز میں ایک بے ڈھب مضمون لکھ کر وزیر ہند کو بھی اپنا مخالف بنالیا۔

مارے کی دلیرانہ حق پسندی

گورنمنٹ ہند بنگال کی شورش سے پنجاب کی شورش کو زیادہ خطرناک سمجھتی تھی۔ ہندوستانی فوج کی بیشتر بھرتی پہلے بھی پنجاب میں ہوتی تھی۔ اور اب بھی پنجاب میں ہوتی ہے۔ سر ڈینزل ایبٹسن بڑے زوردار لفٹننٹ گورنر تھے۔ وہ فوج کو پولٹیکل شورش سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے اون کے اصرار سے لالہ لاجپت رائے اور سردار اجیت سنگھ کی گرفتاری کے وارنٹ حسب ریگولیشن نمبر ۳ ۱۸۱۸ء ، رمئی ۱۹۰۸ء کو جاری کئے گئے اور لالہ لاجپت رائے مانڈلے جیل میں محصور رکھے گئے۔ اہلِ پنجاب کی وفاداری کو بدستور مضبوط رکھنے کے لئے دوسری کارروائی سر ڈینزل ایبٹسن نے یہ کی تھی کہ صوبہ کی کونسل سے پنجاب کالونائزیشن بل پاس کرایا تھا۔ چناب کی نوآبادی آب پاشی کی بدولت بڑی زرخیز ہوگئی تھی اور اس نوآبادی کی زمینیں پنشن یافتہ فوجی افسروں کو عطا کی گئی تھیں۔ جن لوگوں کو زمینیں دی گئی تھیں وہ عرصہ تک خوش حال رہے۔

---

[1] سوانح حیات سی۔ آر۔ داس مولفہ پرتھوی چندر رے مطبوعہ آکسفرڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۲۷ء صفحہ ۵۱ و ۵۲۔

[2] دیکھو انڈیا منٹو اور مارے مولفہ کاؤنٹس آف منٹو مطبوعہ میکملن اینڈ کو ۱۹۳۵ء صفحہ ۵۳

مگر جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اور بیٹے پوتوں کی تعداد بڑھی تقسیم در تقسیم کے باعث آراضی کا رقبہ گھٹتا اور پنشن یافتہ افسروں کے وارثوں کا افلاس بڑھتا گیا۔ بہت سوچ بچار کے بعد پنجاب گورنمنٹ نے خوش حالی قایم رکھنے کی یہ صورت نکالی کہ آراضی سب بیٹوں میں تقسیم نہ ہو بلکہ صرف بڑے بیٹے کو ملے۔ اس غرض کو حاصل کرنے کے لئے پنجاب کالونائزیشن بل معہ دیگر قواعد کے پاس کیا گیا۔ مگر لوگوں میں بڑی بے چینی اس وجہ سے پھیلی کہ یہ بل اور قواعد اوس رسم و رواج کے خلاف تھے جس کی رو سے باپ کی غیر منقولہ جائداد سب بیٹوں کا حق ہوتی ہے۔ شورش بڑھنے پر لفٹنٹ گورنر نے بل منظوری کے لئے گورنر جنرل کے پاس بھیجا اور ساری اونچ نیچ پر غور کرنے کے بعد لارڈ منٹو نے کالونائزیشن بل کی منظوری دینے سے مئی ۱۹۰۷ء کے تیسرے ہفتہ میں انکار کر دیا اور مسٹر مارلے نے بذریعہ تار وائسرائے کو اپنے متفق الرائے ہونے کی اطلاع دی۔ اوس نازک اور خطرناک دور کے حالات ختم کرنے کے قبل دو باتیں اور قابلِ تذکرہ ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ گو مسٹر مارلے جیسے غیر معمولی قابلیت کے وزیر ہند کی بے نظیر جرأت اور عاقبت اندیشی اور اثر کے بغیر وائسرائے کی ایگزیکیوٹو کونسل میں ہندوستانی ممبر کا تقرر کبھی عمل میں نہ آتا۔ لیکن یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ہندوستانی ممبر کے تقرر کی تجویز سب سے پہلے لارڈ منٹو کے ذہن میں آئی اور موصوف نے یہ تجویز مسٹر مارلے کے سامنے پیش کی تھی۔ اوس زمانہ میں یہ تجویز ایسی انقلابی تجویز سمجھی جاتی تھی کہ لارڈ رپن جیسے عالی حوصلہ اور فراخ دل لبرل نے بھی اوس کی مخالفت کرنا اپنا فرض سمجھا۔ لارڈ رپن کی مخالفت کے بعد ہندوستان کے شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم کی مخالفت پر کسی ذی ہوش انسان کو تعجب نہ ہونا چاہیئے۔ دوسرا معاملہ لارڈ منٹو کی جانشینی کا تھا۔ لارڈ کچنر نے ایڑی چوٹی تک کا زور لگایا کہ لارڈ منٹو کے بعد فاتح سوڈان ہندوستان کے وائسرائے مقرر ہوں۔ انگلستان میں سادبانہ (پراپے گینڈا) شروع ہوا اور بہت سے مقتدر اور با اثر سیاست دانوں کی تائید لارڈ کچنر کو حاصل ہو گئی۔ ملک معظم ایڈورڈ ہفتم بھی لارڈ کچنر کے تقرر کو موزوں اور مناسب سمجھتے تھے۔ مگر گلیڈسٹن کے چیلے نے

کوئی اثر قبول نہیں کیا اور وہی کیا جو ایمان دار جان مارلے کی سمجھ میں آیا۔ یہ بحث دلچسپی سے خالی نہیں کہ اگر مارلے کی بجائے ایڈورڈ ہفتم کو ڈسرآیلی (ملکہ وکٹوریہ کے مشہور وزیر اعظم) سے سابقہ پڑتا تو کیا ڈسرآیلی صاحب کی زبان سے جواب میں بجز "اینک ماہ وپردیں" کے کچھ اور الفاظ نکلتے۔ مسٹر مارلے کی دلیل یہ تھی کہ اصلاحات کے نفاذ کے بعد انگلستان کے ایک مشہور و معروف جرنیل کو ہندوستان کا والسرائے مقرر کرنا لوگوں کو یہ جتانا ہے کہ اصلاحات برائے نام ہیں۔ اور اہم معاملات میں ہندوستان کی تقدیر کا فیصلہ ایک جرنیل کے ہاتھ میں ہوگا جس کا نقطۂ نظر سیاسی اور ملکی نہیں بلکہ فوجی ہوگا۔

ایل۔ایل۔بی میں کامیابی

کسی شاعر کا شعر ہے۔ شعر
سنبھالا ہوش تو مرنے لگے حسینوں پر
ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

حسینوں پر مرنے کی بجائے میرے عہد کے وہ نوجوان جو انگریزی تعلیم کی غرض محض روٹی کمانا ہی نہیں سمجھتے تھے پولیٹکل معاملات کے فدائی تھے۔ جیسا اوپر مذکور ہو چکا ہے سیاست کی دیوی کی جھلک میں نے پہلی پہل ۱۹۰۵ء میں دیکھی۔ آنکھ ناک سے درست تھی۔ مگر صورت میں کوئی خاص دل فریبی نہ تھی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ الڑھ پنے کے دن تھے۔ جو بات کرتی تھی اوس میں ایک ادا نکلتی تھی۔ بقول داغ۔ شعر

سادگی، بانکپن، اغماض، شرارت، شوخی
تو نے انداز وہ پائے ہیں کہ جی جانتا ہے

ڈھائی سال میں نے سرکاری ملازمت میں گزارے مگر دیوی کی یاد دل سے نہ گئی۔ جوں جوں ملک میں سیاسی احساس بڑھتا گیا دیوی کی اداؤں کا جادو بھی سوا ہوتا گیا۔ الہ آباد کے قیام میں اپنی مصروفیتوں کا ذکر کر چکا ہوں۔ ایل۔ایل۔بی کا امتحان جولائی ۱۹۰۸ء کے تیسرے ہفتہ میں ہونے والا تھا۔ مجھے تیاری کے لئے بمشکل ڈھائی مہینہ کا وقت ملا ہوگا۔ میں نے اپنے کمرہ میں خس کی ٹٹی لگوالی تھی۔ اور دوپہر میں پنکھا کھینچنے کے لئے ایک قلی کو نوکر رکھ لیا تھا صبح کے دو ڈھائی گھنٹے قانونی کتابوں کے مطالعہ میں صرف کرتا تھا اور دن کے دس بجے سے سہ پہر

کے پانچ بجے تک اپنے کمرہ میں پڑھتا تھا۔ اس درمیان میں کسی کو اپنے کمرہ میں نہ آنے دیتا تھا۔ دن کے بارہ اور ایک بجے کے درمیان پلنگ پر لیٹ کر کمر سیدھی کرتا تھا۔ بقیہ وقت پڑھنے میں صرف ہوتا تھا۔ وقت مقررہ پر میں امتحان میں شریک ہوا۔ امتحان دس بارہ دن تک جاری رہا میں نے پرچے اچھے کئے۔ شروع اگست میں الٰہ آباد سے کندرکھی پہونچا۔ خیال یہ تھا کہ ستمبر میں نتیجہ آجائے گا۔ میری رخصت ۳۱ ؍اگست کو ختم ہونے والی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ نتیجہ کا حال مجھے کندرکھی میں معلوم ہو جائے۔ اس لئے ۳۰ ؍ستمبر ۱۹۰۸ء تک مزید رخصت لے لی۔ نتیجہ آنے میں دیر لگی۔ مجبوراً یکم اکتوبر کو میں نے منصوری جا کر منصرمی کا چارج لے لیا۔ غالباً ۶ ؍اکتوبر کو تار ملا جس سے معلوم ہوا کہ میں پہلے درجہ میں امتحان میں کامیاب ہو گیا۔ یونیورسٹی میں میرا تیسرا نمبر تھا۔

تین مہینے اور ملازمت کی اور دسمبر ۱۹۰۸ء کے بڑے دن کی تعطیل میں مراد آباد آکر وکالت شروع کرنے کے بارہ میں ضروری انتظامات کئے۔ مولوی سید حسن صاحب کن رکھوی نے جو والد صاحب کے دوست تھے مشورہ دیا کہ میں بہ حیثیت وکیل ہائی کورٹ کام شروع کروں۔ ضلع کے وکیل کی حیثیت سے ابتدا نہ کروں۔ دونوں باتوں میں فرق یہ تھا کہ بہ حیثیت وکیل ہائی کورٹ نام درج کرانے میں پانچسو روپیہ یک مشت فیس ادا کرنا ضروری تھا۔ اور یہ اندراجِ نام تمام عمر کے لئے کافی تھا۔ اگر کوئی شخص بہ حیثیت وکیل عدالت ججی اپنا نام درج کرانا چاہتا تو اوس کو صرف پچیس روپیہ سالانہ فیس ادا کرنا پڑتی تھی۔ مگر ججی کی وکالت کے سرٹیفکٹ کی ہر سال تجدید کرانا لازمی تھا۔ مولوی صاحب نے یہ مشورہ دیا کہ بہ حیثیت وکیل عدالت ضلع کام شروع کرنا میرے لئے چھوٹی بات ہے۔ ایل۔ ایل۔ بی ہونے کی حیثیت سے اگر میں وکلائے ہائی کورٹ الٰہ آباد کی فہرست میں نام درج کرا کے کام شروع کروں تو میری وقعت زیادہ ہوگی۔ موصوف کی یہ رائے بالکل صحیح تھی۔ مگر میرے لئے پانچ سو روپیہ کی رقم یک مشت ادا کرنا آسان کام نہ تھا۔ تاہم دوستوں سے قرض لے کر میں نے بہ حیثیت وکیل ہائی کورٹ

اپنا نام ۲۲ جنوری ۱۹۰۸ء کو درج کرایا۔ اور محرم کی تعطیل کے بعد کچہری کھلنے پر کام شروع کر دیا میں نے منصری سے استعفےٰ نہیں دیا تھا بلکہ بغیر تن خواہ کے سال بھر کی رخصت لے لی تھی۔ اور ہائی کورٹ نے مجھے رخصت کے زمانہ میں وکالت کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ میں نے احتیاطاً سرکاری ملازمت سے قطع تعلق نہیں کیا تھا۔ مگر یہ احتیاط غیر ضروری ثابت ہوئی۔ اور دسمبر ۱۹۰۸ء میں میں نے منصری سے استعفےٰ دے دیا۔

مراد آباد میں وکالت جنوری ۱۹۰۸ء

جب جنوری ۱۹۰۸ء میں میں نے مراد آباد میں وکالت شروع کی ہے تو میرا کُل سرمایہ ایک بائیسکل۔ تھوڑا سا فرنیچر اور چند کتابیں اور گورنمنٹ ہند کے غیر مشرح ایکٹ تھے۔ اوسی زمانہ میں مولوی قیام الدین احمد نے دفتر کے لئے ایک میز جس کی قیمت سو روپے کے قریب تھی بریلی سے منگوا کر ہدیۃً مجھے دی تھی میز بہت اچھی تھی اب بھی میرے پاس ہے۔ چیز اگر احتیاط سے برتی جائے تو برسوں رہتی ہے۔ کپڑے بھی میرے پاس خوب چلتے ہیں۔ تین انگریزی سوٹ اس وقت میرے پاس ایسے موجود ہیں جو ۱۹۱۳ء میں یعنی اونتیس سال سے زیادہ زمانہ گزرا دہلی کے انگریز درزی رینکن سے بنوائے تھے۔ ان میں ایک فراک سوٹ تھا۔ وقتاً فوقتاً میں نے فراک سوٹ پہنا مگر وہ رفیق وفادار رنئے کا نیا رہا۔ جب فراک سوٹ پہننے کا رواج نہ رہا تو میں نے فراک کوٹ کو ۱۹۳۴ء میں بدلوا کر مارننگ کوٹ کرا لیا۔ اب سے اٹھارہ بیس سال پہلے کے بنے ہوئے سوٹ میرے پاس بہت سے ہیں۔ میرے چھوٹے چچا میر آل حسن کی شادی جون ۱۸۹۲ء میں ہوئی تھی۔ اوس تقریب میں والدہ صاحبہ نے میرے لئے کامدانی کا انگرکھا تیار کرایا تھا وہ بھی میرے پاس موجود ہے۔ وفات کے کچھ دن پہلے والدہ صاحبہ نے میری چھٹی کی ٹوپی دے کر فرمایا تھا کہ حفاظت سے رکھنا۔ میں اوسے بڑی احتیاط سے رکھتا ہوں۔ بچپن میں ٹوپی کے بارہ میں بڑی دل خوش کن روایتیں سنی تھیں ایک روایت تھی کہ جو اہلِ مقدمہ ٹوپی کو اپنے ساتھ کچہری لے گیا مقدمہ جیت کر گھر لوٹا۔ آج کل بڑا نازک وقت ہے اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ جس فوج کے ساتھ یہ ٹوپی ہو وہ لڑائی جیت جائے گی

تو دولت میں آج میں مسٹر ہنری فورڈ اور لارڈ بیور بروک کا مدمقابل ہوتا۔ مجھے ابھی تک ٹوپی کے خواص آزمانے کا موقع نہیں ملا ہے۔ دیدہ خواہد شد۔ خواص کے قطع نظر میں ٹوپی کو اس لئے بہت بڑی نعمت سمجھتا ہوں کہ جب اوس پر نظر پڑجاتی ہے یا اوس کا خیال آجاتا ہے تو والدہ مرحومہ کی اون شفقتوں اور احسانات کی یاد تازہ ہوجاتی ہے جن کا شمار خالقِ اکبر کی قدرت کے سب سے بڑے جلوؤں میں ہے۔

شروع وکالت کے واقعات کبھی نہ بھولوں گا۔ یہ میری زندگی کا نیا دور تھا میں محنت اور جفاکشی کا بچپن سے عادی تھا۔ ڈپٹی کلکٹروں میں اوس زمانہ میں خاں بہادر قاضی عزیزالدین احمد (جو بعد میں دتیا کے دیوان ہوئے اور نائٹ کا خطاب پایا) اور منشی اشفاق حسن خاں مرادآباد میں تعینات تھے۔ قاضی مخدوم حسن بندوبست کے ڈپٹی کلکٹر تھے۔ بابو نہال چند صدر اعلیٰ تھے۔ خواجہ عبدالعلی جواب علی گڈھ کے پرانے طلبا کی جماعت کے باوا آدم نہیں تو حضرت نوح ضرور ہیں منصف شہر تھے۔ قاضی سر عزیزالدین احمد اور قاضی مخدوم حسن سے میری علی گڈھ کی واقفیت تھی۔ دونوں نے میری جو مدد کی اوس کا تذکرہ نہ کرنا احسان پر پردہ ڈالنا ہے۔ دونوں قاضی صاحبان ایسے ہی مختلف المزاج تھے جیسے دو انسان ہوسکتے ہیں مگر دونوں بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔

قاضی سر عزیزالدین

قاضی عزیزالدین انگریزی مڈل پاس بھی نہ تھے مگر بڑی اچھی انگریزی لکھتے تھے۔ اون کے فیصلے چھ سات صفحے سے زیادہ کے نہ ہوتے تھے۔ چھوٹے جملے۔ سادہ الفاظ۔ بالکل آمد ہوتی تھی۔ آورد کا نام نہ تھا۔ کہا کرتے تھے کہ جتنا بڑا فیصلہ ہوگا اوسی قدر وکیل بیرسٹروں کو عدالت اپیل کے سامنے زیادہ اعتراضات جڑنے اور فیصلہ میں سوراخ کرنے کے موقعے ملیں گے۔ اونھوں نے مجھے مرادآباد کے حکام۔ رؤسا۔ باثر حضرات اور پبلک سے روشناس کرنے میں بڑی ہوشمندی سے کام لیا۔ اکتوبر ۱۹۰۷ء میں نواب محسن الملک کا انتقال ہوا۔ کچھ دن بعد مرادآباد میں تعزیتی جلسہ ہوا۔ میں جلسہ کے

دن مراد آباد میں موجود تھا۔ مسٹر کرٹن (Mr. Kirton) ایڈیشنل جج جلسہ کے صدر تھے اونہوں نے صدر کی حیثیت سے ایک مختصر تقریر انگریزی میں کی۔ ادھر مسٹر کرٹن تقریر ختم کر کے اپنی کرسی پر بیٹھے ادھر قاضی عزیز الدین نے اعلان کیا کہ اب صدر صاحب کی تقریر کا ترجمہ اردو میں سید رضا علی صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کریں گے۔ مجھے قطعاً یہ علوم نہ تھا کہ یہ خدمت میری سپرد ہوگی۔ اگر صدارتی تقریر کی ابتدا میں مجھے معلوم ہو جاتا تو مجھے دشواری نہ ہوتی۔ مگر اس موقع کو ہاتھ سے جانے دینا بڑی غلطی ہوتی۔ میں کھڑا ہو گیا۔ تقریرِ صدارت کی جو جو باتیں یاد رہیں بیان کیں۔ مگر جو عقیدت مجھے نواب صاحب مرحوم کے ساتھ تھی وہ کام آگئی۔ ترجمہ کرنے کے بجائے نئی تقریر شروع کر دی جس میں محسن الملک کے ایسے کارناموں کا تذکرہ تھا جو مسٹر کرٹن نے کبھی نہ سنے ہوں گے۔ ہر نئی بات پر یہ کہتا جاتا تھا کہ جناب صدر نے یہ بھی فرمایا ہے۔ غرض کہ تقریر خوب رہی اور لوگوں کو پسند آئی۔ جلسہ کے بعد ایک انگریزی داں بزرگ نے فرمایا "بھائی تقریر تو تمہاری نہایت اچھی تھی واقعات اور حالات خوب بیان کئے۔ مگر جو کچھ تم نے کہا اوس کا صدارتی تقریر سے کچھ زیادہ تعلق نہ تھا" اعتراض تو صحیح تھا مگر میں اون بزرگ سے کیسے کہتا کہ جناب میں نظر پر نہیں کر رہا تھا بلکہ امتحان کے پرچے کا جواب دے رہا تھا۔ چند ہفتے بعد مجھے مراد آباد میں وکالت شروع کرنا ہے۔ اگر میں نے اس موقع سے فائدہ اوٹھایا اور برادرانِ وطن کو بتا دیا کہ بقول غالب۔ مصرعہ۔ ہم بھی منھ میں زبان رکھتے ہیں۔ تو کیا گناہ کیا؟ مجھے زندگی کا یہ تجربہ ہے کہ نوجوان آدمی کو آگے بڑھنے اور بڑھے چلے جانے کا جو موقع ہاتھ آئے اوس سے پورا کام لینا اور فائدہ اوٹھانا چاہیئے۔ جو چوکا وہ گیا جو بھولا وہ رہا۔ قاضی عزیز الدین کی ہمشیل ذکاوت کا ایک اور واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ مجھے وکالت شروع کئے کوئی چھ مہینے ہوئے ہوں گے قاضی صاحب کے اجلاس میں میرا کوئی مقدمہ تھا۔ میں پہونچا تو معلوم ہوا دفعہ ۱۰۹ مجموعہ ضابطہ فوجداری کا ایک ملزم پیش ہے۔ الزام یہ تھا کہ ملزم آوارہ ہے اور گذر اوقات کا کوئی ذریعہ نہیں رکھتا۔ ملزم نے بیان کیا کہ میں کندرکھی کا رہنے والا ہوں اور بے گناہ ہوں۔ پولیس نے

اپنی کارگزاری کے لیے میرا چالان کر دیا ہے۔ چند منٹ قاضی صاحب نے تامل کیا اوس کے بعد چپراسی کو مخاطب کر کے فرمایا "دیکھو میر صاحب (میرے والد) آج صبح ہم سے ملنے آئے تھے اگر کچہری میں تشریف لائے ہوں تو ہمارا سلام دو" تھوڑی دیر میں والد صاحب قبلہ تشریف لائے تو قاضی صاحب نے دریافت کیا "میر صاحب آپ اس شخص کو جانتے ہیں کیسا آدمی ہے؟ اونھوں نے جواب دیا "میں جانتا ہوں مگر اچھی طرح واقف نہیں ہوں۔ میں نے کوئی شکایت نہیں سُنی" اس پر قاضی صاحب نے ملزم کی طرف خطاب کر کے فرمایا "میر صاحب کی رائے تمہارے بارہ میں اچھی ہے جاؤ تم کو چھوڑ دیا" والد صاحب کا بیان قلم بند نہیں کیا۔ میں اجلاس میں کھڑا یہ سب تماشا دیکھ رہا تھا۔ بعد کو معلوم ہوا قاضی صاحب نے ملزم کو چھوڑنے کا تہیہ پہلے سے کر لیا تھا۔ والد صاحب سے طرف اس لئے پوچھا تھا کہ قاضی صاحب سے اون کے مراسم کا حال لوگوں کو بر سر اجلاس معلوم ہو جائے۔ اور اس طرح اون کے اجلاس کے فوج داری مقدمات میرے پاس آنے لگیں۔ مدد کرنے والے حاکم نومشق (جونیر) وکیل بیرسٹر کی جائز امداد جن طریقوں سے کر سکتے ہیں اوس کی یہ نہایت اچھی مثال ہے۔

قاضی مخدوم حسن

قاضی مخدوم حسن صاحب گنگوہ ضلع سہارن پور کے رہنے والے تھے میری طالب علمی کے زمانہ میں علی گڈھ میں محکمۂ بندوبست کے ڈپٹی کلکٹر تھے۔ وہاں پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی تھی۔ علی گڈھ میں سنا تھا کہ وہاں کے زمیں داروں نے جو اخفائے لگان کر رکھا تھا اوس کا بڑی جدوکد سے قاضی صاحب نے کھوج لگایا تھا بڑی آزاد اور مضبوط رائے کے آدمی تھے۔ جب بندوبست کا کام ۱۹۱۰ء میں ختم ہونے لگا تو ضلع میں اون کی تعیناتی ہوئی اور سنبھل کی تحصیل جو ضلع مرادآباد میں سب سے بڑی تحصیل ہے مجسٹریٹ ضلع نے اون کی سپرد کی۔ بڑے قابل اور بے لاگ مجسٹریٹ تھے۔ مجسٹریٹ ضلع کے لئے مقدمات فوج داری میں اون کی رائے پر اثر ڈالنا مشکل کام تھا۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ فوج داری کے بڑے اور ہنگامہ خیز (Sensational) مقدمات میں جب تک فیصلہ لکھنا شروع نہ کروں

مجھے خود بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ملزم کو سزا دوں گا یا بری کروں گا۔ سر عزیز الدین احمد کا طریقہ بالکل برعکس تھا۔ ۱۹۲۶ء میں موصوف نے خود مجھ سے فرمایا کہ "عموماً چالانی مقدمات میں چالان آنے پر اور استغاثہ کے مقدمات میں عرضی استغاثہ پڑھے جانے کے وقت میں عموماً رائے قایم کر لیتا تھا کہ ملزم کو سزا دوں گا یا چھوڑ دوں گا" میں نے جواب دیا "آپ نے بڑی عنایت کی جو پنشن لینے کے پہلے اپنا یہ طریقہ مجھ کو نہ بتایا ورنہ آپ کے اجلاس میں ملزم کی طرف سے پیروی میں دل سے ہرگز نہ کر سکتا" بات یہ ہے کہ دیوانی کا مقدمہ ہو یا فوجداری کا۔ وکیل بیرسٹر کا جی پیروی میں اوسی وقت لگ سکتا ہے جب اوسے حاکم عدالت کی آزادی اور ناطرف داری پر پورا بھروسہ ہو۔ قاضی مخدوم حسن ہمیشہ انصاف کرنے کی کوشش کرتے تھے دغا کا ایک مقدمہ اون کے اجلاس میں بربنائے استغاثہ دائر ہوا۔ تین ملزم تھے اور تینوں بمبئی کے رہنے والے تھے۔ بیان استغاثہ یہ تھا کہ ملزموں نے مستغیث کو دھوکا دے کر بہت سامال بغیر قیمت ادا کئے بمبئی منگوا لیا تھا۔ ابتدائی شہادت لینے کے بعد قاضی صاحب نے یہ رائے قایم کی کہ بادی النظر میں مقدمہ کے واقعات سچے معلوم ہوتے ہیں۔ تینوں ملزموں کا وارنٹ جاری کر دیا۔ ایک ملزم بڑا دولت مند تھا اور دوسرا بھی خوش حال تھا۔ تیسرے کی حیثیت معمولی تھی۔ دولت مند ملزم کی طرف سے پیروی کے لئے مسٹر دستور Mr. Dastur جو فوجداری کے کامیاب بیرسٹر تھے بمبئی سے بلائے گئے۔ خوش حال ملزم نے اپنی طرف سے مجھے وکیل مقرر کیا۔ معمولی حیثیت والے ملزم کی طرف سے مراد آباد کے ایک اور صاحب وکیل تھے۔ مقدمہ عرصہ تک چلتا رہا۔ اور ثبوت اور صفائی کی شہادت ختم ہو کر بحث کی نوبت آگئی ایک روز قاضی صاحب نے مجھ سے فرمایا مقدمہ ختم ہو رہا ہے۔ مسٹر دستور بمبئی سے آئے ہیں تم اون کی دعوت کیوں نہیں کرتے۔ میں نے دعوت کر دی اور دعوت میں قاضی صاحب کو معہ چند عمائد شہر کے بلایا۔ قاضی صاحب نے دعوت منظور کر لی۔ جس رات کو دعوت تھی اوس کے دوسرے دن صبح کو قاضی صاحب فیصلہ صادر کرنے والے تھے۔ دعوت کے دن میرے

محرر منشی عبدالشکور نے (جو مولوی عبدالرب صاحب مراد آباد کے مشہور وکیل کے یہاں عرصہ تک رہے تھے۔ اور بڑے تجربہ کار اور معاملہ فہم تھے) مجھے اطلاع دی اور کہا کہ "بمبئی والا موکل آیا تھا اور کہتا تھا کہ اگر قاضی صاحب مجھے بری کر دیں تو دس ہزار روپے دینے کے لئے تیار ہوں روپے ابھی لا سکتا ہوں" منشی عبدالشکور بڑے محل شناس۔ ہوشیار اور باسلیقہ محرر تھے۔ غالباً اوس وقت تک اونھوں نے موکل کو قطعی جواب نہیں دیا تھا بلکہ بہ قول شاعر اپنا طرزِ عمل یہ رکھا تھا کہ مصرعہ۔ "ابرو پہ ہے بل ہونٹوں پہ ہنسی انکار بھی ہے اقرار بھی ہے"

میرا خیال ہے کہ موکل کو جواب دینے سے پہلے وہ میرا عندیہ معلوم کرنا چاہتے تھے۔ میں نے پوچھا آپ نے کیا جواب دیا بولے" میں نے کہہ دیا کہ ہمارے وکیل صاحب رشوتوں کے معاملہ میں کبھی نہیں پڑے۔ موکل ہونے کی حیثیت سے میں نے اوس کی بات آپ تک پہونچا دی"۔ میں نے کہا "آپ نے بہت اچھا کیا۔ موکل سے کہہ دیجئے کہ اس طرح کے تذکرے ہمارے دفتر میں نہ کرے"۔ غالباً اتوار کا دن تھا۔ دن کے تین بجے قاضی مخدوم حسن میرے گھر آئے اور کہنے لگے" میں نے دعوت تو منظور کر لی ہے۔ مگر ایک بات غور طلب ہے فیصلہ لکھ رہا ہوں اگر میں نے تمہارے موکل کو چھوڑ دیا تو دنیا یہ کہے گی رات کو تم نے میری اور دستور کی دعوت کی اور صبح کو موکل چھوٹ گیا۔ یہ بدنامی کی بات ہے۔ اگر تم بُرا نہ مانو تو میں دعوت میں شرکت نہ کروں"۔ میں نے کہا "مجھے آپ کی رائے سے اتفاق ہے گو میں نے دعوت آپ کے کہنے سے کی ہے۔ مگر مناسب یہ ہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ شریک نہ ہوں"۔ دعوت ہوئی اور قاضی صاحب کے علاوہ بقیہ سب مہمان شریک ہوئے۔ دوسرے دن قاضی صاحب نے حکم سنایا میرے موکل اور مسٹر دستور کے موکل دونوں کو چھوڑ دیا۔ تیسرے ملزم کو دو سال کی قید کی سزا دی۔ جو بر طبق اپیل سشن جج کے اجلاس سے اور بالآخر ہائی کورٹ سے بحال رہی۔ ابھی قصہ پورا نہیں ہوا۔ ایک بات اور سن لیجئے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ قاضی صاحب کیسے غیر معمولی تدین اور راست بازی کے انسان تھے۔ میں بتا چکا ہوں کہ مسٹر دستور کا موکل بہت دولت مند

تھا۔ دعوت کے دن اوس کے بھیجے ہوئے ایک نوجوان انگریزی داں وکیل قاضی صاحب کے بنگلے پر پہنچے اور اوس کی طرف سے بیس ہزار روپے رشوت کا پیام یہ کہہ کر دیا کہ "آپ کی بات کا اعتبار ہے کسی تیسرے آدمی کے پاس روپیہ جمع کرانے کی ضرورت نہیں۔ صرف ارشاد کی دیر ہے ایک گھنٹے کے اندر روپیہ یہیں کوٹھی پر آجائے گا" قاضی صاحب نے اون کو ڈانٹ بتائی اور جو جواب دیا اوس کا مفہوم حضرت حافظ شیرازی کے حسب ذیل شعر سے بخوبی ادا ہوتا ہے۔ شعر

برو این دام بر مرغ دگر نہ   کہ عنقا را بلند است آشیانہ

ترجمہ:۔ چلو اس جال میں کسی اور پرندہ کو پھانسو۔ عنقا کا گھونسلہ اتنا اونچا ہے کہ وہاں تک کسی جال کی پہونچ نہیں ہے"

قاضی صاحب دولت مند آدمی نہ تھے اگر یہ روپیہ رکھ لیتے تو کانوں کان کسی کو خبر نہ ہوتی۔ مگر وہ سچے مسلمان تھے۔ میں نے اگلے وقتوں کے ایسے مسلمان حاکموں کے قصے بھی سنے ہیں جو مصلّے پر بیٹھ کر نماز ادا کرنے کے پہلے یا ٹھیک نماز کے بعد رشوت لیتے تھے اور رشوت کی رقم جانماز کا سرا اُلٹ کر اوس کے نیچے رکھوا لیتے تھے۔ قاضی صاحب جانتے تھے کہ لوگ نہ دیکھیں۔ مگر خداوند عالم سب جانتا۔ دیکھتا اور سنتا ہے۔ وہ بڑے با اصول انسان تھے۔ ۱۹۱۶ء سے ۱۹۱۹ء تک الہ آباد میونسپلٹی کے ایگزیکیٹیو آفیسر رہے ۱۹۳۴ء میں اپنے وطن میں وفات پائی۔

سر والٹر کالون (Sir Walter Colvin) سر والٹر کالون الہ آباد ہائی کورٹ کے فوج داری کے مشہور بیرسٹر تھے۔ روپیہ کمانے کے ڈھب اون کو خوب آتے تھے۔ سر آکلینڈ کالون جو ۱۸۸۷ء سے ۱۸۹۲ء تک صوبجات متحدہ کے لفٹنٹ گورنر رہے۔ اون کے چچا زاد بھائی تھے۔ بھائی کی لفٹنٹ گورنری کے زمانہ میں اپنی فیس بڑھا کر پانسو روپیہ روزانہ کر دی تھی ہمارے صوبہ میں اتنی بڑی فیس اوس زمانے میں کسی اور وکیل بیرسٹر کی نہ تھی۔ مجھے وکالت شروع کئے چند مہینے گزرے تھے جو میں اوآباد میں دغا کرنے اور جھوٹی

دستاویز بنانے کا ایک بڑا ہنگامہ خیز مقدمہ سشن سپرد ہوا۔ زن۔ زر۔ زمین کی بدولت ہمیشہ ہنگامے برپا ہوئے ہیں۔ اس مقدمہ کی جان بھی ایک جوان عورت کی دل ربا صورت تھی۔ کئی ملزم تھے مگر ایک ملزم مراد آباد کے ایک بڑے معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ مالی حالت بہت اچھی تو نہ تھی مگر مرتا کیا نہ کرتا مثل مشہور ہے۔ چُپ چُپاتے الہ آباد جاکر سروالٹر کالون کو اپنی طرف سے پیروی کے لئے مقرر کر آئے۔ پری کی وکالت کا قرعہ میرے نام نکلا۔ ممکن ہے یہ سمجھا گیا ہو کہ سید ہونے کے باعث شاید میں پری کے آسیب سے محفوظ رہوں گا۔ خودستائی ہوتی ہے مگر اتنا اور کہہ دوں کہ یہ رائے صحیح ثابت ہوئی۔ وہ مجھ سے بڑے انداز سے باتیں کرتی تھی۔ بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ پری مجھے شیشہ میں اُتارنا چاہتی ہے۔ مگر میں نے راجہ اندر بننا اپنے مناسب حال نہ سمجھا۔ مراد آباد کے فوج داری میں کام کرنے والے وکیل بیرسٹر تقریباً سب اس مقدمہ میں مختلف ملزموں کی طرف سے کام کر رہے تھے۔ ایک کو مستغیث نے بھی اپنی طرف سے مقرر کیا تھا۔ وہ وکیل سرکار (گورنمنٹ پلیڈر) کی مدد کر رہے تھے۔ سروالٹر کالون اُردو اچھی بولتے تھے۔ مجھ کو مسٹر کانلین (Mr. Conlan) سے جو الہ آباد ہائی کورٹ میں دیوانی کا کام کرتے تھے۔ واقفیت نہیں تھی۔ سُنا ہے کہ وہ سروالٹر سے بہتر اردو بولتے تھے اور اردو کے محاوروں سے فی الجملہ واقف تھے۔ تذکیر و تانیث کی بھی غلطیاں کم کرتے تھے۔ میرے علم میں صرف دو انگریز ایسے ہیں جو صحیح اور سروالٹر کالون سے کہیں اچھی اردو بولتے ہیں۔ یہ عجب اتفاق ہے کہ دونوں انڈین پولس سے تعلق رکھتے ہیں ایک مسٹر ہالنس (Mr. Hollins) جو گورنمنٹ آف انڈیا کے محکمہ اطلاعات (Intelligence) کے ڈائرکٹر تھے اور اب کئی سال سے حیدرآباد دکن میں پولس کے انسپکٹر جنرل ہیں۔ دوسرے مسٹر مارش اسمتھ (Mr. Marsh Smith) جو صوبجات متحدہ میں پولس کے ڈپٹی انسپکٹر جنرل ہیں۔ دونوں سے میری اردو میں بات چیت ہوئی ہے۔ میں کسی ایسے انگریز سے واقف نہیں ہوں جو خود ہندوستان آیا ہو اور ایسی صحیح اردو بے تکلفی سے بول سکے

جیسی مسٹر ہالنس اور مسٹر مارش اسمتھ بولتے ہیں۔ مسٹر ایولنس ہمارے صوبہ کے سویلین ہیں کئی سال سے دہلی میں ہیں۔ سنا ہے اردو خوب بولتے ہیں۔ مگر میری اون کی اُردو میں کبھی بات چیت نہیں ہوئی۔ مقدمہ کی پیچیدگی کے باعث سر والٹر کالون کو بہت لمبی جرح کرنی پڑی۔ مسٹر ڈی۔ آر۔ لائل کے اجلاس میں مقدمہ تھا۔ وہ لمبی جرح سے گھبراتے تھے۔ مگر سر والٹر کالون کو اونہوں نے نہیں روکا۔ سر والٹر اگر ہندوستانی ہوتے تو جتنی جرح اونہوں نے کی اوس سے آدھی بھی نہ کرنے پاتے۔

انگریز بیرسٹر اور فوج داری مقدمات

اوس زمانے میں انگریز وکیل بیرسٹروں نے دیوانی کے کام کو یا یہ کہنا چاہیئے کہ دیوانی کے کام نے انگریز وکیل بیرسٹروں کو چھوڑ دیا تھا۔ مگر فوج داری کا کام اب بھی اون کے ہاتھ میں تھا۔ عوام یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستانی مجسٹریٹ انگریز وکیل بیرسٹروں کا اثر قبول کریں گے اور انگریز مجسٹریٹ اون کے ساتھ اپنایت برتیں گے۔ مجھے سر والٹر کالون جیسے قابل اور تجربہ کار بیرسٹر کے ساتھ کام کرنے سے بہت فائدہ ہوا۔ میں نے مجسٹریٹ سپرد کنندہ کے اجلاس کے سب اظہار بغور پڑھ لئے تھے اور اون باتوں پر جو گواہوں نے بیان کی تھیں مجھے عبور تھا نومشق (جونیر) وکیل یا بیرسٹر جسے کسی تجربہ کار (سینیر) وکیل بیرسٹر کی ماتحتی میں کام کرنے کا موقع ملے صرف محنت شاقہ کے ذریعہ سے تمام حالات پر عبور حاصل کرنے اور اپنے کو کارآمد ثابت کرنے سے سینیر کو خوش کرسکتا ہے۔ جو جونیر یہ سمجھتے ہیں کہ سینیر کی موجودگی میں اون کی بلا ٹل جاتی ہے۔ اون کو پیشہ وکالت میں کامیابی کی امید نہ رکھنا چاہیئے۔ سر والٹر کالون اپنے مقدمات میں بڑی محنت کرتے تھے۔ اون کی مستقل رائے تھی کہ ملزم کی صفائی کسی ایسے نظریہ (تھیوری) پر مبنی ہونا چاہیئے جو دُور افتادہ نہ ہو بلکہ قرینہ اور قیاس کے اس قدر قریب ہو جسے معمولی آدمی مان سکے۔ کچھ عرصہ بعد جب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کے ساتھ مقدمات فوج داری میں کام کرنے کا مجھے اتفاق ہوا تو معلوم ہوا کہ سر والٹر کالون کی طرح

صفائی کے نظریہ اور ملزم کے بیان کو وہ بھی بہت اہمیت دیتے تھے۔ ایک مقدمہ میں ملزم کو قتل کے الزام سے بری کرانے میں ہم کو کامیابی محض اس وجہ سے ہوئی کہ صاحب زادہ صاحب کے قایم کئے ہوئے نظریہ کو جو بظاہر دور از کار تھا، مسٹر مارشل جج نے منظور کر لیا۔ سوچ سانچ کر سر والٹر کالون اس نتیجہ پر پہونچے کہ مقدمہ کا دار و مدار دو باتوں پر ہے۔ ایک یہ کہ اون کے موکل کا زہد شکن جوان ملزمہ سے جو روپ رنگ میں کھری تھی تعلق تھا یا نہیں۔ دوسرے یہ کہ ایک دستاویز جس کا شہادت ثبوت میں تذکرہ تھا تحریر و تکمیل ہوئی یا نہیں۔ اور ان کو دونوں باتوں سے انکار تھا۔ سر والٹر کالون کی زبردست شخصیت نے اصلی ملزم سے یہ بیان عدالت میں کرا دیا کہ وہ ناگن کے پھن کا زہر چوس چکا ہے۔ یعنی جوان ملزمہ سے اوس کا تعلق ہے۔ نیز دستاویز لکھی گئی مگر تکمیل کی نوبت نہیں پہونچی۔ اصطلاح قانون میں تکمیل کے معنی یہ ہیں کہ دستاویز لکھے جانے کے بعد اوس پر مقر یا مقران اپنے دستخط کر دیں یا انگوٹھے کے نشان لگا دیں۔ میں سر والٹر کا احسان مند ہوں کہ باوجود مبتدی وکیل ہونے کے اونھوں نے ہر بات میں مجھ سے مشورہ کیا اور اختلاف رائے ہونے کی صورت میں مجھ سے میرے دلائل اسی طرح سنے گویا میں اون کا ہم پلہ شریک کار ہوں۔ صفائی کی شہادت مجھ سے پیش کرائی اور اسیسروں کو خطاب کرنے کا کام بھی میرے سپرد کیا۔ وکیل بیرسٹروں کے سامنے اونھوں نے میری بابت یہ رائے ظاہر کی تھی کہ یہ جوان ہوشیار ہے اور جانتا ہے کہ مقدمہ کے کس واقعہ کی کتنی اہمیت ہے۔ تجربہ حاصل ہو جانے کے بعد کامیاب اور ممتاز وکیل ہوگا۔ والدہ صاحبہ نے جب یہ رائے سنی تو اون کو بڑی مسرت ہوئی۔ مقدمہ ختم ہونے کے چار پانچ دن بعد جج نے فیصلہ سنایا اور سب ملزموں کو بری کر دیا۔ سر والٹر کالون نے مرادآباد کے دو وکیلوں کی بابت جن سے وہ واقف تھے ایک دن مجھ سے کہا "ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ ایک صاحب تو ایسے ہیں کہ اگر موقع مل جائے اور جھوٹ پکڑا نہ جائے تو اون کو جھوٹ بولنے میں تامل نہ ہوگا۔ دوسرا آدمی پکا ہے۔ وہ کسی حالت میں جھوٹ نہ بولے گا۔"

میرے خیال میں سر والٹر کالون کی یہ رائے صحیح تھی، موصوف شیعہ موکلوں سے کوئی رو رعایت نہ کرتے تھے، ایک دن مجھ کو بتایا، "شیعہ بغیر استخارہ کے وکیل بیرسٹر مقرر نہیں کرتے، جب شیعہ موکل میرے پاس آتا ہے تو میں سمجھ لیتا ہوں کہ استخارہ میرے لئے آیا ہے وہ مجھ سے مقدمہ کی پیروی ضرور کرائے گا، اس لئے میں اوس کے ساتھ فیس میں کوئی رُو رعایت نہیں کرتا"

فوجداری کے بعض نامور بیرسٹر

سر والٹر کالون بڑے خوش تدبیر بیرسٹر تھے ملکی رسم ورواج سے اچھی واقفیت تھی، انسانی فطرت کو خوب سمجھتے تھے اور اوس سے اپنا کام نکالتے تھے، ایک دن دورانِ گفتگو میں مجھ سے کہنے لگے کہ کسی ڈپٹی مجسٹریٹ کے اجلاس میں اگر کسی مقدمہ کی پیروی کرنے جاؤ تو نہایت مؤدبانہ طریقہ رکھو، میں نے جواب دیا، ڈپٹی مجسٹریٹوں پر ہی کیا منحصر ہے، وکیل بیرسٹروں کا فرض ہے کہ جس عدالت میں کام کریں حاکم عدالت کا ادب ملحوظ خاطر رکھیں، اور اوس کی تعظیم وتکریم کریں، مسکرا کر بولے، یہ تو سچ ہے سب عدالتوں کا ادب کرنا چاہیئے، مگر ڈپٹی مجسٹریٹوں کی حالت جداگانہ ہے، ڈپٹی صاحبان کی تنخواہ تھوڑی ہوتی ہے اور کام بہت کرنا پڑتا ہے، جب کوئی ممتاز وکیل، بیرسٹر جو روزانہ سیکڑوں روپے کماتا ہو، اون کی عدالت میں جا کر پُر ادب طریقہ سے حضور کہہ کر خطاب کرتا ہے تو ڈپٹی صاحب کی باچھیں کھل جاتی ہیں، وکیل بیرسٹر کا درجہ جتنا اونچا ہوگا، حضور کہنے کا اثر اوسی قدر زیادہ ہوگا، سر والٹر کالون نے جو کچھ کہا وہ کوئی نئی بات نہ تھی، شیخ سعدی فرماتے ہیں

تواضع ز گردن فرازاں نکوست ؂ گدا گر تواضع کند خوئے اوست۔ ترجمہ، اونچے درجہ کے لوگوں کا اخلاق وانکسار کیا ہی اچھا معلوم ہوتا ہے مگر گداگر گڑگڑائے تو یہ بات اوس کی عادت میں داخل ہے۔ تاہم یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ سارے نامور قانون پیشہ شیخ سعدی کے شعر پر عمل کرتے ہیں۔

سر راس آلسٹن بھی فوجداری کے نامور بیرسٹر تھے، اردو زبان سے زیادہ واقفیت نہ تھی، اپنی مادری زبان یعنی انگریزی میں گواہوں پر جرح خوب کرتے تھے، بحث بھی بڑی اچھی ہوتی تھی انداز بحث مؤثر اور نہایت صاف تھا، لیکن ضلع کی مختلف فوجداری عدالتوں میں جب کام کرنے

تھے تو حاکم عدالت کو خوش رکھنے کی بجائے اپنے نام اور اقتدار اور اثر سے کام نکالنا چاہتے تھے، اب سے ساٹھ برس پہلے ممکن ہے اس طریقہ سے مفید نتائج نکلتے ہوں، مگر اب مجسٹریٹ اعلی تعلیم یافتہ اکثر و بیشتر قابل اور بسا اوقات خود قانون داں ہوتے ہیں، ہندوستانی قانون پیشہ اصحاب نے تو اس طریقے پر کبھی بھی عمل نہیں کیا، مگر انگریز بیرسٹروں کو بھی فی زمانہ اس طریقہ سے بچنا چاہیئے، مجسٹریٹ بھی انسان ہوتے ہیں اور جب اونھیں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کوئی بیرسٹر اونہیں مرعوب کرنا چاہتا ہے تو اوس کا اثر ہمیشہ مضر ہوتا ہے، مسٹر بوآنر بھی فوجداری کے کامیاب بیرسٹر تھے، اون کا طریق کار سر والٹر کا نون اور سر راس آلسٹن کے بین بین تھا عام طور سے عدالتوں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے، مگر جہاں ضرورت سمجھتے تھے موکل کے حقوق کے تحفظ کے لیئے عدالتوں سے بگاڑ کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے، مقدمات میں محنت کرتے تھے اور چھوٹے چھوٹے واقعات کو بغور مطالعہ کر کے اون سے جرح اور بحث میں کام لیتے تھے، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اور مسٹر رزاق بخش قادری بھی فوجداری کے ممتاز بیرسٹر تھے، دونوں علی گڈھ میں کام کرتے تھے، صاحبزادہ صاحب میرے اوستاد بھی تھے، اون کا حال اوپر لکھ چکا ہوں، مسٹر قادری بڑے طباع اور ذہین تھے، مقدمہ کو طوالت نہ دیتے تھے جرح اور بحث بھی طویل نہ ہوتی تھی، معمولی واقعات کو سرسری طور سے بیان کرتے لیکن اہم واقعات اور نتائج واقعات پر زور دیتے تھے اور جانتے تھے کہ مقدمہ میں کون باتیں ایسی اہمیت رکھتی ہیں جن کا فیصلہ کرنے والے مجسٹریٹ یا جج کی رائے پر خاص اثر ہے یا ہونا چاہیئے۔

دیوانی کے حکام خواجہ عبد العلی منصف شہر کے اجلاس میں مجھے جانے کا کم اتفاق ہوتا تھا اگر وکالت سے مقصود روپیہ کمانا ہے تو نئے وکیل کو جس کو اپنے اوپر اعتماد ہو دیوانی کے چھوٹے چھوٹے مقدمات کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہیئے، منصفی کی وکالت اوس زمانہ میں کوہ کندن و کاہ برآوردن کی مصداق تھی، محنت زیادہ کرنی پڑتی تھی اور محنتانہ کم ملتا تھا۔ منصفوں کا اختیار سماعت اوس زمانہ میں عموماً ایک ہزار روپے کے تعین تک محدود تھا۔

مجھے ایسا یاد پڑتا ہے کہ خواجہ صاحب کی عدالت میں دو ہزار روپے تک کے تعین کے مقدمات دائر ہو سکتے تھے، یہ اختیار اون کو خاص طور پر دیا گیا تھا، اب تو منصفوں کی حد سماعت عموماً پانچ ہزار روپے کے تعین کے مقدمات تک بڑھا دی گئی ہے، خواجہ صاحب نیک نام اور بڑے قابل منصف تھے، مقدمہ کے واقعات پر ہمیشہ اون کو عبور ہوتا تھا، قانونی باتوں کو خوب سمجھتے اور نکتہ میں سے نکتہ پیدا کرتے تھے، بابو نہال چند را بڑے بے لاگ اور ضبط اوقات کے پابند سب جج تھے، قوم کے ویش اور بنارس کے رہنے والے تھے، ٹھیک ساڑھے دس بجے کام شروع اور چار بجے ختم کر دیتے تھے، مگر اس تیزی سے کام کرتے تھے کہ اون کے زمانہ میں ایڈیشنل سب جج کی ضرورت نہیں پڑی، شہادت کے مختصر نوٹ انگریزی میں خود لکھتے تھے اون کے پیش کار بڑے زود نویس اور خوش خط تھے، گواہ کے منہ سے جو لفظ نکلتا تھا اظہار میں وہی لکھتے تھے، اگر کسی لفظ یا فقرے پر وکلاء فریقین کے باہم اختلاف ہوا تو پیش کار بڑی معصومی کی ادا سے قلم روک کر بابو نہال چند را کی طرف دیکھتے تھے، اور جو کچھ وہ بتاتے قلم بند کر لیتے تھے بابو نہال چند را بہی کھاتہ کے بڑے ماہر تھے، اون جیسا بہی کھاتہ کا ماہر کوئی اور سب جج میں نے نہیں دیکھا، جرح میں وکیل کو روکتے کم تھے، مگر جس طرح روکتے تھے وہ طریقہ سخت قابل اعتراض ہوتا تھا، گواہ کا بیان ہو رہا ہے، گواہ سوالات جرح کا جواب دے رہا ہے، پیش کار لکھ رہا ہے کہ ایک دم عدالت مآب نے ایسی خشونت آمیز آواز میں جو عموماً پریڈ کے وقت پریڈ کرانے والے کی ہوتی ہے، فرمایا۔ "سوال نامنظور" وکیل سے کبھی دریافت نہ کرتے تھے کہ اس سوال سے آپ کا کیا مقصد ہے، یا یہ سوال کس طرح متعلق معاملہ ہے، یا الفاظ کے رد و بدل سے سوال قاعدہ قانون کے اندر آ سکتا ہے، وکلاء جانتے تھے کہ بابو صاحب سے بحث کرنا اور سوال کی اہمیت جتانا بے سود ہے، بابو صاحب کے مزاج کے پارے کا اندازہ اس سے بخوبی ہو سکتا تھا کہ وکیل کی جرح کے دوران میں الفاظ "سوال نامنظور" انہوں نے کتنی مرتبہ استعمال کئے، نو مشق (جونیر) وکلا کی ہمت افزائی کا خیال کبھی اون کے دل میں نہ آتا تھا، مشین کی طرح

کام کرتے تھے، خوش مزاجی کو دابِ عدالت کے منافی سمجھتے تھے، کبھی بھولے سے بھی نہ مسکراتے تھے، اور نہ کسی وکیل کو مسکرانے کا موقع دیتے تھے، اون کے اجلاس میں پہنچ کر مجلس سوم میں چنے پڑھے جانے کا سماں آنکھوں میں پھر جاتا تھا؛

مسٹر ڈی آر لائل ڈسٹرکٹ وسشن جج تھے، بیشتر وقت فوجداری مقدمات کی سماعت میں گذر جاتا تھا، بڑے زود فہم اور ذکی الطبع تھے، اجلاس میں دیر سے آتے تھے، جس کا لازمی نتیجہ تھا کہ دیر تک بیٹھتے تھے، آئرلینڈ کے صوبہ السٹر کے رہنے والے تھے، واقعاتِ مقدمہ پر عبور رکھنے کے باعث فوجداری کے اچھے جج تھے، دیوانی کے مقدمات میں قانونی نکات کی قدر کرتے تھے، اور سویلین ہونے کے باوجود قانون سے واقفیت حاصل کرنے میں کوشاں تھے، فی الحقیقت انڈین سول سروس کے عہدہ داروں کو دیوانی کا جج بنانا اصولاً غلط ہے، ججی کی خدمات قابلِ اطمینان طور پر صرف قانون پیشہ لوگ ہی انجام دے سکتے ہیں، دیوانی کا اچھا جج بننے کے لئے جس تربیت کی ضرورت ہے وہ انڈین سول سروس والے ججوں کو حاصل نہیں ہوتی، اگر غور سے دیکھئے تو ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پاس ہو جانے کے بعد انڈین سول سروس کا امتحان ولایت میں جاری رہنا انمل بے جوڑ بات ہے، ہر صوبہ اپنے انتظامی اور دیوانی معاملات کا خود ذمہ دار ہے، ایگزیکیوٹو اور جوڈیشنل محکموں کا گورنمنٹ ہند سے تعلق نہیں ہے، ایسی صورت میں انگلستان میں امتحان لے کر انڈین سول سروس کو آل انڈیا سروس کی حیثیت سے قائم رکھنا بے معنی بات ہے، اگر اہم محکموں اور عہدوں میں انگریزوں کی ایک مقررہ تعداد کا رکھنا ضروری سمجھا جائے تو یہ فرض اکسفورڈ، کیمبرج اور لندن یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے تقرر سے پورا ہو سکتا ہے، مگر سچ تو یہ ہے کہ از ماست کہ بر ماست، ملک ہند کی آج وہ حالت ہے جو اٹھارویں صدی عیسوی کے آخر میں سلطنت مغلیہ کے چاند کو گہن لگنے کے بعد ہو گئی تھی، بلکہ انتشار اور افراتفری کا موجودہ عالم اٹھارویں صدی کی بدنظمی سے بھی بدتر ہے، اوس زمانہ میں مسلمان جانباز سرداروں کی فوج

میں ہندو سپاہی ہوتے تھے، اور ہندو سردار اپنی قسمت آزمائی مسلمان سپاہیوں کے بل بوتے پر کرتا تھا، مگر اب مذہب کی آڑ میں شکار کھیلنے کا طریقہ رائج ہے، جب تک یہ حالت رہے گی ہم ہندوستانیوں کو اپنے ملک میں اجنبی بن کر رہنا پڑے گا، سچ تو یہ ہے کہ جیسا مسٹر گوکھلے نے کہا تھا، ہر قوم میں یہ اہلیت نہیں ہے کہ اپنے اوپر خود حکومت کرسکے، مسٹر کرشن جن کا ذکر پہلے آچکا ہے ایڈیشنل جج تھے، صورت کے بہت اچھے اور مزاج کے نازک تھے، مقدمات جلد فیصل کرتے تھے، مگر بسا اوقات معاملہ کی تہ کو نہ پہنچتے تھے، شادی نہیں کی تھی میل جول کے اچھے تھے، اور اس بات کو یاد رکھتے تھے کہ کس وکیل نے گھر پر جاکر اون سے ملنے میں کوتاہی کی ہے، جب تبادلہ ہوا تو بار کے ممبروں نے اون کو بار لائبریری میں ایٹ ہوم دیا، میرے دوست منشی بابولال نے جو فارسی خوب جانتے تھے اور شعر بھی کہتے تھے (غافل تخلص تھا) مسٹر کرشن کی تعریف میں ایک نظم لکھی، نظم تو مجھے یاد نہیں رہی مگر ایک مصرعہ یاد رہ گیا ہے جو مصداق ۔ قیاس کن ز گلستان من بہار مرا ۔ منشی بابولال کے بے لاگ اور آزاد اظہار خیال کی بہت اچھی مثال ہے، سید انشاء اللہ خاں نے ایک موقع پر نواب سعادت علی خاں کے لئے لفظ انجب استعمال کیا تھا، منشی بابولال کی نظم کے پہلے مصرعہ نے حقیقت کے چہرے سے اس طرح نقاب اٹھائی ہے، مصرعہ ۔ اے بہ تراز کمال تو حسن و جمال تو

نواں باب

مراد آباد کے وکلا، رؤسا، اور دیگر اہلِ کمال، یادِ رفتگاں، خدا نظر بد سے بچائے، چالیس برس پہلے کی شہری زندگی کا حال، منٹو مارلے کی اصلاحات، کچھ اپنے متعلق، الہ آباد کی نمائش ۱۹۱۰ء میں، مسجد کانپور کا ہنگامہ اور گورنمنٹ، مظہر الحق، سر علی امام اور لارڈ ہارڈنگ، یو۔پی کی میونسپلٹیوں کا بل کونسل میں، ہندو بھائیوں کی تنگ نظری، پنڈت موتی لال نہرو، ڈاکٹر تیج بہادر سپرو، اور مسٹر چنتامنی، کانگریس اور لیگ کا ساتھ ساتھ اجلاس۔

یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو خود بڑھ کر اٹھا لے ہاتھ میں، مینا اسی کا ہے
(شاد عظیم آبادی)

مراد آباد کے وکیل میں صرف دیوانی اور فوجداری کی عدالتوں میں ہی نہیں بلکہ اور عدالتوں میں بھی کام کرتا تھا۔ جب میں نے جنوری ۱۹۰۸ء کے آخری ہفتہ میں کام شروع کیا ہے تو مراد آباد میں ہندو بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی وکلا کی تعداد کافی تھی، بابو نرائن داس اور بابو گِردھاری لال نے ضلع کی وکالت کا امتحان پاس کیا تھا لیکن ان دونوں صاحبوں کو قانون پر عبور تھا اور کامیاب وکیل سمجھے جاتے تھے۔ بار کے سب سے زیادہ نامور وکیل یعنی لیڈر مولوی سید حسن تھے، گواہوں کی جرح کی جراحت سے بچنا دشوار تھا، گواہ جتنا زیادہ جھوٹ بولتا اسی قدر گہرے زخم آتے تھے۔ مقدمہ کو طول نہ دیتے تھے، بحث مختصر ہوتی تھی، مگر نہایت پُرمغز

بڑے خوش تقریر تھے، بحث سن کر طبیعت خوش ہو جاتی تھی، میر ضامن حسین، میر سعید حسن، منشی عبدالرزاق مولوی نصیر الحسن اور مولوی یعقوب علی خاں بھی اس دور کے ممتاز وکلاء میں تھے، میر ضامن حسین بڑے خوش مزاج بزرگ تھے، نوجوان وکلاء سے ایسی گھل مل کر باتیں کرتے تھے کہ گویا ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں، میر سعید حسن کی سنجیدہ مزاجی کے باعث اون کے ہم عصر اور بالخصوص ہم نوجوان اون کی بڑی عزت کرتے تھے، میر ضامن حسین اور میر سعید حسن امروہہ کے رہنے والے تھے، یہ عجیب بات ہے کہ امروہہ کے کسی وکیل نے مراد آباد کی سکونت اختیار نہیں کی، بلکہ انگریزوں کی طرح کسب معیشت کے بعد اپنے وطن کو واپس چلے جاتے ہیں، منشی عبدالرزاق میونسپلٹی کے سکرٹری بھی تھے، اوس زمانہ میں یہ عہدہ اعزازی تھا، بغیر کسی معاوضہ کے دو گھنٹے میں جو کام کرتے تھے وہ اب بیش قرار تنخواہ کے دو عہدہ داروں کے سمیٹے نہیں سمٹتا، مولوی یعقوب علی خاں پرانی روایات کے حامل تھے، اون کے قصے بڑے پُر لطف اور سبق آموز ہوتے تھے، بات کھری کہتے تھے، عدالتوں اور وکیل بیرسٹروں میں کبھی کبھی نوک جھونک بھی ہو جاتی ہے، اس نوک جھونک میں خاں صاحب پھسڈی نہ رہتے تھے، مسٹر محمد محسن علی گڈھ کالج کے تعلیم یافتہ اور مراد آباد کے پہلے بی۔ اے۔ ایل۔ ایل بی مسلمان وکیل تھے۔ علی گڈھ میں یاروں کے یار اور کرکٹ کے مرد میدان تھے، خاموش آدمی تھے، مگر بڑے پُر مذاق، دیوانی کے وکیل تھے، اوس زمانہ میں ایک صدر اعلی (سب جج) تھے، جو مقدمات فیصل کرتے وقت دماغ پر چوٹ نہ آنے دیتے تھے، اون کے اجلاس میں ہار جیت کا فیصلہ عموماً تقدیر کرتی تھی، تدبیر بھی کام آ جاتی تھی، محسن مرحوم کا مقدمہ تھا، اون کے اجلاس میں پہنچے سب جج صاحب کی میز پر مسلیں پھیلی ہوئی تھیں، مرحوم کو دیکھ کر از راہ خوش مزاجی عدالت مآب نے فرمایا، "دیکھیے مسلیں گاجر مولی کی طرح کیسی بکھری پڑی ہیں"، علی گڈھ کے کھلاڑی نے برجستہ جواب دیا ـ "بجا ہے گاجر مولی ہی کی طرح کٹ بھی جائیں گی"۔ مسٹر گیسپر پرانے وکیل تھے، ۱۸۷۶ء میں سند وکالت حاصل کی تھی، آرمینیا اون کا اصلی وطن تھا، فوجداری کی عدالتوں میں کام کرتے تھے۔ انگریز بیرسٹروں کی اوس زمانہ میں بڑی قدر تھی، لیکن مراد آباد میں کوئی انگریز بیرسٹر نہیں

تھا، مسٹر گیسپر کو اوس طبقہ کا وارث عودی سمجھنا چاہیئے، ایک زمانہ میں کام بہت اچھا تھا، پھر بہت سے حریف پیدا ہو گئے، جس سے کام پر اثر پڑا، میرے زمانہ میں اون کی وکالت معمولی رہ گئی تھی، مولوی حشمت علی منصفی کے وکیل تھے، بڑے زندہ دل اور شگفتہ مزاج آدمی تھے، بڑی عمر ہوئی، بوڑھوں میں بوڑھے، جوانوں میں جوان اور لڑکوں میں لڑکے، پرانے زمانہ کے منصفوں کے قصے سنایا کرتے تھے، جن سے معلوم ہوتا تھا کہ آج سے ساٹھ ستر برس پہلے رشوت لینے والے دیوانی کے حکام کی تعداد کافی تھی، ایک منصف کا تذکرہ کرتے تھے، جن کے سامنے دورانِ بحث میں فریقین کے وکلار کو استعارتاً رقم رشوت کے اظہار میں تأمل نہ ہوتا تھا، مثلاً مدعی کا وکیل کہتا۔ پچاس مضبوط دلائل سے میرے موکل کے دعوی کی تائید ہوتی ہے، مدعا علیہ کا وکیل اپنی بحث میں جواب دیتا، میں چھپتر دلائل ایسے پیش کرنے کے لئے تیار ہوں جن سے ثابت ہو جائے گا کہ مدعی کا دعویٰ غلط اور بے بنیاد ہے، اوسی دور کے ایک اور منصف اہل مقدمہ سے معاملہ اوس وقت تک طے نہ کرتے تھے جب تک مسل مکمل نہ ہو جائے، مسل کے تکملہ پر جس فریق کی شہادت زیادہ قوی سمجھتے اوسی سے معاملہ چکا لیتے تھے، مغربی تعلیم نے بحیثیت مجموعی ملک کو فائدہ پہنچایا ہو یا نقصان، مگر اس میں شک نہیں کہ آج ملک کا اخلاقی معیار ساٹھ ستر برس پہلے کی زندگی سے بہتر اور بلند تر ہے۔

سوامی کشن سروپ عرصہ دراز تک وکیل سرکار رہے، بڑے صاف اور صاف گو آدمی تھے اپنی خودداری کو کبھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے، مسٹر مارشل انگریز نواز جج تھے، اونچے درجہ کے ہندوستانیوں کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے، سوائے فوجداری یا متفرق مقدمات کے اور کام بہت کم کرتے تھے، فوجداری مقدمات کے فیصلے بھی بسا اوقات مہینوں تک نہ لکھتے تھے، اجلاس میں کام شروع کرنے کا کوئی وقت مقرر نہ تھا، سوامی جی سے نہ بنی اور وہ سرکاری وکالت سے مستعفی ہو گئے۔

اون کی جگہ پنڈت لکھرام مقرر ہوئے، اون کی مسٹر مارشل سے خوب نبھی اور کیوں نہ نبھتی بقول سعدی، اگر شہ روز را گوید شب است ایں ؛ ببا ید گفت اینک ماہ و پروین ۔ ترجمہ۔ اگر بادشاہ دن کو رات بتائے تو فوراً کہنا چاہیئے کہ ضرور رات ہے اور چاند تارے بھی نظر آرہے ہیں۔ پنڈت

صاحب بڑے خلیق اور ملنسار آدمی تھے، سنسکرت اچھی جانتے تھے، مسعود الحسن مرحوم کو میں ۱۹۰۳ء سے جانتا تھا، اوس وقت وہ اسکول کے کسی چھوٹے درجہ میں پڑھتے تھے، مولوی قیام الدین کے قریبی رشتہ دار تھے، مسعود ۱۹۰۹ء میں بیرسٹر ہو کر ولایت سے پلٹے، اور مراد آباد میں کام شروع کیا، میرے بڑے دوست تھے۔ یوں تو جیسے درزی کی سوئی ہر طرح کے کپڑے میں سے نکلتی ہے، موصوف دیوانی، فوجداری مال وغیرہ سب عدالتوں میں بیرسٹری کرتے تھے مگر فوجداری کا کام اچھا تھا۔

نواب محمد علی پہلی بیوی کے انتقال پر مسعود نے ۱۹۱۶ء میں نواب محمد علی صاحب کی چھوٹی لڑکی سے شادی کا پیغام دیا، نواب صاحب اوس زمانہ میں مراد آباد میں ڈسٹرکٹ اسشن جج تھے، جب پیام آیا تو نواب صاحب نے مجھ سے مشورہ کیا، اور کہا کہ میرا ارادہ ہے کہ ہائی کورٹ کو نیم سرکاری طور پر اطلاع دوں کہ میری لڑکی کی شادی مراد آباد کے ایک بیرسٹر سے ہونے والی ہے۔ میرا تبادلہ کر دیا جائے، میں نے کہا شادی کا تبادلہ سے کچھ تعلق نہیں ہے، کہنے لگے تو یہ لکھنا مناسب ہوگا کہ مسعود الحسن میرے اجلاس میں کام نہ کریں گے، میں نے کہا، اس کے معنی یہ ہوئے کہ آپ کو خود اپنے اوپر بھروسہ نہیں ہے، ایمان دار جج کی عدالت میں بیٹا وکالت یا بیرسٹری کرے، یا داماد، اس کا جج کی رائے پر مطلق اثر نہ ہونا چاہیئے، آپ صرف ہائی کورٹ کو اطلاع کر دیجئے اور کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے، محمد علی صاحب نے میری رائے سے اتفاق کیا، جون ۱۹۱۶ء میں شادی ہوئی، اور موصوف بدستور مراد آباد میں جج رہے، ۱۹۱۸ء میں مراد آباد سے پنشن لی، نواب صاحب سے میرے گہرے مراسم تھے، میں جانتا تھا کہ مقدمات میں وہ رو رعایت کرنے والے آدمی نہیں ہیں اور اون کے اجلاس میں مسعود کے کام کرنے سے کسی اور بیرسٹر وکیل کو شکایت نہ ہوگی، یہ ۱۹۱۶ء کی بات ہے، مگر اب دنیا کا رنگ دوسرا نظر آتا ہے، نواب محمد علی فوجداری کے بہت اچھے جج تھے، بڑی مضبوط اور آزاد رائے رکھتے تھے۔ ٹھیک گیارہ بجے کام شروع کر دیتے تھے، اور چار بجے کے بعد اجلاس میں کبھی نہ بیٹھتے تھے، گواہ کو خواہ انگریز ہو یا ہندوستانی، امیر ہو یا غریب، گواہ کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر شہادت دینا ہوتی تھی، اجلاس کے چبوترہ پر کبھی کرسی نہ دیتے تھے، مراد آباد میں پہلے مستقل ہندوستانی ڈسٹرکٹ و سشن جج ہو کر نواب اسحاق خاں صاحب ۱۹۱۲ء میں آئے، ۱۹۱۳ء میں موصوف کے پنشن لینے پر

نواب محمد علی جج ہوئے، یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ یہ دونوں صاحب یکے بعد دیگرے علی گڑھ کالج کے سکریٹری اور سرسید احمد خاں علیہ الرحمۃ کے جانشین ہوئے، بابو برج نندن پرشاد ایم۔اے، ایل۔ایل، بی نے ہمیشہ سادہ زندگی بسر کی، قابلیت کی حدود ایسی ہی وسیع تھیں جیسی منکسر المزاجی کی، چالیس بیالیس سال وکالت کرنے کے بعد سات آٹھ سال سے خانہ نشین ہوگئے تھے، اپنے زمانہ میں دیوانی کے نامور وکیل تھے، نظائر کو بڑے شوق سے پڑھتے اور ان پر عبور رکھتے تھے، میں دیوانی اور فوجداری دونوں عدالتوں میں وکالت کرتا تھا، دیوانی کے مقدمات میں جب کبھی مجھے مشورے کی ضرورت ہوتی تو بابو صاحب یا میر سعد حسن امروہوی سے مشورہ کرتا تھا، دونوں صاحب بڑی توجہ سے میری گذارش سنتے اور اپنی قیمتی رائے اور مشورہ سے میری مدد کرتے تھے، منشی بابو لال کا کام منصفی کی عدالتوں میں تھا، اوس زمانہ میں دو منصفیاں تھیں، ایک منصفی شہر اور دوسری منصفی حوالی، منصفی حوالی میں زیادہ کام نہ تھا، عموماً منصف شہر منصف حوالی سے زیادہ پورانا اور تجربہ کار ہوتا تھا، منشی صاحب کے پاس کام کا ہجوم رہتا تھا۔ ایک موکل کے مقدمہ میں کام کر رہے ہیں، دوسرے موکل نے آکر تقاضا کیا کہ چلئے میرا مقدمہ دوسرے اجلاس میں پیش ہوگیا ہے، اوسے ابھی تسلی بخش جواب نہ دینے پائے تھے کہ تیسرے موکل نے اطلاع دی کہ حکم امتناعی حاصل کرنے کی جو درخواست تھی وہ پیش ہے، فریق ثانی کا وکیل یک طرفہ بحث کر رہا ہے، فوراً چلئے ورنہ درخواست نامنظور ہو جائے گی، اس اینچاتانی کے باوجود منشی صاحب سے موکل بہت خوش رہتے تھے، مزاج ایسا ہموار پایا تھا کہ کبھی کسی حاکم عدالت سے بدمزگی کی نوبت نہیں پہنچی. حاکم عدالت کچھ کہے اپنے کام سے کام رکھتے تھے، طبیعت میں رنگینی تھی جس کو شاعری نے اور چمکا دیا تھا، مولوی ظہیر عالم چشتی نے کچھ دنوں سنبھل میں وکالت کی، پھر مراد آباد چلے آئے، وکالت اچھی تھی، ذہین تھے، اور وکالت کا کام جی لگا کر کرتے تھے، افسوس ہے کہ موت نے مہلت نہ دی، ورنہ خوب نام پیدا کرتے، سیاسی معاملات سے علیحدہ رہنے کے باوجود مسلم لیگ کے حامی

تھے۔

مراد آباد کے رؤسا اور دیگر اہل کمال مسلمان رؤسا میں منشی مظہر حسن صاحب اعلیٰ درجہ کی انتظامی قابلیت رکھتے تھے، اور اپنی وضع داری کے باعث مشہور تھے، خان بہادر قاضی ابرار احمد صاحب زمیں دار ہونے کے علاوہ درجہ اول کے آنریری مجسٹریٹ اور بڑے طنطنہ کے آدمی تھے، کیا مجال تھی کہ ناک پر مکھی بیٹھ جائے، شیخ رحمت اللہ صاحب بڑے ہنس مکھ خوش تدبیر اور حکام رس آدمی تھے، انہوں نے جو کچھ کمایا اپنے قوت بازو سے کمایا، اون کی زندگی سادہ تھی، مہمان نوازی خوب کرتے تھے، حافظ محمد اسمٰعیل صاحب (سر محمد یعقوب کے والد) شاہجہاں پور میں وکالت کرتے تھے، وفات سے کچھ پہلے وکالت سے دست بردار ہو کر اپنے وطن مراد آباد میں آکر رہے، وضع داری کا غالباً اون پر خاتمہ ہو گیا۔ منشی قدرت حسین ان کے دوست تھے، اسی باعث حافظ صاحب نے اون کو اپنا محرر رکھا، مگر شان محرری یہ تھی کہ منشی قدرت حسین مالک تھے، جو چاہتے تھے کرتے تھے کبھی حافظ صاحب نے اون سے نہیں پوچھا کہ کیا کر رہے ہو، موصوف صاحب استعداد اور نہایت خوش خلق بزرگ تھے، قومی کاموں میں خاص شغف تھا، مذہبی خیالات اس قدر بلند اور مذہبی رواداری اس قدر وسیع تھی کہ بیس سال پہلے پیدا ہوتے تو سرسید علیہ الرحمۃ کے خاص دوستوں کے حلقہ میں اون کو جگہ ملتی، مسلمانان مراد آباد کی تاریخ میں مولوی ابرار حسن صاحب مرحوم کا نام زرّیں حروف میں لکھنے کے قابل ہے، موصوف نہ صاحب جائیداد تھے، نہ دولتمند، نہ صاحب اثر تھے، نہ کثیر الاحباب، ہیوٹ مسلم ہائی اسکول کی بنا ڈالنے اور اس کو صوبہ کے بہترین اسکولوں کے درجہ تک پہنچانے میں موصوف کو جو دشواریاں پیش آئی ہوں گی آج اون کا صحیح اندازہ کرنا نہایت مشکل ہے، مگر ہمت بڑی چیز ہے، مولوی ابرار حسن بلند حوصلہ آدمی تھے، اون کا صفحۂ ضمیر قومی تمنا کے نقوش سے پُر تھا، قومی خدمت کے لئے پہلی شرط حوصلہ ہے، اوس کے بعد قوت عمل، مرحوم کی ذات میں دونوں اوصاف موجود تھے، اہل وطن کو اگر مرحوم کی یادگار قائم

کرنا منظور ہے تو بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہیوٹ مسلم اسکول کو محض انٹرمیجیٹ کالج ہی نہ بنایا جائے بلکہ ایسے ادارہ کے درجہ تک پہنچایا جائے جہاں طلبا فنون کی تعلیم حاصل کر کے روٹی کمانے کے قابل ہو سکیں، ڈپٹی کلکٹری سے پنشن لینے کے بعد سید اصغر علی صاحب اپنے وطن مراد آباد میں رہتے تھے، درجہ اول کے آنریری مجسٹریٹ مقرر ہو گئے تھے، اپنے فرائض منصبی کو بغیر رُو رعایت کے انجام دیتے تھے، اون کے زمانہ میں مسلمان انگریزی بہت ہی کم پڑھتے تھے، مگر موصوف انگریزی داں تھے، اور تمام زمانۂ ملازمت بڑی نیک نامی سے گذارا، اوس زمانہ کے مشہور پہلوانوں میں نظیر علی صاحب اور محمد علی صاحب دو بھائی تھے، محلہ مغل پورہ میں رہتے تھے، محمد علی صاحب بڑے خوش رُو جوان تھے، دونوں بھائی اپنے فن میں صاحب کمال تھے، چھ فٹ کا قد، سینہ اُبھرا ہوا، شیر کی سی گردن، خوب گٹھے ہوئے بازو، مرزا پیارے جان بیگ صاحب بھی کسرتی جوان تھے، گورے چٹے ایسے کہ انگریزی لباس پہن لیتے تو یہ معلوم ہوتا کہ یورپ کا رہنے والا بشر ہے۔ گوری رنگت کے علاوہ بڑے خوبصورت تھے، ورزش، کسرت کشتی، دنگل کا اوس زمانہ میں خاصا چرچا تھا، بنوٹ اور بانک وغیرہ کے باکمال اوستاد میر مہر علی تھے، شاعروں کا تذکرہ کروں تو یہ مضمون بہت طویل ہو جائے گا، مختصر یہ کہ مصحفی اور ذکی کے نام لیوا آج کل بہت ہیں، (خدا نظر بد سے بچائے) مگر اوس زمانہ میں بھی کمی نہ تھی، مثنوی جانستان اوس زمانہ کی مشہور مثنوی ہے، محبت نے یہ کنوئیں جھکائے کہ گورنمنٹ اسکول کے ایک طالب علم نے، جس کو دوسرے طالب علم سے محبت تھی یا مبتلائے ہوس تھا، کنوئیں میں ڈوب کر اپنی جان دے دی مثنوی ۱۸۸۸ء کے لگ بھگ لکھی گئی، واقعات سچے ہیں۔ ناکردہ گناہ قاتل کو برسوں بعد میں نے بھی دیکھا تھا۔ مثنوی کا مشہور شعر ہے (عاشقِ دلگیر کی زبان سے) شعر

> یوں مرتے ہیں دیکھ مرنے والے   اوہم پہ نظر نہ کرنے والے

خان بہادر قاضی شوکت حسین

خان بہادر قاضی شوکت حسین خاں صاحب ہماری پرانی تہذیب و شائستگی کا روہیل کھنڈ میں بہترین نمونہ تھے

ضلع کے بڑے زمینداروں میں شمار تھا، فارسی زبان میں ید طولیٰ رکھتے تھے، عربی بھی جانتے تھے
شعر خوب کہتے تھے اور اس فن میں داغ کے شاگرد تھے، شوکت تخلص تھا، شگفتہ مزاجی اور زندہ دلی
کا یہ عالم تھا کہ روتا آدمی دو گھڑی صحبت میں بیٹھے تو ہنس دے، بڑے خلیق، ستھرا مذاق،
کمال کے قدرداں، جاننے والوں کے شفیق، دوستوں کے رفیق، مہماں نوازی کی یہ حالت
تھی کہ ممکن نہ تھا کہ کوئی اہل کمال یا نامور آدمی مراد آباد آئے اور قاضی صاحب کے یہاں
دعوت نہ ہو، تھوڑی سی انگریزی بھی جانتے تھے، لیکن اس درجہ واقفیت نہ تھی کہ بول سکتے
یا لکھ پڑھ سکتے، یہ بڑی رکاوٹ تھی، انگریزی جانتے ہوتے تو سارے صوبہ پر اون کی
جامعیت ظاہر ہو جاتی، پھر بھی شہر اور ضلع کی کوئی تحریک نہ تھی جس میں وہ پیش پیش نہ
رہے ہوں، ڈسٹرکٹ بورڈ کی ممبری، میونسپل بورڈ کی وائس چیرمینی (اس زمانہ میں چیرمین
ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہوا کرتا تھا) ڈسٹرکٹ مسلم لیگ کی پریسیڈنسی، مسلمانوں کی سب سے بڑی
تعلیمی درس گاہ ہیوٹ مسلم ہائی اسکول کی جماعت متولیان کی صدارت، یتیم خانے، عربی
مدرسے، غرض کہ کوئی ادارہ نہ تھا، جس کی دامے، درمے، قلمے، سخنے، قاضی صاحب نے
مدد نہ کی ہو، چھوٹے قد پر چڑھی ہوئی ڈاڑھی، بڑی بڑی مونچھیں، خوب بڑی آنکھیں
کھلتا رنگ، سر کے بیچوں بیچ مانگ، دونوں جانب بڑے بڑے پٹھے، سر پر لبیری کی گول
ٹوپی، بدن میں ہلکے اودے کمخواب کی اچکن، اوس کے اوپر نیمہ آستین، اس شان سے جب
باہر نکلتے اور بے تکلف دوستوں کو بھی جو رتبہ میں موصوف سے کم تھے، حضور کہہ کر خطاب کرتے تو
معلوم ہوتا تھا کہ نواب آصف الدولہ کے دور کا کوئی علم دوست امیر لکھنؤ چھوڑ کر مراد آباد
میں آبسا ہے، اون کے خلق کی ایک مثال سنئے، سنہ ۱۹۱۳ یا سنہ ۱۹۱۴ء کی بات ہے، ڈاڑھ میں
درد ہوا، ملٹری فوج کا ہسپتال مراد آباد میں بن چکا تھا، اور اوس کے افسر اعلیٰ ایک بڑے
ہوشیار یورپین ڈاکٹر تھے، ہسپتال جا کر قاضی صاحب نے کہا، میری ڈاڑھ میں بڑا درد ہے
اوکھاڑ دیجئے، دانتوں کے مریض کے بیٹھنے کی کرسی بھی خاص طرح کی ہوتی ہے، جراح پر سری

نظر ڈالنے سے تخیل کی نگاہ کو قصہ کہانیوں کے اوڑن کھٹولے کا تھوڑا بہت شبہ ہوتا ہے. قاضی صاحب کرسی پر بیٹھے، ڈاکٹر کو اشارہ سے بتایا کہ درد کس ڈاڑھ میں ہے، ڈاکٹر اپنے کام میں مصروف ہوا، ڈاکٹر بڑا مضبوط جوان تھا، سمجھتا تھا کہ ایک ہی جھٹکے میں ڈاڑھ الگ ہو جائے گی، اب وہ زور پر زور کر رہا ہے، جھٹکے دے رہا ہے، خون سے تولیہ تر ہو چکا ہے، مگر ڈاڑھ اپنی جگہ سے نہیں ہلتی، ڈاکٹر قاضی صاحب کا دوست بھی تھا، بیچارے کو خجالت دامن گیر تھی کہ ذرا سے کام کے لئے شہر کا ایک ممتاز رئیس آیا ہے اور وہ بھی ٹھیک نہیں بیٹھتا، بالآخر اوس نے ڈاڑھ نکال کر ہی چھوڑی، ڈاڑھ کا نکلنا تھا کہ خون کی تلی بندھ گئی، بڑی مشکل سے خون بند ہوا، دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ جو ہمراہ گئے تھے قاضی صاحب گرتے پڑتے گھر واپس پہنچے، خاموش ہیں، کسی سے کچھ نہیں کہتے، جب دوستوں نے باصرار پوچھا کہ عمل جراحی تو بالکل سادہ تھا، اس قدر دیر کیوں لگی اور اتنا خون نکلنے کی کیا وجہ ہوئی تو بتایا کہ ڈاکٹر نے غلطی سے درد والی ڈاڑھ کی بجائے میری اچھی بھلی ڈاڑھ اوکھاڑ دی، جب پوچھا کہ آپ نے ڈاکٹر کو یہ کیوں نہ بتایا کہ تم غلط ڈاڑھ پر زور آزمائی کر رہے ہو۔ تو بولے، میں اس لئے خاموش رہا کہ ڈاکٹر کو اوس کی غلطی پر متنبہ کرتا تو اوس کو ندامت ہوتی، میں یہ نہیں کہتا کہ قاضی صاحب نے جو کچھ کیا اچھا کیا یا اون کی یہ مثال ہمارے لئے قابل تقلید ہے، جہاں اس مثال سے موجودہ نسل کو بزرگوں کی وضع داری کا حال معلوم ہوگا وہاں یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ انتہائی وضع داری کا دامن اخلاقی کمزوری کے داغ سے بسا اوقات پاک نہیں رہ سکتا، ایسی وضع داری تو سمجھ میں آسکتی ہے، جس میں خود زحمت اٹھانے سے دوستوں اور جاننے والوں کو راحت ملے، لیکن خود بلا سبب تکلیف اٹھانا اور دوستوں کو اون کی انجان پنے کی غلطی نہ بتانا، ایسی وضع داری ہے جس کی ارتھی پر سرت کے پھول چڑھانے کا سوسائٹی کو بجا طور پر حق حاصل ہے، قاضی صاحب کے چند شعر یہاں درج کئے جاتے ہیں، کلام میں بلا کی شوخی ہے، روزمرّہ اور آمد ملاحظہ ہو، آخری شعر کا مضمون اچھوتا نہ سہی مگر طرزِ ادا ضرور انوکھی ہے۔

بچیں گے بھلا آپ شوکت سے کب تک | لگالے گا وہ راہ پر، دیکھ لینا
یہ نہ کہیے ترے مرنے سے مرا کیا ہوگا | آپ کے سر کی قسم آپ کا چرچا ہوگا
سوالِ وصل کو ٹالا یہ کہہ کر واہ ری شوخی | ہنسی ہر وقت کی مجھ کو بُری معلوم ہوتی ہے
رہگذر میں تری ہنگام تلاشِ دلِ زار | خاک آلودہ سی اک چیز پڑی پائی ہے
ہوا جو ہونا تھا خیر شوکت بس اب نہ روٹھو ملاپ کرلو | کہ باہیں ڈالے ہوئے گلے میں تمہیں وہ کب سے منا رہے ہیں

یادِ رفتگاں ہدایت علی خاں صاحب بڑے ہنس مکھ اور خوش اخلاق آدمی تھے، طرزِ زندگی سادہ، دل کے صاف، بات کے پکے، دوستوں سے مل کر ایسا خوش ہوتے تھے گویا نزاعی مقدمہ جیت لیا، مرحوم روپے پیسے کے معاملہ میں محتاط تھے، مگر خیر خیرات اور قومی کاموں کی امداد کے لئے اون کا ہاتھ کھلا رہتا تھا، دیتے تھے، اور بغیر پیشانی پر بل ڈالے دیتے تھے، اس ضمن میں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ بزرگوں کے ترکہ کے بھروسے ایک کی جگہ دو اٹھانا ایک بات ہے اور اپنے گاڑھے پسینہ کی کمائی کو بیجا خرچ کرنا امرِ دیگر ہے، نوجوان مسلمانو کو کبھی نہ بھولنا چاہیئے کہ روپیہ ناقدر دانوں کے پاس نہیں ٹھیرتا، بلکہ اونہیں لوگوں کو ڈھونڈتا ہے، جو اس کی قدر جانتے ہیں،

ہندوؤں میں راجہ جے کشن داس صاحب اُس زمانہ کے نامور لوگوں میں تھے، سر سید احمد خاں علیہ الرحمۃ کے گہرے دوست تھے، غدر ۱۸۵۷ء میں ڈپٹی کلکٹر تھے، گورنمنٹ کی وفاداری کے صلہ میں، سی۔ ایس، آئی کا خطاب اور بہت سی جایداد انعام میں پائی، مکان جو عطا ہوا اوس کے کونہ میں مسجد واقع تھی، اور اب بھی ہے، راجہ صاحب نے نہ صرف مسجد کو قائم رکھا بلکہ جب تک زندہ رہے، مسجد کے جملہ اخراجات خود برداشت کرتے رہے، اون کے بعد ان کے بیٹے اور اب پوتے کنور سر جگدیش پرشاد مسجد کا سارا خرچ اٹھاتے ہیں، منشی اندرمن صاحب فارسی کے جید عالم تھے، اون کی تصانیف فارسی میں ہیں، فارسی شعر بھی کہتے تھے، آریہ ہوگئے تھے، مولوی آل حسن صاحب سے مناظرہ میں کئی کتابیں لکھیں

عربی بھی خاصی جانتے تھے، جانبین کی کتابیں آج بھی اون حضرات کے لئے جن کو مذہبی مناظرہ کا ذوق ہے دلچسپی سے خالی نہ ہوں گی، بابو بیجناتھ صاحب نے فوجداری وکالت میں نام حاصل کیا، راجہ کشن کمار صاحب رئیس ہنس پور فارسی میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے، اور شاعر بھی تھے، وقار تخلص تھا، کلام بیشتر اُردو میں ہے، صاحب دیوان ہیں، ضلع مراد آباد کے سب سے بڑے اور صاحب اقبال رئیس تھے، اب ریاست کورٹ آف وارڈس کے زیر اہتمام ہے ریاست کی مالک اون کے پوتے راجہ جگت کمار کی بیوہ رانی پریتم کنور ہیں، پنڈت پرتاپ کشن صاحب قوم کے کشمیری برہمن تھے، اخبار رہبر کے جو چالیس برس پہلے مرادآباد سے نکلتا تھا، مالک اور ایڈیٹر تھے، فارسی ایسی ہی جانتے تھے، جیسی آج کل کے وہ بی۔اے جنھوں نے فارسی میں ڈگری لی ہو، مگر مشق کے باعث اُردو اچھی خاصی لکھ لیتے تھے، عام کشمیری حضرات کی طرح خوش خوراک اور خوش پوشاک تھے، ساہو پرشادی لال صاحب بڑے ہنس مکھ اور ملنسار آدمی تھے، سرخ سفید رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، خوب بڑی مونچھیں، شاندار صورت، زمیندار ہونے کے علاوہ لین دین بھی کرتے تھے، اور اپنے زمانہ کے دولتمند لوگوں میں تھے، روپیہ بھی مسرفوں کے ہاتھ سے تنگ آکر اون کے دامن میں پناہ لیتا تھا، موصوف کی راجہ کشن کمار صاحب سے بڑی دوستی تھی، نواب عبدالمجید خاں صاحب حسن پور کے با اثر، خلیق، مہماں نواز اور نہایت صاحب اقبال رئیس تھے، حاجی سید مقبول احمد صاحب کو میں نے سادات امروہہ میں سب سے زیادہ روشن خیال پایا وہ دل سے خواہشمند تھے کہ امروہہ کے سنیوں اور شیعوں کے تعلقات برادرانہ رہیں، نواب عاشق حسین خاں صاحب سنہ ۱۹۱۶ء سے سنہ ۱۹۴۲ء تک مسلسل بذریعہ انتخاب سنبھل میونسپلٹی کے چیرمین رہے، ذاتی قابلیت اور خوش انتظامی سے جو جائداد خود خریدی اوس کی سالانہ آمدنی چالیس ہزار روپے سے زیادہ ہوگی، وفات سے پہلے سب جائداد وقف علی الاولاد کردی تھی، نواب صاحب نے تیرہ یا چودہ بیٹیاں اور بیٹے چھوڑے ہیں، ایک بیٹا بی۔اے ہے۔

خدا نظر بد سے بچائے بچھرایوں مسلمانوں کا پرانا قصبہ ہے، چالیس برس ہوئے وہاں چند رئیس ایسے موجود تھے جن کی زمینداری کی آمدنی ڈیڑھ دو ہزار روپے ماہوار تھی، اب صرف تین رئیس رہ گئے ہیں، مولوی عبدالحفیظ اپنی جائداد کا انتظام خود کرتے ہیں، اور بڑے اچھے منتظم ہیں، اپنے رشتہ داروں کا بھی خیال رکھتے ہیں، انگریزی نہ جاننے کے باوجود بڑے روشن خیال ہیں، بدقسمتی سے کوئی اولاد نہیں ہے، اور جہاں تک مجھے معلوم ہے اونہوں نے ابھی تک کوئی وقف یا اپنی جائداد کا کوئی مستقل انتظام نہیں کیا ہے، مولوی سلطان حسن خاموش آدمی ہیں، عربی کی استعداد اچھی ہے، رہنے سہنے کا ڈھنگ وہی ہے جو ہمارے بزرگوں کا اب سے چالیس پچاس برس پہلے تھا، معقول جائداد کے مالک ہیں، قومی کاموں میں کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے، مولوی قیام الدین احمد مرحوم کی اہلیہ بچھرایوں کی تیسری بڑی زمیندار ہیں، ان کے والد مولوی عباس علی مرحوم نے اپنی ساری جائداد وقف کردی تھی، موصوفہ اوس کی متولی ہیں، انہوں نے خود بھی ایک وقف نامہ دو ڈھائی سال ہوئے لکھا ہے، عزیزی عبدالسلام ہیں نو مراد آباد کے رہنے والے، مگر چند سال سے بچھرایوں کی سکونت اختیار کرلی ہے۔ بچھرایوں ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک بڑی اچھی دو منزلہ کوٹھی بنائی ہے، اوسی میں رہتے ہیں، عبدالسلام کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اونہوں نے اپنا مراد آباد کا مکان جو بھٹی محلہ میں ہے عبدالسلام مسلم گرلس ہائی اسکول کے نام وقف کرکے اسکول کی انتظامیہ کمیٹی کو متولیانہ قابض کرادیا ہے، وقف کے جواز کے لئے وقف نامہ کی تحریر یا رجسٹری کی ضرورت نہیں ہے، تاہم امید ہے کہ عزیز مذکور مکان کا وقف نامہ لکھ کر بہت جلد رجسٹری کرادیں گے، مکان بہت اچھا اور لڑکیوں کے اسکول کے لئے نہایت موزوں ہے، ایسا مکان اگر آج بنایا جائے تو تعمیر میں ایک لاکھ روپیہ سے زیادہ خرچ ہوگا۔

مسٹر اسپیرس (Speirs) مجھ سے چند سال پہلے سے وکالت کرتے تھے، شاہجہانی عمارت ہیں، اس ۳۵ سال میں نہ صورت میں زیادہ فرق ہوا ہے نہ عادات وخصائل میں، ہندوستان میں پیدا ہوئے اور یہیں پلے بڑھے، اردو خوب بولتے ہیں۔ فوجداری کی عدالتوں میں کام کرتے تھے اور کام اچھا

تھا، قانون پیشہ برادری میں سب سے میل جول تھا، بڑے شگفتہ مزاج ہیں، خوش طبع نہ ہوتے تو عدم تعاون، خلافت، اور سول نافرمانی کے زمانہ میں زندگی دوبھر ہو جاتی۔ موقع محل دیکھ کر مرادآباد کی پولیٹیکل زندگی میں دلچسپی لینے سے بھی نہیں چوکتے تھے، اولاد کو بہت اچھی تعلیم دلائی ہے،

سنہ ۱۹۱۰ء کا ایک قصہ یاد آیا، مولوی ابراہیم علی صاحب ضلع مرادآباد کے بہت بڑے زمیندار تھے، وفات کے بعد بیٹوں اور بیٹیوں میں بعض دیہات کے بارہ میں نزاع پیدا ہوئی، داخل خارج کے مقدمہ کا اپیل مسٹر گگ کلکٹر کے اجلاس میں تھا، بیٹوں کی طرف سے مسٹر اسپیرس وکیل تھے اور ایک بیٹی کی طرف سے میں وکیل تھا، مسٹر گگ دورہ میں تھے، دورہ میں اہل معاملہ اور ان کے قانونی مشیروں کو اب بھی تکلیف ہوتی ہے، پہلے اور زیادہ تکلیف ہوتی تھی، تیس برس ہوئے یہ ہدایت گورنمنٹ نے جاری نہ کی تھی کہ جن مقدمات میں وکیل ہوں اون کی سماعت ریلوے اسٹیشنوں کے قریب کی جائے، دن کے گیارہ بجے مسٹر اسپیرس امعہ میں اوس جگہ پہنچے جو کلکٹر کے دورہ کے پروگرام میں درج تھی، معلوم ہوا کہ کلکٹر کا لشکر[1] یہاں سے اوٹھ گیا، آج کلکٹر کا لشکر دس بارہ میل کے فاصلہ پر ہے، ہم روانہ ہوئے، راستہ بہت خراب تھا، میں تانگہ میں تھا مسٹر اسپیرس ہاتھی[2] پر سوار تھے، شام کے چار بجے ہم سب تھکے ماندے کلکٹر کے لشکر میں پہنچے، اطلاع کرائی، کلکٹر نے

---

[1] دورہ کے زمانہ میں یہ لفظ سرکاری حکام کے کیمپ کے لئے اب بھی بولا جاتا ہے۔

[2] بچھرایوں کے مولوی ابراہیم علی صاحب نے سنہ ۱۹۰۸ء میں وفات پائی، ترکہ میں جو دیہات چھوڑے اون کی آمدنی سوا لاکھ روپے سالانہ کے قریب تھی، بہت سے مواضعات معافی کے تھے جن پر سرکاری مالگذاری کچھ دینا نہ پڑتی تھی، کچھ قرضہ بھی چھوڑا تھا، تین بیٹے اور دو بیٹیاں وارث ہوئے حتیٰ ۱۹۲۶ء تک سب جائداد مع مکانات نیلام ہوگئی تھی، اتنا بھی ٹھکانا نہ تھا کہ ان میں سے دو بیٹے اپنی بسر اوقات کر سکتے، تینوں بیٹے چال چلن کے اچھے تھے، کوئی بُرا شوق نہیں تھا، تربیت البتہ بہت ناقص تھی، خوشامدی اور خود غرض لوگ مصاحب بن گئے تھے، تینوں بیٹوں کی یہ حالت تھی کہ ہزار روپے قرض لے کر چار پانچ ہزار روپے کا رقعہ لکھ دیتے تھے، نمک حرام کارندے صاحب حیثیت ہوگئے، اور نیلام میں زمینداری سستے داموں خرید کر مالک بن بیٹھے، ایک دوست نے سنہ ۱۹۳۳ء میں مجھے بھی مشورہ دیا تھا کہ ہزار روپے ان حضرات کو قرض دے کر چار یا پانچ ہزار روپے کا رقعہ لکھوالو، پانچسو روپے کارندوں کی نذر کرتا ہوں گاؤں اس طرح ایک گاؤں ہاتھ آجائے گا، اگر خدا کا شکر ہے، میں نے اس مشورہ پر عمل کرنے سے انکار کر دیا سچ تو یہ ہے کہ بھلا خدا کے دیئے ہوتا ہے۔

فوراً اپیل ملتوی کر کے سماعت کے لئے خاص مراد آباد کی تاریخ مقرر کر دی، تھوڑی دیر میں کلکٹر کا چپراسی آیا اور مسٹر اسپیرس سے کہا کہ آپ صاحب چاء پینا چاہیں تو کلکٹر صاحب کا حکم ہے، چاء حاضر کر دی جائے، میرے دوست نے انکار کر دیا، چونکہ چپراسی کا روئے سخن مسٹر اسپیرس کی طرف تھا، اس لئے میں نے اپنی طرف سے کچھ کہنا غیر ضروری سمجھا، انگریزی میں اسپیرس نے مجھ سے کہا کہ میں چور دروازہ سے داخل ہو کر کلکٹر کے یہاں چاء پینا نہیں چاہتا، اسپیرس کا مطلب یہ تھا کہ اگر چاء پلانی تھی تو اس کی دعوت ہم دونوں کو کلکٹر خود دیتے، چپراسی کی معرفت مدعو کرنا ہمارے لئے باعثِ توہین ہے، اس اظہار خودداری نے مسٹر اسپیرس کی وقعت میری نظر میں بڑھا دی، ہمارے ملک میں جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں اون کا حال اس واقعہ سے معلوم ہوگا جو ساڑھے تین برس بعد مجھے دورہ میں مسٹر لیپٹن کے ساتھ پیش آیا، جو ۱۹۱۳ء میں مراد آباد کے کلکٹر تھے، وہ حالات میں نے کسی اور جگہ لکھ دیئے ہیں۔

رائے بہادر پنڈت بنارسی پرشاد نے مجھ سے چند مہینے پہلے وکالت شروع کی تھی، اون کے والد سنبھل کے نامی رئیس تھے، پنڈت صاحب دیوانی کے ممتاز وکیل ہیں، اب کچھ عرصہ سے باقاعدہ وکالت چھوڑ دی ہے۔ ریلوے اسٹیشن کے قریب کوٹھی بنائے عرصہ ہوا، سڑک کے کنارے جتنی زمین تھی اوس سب پر دوکانیں بنوا دی ہیں، دوکانوں کی تعمیر سے کوٹھی کا سامنا دب گیا، مگر ہر مہینے کرایہ کی معقول رقم آتی ہے، بڑے زندہ دل اور میل جول کے آدمی ہیں، سنا ہے آج کل اون کا بیشتر وقت مجنوں کی تلاش میں ضلع نینی تال کے جنگل میں گذرتا ہے، یعنی جنگلات کا ایک بڑا ٹھیکہ موصوف نے لے رکھا ہے، جوئندہ یابندہ، اگر مجنوں سے ملاقات نہ ہوئی تو بھی لیلیٰ کی بہنوں کی اوس نواح میں کمی نہیں ہے، خان بہادر سید جعفر حسین بھی سنبھل کے رہنے والے ہیں۔ اون کے والد خان بہادر سید فاکر حسین صاحب اپنے زمانہ کے بڑے نیک نام اور قابل ڈپٹی کلکٹر تھے، ڈپٹی صاحب نے دونوں بیٹوں کو انگلستان بھیجا، اور دونوں ولایت سے بیرسٹر ہو کر آئے، جعفر حسین عرصہ تک صوبہ کی کونسل کے ممبر رہے، مراد آباد میں بیرسٹری کرتے ہیں، سنجیدہ مزاج آدمی ہیں۔ بابو مرلی منوہر اور رائے بہادر بسنت لال نے میرے چند سال بعد وکالت شروع کی، بابو صاحب نے دیوانی مقدمات سے تعلق

رکھا، رائے بہادر نے فوجداری مقدمات سے پینگ بڑھائے، نامور وکیل ہونے کے علاوہ دونوں بڑے زندہ دل اور شگفتہ مزاج ہنس مکھ اور خوش اخلاق ہیں، مگر وکالت کے پیچھے دھونی رمانے اور اپنے کو روپیہ کمانے کا آلہ بنانے کے قائل نہیں ہیں، دونوں صاحب بڑے وضعدار اور یاروں کے یار ہیں، مسٹر کدار ناتھ اصلی رہنے والے تو ضلع راولپنڈی کے ہیں، مگر شادی مراد آباد میں ہوئی ہے کامیاب بیرسٹر ہیں، مقدمات کو طول نہیں دیتے، اونہوں نے بھی بیرسٹری میرے سامنے شروع کی، بڑے سلیقہ شعار، خوش دل، خوش باش اور مہمان نواز ہیں - وضع داری کا یہ عالم ہے کہ برخوردار حمزہ علی کو اپنے عزیزوں کی طرح سمجھتے ہیں، مسٹر خوشی رام بھی پنجاب کے رہنے والے ہیں، تیس برس ہوئے بیرسٹری کرنے مراد آباد آئے تھے، سال دو سال بعد وکیل سرکار مقرر ہوئے، اور یہیں سکونت اختیار کرلی، مرنجاں مرنج آدمی ہیں، اور سب سے یاد اللہ ہے، بگاڑ کسی سے نہیں ہے، رائے بہادر بابو چھوٹے لال دولت مند ہیں، اور ان تحریکوں میں جن کا تعلق گورنمنٹ یا سرکاری حکام سے ہے بڑی فراخ دلی سے چندہ دیتے ہیں، انگریزی داں ہونے کے باوجود ہماری پرانی تہذیب کا قابل قدر نمونہ ہیں -

چالیس برس پہلے کی شہری زندگی

یورپ کی اصطلاح میں شہری زندگی سے مراد وہ تمام حقوق ہیں جو کسی ملک کے باشندوں کو حاصل ہوں، سنہ ۱۹۰۰ء میں جو حقوق ہم ہندوستانیوں کو حاصل تھے وہ اتنے کم تھے کہ اوس زمانہ کی زندگی کو شہری زندگی کے نام سے تعبیر کرنا، دُنیا کی توجہ اس طرف دلانا ہے کہ انگلستان کی اونچی دوکان سے جو پکوان ہندوستان بھیجا جاتا تھا وہ بہت پھیکا ہوتا تھا، یہاں یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اوس زمانہ

---

[۱] ایک ناخواندہ مسلمان جب مسجد کے سامنے ہو کر گذرتا تھا سلام کرلیتا تھا، ایک دن کسی مسلمان دوست کے ساتھ جا رہا تھا، راستہ میں مندر پڑا جھک کر سلام کیا، دوست نے کہا میاں تم کیسے مسلمان ہو بُت خانہ کو سلام کرتے ہو، کہنے لگے میں جب کبھی مسجد کے سامنے ہو کر نکلتا ہوں ہمیشہ ادب سے سلام کرتا ہوں اور وہی بات ٹھیک بھی ہے، مگر بگاڑ ان سے بھی (مندر کی طرف اشارہ کرکے بتلایا) اچھا نہیں ہے -

میں ہم ہندوستانیوں کو کیا کیا حقوق حاصل تھے، ہر ضلع میں دو جماعتیں تھیں جن میں سے ایک کا نام ڈسٹرکٹ بورڈ اور دوسری کا نام میونسپل بورڈ تھا، ڈسٹرکٹ بورڈ کے سپرد ضلع کے شفاخانوں، سڑکوں مدرسوں اور حفظان صحت کا کام تھا، میونسپل بورڈ کے اختیارات زیادہ وسیع تھے، دونوں بورڈوں کے ممبر انتخاب اور نامزدگی کے ذریعہ سے مقرر ہوتے تھے، میونسپل بورڈ کے حلقۂ انتخاب کی فہرست رائے دہندگان گو نامکمل ہوتی تھی تاہم اوس میں اتنی زیادہ غلطیاں نہ ہوتی تھیں جتنی اون فہرستوں میں موجود ہوتی تھیں جو ڈسٹرکٹ بورڈ کے انتخابی حلقوں کے لئے تیار کی جاتی تھیں، دونوں بورڈوں میں اکثریت منتخب شدہ ممبروں کی ہوتی تھی، مگر بسا اوقات منتخب شدہ ممبروں اور نامزد شدہ ممبروں کی ذہنیت میں کوئی بیّن فرق نہ ہوتا تھا، دونوں بورڈوں میں وہی شخص نامزدگی کے ذریعہ سے ممبر ہوسکتا تھا جس کی سفارش حاکم ضلع یعنی کلکٹر کرے۔ ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپل بورڈ کا چیرمین حاکم ضلع ہوتا تھا۔ ۱۹۰۹ء میں پانچ چھ میونسپلٹیوں کا غیر سرکاری چیرمین مقرر ہوا، مگر یہ تقرر بذریعۂ انتخاب عمل میں نہیں آیا بلکہ لفٹنٹ گورنر نے جس غیر سرکاری ہندوستانی کو مناسب سمجھا چیرمین مقرر کر دیا یہ نہایت معمولی تبدیلی تھی، اس پر بھی جن جن میونسپلٹیوں میں غیر سرکاری چیرمین مقرر کئے گئے تھے وہاں کے کلکٹروں کو شکایت تھی کہ میونسپلٹی سے بے تعلق ہوجانے کے باعث اون کو شہر کے حالات بخوبی معلوم نہیں ہوتے، آج سے چالیس برس پہلے عام حالت یہ تھی کہ چیرمین یعنی حاکم ضلع کو ناراض کئے بغیر کوئی ممبر چیرمین کی رائے سے اختلاف نہ کرسکتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ مقامی جماعتوں یعنی ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپل بورڈوں کا جیسا اچھا انتظام اس صدی کے شروع میں تھا اب ویسا نہیں ہے، اس خرابی کے دو سبب ہیں، ایک سبب تو یہ ہے کہ انگلستان نے ہندوستان کو معمولی حقوق دینے میں بھی بڑی دیر کی، ہر اصلاح کے دیئے جانے میں اس قدر تاخیر ہوئی کہ ایک طرف تو اوس اصلاح کی قدر لوگوں کی نظر میں جاتی رہی، دوسری طرف عوام کو اتنا موقع نہ ملا کہ اوس اصلاح کے مفید نتایج کا کافی تجربہ کرسکتے، لارڈ رپن نے مقامی جماعتوں میں ہندوستانیوں کو اختیارات دیئے جانے کا جو کام اب سے ساٹھ برس پہلے شروع کیا تھا اگر اوس میں گورنمنٹ ہند کتر بیونت کرنے کے بجائے وقتاً فوقتاً

اضافہ کرتی رہی تو ڈسٹرکٹ اور میونسپل بورڈوں کی حالت ایسی ناقابل اطمینان اور خراب نہ ہوتی جیسی آج ہے، دوسرا سبب حالات کے بد سے بدتر ہو جانے کا یہ ہوا کہ میری ناچیز رائے میں ہندوستان کی زمین جمہوریت کے پودے کی نشو و نما کے لئے موزوں نہیں ہے، جس حلقۂ انتخاب میں جس ذات یا طبقہ کی اکثریت ہوتی ہے وہاں اوس ذات یا طبقہ کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ممبر بھی اوسی ذات یا طبقہ کا ہو ہم ہندوستانیوں کا یہ رجحان جواب ہماری ذہنیت میں داخل ہو گیا ہے، نہایت قابل افسوس ہے اور صاف بتلا رہا ہے کہ جمہوریت کی بیل ہمارے ملک میں کبھی منڈھے نہ چڑھے گی، سچ پوچھئے تو ہندو بھائیوں کی اسی ذہنیت نے مسلمانوں کو انتخاب جداگانہ کی آواز بلند کرنے پر مجبور کیا، غیر مسلم انتخابی حلقوں کی یہ حالت ہے کہ اگر رائے دہندوں کی فہرست میں جاٹوں کی اکثریت ہے تو سوائے جاٹ کے کسی اور ذات کے آدمی کا منتخب ہونا بڑا دشوار کام ہے، انتخاب جداگانہ سے مسلمانوں کو یہ فائدہ تو ضرور ہوا کہ وہ کٹھ پتلی کی طرح ہندو بھائیوں کے ہاتھ میں نہیں ہیں، تاہم انتشار اور پراگندگی کی جو فضا ملک میں پھیل گئی ہے اوس کے زہریلے اثر سے مسلمان بھی اپنے کو محفوظ نہ رکھ سکے، مرکزی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی کا حلقۂ انتخاب تو بڑا وسیع ہے، وہاں ابھی اس زہریلی ذہنیت کے نتائج ظاہر نہیں ہوئے ہیں، مگر باوجود اس کے کہ مذہب اسلام کی جان مساوات اور برابری کا وہ درس ہے جس کی مثال دنیا کے کسی اور مذہب میں نہیں ملتی، مقامی جماعتوں یعنی ڈسٹرکٹ اور میونسپل بورڈوں کے انتخاب کا یہ حال ہے کہ جس حلقۂ انتخاب میں قریشی یا انصاری بھائیوں کی کثرت رائے ہے وہاں امیدواروں کی ذاتی قابلیت نہیں دیکھی جاتی، بلکہ بدقسمتی سے یہ ضروری سمجھا جاتا ہے کہ اوس حلقۂ انتخاب کا نمائندہ قریشی یا انصاری ہو، میرا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ قریشی یا انصاری بھائی خاص طور سے قابل الزام ہیں، اسلامی آبادی کی ان دونوں جماعتوں کا تذکرہ میں نے محض تمثیلاً کیا ہے، ورنہ بقیہ اسلامی آبادی کی حالت بھی وہی ہے جو ان دونوں جماعتوں کی ہے۔

مولوی محمد یعقوب مرحوم

۱۹۰۸ء کے آخر میں مولوی محمد یعقوب نے شاہجہاں پور چھوڑ کر

مرادآباد میں وکالت شروع کی، وکالت بڑی بدگمان اور حاسد معشوقہ ہے، اگر کوئی اس سے ملنا چاہے تو شرط یہ ہے کہ اسی کا ہو رہے، مرحوم نے وکالت کو پیشہ نہیں بنایا، بلکہ تفریحی شغل قرار دیا، وکالت کی دیوی نے بھی اس نوجوان طالب کے ساتھ وہی برتاؤ کیا جو متلون مزاج معشوق عموماً عاشقوں کے ساتھ کرتے ہیں، مرحوم کے والد حافظ محمد اسماعیل دولت مند تو نہ تھے، مگر خاصے خوش حال تھے یہی خوش حالی وکالت سے محمد یعقوب مرحوم کی کم توجہی کا باعث ہوئی، جس کا نتیجہ قوم کے حق میں بہت مفید ثابت ہوا، تمام تر وقت اور توجہ وکالت کی نذر کرتے تو پندرہ بیس برس میں ضلع کے کامیاب وکیل ہو جاتے، ہر ضلع میں اب بھی کامیاب وکلأ کی تعداد آدھے درجن کے قریب ہے،

قومی اور ملکی معاملات میں جس قدر انہماک بڑھتا گیا وکالت کی شاہ راہ دور ہوتی گئی، اس زمانہ میں سیاسی جد وجہد کی سیڑھی کا پہلا ڈنڈا میونسپل بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈ کی ممبری تھی، مرحوم نے اسلامی شہری زندگی کی تنظیم کی طرف توجہ کی اور چار پانچ سال کے اندر مرحوم کی کوشش سے میونسپل بورڈ میں ایسے ایسے تعلیم یافتہ، آزاد اور روشن خیال ممبر انتخاب کے ذریعہ سے پہنچ گئے، جن کی موجودگی نے مرادآباد میونسپلٹی کو قابل رشک بنا دیا، مولوی محمد یعقوب کے علاوہ خان بہادر مسعود الحسن بیرسٹر (جو بعد کو ریاست رام پور کے چیف منسٹر ہوئے) مولوی محمد محسن مرحوم بی۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی، مولوی محمد احمد بی۔ اے ایل۔ ایل۔ بی (پنشن یافتہ ڈسٹرکٹ سشن جج) اور مسٹر ابو الحسن بیرسٹر بھی میونسپلٹی کے ممبر تھے، اکثر و بیشتر معاملات میرے گھر پر طے ہوتے تھے، مگر میری زندگی کا مقصد اس زمانہ میں صرف روپیہ کمانا تھا، ڈسٹرکٹ مسلم لیگ کا سکرٹری ہونے کے علاوہ میں نے اور قومی کاموں کی باقاعدہ ذمہ داری سے اپنے کو سبکدوش کر رکھا تھا۔

کچھ اپنے متعلق

دوران گفتگو میں سر تھیوڈر ماریسن نے ایک دفعہ مجھ سے کہا تھا کہ ان کے والد مسٹر کاٹر ماریسن اور مسٹر جان مارلے دونوں بڑے دوست تھے، اور تقریباً ایک ہی زمانہ میں دونوں نے تالیف و تصنیف کا کام شروع کیا تھا، لیکن فرق اتنا تھا کہ مسٹر مارلے کی رفیق تنگ دستی تھی، کتابیں لکھ کر جو کچھ کماتے تھے اس سے گذر ہوتی تھی، اس کے

برخلاف مسٹر کاٹر مارین کو فی الجملہ فارغ البالی حاصل تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ بحیثیت مصنف جو شہرت مسٹر مارلے نے حاصل کی وہ مسٹر کاٹر مارین کو نصیب نہ ہوئی، غریبی اس لحاظ سے اچھی چیز ہے کہ انسان کو خود اپنے قوت بازو پر بھروسہ کرنا سکھاتی ہے۔ میں طالب علمی کے زمانہ میں بھی مطالعہ اور محنت کا عادی تھا، جب وکالت شروع کی تو اپنے کو اور زیادہ محنت کا عادی بنایا، وکالت کے پہلے مہینہ کی میری آمدنی ایک سو سترہ روپے تھی، مئی ۱۹۰۶ء یعنی وکالت کے چوتھے مہینہ میں چارسو روپیہ سے زیادہ کمائے، مئی ۱۹۰۸ء میں یعنی کام شروع کرنے کے سوا دو برس کے اندر میری آمدنی ایک ہزار روپیہ سے زیادہ ہوگئی تھی، میں سب عدالتوں میں کام کرتا تھا اور ابتدائے وکالت کے زمانہ میں کئی مرتبہ تحصیلدار اور آنریری مجسٹریٹوں کے اجلاسوں میں جا کر میں نے مقدمات کی پیروی کی، ڈسٹرکٹ اور میونسپل بورڈوں کے انتخاب کے مقدموں میں موکل بہت اچھی فیس دیتے تھے، بہ حیثیت مجموعی میرا آدھے سے زیادہ کام دیوانی عدالتوں میں اور آدھے سے کم کام فوجداری عدالتوں میں تھا، بڑے مقدموں میں کلکٹر اور کمشنر کی عدالتوں میں بھی کام کرتا تھا، میرا قصد تھا کہ جب تک مالی حالت بالکل قابل اطمینان نہ ہو جائے، سیاسی معاملات کی طرف توجہ نہ کروں، لیکن جوش کے آگے ہوش کی نہیں چلتی، منٹو مارلے اصلاحات کا نفاذ ۱۹۰۹ء کے آخر میں ہوا اور صوبہ کی کونسل کا پہلا انتخاب اخیر نومبر ۱۹۰۹ء میں قرار پایا، یہ پہلا انتخاب تھا جس میں مسلمانوں کو جداگانہ نیابت کا حق دیا گیا تھا، روہیل کھنڈ اور کمایوں دونوں کو ملا کر ایک اسلامی حلقۂ انتخاب بنایا گیا تھا جس کو ایک مسلمان ممبر منتخب کرنے کا حق تھا، رائے دہندوں کی فہرست جب گزٹ میں شائع ہوئی تو اوس میں میرا نام بھی موجود تھا، میرے دل میں کونسل کی ممبری کا خیال بھی نہ آیا تھا، مگر بعض احباب نے زور دیا کہ روہیل کھنڈ اور کمایوں کے اسلامی حلقۂ انتخاب سے میں اپنی امیدواری کا اعلان کروں، ان دوستوں میں پیش پیش مولوی محمد یعقوب مرحوم تھے، جن کو بڑا اصرار تھا کہ ہمارے حلقہ کا مسلمان نمائندہ مرادآباد کا رہنے والا ہو۔ میں جانتا تھا کہ جس شخص کو وکالت شروع کئے پورے دو برس بھی نہ ہوئے ہوں اوس کا میدان سیاست میں کودنا اور بجائے روپیہ کمانے کے اپنا وقت سیاسی مسائل کے حل کرنے میں صرف کرنا

وکالت کے کام میں خلل ڈالنا ہے، میں نے دوستوں کا شکریہ ادا کیا، اور معذرت چاہی لیکن بقول میرے
دل میں کتنے مسودے تھے مگر ؎ ایک پیش اون کے رو برو نہ گیا، دوستوں نے میرا عذر منظور نہ کیا اور
خود اپنے دستخطوں سے نوٹس اور خطوط چھاپ کر میری امیدواری کا اعلان کر دیا، انتخاب کا قصہ عموماً
ایسا ہی طویل ہوتا ہے، جیسے معشوق کی زلف، میں اور باتوں کو چھوڑتا ہوں اور صرف ایک واقعہ
کے بیان پر اکتفا کرتا ہوں، ہماری طرف سے روہیل کھنڈ کے مختلف ضلعوں میں کام ہو رہا تھا،
اور کامیابی کے آثار اچھے نظر آتے تھے، دورہ کرتے ہوئے ہم لوگ بریلی پہنچے، اور حامد حسین خاں مرحوم
کے مہمان ہوئے، موصوف نواب الطاف علی خاں مرحوم کے نواسہ تھے، اور ننا کا ترکہ میراث میں
پایا تھا، وہاں بعض احباب نے مشورہ دیا کہ انتخاب میں اگر دو امیدوار آخر وقت تک کھڑے رہے تو
مسلمانوں میں کش مکش اور بدمزگی پیدا ہو جانے کا احتمال ہے، مناسب ہے کہ یہ معاملہ نواب
وقار الملک کی پنچایت میں دے دیا جائے اور جو فیصلہ وہ دیں اوسے دونوں فریق منظور کریں،
میرے مد مقابل اوس وقت مولوی قمر علی ایم۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی تھے، جو دس گیارہ سال سے بریلی
میں وکالت کرتے تھے، ہم دونوں نے اپنے اپنے دوستوں اور بہی خواہوں سے مشورہ کرنے کے
بعد اس رائے کو منظور کر لیا، اور علی گڈھ پہنچے، ہم سہ پہر کے کوئی تین بجے نواب صاحب کے بنگلہ پر
پہنچے ہوں گے، نواب صاحب بڑی خندہ پیشانی سے ملے اور ہمارے آنے کی وجہ دریافت کی، میں
نے جواب دیا، مولوی قمر علی اور میں دونوں آپ سے ایک معاملہ کی پنچایت کرانے آئے ہیں، فرمانے
لگے، جلدی کیا ہے، ہاتھ منہ دھوئیے، چائے پیجئے پنچایت بھی ہو جائے گی، ہم دونوں ضروریات سے
فارغ ہوئے، چائے پی اور پھر نواب صاحب ہم کو اپنے دفتر میں لے گئے، پوچھا کہئیے کیا بات ہے،
میں نے جواب دیا، صوبہ کی کونسل کے انتخابات ہونے والے ہیں، روہیل کھنڈ اور کمایوں کے
حلقۂ انتخاب سے دو امیدوار ہیں، ایک میں دوسرے مولوی قمر علی صاحب، ہم دونوں آپ کی
خدمت میں حاضر ہوئے ہیں، جس امیدوار کو آپ حکم دیں وہ اپنا انتخاب چاہے دوسرا دست کش ہو جائے
فرمایا، یہ تو کچھ مشکل مسئلہ نہیں ہے، آپ دونوں میں سینیر کون ہے (یعنی عمر میں بڑا کون ہے اور کالج میں

پڑھنے کے لئے پہلے کون آیا تھا) میں نے کہا، مولوی قمر علی صاحب آٹھ دس سال مجھ سے سینیر ہیں، فرمانے لگے، پھر تو معاملہ بہت آسان ہے، آپ (میری طرف خطاب کرکے کہا) بیٹھ جایئے، آپ (مولوی قمر علی کی طرف روئے سخن تھا) کھڑے رہیئے، نواب وقار الملک کا یہ فیصلہ میری امید کے خلاف تھا، مگر ہمارے دلوں میں سر سید احمد خاں علیہ الرحمۃ کے جانشین کا ایسا احترام تھا اور ہم سب اون کی ایسی عظمت کرتے تھے کہ مجھ پر ہی کیا موقوف ہے، میری جگہ جو کوئی ہوتا وہ اس فیصلہ کے آگے سر تسلیم خم کرتا، میں نے اوسی وقت نواب صاحب کے دفتر میں بیٹھ کر ایک تار ایسوسی ایٹڈ پریس کے نام لکھ دیا کہ نواب وقار الملک بہادر کے فیصلہ کی بموجب میں دست بردار ہوتا ہوں، اور جو رائے دہندہ حضرات مجھے ووٹ دینا چاہتے تھے، اون سے درخواست کرتا ہوں کہ بجائے میرے مولوی قمر علی کو ووٹ دیں، نواب صاحب کا فیصلہ اکثر رائے دہندوں کو پسند نہ آیا، مراد آباد میں تو کس کی مجال تھی کہ سرتابی کرسکتا، مگر بریلی والوں نے خان بہادر اصغر علی خاں کو جن کو سر جان ہیوٹ لفٹنٹ گورنر کچھ دن پہلے بریلی میونسپلٹی کا پہلا غیر سرکاری چیرمین مقرر کرچکے تھے، مولوی قمر علی کے مقابلہ میں کھڑا کیا، اور خان بہادر کو کامیابی ہوئی نواب وقار الملک کا فیصلہ بہ لحاظ نتائج میرے حق میں بہت مفید ثابت ہوا، مجھے تین سال اور دل لگا کر وکالت کا کام کرنے کے لئے مل گئے، ورنہ میرا وہی حال ہوتا کہ الّذی نہ الّذی، کسی نو آموز وکیل کو جو صاحب مقدرت نہ ہو اوس وقت تک سیاست کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہیئے جب تک اوس کی حالت اس قابل نہ ہو جائے کہ اندیشۂ فردا سے آزادی دلا سکے۔

دہلی میں لیگ کا اجلاس

آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ۲۹۔ اور ۳۰۔ دسمبر سنہ ۱۹۱۰ء کو بمقام دہلی سنگم تھیٹر میں زیر صدارت سر غلام محمد علی خاں بہادر شہزادہ ارکاٹ منعقد ہوا، استقبالیہ کمیٹی کے صدر حاذق الملک (خطاب واپس کرنے کی نوبت دس سال بعد آئی) حکیم اجمل خاں تھے، منٹو مارلے اصلاحات کے نفاذ کے بعد لیگ کا یہ پہلا اجلاس تھا، ہز ہائینس آغا خاں نواب وقار الملک اور بہت سے نامور بزرگ جلسہ میں شریک تھے، رائٹ آنریبل امیر علی نے تحریری تقریر انگلستان سے بھیجی تھی جو خان بہادر میاں محمد شفیع نے جلسہ کو پڑھ کر سنائی، آغا خاں

کی تقریر بھی جلسہ کو بہت پسند آئی، شہزادہ ارکاٹ کا خطبۂ صدارت مختصر تھا، مگر اہم سیاسی معاملات پر موصوف نے اپنے خیالات کا اظہار خوبی کے ساتھ کیا تھا، مولوی رفیع الدین احمد نے رزولیوشن پیش کیا تھا کہ امپیریل کونسل اور صوبائی کونسلوں میں انتخاب جداگانہ کے اصول کے نفاذ کے بعد یہ بات نہایت ضروری ہے کہ اصول مذکور کی توسیع مقامی جماعتوں میں بھی کی جائے، جن صوبوں میں مسلمانوں کی اقلیت ہے وہاں انتخاب جداگانہ کا حق مل جانے سے مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ نہیں ہو سکتا تھا اس لئے میں نے ترمیم پیش کی کہ مقامی جماعتوں میں مسلمانوں کی نیابت کافی اور موثر ہونا چاہیئے، اس ترمیم کو جلسہ نے بہ اتفاق رائے منظور کیا اور مولوی رفیع الدین کا رزولیوشن ترمیم مذکور کے بعد منظور رہوا، دہلی میں یہ میری پہلی تقریر تھی، اوس زمانہ کی تقریریں اگر آج پڑھی جائیں تو سب پھیکی معلوم ہوتی ہیں، اس کی وجہ جیسا میں کسی دوسری جگہ بیان کر چکا ہوں یہ ہے کہ کانگریس اور لیگ دونوں گورنمنٹ برطانیہ کی بہی خواہ اور وفادار تھیں اپنی بے بسی کا احساس تو دونوں کو تھا اور دونوں جماعتیں چاہتی تھیں کہ ملکی دستور میں ایسی تبدیلیاں کی جائیں جس سے ہندوستانیوں کے اختیارات میں توسیع ہو سکے، لیکن آزادی کامل تو درکنار اوس آزادی کا تخیل بھی جو آسٹریلیا اور کناڈا کو حاصل تھی ابھی ہندوستان سے منزلوں دور تھا، نیابت جداگانہ کا جو محدود حق مسلمانوں کو کونسلوں میں دیا گیا تھا اوس کے پنڈت مدن موہن مالوی بڑے مخالف تھے، مسٹر گوکھلے کی رائے البتہ یہ تھی کہ جو اصلاحات ملک کو ملی ہیں اون پر اعتراض نہ کیا جائے، اور اون اصلاحات کو کامیاب بنا کر انگریزی وزارت اور انگریزی پبلک پر یہ ثابت کر دیا جائے کہ ہندوستانی جو حقوق اون کو دیئے گئے ہیں اون سے زیادہ حقوق کو صحیح طور پر برتنے کی اہلیت رکھتے ہیں، سیاسی معاملات کے علاوہ دو اور مسئلوں پر اس اجلاس میں خاص طور پر بحث کی گئی یعنی اردو زبان کا تحفظ اور اوس کی توسیع، اور علی گڑھ میں مسلم یونیورسٹی قائم کرنے کی تدابیر۔

مجوزہ مسلم یونیورسٹی کے وفد ۱۹۱۰ء میں

خدا ہز ہائنس آغا خاں کا بھلا کرے جن کے اثر سے مجوزہ مسلم یونیورسٹی کے بہت سے ڈیپوٹیشنوں نے ملک

کا دورہ کیا اور چندہ کی ایک کثیر رقم جمع کی۔ مسلمانوں میں خوش حال لوگوں کی تعداد بہت تھوڑی ہے، لیکن اسلامی روایات کا اثر دیکھئے، جب کبھی کسی اہم تحریک کے لئے قوم کے سامنے دست گدا گری پھیلایا جاتا ہے تو دینے والے اپنی حیثیت کے اعتبار سے نہیں بلکہ اپنے حوصلہ کے موافق چندہ دیتے ہیں۔ تحریک خلافت کے لئے جتنا روپیہ مسلمانوں نے دیا اوس کی نظیر تو اس کے زمانہ میں ملنا فدا مشکل ہے، لیکن بیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی پندرہ برس میں بھی ہماری قوم نے جو چندے دیئے اور جس ہمت سے دیئے وہ آنے والی نسلوں کے لئے قابل تقلید مثال ثابت ہوں گے، سرسید میموریل فنڈ جنگ طرابلس وبلقان، ڈاکٹر انصاری کا طبی مشن، مجوزہ مسلم یونیورسٹی، سانحہ مسجد کانپور، غرض کہ کوئی قومی تحریک ایسی نہیں تھی جس میں مسلمانوں نے اپنی حیثیت سے زیادہ چندہ نہ دیا ہو، چندوں کے بارے میں میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ ہماری کسی قومی تحریک کو محض روپیہ کی کمی کے باعث کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچا، البتہ کام کرنے والوں کی ہماری قوم میں کمی رہی ہے، اور بدقسمتی سے اب بھی ہے، سنہ ۱۹۱۰ء میں مسلم یونیورسٹی کا وفد مرادآباد میں آیا، اس وفد کے قائد سر محمد علی محمد خاں مرحوم راجہ محمودآباد تھے، راجہ صاحب کی خوبیوں کا تذکرہ کسی اور جگہ کیا جائے گا، اس جگہ اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ تنہا ایک شخصیت جس میں اتنی خوبیاں موجود ہوں جتنی راجہ صاحب مرحوم میں جمع تھیں بڑی مشکل سے ملے گی، سیاست، تعلیم، ادب، شعروشاعری، قومی تنظیم، بالمختصر ہماری قومی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو مرحوم ومغفور کا مرہون منت نہ ہو، سچ تو یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی کو وجود میں لانے والی ایک طرف محسن الملک اور وقارالملک کی جدوجہد تھی تو دوسری طرف آغا خاں اور راجہ محمودآباد کی فیاضانہ مالی امداد اور وسیع اثر، اور مالی امداد سے بڑھ کر ان دونوں عالی مرتبت اور بلند پایہ ہستیوں کا ذاتی تکالیف برداشت کرکے قوم کے سامنے بھکاری بن کے آنا اور گورنمنٹ کے شکوک وشبہات کو جن سے ہماری قوم کو بہت بڑا نقصان پہنچ سکتا تھا رفع کرنا، مرادآباد میں بڑا کامیاب جلسہ ہوا، جہاں تک مجھے یاد ہے ہمارے ضلع کی رقم پچیس ہزار روپے سے اوپر تھی، ہم سب نے نہایت گرمجوشی سے ایک دوسرے کی گرہ کاٹی اور دولت مند بزرگوں کی گرہ کٹوائی، میں ڈھائی سو روپے دینا

چاہتا تھا، مگر دوست نہ مانے اور مجھ سے چندہ میں پانچسو روپے لئے، متوسط طبقہ کے مسلمانوں نے بھی دل کھول کر چندے دیئے۔

گوہر جان الہ آباد کی نمائش میں۔ دسمبر ۱۹۱۰ء

مسٹر حسن امام سے عرصہ بعد الہ آباد کی نمائش میں ملاقات ہوئی، پوچھا وقت کیسے کٹتا ہے، میں نے کہا، دن میں کانگریس کے اجلاس کی گرما گرم تقریریں سنتا ہوں، شام کا وقت دوستوں کی ملاقات اور نمائش کی سیر میں گذرتا ہے، رات کو گوہر کا گانا سن کر دل و دماغ تازہ رکھتا ہوں، الہ آباد کی نمائش میں بڑی بڑی عجیب اور نادر چیزیں موجود تھیں، ایسٹ انڈین ریلوے کا وہ انجن موجود تھا، جو ہمارے ملک میں سب سے پہلے ۱۸۵۰ء میں استعمال کیا گیا تھا، ڈھاکہ کی ململ کا پورا تھان تھا جس کا وزن چار تولہ سے زیادہ نہیں تھا، مگر سب سے نرالی، انوکھی اور ہر دل عزیز شے کلکتہ والی گوہر جان تھی، گوہر کے حالات ۱۹۰۶ء میں کلکتہ میں مجھے معلوم ہوئے تھے، اوس وقت امیر و غریب گوہر کے حسن کا دم بھرتے تھے، کلکتہ والوں کو بڑا ناز تھا اور بجا ناز تھا کہ گوہر امان کے شہر کی رہنے والی ہے ۱۹۱۰ء میں حسن ماند ہو گیا، ہو مگر اس عجیب و غریب عورت کے گانے کا آفتاب کمال نصف النہار پر تھا، الہ آباد کی نمائش میں اوس کے لیے بہت بڑا پنڈال بنایا گیا تھا، جس میں پانچ چھ ہزار آدمی بیٹھ سکتے تھے، ایک طرف چھوٹا سا چبوترہ تھا، جسے دولہن کی طرح سجایا تھا، اس چبوترہ ڈائس پر بہار جمان ہوتی اور لوگوں کو مسحور کرتی تھی، ابھی گیت گا رہی ہے، رام کرے کہیں نیناں نہ اُلجھے، ان نین کی بان بُری ہے اُلجھے نینا سلجھائے نہ سلجھے، رام کرے کہیں نیناں نہ اُلجھے، پیت اور پیار، رین اور نین کی یاد دلا کر کسی کو سکھی بنا رہی ہے اور کسی کو دکھی، لوگ مگن ہیں، مزے لوٹ رہے ہیں، گنگا جی کے کنارے جوگن دل لبھا رہی ہے، عجیب سماں بندھا ہے، گیت ختم ہوتے ہی غالب کی غزل شروع کر دی، غالب کا کلام اور گوہر کی تانیں، کچھ لوگ کلام پر عش عش کر رہے ہیں، کچھ گانے کا مزہ لے رہے ہیں، جو دونوں سے ناآشنا ہیں وہ بھی چپکے چپکے اس لئے مصروف داد ہیں کہ نلواتفیت کا پتہ نہ چلے، یہ ہو ہی رہا تھا کہ گوہر

کی نظر پنجابی پگڑیوں پر جا پڑی، بھلا وہ اس لقمۂ تر کو کہیں چھوڑنے والی تھی، غزل ختم ہونے پر پنجابی گیت شروع کر دیا، گیت ۔کن ماردے بنیڑے تین روڑیاں ۔ چندلوں تے چھپ لیسڑ دے ، ترجمہ تم چھت پر مجھ کو کنکریاں مارتے ہو ذرا چاند کو تو چھپ جانے دو، دھڑ ادھڑ ٹپے اور ڈھال گیت میں آرہے ہیں، لکھنؤ کے نازک مزاج حضرات کانوں میں انگلیاں دے رہے ہیں، مگر گوہر کی ٹپے زندہ دلانِ پنجاب کے دلوں پر خنجر چلا رہی ہے ،اور اس کی ڈال کے آگے ہر بلند قامت پنجابی جوان کی کمر خمیدہ ہے ایک گیت ایسا گائی کہ ہیر اور رانجھے کے حسن و عشق کی جیتی جاگتی تصویر سب کی آنکھوں میں پھر گئی۔ سرحدی صوبہ کے کلاہ و لنگی والے اصحاب اور ہینگ بیچنے والے خان بھی موجود تھے ۔ملک کے صدھا فارسی دانوں کی چشم شوق گوہر کے چہرہ پر لگی ہوئی تھی، لیجئے سرحد والوں، خانوں اور ملک ہند کے صاحبان ذوق کی باری آگئی ، گوہر نے ترچھی نظروں سے ان حضرات کو دیکھا ، اور فارسی غزل گانا شروع کر دی، از پنجۂ من چاک گریباں گلہ دارد، سیدھے سروں میں اس لئے گا رہی ہے کہ الفاظ صاف طور پر سمجھ میں آئیں ، مگر جہاں تان لیتی ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قریب میں کہیں بجلی گری ، اس کے بعد امیر حبیب اللہ خاں کی تعریف میں اپنی تصنیف کردہ فارسی غزل شروع کر دی ، امیر افغانستان تین برس پہلے ہندوستان کا دورہ کر کے اہل ہند کو اپنا گرویدہ بنا چکے تھے ، کچھ کی غرض امیر سے عقیدت تھی، کچھ فارسی کلام سے متأثر تھے ، کچھ پر گانے کا جادو چل گیا تھا، غرض کہ لوگ جھوم رہے ہیں، سر ہل رہے ہیں، ہر شخص کا یہ حال ہے کہ مصرعہ ۔ میں کس کی لوں خبر مجھے اپنی خبر نہیں کہ یکایک گوہر کو کلکتہ یاد آیا، بنگالی چیزا اپنی شروع کر دی ، اب کیا تھا جدھر دیکھئے چپ ہی چپ ہے ، بنگالی حضرات کی باچھیں کھل رہی ہیں ، صرف یہی نہیں کہ چٹرجی ، چودھری، چٹر دیدی ، چٹو پادھیا چکرورتی اور ان کے بھائی بند بنگالی چیز کے چبھتے بول سے لطف اندوز ہو رہے ہیں باقی مجمع بھی چپ چاپ سن رہا ہے ، نہ چوں چرا ہے ، نہ چہ می گوئیاں ہیں، ہر شخص چاہتا ہے کہ گانے کا سے شعر دور چلے دور چلے ساقیا ؛ اور چلے اور چلے ساقیا ۔ اس سے فراغت ہوئی تو صوبجات متوسط دسی پی، کا نمبر آیا ، مرہٹی گیت کے بھالوں کے وار ڈاس سے چلنے لگے ، یہ میدان طے کر کے گوہر گجراتی راگ

میں داخل ہوئی، گجراتی بڑی پیاری زبان ہے، یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ اوس کے گل بوٹے مجمع کے سامنے نہ پیش کئے جائیں، انگریزی زبان حکومت کی زبان ہے، الہ آباد میں یہ بھی مشہور تھا کہ گوہر کے قدردان بعض جلیل القدر انگریز بھی ہیں، مجمع میں سولہ آنے سے لے کر دو آنے تک گوری رنگت کے انگریزوں، نیم انگریزوں اور انگریز نما غیر انگریزوں کا خاصا مجمع موجود تھا، اون کی تفنن طبع کے لئے I ame a good Bangali Babu Come from Calcutta گا کر اونھیں خوش کیا، گوہر کی موسیقی کے تیر بے پناہ تھے، بقول سوداؔ، شعر

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانہ میں

گانا ختم ہوا تو کسی کا جی گھر جانے کو نہ چاہتا تھا، یہی حسرت تھی کہ یہ محفل ابھی اور چلتی، سچ تو یہ ہے کہ کمال کمال ہی ہے، چاہے جس رنگ میں ہو، عصمت فروشی ہمارے ملک میں سب سے بڑا اخلاقی عیب ہے، اس کے باوجود عصمت فروش گانے والیوں کی ہمارے ملک نے جو قدر کی اوس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم میں اور جو کچھ کمزوریاں ہوں، مگر کمال کی ناقدری کا الزام ہمارے ملک پر عائد نہیں کیا جا سکتا، والیان ملک میں نواب حامد علی خاں مرحوم اور شاعروں میں مولوی اکبر حسین مرحوم اکبر الہ آبادی کو اپنے زمانہ کے صاحبان کمال میں ممتاز مرتبہ حاصل تھا، استعداد علمی اور جامعیت کے علاوہ دونوں حضرات بڑا مذاق سلیم رکھتے تھے، اور ہنر کے سچے قدردان تھے، گوہر جان اکثر رام پور حاضر ہوتی تھی، اور بوقت ضرورت نواب صاحب اوس کی مدد فرماتے تھے، گوہر کے کمال کے باعث ملک نے اوسے سونے چاندی میں تولا، دولت کی کمی نہ تھی مگر شوقین مزاج پایا تھا، طرح دار نوجوان دوستوں کی تعداد زیادہ تھی، اندھا دھند خرچ کرتی تھی جس کے باعث بعض اوقات زیور تک رہن رکھنے کی ضرورت پڑجاتی تھی، اکبر مرحوم باوجود مذہبی آدمی اور پابند صوم وصلوٰة ہونے کے بڑی شوخ طبیعت رکھتے تھے، شاید ہی کوئی معاشرتی، اخلاقی اور سیاسی مسئلہ بچا ہوگا جس پر موقع محل سے موصوف نے طبع آزمائی نہ کی ہو، وہ چبھتے الفاظ میں

انوکھے خیالات کو نظم کرنے کے ساتھ ساتھ حقیقت نگاری کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے تھے، گوہر کے بارہ میں فرماتے ہیں۔ شعر

خوش نصیب آج بھلا کون ہے گوہر کے سوا　　　سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

اخیر مرتبہ میں نے اس باکمال عورت کا گانا پندرہ سولہ سال ہوئے موجودہ راجہ صاحب محمود آباد کی محفل شادی میں سنا تھا، مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں مرحوم نے بیٹے کا بیاہ بڑی دھوم دھام سے رچایا تھا، سارا انتظام ویسا ہی تھا جیسا اونچے درجہ کے حوصلہ مند والیانِ ملک ایسے موقعوں پر کرتے ہیں، محمود آباد میں بڑی اچھی محفل ہوئی تھی جس میں ملک کی چوٹی کی گانے والیاں موجود تھیں، گوہر کی حریف کلکتہ والی نورجہاں تھی، نورجہاں کے حسن کی ضیا پاشی اور گوہر کے کمال موسیقی کی آب و تاب نے محفل کو جگمگا دیا تھا، دونوں نے اپنے اپنے کمال دکھلائے، گائیں اور خوب گائیں سن و سال اور حسن و جمال میں نورجہاں کا پلہ بھاری تھا، خوش گلوئی میں بھی اوس کو گوہر پر ترجیح تھی، فن موسیقی[1] کا اکتساب بھی اوس نے بڑی ریاضت سے کیا تھا، مگر گوہر کچھ اس انداز سے گائی کہ ساری محفل پر چھا گئی، موسیقی کے ماہروں کی رائے جو کچھ بھی ہو لیکن محفل سے جو خراج تحسین گوہر نے حاصل کیا وہ نورجہاں کو نہ ملا اور سچ تو یہ ہے کہ گوہر نے اوس موقع پر ثابت کر دیا کہ اوس کا کمال اور شراب کہنہ دونوں ایک خاصیت رکھتے ہیں۔

ایجوکیشنل کانفرنس ناگپور میں ۲۷ دسمبر ۱۹۱۰ء کو میں الہ آباد سے ناگپور روانہ ہوا۔ ناگپور میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس مسٹر عبداللہ یوسف علی آئی سی ایس کی صدارت میں تھا، میرے ساتھ مولوی محمد یعقوب بھی تھے۔ جبلپور ہو کر راستہ تھا، مگر جبلپور اور ناگپور کے درمیان سیدھی ریل نہ جاتی تھی بلکہ بیچ میں ریل بدلنا پڑتی تھی اور ریل کی رفتار بھی مدھی تھی، مسٹر محمد علی نے اُسی زمانہ میں کلکتہ سے اپنا مشہور اخبار کامریڈ نکالنا شروع کیا تھا۔ وہ بھی جبلپور سے ہمارے شریک سفر ہو گئے اور اُن کی خوش طبعی کے باعث

---

[1] عباسیوں کے عہد میں موسیقی بھی علم ہندسہ، علم عدد، نجوم، جبر و مقابلہ، جر ثقیل وغیرہ کی طرح ریاضی کی ایک شاخ سمجھی جاتی تھی۔

یہ سفر لطف سے کٹا۔ ریل جبلپور سے ہی دیر سے روانہ ہوئی تھی اور جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اور
لیٹ ہوتی گئی۔ جوں توں کر کے دوسرے دن شام کے وقت ہم سب ناگپور پہنچے۔ دسمبر کے آخر
میں ناگپور کا موسم ایسا تھا جیسا دہلی میں مارچ کا دوسرا ہفتہ ہوتا ہے۔ کانفرنس کے اجلاس میں
ہم سب شریک ہوئے مسٹر عبداللہ یوسف علی کا خطبہ صدارت پُرمغز تھا اور اُس میں علمی شان
بھی موجود تھی۔ سر رجنالڈ کریڈک جو اُس زمانہ میں ممالک متوسط کے چیف کمشنر تھے مسلمانوں کی ہمت
افزائی کے لئے اجلاس کانفرنس میں تشریف لائے تھے، خشک مزاج آدمی تھے اور اس زمانہ میں
انڈین سول سروس کے انگریز بالعموم سر رجنالڈ کریڈک کو اپنے لئے قابل تقلید نمونہ سمجھتے تھے۔ یہ
وہی سر رجنالڈ کریڈک ہیں جو بعد کو وائسرائے کی ایگزیکٹیو کونسل کے ہوم ممبر مقرر ہوئے موصوف نے
کونسل میں آکر جو اُدھم مچایا اُس سے ملک کے سیاسی حلقے ناواقف نہیں ہیں موصوف کی طبیعت
میں لچک ذرا بھی نہ تھی کڑی کمان کے تیر تھے اگر تقریریں تیر ہوتی تھیں تو انداز بیان کا سوفار
اُنہیں اور زیادہ تکلیف دہ بنا دیتا تھا۔

یکم جنوری ۱۹۱۱ء کی ہندو مسلم کانفرنس

کانفرنس کا اجلاس جلد جلد ختم کیا گیا۔ ہز ہائی نس آغا خان بھی اجلاس میں شریک تھے اُن کو اُس
زمانہ میں بڑی فکر تھی کہ کسی طرح ہندو مسلمانوں میں اتفاق قائم ہو۔ آج برادران وطن کہتے ہیں کہ
مسلمان ہندوؤں سے میل ملاپ کی پرواہ نہیں کرتے۔ میں ملک کی توجہ اُس جدوجہد کی طرف دلانا
چاہتا ہوں جو ہز ہائی نس آغا خان نے برابر عرصہ تک جاری رکھی۔ اصلیت یہ ہے کہ بعض مقتدر
مسلمان لیڈروں کو اس زمانہ میں یہ غلط خیال پیدا ہو گیا تھا کہ کونسلوں میں نیابت جداگانہ کے
حاصل ہو جانے سے مسلمانوں کے حقوق کا کافی تحفظ ہو گیا ہے لہذا وہ چاہتے تھے کہ بقیہ ملکی مسائل میں
ہماری قوم کانگریس اور ہندو بھائیوں کے ساتھ اشتراک عمل میں پیش قدمی کرے۔
پنڈت مدن موہن مالوی ہندو قومیت کے سب سے بڑے دیوتا سمجھے جاتے تھے۔ پنڈت صاحب
اُردو کے بڑے اچھے مقرر ہیں مگر ہندوستان کی خوبی قسمت دیکھئے۔ ابتداء زمانہ سے پنڈت صاحب کی

کوشش یہ رہی ہے کہ ہمارے صوبہ میں اُردو کی بجائے ہندی پھیل جائے۔ کانگریسی لیڈروں میں دو صاحب ایسے تھے جن کی دلی خواہش تھی کہ ہندو مسلمانوں میں مستقل سمجھوتہ ہوجائے۔ ایک مسٹر دادابھائی نوروجی اور دوسرے مسٹر گوکھلے۔ بوڑھاپے کے باعث مسٹر دادابھائی اس قدر کمزور ہوگئے تھے کہ سیاسی جلسوں کی شرکت انھوں نے ترک کردی تھی۔ مسٹر گوکھلے نے البتہ اپنے کو سیاسیات کے لئے وقف کر رکھا تھا لیکن اُردو ہندی کے مسئلہ کا تعلق زیادہ تر شمالی ہند سے تھا۔ شمالی ہند کے لیڈر پنڈت مدن موہن مالوی تھے جو ہندی کو رواج دینے کی تحریک کے روحِ رواں تھے اس مسئلہ کے ساتھ محض روزمرّہ کی بول چال کا معاملہ وابستہ نہ تھا بلکہ مسلمانوں کو ہمیشہ سے اس بات کا یقین رہا ہے کہ اُن کا مذہب، تہذیب، شائستگی، روایات اور اُن کی تمام تر قومی زندگی اُردو زبان کے ساتھ وابستہ ہے۔ آغا خان چاہتے تھے کہ زبان کے معاملہ میں ہندو بھائیوں سے کوئی تصفیہ ہوجائے تاکہ آئے دن کی بدمزگی رفع ہوسکے۔ چند اور مسائل بھی تھے جن کا تصفیہ ہوجانے سے ملک متحدہ ہندوستانی قومیت کی منزل مقصود پر پہنچ سکتا تھا۔ میرے نزدیک کسی ہندوستانی لیڈر نے ہندو مسلم نزاعات کی گتھی کے سلجھانے میں اُس فراخ دلی اور بلند نظری سے کام نہیں لیا جیسا آغا خان نے۔ موصوف سربرآوردہ مسلمانوں کی ایک اسپیشل ٹرین بھر کر ناگپور سے الہ آباد لائے اور یکم جنوری ۱۹۱۱ء کو الہ آباد میں ہندو مسلمان لیڈروں کی کانفرنس شروع ہوئی۔ اگر یہ کانفرنس اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتی تو ہندوستان کا آئندہ مورخ ہندو مسلم تعلقات کا ایک زرّیں باب لکھ سکتا۔ مگر ہمارے بدقسمت ملک کی تو عرصہ دراز سے یہ حالت رہی ہے کہ۔ قطعہ۔ ہر بلائے کز آسماں آید۔ گرچہ بر دیگراں قضا باشد۔ از فلک تا رسید می پُرسد۔ خانہ الوزی کجا باشد ؛ افسوس ہے کہ کانفرنس کی جدوجہد کا عملی نتیجہ ناقابل اطمینان رہا جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اُردو ہندی کے مسئلہ کا کوئی معقول فیصلہ نہ ہوسکا۔

کونسل کا انتخاب ۱۹۱۲ء میں مسٹر مارلے کے زمانہ میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی جو ترمیم ہوئی اور جو قواعد اس ترمیم کے ماتحت بنے اُس کی رو سے صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کی

کونسل میں سب سینتالیس ممبر علاوہ پریسیڈنٹ کے تھے۔ سترہ ممبروں کا انتخاب ہوتا تھا اور تیس ممبروں کو لفٹنٹ گورنر نامزد کرتے تھے۔ منجملہ ان سترہ کے چار ممبروں کے انتخاب کا حق اسلامی حلقہ ہائے انتخاب کو دیا گیا تھا۔ ۱۹۰۹ء میں پہلا انتخاب ہوا۔

۱۹۱۲ء میں جب دوبارہ انتخاب کا زمانہ قریب آیا تو روہیلکھنڈ اور کمایوں کے حلقہ انتخاب سے میرے اُمیدوار ہونے کا اعلان دوستوں نے کیا میری تائید میں بزرگوں اور دوستوں نے بہت سے مضامین لکھے اور خطوط جاری کئے جن میں سب سے زیادہ قابل قدر اور میرے لئے موجب عزت وہ خط تھا جو نواب وقار الملک مرحوم نے رائے دہندہ حضرات کے نام بھیجکر اُن کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنا پرچہ میرے حق میں ڈالیں، میں اُس زمانہ میں دیوانی کے ایک بڑے مقدمہ میں کام کر رہا تھا جس میں فریق ثانی کی طرف سے پیروی کرنے کے لئے پنڈت موتی لال نہرو مرحوم الہ آباد سے بلائے گئے تھے۔ مقدمہ سے فارغ ہو کر میں نے حلقہ انتخاب کا دورہ شروع کیا جو تجربے اس دورہ میں حاصل ہوئے وہ بیش قیمت اور عجیب و غریب تھے، خان بہادر شیخ عبد الحق مرحوم رئیس پیلی بھیت نے میرے مدمقابل مولوی ریاض الدین وکیل بدایوں کو ووٹ دینے کا نہ صرف وعدہ کیا تھا بلکہ اُن کی تائید میں ایک خط بھی جاری کر چکے تھے۔ جب میں معہ مولوی محمد یعقوب مرحوم، مسٹر مسعود الحسن مرحوم اور مولوی ابن علی مرحوم ایڈیٹر نیر اعظم کے پیلی بھیت جا کر اُن کا مہمان ہوا تو شیخ صاحب نے ہمارا بیان سُننے کے بعد اعلان کیا کہ وہ انتخاب میں میرا ساتھ دیں گے، اور پوری کوشش کریں گے۔ خدا بخشے شیخ صاحب بات کے پکے اور بڑے کھرے مسلمان تھے۔ ۴ نومبر ۱۹۱۲ء کو حلقہ انتخاب کے ہر ضلع میں پرچہ اندازی ہوئی تھی میری طرف سے ایک دوست ایجنٹ ہو کر پیلی بھیت گئے تھے شام کے وقت شیخ صاحب نے میرے ایجنٹ سے اپنے بیٹے زماں کے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہا کہ بھائی میں نے پہلے بے شک مولوی ریاض الدین کو ووٹ دینے کا وعدہ کیا تھا مگر سید رضا علی سے ملاقات کے بعد میں نے برابر اُن کا ساتھ دیا ہے اور اس لڑکے کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آج ووٹ بھی میں نے انہیں کو دیا ہے۔ شاہجہاں پور کے کلکٹر مسٹر شیرنگ اور تحصیلدار مسٹر نجم الدین احمد جعفری تھے

جعفری صاحب سے میرے الہ آباد کے مراسم تھے مگر شیرنگ صاحب مولوی ریاض الدین کے طرفدار تھے کلکٹر کی ہاں میں ہاں ملانا تحصیلدار کا فرض تھا اس لئے مسٹر جعفری ناطرفدار نہ رہ سکے اور اُن کے اثر سے میرے مدمقابل نے فائدہ اُٹھایا۔ بریلی میں میرے بڑے سرگرم کام کرنے والے مولوی عبدالودود صاحب مرحوم تھے، عربی فارسی کی استعداد نہایت معقول تھی اور بڑے اچھے انشا پرداز تھے۔ انگریزی تعلیم سے ناآشنا ہونے کے باوجود مذہبی معاملات میں بڑے رواداراور بلند خیال تھے۔ انتخاب کے زمانہ میں میں اور میرے دوست بریلی میں مولوی عبدالودود کے مہمان ہوتے تھے۔ اُن کے مذہبی عقائد اہلحدیث سے ملتے جلتے تھے، انتخاب میں جن جن ترکیبوں سے کام لیا جاتا ہے اُس کا ایک قصہ شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو۔ میرے تین رائے دہندہ صدر میں رہتے تھے اُس زمانہ میں ہندوستانیوں کی فوجی ترقی وائسرائے کے کمیشن تک محدود تھی، یہ تینوں رائے دہندے عرصہ تک فوج میں ملازم رہے ایک صاحب جمعدار تھے باقی دو کے عہدوں کا اس وقت خیال نہیں رہا۔ انتخاب سے ایک دو سال پہلے پنشن لے چکے تھے اور اپنے وطن بریلی میں رہا کرتے تھے۔ ایک دن یہ تینوں حضرات جو اہل حدیث تھے مولوی عبدالودود کے پاس پہنچے اور کہنے لگے مولوی صاحب ہم نے تو آپ کے فرمانے کی بموجب سیّد رضا علی کو ووٹ دینے کا ارادہ کرلیا تھا مگر سنا ہے وہ مذہب کے معاملہ میں ڈھل مل یقین ہیں پکے مسلمان نہیں ہیں۔ یہ سُننا تھا کہ مولوی عبدالودود کے چہرے پر برہمی کے آثار نمایاں ہو گئے نہایت طیش میں آکر بولے "جس شخص نے تم سے یہ باتیں بیان کی ہیں وہ خود غرض آدمی ہے اور اپنا کام نکالنا چاہتا ہے۔ سیّد رضا علی جب کبھی بریلی آتے ہیں میرے یہاں ٹھہرتے ہیں فرشتہ صفت آدمی ہیں میں اُن کا حال تم سے کیا بیان کروں اُن کا ظاہر درست نہیں ہے مگر باطن کا یہ حال ہے کہ جب لوگ سو جاتے ہیں تو رات میں چُپ چاپ اُٹھ کر تہجد کی نماز اس طرح پڑھتے ہیں کہ کسی کو خبر نہ ہو۔" کاش میرے عزیز دوست نے مجھ گنہگار کے بارے میں جو رائے ظاہر کی تھی وہ صحیح ہوتی اس تہدید کا نتیجہ یہ ہوا کہ تینوں رائے دہندوں نے اپنا پرچہ میرے حق میں ڈالا۔ بدایوں مولوی ریاض الدین کا وطن ہے وہاں میرے سب سے بڑے مددگار خان بہادر اشفاق حسن خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر تھے، فریق ثانی نے اُن کی

شکایتیں مسٹر مینا وتی کلکٹر سے کیں لیکن اشفاق حسن خاں صاحب میں وضعداری اور مستقل مزاجی کے وہی اوصاف موجود تھے جو ہمیشہ ہمارے افغان بھائیوں کے طرۂ امتیاز رہے ہیں۔ انہوں نے مسٹر مینا وتی سے صاف کہہ دیا کہ میں سید رضا علی کی مدد کے لئے کوئی بے جا کارروائی نہ کروں گا مگر جائز مدد کرنے سے باز نہ آؤں گا۔ وجیہ اللہ خاں صاحب جو مرادآباد کے مشہور نواب خاندان کے رکن ہیں اُس زمانہ میں بدایوں میں تحصیلدار تھے انہوں نے بھی مجھے قابل قدر مدد دی مگر بھائی وجیہ اللہ خاں کا طریق عمل ایسا نادر اور خاموش تھا کہ کسی کو لب کشائی کا موقع نہ ملا۔ بدایوں کا ایک اور واقعہ بھی قابل تذکرہ ہے:- میں سلسلۂ انتخاب میں بدایوں گیا تھا اور حسب معمول اشفاق حسن خاں صاحب کا مہمان تھا دوسرے روز انجمن ادب اُردو کا جلسہ ہونے والا تھا محمد سلیمان صاحب نے جو میرے مددگار تھے مجھے اطلاع کی میں وقت مقررہ پر جلسہ میں پہنچا غالباً لوگوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ میں تقریر کرنے والا ہوں لوگ جلسہ میں بڑی کثرت سے شریک تھے میں نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھا اور اُردو کی ادبی حیثیت پر تقریر کرنے کھڑا ہو گیا یہ تو یاد نہیں رہا کہ دوران تقریر میں کیا کیا کہا تھا مگر اہل بدایوں نے ابتدا ہی سے اُردو ادب کی جو خدمت کی ہے اُس کا تذکرہ کرتے ہوئے میں نے یہ شعر پڑھا تھا:

بیا در یدگر ایں جا بود زباں دانے ✽ غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد۔

ترجمہ معہ مطلب اگر اس جگہ کوئی منہ میں زبان رکھنے والا اور اُردو ادب کا جاننے والا ہو تو سامنے آئے مجھ مسافر کو آج کچھ کہنا ہے۔ بدایوں والوں کی منصف مزاجی دیکھئے میری تقریر اور بالخصوص اس شعر کی بہت داد ملی۔ اگر کتاب میں گنجائش ہوتی تو انتخاب کے اور واقعات بھی لکھتا حلقۂ انتخاب میں کل رائے دہندوں کی تعداد دو سو کے قریب تھی جن میں سے ڈیڑھ سو نے تاریخ انتخاب پر پرچے ڈالے تھے ۲۴ نومبر ۱۹۱۲ء کو کمشنر بریلی نے جو مہتمم انتخاب تھے پرچے شمار کئے اور چالیس ووٹوں کی بیشی سے میرے انتخاب کا اعلان کیا۔ ہمارے ملک میں انتخاب سے امیدواروں اور اُن کے حامیوں کے باہم رنجشیں پیدا ہو جاتی ہیں اور بعض اوقات عرصہ تک قائم رہتی ہیں، مجھے مسرت ہے کہ میرے اور مولوی ریاض الدین کے تعلقات میں انتخاب کی وجہ سے کوئی خرابی نہیں ہوئی بلکہ موصوف نے

میرے ساتھ یہاں تک ستانہ اور برادرانہ برتاؤ کیا کہ کچھ عرصہ بعد معقول فیس کا ایک مقدمہ میرے پاس بھیجا۔ انتخاب کی مہم پر میرا تخمیناً دو ہزار روپیہ خرچ ہوا مگر اسی کے ساتھ روہیلکھنڈ کے سب ضلعوں میں بہ سلسلۂ مقدمات آنا جانا شروع ہو گیا اور میری ماہواری آمدنی پہلے سے ڈیوڑھی ہو گئی۔ روہیلکھنڈ کے احباب کا شکریہ میں نے اس طرح ادا کیا کہ انتخاب کے بعد مجھے روہیلکھنڈ کے جس ضلع میں کسی مقدمہ کی پیروی میں جانے کا اتفاق ہوا اُس موکل سے میں نے فیس نہیں لی۔

بابو بیجناتھ داس کی بے تعصبی بریلی کا ایک واقعہ قابل تذکرہ ہے، بریلی میں ہندو مسلمانوں کے درمیان ایک مکان کے متعلق جو ناف شہر میں کتب خانہ سے کوئی دو سو قدم کے فاصلے پر اُس سڑک پر واقع تھا جو کتب خانہ سے شمال کی طرف جاتی ہے تنازعہ تھا مسلمانوں کا بیان تھا کہ مکان مذکور میں جو ایک مسجد کے قریب تھا مشہور بزرگوں کی پختہ قبریں واقع ہیں اور یہ ساری جائداد وقف ہے۔ فریق ثانی ایک ہندو تھا جو کہتا تھا کہ وہ مکان مذکور کا عرصۂ دراز سے مالک اور اُس پر قابض ہے۔ ممکن ہے مکان مذکور کے کسی حصہ میں پختہ قبریں ہوں مگر قبروں کی موجودگی سے اُس جائداد کا وقف ہونا لازم نہیں آتا۔ مقدمہ بابو بیجناتھ داس کی عدالت میں دائر تھا اور موجودہ زمانہ میں ہندو مسلمانوں کے تعلقات میں جو ناخوش گواری پیدا ہو گئی ہے اُس کے لحاظ سے بابو بیجناتھ داس نے اس مقدمہ کا فیصلہ جس طرح کیا اُس کا تذکرہ کرنا میں مناسب سمجھتا ہوں۔ میں نے اجلاس مذکور میں مسلمانوں کی طرف سے تین دن تک مقدمہ کی پیروی کی۔ جانبین کے گواہوں کی فہرست طولانی تھی اور خیال تھا کہ مقدمہ کئی دن اور چلے گا۔ تیسرے دن بابو بیجناتھ داس نے ہندو فریق کے وکیلوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ جو بے چینی شہر میں پیدا ہو گئی ہے اُس کے لحاظ سے مناسب ہے کہ مقدمہ میں فریقین باہمی تصفیہ کر لیں۔ عدالت کی اس رائے سے دونوں فریق متاثر ہوئے مسلمانوں کی طرف سے مقدمہ میں زیادہ قوت نہ تھی اس لئے تصفیہ کا دار و مدار زیادہ تر ہندو فریق کی مرضی پر تھا۔ کسی مقدمہ میں عدالت کی رائے کے اظہار سے فریقین پر

اثر پڑتا ہے بالخصوص جب وہ رائے خلوص پر مبنی اور بے لاگ ہو۔ بالآخر اس مقدمہ کا تصفیہ ان شرائط پر ہو گیا کہ مسلمان ایک سال کے اندر بیس ہزار روپیہ (ممکن ہے رقم کی تعداد پچیس ہزار ہو) ہندو فریق کو ادا کر دیں اور ہندو فریق جائداد مذکورہ پر مسلمانوں کو متولیانہ قابض کرادے۔[۱] بریلی کے معزز اور معقول پسند ہندو مسلمانوں نے اس تصفیہ کو قابل اطمینان سمجھا۔ جب میں مراد آباد روانہ ہونے لگا تو مولوی عبدالودود صاحب نے پانسو روپیہ کی رقم میرے سامنے لا کر رکھی اور کہا کہ یہ آپ کی تین دن کی فیس ہے۔ میں نے رقم مذکور یہ کہہ کر مولوی صاحب کو واپس کر دی کہ مسلمانان بریلی کو ایک بڑی رقم کا چندہ کرنا ہوگا میں چاہتا ہوں کہ اس چندہ کی ابتدا اس پانسو روپیہ کی رقم سے ہو۔ میرے ہدیہ کو مولوی صاحب نے شکریہ کے ساتھ منظور کر لیا۔ اس واقعہ کے چند سال بعد مجھے بابو بیجناتھ داس کے اجلاس میں جب وہ کانپور میں سب جج تھے ایک اور مقدمہ میں پیروی کرنے کا اتفاق ہوا۔ اُس مقدمہ میں بھی نزاع ہندو مسلمانوں کے درمیان تھی اور نقض امن کا اندیشہ تھا۔ میرے موکل مسلمان تھے، بابو صاحب نے اُس مقدمہ کا فیصلہ بھی فریقین کی باہمی رضامندی کے ذریعہ سے کرایا اور حکم لکھتے وقت مجھ سے کہا کہ مجھے بڑی مسرت ہے کہ جن دو مقدمات میں آپ بہ حیثیت وکیل میری عدالت میں آئے وہ دونوں باہمی تصفیہ کے ذریعہ سے طے ہو گئے۔ بابو صاحب کی مثال ہمارے ہندو اور مسلمان دیوانی کے حکام کے لئے قابل تقلید ہے۔

میرے تجربہ کا بہترین انگریز کلکٹر میں انگریز عہدہ داروں سے صرف بقدر ضرورت ملتا تھا مگر کونسل کا ممبر منتخب ہونے کے بعد میری ذمہ داریاں بہت بڑھ گئیں۔ حکام سے جن لوگوں کو کام یا اُن کے خلاف شکایتیں ہوتی تھیں وہ میرے پاس آتے تھے عوام کے نمائندہ کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ اُنکی شکایتیں سُنے اور جہاں تک ہو سکے اُن کی مدد کرے۔ ضلع کے بڑے حاکم یعنی کلکٹر، جج، کپتان پولیس

---

[۱] مسلمانوں نے چندہ کر کے رقم معینہ ادا کر دی اب وہ اس اراضی پر قابض ہیں اور بہت اچھی عمارت بنالی ہے۔ یہ نیک کام خدا مغفرت کرے مولوی عبدالودود کی اَن تھک کوشش سے انجام پایا۔

اور سول سرجن اُس زمانہ میں سب انگریز ہوتے تھے۔ جب میرا انتخاب ہوا ہے مراد آباد کے کلکٹر مسٹر ڈبلو۔ جے۔ ای۔ لیپٹن تھے جو کئی سال تک ہمارے ضلع کے کلکٹر رہے۔ مسٹر لیپٹن اُن انگریزوں میں تھے جو ہندوستانیوں سے خوش گوار تعلقات رکھنا اور باا ثر ہندوستانیوں کی عزت کرنا اپنا فرض اور سلطنت برطانیہ کے لئے مُفید سمجھتے تھے۔ تقسیم بنگالہ کی منسوخی اور دار الحکومت کے کلکتہ سے دہلی منتقل ہو جانے سے بنگالیوں کی شورش قریب قریب ختم ہو گئی تھی تاہم دوراندیش انگریزوں کو اُس شورش سے یقین ہو گیا تھا کہ ملک ہند پر انگلستان کا تسلّط قائم رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہندوستانیوں کی جائز شکایتیں رفع کی جائیں اور انہیں قانع بنانے کی کوشش کی جائے۔ مسٹر لیپٹن کو ہندوستانیوں سے ایسی ہمدردی تھی جس کی مثال اس زمانہ کے انڈین سول سروس کے انگریز عہدہ داروں میں میں نے بہت کم پائی۔ بابو برج نندن پرشاد صاحب تین سال پہلے سے کونسل کے منتخب شدہ ممبر تھے اور ۱۹۱۲ء میں اُن کا دوبارہ انتخاب ممبری پر ہوا تھا۔ پنڈت بنارسی پرشاد صاحب مصر اور اُن کے والد نے ہم دونوں کے اعزاز میں بمقام سنبھل ایک ایٹ ہوم دیا جس میں مراد آباد کے بہت سے سربرآوردہ حضرات اور حکام کو مدعو کیا تھا اس ایٹ ہوم کی شرکت کے لئے مسٹر لیپٹن مراد آباد سے سنبھل گئے تھے چند مہینے بعد مسٹر لیپٹن کے اجلاس میں مجھے مال کے ایک اپیل کی پیروی کے لئے جانے کا اتفاق ہوا موصوف دورہ میں تھے میں اجلاس کے ڈیرہ میں پہونچا مجھے دیکھ کر انہوں نے اجلاس ملتوی کر دیا مجھے اپنے نجی کے ڈیرہ میں لے گئے اور کہا کہ لنچ میرے ساتھ کھائیے۔ آپکے اپیل کی سماعت میں لنچ کے بعد کروں گا۔ جب لنچ کا وقت آیا تو مجھ سے کہا کہ آپ کو ہاتھ منھ دھونے کی ضرورت ہو تو غسلخانہ موجود ہے اور مجھے اپنے ساتھ غسل خانہ لے گئے وہاں دیکھا تو جگ میں پانی نہ تھا۔ بیرا کو آواز دی مگر اتفاق سے وہ اس وقت موجود نہ تھا مسٹر لیپٹن خود جگ اٹھا کر اُس میں پانی لائے اور اپنے ہاتھ سے جگ کا پانی طشت میں اُنڈیلا تاکہ مجھے کوئی زحمت برداشت نہ کرنی پڑے۔ میں نے مُنھ دھویا مسٹر لیپٹن اور اُن کی میم کے ساتھ لنچ کھایا، اپیل میں بحث کی اور مقدمہ

جیت کر شام کی ٹرین سے مراد آباد واپس چلا آیا۔ یہ وہی مراد آباد تھا جہاں تین ساڑھے تین برس پہلے مسٹر کٹ نے مسٹر اسپیرس کو اور مجھ کو چپراسی کی معرفت چائے پینے کا پیغام بھیجا تھا جس کا تذکرہ میں نے اس کتاب کے صفحہ ۲۸۳ پر کیا ہے۔ اس قصہ سے ذاتی حیثیت کا اظہار مقصود نہیں ہے بلکہ یہ بتانا مدِنظر ہے کہ اُس زمانہ میں بھی انڈین سول سروس میں بعض ایسے شریف انگریز موجود تھے جن کو ہندوستانیوں کے ساتھ برابری کا برتاؤ کرنے میں کوئی تامّل نہ تھا۔ یوں تو سر جان اسٹریچی اور سر جیمس مسٹن ابتدائے ملازمت میں مراد آباد میں رہ چکے تھے مگر لپٹن جیسا شریف انگریز غالباً ضلع کو نصیب نہیں ہوا۔ ہندوستانیوں کے ہر دل عزیز کلب کا نام لپٹن کلب ان ہی کے نام پر رکھا گیا۔ مچھلی شہر کانپور کی مسجد کی شورش کے زمانہ میں مسٹر لپٹن سے میرا جھگڑا بھی ہوا مگر اس مسئلہ کے تصفیہ کے بعد پھر دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے۔ افسوس ہے کہ مسٹر لپٹن جیسا ہمدرد انگریز حکومت کی بے اعتنائی کے باعث مستعفی ہو کر انگلستان چلا گیا۔ بعض ناواقف حضرات کا خیال ہے کہ مسٹر لپٹن کے استعفا دینے کی وجہ یہ تھی کہ وہ ۱۹۱۹ء کی سیاسی اصلاحات سے ناراض تھے، یہ خیال قطعی غلط ہے۔ استعفا دینے کی اصل وجہ یہ تھی کہ سر کورٹ بٹلر کی لفٹننٹ گورنری کے زمانہ میں مسٹر کین[1] چیف سکرٹری نے اُن کا تقرر ایک ضلع کی کلکٹری پر کیا تھا۔ مسٹر لپٹن وہاں جانا نہیں چاہتے تھے انہوں نے مسٹر کین سے کہا مگر جب مسٹر کین نے تقرر کے حکم میں تبدیلی کرنے سے انکار کیا تو بطور احتجاج مسٹر لپٹن نے استعفا دیدیا۔

نئے دور کا پس منظر | سر انٹانی میکڈانل کے عہد میں ہندی کے رزولیوشن مورخہ ۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ مسلم لیگ کے قیام کے باعث مسلمانوں کی تنظیم کی تھوڑی بہت ابتدا ہو گئی تھی مگر حالت یہ تھی کہ جس جس ضلع میں لیگ قائم ہوتی تھی وہاں کے کلکٹر سے مل کر ضروری حالات بیان کرنا مقتدر مسلمان اس لئے مناسب سمجھتے تھے کہ حاکم ضلع کی مخالفت سے مسلمانوں کو

---

[1] مسٹر کین بعد کو یو۔ پی کونسل کے پریسیڈنٹ اور بورڈ آف ریونیو کے ممبر ہوئے۔ سر میلکم ہیلی کے زمانہ میں آسام کے گورنر ہوئے اور کے سی۔ آئی۔ ای کا خطاب پایا۔

ممبر بنانے کے کام میں روڑا نہ اٹکے۔ مسلمان اس وقت سیاست سے اس قدر نا آشنا تھے کہ اگر کوئی حاکم ضلع کانگریس کی طرح لیگ سے بے اعتمادی کا اظہار کرتا تو اُس ضلع میں لیگ قائم کرنے کے کام میں سخت دشواریاں پیش آتیں۔ خوش قسمتی سے نواب وقارالملک کو کام کرنے والے بہت اچھے مل گئے اور حاجی موسیٰ خاں صاحب، مولوی عزیز مرزا صاحب مرحوم اور میجر حسن بلگرامی مرحوم کی مسلسل مگر خاموش کوششوں سے سرکاری حلقوں میں بدظنی پیدا کئے بغیر بہت سا کام ہو گیا۔ تاہم حالت یہ تھی کہ کانگریس لیگ کو اپنا حریف سمجھتی تھی اور مسلمانوں کے اظہارِ وفاداری کے باوجود گورنمنٹ اُسے شبہ کی نظر سے دیکھتی تھی اس حالت سے تعلیم یافتہ حضرات ہرگز مطمئن نہ تھے مگر مجبوری سب کچھ کراتی ہے۔ انگریزی کی مثل ہے کہ جس بات کا علاج نہ ہو اُسے سہنا چاہیئے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب مراکو پر اٹلی نے حملہ کیا اور انگلستان نے ٹرکی کو مصر میں ہو کر فوجیں لے جانے کی اجازت نہ دی بلقان کی حکومتیں بھی ٹرکی پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ روسی مشہد پر گولہ باری کر کے اس بات کا ثبوت دے چکے تھے کہ اُن کی نظر میں مذہب اسلام کا کوئی احترام نہیں ہے۔ یہ سب تو خارجی اسباب تھے جن سے مسلمانانِ ہند کا متاثر ہونا ناگزیر امر تھا۔ اندرونی حالت یہ تھی کہ ملک معظم جارج پنجم دہلی آکر تقسیم بنگالہ کو منسوخ کر چکے تھے۔ شمالی ہند میں گورنمنٹ کی اُس ناعاقبت اندیشانہ روش نے جو اُس نے علی گڈھ میں مسلم یونیورسٹی قائم ہونے کے بارہ میں اختیار کی تھی ہیجان برپا کر رکھا تھا۔

دسمبر ۱۹۱۲ء فونڈیشن کمیٹی کے جلسہ میں تلاطم

ان حالات میں مُسلم یونیورسٹی فونڈیشن کمیٹی کا اجلاس بمقام لکھنؤ منعقد ہوا مُسلمان لیڈروں کا تو یہی خیال تھا کہ جلسہ میں کوئی ہماہمی نہ ہوگی مگر واقعہ یہ ہے کہ جو گرما گرم تقریریں جلسہ میں ہوئیں اور گورنمنٹ پر بے اعتمادی کا اظہار جس زور شور سے کیا گیا اُس سے ثابت ہو گیا کہ مُسلمانوں کی زندگی کا نیا دَور شروع ہو گیا ہے اور جو معاشرتی اور ملکی حقوق وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں اس کا سنگِ بنیاد وہ اپنا استحقاق سمجھتے ہیں کسی کے آگے کاسۂ گدائی لے کر جانا

نہیں چاہتے سارے واقعات کا بیان کرنا طوالت سے خالی نہیں ہیں صرف دو باتوں کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جن سے جلسے کے مزاج کی کیفیت کا اندازہ ہو جائے گا۔ پہلے روز بڑی طویل بحث رہی اور تقریروں میں گورنمنٹ پر بے اعتمادی کے ساتھ لیڈروں پر بھی بدگمانی کا اظہار کیا گیا۔ دوسرے روز بحث جاری رہی اور سہ پہر کے وقت ایک کمیٹی کے تقرر کی تجویز پیش کی گئی بہت سے نام پیش ہوئے ایک صاحب نے کھڑے ہو کر ڈاکٹر ضیاء الدین کا نام پیش کیا جس کی بڑی سخت مخالفت ہوئی میرے ایک دوست[۱] جو سیاسی معاملات میں نمایاں حصہ لیتے تھے اور جو بعد کو گورنمنٹ کے ایک ممتاز عہدہ پر فائز ہو گئے میرے قریب بیٹھے تھے وہ بھی ڈاکٹر صاحب کا نام اضافہ کئے جانے کے زبردست مخالف تھے۔ میں نے آہستہ اُن سے کہا کہ یہ تعلیمی معاملہ ہے ڈاکٹر صاحب کا نام بڑھائے جانے میں کیا مضائقہ ہے یہ سُنکر میرے دوست بہت برہم ہوئے اور اس طرح چلا کر کہ آدھے جلسہ تک آواز پہنچی ہو گی مجھ سے کہنے لگے سبحان اللہ آپکی سمجھ کا کیا کہنا سی۔ آئی۔ ای بھی ڈاکٹر صاحب ہوں اور جلسہ اپنا نمائندہ بھی ڈاکٹر صاحب ہی کو مقرر کرے۔ دونوں دن کی تقریروں میں پیش پیش مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ سر جیمس مسٹن کی لفٹنٹ گورنری کا زمانہ تھا اور ساری خبریں اُن تک پہنچتی تھیں۔ رات کو گورنمنٹ ہاؤس میں سر جیمس مسٹن نے ڈنر کیا دعوت میں منجملہ شرکائے جلسہ کے مولانا محمد علی بھی تھے سر جیمس مسٹن بڑے ہوشیار لفٹنٹ گورنر تھے دعوت میں جو مسلمان شریک تھے موصوف نے اُن کی رائے کو متاثر کرنے کی کوئی ظاہری کوشش نہیں کی مگر فونڈیشن کمیٹی کے جلسوں کے متعلق بات چیت ضرور ہوئی ہو گی۔ تیسرے دن جب جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی تو لیڈروں کی تقریروں کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مناسب سمجھتے ہیں کہ گورنمنٹ سے مفاہمت کی ایک کوشش اور کی جائے، رات کے ڈنر کا حال بھی اکثر حاضرین جلسہ کو معلوم ہو گیا تھا آج کی تقریروں میں پہلے دو دن کا زور و شور نہ تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کھڑے ہوئے اور جلسہ کے

---

[۱] میرے ان دوست کو بالآخر گورنمنٹ کی بارگاہ سے سی۔ آئی۔ ای سے بھی بڑا خطاب ملا۔

رنگ کی تبدیلی اور رات کے ڈنر کا کنایتہً تذکرہ کرتے ہوئے مولانا محمد علی کی طرف دیکھ کر یہ شعر پڑھا۔

ے معشوق ما بہ مذہب ہر کس موافق است ✧ با ما شراب خورد و بہ زاہد نماز کرد

ترجمہ:۔ میرے معشوق کا مسلک دیکھیے سب کی خاطر عزیز ہے۔ میرے ساتھ شراب پیتا ہے اور حضرت مولانا کے ساتھ نماز پڑھتا ہے۔ مولانا محمد علی نے بھی مدافعانہ تقریر کی مگر مرحوم کی خصوصیت اُن کے جارحانہ وار ہوتے تھے اور یہ تقریر اُس شیر کی ہوک تھی جو کچھار کے بجائے زو حم کے میدان (جانور خانہ) میں دہاڑے۔

مسجد کانپور کا واقعہ مسجد کانپور کا واقعہ انگریزی تدبر کی بدترین مثال ہے بازار مچھلی شہر کی مسجد میں جو لبِ سڑک ہے کچھ غسلخانے جانب شرق واقع تھے۔ جب نئی سڑک نکلی تو گورنمنٹ نے قانونی کارروائی کے ذریعہ سے غسل خانوں کی زمین کو حاصل کر لیا۔ مسلمان چیختے چلاتے رہے کہ مسجد کا جزو ہونے کی وجہ سے غسلخانوں کی اراضی قانوناً حاصل نہیں کی جاسکتی مگر کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ آخر وقت میں یہ معاملہ گورنمنٹ سے بھی رجوع کیا گیا مگر گورنمنٹ نے معمولی بات سمجھ کر مداخلت سے انکار کر دیا۔ کانپور کے کلکٹر اُس زمانہ میں مسٹر ٹائلر اور امپرومنٹ ٹرسٹ کے چیرمین مسٹر سم تھے۔ آخر جولائی ۱۹۱۳ء میں مسٹر سم کی تحریک پر پولیس کی مدد سے غسلخانے منہدم کر دیئے گئے اور امپرومنٹ ٹرسٹ نے برائے نام قبضہ لے لیا۔ انہدام کی خبر شائع ہوتے ہی شہر کے مسلمانوں میں بے چینی پیدا ہوئی اور اسلامی اخباروں میں اس کارروائی پر احتجاج کیا گیا ہم مسلمان جذباتی قوم ہیں جس کا حال خود ہم کو بھی معلوم ہے اور گورنمنٹ کو بھی تیسری اگست ۱۹۱۳ء کو مسلمان مچھلی بازار کی مسجد میں جمع ہوئے اور منہدمہ غسلخانوں کی جو اینٹیں موقع پر موجود تھیں وہ بغیر مسالہ یا گارے کے ایک کے اوپر ایک رکھنا شروع کر دیں۔ یہ نادانی کا فعل تھا غالباً سادہ دل مُسلمان جو موقعہ پر موجود تھے گورنمنٹ کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ ے

نہ ہلا سر کا طلب نیم گرم سے کچھ بھی وہ اب ایک بار تقاضائے والہانہ کریں۔ (اسد ملتانی)

غیر ذمہ دار حکومت پر۔ اور خاصکر جب وہ حکومت بدیسی بھی ہو منجملہ اور اعتراضوں کے ایک بڑا

اعتراض یہ ہے کہ وہ اپنے عہدہ داروں کی حمایت کرنا اپنا فرض سمجھتی ہے جس کا اثر یہ ہے کہ مقامی حکام مسائل کے حل کرنے میں صبر و تحمل، فہم و فراست سے کام لینے کی بجائے تشدد کرتے اور عوام کو اپنا زور دکھاتے ہیں بدقسمتی سے یہی صورت کانپور میں پیش آئی۔ مقامی حکام نے مسلح پولیس کو بلا کر مجمع کو منتشر کیا۔ ایسے موقعوں پر پولیس والوں کے ڈنڈوں سے دو چار آدمی عموماً زخمی ہوا کرتے ہیں لیکن اس مجمع پر پولیس نے بے تحاشا بندوقوں کے فیر اور بھالوں کے وار کئے۔ کسی مختصر مقام پر جو آدمیوں سے بھرا ہوا ہو بلا امتیاز فیر کرنے کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے وہ یہاں بھی ہوا بہت سے آدمی جان سے مارے گئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔ اس واقعہ کی خبریں شائع ہونے پر مسلمانوں میں بڑی سخت بے چینی پیدا ہوئی۔ اس بے چینی کو سر جیمس مسٹن کے طریق عمل نے اور بڑھا دیا۔ ملک معظم کا قائم مقام ہونے کی حیثیت سے لاٹ صاحب کا فرض تھا کہ سب معاملات کو دیکھتے بھالتے اُن کی چھان بین کرتے اور مسلمانوں میں جو برہمی پیدا ہو گئی تھی اُس کو رفع کرنے کے لئے عاقلانہ تدابیر عمل میں لاتے۔ مگر موصوف نے آؤ دیکھا نہ تاؤ واقعہ کے چار پانچ دن بعد ہی کانپور پہنچے پولیس پریڈ کا معائنہ کیا، وہاں تقریر فرمائی اور نہتے مجمع کے اوپر اندھا دُھند فیر کر کے پولیس نے بقول لاٹ صاحب جو بہادری دکھائی تھی اُس کو بہت سراہا اور پولیس والوں کو کارگذاری کی سندیں عطا کیں۔ لاٹ صاحب کی اس غیر دانشمندانہ کارروائی سے مسلمانوں میں آگ لگ گئی اور اُن پر یہ ثابت ہو گیا کہ گورنمنٹ مسلمانوں کے ساتھ نہ صرف ناانصافی کا برتاؤ کرتی ہے بلکہ ان کو ذلیل بھی کرنا چاہتی ہے۔ مسٹن صاحب سے مزید شکایت قوم کو یہ تھی کہ مسلمانوں کے طور طریقوں سے واقف ہونے اور بہت سے مقتدر مسلمانوں سے دوستی رکھنے کے باوجود انھوں نے یہ حرکت کی یہ بے چینی عام تھی جس نے بلغوائے ؎

عشق را نازم کہ یوسف را بہ بازار آورد ٭ ہمچو صنعا زاہدے را سر بہ زنار آورد

علماء کی صف سے مولوی عبدالباری صاحب مرحوم و مغفور جیسی بلند پایہ مذہبی ہستی کو درس و تدریس کے خاموش اور پُرسکون حجرہ سے نکال کر سیاست کے میدان میں لا کھڑا کیا، تعلقہ داروں کے گروہ میں سے

جن کی جاگیروں کے برقرار رہنے کی وفاداری ایک ضروری شرط ہے سر محمد علی محمد خاں بہادر راجہ محمود آباد پر اتنا اثر ڈالا کہ ناموس ملّت اور قومی مفاد کی خاطر جو جدو جہد موصوف نے کی اُس کے باعث وہ لاٹ صاحب کی میزان عدل میں جس کا ایک پلّہ تول سے بہت پہلے کانپور کے مقامی حکام کی طرف جُھکا ہوا تھا غیر وفادار قرار پائے۔ سر سیّد احمد خاں کا سن رسیدہ جانشین (وقار الملک) جو خرابی صحت کے باعث سکرٹری کے عہدہ سے دست بردار ہو چکا تھا اللہ جل شانہ کے نام کا عصا ہاتھ میں لے کر ایک دفعہ پھر فرعونیت کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ انگریزی دانوں کی جماعت سے وہ ڈاڑھی مونچھ مُنڈا بیرسٹر (مظہر الحق) آگے بڑھا جس کے دل میں اسلام کا سچّا درد تھا اور جس نے آخر دم تک اپنے خیال کی بموجب قوم وملت کی خدمت کی۔ مشائخ کی جماعت کے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے خواجہ حسن نظامی صاحب نے حق کی تائید میں وہ صدا بلند کی جو آج تک بہت سے مُسلمانوں کے کانوں میں گونج رہی ہے اور جس کو انگریزی حکومت نے بھی عارضۂ ثقل سماعت میں مُبتلا ہونے کے باوجود اچھی طرح سے سُنا۔ خواجہ صاحب نے اپنی تقریر میں جو قسمیں کھائی تھیں وہ صرف چاند سورج اور زمین و آسمان کی نہ تھیں بلکہ بندوق کے ان کارتوسوں اور بھالوں کی اُن نوکوں کی بھی قسمیں تھیں جن سے نہتّے مسلمان شہید کئے گئے تھے۔ خواجہ صاحب اُس زمانہ میں حکومت کے معتوب تھے اور غالباً اس واقعہ کے بعد اُن کی نگرانی بھی خفیہ پولیس کرنے لگی تھی مگر مثل مشہور ہے کہ سانچ کو کیا آنچ۔ اُن کے بے نظیر اظہار جرأت سے قوم کو معلوم ہو گیا کہ اعلاء کلمۃ الحق کا درجہ کیسا اونچا اور اثر کتنا وسیع ہے۔ مولوی آزاد سُبحانی نے سب سے پہلے قربانی پیش کی۔ مسلمانان کانپور پر جو زیادتیاں مقامی حکام کی طرف سے ہو رہی تھیں وہ موصوف نے ایک تقریر میں بیان کیں۔ اُس تشدد کے طوفان نے مولوی صاحب کی راست گوئی کو گھیر لیا۔ اُن پر مقدمہ چلایا گیا اور قید کی سزا دی گئی۔

کانپور کی مسجد کا معاملہ خالص مذہبی معاملہ نہ تھا بلکہ جیسا اکثر ہوتا ہے، وہ ایسا مسئلہ تھا جس کے مذہبی پہلو کو سیاسی پہلو سے یا سیاسی حصّہ کو مذہبی حصّہ سے جُدا کرنا ناممکن تھا۔ اُس کے مذہبی پہلو سے علماء اور مشائخ اور راسخُ العقیدہ مُسلمان مُتاثر تھے اُس کا سیاسی

پہلو انگریزی داں مسلمانوں کے دلوں میں تیر کی طرح کھٹک رہا تھا۔ سچ پوچھئے تو اس مسئلہ کا سیاسی پہلو احترام مذہب کے جسم سے پیدا ہوا تھا۔ تعلیم یافتہ مسلمان اس لئے برہم تھے کہ لاٹ صاحب کے کانپور جاکر پولیس کی خدمات کو سراہنے کے یہ معنی تھے کہ مسلمانوں کے گہرے مذہبی جذبات حکومت کی نظر میں ناقابلِ التفات ہیں۔ غیر مسلم پریس نے اس زمانہ میں اپنا جو طریقہ رکھا وہ قابلِ افسوس ہے۔ اسلامی اخبارات نے زوردار مضامین لکھ کر قوم وملت کی مقدور بھر خدمت کی مگر اردو اخباروں کا اس زمانہ میں اثر بہت کم تھا اور سرجیمس مسٹن نے جو پالیسی پریس کے ساتھ برتی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو اخبارات گورنمنٹ سکرٹریٹ میں صرف اس لئے پڑھے جاتے تھے کہ گورنمنٹ کی رائے میں کوئی مضمون قابل اعتراض ہونے کی صورت میں اخباروں کا گلا پریس ایکٹ کے زبردست پنجہ سے دبوچا یا گھونٹا جائے۔

معائنہ موقعہ کے لئے میرا کانپور جانا

بڑی خرابی یہ تھی کہ ہنگامۂ کانپور کے صحیح واقعات پبلک کو معلوم نہ تھے۔ گورنمنٹ سے مقابلہ ہونے کے باعث اخباروں نے اکثر یکطرفہ خبریں شائع کی تھیں جن کا مضمون یہ تھا کہ مسلمان غسل خانوں کو زبردستی دوبارا التعمیر کرنا چاہتے تھے اور منتشر ہوجانے کا حکم دئے جانے کے بعد بھی صرف موقعہ پر ڈٹے رہے بلکہ پولیس کا مقابلہ کیا اور پولیس کو حفاظت خود اختیاری میں بندوقوں کے فیر کرنا پڑے۔ موقعہ کو بچشم خود دیکھنے اور حالات معلوم کرنے کی غرض سے میں ۱۰ اگست کو کانپور پہنچا اور مسٹر ٹائلر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی اجازت سے ان ملزموں سے ملا جو زیر حراست تھے، ان میں سے بہت سے آدمی بندوقوں اور بھالوں سے زخمی ہوئے تھے اور متعدد اشخاص کے زخم ایسے شدید تھے کہ وہ اٹھنے بیٹھنے سے بالکل معذور تھے۔ میں نے سب زخمیوں کی اسم وار فہرست بنائی اور جس جس کے جسم پر جہاں جہاں چوٹیں تھیں ان سب کو لکھ لیا۔ کانپور پہنچکر مجھے معلوم ہوا کہ مولانا ابوالکلام آزاد بھی جو اس زمانہ میں الہلال کے ایڈیٹر تھے حالات معلوم کرنے کی غرض سے کانپور آئے تھے مگر مقامی حکام کے طریق عمل کے باعث ان کو واپس جانا پڑا۔ حافظ

ہدایت حسین مرحوم مقامی مسلمانوں میں سر برآوردہ تھے میں اُن سے بھی ملا تھا مگر وہ اس سانحہ سے اس درجہ متاثر اور پریشان تھے کہ میں نے اُن کو زیادہ تکلیف دینا مناسب نہ سمجھا، کانپور ہی میں میں نے ایک طویل مضمون انگریزی اخباروں کے لئے لکھنا شروع کر دیا تھا جس میں اُن زخمیوں کے نام درج کر دئے تھے جن کی پیٹھ پر چوٹیں تھیں یہ چوٹیں اس بات کا بیّن ثبوت تھیں کہ ان لوگوں نے پولیس کا مقابلہ نہیں کیا تھا بلکہ چوٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بھاگتے ہوئے آدمیوں کے اوپر پولیس نے فیر کئے اور اُن کو بھالوں سے بھی زخمی کیا مسجد کی اندر کی گہہ میں دیواروں پر جہاں جہاں بندوق کے فیروں کے نشان تھے یا اندر فرش پر جہاں جہاں خون کے بڑے بڑے دھبّے میں نے دیکھے تھے اُن سب کا حال بھی میں نے مضمون میں لکھ دیا تھا مراد آباد پہنچکر میں نے مضمون فوراً انگریزی اخبارات کو بھیج دیا۔ پانیر تو ایسے مضمون کو جو گورنمنٹ کے خلاف تھا اور جس سے پولیس کی زیادتی ثابت ہوتی تھی کیوں چھاپنے لگا تھا مگر انڈین ڈیلی ٹیلیگراف لکھنؤ کے ایڈیٹر نے وہ مضمون چھاپ دیا، اور لکھنؤ کی اُس انجمن نے جو تحفظ مسجد مچھلی بازار، اور امداد ملزمان مقدمہ کانپور کے لئے راجہ صاحب محمود آباد، مولوی عبد الباری صاحب فرنگی محلی، مولوی محمد نسیم صاحب ایڈوکیٹ، منشی احتشام علی صاحب، مسٹر اظہر علی وکیل اور دیگر مقتدر مسلمانوں کی سرپرستی میں قائم ہوئی تھی اُس خط اور خط کے ترجمہ کی ہزاروں کاپیاں چھپوا کر ملک میں تقسیم کیں۔ اب مقتدر مسلمانوں کے کانپور جانے کا تانتا بندھ گیا تھا اور سچی خبریں پھوٹ کر پبلک تک پہونچنے لگی تھیں۔

سر جیمس مسٹن کی دوسری غلطی

مسلمانوں میں بڑھتے ہوئے ہیجان کے لحاظ سے سر جیمس مسٹن کو اس عرصہ میں طے کر لینا چاہیئے تھا کہ مسجد کے معاملہ اور اُس فوجداری مقدمہ کے بارے میں جو بہت سے مسلمانوں کے اوپر چلایا گیا تھا، اُن کی پالیسی کیا ہوگی مگر وہ اس امر میں کوئی قطعی رائے قائم کرنے سے قاصر رہے وہ ابھی تک اسی خیالِ باطل میں مبتلا تھے کہ اُن مسلمان لیڈروں کو جن سے اُن کے مراسم تھے سمجھا بجھا کر

گورنمنٹ کے فیصلہ پر اُن کی منظوری کی مُہر لگوالیں گے۔ مولانا محمد علی نے ایک موقعہ پر کہا تھا کہ قوم کا فائدہ اس میں ہے کہ اہم معاملات کے فیصل کرنے کا اختیار جمہور کو ہو۔ سیاہ و سفید کے مالک چند افراد نہ رہیں۔ گنے چنے افراد کی رائے کو گورنمنٹ مُتاثر کرسکتی ہے مگر ساری قوم کو رشوت دے کر اپنا ہمنوا نہیں بنا سکتی بعینہ یہی حالت مسئلہ کانپور کی تھی۔ سرجیمس مسٹن خاص خاص اشخاص کے ذریعہ سے لگی آگ کو بجھانا چاہتے تھے مگر آگ اتنی زیادہ پھیل گئی تھی کہ موصوف کے ہوا خواہوں کی پھونکوں سے اُس کا بجھانا ناممکن تھا۔ ۱۵ ؍اگست ۱۹۱۳ءکو سرجیمس مسٹن نے گورنمنٹ ہاؤس لکھنؤ میں مقتدر مسلمانوں کی ایک کانفرنس منعقد کی۔ کونسل کے منتخب شدہ چاروں مسلمان ممبر یعنی مسٹر عبدالرؤف، شیخ شاہد حسین مرحوم، خواجہ غلام الثقلین مرحوم اور میں اس کانفرنس میں مدعو کئے گئے تھے۔ راجہ صاحب محمود آباد، مولوی عبدالباری صاحب فرنگی محلی، راجہ سر تصدق رسول خاں (راجہ جہانگیر آباد) اور بعض دیگر سر برآوردہ مسلمان بھی کانفرنس میں شریک تھے میز کے ایک سرے پر صدر کانفرنس یعنی لاٹ صاحب کی کُرسی تھی جس کے دونوں طرف شرکائے کانفرنس کے لئے کُرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ لاٹ صاحب تشریف لائے ہم سب تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔ لاٹ صاحب نے راجہ صاحب جہانگیر آباد کو اشارہ کیا کہ اُن کے داہنے ہاتھ کی طرف پہلی کرسی پر بیٹھ جائیں دوسری کرسی پر بیٹھنے کا راجہ صاحب محمود آباد کو اشارہ کیا محمود آباد کے ساتھ مولوی عبدالباری صاحب تھے۔ محمود آباد نے اپنی جگہ فوراً مولوی صاحب کو بٹھا دیا اور خود برابر کی کرسی پر یعنی شروع سے تیسری کرسی پر بیٹھ گئے۔ لاٹ صاحب کی یہ بڑی غلطی تھی کہ پہلی کرسی پر اُنھوں نے محمود آباد کی بجائے جہانگیر آباد کو بٹھایا۔ یہ سچ ہے کہ جہانگیر آباد عمر میں محمود آباد سے بڑے تھے اور محمود آباد اُن کی عزت بھی بڑے بھائی کی طرح کرتے تھے مگر بحیثیت راجہ محمود آباد سر محمد علی محمد خاں کو راجہ جہانگیر آباد پر تقدم حاصل تھا پھر یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ جس مسئلے پر غور کرنے کے لئے کانفرنس منعقد کی گئی تھی اُس کا محمود آباد سے گہرا تعلق تھا۔ سرجیمس مسٹن کی اس بے عنوانی سے راجہ صاحب محمود آباد بہت مکدّر ہوئے وہ بڑے ملیق آدمی تھے

منکسر المزاجی بھی اُن میں اس درجہ تھی کہ اُن کے ہم پایہ اصحاب میں مشکل سے ملے گی لیکن وہ سرکاری
تعلقات میں اپنی عزت نفس کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی بزم گرم تقریریں
ہوئیں لاٹ صاحب برابر ایک ہی زبان سے یہی کہتے رہے کہ غسلخانوں کی زمین پر مسجد کا اطلاق نہیں
ہوسکتا۔ اس اعتراض کا جواب مولوی عبدالباری صاحب نے بڑے زورشور سے دیا جس میں بہت سی
احادیث اور مشہور فقہا کے فتووں کا حوالہ تھا، سیاسی حالات اور عام مُسلمانوں کے نقطۂ نظر کو راجہ صاحب
محمود آباد نے اور میں نے پیش کیا، شرکاء نے تین چار کے سوا ہماری تائید کی جو حضرات خاموش رہے
انھوں نے بھی ہماری رائے سے اختلاف ظاہر نہیں کیا۔ بحث و مباحثہ بہت دیر تک جاری
رہا مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔

تیسری غلطی

دوسرے دن یعنی ۴ اگست ۱۹۱۳ء کو رفاہ عام کے میدان میں مُسلمانوں کا
بہت بڑا جلسہ اس لئے ہونے والا تھا کہ کانپور کے مظلوموں کے مقدمہ کی پیروی
کے لئے چندہ اور گورنمنٹ سے غسل خانوں کی زمین کی واپسی کا مطالبہ کیا جائے، مسٹر گوین اُس
زمانہ میں لکھنؤ کے سٹی مجسٹریٹ تھے میں سر سید وزیر حسن کا مہمان تھا، موصوف اُس زمانہ میں
آل انڈیا مُسلم لیگ کے سکرٹری تھے۔ ہم سب موٹر میں بیٹھ کر رفاہِ عام کو روانہ ہونے والے تھے،
جو معلوم ہوا کہ جلسہ کے انعقاد کی حسب دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری ممانعت کردی گئی ہے۔
لاٹ صاحب کی یہ تیسری غلطی تھی۔ کسی بڑی اور ذکی الحس قوم کے ساتھ ناانصافی کا برتاؤ کرنا
اور اُس کے خلاف سر جیمس مسٹن کے محبوب دارالحکومت یعنی لکھنؤ میں (لکھنؤ کو دارالحکومت ہونے
کا مرتبہ سر جیمس مسٹن کے زمانہ میں عملاً حاصل ہوگیا تھا) صدائے احتجاج بلند نہ ہونے دینا بڑی نادانی
تھی، صدائے احتجاج اُٹھائی گئی اور اس زورشور سے اُٹھائی گئی کہ ایک طرف شملہ کی چوٹیوں تک
اور دوسری طرف لندن میں وہائٹ ہال تک پہونچی، مسٹر مانٹیگو نے اپنی کتاب ہندوستانی روزنامچہ
میں گورنمنٹ صوبہ مدراس کی ناقابلیت کا تذکرہ کیا ہے۔ مدراس کے گورنر اس زمانہ میں لارڈ
پینٹ لینڈ تھے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۳-۱۹۱۲ء میں بلحاظ ناقابلیت و ناواقفیت یو۔پی

گورنمنٹ کا وہی درجہ تھا جو لارڈ پنٹ لینڈ کی گورنمنٹ نے مدراس میں چھ برس بعد حاصل کیا۔ صوبجات متحدہ کی کونسل کے جلسہ منعقدہ ۱۵ ستمبر ۱۹۱۳ء میں جو سوال میں نے رفاہِ عام کے جلسہ کو حکماً روک دینے کے بارہ میں کیا تھا وہ سوال مع گورنمنٹ کے جواب کے یہاں درج کیا جاتا ہے۔ سوال[۵۱] (الف) کیا گورنمنٹ کو علم ہے کہ ۱۶ راگست ۱۹۱۳ء کو لکھنؤ میں جو جلسہ اس غرض سے ہونے والا تھا کہ چندہ جمع کرکے مصیبت زدگان کانپور کی مدد کرے اُس جلسہ کی ممانعت کے حکم سے مسلمانوں میں بڑی بے چینی پیدا ہو گئی ہے۔ (ب) کیا گورنمنٹ براہِ عنایت بتائے گی کہ وہ کیا اطلاعات تھیں کہ جنکی بنیاد پر حکام نے جلسہ کو منعقد ہونے سے حکماً روک دیا۔ جواب منجانب آنریبل مسٹر برن (چیف سکرٹری) (الف) جواب نفی میں ہے۔ (ب) لفٹنٹ گورنر کو کوئی اطلاع نہیں ہے۔ ۱۵ ستمبر کے اجلاس کونسل میں ہنگامہ کانپور کے متعلق میں نے متعدد سوالات کئے تھے اُن میں سے ایک سوال اور اس کا جواب ادھر ملاحظہ فرمائیے۔ سوال[۵۲] (الف) کیا یہ سچ ہے کہ ۱۶ راگست کی صبح کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لکھنؤ نے ایک مقتدر مسلمان کو بلا کر کہا کہ اُس روز اگر کوئی ہنگامہ پیش آیا تو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی رائے میں تمام تر ذمہ واری اُس مقتدر مسلمان کی ہوگی۔ (ب) کیا گورنمنٹ بتائے گی کہ وہ کونسا قانون ہے جس کی رُو سے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اُس مسلمان کو مذکورۂ بالا دھمکی دی تھی۔ جواب منجانب آنریبل مسٹر برن گورنمنٹ کو کوئی اطلاع نہیں ہے۔ اُس زمانہ کی کونسلوں میں اس طرح کے انجان پنے کے جوابوں سے عوام ایک ہی نتیجہ نکالتے تھے یعنی گورنمنٹ قصداً واقعات کو چھپانا چاہتی ہے اور سوالات کا جواب دینے سے گریز کرتی ہے تاہم تھوڑی دیر کے لئے مان لیجئے کہ گورنمنٹ اُن اہم معاملات سے بے خبر تھی جن کا تذکرہ میرے سوالات میں تھا تو کیا ان واقعات سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ لاٹ صاحب اور اُن کی گورنمنٹ اس قابل نہ تھے کہ ایک بڑے صوبہ پر حکومت کریں۔ سر جیمس مسٹن کی گورنمنٹ پریس ایکٹ کو جس طرح کام میں لارہی تھی اس کی بھی ایک مثال ناظرین کے سامنے پیش کردینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کونسل کے جلسہ مذکور میں ایک سوال میں نے

---

۵۱ و ۵۲ دیکھو روئداد جلسہ لیجسلیٹو کونسل منعقدہ پندرہ ستمبر ۱۹۱۳ء صفحہ ۵۰۶ مطبوعہ گورنمنٹ۔

یہ کیا تھا۔ سوال (الف) کیا گورنمنٹ کو اُس خبر کی اطلاع ہے جو اُردو اخبارات میں اس مضمون کی شائع ہوئی ہے کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لکھنؤ نے اخبار مُسلم گزٹ کے مالک کو بلایا اور مطالبہ کیا کہ ایڈیٹر کو فوراً موقوف کردیا جائے اور اگر ایسا نہ کیا گیا تو مالک اخبار پر فوجداری کا مقدمہ چلایا جائیگا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مالک اخبار نے ایڈیٹر کو موقوف کردیا۔ (ب) کیا مذکورۂ بالا خبر سچ ہے۔ (ج) اگر سچ ہے تو کیا گورنمنٹ براہِ عنایت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے دریافت کرے گی کہ اُنہوں نے کس قانون کی بموجب یہ تمام کارروائی کی۔ جواب منجانب آنریبل مسٹر برن۔ واقعات اُس طرح نہیں ہیں جس طرح سوال میں بیان کئے گئے ہیں۔ اخبار مُسلم گزٹ کے مالک اور ناشر (پبلشر) نے جس بیان میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے سامنے ایڈیٹر کو موقوف کرنے کے وجوہ ظاہر کئے تھے اُس بیان کے ترجمہ کی ایک نقل میز پر رکھی جاتی ہے۔ بیان اپنے خسر کی وفات کے باعث میں دو مہینے تک یعنی جون اور جولائی میں فرخ آباد میں رہا۔ ان دو مہینوں میں مُسلم گزٹ کے پرچوں کا لب ولہجہ بالخصوص مسجد کانپور کے متعلق ۱۶ جولائی ۱۹۱۳ء کے پرچہ کے مضامین ایڈیٹر اخبار مولوی وحیدالدین سلیم کی خودرائی اور ضد کے باعث قابل اعتراض تھے جس کا مجھے نہایت افسوس ہے، مجھے خوف ہے کہ ایڈیٹر مذکور کی خودرائی کے سبب میری لکھنؤ میں موجودگی اور بغایت نگرانی کے باوجود میں ایڈیٹر مذکور کے اُس جذبہ کو جس کو وہ اپنے خیال میں اظہارِ حق سمجھتے ہیں روک نہ سکونگا اور ایسی صورت میں اُن کے غیر معتدل طریقہ کی ذمہ داری تمام تر مجھ پر عائد ہوگی اس وجہ سے نیز اس غرض سے کہ ایڈیٹر مذکور کو اُس کے قابلِ اعتراض طرزِ عمل کی سزا دینا ضروری ہے، میں آپ کی تجویز کی بموجب مولوی وحیدالدین سلیم کو ایڈیٹری سے موقوف کر رہا ہوں مُسلم گزٹ کے آئندہ پرچہ میں قابلِ اعتراض مضامین چھاپے جانے پر میں اپنا اظہارِ افسوس شائع کرونگا[۱] (دستخط میر جان مالک و ناشر اخبار مُسلم گزٹ)۔

مسٹر برن چیف سکرٹری کے یہ جوابات اِس قابل تھے کہ موصوف سے متعدد ضمنی سوالات کئے جاتے مگر اُس زمانہ کے قواعد وضوابط کی بموجب ضمنی سوالات کرنے کا ممبروں کو حق حاصل نہ تھا تاہم اِن سوالات

[۱] دیکھو روئداد جلسہ یو۔ پی لیجسلیٹو کونسل منعقدہ پندرہ ستمبر ۱۹۱۳ء صفحہ ۵۰۷ نیز صفحہ ۵۰۳ مطبوعہ گورنمنٹ

سے ہماری غرض پوری گئی۔ جب سوال کا جواب دینے میں وہ طریقہ اختیار کیا جائے جو مسٹر برن نے اختیار کیا تو پبلک کو حق ہے کہ حالاتِ حاضرہ کی روشنی میں اُس سے نتیجہ نکالے چنانچہ یہی صورت، اس موقعہ پر بھی پیش آئی، ملک کے تمام روزنانہ اخباروں میں میرے سوالات اور اُن کے جوابات شائع ہوئے جس سے ہماری تحریک کو جو ہم نے سرجیمس مسٹن کے خلاف شروع کی تھی بڑی تقویت پہونچی۔ انگریزی کی ایک مثل ہے کہ کسی واقعہ کو اُس وقت تک سچ نہ سمجھنا چاہیئے جبتک گورنمنٹ سرکاری طور سے اُسے غیر صحیح نہ بتائے۔ بھلا اس ستم ظریفی کا کہیں ٹھکانا ہے کہ سرجیمس مسٹن کی گورنمنٹ اہم سیاسی واقعات کے متعلق جن کا حالات معلوم کرنے کے بعد جواب دینا گورنمنٹ کا فرض تھا یہ بیان کرتی ہے کہ گورنمنٹ کو کوئی اطلاع نہیں ہے حالانکہ جس دن رفاہِ عام کے جلسہ کو حکماً روکا گیا اُس دن لاٹ صاحب خود لکھنؤ میں موجود تھے۔

مسٹر مظہر الحق کی خدمات

جہاں تک مجھے یاد ہے اسّی سے زیادہ مُسلمان زیرِ حراست تھے جن پر تعزیراتِ ہند کی مختلف دفعات کے ماتحت گورنمنٹ نے مقدمہ چلایا تھا اس مقدمہ میں ملزموں کی طرف سے پیروی کرنے کا مسئلہ نہایت اہم تھا، خدا بخشے مسٹر مظہر الحق بہار کے ممتاز بیرسٹر کانپور آئے اور بغیر فیس کے مُلزموں کی طرف سے پیروی کا کام اُنھوں نے اپنے ذمہ لیا۔ ابتدائی مقدمہ کی سماعت مسٹر ہنری مانکریف اسمتھ نے کی جن کو گورنمنٹ نے اسپیشل مجسٹریٹ مقرر کیا تھا۔ اس عرصہ میں دو مرتبہ مقامی حالات معلوم کرنے کی غرض سے میں کانپور گیا اور بڑی ناانصافی ہوگی اگر اس مسئلہ میں میں مسٹر مظہر الحق کی محنت اور جانفشانی کا تذکرہ نہ کروں، یہ مقدمہ پولیٹکل مقدمہ تھا اور مسٹر ہنری مانکریف اسمتھ بڑے مضبوط مجسٹریٹ سمجھے جاتے تھے۔ دوران مقدمہ میں اُنکی مسٹر مظہر الحق سے اکثر جھڑپ ہو جاتی تھی مگر مسٹر مظہر الحق نے باوجود حاضر جوابی کے کبھی یہ نوبت نہیں آنے دی کہ اُن کو مقدمہ کی پیروی چھوڑنا پڑے۔

مسٹر لیٹن کی اوچھی ادا اُسکی سنبھال

عدالت کی روئداد روزانہ اخباروں میں شائع ہوتی تھی اور اُس سے مُسلمانوں میں بےچینی بڑھ رہی تھی بہت سے

مقامات پر مسلمانوں کے جلسے ہوئے جن میں مقدمۂ کانپور کی پیروی کے لئے چندہ جمع کیا گیا مُراد آباد کی جامع مسجد میں بھی ایک بہت بڑا جلسہ منعقد ہونے والا تھا جس کا اشتہار مولوی سیّد حسن وکیل، مولوی عبدالرحمٰن پنجابی، مولوی دائم علی اور بعض دیگر معتقد مُسلمانوں کی طرف سے شائع ہوا تھا جلسہ کرنے والوں کی فہرست میں آخری نام میرا تھا۔ جلسہ کی تاریخ سے ایک دن پہلے مجھے مسٹر لیٹن کلکٹر و مجسٹریٹ کا طول طویل خط ملا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ مُراد آباد میں مسجد کانپور کے متعلق شورش بڑھ رہی ہے اگر انعقاد جلسہ کے باعث امن عامّہ میں کوئی خلل واقع ہوا یا بلوہ ہوا تو اُس کی ذمّہ داری سے شورش کا لیڈر ہونے کی حیثیت سے میں اور میرے ساتھی نہیں بچ سکتے۔ اسی مضمون کا ایک بہت مختصر خط مسٹر لیٹن نے دیگر داعیانِ جلسہ کے نام بھی بھیجا تھا۔ میں نے فوراً ایک مبسوط جواب مسٹر لیٹن کو بھیجا۔ جواب تو لمبا چوڑا تھا مگر اصل بات جو قابل تذکرہ ہے یہ تھی کہ بلوہ دو فریقوں کے درمیان ہوا کرتا ہے مُسلمان کل جامع مسجد میں جلسہ کر رہے ہیں اگر واقعاً بلوہ ہوا تو سوال یہ ہے کہ دوسرا فریق کون ہوگا مُراد آباد کی فضا بالکل پُر امن ہے اور میرے نزدیک نقض امن کا کوئی احتمال نہیں ہے ہاں ایک بات مجھے معلوم ہوئی ہے وہ یہ کہ آپ کا ارادہ ہے کہ جلسہ سے پہلے تمام بازار میں اور جامع مسجد کے دروازوں کے آگے مُسلح اور سوار پولیس تعینات کردیں، اگر یہ خبر صحیح ہے تو میری رائے میں نقض امن کا واقع ہونا لازمی ہے جس کے ذمّہ دار آپ خود ہوں گے۔ چونکہ اس معاملہ کا گورنمنٹ تک پہنچنا ضروری معلوم ہوتا ہے لہذا مناسب ہے کہ اس خط و کتابت کو جو میرے اور آپ کے درمیان ہوئی ہے آپ بہ احتیاط رکھیں۔ دوسرے دن صبح کو مسٹر لیٹن کا خط مجھے ملا جس میں لکھا تھا کہ آپ کے جواب سے مجھے پورا اطمینان ہے کہ نقض امن کا کوئی اندیشہ نہیں ہے آپ کو جلسہ کرنے کا پورا اختیار ہے اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، کہ مُسلح پولیس یا سوار پولیس کا ایک کانسٹبل بھی شہر میں موجود نہوگا۔ یہ خط پڑھ کر مجھے بڑا تعجب ہوا اور کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ مسٹر لیٹن کی یہ کایا پلٹ کس طرح ہوگئی۔ سید محمد علی اُس زمانہ میں مُراد آباد کے ڈسٹرکٹ اور سیشن جج تھے مسجد کانپور کی شورش میں جو حصّہ میں نے لیا تھا اس کا حال

موصوف کو بخوبی معلوم تھا۔ مُراد آباد میں مُصیبت زدگانِ کانپور کی امداد کے لئے جو چندہ میں نے عید الفطر کے دن جمع کرنا شروع کیا تھا اُس میں بھی موصوف کی بیگم صاحبہ اور لڑکیوں نے ایک خاصی رقم بغیر اپنے نام کا اظہار کئے ہوئے دی تھی۔ مُراد آباد کی جامع مسجد میں بڑے زور شور کا جلسہ ہوا جس کے کچھ دن بعد خدا بخشے سید محمد علی مرحوم سے مجھے معلوم ہوا کہ شہر میں مُسلّح پولیس کی تعیناتی نہ ہونے کی وجہ یہ ہوئی کہ میرا خط لے کر مسٹر لیپٹن جج صاحب کے پاس گئے اور میرا خط دکھا کر اُن سے مشورہ کیا۔ وہ میرے دوست تھے اور میری رفتارِ مزاج سے خوب واقف تھے۔ اُنہوں نے مسٹر لیپٹن سے کہا کہ بھڑوں کے چھتّہ کو کیوں چھیڑتے ہو۔ مُسلمان جلسہ کرتے ہیں کرنے دو تمہارا کیا حرج ہے۔ مُسلّح اور سوار پولیس کی تعیناتی نہ صرف غیر ضروری بلکہ نامناسب ہے اگر کوئی جھگڑا ہو گیا تو تمہاری خواہ مخواہ بدنامی ہو گی۔ انگریزی تعلیم سے جو عظیم الشان نقصان ملک کو پہنچا ہے وہ یہ ہے کہ انگریزی دانوں کی باتوں میں ظاہری ٹیپ ٹاپ تو بہت ہوتی ہے مگر اسّی فی صدی کی حالت یہ ہے کہ اُن میں کیریکٹر نہیں ہوتا۔ ہمارے بزرگوں کا کیریکٹر بالعموم بڑا زبردست ہوتا تھا۔ جامع مسجد کے جلسہ کے داعی میرے سوا سب کے سب پُرانی روشنی کے بزرگ اور انگریزی زبان سے ناآشنا تھے۔ مسٹر لیپٹن نے جو دھمکی مجھ کو دی تھی اُس کا اِعادہ موصوف نے اُن خطوں میں بھی کیا تھا جو بقیہ داعیانِ جلسہ کے نام بھیجے تھے۔ مگر اِس استقامت کو دیکھئے سوائے ایک کے کسی داعیِ جلسہ نے مسٹر لیپٹن کا خط میرے پاس بھیجنے کی ضرورت نہیں سمجھی نہ کوئی صاحب میرے پاس تشریف لائے نہ کسی نے مجھ سے یہ دریافت کیا کہ اب کیا کارروائی مزید کرنا چاہتے ہو۔ جب مُلاقات ہوئی اور میں نے خط کا تذکرہ کیا تو ہر ایک نے یہی کہا کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کانپور کے مُعاملہ میں جو مُناسب سمجھو کرو۔ جمہوریت یقیناً اچھی چیز ہے مگر اب تو یہ حالت ہے کہ اہم مُعاملات کا کمیٹیوں میں پیش ہو کر بسا اوقات یہ حشر ہوتا ہے کہ بقول شاعر مصرعہ۔

شُد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیرہا۔

دہلی کا جلسہ

جن والیانِ ملک سے میں واقف ہوں اُن میں خدا بخشے نواب سید حامد علیخاں بہادر والیِ رام پور جیسے علم و فضل اور سمجھ بوجھ کا آدمی میں نے نہیں دیکھا سر جیمس مسٹن تو ستمبر کے مہینہ میں رُخصت لے کر انگلستان جا چکے تھے اخباروں کا بیان تھا کہ اُنہوں نے نجی ضروریات کے باعث رُخصت لی ہے۔ مگر مُسلمانوں کا خیال تھا کہ اُنہوں نے کانپور کے حالات کے متعلق وزیر ہند کے کان بھرنے کی غرض سے یہ سفر اختیار کیا ہے۔ اگر لاٹ صاحب واقعات وزیر ہند کے گوش گُزار کرتے تو اُس کے یہ معنی ہوتے کہ تنہا پیش قاضی روی راضی آئی مُسلمانوں نے یہ طے کیا کہ لاٹ صاحب کو یک طرفہ بات چیت کرنے کا موقعہ نہ ملے آگے آگے لاٹ صاحب گئے پیچھے پیچھے مولانا محمد علی جو اپنے ہفتہ وار انگریزی اخبار کامریڈ میں واقعہ کانپور کے متعلق ایک زبردست سلسلۂ مضامین شائع کر چکے تھے۔ اور سیّد وزیر حسن جو اُس وقت آل انڈیا مُسلم لیگ کے مُستعد اور نبرد آزما سکرٹری تھے یہ کہتے ہوئے بمبئی سے انگلستان روانہ ہوئے۔ شعر:۔ ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے ٭ کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی ٭ (میر حسین تسکین) انگلستان کی داستان مختصر ہے اُس زمانہ میں رائٹ آنریبل سید امیر علی کا دَور دورہ تھا موصوف سنہ ۱۹۰۹ء کے مسودۂ اصلاحات کے متعلق قوم کی اہم خدمات انجام دے چکے تھے وزیر ہند لارڈ کریو تھے۔ سید امیر علی کا لارڈ مارلے سے بگاڑ ہو چکا تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ لارڈ کریو سے بھی تعلقات خراب ہو جائیں سنہ ۱۹۰۴ء میں پنشن لینے کے بعد مسٹر امیر علی نے انگلستان کی سکونت اختیار کر لی تھی وہ مسجد کانپور کے مسئلہ کی سیاسی اہمیت سے ناواقف تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن سے ہندوستانی مُسلمانوں کے دونوں نمائندوں کی دُبدھا جس سے مسجد کانپور کی تحریک کو تھوڑا سا نقصان پہنچا مگر بڑے آدمیوں کی نازبرداری کوئی کب تک کرے مسٹر امیر علی تو علیحدہ رہے مگر ہندوستان کے مُسلمانوں کو جو کچھ کرنا تھا اُنہوں نے بغیر موصوف کی امداد کے کر دکھایا۔ نواب حامد علی خاں مرحوم کی سر جیمس مسٹن سے دوستی تھی، ہز ہائنس نے دہلی میں یکم اکتوبر سنہ ۱۹۱۳ء کو معتقدر مسلمانوں کا ایک جلسہ بصیغۂ راز منعقد کرنا چاہا

اور بڑی احتیاط سے دعوتی رقعے جاری کئے گئے۔ مجھ جیسے شورش پسند آدمی کو اس جلسہ میں کیوں مدعو کیا جاتا مگر بقول ئے بمصرعہ۔ نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا مجھے تین چار دن پہلے اس جلسہ کی خبر ہو گئی میں نے نواب صاحب کی خدمت میں اس مضمون کا تار بھیجا کہ میں مسلمانان روہیلکھنڈ و کمایوں کا منتخب شدہ نمائندہ ہوں آپ یکم اکتوبر کو دہلی میں مسلمانوں کا جلسہ منعقد فرما رہے ہیں جس میں شرکت کی دعوت آپ نے مولوی عبدالباری صاحب فرنگی محلی یا راجہ صاحب محمود آباد یا نواب وقارالملک کو نہیں دی ہے مجھ ناچیز کو بھی آپ نے مدعو نہیں کیا ہے لیکن روہیلکھنڈ اور کمایوں کے مسلمانوں کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے میرا ارادہ ہے کہ جلسۂ مذکور میں شرکت کروں۔ یکم اکتوبر ۱۹۱۳ء کو میرا دیوانی کا ایک بڑا مقدمہ شروع ہونے والا تھا جس میں اور وکیل بھی میرے ساتھ تھے لیکن موکل مجھ سے پیروی کرانا چاہتا تھا میں نے مقدمہ کے کاغذات اپنے ساتھی وکیل کے پاس بھیجدیئے اور ۳۰ ستمبر کی شب میں مراد آباد سے روانہ ہو کر یکم اکتوبر کی صبح کو دہلی پہنچا۔ مولانا محمد علی انگلستان میں تھے مولانا شوکت علی سے دہلی میں ملاقات ہوئی مگر نواب حامد علی خاں مرحوم سے مولانا کے کچھ ایسے تعلقات تھے کہ انہوں نے جلسہ میں میرے ساتھ جانے یا کھلم کھلا مجھے مدد دینے سے انکار کر دیا۔ اُس زمانہ میں اخبار کامریڈ کا چھوٹا بھائی روزانہ اخبار ہمدرد مولوی محمد فاروق صاحب کی اڈیٹری میں دہلی سے نکلتا تھا۔ فاروق صاحب بڑے اچھے انشا پرداز ہیں۔ اُس عہد کے ہمدرد میں بڑے زبردست افتتاحیہ مقالے لکھتے تھے۔ ادارۂ ہمدرد سے مل کر میں نے جلسہ کا مقام اور وقت معلوم کیا۔ یہ دونوں باتیں دعوت نامہ میں نہیں درج کی گئی تھیں بلکہ بصیغۂ راز رکھی گئی تھیں، میں جلسہ میں پہنچا باہر رام پور کے سپاہیوں کا پہرہ تھا۔ ہال کھچا کھچ حاضرین سے بھرا ہوا تھا۔ نواب صاحب رام پور بحیثیت صدر تشریف فرما تھے۔ اُن کے داہنے ہاتھ پر حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم اور بائیں ہاتھ پر نواب اسحاق خاں صاحب مرحوم بیٹھے ہوئے تھے، نواب صاحب کے قریب میاں محمد شفیع مرحوم بھی موجود تھے اُن کے پاس

نواب حمید اللہ خاں صاحب مرحوم سربلند جنگ (حیدرآباد کے پنشن یافتہ چیف جسٹس) بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر ہز ہائینس نے ارشاد فرمایا یہاں میرے قریب آجائیے۔ میں نے عرض کیا، میں ناخواندہ مہمان ہوں میری جگہ یہاں (یعنی پائین میں) ہے۔ میں یہ کہہ کر بیٹھ گیا۔ جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی نواب اسحاق خاں اور میاں محمد شفیع نے تقریریں کیں۔ تقریروں کے دوران میں کہیں کہیں حکیم اجمل خاں بھی ایک آدھ فقرہ کہہ دیتے تھے۔ میں کھڑا ہو گیا اور غالباً پندرہ بیس منٹ تک تقریر کی۔ آج وہ سب باتیں خواب معلوم ہوتی ہیں لیکن چونکہ اس خواب کی تعبیر کا اثر مسلمانوں کے مستقبل پر تھا اور ہوا اس لئے مختصراً یہ بتا دینا شاید نامناسب نہ ہو کہ میں نے اپنی تقریر میں ہز ہائی نس کو خطاب کرتے ہوئے یہ کہا تھا

"حضور کو خدا نے والی ملک بنایا ہے مسلمانوں کے اس جلسہ کو حضور نے طلب فرمایا ہے حضور کا مقصد یہ ہے کہ کان پور کی مسجد کا معاملہ باہمی مفاہمت کے ذریعہ سے طے ہو جائے مگر تعجب ہے کہ ان حضرات میں سے کوئی ایک بھی اس جلسہ میں مدعو نہیں کیا گیا۔ جن کا اس مسئلہ سے نہایت گہرا تعلق ہے اس وقت مسلمانوں کے مذہبی پیشوا مولوی عبد الباری صاحب فرنگی محلی ہیں، نواب وقار الملک سر سید احمد خاں مرحوم کے سچے جانشین ہیں، اور ان کا جو احترام اور عظمت و وقار مسلمانوں کے دلوں میں ہے وہ اس جلسہ سے پوشیدہ نہیں ہے، جو کھیل اس وقت کھیلا جا رہا ہے اس میں راجہ محمود آباد نے اپنی ریاست کو داؤں پر لگا دیا ہے مسٹر مظہر الحق چھ ہفتہ سے کانپور میں مقیم ہیں اور بڑی سرگرمی اور مستعدی سے کانپور کے مظلوموں کی خدمت کر رہے ہیں۔ کیا حضور والا نے ان جاں بازوں اور سرفروشوں میں سے کسی کو جلسہ میں شرکت کی دعوت دی ہے۔ میں قوم کا ایک نہایت ناچیز اور کمترین فرد ہوں مگر اسی کے ساتھ صوبہ کے نو ضلعوں کے مسلمانوں کا صوبہ کی کونسل میں نمائندہ ہوں اور اگر اجازت ہو تو بمصداق۔ مصرعہ۔ کہنے میں بات آتی ہے یہ کچھ گلا نہیں۔ کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ جلسہ کی شرکت کا کوئی دعوت نامہ میرے نام بھیجا گیا، حضور والی ملک ہیں

اور سارے شرکاء جلسہ سوائے میرے آپ کی دعوت پر یہاں آئے ہیں آپ جس قسم کا رزولیوشن چاہیں جلسہ سے منظور کرا سکتے ہیں مگر اتنا عرض کر دینا میرا فرض ہے کہ اگر اس جلسے نے کوئی ایسا رزولیوشن پاس کیا جس سے عام مسلمانوں اور اُن مسلمان لیڈروں کی تشفی نہ ہوئی جن میں سے بعض کا میں ابھی نام لے چکا ہوں یا جس سے ہمارے مذہبی احترام میں خلل واقع ہوا تو یاد رہے کہ گاؤں گاؤں، قصبہ قصبہ، شہر شہر میں مسلمان جلسے کر کے آج جو رزولیوشن حضور کی صدارت و قیادت میں پاس کیا جائیگا اس کی تردید کریں گے۔" ہز ہائی نس کے دل میں مذہب کا جو سچا احترام تھا اور معاملہ فہمی کی جو بے نظیر قابلیت خدائے تعالیٰ نے اُن کو عطا کی تھی، اُس کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہو گا کہ باوجودیکہ جلسہ میں صرف دو آدمی یعنی خان بہادر سید آل نبی مرحوم اور مولوی محمد یعقوب مرحوم میرے ہم آواز تھے اور بقیہ سارے کا سارا جلسہ ہز ہائی نس کی آواز پر لبیک کہنے کے لئے تیار تھا۔ ہز ہائی نس نے جلسے سے اصل قضیہ کانپور کے تصفیہ کے بارہ میں کوئی رزولیوشن پاس نہیں کرایا بلکہ جو رزولیوشن جلسہ سے منظور کرایا گیا وہ اس مضمون کا تھا کہ ایک اور جلسہ منعقد کیا جائے جس میں قوم کی خواہشات معلوم کرنے کے بعد اس امر پہ غور و خوض کیا جائے کہ گورنمنٹ سے کن شرائط پر تصفیہ کر لینا قوم کے لئے مُفید ہے۔ اِس جلسہ کے بعد ہز ہائی نس کی دعوت پر میں رام پور گیا اور موصوف سے میری مفصل گفتگو کانپور کے اہم معاملہ کے بارہ میں ہوئی۔ دورانِ گفتگو میں ہز ہائی نس نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ دہلی کا جلسہ کن حالات میں اور کس شخص کی تحریک پر کیا گیا تھا۔ ہز ہائی نس نے مجھ سے یہ بھی فرمایا تھا کہ یہ سب باتیں بہ صیغۂ راز اُنہوں نے مجھ سے کہی ہیں اور یہ راز مجھ سے کسی دوسرے تک نہ پہونچے۔

میں نے راز داری کا وعدہ کر لیا تھا، آج ہز ہائی نس دُنیا میں نہیں ہیں، مگر اُن کا راز میرے سینہ میں محفوظ ہے۔ اور اس وقت تک محفوظ رہے گا جب تک میں زندہ ہوں۔

سر علی امام اور ملک و قوم کی بے نظیر خدمت

سید علی امام وائسرائے کی ایگزیکٹیو کونسل کے دوسرے ہندوستانی ممبر اور مسٹر سنہا (بعد کو لارڈ سنہا ہوئے) کے جانشین تھے موصوف اس زمانہ کے قابل ترین مسلمان تھے وہ مسلم لیگ کے اُس سالانہ اجلاس کے صدر تھے جو دسمبر سنہ ۱۹۰۸ء میں امرتسر میں منعقد ہوا تھا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اُنہوں نے کانگریس کے کسی اجلاس میں بحیثیت ممبر شرکت نہیں کی مگر مسلمانوں کے حقوق کی سختی سے محافظت کرنے کے باوجود وہ کانگریس کے اکابر اور زعما سے بھی دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں اُن کی جدوجہد کا یہ نتیجہ ہوا کہ مسلمانوں کو نیابت جُداگانہ کا حق ملنے کے ساتھ ساتھ ایک مشترک حلقۂ انتخاب بھی قائم ہوا جس کی نمائندگی کا حق بلالحاظِ مذہب و مِلت ہر اُس ہندوستانی کو تھا جو اس حلقۂ انتخاب کا ممبر تھا۔ کوتہ اندیش مسلمانوں کی طرف سے اُس زمانہ میں سید علی امام پر لے دے ہوئی اور لیگ کے اونچے حلقوں میں بھی اُن کا یہ عمل پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا گیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ محدود مشترکہ حلقۂ انتخاب رکھنے کی تجویز لارڈ مارلے کی سیاسی تجربہ کاری اور فراست کی بہت اچھی مثال اور سید علی امام کی دور اندیشی کی قابلِ قدر دلیل تھی۔
مسلمانوں کو اُس زمانہ میں شکایت تھی اور بجا شکایت تھی کہ مشترکہ حلقۂ انتخاب میں ہندو اکثریت مسلمانوں کے ساتھ سوتیلی ماں کا سا برتاؤ کرتی ہے، لارڈ مارلے تجربہ سے یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ اگر تعلیم یافتہ اور باخبر ہندوستانیوں کا ایک مشترک حلقۂ انتخاب بنا دیا جائے تو ایسے حلقہ کے ممبر ملکی مفاد کو مذہبی اختلافات پر ترجیح دیں گے یا نہیں۔
بہ الفاظ دیگر ایسا حلقۂ انتخاب مسلمانوں کو اپنا نمائندہ منتخب کرے گا یا نہیں سید علی امام پکے ہندوستانی ہونے کے ساتھ سچے مسلمان تھے وہ شملہ میں بیٹھے کانپور کے واقعات کا بغور مطالعہ کرتے رہے اور وقتِ مناسب پر یعنی اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں اُنہوں نے لارڈ ہارڈنگ کو آمادہ کیا کہ کانپور کے قضیہ نامرضیہ کو اب اور آگے نہ بڑھنے دیں۔ میں ۱۰ اکتوبر سنہ ۱۹۱۳ء کو شملہ

اس نیت سے گیا تھا کہ وہاں کچھ دن قیام اور آرام کروں گا میرا قیام سسل ہوٹل میں تھا۔ علی امام صاحب کی کوٹھی وہاں سے بالکل قریب تھی میں نے ٹیلیفون کیا معلوم ہوا کہ راجہ صاحب محمود آباد بھی مع مسٹر بنی اللہ اُن کے یہاں مقیم ہیں اور ایک ضروری معاملہ میں مجھ سے مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔ علی امام صاحب الور آرم میں رہتے تھے میں کوٹھی پر پہنچا۔ راجہ صاحب سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ مسجد کانپور کے تصفیہ کی گورنمنٹ سے علی امام صاحب کی وساطت سے بات چیت ہو رہی ہے بعض معاملات طے ہو گئے ہیں اور بعض ہنوز باقی ہیں میں آج ہی دن کے ایک بجے کی ٹرین سے مولوی عبد الباری صاحب سے مشورہ کرنے لکھنؤ جا رہا ہوں آپ بھی میرے ساتھ چلئے راستہ میں سب مفصل حالات میں آپکو بتا دوں گا۔ شملہ کا میرا یہ پہلا سفر تھا اور میں دو ہفتہ تک شملہ میں ٹھہرنا چاہتا تھا مگر یہ کام ضروری تھا میں اسی دن راجہ صاحب کے ساتھ لکھنؤ روانہ ہو گیا، ایک دن لکھنؤ ٹھہر کر مولوی عبد الباری صاحب اور دوسرے احباب سے مسئلہ مسجد کانپور کے متعلق مشورہ کیا اور ضروری مراتب طے کرنے کے بعد راجہ صاحب اور میں پھر شملہ روانہ ہو گئے اور سر علی امام کے یہاں ٹھیرے موصوف کی معرفت گورنمنٹ سے جن شرائط پر معاملہ طے ہونا قرار پایا تھا وہ حسب ذیل تھے :۔

اول مسجد کی سطح چونکہ زمین سے کئی فٹ بلند تھی اس لئے جس جگہ غسل خانے واقع تھے وہ بدستور تعمیر کر لئے جائیں گے مگر نیچے کی زمین پر فٹ پاتھ بنا دیا جائیگا تاکہ رہرو اُس پر سے گزر سکیں۔ دوم۔ فوجداری کا وہ مقدمہ جس میں مسلمان ملزم سشن سپرد ہو چکے تھے اور جس کی سماعت کے لئے مسٹر ڈی۔ آر۔ لائل کی عدالت میں اکتوبر ۱۳ ۱۹ء مقرر تھی وہ اُٹھا لیا جائیگا اور جملہ ملزمان بری کر دئے جائیں گے۔ اُسی شام کو سید علی امام نے لارڈ ہارڈنگ سے مل کر سارا معاملہ تفصیل کے ساتھ طے کیا، رات کو کھانے کے بعد ایگزیکٹیو کونسل کے اپنے ساتھیوں سے ٹیلیفون پر بات چیت کی اور رات کے دو بجے تک تار کی لین یہ کار سرکار صاف کرا کر مسٹر مظہر الحق سے جو کانپور میں تھے اور بعض دیگر مسلمان احباب سے ٹیلیفون پر گفتگو کی، دوسرے دن

ہم شملہ سے کانپور روانہ ہوئے اور لارڈ ہارڈنگ بھی بذریعہ اسپیشل ٹرین کالکا سے کانپور پہنچے۔

مسئلہ کانپور کا تصفیہ — راجہ صاحب محمود آباد اور میں فرسٹ کلاس کے ایک ہی درجہ میں تھے ہم ڈاک گاڑی سے کانپور روانہ ہوئے تھے جس میں سید علی امام کا سیلون بھی لگایا گیا تھا تصفیہ کی خبر کانپور پہونچ چکی تھی اور ہزاروں مسلمان اسٹیشن پر موجود تھے۔ راجہ صاحب اور میں اس کوٹھی میں جا کر ٹھہرے جہاں ہمارے قیام کا انتظام تھا۔ دن کے گیارہ بجے وہ جلسہ شروع ہوا جس میں لارڈ ہارڈنگ شرائطِ تصفیہ کا اعلان کرنے والے تھے، معزز مسلمان اس جلسہ میں بڑی کثرت سے شریک تھے مقامی حکام نے بھی شرکت کی تھی مسٹر بیلی قائم مقام لفٹنٹ گورنر اور سید علی امام بھی موجود تھے، وقتِ مقررہ پر لارڈ ہارڈنگ آئے اور اپنی تقریر شروع کی۔

اس تقریر کی دو باتیں قابلِ تذکرہ ہیں۔ ایک تو لارڈ ہارڈنگ نے انڈین سول سروس کو خوش رکھنے کے لیے کانپور کے مسلمانوں کی زیادتیوں کو اس طرح بیان کیا گویا مقامی مسلمان قابلِ الزام ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ دورانِ تقریر میں لارڈ ہارڈنگ نے بتایا کہ شرائطِ تصفیہ سے سر جیمس مسٹن کو جو انگلستان میں تھے مطلع کر دیا گیا ہے اور مسٹن صاحب نے شرائط مذکورہ سے اپنی رضامندی کا اظہار کیا ہے۔ جیسا کہ اُن موقعوں پر اکثر ہوتا ہے جہاں مقامی جذبات اور مقامی مصلحت اہم قومی سیاسی اغراض پر غالب ہو جائیں۔ کانپور میں تو اس تصفیہ پر بڑی خوشیاں منائی گئیں مگر لارڈ ہارڈنگ کی تقریر جب اخباروں میں چھپی اور مسلمانوں نے اُسے پڑھا تو مسلمانوں کی ایک جماعت کو یہ خیال پیدا ہوا کہ کانپور کے معاملہ میں قوم کو فتح کے ساتھ شکست بھی ہوئی۔ یہ خیال کوتہ اندیشی پر مبنی اور بالکل غلط تھا معترضین نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ مسلمانوں کا مقابلہ ایک ایسے لفٹنٹ گورنر سے تھا جسکو اُس زمانہ کی انڈین سول سروس اپنا گل سر سبد سمجھتی تھی مسٹن صاحب اُن پولیس والوں کی خدمات کو جنہوں نے مسلمانوں پر فیر کئے تھے زوردار الفاظ میں سراہ چکے تھے اور کہہ چکے تھے کہ غسلخانے دوبارہ بنانے کی اجازت کبھی نہ دی جائے گی، لارڈ ہارڈنگ کے تصفیہ کی بموجب

سارے ملزم بری کردیئے گئے اور مسلمانوں کو امام متنازعہ کے بالائی حصہ پر جو فرش مسجد کی ہم سطح تھا دوبارہ غسل خانے تعمیر کرنے کی اجازت مل گئی، یہ مسلمانوں کی ایسی نمایاں کامیابی تھی جس کی نظیر برٹش گورنمنٹ اور ہماری قوم کے باہمی تعلقات میں اُس وقت تک موجود نہ تھی رہی یہ بات کہ لارڈ ہارڈنگ کا فیصلہ سر جیمس مسٹن کو منظور تھا اس کی حقیقت یہ ہے کہ بہت سے سیاست داں حضرات اور خود بعض انگریزوں کا یہ خیال تھا کہ لارڈ ہارڈنگ کے تصفیہ کو منظور کرنے کی بجائے سر جیمس مسٹن کو استعفا دے دینا چاہیئے تھا مسلمانوں کی زبردست اکثریت نے لارڈ ہارڈنگ کے تصفیہ کو اپنی فتح سمجھا اور بالکل بجا سمجھا لیکن ایک قلیل جماعت اس تصفیہ پر کچھ عرصہ تک معترض رہی، اس قلیل جماعت کے طریق عمل سے ثابت ہوتا تھا کہ اس وقت تک ہماری قوم کے بعض حضرات سیاسی مسائل کی نزاکت اور اُن کے آئندہ اثرات سے ناواقف ہیں۔ لارڈ ہارڈنگ کے تصفیہ کو آج ٹھیک تیس سال ہوگئے۔ وائسرائے نے اپنی تقریر میں جو کچھ کہا تھا آج اُس کا حال شاید سو میں سے ایک مسلمان کو بھی معلوم نہیں مگر ساری قوم اس حقیقت سے خبردار ہے کہ سر جیمس مسٹن لفٹنٹ گورنر کے مقابلہ میں قوم کو نمایاں کامیابی ہوئی مسلمانوں کی سیاسی رفتار کو جس طرح واقعہ کانپور نے تیز کیا اُس کی کوئی مثال ۱۹۱۳ء تک مسلمانان ہند کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ گو اس کامیابی کا سہرہ ہمیشہ مولوی عبدالباری صاحب اور مہاراجہ صاحب محمود آباد کے سر رہے گا لیکن اس حقیقت کو بھی کبھی نہ بھولنا چاہیئے کہ اگر سید علی امام جیسا محب قوم وائسرائے کی ایگزیکیٹو کونسل کا ۱۹۱۳ء میں ممبر نہ ہوتا تو ہمیں اس معاملہ میں بھی ایسی ہی ناکامی ہوتی جیسی ۱۹۰۰ء میں اُردو ناگری کے مسئلہ میں سر انٹانی میکڈانل کے مقابلہ میں ہوئی تھی یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ کانپور کی کامیابی ہماری قوم کو محض اپنی ذاتی جدوجہد سے بغیر ہندو بھائیوں کی امداد کے حاصل ہوئی۔

آگرہ میں مسلم لیگ کا اجلاس

آخر دسمبر ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس آگرہ میں منعقد ہوا۔ سر ابراہیم رحمت اللہ صدر تھے۔ آغا خان بھی

اِس اجلاس میں شریک تھے دوران اجلاس میں مولانا محمد علی اور سر وزیر حسن انگلستان سے واپس ہو کر آگرہ پہونچے اور انگلستان کی داستان بیان کی۔ اجلاس میں ایک رزولیوشن پیش ہوا کہ گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ نیابت جداگانہ کی توسیع مقامی انتخابی جماعتوں یعنی ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپلیٹیوں میں بھی کردی جائے۔ کونسلوں کے چار سال کے تجربے کے بعد مُسلمانوں کو یقین ہو گیا تھا کہ مقامی جماعتوں میں بھی نیابت جداگانہ کے اصول کا عمل درآمد نہایت ضروری ہے مگر ہم سب یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس رزولیوشن کی مخالفت بڑے بڑے مُعتدر مُسلمان لیڈروں نے کی جن میں سے آغا خان، مولینا محمد علی، اور مسٹر جناح کے نام قابلِ تذکرہ ہیں۔ رزولیوشن کی مخالفت کی وجہ صرف یہ بتائی گئی کہ اس سال اس رزولیوشن کا پاس کرنا خلافِ مصلحت ہے لیکن مصلحت کی توضیح و تشریح مطلق نہیں کی گئی۔ رزولیوشن کی تائید سر ابراہیم رحمت اللہ، خان بہادر سیّد آل نبی نے اور میں نے اور دوسرے بہت سے مُسلمانوں نے جن کو سیاسی مُعاملات کا کافی تجربہ تھا کی، دونوں طرف سے زبردست تقریریں ہوئیں مگر ہماری تقریروں میں گرمی زیادہ تھی۔ مجمع اس قدر زیادہ تھا کہ ہاتھ اُٹھوا کر ووٹ لینا قابلِ عمل نہ تھا لہٰذا لیگ کے قواعد و ضوابط کے بموجب ووٹ صوبہ وار لئے گئے یعنی جس صوبہ کو آل انڈیا مُسلم لیگ کی کونسل میں جتنے ممبر بھیجنے کا حق حاصل تھا اُتنے ہی ووٹ اُس صوبہ کے قرار دے کر اُس تناسب سے تقسیم کر دیئے گئے جو صوبہ کے حاضرین جلسہ میں موئدین و مخالفین کی تعداد تھی نتیجہ یہ ہوا کہ زبردست کثرتِ رائے سے رزولیوشن منظور ہوا۔

لارڈ ہارڈنگ اور مُسلم ڈیپوٹیشن

مسجد کانپور کا مُعاملہ اگرچہ مذہبی اور سیاسی پہلو رکھتا تھا مگر دراصل یہ مُقابلہ راجہ صاحب محمود آباد اور سر جیمس مسٹن کے درمیان تھا۔ لاٹ صاحب نے شورش کو کم وزن بنانے کی غرض سے یہ ثابت کرنا چاہا تھا کہ من حیث القوم مسلمانوں کا کانپور کی بے چینی سے تعلق نہیں ہے بلکہ چند شورش پسند مُسلمانوں نے بات کا بتنگڑ بنا رکھا ہے اور شورش کے کرتا دھرتا راجہ صاحب محمود آباد ہیں جن کی گورنمنٹ کے

ساتھ وفاداری بھی قابلِ اطمینان نہیں ہے۔ فروری ۱۹۱۴ء میں راجہ صاحب نے مناسب سمجھا کہ مسلمانانِ ہند کا ایک ڈپوٹیشن لارڈ ہارڈنگ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس بے بنیاد اعتراض کا قابلِ تشفی جواب دے۔ اس ڈپوٹیشن کو اظہارِ وفاداری کا ڈپوٹیشن سمجھنا چاہیئے جو بہت سے مسلمانوں کی رائے میں غیر ضروری تھا مگر منظم پولیٹکل زندگی میں اس طرح کے واقعات کا پیش آنا ناگزیر ہے۔ مسلم لیگ کے اور مسلمانوں کے سب سے بڑے پولیٹکل لیڈر اُس وقت راجہ صاحب محمود آباد تھے اور اُن کے اثر و اقتدار کو سر جیمس مسٹن کے مقابلہ میں قائم رکھنا ہم سب مسلمانوں کا فرض تھا۔ موجودہ سیاسی زندگی اور اُس طریقِ کار کا جس کا نام پارٹی بندی ہے چولی دامن کا ساتھ ہے پارٹی کے اربابِ بست و کشاد کسی اہم معاملہ میں جو فیصلہ کریں ممکن ہے اُس سے پارٹی کے بہت سے افراد کو اتفاقِ رائے نہ ہو مگر اُس فیصلہ پر کاربند ہونا تمام پارٹی کا فرض ہے یہی وجہ تھی کہ اس ڈپوٹیشن میں مسٹر جناح اور مسٹر مظہر الحق جیسے آزاد خیال مسلمانوں نے شرکت کی تھی۔ ڈپوٹیشن میں شرکت کی غرض سے جو لوگ دہلی آئے تھے ان میں خان بہادر سید آلِ نبی اور میں ہم دونوں بھی تھے۔ ڈپوٹیشن کے پیش ہونے سے دو دن پہلے ایڈریس کا مسودہ ڈپوٹیشن کے ممبروں کے جلسہ میں پیش کیا گیا۔ مسئلہ کانپور میں مسلمانوں کی کامیابی کے باعث اُس زمانہ میں مسٹر مظہر الحق کا طوطی بول رہا تھا۔ اخبار پائنیر کا اُس عہد میں جو وقار تھا اُس کا اندازہ اکبر الہ آبادی کے حسب ذیل شعر سے ہوگا۔ ؎

پائنیر کے صفحۂ اول پہ جس کا ذکر ہو ٭ میں ولی مانوں جو اُسکو عاقبت کی فکر ہو

کچھ دن پہلے پائنیر میں مسٹر مظہر الحق کی شخصیت پر ایک لیڈنگ آرٹیکل (افتتاحیہ) شائع ہو چکا تھا۔ مسودۂ ایڈریس میں سر سید احمد خاں علیہ الرحمۃ کی خدمات کا تذکرہ تھا۔ مسٹر مظہر الحق کانگریس کے سرگرم ممبر تھے انہوں نے اُن الفاظ پر اعتراض کیا۔ میں نے جواب دیا کہ مسلمانوں میں سیاسی احساس کے پیدا کرنے والے سر سید تھے لہٰذا ان الفاظ کا قائم رکھنا ضروری ہے۔ مسٹر مظہر الحق نے گرم ہو کر کہا آپ سر سید کی پولیٹکل خدمات کو قابلِ ستائش سمجھتے ہیں میں تو

اُن خدمات کو قابلِ شرم قرار دیتا ہوں، میں نے بھی کڑک کر جواب دیا اپنی اپنی رائے کے اظہار کا ہر شخص کو حق ہے مگر اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اگر سر سید قوم میں سیاسی بیداری پیدا نہ کرتے تو آج بہت سے مُسلمانوں کی پولیٹکل لیڈری عالم وجود میں نہ آتی، آلِ نبی مرحوم نے میری تائید کی. جلسہ تو مسٹر مظہر الحق سے مرعوب تھا مگر راجہ صاحب محمود آباد اور چند اور دوستوں نے بیچ بچاؤ کرنا چاہا مسٹر جناح اُس وقت تک بمبئی سے دہلی نہیں پہنچے تھے. بعض اصحاب کی رائے ہوئی کہ سر سیّد کی خدمات کے اعتراف کے بارہ میں جو فقرہ مسودہ میں موجود ہے اُسے قلم زد کر دیا جائے اور اس کی بجائے جہاں سر سیّد کا تذکرہ ہے وہاں اُن کا عظیم الشان کام great work کے الفاظ درج کر دیئے جائیں. مسٹر مظہر الحق تو اس پر راضی ہوگئے مگر میں نے اس تبدیلی کو منظور نہیں کیا اور کہہ دیا کہ جب تک ایڈریس میں اصلی فقرہ نہ لکھا جائیگا میں ڈپوٹیشن میں شرکت سے معذور ہوں آلِ نبی مرحوم نے میرا ساتھ دیا اور رات کی ٹرین سے میں مُراد آباد روانہ ہوگیا اور وہ آگرہ کو واپس چلے گئے. راجہ صاحب کو میری روانگی کا علم نہیں ہوا، مُراد آباد پہونچنے کے کچھ گھنٹہ بعد مجھے راجہ صاحب کا تار ملا جس میں لکھا تھا کہ آپ کے واپس چلے جانے کا مجھے سخت افسوس ہے آپ فوراً دہلی چلے آیئے. ایڈریس میں آپ کی منشا کے موافق ترمیم کردی جائے گی. مَیں نے جواب میں تار بھیجا کہ ہم مُسلمان سوائے آپ کے اور کسی کو اپنا لیڈر نہیں سمجھتے. مَیں صرف اُس صورت میں ڈپوٹیشن میں شرکت کر سکتا ہوں کہ مسودہ کا اصلی فقرہ ایڈریس میں بدستور قائم رکھا جائے اور ایڈریس کی مطبوعہ کاپی میرے پاس کسی آدمی کے ہاتھ مُراد آباد بھیجدی جائے. تاریخ مقررہ پر ڈپوٹیشن نے وہی ایڈریس پیش کیا جس میں مسٹر مظہر الحق کے حسبِ منشا ترمیم درج تھی لارڈ ہارڈنگ نے ہمدردانہ اور معقول جواب دیا اور اس طرح یہ مرحلہ بھی جس کو سانحہ کان پور کی آخری منزل سمجھنا چاہیئے طے ہوگیا مَیں نے اور آلِ نبی مرحوم نے ڈپوٹیشن میں شرکت نہیں کی. راجہ محمود آباد کی کس کس خوبی کا بیان کروں اُس زمانہ میں میرے اُن کے گہرے مراسم تھے اس چھوٹی سی بات پر میرے بگڑ کر

چلے آنے سے راجہ صاحب کا آزردہ خاطر ہونا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ وہ بڑے ذکی الحس تھے مگر خدا بخشے جب اُن سے مہینہ بھر بعد لکھنؤ میں ملاقات ہوئی تو اس طرح ملے گویا دہلی میں کوئی بات ہوئی ہی نہ تھی۔ مسٹر مظہر الحق کی مطلق العنانی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا میں نے اِس لیئے ضروری سمجھا تھا کہ وہ چاہتے تھے کہ بغیر شرائط طے کیئے لیگ کانگریس کی ہمنوا ہو جائے جسے میں مسلمانوں کے لیئے خطرناک سمجھتا تھا۔

ٹون ایریا بل یکم دسمبر ۱۹۱۳ء کو ٹون ایریا بل صوبہ کی کونسل میں پیش ہوا اُس وقت تک ہمارے صوبہ کے قصبوں میں چوکی دارہ ایکٹ ۱۸۵۹ء نافذ تھا مگر وہ ایکٹ پرانا ہو گیا تھا اور اُس سے اُن قصبوں کی جہاں جہاں پنچایتیں قائم تھیں، ضروریات پوری نہیں ہوتی تھیں، میں نے ایک ترمیم پیش کی کہ جو قواعد حسب دفعہ ۳۹ بنائے جائیں اُن کی رو سے مسلمانوں کو نیابت جداگانہ کا حق دیا جائے۔ مسلمان ممبروں نے ترمیم کی موافقت میں اور ہندو ممبروں نے مخالفت میں تقریریں کیں البتہ ڈاکٹر تیج بہادر سپرو نے میری تائید کی اور کہا کہ اگر مسلمان جداگانہ نیابت کا حق چاہتے ہیں تو اس پیچیدہ مسئلہ کا بہترین حل یہ ہے کہ یہ حق مسلمانوں کو دیا جائے۔ مسٹر بم نے جو تقریر منجانب گورنمنٹ کی اُس میں معقولیت اور مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی دونوں باتیں موجود تھیں۔ مسٹر بم نے اس مسئلہ پر غور کرنے کا وعدہ بھی کیا تھا اِس لئے میں نے ترمیم واپس لے لی۔ سر جیمس مسٹن انگلستان سے واپس آچکے تھے اور یکم دسمبر کے کونسل کے جلسہ کی صدارت اُنہوں نے کی تھی۔ مسلمانوں کی ایک جماعت کا جس میں مَیں بھی شامل تھا خیال تھا کہ وہ کانپور کے واقعہ سے سبق لینگے اور کوئی ایسی بات نہ کریں گے جس کا مسلمانوں کے حقوق پر مضر اثر پڑے۔ ڈھائی برس بعد کے ایک اہم سیاسی واقعہ نے اس خیال کی تصدیق کر دی۔

سر تھیوڈر ماریسن اور سر علی امام مراد آباد میں ۱۹۱۳ء کے آخر میں سر تھیوڈر ماریسن بحیثیت ممبر اسلنگٹن کمیشن ہندوستان آئے، میں نے کمیشن مذکور کے سامنے شہادت دی تھی، اور

مارچ ۱۹۱۴ء میں میری دعوت پر اُستادِ شفیق (مارلین صاحب) مُراد آباد تشریف لائے تھے یہاں میں نے اُن کے اعزاز میں ایک بڑا ایٹ ہوم دیا تھا، کمیشن کے حالات اور مُراد آباد میں سر تھیوڈر مارلین سے جو گفتگو میری ہوئی اُس کی کیفیت کسی دوسری جگہ درج ہے۔ علیگڈھ کالج کے سابق اساتذہ اور اُن کے شاگردوں میں جو تعلقات عمر بھر قائم رہتے تھے اُس کی یہ بہت اچھی مثال تھی کہ مارلین صاحب مجھ سے ملنے اور ایٹ ہوم میں شرکت کرنے کی غرض سے ایک دن کے لئے مُراد آباد تشریف لائے۔ فروری ۱۹۱۵ء میں میری دعوت پر سر علی امام بھی مُراد آباد آئے تھے، سر علی امام کو بھی میں نے وسیع پیمانہ پر ایک ایٹ ہوم ٹاؤن ہال کے میدان میں دیا تھا۔ ریاست رام پور کی قربت کی وجہ سے ہم مُراد آباد والوں کو یہ آسانی ہے کہ بڑی تقریبوں میں جس قدر سامان کی ضرورت ہوتی ہے وہ والیِ رامپور کی سرکار سے عاریتاً منگا لیتے ہیں۔ یہ رسم نئی نہیں ہے بلکہ نواب یوسف علی خاں بہادر مرحوم کے عہد سے جاری ہے۔ مگر مسئلہ کانپور کے تصفیہ کے بعد نواب حامد علی خاں صاحب مرحوم نے مجھ سے تعلقات ترک کر دئے تھے یہاں تک کہ جب ہیوٹ مُسلم ہائی اسکول کے چندہ کے لئے اُن کی خدمت میں تحریک کی گئی، تو انہوں نے نواب محمد علی سے کہا کہ جب تک اسکول کا رضا علی سے تعلق ہے میں کوئی مالی امداد نہ دوں گا۔ میں نے جواب میں کہلا بھیجا کہ اسکول کی مدد فرمائیے میرا استعفا حاضر ہے۔ اجنبیت اور منافرت کا یہ دَور تیرہ سال تک رہا اور ۱۹۲۶ء میں نواب سر امیر الدین احمد خاں بہادر سابق والیِ لوہارو کے ذریعہ سے صفائی ہو گئی۔ اور اس طرح ہوئی کہ کوئی حرفِ شکوہ و شکایت زبان پر نہیں آیا۔ خدا بخشے نواب صاحب مرحوم کا دل ایسا ہی بڑا تھا جیسا ہمارا ملک وسیع ہے۔ ہمارے وہ والیانِ مُلک جن کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہے بہتے ہوئے دریا یا پھلوں سے لدے ہوئے درخت کی خاصیت رکھتے ہیں۔ دریا کی طرح پیاسوں کو سیراب کرتے ہیں اور بارور درخت کی طرح ضرورتمندوں کو اپنے سایہ میں جگہ دیتے اور اپنے پھل سے فیضیاب کرتے ہیں۔ رام پور کے لئے سوائے اِس کے کیا کہوں کہ بہ قول داغ ؎

سب اسے رام پور کہتے ہیں ٭ ہم تو آرام پور کہتے ہیں

۱۹۳۴ء میں موجودہ فرماں روائے رام پور ہز ہائی نس نواب سر سید رضا علی خاں بہادر نے سو روپے ماہوار کا دوامی عطیہ مرحمت فرما کر ہیوٹ مسلم ہائی اسکول مراد آباد کی ایسے وقت امداد فرمائی جب ہمارا اسکول مالی مشکلات میں مبتلا تھا اور جس کے لئے تمام مسلمانان مراد آباد ہز ہائینس کے تہ دل سے شکر گزار ہیں۔ جولائی ۱۹۴۲ء سے مراد آباد میں مسلمان لڑکیوں کا ہائی اسکول عبد السلام مسلم گرلس ہائی اسکول کے نام سے قائم ہوا ہے۔ مولوی عبد السلام نے اپنا بیش قیمت مکان جو زنانہ اسکول کے لئے خاص طور سے موزوں ہے اسکول کے حق میں وقف کر کے جو قابلِ قدر خدمت ضلع مراد آباد کے مسلمانوں کی کی ہے اس کا تذکرہ کسی اور جگہ ہو چکا ہے۔ ہر ہائینس بیگم صاحبہ رام پور نے پچھلے سال اس اسکول کا افتتاح اپنے دستِ مبارک سے فرمایا اب اسکول کو مستقل امداد کی ضرورت ہے مسلمانانِ مراد آباد کی آنکھیں ریاست رام پور پر لگی ہوئی ہیں جو سو برس سے اپنی علم دوستی و علم نوازی کے لئے مشہور ہے۔ وقت مناسب پر مراد آباد کے بھکاری ہز ہائی نس نواب صاحب اور ہر ہائی نس بیگم صاحبہ کے آستانۂ مبارک پر صدا لگائیں گے "خدا آباد اور خرم و شاد رکھے۔ تعلیمی ضروریات کے لحاظ سے لڑکیوں کا حق لڑکوں سے دو گنا ہے"۔ یہ تو جملۂ معترضہ تھا میں کہہ یہ رہا تھا کہ سر علی امام کی آمد کے موقع پر میں رام پور سے سامان نہ منگا سکا ایک خوبصورت اور بڑے شامیانہ کی ضرورت تھی جو مراد آباد میں کسی کے پاس موجود نہ تھا مجبوراً کرایہ پر شامیانہ میرٹھ سے منگانا پڑا۔ سر علی امام آئے۔ دوستوں سے ملے جلے ملیٹ ہوم ہوا۔ قاضی شوکت حسین خاں مرحوم نے بڑی شان دار دعوت کی اور یہ تمام وقت بڑے لطف سے گزرا۔

کونسل کی سرگرمیاں

۱۹ جولائی ۱۹۱۵ء کے اجلاس کونسل میں مسٹر یم نے صوبجات متحدہ کی میونسپلٹیوں کا بل پیش کیا۔ میونسپلٹیوں کا رائج الوقت ایکٹ جو ۱۹۰۰ء میں سر انٹانی میکڈانل کے زمانہ میں بنا تھا ہماری ضروریات پوری کرنے کے لئے

ناکافی تھا اس کے علاوہ تین ایکٹ اور ایسے تھے جن کا تعلق میونسپلیٹیوں سے تھا مگر آسانی کے لحاظ سے جہاں تک میونسپلیٹیوں کا تعلق تھا ان چہارایکٹ کا یک جائی ہونا ضروری تھا بقیہ تین ایکٹوں کے نام یہ تھے۔ واٹر ورکس ایکٹ سنہ ۱۸۹۱ء۔ لاجنگ ہوس ایکٹ سنہ ۱۸۹۲ء۔ سوریج ایکٹ سنہ ۱۸۹۴ء مقامی حکومت کو مزید اختیارات دینے کے بارہ میں جو رائل کمیشن قائم ہوا تھا اُس کی بعض سفارشوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بھی ضرورت تھی کہ سنہ ۱۹۰۰ء کے میونسپلیٹیوں کے ایکٹ کی ترمیم کی جائے۔ مسٹر پیم کے بعد میں نے تقریر کی اور منجملہ دیگر امور کے گورنمنٹ کی توجہ اس بات کی طرف دلائی کہ مسٹر پیم نے بل کا جو مسودہ کونسل میں پیش کیا ہے اُس کی ضخامت کے باوجود مسودہ میں مسلمانوں کی نیابت جداگانہ کا کوئی انتظام نہیں ہے، میری تقریر جو کونسل کی مطبوعہ کارروائی میں موجود ہے لمبی تھی یہاں اُس کا صرف ایک فقرہ نقل کرتا ہوں جس سے معلوم ہو جائے گا کہ آج سے تخمیناً تیس برس پہلے ہم مسلمان مقامی جماعتوں میں نیابت جداگانہ کی ضرورت کیوں محسوس کرتے تھے۔

"آج کل بھی مسلمان میونسپلیٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے ممبر ہیں مگر بڑی خرابی یہ ہے کہ جس شخص کو وہ اپنا صحیح نمائندہ سمجھتے ہیں اُس کو منتخب کرنا اُن کے اختیار سے باہر اس وجہ سے ہے کہ صرف وہ شخص میونسپل بورڈ یا ڈسٹرکٹ بورڈ کا ممبر منتخب ہونے کی جائز طور پر اُمّید کر سکتا ہے جس کو ووٹوں کی سب سے بڑی تعداد مل سکے اور یہ حالات موجودہ کسی مسلمان اُمّیدوار کو جو ہر طرح ممبری کی قابلیت رکھتا ہو ہندو اُمّیدوار کے مقابلہ میں آخر الذکر سے زیادہ ووٹ حاصل کرنے اور ممبر منتخب ہونے کی اُمّید نہیں ہو سکتی۔"

بحث و مباحثہ کے بعد مسٹر پیم کی تحریک منظور ہو گئی کہ بل رائے حاصل کرنے کی غرض سے مشتہر کیا جائے۔ میں ٹھیک آٹھ برس تک صوبہ کی کونسل کا ممبر رہا اور سوالات کرنے کے علاوہ متعدد رزولیوشن میں نے پیش کئے جن میں سے بعض ایسے رزولیوشنوں کا یہاں حوالہ دینا غالباً نامناسب نہ ہوگا جن سے اُس دور کی ملکی زندگی کی ناکامیوں اور نارسائیوں آرزوؤں

اور تمناؤں کا پتہ چلتا ہے۔ ۱۸ ار دسمبر ۱۹۱۵ء کے اجلاس کونسل میں ہیں نے حسب ذیل رزولیوشن پیش کیا۔ "یہ کونسل ہز آنر لفٹنٹ گورنر سے سفارش کرتی ہے کہ اس کونسل کے دستور میں ایسی ترمیمات کی جائیں جن سے کونسل میں منتخب شدہ ممبروں کی اکثریت ہو جائے"۔ کافی بحث کے بعد اس رزولیوشن کی موافقت میں چودہ ۱۴ حضرات نے رائے دی مخالف ووٹوں کی تعداد تینتیس ۳۳ تھی، جن چودہ حضرات نے موافقت میں رائے دی اُن کے نام یہ ہیں:۔ (۱) رانا سر شیوراج سنگھ۔ (۲) منشی مہادیو پرشاد۔ (۳) بابو بالک رام۔ (۴) راجہ کوشل پال سنگھ۔ (۵) بابو برج نندن پرشاد (۶) پنڈت موتی لال نہرو۔ (۷) رائے گوکل پرشاد بہادر۔ (۸) سید رضا علی۔ (۹) رائے بشمبر ناتھ بہادر۔ (۱۰) ڈاکٹر تیج بہادر سپرو۔ (۱۱) لالہ سکھ بیر سنگھ۔ (۱۲) منشی نرسنگھ پرشاد۔ (۱۳) سید آل نبی۔ (۱۴) رائے شنکر سہائے صاحب۔ خلاف رائے دینے والوں میں معہ لاٹ صاحب کے بیس انگریز ممبر تھے اور تیرہ ہندوستانی۔ ان تیرہ ہندوستانیوں کے نام یہ ہیں:۔ (۱) سید عبد الرؤف۔ (۲) مہاراجہ بلرام پور۔ (۳) شیخ شاہد حسین (۴) بابو موتی چند۔ (۵) منشی اصغر علی خاں۔ (۶) کنور آدیتہ نراین سنگھ۔ (۷) راجہ سر محمد تصدق رسول خاں۔ (۸) نواب سر محمد فیاض علی خاں۔ (۹) راجہ رام پال سنگھ۔ (۱۰) سید محمد ہادی۔ (۱۱) سید کرامت حسین۔ (۱۲) پنڈت تارا دت گیرولہ۔ (۱۳) رائے پراگ نراین بھارگوا بہادر۔ سید محمد ہادی اُس زمانہ میں ڈپٹی کلکٹر ہونے کی حیثیت سے سرکاری ممبر تھے اس لئے اُن کا ووٹ خارج کر دینا چاہیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز اور سرکاری ممبروں کے علاوہ چھبیس ۲۶ ممبروں نے اس رزولیوشن پر رائے دی، جن میں سے چودہ ۱۴ نے رزولیوشن کی تائید اور بارہ نے مخالفت کی۔ سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کو اُس وقت ڈیڑھ سال کے قریب زمانہ گذر چکا تھا اور انگلستان اور ہندوستان دونوں ملکوں کو معلوم تھا کہ اگر لڑائی میں انگلستان کو کامیابی ہوئی تو ہندوستان کو بہت وسیع پولیٹکل اختیارات دینا پڑیں گے۔ اس کے باوجود اُس زمانہ کی لوکل گورنمنٹ اور مرکزی گورنمنٹ میں تخیل کی بڑی کمی تھی اور اُن کے طریقِ عمل سے معلوم ہوتا تھا کہ "آنکھوں کے آگے ناک، سوجھے کیا خاک"۔ والی مثل اُن کے حال پر صادق ہے۔ سر جیمس مسٹن

مسٹر گوکھلے کے دوست ہی نہ تھے بلکہ اس زمانہ کے صوبہ کے حاکموں میں بڑے روشن خیال سمجھے جاتے تھے پھر بھی یہ نہ ہوا کہ وہ سرکاری ممبروں کو اس رزولیوشن پر ووٹ دینے سے باز رکھیں اور اُن کو غیر جانب دار رکھ کر رزولیوشن کا تصفیہ کونسل کے آزاد اور نامزد شدہ ممبروں کی رائے پر چھوڑ دیں۔ ۸ ؍ دسمبر ۱۹۱۵ء کے اجلاس کونسل میں ایک اور رزولیوشن میں نے یہ پیش کیا تھا" یہ کونسل ہز آنر لفٹنٹ گورنر سے سفارش کرتی ہے کہ پولیس کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹوں کا رتبہ اور حیثیت بڑھانے اور اُن کو ترقی کے بہتر موقعے دئے جانے کی غرض سے سپرنٹنڈنٹ پولیس کی جتنی اسامیاں صوبہ میں ہیں اُن میں سے آٹھواں حصہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹوں کی ترقی کے لئے محفوظ کر دیا جائے" ہمارے صوبہ میں پہلے ہندوستانی سپرنٹنڈنٹ پولیس سر سید احمد خاں مرحوم کے بڑے بیٹے مسٹر حامد تھے، ممکن ہے اُن کے بعد کسی اور ہندوستانی کا تقرر بھی اس عہدے پر ہوا ہو مگر میری طالب علمی کے زمانہ میں مسٹر اسلام اللہ خاں سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے اُنہوں نے ۱۹۱۱ء میں پنشن لی اور اُن کے بعد اُس وقت تک جب میں نے کونسل میں رزولیوشن پیش کیا کسی ہندوستانی کا تقرر اس عہدہ پر نہیں ہوا، بعض اور صوبوں میں ہندوستانی سپرنٹنڈنٹ پولیس موجود تھے مگر ہمارا صوبہ بڑے عہدوں پر ہندوستانیوں کے تقرر کے بارہ میں لکیر کا فقیر تھا، لندن کا امتحان مقابلہ پاس کرکے جو انگریز انڈین سول سروس کے ممبر مقرر ہوئے اُن میں سوائے پولٹیکل تخیل کے سب قابلیتیں موجود تھیں مگر جو مورخ آئندہ انڈین سول سروس اور امتحان مقابلہ کے صحیح واقعات لکھے گا اُس کو افسوس کے ساتھ اعتراف کرنا پڑے گا کہ اس جھرمٹ میں میکڈانل مسٹن اور ہیلی جیسے چمکتے ہوئے تارے تو نکلے مگر ہیوم[1] جیسا چاند نہ پیدا ہوا جس کی روشنی گہن لگ جانے کے

---

[1] مسٹر ہیوم غدر ۱۸۵۷ء میں اٹاوہ کے کلکٹر تھے۔ بعض حلقوں کا خیال تھا کہ وہ ہمارے صوبہ کے لفٹنٹ گورنر ہونگے مگر یہ اُمید پوری نہ ہوئی، کانگریس قائم ہونے سے پہلے وہ پنشن لے چکے تھے کانگریس قائم کرنے میں اُن کا ایسا زبردست ہاتھ تھا کہ بعض لوگ اُنہیں کانگریس کا بانی سمجھتے ہیں، ہیوم صاحب بڑے زبردست مدبر تھے۔ اگر کوئی شخص اُس زمانہ کی ملکی زندگی کی تصویر دیکھنا چاہے تو اُسے وہ خط و کتابت پڑھنی چاہئے جو ۱۸۸۶ء میں مسٹر ہیوم اور سر آکلینڈ کالون کے باہم ہوئی تھی۔

بعد بھی سب تاروں پر غالب تھی۔ اگر ملکی آزادی کے تخیل کو پیش نظر رکھا جائے تو سپرنٹنڈنٹ پولیس کے عہدے پر ہندوستانیوں کا تقرر بہت ہی چھوٹا مسئلہ ہے مگر جو ملک آزادی اور خودمختاری کی برکتوں سے محروم ہیں اُن کی سیاست اور پولیٹیکل احساس کا دَور انہیں چھوٹی چھوٹی باتوں سے شروع ہوتا ہے۔ ترقی کے ارتقائی منازل طے کرنے کے لئے بڑی قوموں کو بھی ان تنگ اور دشوار گزار گلیوں میں ہو کر گزرنا پڑتا ہے اسی وجہ سے میں نے ایسے متعدد معمولی واقعات درج کر دیئے ہیں جو بظاہر کوئی پولیٹیکل اہمیت نہیں رکھتے مگر جنہوں نے بہ حیثیت اجتماعی ہماری ملکی زندگی کی رفتار کو تیز کر دیا، کونسل کے جن ممبروں نے تقریریں کیں اُن سب نے میرے رزولیوشن کی تائید کی مگر مسٹر اوڈانل نے گورنمنٹ کی طرف سے تقریر کرتے ہوئے اسلنگٹن کمیشن کے حصار میں پناہ لی اور بیان کیا کہ بڑے محکموں کے عہدوں اور اُن عہدوں کی شرطوں کا مسئلہ اسلنگٹن کمیشن کے حوالہ کر دیا گیا ہے اور کمیشن مذکور کی رپورٹ جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے ابھی تک شائع نہیں کی گئی ہے اس لئے گورنمنٹ اس مسئلہ پر کسی رائے کا اظہار نہیں کر سکتی مثل مشہور ہے کہ :۔ مرتے کو ماریں شاہ مدار۔ اظہار رائے نہ کرنے کے باوجود مسٹر اوڈانل نے یہ بھی کہہ دیا کہ سید رضا علی کو اس مسئلہ کے حل کرنے میں کوئی دشواری معلوم نہیں ہوتی لیکن گورنمنٹ کی رائے میں اس راستہ میں ایسی رکاوٹیں ہیں جو ہٹائی نہیں جا سکتیں میں نے جواب اپنی تقریر میں کہا کہ یہ کھلا ہوا راز ہے کہ اسلنگٹن کمیشن سفارش کرے گا کہ ہندوستانیوں کا تقرر ذمہ دار عہدوں پر زیادہ وسیع پیمانہ پر کیا جائے دو یا تین ہندوستانیوں کو ترقی دے کر سپرنٹنڈنٹ پولیس بنانا ایسا اہم مسئلہ نہیں ہے جس کے لئے اسلنگٹن کمیشن کی رپورٹ کے انتظار میں گورنمنٹ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہے۔ میرے پہلے رزولیوشن کا حشر جو منتخب شدہ ممبروں کی اکثریت کے بارہ میں تھا میں دیکھ چکا تھا، دوسرے رزولیوشن پر اگر ووٹ لئے جاتے تو وہ بھی سرکاری اور نامزد شدہ ممبروں کی کثرت رائے سے نامنظور ہو جاتا اس لئے میں نے رزولیوشن واپس لے لیا۔ یہ واپسی ناتجربہ کاری پر مبنی تھی، جو حالت اُس زمانہ میں یو۔ پی کونسل کی تھی کم و بیش وہی حالت کانگریسی ممبروں کی عدم موجودگی

کے باعث مرکزی لیجسلیٹو اسمبلی کی آج کل ہے۔ منجملہ دیگر فوائد کے ووٹوں کے شمار کرانے کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ اُس سے ملک میں پولیٹیکل مسائل کے بارہ میں صحیح رائے قائم کرنے کا پبلک کو موقع ملتا ہے اور اس طرح پبلک کو پولیٹیکل تعلیم حاصل ہوتی ہے۔ یہ کہانی کونسل کی میری ابتدائی زندگی کی ہے۔ مصرعہ۔ یہ قصّہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا۔ اب تو یہ حالت ہے کہ یہ یقین ہونے کے باوجود کہ پبلک کے نمائندوں کو شکستِ فاش ہو گی مرکزی اسمبلی میں دھڑلّے سے رائے شماری کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور میرے نزدیک یہ طریقہ بہتر ہے اور کچھ نہیں تو اتنی تسکین قلب تو ہو جاتی ہے کہ مصرعہ۔ لیکن اُسے بتا تو دیا جان تو گیا۔

میونسپلٹیوں کا بِل سنہ ۱۹۱۶ء میں میونسپلٹیوں کا وہ بِل جو سال گزشتہ کونسل میں پیش ہو چکا تھا سنہ ۱۹۱۶ء کے بجٹ سیشن میں جو بالعموم ہر سال شروع اپریل تک رہتا تھا پیش ہوا جیسا میں اوپر لکھ آیا ہوں بِل میں مُسلمانوں کے انتخاب جداگانہ کا کوئی تذکرہ نہ تھا میں نے سلیکٹ کمیٹی کے روبرو زور دیا کہ مُسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کیلئے نیابت جُداگانہ کی مُناسب توسیع مقامی جماعتوں میں بھی کر دی جائے۔ مسٹر یم نے منجانب گورنمنٹ کہا کہ نیابت جُداگانہ کے اصول کے نفاذ میں جو عملی دشواریاں پیش آئیں گی اگر اُن کے دُور کرنے کا کوئی انتظام کر دیا جائے اور ہندو ممبر بھی راضی ہوں تو گورنمنٹ کو اس تجویز کے منظور کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں نے سلیکٹ کمیٹی کے اجلاس میں ایک فارمولا کا مسودہ اُسی وقت لکھ کر پیش کیا جس سے بہت سی دشواریاں رفع ہوتی تھیں، باہمی تبادلۂ خیالات کے بعد پنڈت موتی لال نہرو اور ڈاکٹر تیج بہادر سپرو کی یہ رائے ہوئی کہ مسودہ کارآمد ہے اور مناسب تبدیلیوں کے بعد قرینہ ہے کہ یہ فارمولا ایسی صورت اختیار کر لے کہ اُسے بِل کی ایک دفعہ قرار دیا جا سکے۔ مسٹر یم کو بھی اِس رائے سے اتفاق تھا۔ چار پانچ دن کی کوئی تعطیل درمیان میں آ گئی جس کی وجہ سے کونسل کا اجلاس مُلتوی رہا اور اکثر ممبر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ الہ آباد کے روزانہ اخبار لیڈر کو سلیکٹ کمیٹی کی کارروائی کا پتہ چل گیا اور اُس نے انتخابِ جُداگانہ کی توسیع

کے خلاف ایڈیٹوریل نوٹ لکھنا شروع کردئے۔ مسٹر سی. وائی چنتامنی بڑے قابل صحافت نگار تھے۔ گورنمنٹ آف انڈیا یا ہمارے صوبہ کی گورنمنٹ کی شاید ہی کوئی رپورٹ ہو جو اُن کی نظر سے نہ گذری ہو حافظہ بھی بلا کا تھا۔ میں نے اپنے تجربہ میں تین آدمی ایسے دیکھے ہیں جنکا حافظہ فیضی کے قصے یاد دلاتا تھا۔ ایک مسٹر چنتامنی دوسرے نواب حامد علی خاں مرحوم والی رام پور اور تیسرے مسٹر میکواٹرس جو فنانس ڈیپارٹمنٹ کے سکرٹری تھے اور بعد کو سر آرتھر میکواٹرس ہوئے نواب حامد علی خاں صاحب جو بات ایک دفعہ سُن لیتے تھے وہ عرصہ تک اُن کے حافظہ میں محفوظ رہتی تھی۔ عربی و فارسی کی درسی کتابیں تقریباً پچاس سال کا سن ہونے کے باوجود ایسی یاد تھیں کہ گویا کل ہی مدرسہ چھوڑا ہے۔ مسٹر میکواٹرس ہر سال کونسل آف اسٹیٹ میں گورنمنٹ ہند کے مالیہ اور بجٹ پر تقریر کرتے تھے، گورنمنٹ ہند کا سالانہ بجٹ اُس زمانہ میں نوّے کروڑ روپے کے قریب تھا جس سال کا بجٹ تیار ہوتا تھا اُس کی آمدنی اور خرچ کی اہم مدات کا مقابلہ سال گزشتہ کی آمدنی اور خرچ کی اہم مدات سے کیا جاتا تھا اس کے علاوہ مالی حالت کی صحیح تصویر پیش کرنے کے لئے درجنوں رقمیں ایسی ہوتی تھیں جن کا تفصیل سے بیان کرنا ضروری تھا مسٹر میکواٹرس یہ سب رقمیں جن میں کروڑوں سے لیکر ہزاروں روپے تک کی تشریح ہوتی تھی، تفصیل وار بیان کرتے تھے یہ تقریر ہر سال آدھ گھنٹہ سے لیکر پون گھنٹہ تک جاری رہتی تھی مگر لطف یہ ہے کہ بغیر کاغذ کا ایک پُرزہ ہاتھ میں لئے یا یادو کاغذات سے تازہ کئے نوّے کروڑ روپے کی آمد و خرچ کا حساب کتاب مسٹر میکواٹرس کی نوکِ زبان پر رہتا تھا۔ خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا ڈاکٹر تیج بہادر سپرو اور مسٹر چنتامنی سے گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ پنڈت موتی لال نہرو بڑی شان اور طنطنہ کے آدمی تھے اُن کو وہ زمانہ یاد تھا جب مسٹر چنتامنی کا تقرر ایک چھوٹی آسامی پر ہوا تھا ایک اور دشواری یہ تھی کہ پنڈت موتی لال کی طرح مسٹر چنتامنی کی طبیعت میں بھی لچک بہت کم تھی اگر دو قومی کام کرنے والوں میں سے ایک کا مزاج گرم اور دوسرے کا نرم ہو تب تو نباہ کی صورت نکل سکتی ہے مگر جب دونوں کی طبیعت کا انداز یہ ہو کہ اپنی بات پر اڑے

رہیں تو کہیں نہ کہیں ٹکرا جانا لازمی ہے۔ تعطیل کے بعد سلیکٹ کمیٹی کا اجلاس ہوا اور سلیکٹ کمیٹی نے اپنی رپورٹ جس پر جہاں تک مجھے یاد ہے ڈاکٹر سپرو اور پنڈت نہرو دونوں کے دستخط تھے مسٹر ہم کے ذریعہ سے کونسل میں پیش کر دی۔ میں مُرادآباد ہی میں تھا کہ مسٹر ہم کا خط مجھے ملا کہ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو آپ کے بنائے ہوئے فارمولے کو سر تصدق رسول خاں صاحب راجہ جہانگیر آباد اپنے نام سے بطور ترمیم پیش کر دیں۔ میں نے فوراً جواب دیا کہ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مسٹر ہم کا خط مجھے گراں تو گزرا مگر کام اور نام میں بسا اوقات بیر ہوتا ہے۔ انسان کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ اس کا نام ہو مگر متعدد موقعوں پر یہ خواہش کام میں حارج ہوتی ہے، نوجوانوں کو کبھی نہ بھولنا چاہیئے کہ مرد وہی ہے جو کام خود کرے اور تحسین و آفرین کے پھولوں کا ہار دوسروں کے گلے میں پہنائے۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ سر جیمس مسٹن چاہتے ہیں کہ قوم راجہ صاحب جہانگیر آباد کو اودھ کا بہت اچھا منتظم اور باہوش و گوش تعلقہ دار سمجھنے کی بجائے اپنا دوست اور قومی حقوق کا محافظ سمجھے۔ سر جیمس مسٹن پورے طور سے اور سر ہارکرٹ بٹلر ایک حد تک یہ چاہتے تھے کہ پُرانی روشنی کے بزرگ مُسلمانوں کے لیڈر رہیں۔ جب بل کونسل میں پیش ہوا تو راجہ صاحب جہانگیر آباد نے وہ ترمیم اپنے نام سے پیش کی جس کا مسودہ میں سلیکٹ کمیٹی میں پیش کر چکا تھا اور جو مسودہ ضروری ترمیمات کے بعد سلیکٹ کمیٹی سے تعطیل ختم ہونے پر منظور ہو چکا تھا۔ اس ترمیم کا مضمون یہ تھا کہ جس جس میونسپلٹی میں مُسلمانوں کی آبادی پچیس فیصدی سے کم ہے وہاں مُسلمان ممبروں کی تعداد میں بقدر ½ کے اضافہ کیا جائے اور جہاں مُسلمانوں کی آبادی پچیس فیصدی سے کم نہ ہو مگر ۳۸½ فیصدی سے کم ہو وہاں آبادی مذکور ۳۸½ فیصدی سمجھی جائے۔ اور جن میونسپلٹیوں کی آبادی میں مُسلمانوں کا تناسب ۳۸½ فیصدی یا اُس سے زیادہ ہو وہاں مُسلمان ممبروں کی تعداد کا تعین محض آبادی کی بُنیاد پر ہو۔ اگرچہ لیڈر کے زہریلے مضامین کا اثر صوبہ میں پھیلنا شروع ہو گیا تھا تاہم ڈاکٹر تیج بہادر سپرو اور پنڈت موتی لال نہرو نے ترمیم مذکور کی تائید کی اور راجہ رام پال سنگھ نے: (بعد کو تعلقہ داروں کی

ایسوسی ایشن کے پریسیڈنٹ ہوئے اور گورنمنٹ سے کے. سی. آئی. ای کا خطاب پایا) اُس کی مخالفت نہیں کی۔ بابو برج نندن پرشاد اور لالہ سُکھبیر سنگھ اور بعض دیگر ہندو ممبروں نے ترمیم کے خلاف تقریریں کیں اور بالآخر کونسل سے یہ ترمیم بغیر مطالبۂ رائے شماری کے منظور ہو گئی۔

ہندو بھائیوں کی کوتہ اندیشی

بل کا پاس ہونا تھا کہ اخبار لیڈر نے طوفان برپا کر دیا اور چھوٹی قومیت کے جذبہ کی آگ کو اس طرح مشتعل کیا جس کی مثال اس سے پہلے میں نے اپنے ملک میں نہیں دیکھی تھی بڑی خرابی یہ ہے کہ مُلک کی مجموعی آبادی میں اکثریت رکھنے کے باعث بہت سے ہندو بھائیوں کے سیاسی مسلک کا اصول موضوعہ یہ ہے کہ وہ مُلک کے ہر ہر حصّہ اور ہر ہر مقام پر حکومت کریں، ۱۹۰۹ء کے پہلے صوبائی حکومتیں تھیں مگر اکثر اہم مُعاملات میں قطعی حُکم صادر کرنے کی ذمّہ داری گورنمنٹ ہند پر عائد ہوتی تھی۔ ۱۹۰۹ء میں جن اصلاحات کا نفاذ ہوا اُن کی رُو سے صوبائی حکومتوں کے اختیارات استحکام کے ساتھ معیّن کرنے اور گورنمنٹ ہند کی مداخلت کے حدود کو گھٹانے کی بُنیاد رکھی گئی جس کا مطلب یہ تھا کہ سوائے فوجی اور خارجی معاملات، تار ڈاک خانہ اور ریلوے، اور محصول درآمد و برآمد کے جملہ معاملات طے کرنے کا حق صوبائی حکومتوں کو ہوگا تعلیم میں مُسلمانوں سے آگے اور بہت آگے ہونے کے باوجود ہندو بھائیوں کو اُس وقت تک یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ اس اُصول جمہوریت کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جن جن صوبوں یا شہروں میں مُسلمانوں کی اکثریّت ہے اُن صوبوں میں مُسلمان حکومت کریں یا شہروں کی میونسپلٹی کا انتظام مُسلمانوں کے ہاتھ میں ہو۔ سمندِ ناز پہ ایک اور تازیانہ یہ ہوا کہ صوبجات مُتّحدہ کے سب سے بااثر اخبار لیڈر کے ایڈیٹر مسٹر چنتامنی تھے جو مدراس کو چھوڑ کر ہمارے صوبہ میں آ بسے تھے تخمیناً پانچ برس تک میرا اور مسٹر چنتامنی کا ساتھ یو۔ پی کونسل میں رہا اُن کی قابلیت اور ذہانت کا مجھے اعتراف ہے۔ اُن کو سرکاری رپورٹوں کی اطلاعات اور اہم اعداد و شمار کی کان سمجھنا چاہیئے لیکن بدقسمتی سے یہ اُن کے اختیار کے باہر تھا کہ اُن مسائل پر جن کا وسیع

دامن ہندو اور مسلمانوں کے باہمی خوشگوار تعلقات کا حامل تھا اُسی زاویہ سے نظر ڈالتے جس کا عادی ہمارے صوبہ کا ہندو یا مسلمان باشندہ تھا جو معاملات ہمارے صوبہ کے ہندو مسلم تعلقات سے وابستہ ہیں اُن کو پیش پیش رکھ کر ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف یا مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف بھڑکانا آسان ہے مگر اس اشتعال کے نتائج ایسے خوفناک ہوتے ہیں جن پر ۱۹۳۷ء کی کانگریسی گورنمنٹ بھی قابو نہ پا سکی۔

متحدہ قومیت کے جذبے اور صوبائی تعصب کی ٹکر

مسٹر چنتامنی مدراس کے رہنے والے تھے جہاں اسلامی آبادی نہایت قلیل ہونے کے علاوہ مسلمانوں کا اثر و اقتدار تخمیناً سوا سو برس پہلے زائل ہو چکا تھا۔ وہ ہمارے صوبہ کو جو اسلامی عظمت و وقار اور اسلامی تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا مدراسی عینک سے دیکھتے تھے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ چشم احول کی طرح اُن کی آنکھ میں بہت سی چیزیں ایک کی دو معلوم ہوتی تھیں، کہا جاتا ہے کہ ہمارے صوبہ کے ہندو اور مسلمان ایسے بے حس ہیں کہ اپنے پرائے میں تمیز نہیں کرتے غیر صوبہ کے لوگ اگر یو۔ پی میں آباد ہو جائیں تو ہم اُن کے خلاف صوبائی جذبے یا صوبائی تعصب سے کام نہیں لیتے۔ برخلاف اس کے اگر یو۔ پی کا آدمی پنجاب، مدراس یا بنگال میں آباد ہو جائے تو وہ ہمیشہ غیر سمجھا جائے گا۔ ہمارے صوبہ نے مسٹر چنتامنی، مسٹر رنگا آیر، مسٹر محمد افضل اور مسٹر شہاب الدین کو نہ صرف اپنی آغوش میں پناہ دی بلکہ اپنا نمائندہ منتخب کر کے ان میں سے تین صاحبوں کو یو۔ پی کونسل اور ایک کو مرکزی لیجسلیٹیو اسمبلی میں بھیجا میرے نزدیک صوبائی جذبہ کا اس حد تک پہونچ جانا کہ دوسرے صوبہ کا آدمی ہمیشہ غیر سمجھا جائے ایسا امر ہے جو مذموم اور مستحسن دونوں پہلو رکھتا ہے، بُرائی تو یہ ہے کہ صوبوں کے موجودہ جغرافیائی حدود، جو انگریزی حکومت نے کسی زمانہ میں اپنی ضروریات کے لحاظ سے بغیر اس امر کو پیش نظر رکھے ہوئے کہ صوبوں کی آبادی میں کہاں تک اشتراک زبان یا اتحاد مذہب رسم و رواج ہے معین کئے تھے ہمارے اوپر قابل پابندی ہو جائیں گے۔ اگر موجودہ حدود کی صحت کو تسلیم

کرلیا جائے تو صوبوں کی کسی فطری یا معقول بُنیاد پر دوبارا ساخت کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر کوئی قابل آدمی دوسرے صوبہ میں جا کر بسے تو اُسے غیر سمجھنے سے وہ صوبہ جہاں وہ جا کر بسا ہو اُس کی خدمات سے اپنے کو محروم کرلے گا۔ صوبائی تعصّب کا فائدہ یہ ہے کہ غیروں کے حاوی ہو جانے سے بسا اوقات اپنوں کو نقصان پہونچتا ہے غیر اپنا بھی بننا چاہے تو پھر بھی عادات وخصائل اور بیشتر مُعاملات میں مستقل رائے اور نقطۂ نظر قائم ہو جانے کے باعث غیر ہی رہتا ہے اب بڑھتے ہوئے صوبائی اور قومی جذبات کا زمانہ ہے کوئی وجہ نہیں ہے کہ یو۔پی کا باشندہ اپنے تاریخی معنی میں ہندوستانی ہونے پر اسی طرح فخر کیوں نہ کرے جس طرح پنجابی پنجاب میں رہنے پر یا بنگالی بنگال کا باشندہ ہونے پر یا مدراسی مدراس مولد ومسکن ہونے پر ناز کرتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ صوبائی تعصّب کا نشو ونما مُتحدہ ہندی قومیّت کی روح کے منافی ہے مگر جب تک مُتحدّہ ہندی قومیّت کی روح سارے مُلک میں نہ پھیل جائے یو۔پی والوں کا اپنے کو اس تصوّر پر بھینٹ چڑھانا بحالیکہ دوسرے صوبوں کو اس کی پروا نہیں ہے۔ بڑی نادانی ہے۔

تین پنڈتوں کی کتھا

میں اخبار لیڈر کے مضامین اور مسٹر چنتامنی کے طریق کار کا تذکرہ کر رہا تھا، نیابت جُداگانہ کی ترمیم کی تائید تنہا پنڈت موتی لال نہرو نے ہی نہیں کی تھی بلکہ ڈاکٹر تیج بہادر سپرو نے بھی اُسکی مُوافقت میں بڑی زبردست اور پُر مغز تقریر کی تھی۔ ترمیم کے خاموش موافقین میں راجہ رام پال سنگھ بھی تھے مگر مسٹر چنتامنی کی ضعیف مزاجی دیکھئے ڈاکٹر سپرو اور راجہ رام پال سنگھ کو چھوڑ تنہا پنڈت نہرو کو لپٹ پڑے۔ بل پاس ہونے کی خبر شائع ہونے پر پنڈت مدن موہن مالوی نے بھی نیابت جُداگانہ کی ترمیم کی موافقت میں رائے کا اظہار کیا تھا۔ میں پنڈت مالوی کا بڑا احترام کرتا ہوں لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مالوی جی کی اُنگلی ہمیشہ رائے عامہ کی نبض پر لگی رہتی ہے جب انہوں نے دیکھا کہ لیڈر کی برپا کی ہوئی شورش کا ہندوؤں

میں اثر ہو رہا ہے تو ترمیم کو دعا دے کر پلٹ پڑے اور بددعائیں دینا شروع کر دیں۔ جب مالوی جی جیسے تجربہ کار سیاست داں اپنی رائے پر قائم نہ رہ سکے تو راجہ رام پال سنگھ کا جو عاقل و بالغ تھے ترمیم کی مخالفت نہ کرنا اور پھر خارجی اثر قبول کر کے اُس کی مخالفت کرنا ایسا امر نہ تھا جس پر کسی کو زیادہ تعجب ہوتا، اب موئدین کی صف میں صرف دو آدمی یعنی پنڈت نہرو اور ڈاکٹر سپرو رہ گئے تھے لیکن بعض واقعات افسانوں سے بھی عجیب تر ہوتے ہیں مسٹر چنتامنی نے ڈاکٹر سپرو کو تو چھوڑ دیا مگر پنڈت نہرو کے خلاف سلسلۂ مضامین لیڈر میں لکھنا شروع کر دیا۔ پنڈت نہرو کی عمر اُس وقت پچاس سال سے کچھ کم ہوگی مگر عزم و استقلال میں وہ کسی نوجوان سے کم نہ تھے۔ انہوں نے مسٹر چنتامنی کی پول کھولنا شروع کی اور حقیقت یہ ہے کہ سیاست دقانون داں پنڈت اور صحافت نگار پنڈت کی وہ ناخوش گوارِ تعلّقات جو اس زمانہ میں شروع ہوئی تھی آگے چل کر جلیانوالہ باغ کے واقعات کی روشنی میں اس قدر بڑھ گئی کہ ۱۹۱۹ء میں روزانہ انگریزی اخبار انڈیپنڈنٹ کے اجراء نے لیڈر پر نمایاں غلبہ حاصل کر کے اُس کی آواز کو بہت کمزور بنا دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر انڈیپنڈنٹ اپنے اُن دِل ہلا دینے والے مضامین سے جو اُس وقت حکومت کو قابلِ اعتراض معلوم ہوتے تھے خود اپنی زندگی کا خاتمہ نہ کر لیتا تو لیڈر کا وجود معرضِ خطر میں پڑ جاتا مشتعل شدہ جذبات معقولیت کے ساتھ اکثر وہی برتاؤ کرتے ہیں جو سلوک سوتیلی ماں خاوند کی پہلی بیوی کی اولاد کے ساتھ کرتی ہے۔ افسوس ہے کہ ۱۹۱۶ء کی نزاع میں ہمارے ہندو بھائیوں نے دو باتوں کو قطعاً نظر انداز کر دیا، پہلی بات تو یہ کہ میونسپلٹیوں کے بل کے ذریعہ سے جہاں جہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی وہ قائم رکھی گئی تھی، مسلمانوں کو ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ ہندو بھائی اُن کے ساتھ انصاف کا برتاؤ نہیں کرتے اور اپنی اکثریت کے زعم میں اُن کے حقوق کو پامال کرتے ہیں۔ اگر ہمارے ہندو بھائی آزادی اور حکمرانی کو بنیئے کی دوکان نہ سمجھتے اور تھوڑی سی فراخدلی سے بھی کام لیتے تو مسلمانوں کو اپنی

رواداری پر اطمینان دلانے اور اس طرح اُن کا اعتماد حاصل کرنے کا یہ بے نظیر موقع تھا۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا ۱۹۱۶ء کی شورش جس کے علمبردار مسٹر چنتامنی تھے نیک نیتی پر مبنی تھی؟ کسی پولیٹیکل کام کرنے والے کی نیت کا اندازہ حالات گردوپیش کی روشنی میں ہی کیا جاسکتا ہے، اُس زمانہ میں ہندو بھائیوں نے ٹھنڈے دل سے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ اگر میونسپلیٹیوں کے بل کی ترمیم ہندوؤں کے حق میں زہریلا اثر رکھتی تھی تو اس زہر کے پھیلانے والے ڈاکٹر تیج بہادر سپرو اور پنڈت موتی لال نہرو دونوں تھے۔ اوّل الذکر کے الزام سے چشم پوشی کرنا اور ساری ذمہ داری آخر الذکر کے سر تھوپنا صاف بتا رہا تھا کہ ہندوؤں کے حقوق کی محافظت کرنے کی بجائے اس مصنوعی شورش کا سبب کوئی اور ہی جذبہ تھا۔ کالیستھوں نے فارسی زبان میں بڑا کمال حاصل کیا تھا اُن کے کمال کی اس سے بہتر کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ مغلیہ حکومت کے دور میں انشائے مادھورام درسی کتاب تھی جسے اکثر مسلمان طلبا مکتب میں پڑھتے تھے۔ منشی مادھورام قوم کے کالیستھ اور دہلی کے رہنے والے تھے اُن کے پوتے منشی چھتر سنگھ موزوں اُردو کے شاعر تھے اور فن شاعری میں اچھی مہارت رکھتے تھے۔ موزوں کا ایک شعر ملاحظہ ہو:- ؎

بیتِ ابرو کو ترے دیکھ کے لے مطلعِ حُسن ٭ جو ترے کوچہ سے نکلا سو غزل خواں نکلا۔

منشی منولال صبا بھی کالیستھ تھے لکھنؤ کے رہنے والے اور مصحفی کے شاگرد تھے۔ اُن کا حسبِ ذیل شعر سارے ملک کی زبان پر ہے مگر اکثر اُردو داں حضرات اس حقیقت سے ناواقف ہیں کہ یہ شعر ایک ہندو شاعر کا ہے فرماتے ہیں:- ؎

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں ٭ کوئی معشوق ہے اِس پردۂ زنگاری میں

آسمان کی پردہ دری میں صبا نے جو کمال دکھلایا ہے وہ اسی قابل ہے کہ شعر ضرب المثل ہوجاتا۔ جو قومیں اپنے کمال پہ ناز اں ہوتی ہیں اُن کی طبیعت میں شوخی بھی

بُلاکی ہوتی ہے جس طرح آج بعض ایسے انگریزی داں جو انگریزی زبان کو خود انگریزوں کی طرح لکھتے اور بولتے ہیں بابو انگلش کے نمونے لکھ کر اپنا دل بہلاتے اور آپ اپنا مذاق اُڑاتے ہیں اسی طرح بعض نامور کالیستھ بھی اُس زمانہ میں جب فارسی دفتروں کی زبان تھی کالیستھوں کی فارسی کے مزاحیہ نمونے خود لکھ کر اہلِ ملک کے تفنّنِ طبع کے لئے پیش کرتے تھے۔ اُس زمانہ کے کالیستھ اپنے نام کے پہلے لفظِ منشی لکھا جانا ایسا ہی باعثِ فخر سمجھتے تھے جیسا تحریکِ ترکِ موالات سے پہلے ہم انگریزی داں ہندوستانیوں کے نزدیک مسٹر کے لفظ کا استعمال سفرِ دُنیا کا بہترین زادِ راہ تھا۔ ایک فارسی داں کالیستھ کے دو[۲] پوتے تھے ایک کی عمر نو دس سال اور دوسرے کی گیارہ بارہ سال تھی لڑکوں کے نانا نانی بھی زندہ تھے دونوں لڑکے اپنی ننھیال جو کسی دوسرے شہر یا قصبہ میں تھی گئے ہوئے تھے قیام کو طوالت ہوئی دادا کو پوتوں سے بہت محبّت تھی۔ لینے خود پہونچے سمدھی یعنی لڑکوں کے نانا موجود نہ تھے کسی کام سے دو تین دن کے لئے باہر گئے ہوئے تھے دادا ایک پوتے کو اپنے ساتھ لے آئے اور دوسرے کو اُس کی ننھیال میں چھوڑ دیا۔ دوسرے منشی صاحب یعنی نانا واپس آئے تو دیکھا ایک نواسہ موجود ہے دوسرے کو اُس کے دادا ساتھ لے گئے ہیں۔ منشی صاحب بھی فارسی داں تھے۔ قلم برداشتہ ایک خط سمدھی کے نام لکھا جس کا ایک جزو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

"ایں چہ بردندنی بود کہ یکے را بردندے و دیگرے را نہ بردندے اگر بردندے ہر دو را بردندے واگر نہ بردندے کسے را نہ بردندے۔ یکے را بردندن و دیگرے را نہ بردندن خوب بردندنی نیست"۔

بعینہ یہی حالت مسٹر چنتامنی کی بردندنی کی تھی کیسا غضب ہے کہ پنڈت موتی لال نہرو کے خلاف اِس جُرم کی پاداش میں شورش کا طوفان اٹھایا جائے کہ انھوں نے نیابت جُداگانہ والی ترمیم کی تائید کی تھی لیکن ڈاکٹر تیج بہادر سپرو بعینہ وہی عمل کریں

اور گنگا نہا جائیں راجہ رام پال سنگھ سے بھی کوئی تعرض نہ کیا جائے۔ رہے پنڈت مدن موہن مالوی اُن سے باز پُرس کیوں کی جاتی اُن کے حال پر تو مارتے کے پیچھے بھاگتے کے آگے والی مثل عائد ہوتی تھی۔ کسی شاعر نے سچ کہا ہے :۔ ؎

خرد کا نام جنوں رکھ لیا جنوں کا خرد ÷ جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

اِس موقع پر اگر دوسرے مصرعہ کو اِس طرح پڑھا جائے تو غالباً زیادہ موزوں ہوگا۔ مصرعہ۔ جو چاہے آپ کا فنِ[۱] کرشمہ ساز کرے۔

ہندو مُسلم کش مکش ہمارے مُلک میں روزانہ انگریزی اخبار کی ایڈیٹری بھی عجیب چیز ہے جس کے ذریعہ سے آگ کو پانی اور پانی کو آگ ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی جا سکتی ہے مسٹر چنتامنی اور اُن کے ساتھیوں کا مطالبہ تھا کہ میونسپلیٹیوں کے بِل کی گورنر جنرل منظوری نہ دیں قانوناً اِس منظوری کے دینے یا نہ دینے کا اختیار گورنر جنرل کو منجانب مَلِک معظم حاصل ہے۔ اخبار لیڈر کی شورش پر جا بجا ہندو بھائیوں کے جلسے ہوئے جن میں مطالبہ مذکور کے رزولیوشن پیش اور منظور کئے گئے۔ سب سے بڑا جلسہ راجہ رام پال سنگھ مرحوم (آن جہانی) کی صدارت میں ہوا یہ بھی مسٹر چنتامنی کی ستم ظریفی تھی کہ اس جلسہ کی صدارت کے لئے اُن کی نظرِ انتخاب راجہ صاحب پر پڑی راجہ صاحب نے جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے نیابت جُداگانہ کی ترمیم کی مُخالفت نہیں کی تھی وہ بڑے شریف اور ہر دل عزیز آدمی تھے اُن کی بجائے اگر کوئی زیادہ مضبوط رائے رکھنے والا آدمی ہوتا تو اِس جال میں نہ پھنستا اُن کے ایڈریس کو موصوف کے پچھلے طریق عمل کا معافی نامہ سمجھنا چاہیئے۔ اس شورش سے مُسلمانوں میں بھی ہیجان پیدا ہوا اور یہ قرار پایا کہ مُسلمانانِ صوبہ کی طرف سے ایک نمائندہ جلسہ مُراد آباد میں مُنعقد کیا جائے، یہ عظیم الشان جلسہ آخر مئی سنہ ۱۹۱۶ء میں بمقام شوکت باغ مُراد آباد زیرِ صدارت راجہ صاحب محمود آباد

---

[۱] فنِ کرشمہ ساز سے مُراد مسٹر چنتامنی کا فنِ صحافت نگاری ہے۔

منعقد ہوا۔ اصلی رزولیوشن جس میں گورنمنٹ ہند اور وائسرائے سے درخواست کی گئی تھی کہ بل کی منظوری کا جلد سے جلد اعلان کر کے موجود الوقت کشاکش کا خاتمہ فرمائیں۔ سید وزیر حسن صاحب نے پیش کیا تھا اور بڑی زبردست تقریر کی تھی۔ مختلف ضلعوں کے نمائندوں کی تعداد اس جلسہ میں کافی تھی جنھوں نے رزولیوشن کی تائید میں تقریریں کی تھیں میں نے بھی کچھ عرض حال کیا تھا بالآخر گورنر جنرل نے اس بل کی منظوری دیدی جس کی اطلاع مجھے سر جیمس مسٹن کے خط سے ہوئی۔

کانگریس اور لیگ کا ساتھ ساتھ اجلاس

۱۹۱۴ء میں جنگ یورپ کے باعث مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس نہیں ہوا تھا۔ بعض نامور مسلمان چاہتے تھے کہ لیگ اور کانگریس کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم ہو جائیں لیکن دشواری یہ تھی کہ لیگ کا سالانہ اجلاس ایک شہر میں ہوتا تھا اور کانگریس کا دوسرے شہر میں خوش گوار تعلقات باہمی ربط کے بغیر قائم نہیں ہو سکتے تھے لہٰذا کوشش تھی کہ دونوں جماعتوں کا اجلاس ایک ہی شہر میں ہو اس کوشش میں پیش پیش مسٹر جناح تھے آج ہمارے کانگریسی بھائی مسٹر جناح کو متحدہ ہندوستانی قومیت کے شیرازہ کا درہم و برہم کرنے والا سمجھیں مگر اس حقیقت سے کون انصاف پسند شخص انکار کر سکتا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنے کی سب سے بڑی اور مسلسل کوشش آغا خان کے علاوہ مسٹر جناح، مہاراجہ صاحب محمود آباد اور مسٹر مظہر الحق نے کی۔ کانپور کے معاملہ میں جو بے اعتنائی ہندو بھائیوں نے برتی اُس کا یہ اثر تھا کہ بالعموم مسلمان کانگریس سے ربط ضبط قائم کرنے کو قوم کے حق میں مفید نہیں سمجھتے تھے مگر اس آڑے وقت میں مسٹر جناح نے اپنے ذاتی اثر سے پورے طور پر کام لے کر آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل سے یہ طے کرا دیا کہ لیگ کا سالانہ اجلاس دسمبر ۱۹۱۵ء کے آخر میں بمقام بمبئی منعقد ہو جہاں کانگریس کا سالانہ اجلاس سر ایس۔ پی۔ سنہا کی صدارت میں ہونے والا تھا

میں مسٹر جناح کی اس تجویز سے اتفاق نہیں رکھتا تھا میرا خیال تھا اور اب بھی ہے کہ اکثریت کی منظم نمائندہ جماعت ہونے کے لحاظ سے کانگریس کا فرض ہے کہ مفاہمت یا ربط ضبط کا اقدام کانگریس کرے اور پہلا قدم کانگریس اُٹھائے مُسلم لیگ کی کونسل کے جلسہ میں میں نے تحریری رائے بمبئی میں لیگ کا اجلاس ہونے کے خلاف بھیجی تھی۔

نومبر ۱۹۱۵ء کے تیسرے ہفتہ میں علی برادران جو اُس وقت ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت نظر بند تھے مُراد آباد سے گزرے دونوں بھائی پہلے لینسڈون میں نظر بند تھے مگر پھر گورنمنٹ ہند نے اُن کو لینس ڈون سے چھندواڑہ جانے کا حکم دیا تھا میں مُراد آباد کے اسٹیشن پر اُن سے ملنے گیا۔ مولوی محمد یعقوب، مسٹر مسعود الحسن اور بہت سے اور احباب بھی میرے ساتھ تھے میں اپنے ساتھ کھانا اور پھل بھی لے گیا تھا، علی برادران سے بڑے تپاک کی مُلاقات ہوئی مولانا محمد علی کی شوخی طبع کو دیکھئے بغلگیر ہونے اور مزاج پُرسی کرنے کے بعد پہلی بات مولانا نے مجھ سے یہ کہی "لیگ کی کونسل کے جلسہ منعقدہ لکھنؤ کی رُوداد میں نے پڑھی اور مجھے افسوس ہوا کہ رائے دینے والوں میں تمہارا نام غلط فہرست میں چھپ گیا ہے تم نے تو لیگ کا جلسہ بمبئی میں کرنے کی موافقت میں رائے دی ہو گی"۔ مولانا کا یہ سُتھرا مذاق مجھے بہت پسند آیا۔ وہ پھبتی اُڑانے اور فقرہ کسنے سے جس کی تہہ میں بعض اوقات نشتر کی چُبھن ہوتی تھی کبھی نہ چوکتے تھے، میں نے آہستہ سے جواب دیا "جن لوگوں نے بمبئی میں جلسہ کرنے کی رائے دی ہے اب مجھے یہ دیکھنا ہے کہ اُن میں سے کتنے سُورما بمبئی کے جلسہ میں شریک ہوتے ہیں"۔ میں لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ بمبئی میں شریک ہوا اور یہ دیکھ کر مجھے ذرا بھی تعجب نہیں ہوا کہ لیگ کی کونسل کے جن ممبروں نے لیگ کا اجلاس بمبئی میں منعقد کرنے کی تائید میں بڑے زور شور سے اخباروں میں مضمون لکھے تھے اور لکھنؤ کے جلسے میں پُرزور تقریریں کی تھیں اُن میں سے پانچ چھ آدمیوں کے سوا اور کسی نے بمبئی

جانے یا سالانہ اجلاس میں شرکت کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی مولوی نذیر احمد صاحب نے اپنی کسی کتاب میں حضرت سید الشہداء امام حسینؑ کی ایک مجلسِ عزا کا تذکرہ کیا ہے اُس مجلس میں مولوی نذیر احمد بھی شریک تھے شرکائے مجلس میں سے ایک صاحب کو بہت رقت ہوئی زار وقطار روتے اور یہ کہتے جاتے تھے یَالَیْتَنِیْ کُنْتُ مَعَکُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِیْمًا ؕ ترجمہ :- کاش میں آپ (امام حسینؑ) کے ساتھ ہوتا اور آپ کے ساتھ سر کٹا کر شہادت کا مرتبۂ عظیم حاصل کرتا۔ اتفاق سے مجلس میں جھگڑا ہو گیا اور مار پیٹ کی نوبت پہونچ گئی جس میں بعض شرکا کے چوٹیں آئیں، فوجداری کا مقدمہ عدالت میں پہونچا ملزموں میں ایک مُلزم وہ صاحب بھی تھے جو مجلس میں شوقِ شہادت کا اظہار بار بار فرما رہے تھے جب بہ حیثیت ملزم اُن کے بیان کی نوبت پہونچی تو بڑی معصومیت سے کہا "مستغیث نے میرا نام جھوٹ لیا ہے میں اُس روز مجلس میں شریک نہیں تھا بلکہ مجلس کے وقت بیس کوس کے فاصلہ پر ایک شادی میں موجود تھا۔" یہی حالت لیگ کی کونسل کے اُن ممبروں کی تھی جنہوں نے باوجود ادعائے حرّیت واتحادِ باہمی کے بمبئی کا سفر کرنا ضروری نہ سمجھا۔

لارڈ سنہا اور مسٹر مظہر الحق بمبئی میں پہلے ہی سے سازشیں ہو رہی تھیں کہ لیگ کے جلسہ کو کامیاب نہ ہونے دیا جائے ان سازشوں میں بعض مقامی حُکام بھی شریک تھے۔ جلسہ کے صدر مسٹر مظہر الحق تھے انہوں نے اپنا وہ زبردست ایڈریس پڑھا جس کی نسبت مسز اینی بسینٹ نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ سیاسی مُعاملات میں مُسلمانوں کے پیچھے رہ جانے کے باوجود مسٹر مظہر الحق کا ایڈریس ایک آزاد، بہادر اور صاف گو آدمی کا ایڈریس ہے۔ اُس کے برخلاف سر ایس۔ پی سنہا کا ایڈریس احتیاط اور نامُناسب اعتدال سے بھرا ہوا ہے، جو اوصاف ہوم رول کا پیش خیمہ نہیں ہو سکتے۔ لیگ کا اجلاس شروع ہونے سے پہلے

پلیٹ فارم پر لیگ کے ممتاز ممبروں اور غیر مُسلم وزیٹروں کو جگہ دی گئی تھی۔ میں اُس روز فراک سوٹ پہن کر گیا تھا مُتعدد مُسلمان بھی جن کی نشست پلیٹ فارم پر تھی فراک سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ جلسہ شروع ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ میں مسز سروجنی نائڈو سے بات چیت کرنے لگا۔ یوں تو بہت سے ہندوؤں کو مُسلمانوں کی پولیٹیکل تحریک سے ہمدردی تھی مگر مسٹر گوکھلے کے بعد جن کا انتقال ۱۹۱۵ء کے شروع میں ہوچکا تھا کانگریسی جماعت میں کوئی ہندو ایسا نہ تھا جو مسز سروجنی نائڈو کی طرح ہندو مُسلمان دونوں کو ایک ہی نظر سے دیکھتا اور برابر سمجھتا ہو۔ اسی زمانہ میں سر تھیوڈر ماریسن نے لندن سے ایک خط میرے نام بھیجا تھا جس میں لکھا تھا کہ ہندو مُسلمانوں میں اگر اتحاد ہوجائے تو ملک کی پولیٹیکل تحریک کو اُس سے یقیناً بہت فائدہ پہونچے گا لیکن موصوف کی رائے میں جن ہندوؤں سے وہ واقف ہیں اُن میں سوائے مسز سروجنی نائڈو کے ایک مُتنفس بھی ایسا نہیں ہے جو پہلے ہندو اور بعد کو ہندوستانی نہ ہو۔ مسٹر جناح بھی حسبِ معمول بہت خوش قطع انگریزی لباس پہنے ہوئے تھے دورانِ گفتگو میں مسز نائڈو مجھ سے کہنے لگیں "مسلمانوں کے جلسوں کی اور کوئی خصوصیت ہو یا نہ ہو مگر حق بات یہ ہے کہ آپ لوگ لباس بہت اچھا پہنتے ہیں۔"

میں نے جواب دیا "سلطنت تو کھو چکے اب کیا اچھا لباس بھی نہ پہنیں۔"

جلسے کے تفصیلی حالات بیان کرنا غیر ضروری ہے۔ مظہر الحق صاحب نے اپنا ایڈریس پڑھا۔ ضابطہ کے رزولیوشن کرسی صدارت سے پیش ہوئے، مولوی فضل الحسن حسرت موہانی نے جنابِ صدر سے باصرار کہا کہ اوّل اُن کا رزولیوشن بابت التوائے اجلاس لیا جائے جس پر کچھ صدائیں مولوی صاحب کی موافقت میں اور کچھ مخالفت میں بلند ہوئیں بعض لوگوں نے مطالبہ کیا کہ تقریریں اُردو میں ہوں اور مولوی فضل الحسن

کو بولنے کا موقع دیا جائے غرض کہ جلسہ میں اختلاف و افتراق کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ مولوی عبدالرؤف خاں پلیٹ فارم کی طرف جوش میں کچھ کہتے ہوئے بڑھے یہ آواز بھی میرے کان تک پہونچی کہ یہ کیسا مسلمان صدر ہے جس کے نہ مونچھ ہے نہ داڑھی انگریزی لباس پہنے مسلمانوں کے جلسہ کی صدارت کر رہا ہے بمبئی کے بہت سے آدمی اِس لئے شریک ہوئے تھے کہ وقتِ مناسب پر جلسہ کو درہم برہم کر دیں مگر سازش کرنے والوں نے یا تو مداخلت کے لئے کوئی خاص علامت قرار نہ دی تھی یا اُس علامت کے سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ شور و غل ہونے لگا بہت سے آدمی کھڑے ہو گئے اور اُنہوں نے پلیٹ فارم کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ ہم نوجوان مسلمانوں نے مسٹر مظہر الحق کے گرد حلقہ کر لیا اور پنڈال سے لے جا کر اُن کو ایک خیمہ میں بٹھا دیا۔ اس خیمہ کی محافظت ہم نوجوانوں نے اپنے ذمّہ لی میں اپنے لباس کے باعث خواہ مخواہ مردِ ممتاز سمجھا گیا اور جو نوجوان وہاں موجود تھے اُنہوں نے میری ہدایات کی تعمیل کی۔ سب سے مُقدم ہدایت یہ تھی کہ کسی کو اُس خیمہ میں داخل نہ ہونے دیا جائے جس کے اندر مسٹر مظہر الحق تھے۔ میں نے معہ اپنے نوجوان ساتھیوں کے خیمہ کی محافظت اُس وقت تک کی جب تک موصوف اپنی قیام گاہ کو نہ چلے گئے مسٹر جناح نے پولیس کو اطلاع کر دی تھی مگر پولیس دیر سے آئی۔ بارے خدا کا شکر ہے کہ نہ کوئی حملہ ہوا نہ مار پیٹ کی نوبت آئی۔ لیگ کا جو جلسہ پنڈال میں نہ ہو سکا تھا وہ تاج محل ہوٹل میں منعقد کیا گیا تھوڑے سے آدمی اس میں شریک تھے میں خود تاج محل ہوٹل میں مُقیم تھا مگر سر وزیر حسن یا مہاراجہ صاحب محمود آباد نے مجھے اُس جلسہ کی کوئی اطلاع نہیں دی۔ بمبئی میں لیگ کا جلسہ ہونے کے خلاف ووٹ دینے کے باعث غالباً میں اس قابل نہ سمجھا گیا کہ تاج محل کے جلسے میں مدعو کیا جاؤں۔ میں کانگریس کے اجلاس میں وزیٹر کی حیثیت سے شریک ہوا تھا

مسٹر گوکھلے اور سر فیروز شاہ مہتہ کی وفات سے کانگریسی لیڈر بہت متاثر تھے۔ مسٹر دادا بھائی نوروجی خرابیٔ صحت کے باعث جلسہ میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔ بمبئی میں سر ایس۔ پی۔ سنہا کی آمد پر جو شاندار استقبال بمبئی والوں نے اُن کا کیا تھا وہ بھی قابلِ تذکرہ ہے، جوہریوں نے جگہ جگہ اپنی دُکانوں میں لاکھوں بلکہ کروڑوں روپے کے ہیرے جواہرات لٹکائے تھے جس کو اُن کے حُبِّ وطن کا مُظاہرہ یا دارم چرا نہ پوشم کے بمصداق سرمایہ داری کی نمائش سمجھنا چاہیئے۔ سنہا صاحب ہاتھ جوڑے ایک موٹر میں جو بڑے سلیقہ سے سجائی گئی تھی کھڑے تھے۔ سارے راستہ غریب اسی طرح ہاتھ جوڑے کھڑے رہے۔ ہمارا لکھنوی طریقۂ آداب و تسلیم بڑا دلکش ہے مگر ہمارے ہندو بھائیوں کے ہاتھ جوڑنے کی رسم بھی کچھ کم دل آویز نہیں ہے۔

دسواں باب

میرا مذہب

کفر و اسلام در رہت پویاں   وحدہٗ لاشریک لہٗ گویاں

عبد و معبود کے تعلقات، توحید اور معاد، نبوت، خلافت اور امامت دونوں فرقوں کا بیک وقت عروج و زوال، مذہب اور حکومت کا ایک دوسرے پر اثر، کچھ اپنے متعلق، رسوم محرم کی اصلاح بنی عباس کی سیاست، کیا رونا ثواب ہے؟ کربلا کا سبق، ذاکری کی اجرت ہم خرما و ہم ثواب۔

ایسے مذہبی ماحول میں پرورش پانے کے باعث جہاں بزرگ خاندان (دادا صاحب قبلہ) سنی اور بقیہ خاندان والے شیعہ تھے، میں مذہب سے بیگانہ نہ تھا، مرثیہ گو شعراء کے کلام نے میرے ادبی مذاق پر تو یقیناً اثر ڈالا، مذہبی خیالات بھی متاثر ہوئے ہونگے، تاہم طبیعت میں جو کرید تھی وہ نہ مرثیہ خوانی سے مغلوب ہو سکی نہ مناظرہ کی کتابوں کے مطالعہ سے، پچاس سال گذر جانے کے بعد اس زمانہ کے اپنے مذہبی رجحانات کا مرقع پیش کرنا میرے لئے مشکل ہے مگر خدا کے فضل سے میرا حافظہ اچھا ہے، ایک معمولی واقعہ بیان کرتا ہوں جس سے میرے مذہبی خیالات کا اندازہ ہو سکے گا۔

ایک فقہی مسئلہ

شروع ۱۸۹۳ء کی بات ہے، میں نے انگریزی پڑھنی شروع کردی تھی، ایک روز کتابیں لئے مولوی محمد حسین مقتول کے گھر کو جارہا تھا، ایک کتا بیچ راستہ میں بڑے اطمینان سے اپنے بزرگوں اور ہمجنسوں کی عادت کے مطابق لیٹا آرام کر رہا تھا، راستہ تنگ تھا، میں نے قریب پہنچ کر ڈپٹا تو بہ اکراہ کتا راستہ میں سے اٹھا، مگر بطور اظہار ناراضی ایک چھینکا ماری جس کی آواز اوس آواز سے مشابہ تھی جو ناک صاف کرتے وقت آدمی کی ناک سے پیدا ہوتی ہے، کتے کی ناک اور منہ کی تری کے چھینٹے میرے پائجامہ کے پائنچوں پر آگئے، اوس وقت تک توفیق شامل حال تھی، اور میں نمازی تھا، شیعوں کے ہاں طہارت کے مسائل بڑے سخت ہیں، وہ مشرک کی تری کو ناپاک سمجھتے ہیں، میں نص قرآنی کی تعبیر میں، سنیوں کا ہم خیال تھا، اور ہندو دھوبی کے ہاتھ کے دھلے ہوئے کپڑوں کو پاک سمجھتا تھا، اب مجھے یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ بغیر پائجامہ بدلے یا پائنچے دھوئے نماز ہوسکتی ہے یا نہیں، میں چاہتا تھا کہ کسی روشن خیال شیعہ مولوی سے یہ مسئلہ دریافت کروں، "جو شیعہ مشرک کی تری کی نجاست کا قائل نہ ہو، وہ کتے کی ناک اور منہ کی تری کے چھینٹے جس کپڑے پر ہوں اوس کپڑے کو پہن کر نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں" سوائے مولوی رضا حسین صاحب پیش نماز کے اور کوئی شیعہ مولوی مرادآباد میں نہ تھا، مولوی صاحب موصوف میرے استاد رہ چکے تھے، میں جانتا تھا کہ اون کی پہنچ کہاں تک ہے، اگر میں اون سے یہ مسئلہ دریافت کرتا تو وہ یہی جواب دیتے کہ جو شیعہ مشرک کی تری کو نجس نہ سمجھے وہ گمراہ ہے، کیونکہ مذہبی معاملات میں عقل اور اگر مگر سے کام لیتا ہے، میں کئی گھنٹہ تک اسی سوچ بچار میں رہا، بالآخر بہت سی ہیر پھیر کے بعد اوسی پائجامہ سے نماز پڑھی، پچاس سال گذر جانے کے بعد آج بھی میرا خیال ہے کہ مسئلہ کی جو مشروط صورت میرے ذہن میں آئی تھی وہ بے معنی نہ تھی، علی گڈھ جاکر میرے مذہبی عقائد کی کایا پلٹ ہوگئی۔

عبد اور معبود کے تعلقات خدا کا وجود اور توحید

مذہب کا معاملہ خالق اور مخلوق، عبد اور معبود کے باہمی تعلق کا معاملہ ہے، تیسرے کو اس میں دخل نہیں، اتنا

کہہ دینا کافی ہے کہ بحیثیت مسلمان ہوں، انسانی الوہیت کو خواہ وہ کسی درجہ اور کسی قسم کی ہو ناممکن محض اور اسلامی تعلیم کے بالکل متناقض سمجھتا ہوں، اور اس بارہ میں اہل حدیث کا ہم خیال ہوں، اسلام کی روح رواں باری تعالیٰ کے وجود اور توحید کا مسئلہ ہے، ریل کے انجن، بحری اور ہوائی جہاز، برقی کلیں اور آلے، توپ، بندوق، بمب وغیرہ کا بنانے والا انسان ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ جن عنصروں اور قوتوں کے خواص معلوم کرنے سے انسان کو ان چیزوں کے بنانے میں کامیابی حاصل ہوئی ان عنصروں اور قوتوں کا بنانے والا نہ ہو، خود انسان کا وجود ایسا عجیب وغریب معما ہے جس کے حل کرنے سے سائنس بالکل عاجز ہے، اس معمہ کا حل ایک اور صرف ایک ہی ہے، وہ یہ کہ انسان خالق کے وجود کو تسلیم کرے، خدا کے نہ ماننے والوں کے دو گروہ ہیں، پہلے گروہ میں وہ اشخاص ہیں جو کہتے ہیں، "ہم مادی مسائل کے حل کرنے میں مشغول ہیں، ممکن ہے، دنیا کا پیدا کرنے والا کوئی ہو، لیکن ہم نے اوسے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا نہ وہ کبھی ہم سے ہمکلام ہوا، ہم اوس کا وجود تسلیم کرنے یا اوس سے انکار کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں"۔ یہ وہی اعتراض ہے جس کی طرف شاعر نے ذیل کے شعر میں اشارہ کیا ہے، ؎ حرم و دیر کے جھگڑے ترے چھپنے سے بڑے ÷ تو اگر پردہ اٹھا دے تو تو ہی تو ہو جائے۔ (نجم الدین برق) اس خیال کے آدمی کو متشکک یا لامذہب کہتے ہیں، یہ جواب اگر اوس وقت دیا جاتا جب دنیا کا عہد طفولیت تھا اور آدمی برائے نام انسان ورنہ عادات اور خصائل میں حیوان سے کچھ ہی افضل تھا، تو اور بات تھی لیکن اب تو انسان کا دعویٰ یہ ہے ؎ بے وجہ تو نہیں ہے جبین سپہر خم ÷ ہے اعتراف عظمت آدم کئے ہوئے (نہال سیوہاروی)، اشرف المخلوقات نے علم وفضل حاصل کر کے اپنی انسانیت کے ایسے عجیب وغریب جوہر دکھائے ہیں کہ زبان سے ایسا جواب نکالنا فہم وادراک کے شرف کو خیرباد کہنے کا ہم معنی ہے حیف ہے اگر آدمی حیوانات کے عادات وخصائل اور اون کی تشریح بدن کا علم حاصل کرنے میں عمر گنوائے اور خود اپنے وجود پر غور کرنے اور یہ سمجھنے کی مہلت اوسے نہ ملے کہ اسباب کے لئے مسبب کا ہونا لازمی ہے، دوسرا گروہ وجود باری تعالیٰ کا منکر ہے، اس گروہ کو معقولیت سے

کچھ سروکار نہیں ہے، اگر عقلی دلائل سے خدا کا وجود اس طرح ثابت نہیں ہو سکتا جس طرح منطقی صغریٰ وکبریٰ سے نتیجہ نکالا جاتا ہے تو یاد رہے کہ عقلی براہین سے خدا کا عدم وجود ثابت کرنا وجود ثابت کرنے سے کہیں زیادہ دشوار ہے، علم کا دائرہ جوں جوں وسیع ہوتا جائے گا انسان پر جس کی خلقت بہت ضعیف ہے اپنی حقیقت زیادہ واضح ہوتی جائے گی دُنیا کی رفتار اور بالخصوص مذہبی رفتار کے بارہ میں پیشین گوئی کرنا بڑی نادانی ہے، تاہم میرا خیال ہے کہ مادیت کی بھول بھلیاں کا دور ڈیڑھ سو دو سو برس سے زیادہ نہ چلے گا، اور مادیت لاادریت، دہریت، الحاد اور شک وشبہ کے طوفان خیز سمندر میں تھپیڑے کھا کر انسانی فہم مادرک کا جہاز بالآخر خداشناسی اور توحید کے پُرسکون ساحل پر لنگر ڈالے گا، مجھے اقرار ہے کہ عرصہ تک مجھے عقل کے چکر نے بھنور میں ڈالے رکھا، اب دریا پایاب معلوم ہوتا ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ میری طرح بھٹکی ہوئی مخلوق کو بشرطیکہ دل میں طلب صادق کا جذبہ موجود ہو یہ ماننا پڑے گا ؎ تو تو جس خاک کو چاہے وہ بنے بندۂ پاک ؛ میں خدا کس کو بناؤں جو خفا تو ہو جائے (برق)، انسانی ترقی کے مدارج کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حقانیت اور معرفت اور خداشناسی بیشتر اندرونی محسوسات اور جذبات کے اثر سے حاصل ہوتی ہیں، نہ محض دلائل اور براہین سے باری تعالیٰ کا وجود ثابت ہونے کے بعد مسئلۂ توحید کے سمجھنے میں کچھ پیچیدگی باقی نہیں رہتی اور دلیلوں کو جانے دیجیے، تنہا ایک دلیل کافی ہے، بقول مرزا اوج لکھنوی ؎

فساد علم وعمل میں جدا جدا ہوتے ۔۔۔ خلل خدائی میں پڑتا جو دو خدا ہوتے

اسلام نے خدا کی وحدانیت کا جو تصور پیش کیا ہے وہ کامل ہے، اس جیسا تصور نہ کسی مذہب نے پہلے پیش کیا تھا، نہ اسلام کے بعد کسی مذہب نے پیش کرنے کی آج تک جسارت کی، عیسائی مذہب کے پروٹسٹنٹ، کالوینیٹ (Calvinist) اور دوسرے فرقے، برہم سماجی یا برھمو، آریہ سماجی اور یورپ کے معقولی، غرض کہ سارے نئے مسند اور مذہب، فرقے اور جماعتیں جو آج توحید کے قائل ہیں سب کے سب اسلامی تعلیم کے خوشہ چیں ہیں۔ اسلام کے مکمل دین ہونے کا بہترین ثبوت

وہ حدود ہیں جو خالق اور مخلوق کے درمیان اسلام کی مقدس تعلیم نے اس مضبوطی اور سختی سے قائم کی ہیں جنہوں نے نہ صرف انسان کی الوہیت اور ربوبیت کا بلکہ اوس الوہیت اور ربوبیت کے تخیل کا بھی ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا ہے، معاد اور جزا و سزا کے عقائد بھی معقولیت کی اوس ٹھوس چٹان پر قائم کئے ہیں جس کا ایک سرا اس گول دنیا کے ایک طرف ہے تو دوسرا سرا دوسری طرف۔

معاد انسان گناہ کی پوٹ ہے، گرا تو پستی کی حد نہ رہی مگر گر کر سنبھلا بقول میر۔ مصرعہ۔ لغزش بڑی ہوئی تھی ولیکن سنبھل گیا۔ معلم الملکوت کا حشر دیکھ چکا تھا، پشیمان ہوا تو ایسا کہ عرق ندامت میں تر ہو گیا، ندامت کے آنسو سچے تھے، جناب باری کا دریائے رحمت جوش میں آیا، ندامت نے معصیت میں عجب شان پیدا کر دی تھی، وہ نکتہ نواز ہے، عذر قبول ہوا، بقول مومن شعر۔ دھو دیا اشکِ ندامت نے گناہوں کو مرے ؛ تر ہوا دامن تو بارے پاک دامن ہو گیا۔

غفور الرحیم کی رحمت نے انسان نافرمان کو بچا لیا، ورنہ کہیں تھل بیڑا نہ لگتا، مگر مشیت ایزدی کو منظور ہوا کہ خاکی مخلوق اپنے خالق کی عدالت کے جلوے دیکھے، حکم ہوا کہ جس کرہ کی خاک کا تمہارا خمیر ہے وہیں رہنا ہو گا، نیک و بد کے مختار ہو۔ جو چاہو کرو، ہماری طرف سے کچھ روک ٹوک نہیں ہے، لیکن جَو جَو کا حساب دینا ہو گا۔ تم اپنے بنی نوع کے ساتھ انصاف کا برتاؤ کرو، ہم تمہارے ساتھ معدلت برتیں گے، دنیا کی بہت سی چیزیں تمہیں للچائیں گی، لالچ میں نہ آنا۔ نیکی اور بدی میں تمیز کرنے کے لئے ہم نے تمہیں فہم و ادراک دیا، اپنے فعل کے مختار ہو، کل کلاں کو اپنی ناسمجھی سے یہ دریدہ دہنی نہ کرنا کہ۔ شعر۔ ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی ؛ چاہیں ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا۔ اگر پہلا عہد و پیمان بھولے تو کبھی جھوٹی شاعری کی گمراہ رہبری میں، کبھی مصوری اور نقاشی کے پردہ میں، کبھی بت تراشی اور سنگ سازی کی آڑ میں بہکوگے اور ہمارے شریک اپنے ہاتھ سے بناؤگے، کبھی ہماری شان میں گستاخیاں کر کے اپنے ہم جنسوں سے داد طلب ہو گے، وہ بھی تمہارے ہی بھائی اور تمہاری طرح اوچھے ہیں، اتنا ظرف کہاں کہ سوچیں اور غور کریں، وہ چھلک کر تمہیں اور مدہوش بنائیں گے، اور تم میں سے بہتیروں کی یہ حالت

ہوگی کہ ایک تو سانپ نے کاٹا اوپر سے افیم کھائی لیکن یہ تمہاری طاقت کے باہر ہے کہ لوٹ کر ہماری طرف نہ آؤ، تم تو نادہند مدیون کی طرح حساب کتاب پر بھی دبے الفاظ میں اعتراض کروگے۔ اور کہوگے۔ شعر۔

حشر میں ہوگا حساب زندگی　　بعد مرنے کے بھی جھگڑا رہ گیا

کھل کر کہنے سے بچو گے، چبا چبا کر باتیں کرو گے، کہو گے کچھ، مطلب ہوگا کچھ اور، اور اس دو رنگی کو صنعت ایہام کے نام سے موسوم کرو گے، مگر یاد رکھو کہ حساب کتاب ہوگا ضرور۔ ہماری عدالت کرۂ ارض کے مفتیوں اور قاضیوں (ججوں اور مجسٹریٹوں) کی کچہریوں سے مختلف ہے، ہماری عدالت میں خود تمہارے ہاتھ پاؤں، آنکھ، ناک، کان شہادت دیں گے، اور سچ بولیں گے، تم اہل دنیا کی کچہریوں میں جھوٹے کے آگے سچا روئے گا، ہماری عدالت کے اہل معاملہ جھوٹ کو جھوٹوں بھی نہ پوچھیں گے۔ کسی کام کے کرنے والے کی نیت کا حال بھی لبا اوقات تمہاری کچہریوں میں معما ہی رہے گا۔ مفتیوں اور قاضیوں کو یہ پتہ چلانا دشوار ہوگا کہ کرنے والے کی نیت کیا تھی، ہم نیت کا حال خوب جانتے ہیں۔ تم نے دنیا میں اگر اچھے اور نیک کام کئے تو اوس کی جزا ہماری خوشنودی اور برُے کاموں کی سزا ہماری ناراضی ہے، جزا اور سزا کا تخیل دنیا کے ہر مذہب میں ہے مسلمانوں عیسائیوں اور یہودیوں کے عقیدہ کی بموجب قیامت کے دن ہم سے ہمارے اعمال کے بارے میں باز پرس ہوگی اور نیک بندوں کو جزا اور برائی کرنے والوں کو سزا دی جائے گی، جزا اور سزا کا تخیل مختلف ہے، میرا عقیدہ یہ ہے کہ خلاق دوعالم کی خوشنودی کا نام جزا اور اوس کی ناراضی کا نام سزا ہے، بعض ایسے بھی مذاہب ہیں جن کے نزدیک انسانوں کو اون کے اعمال کی جزا اور سزا مسئلہ تناسخ کے عمل سے ملتی ہے، میری ناچیز رائے میں جو قوت یہ فیصلہ کرتی ہے کہ کسی انسان کی آئندہ زندگی اوس زندگی سے جس کا دورہ ختم کر رہا ہے بہتر یا بدتر ہو اوسی کا نام خدا ہے بہر نہج دنیا کے تمام مذاہب اس زندگی کے بعد اور زندگی اور کسی نہ کسی صورت میں جزا و سزا یعنی معاد کے قائل ہیں، مسلمان قبر پرستی یا تعزیہ پرستی کریں یا خدا کے سوا کسی اور سے مدد چاہیں یا مراد

مانگیں، مگر ان باتوں سے اسلام کی اصلی تعلیم کا منور چہرہ دھندلا نہیں ہو سکتا۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ کمزور ایمان کے مسلمانوں کے چہرہ پر گرد کی عارضی تہ جم جائے، میری نظر میں اسلام کے تہتر یا جو بہتر فرقے مختلف راستے ہیں جو سب کے سب ایک ہی منزل مقصود پر جا ملتے ہیں، اس بارے میں جھگڑنا کہ بعض راستے پھیر کے ہیں اور بعض سیدھے، فعل عبث ہے، راستہ پھیر کا ہی سہی مگر با صحیح راستہ پر تو چلو، راستہ کی سہولت یا دشواری کی بحث میں پڑکر منزل مقصود کو آنکھوں سے اوجھل کر دینا توازن عقل کو خیر باد کہنا ہے۔

نبوت نبوت کے بارہ میں میرا یہ خیال ہے کہ جب آج یورپ میں لینن، اسٹیلن اور ہٹلر وغیرہ کے اور امریکہ میں جارج واشنگٹن اور لنکن کے مجسمے محض اس وجہ سے پوجے جاتے ہیں کہ اونہوں نے اپنی اپنی قوم کو بڑے عروج پر پہنچایا، یا عروج پر پہنچانے کی تدبیر کی بنیاد ڈالی تو ہم مسلمانوں کو حضرت خیر البشر کا کس قدر احسانمند ہونا چاہیئے جنہوں نے ہم کو وہ سبق سکھایا جس پر قائم رہنے سے ہم دین اور دنیا دونوں جگہ سرخ روئی حاصل کر سکتے ہیں، درود اور سلام ہو ہمارے آقا پر جو بنی نوع انسان کے سب سے بڑے محسن ہیں، تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھیئے تو شیخ سعدی نے حضرت ختم المرسلین کی کیا ہی سچی تعریف کی ہے ؎ یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست ؛ کتب خانۂ ہفت ملت بشست۔ ترجمہ معہ مطلب، ہمارے آقا ایسے بے سر و سامان یتیم تھے کہ حضور کو قرآن جمع کرنے یا قرآن پر اعراب لگانے کی بھی نوبت نہیں آئی، اس کے باوجود جو ہدایت حضور نے فرمائی وہ ایسی اعلیٰ تھی کہ تمام دنیا کے مذاہب اوس کے آگے ٹھنڈے پڑ گئے، شیخ سعدی کی بیت کیا ہے سچے موتیوں کی لڑی ہے ایک اور شاعر نے مشہور حدیث لولاک لما خلقت الافلاک کو ان پر عقیدت الفاظ میں نظم کیا ہے ؎ خود از آدم، ولے تخلیق آدم از طفیل او ؛ زہے مشتق کہ اصل وعلت ایجاد مصدر شد ترجمہ مع مطلب، ہمارے آقا گو حضرت آدم کے پوتے ہیں مگر خود حضرت آدم اس لئے عالم وجود میں آئے کہ مشیت ایزدی کو ہمارے آقا کا پیدا کرنا منظور تھا، حضرت آدم کو مصدر اور ہمارے

آقا کو مشتق (یعنی ایسا صیغہ جو مصدر سے بنا ہو) سمجھنا چاہیے مگر اس مشتق کی شان یہ ہے کہ خود مصدر کی اصل و غایت یہ مشتق ہے۔ میرے نزدیک اسلام کا ہر فرقہ اپنے اپنے عقیدے کی بموجب خالق کی طاعت اور خلق خدا کی خدمت کرکے نجات حاصل کرسکتا ہے مگر اس عالم اسباب میں عمل اور نیّت شرط ہے ہم اس دنیا میں جیسا بوئیں گے دوسری دنیا میں ویسا کاٹیں گے۔

عیسائیوں کے اعتراضات

سرسیّد نے تہذیب الاخلاق میں سلسلۂ مضامین لکھ کر اسلام کی جو عظیم الشان خدمت شروع کی تھی وہ ادھوری پڑی ہے میں یہ نہیں کہتا کہ سرسید کے سب دلائل قابل قبول ہیں۔ اسلام کو انیسویں صدی کے عیسائیوں کی نظر میں بھاری بھرکم بنانے کی دُھن میں سرسید علیہ الرحمہ نے بعض مقامات پر بہت اچھے طریقہ استدلال سے کام لیا ہے، بھلا وہ مذہب جس کے ایک میں تین اور تین میں ایک (تثلیث) کا مسئلہ آج تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا اور جس کو سمجھانے سے خود متصر (عیسائیت) عاجز ہے دین اسلام کے مُنہ کیا آئے گا۔ دین اسلام کے اصول عین قوانین قدرت کے مطابق ہیں اسلام کی یہ غیر فطری اور دنیا کے امن میں خلل ڈالنے والی تعلیم نہیں ہے کہ اگر کوئی ایک رخسارے پر طمانچہ مارے تو دوسرا رخسارہ بھی پیش کردیا جائے۔ آج ضرورت ہم کو ایسے علماء کی ہے جن میں ایسی جامعیت اور وسعتِ نظر ہو کہ سرسید کے شروع کیے ہوئے کام کو جاری رکھ سکیں۔ دین کی سچی خدمت کرنے والے عالم میں وہ صفتیں موجود ہونا چاہئیں جن میں کی بعض ہمارے ملک میں مولوی چراغ علی اور سید امیر علی میں اور مصر میں مفتی محمد عبدہٗ میں موجود تھیں۔ بہت سے نوجوان جنہوں نے مغربی تعلیم پائی ہے ایک غلطی میں مبتلا ہیں جس کی نوعیت کو واضح کردینا ضروری ہے۔ حضرت عیسٰیؑ خدا کی طرف سے ایک برحق دین لے کر آئے تھے جس کے اصول انہوں نے اپنی اُمّت کے سامنے پیش کیے وہ اصول اچھے اور قابل قبول ہیں اور ہمارے دین کے اصول سے مطابقت رکھتے ہیں۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ حضرت عیسٰیؑ کو شریعت قائم کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اگر دنیا میں رہتے تو حضرت موسیٰؑ کی طرح وہ بھی اپنی شریعت قائم کرتے۔ قرینہ یہ ہے کہ شریعت عیسوی

کے قواعد سے شریعت موسوی کی غیر معمولی سختی میں بہت کمی ہو جاتی مگر تخمیناً ساڑھے اُنیس سو
برس کے بعد قیاس کے گھوڑے دوڑانا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے جو بات واقع ہوئی اُس کو
پیش نظر رکھئے قبل اس کے کہ حضرت عیسیٰ شریعت قائم کریں وہ اس دنیا سے رخصت ہوگئے
حقیقت بیں دل و دماغ تو ان واقعات سے یہی نتیجہ نکالیں گے کہ حضرت عیسیٰ کا دین نامکمل رہا
اور ایک ایسے ہادی کی ضرورت باقی رہی جس کے ہاتھوں حضرت عیسیٰ کے دین کی تکمیل ہوسکے
ہم مسلمانوں کے عقیدہ کی بموجب حضرت عیسیٰ کا ادھورا کام حضرت ختم المرسلین نے پورا کیا۔ شریعت
کے نہ ہونے کے باعث عیسائی فقہ حواریوں، عیسائی کونسلوں اور روم کے پاپاؤں نے وقتاً فوقتاً
اپنی سمجھ اور بوجھ کے مطابق وضع کی، آگے چل کر مختلف عیسائی قوموں اور ملکوں اور حکومتوں نے
اس فقہ میں اپنی ضروریات کے مطابق تبدیلیاں کرلیں مگر شریعت کے نہ ہونے سے جو عیسائیت
کے غیر مکمل دین ہونے کا بیّن ثبوت ہے فائدہ اُٹھا کر اٹھارویں اور اُنیسویں صدی عیسوی
کے عیسائیوں نے اسلامی شریعت پر اعتراضات شروع کردئے۔ یہ اعتراضات یا فقہی مسائل پر ہیں
یا حضور کی زندگی کے بعض واقعات پر۔ عیسائی معترضین نے یہ التزام رکھا ہے کہ اُن واقعات میں
حضور کی متاہل زندگی کو پیش پیش رکھا جائے، دونوں قسم کے اعتراضات معمولی ہیں جو کچھ وزن
نہیں رکھتے۔ مسلم علماء نے جن میں مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی، مولوی ابو المنصور صاحب دہلوی،
مولوی آل حسن صاحب خاص طور سے قابل تذکرہ ہیں۔ ان اعتراضات کا جواب دینے کی ضرورت
اس لئے سمجھی کہ اُنیسویں صدی میں مغلیہ سلطنت کے جانے اور انگریزی حکومت کے آنے سے
جو تبدیلیاں ملک میں ہوئیں انہوں نے ان اعتراضات میں وہ اہمیت پیدا کردی جو پہلے اُن کو
حاصل نہ تھی۔ مغربی طریقہ یہ ہے کہ وسعت تجارت کی آڑ میں حکومت حاصل کی جائے، اور
سلطنت حاصل کرنے کے بعد عیسائی مشنریوں (مبلغین) کو پورا موقع دیا جائے کہ مختلف ذرائع
سے دین عیسوی کی اشاعت و تبلیغ کر کے نئے حاصل کئے ہوئے ملک کے باشندوں کو عیسائی بنائیں
اُنیسویں صدی عیسوی میں یورپ اور امریکہ کے مشنریوں نے جان توڑ کر ملک ہند میں عیسوی دین

کو پھیلانے کی کوشش کی، جو ذرائع اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے برتے گئے اُن میں کے بعض ذریعے یہ ہیں: (۱) اسکولوں میں انگریزی تعلیم دینا۔ (۲) لوگوں کو عیسائی مذہب قبول کرنے کے لئے مالی ترغیب دینا۔ (۳) ہندوستانی عیسائیوں کے لئے ایک ایسے نئے طبقہ کا قائم کرنا جو انگریزوں سے نیچے مگر عام ہندوستانیوں سے اوپر ہو اور (۴) عوام کے یہ ذہن نشین کرنا کہ دین اسلام اور ہندو دھرم من جانب اللہ نہیں ہیں بلکہ اسلام ایک ایسے بزرگ کا قائم کیا ہوا دین ہے جو نعوذ باللہ دین کے پردے میں دنیاوی عظمت اور حکومت حاصل کرنا چاہتے تھے اور ہندو دھرم بجائے الہامی مذہب ہونے کے ایسا مذہب ہے جس کی بنیاد برہمنوں نے اپنا وقار ہمیشہ کے لئے قائم رکھنے کی غرض سے نابرابری۔ نارواامتیاز اور اُس رسم و رواج پر رکھی ہے جو اپنی سختی میں کسی طرح لوہے سے کم نہیں ہے۔ عیسائیوں کی طرف سے ہندو مذہب پر جو حملے ہوئے اُس کا اثر یہ ہوا کہ چھوٹی ذات کے لوگوں یا اچھوتوں کو جو برائے نام ہندو تھے عیسائی بنانے میں ایک حد تک مشنریوں کو کامیابی ہوئی۔ اس کامیابی کی اصلی وجہ وہ ناقابل برداشت برتاؤ تھا جس کا شکار عرصہ دراز سے ہندو مذہب نے اچھوتوں کو بنا رکھا تھا، ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ یورپ اور امریکہ نے جو رقم خطیر ہر سال نئے عیسائیوں کی مالی امداد پر خرچ کی اُس سے بھی، مشنریوں کی جد وجہد کو تقویت حاصل ہوئی تاہم ہندوؤں نے عیسائی حملوں کا جواب بنگال میں برہمو سماج اور شمالی ہند میں آریہ سماج قائم کر کے دیا۔ عیسائی مشنریوں کو وہ کامیابی نہ ہونے کی جس کی اُن کو توقع تھی ایک اور وجہ بھی ہوئی۔ عیسائی مذہب قبول کرنے والوں میں بہت سے آدمی ایسے تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ دین اسلام کی طرح نصرانی اخوت بھی عالمگیر ہے اور سب عیسائیوں کے حقوق برابر ہیں۔ جب تجربہ سے ثابت ہوا کہ عیسائی مذہب نسل و رنگ کے امتیازات پر غالب نہیں ہے بلکہ اُن سے مغلوب ہے تو چھوٹی قوموں کے افراد کو بھی نصرانیت قبول کرنے میں جو بہت بڑا لالچ تھا وہ جاتا رہا۔ جہاں تک دین اسلام کا تعلق ہے جیسا اوپر مذکور ہوا ہے عیسائیوں کے اعتراضات یا شرعی مسائل پر ہوتے تھے یا بیشتر حضرت خیر البشر کے

تعدد ازدواج پر میری ناچیز رائے میں مسلمانوں کی طرف سے دونوں اعتراضوں کا یہ جواب بالکل کافی تھا کہ حضرت عیسےٰ ایسے نبی تھے جن کو بحیثیت انسان دنیاوی تعلقات قائم کرنا اور نباہنا تو درکنار کبھی شادی کرنے تک کی نوبت نہیں آئی۔ بہت سے رشی اور ولی دنیا میں ایسے گزرے ہیں جنھوں نے مدت العمر کبھی کسی عورت کی طرف توجہ نہیں کی۔ عیسائی مبلغین اور مصنفین کا اس بات پر زور دینا کہ کسی حالت میں بھی مرد ایک سے زیادہ بیوی نہ رکھے۔ اُس اخلاقی پستی کا ذمہ دار ہے جو اکثر عیسائی ممالک میں مرد و عورت کے تعلقات میں آج پائی جاتی ہے۔ اسلام کی بڑی خوبی یہ ہے کہ افراط و تفریط سے بچ کر اس نے میانہ روی کا وہ راستہ بتایا ہے جس کو اختیار کرنے سے ہر انسان نیکی اور سلامت روی کی زندگی بسر کرسکتا ہے۔ اسلامی نکاح اور طلاق کے بارے میں عیسائی مبلغین جو چاہیں کہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے پہلی بیوی کی زندگی میں دوسرا نکاح کرنے کی اجازت صرف خاص شرائط کے ساتھ دی ہے جس میں سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ مسلمان ایک سے زیادہ بیوی ہونے کی حالت میں سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرے اور کوئی امتیاز اُن کے درمیان قائم نہ کرے رہا طلاق کا معاملہ وہ اتنا صاف ہے کہ جو لوگ اسلامی سوسائٹی کی ترکیب اور اُس سرزنش سے واقف ہیں جس کے تازیانوں کی سزا مدت العمر اُس مسلمان مرد کو بھگتنی پڑتی ہے جو بلا وجہ اپنی بیوی کو طلاق دے وہ اس امر سے بھی بخوبی آگاہ ہیں کہ طلاق کے واقعات ہندوستان کے مسلمانوں میں اُس تعداد سے بہت کم ہیں جو تعداد طلاقوں کی یونائٹڈ اسٹیٹس (امریکہ) میں ہر سال ہوتی ہے۔ خود میرے قصبہ میں میری یاد میں شریف مسلمانوں میں طلاق کا ایک واقعہ گزرا ہے۔ حضرت ختم المرسلین نے اپنی ساری جوانی ایک بیوی کے ساتھ گزاری جو عمر میں حضور سے بڑی تھیں اُن کی وفات کے بعد کئی نکاح کئے لیکن اکثر بیویاں زیادہ عمر کی اور ایک کے سوا باقی سب بیوہ یا مطلقہ تھیں۔ ہر زوجہ سے خاص حالات میں نکاح کیا کسی بیوی کو طلاق نہیں دی۔ بیویوں کے ساتھ جو برتاؤ انصاف کا کیا اُس سے

نہ صرف مسلمان بلکہ دیگر مذاہب کے پیرو سبق لے سکتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ دنیا اور لذاتِ دنیاوی کا ترک کرنا دشوار ہے لیکن ہر ذی ہوش انسان تسلیم کرے گا کہ خاندان، قبیلے، برادری، اہلِ شہر اور ملک کے باشندوں سے گہرے تعلقات رکھنے کے باوجود اپنے کو مکروہاتِ دنیاوی میں ملوث نہ ہونے دینا اور دنیا میں رہ کر اُس سے علیحدگی اختیار کرنا دشوار تر ہے۔ قریش نے طرح طرح کے لالچ دئے یہاں تک کہ مکہ کی حکومت بھی پیش کی۔ جاہ و منصب کی پروا ہوتی تو حضور یہ پیش کش منظور فرما لیتے۔ سارے انبیاء حق سبحانہٗ و تعالیٰ کے پیغام بر تھے جن کا احترام ہم مسلمانوں پر فرض ہے لیکن تاریخ شاہد ہے کہ دنیای حکومت کی پیش کش کا جال یہودیوں یا رومیوں نے حضرت عیسیٰ کی آزمائش کے لئے نہیں بچھایا۔ فتح مکہ کے دن جس سیر چشمی اور فیاضی کا برتاؤ اہل مکہ کے ساتھ کیا گیا اور جانی دشمنوں کی بڑی سے بڑی خطائیں معاف کر کے جس طرح اُن کو امان دی گئی اُس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس عفو و تحل کا درجہ اُس دعا سے جو حضرت عیسیٰ نے اپنے دشمنوں کے لئے مانگی تھی کہیں ارفع و اعلیٰ ہے جناب صمدیت کی بارگاہ میں دشمنوں کیلئے دعا کرنا ایک بات ہے لیکن جو دشمن اپنے قبضۂ قدرت میں ہو اُس سے انتقام نہ لینا امرِ دیگر ہے۔ ہر مذہب کا سنگِ بنیاد اُس کے موٹے موٹے اصول ہیں مثلاً دین اسلام کی توحید اور نصرانیت کی تثلیث ایسے مسائل ہیں جن پر دونوں مذہبوں کی عمارتیں تعمیر ہوئی ہیں دین اسلام کی عمارت سادہ مگر نہایت عالی شان ہے مصنوعی رنگ کا اس میں دخل نہیں۔ پتھروں کے مختلف قدرتی رنگوں نے عجب بہار پیدا کر دی ہے پتھروں کے باہمی جوڑ ایسے خوبصورت اور ہر حصۂ عمارت کا تناسب دوسرے حصوں سے ایسا کامل ہے کہ خدا کی قدرت کا کرشمہ نظر آتا ہے۔ نصرانیت کی عمارت بھی لمبی چوڑی ہے مگر موزونیت کا پتہ نہیں نہ ایک حصہ کو دوسرے حصہ کے ساتھ کوئی مناسبت ہے۔ [1] معلوم ہوتا ہے مختلف

۱؎ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ عیسائی فقہ کو مختلف کونسلوں اور پوپوں نے وضع کیا۔ حضرت عیسیٰ کی بنائی ہوئی چھوٹی بارہ دری سے مراد اُن کے بارہ حواری ہیں جن میں سے سات نے حضرت عیسیٰ کا ساتھ چھوڑ دیا تھا باقی ص ۳۶۶ پر

اوقات میں مختلف شخصوں نے اس عمارت کے انمل بے جوڑ حصّوں کو تعمیر کیا ہے نہ پتھر اور اینٹیں اچھی ہیں نہ مسالہ مضبوط ہے البتہ جو نمائشی کمرے غیروں کو دکھانے کیلئے مخصوص کر دیے گئے ہیں اُن کے ظاہری نقش نگار نظر فریب ہیں اور خوبصورتی میں ایسے ہی بھلے معلوم ہوتے ہیں جیسا ویٹیکن میں پاپائے روم کا چھوٹا گرجا مائکل اینجیلو اور دوسرے مُصوّروں کے کمال کے باعث نظر آتا ہے۔ حضرت عیسیٰ کی بنائی ہوئی چھوٹی سی بارہ دری جس کے سات دراُن کے دنیا سے رُخصت ہونے سے پہلے ہی مُنہدم ہو گئے تھے بیت المقدس میں تھی مگر چند صدیوں کے بعد پوپوں نے بارہ دری کا ملبہ رومتہ الکبریٰ میں اُٹھوا منگوایا اور خوب گہرا زمین میں دفن کر کے اُس کے اوپر پاپائے روم کے ایوان کی تعمیر شروع کی۔ نتیجہ یہ ہے کہ اگر آپ آج حضرت عیسےٰ کی بارہ دری کے اینٹ پتھر اور مسالہ کو دیکھنا چاہیں تو عمارت کے محافظوں میں سے کسی سے آپ کو مدد نہ ملے گی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان محافظوں کو اُجڑی ہوئی بارہ دری یا اُس کے ملبہ کی کچھ پروا نہیں ہے اُن کو تو بعد کی بنی ہوئی عمارت سے غرض ہے۔ جس مذہب کے پیرو آدمی کو خدا سمجھیں اور عبد کو معبود قرار دیں اُن کے دنیاوی وقار سے مرعوب ہو کر اُن کے معمولی اعتراضات کا جو انہوں نے حضرت خاتم الانبیا یا اسلام کے فقہی مسائل پر کئے ہیں مبسوط کتابیں لکھ کر جواب دینا ہرگز ضروری نہیں ہے۔ ہمارے مذہب کے جملہ مسائل کو عقلی دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کرنا اور معترضین کو یہ سمجھانا کہ وہ موجودہ زمانہ کی سائنس سے مطابقت رکھتے ہیں اور بھی غیر ضروری بلکہ مُضر ہے سائنس کے مسائل برابر بدلتے رہتے ہیں اور روز نئی تحقیقاتیں ہوتی ہیں۔ زمین آفتاب کے گرد گھومتی ہو یا نہ گھومتی ہو آسمان کو گردش ہو یا نہ ہو لیکن اللہ ایک تھا ایک ہے اور ایک ہی رہے گا۔ ہمارا فرض ہے کہ ہر مُسلمان بچّہ کو وہ آیات جو قرآن مجید میں ذات اور صفاتِ باری تعالیٰ کے بارہ میں ہیں زبانی یاد کرائیں اور اُن کا مطلب سمجھائیں۔ جو لوگ خالق کو ماننے کے باوجود مخلوق کو

بقیہ ۳۶۵ آگے چل کر جو عبارت ہے اُس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ نے تبلیغ رسالت بیت المقدس میں کی لیکن چند صدیوں کے بعد نصرانیت کا مرکز روم قرار پایا اور روم سے عیسائی مذہب مختلف ممالک میں پہنچا۔ روم کے مرکز قرار پانے کے بعد نصرانیت کی دنیاوی ترقی تو بہت ہوئی مگر حضرت عیسےٰ کی مقدس تعلیم کی بارہ دری پاپائے روم کے ایوان (مذہبی تعلیم) کے نیچے دب کر رہ گئی جن تاریخی واقعات کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے وہ انجیل میں موجود ہیں۔

خالق گردانیں اُن سے زیادہ فہم و ادراک رکھنے والے تو گوتم بدھ کے پیرو ہیں جن کا عقیدہ ہے کہ انسان کی زندگی کا مقصد نروان (نجات) حاصل کرنا ہے۔ بڑی خیریت ہوئی کہ حضرت عیسےٰ نے شادی نہیں کی اگر اولاد چھوڑتے تو اولادِ آدم اور آل اللہ کے (نعوذ باللہ خدا کے پوتے پوتیوں اور اُنکی اولاد سے مُراد ہے) باہمی ازدواج اور سیاسی اقتصادی اور معاشرتی رقابتوں سے معلوم نہیں اس دنیا میں کیا کیا گل کھلتے۔ اس مناکحت کا ایک نتیجہ یہ ہوتا کہ بعض خواتین کا تعارف سوسائٹی میں اس طرح کرایا جاتا کہ "آپ ماں کی طرف سے حضرت آدم کی نواسی ہیں اور باپ کی طرف سے خدائے تعالیٰ کی پوتی ہیں"۔ خدا ہم سب کو ان باطل و مضحکہ انگیز عقیدوں سے محفوظ رکھے اور ہمارے عیسائی بھائیوں اور بہنوں کو سچی راہِ ہدایت پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

خلافت اور امامت

دادا صاحب کے عقائد سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت زید شہید بن امام زین العابدین کے پیرو تھے وہ شہید کربلا کی مجالس بھی کرتے تھے اور حضرت ختم المرسلین کی محفل میلاد بھی اُن کے یہاں ہوتی تھی۔ محفل میلاد میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے محامد و مناقب پڑھے جاتے تھے۔ یوم عاشورہ کو تعزیوں کے دفن ہو جانے کے بعد کندرکھی میں رسم فاقہ شکنی دادا صاحب نے قائم کی۔ کندرکھی کے سادات بالعموم دسویں محرم کو فاقہ سے رہتے ہیں۔ خدا میر ہادی علی صاحب کی روح پر رحمت نازل کرے اُنہوں نے یہ رسم جاری کی کہ عصر کے وقت سد فاقہ کرنے والوں کو اپنے مردانہ مکان میں جو کندرکھی کی کربلا کے راستہ میں قصبہ کے نکڑ پر تھا کھانا کھلاتے تھے۔ عام طور سے وہی لوگ فاقہ شکنی میں شریک ہوتے تھے جن کا فاقہ ہوتا تھا مگر شرکت کے لئے سید ہونے کی شرط نہ تھی۔ ہر مسلمان شریک ہو سکتا تھا۔ میں بھی دسویں محرم کو فاقہ کرتا ہوں، دادا صاحب کے انتقال کے بعد یہ رسم میرے بڑے چچا حاجی میر فدا علی اور اُن کے بعد چھوٹے چچا حاجی میر آل حسن نے جاری رکھی اب اس خدمت کی انجام دہی مجھ سے متعلق ہے امید ہے کہ حمزہ علی اور ہادی رضا علی اپنے زمانہ میں اس رسم کو جاری رکھیں گے۔ دادا صاحب مہمانوں کے سامنے کھانا خود اپنے ہاتھ سے چنتے تھے۔ مجھے بھی جب دسویں محرم کو کندرکھی جانے کا موقع مل جاتا ہے تو اپنے ہاتھ سے اس خدمت کے انجام دینے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔ میں یوم عاشورہ کے فاقہ کو کارِ ثواب نہیں سمجھتا

بلکہ میرے نزدیک اظہار جذبہ عقیدت کا یہ نہایت موزوں اور مؤثر طریقہ ہے جس کی معنی خیز حقیقت کا مزہ کچھ احسان مند فاقہ کش ہی جانتے ہیں۔

حضرت ختم المرسلین نے ۱۱ھ ہجری میں وفات پائی، اب ۱۳۶۲ھ ہجری ہے، اس ساڑھے تیرہ سو برس کے عرصہ میں حضور کی جانشینی کے مسئلہ میں شیعوں اور سنیوں میں اختلاف رہا ہے، وجوہ اختلاف دونوں فرقوں کو معلوم ہیں، اور اون کی ہزاروں لاکھوں کتابوں میں درج ہیں، جب مسلمانوں کو خلیفۂ ارض ہونے کا مرتبہ حاصل تھا اس وقت یہ بحث بھی غیر متعلق نہ تھی کہ خلیفۂ وقت کون ہو یا ملّت کس خاندان میں رہے، مگر خلیفۂ ارض ہونے کی بجائے اب ہم اکثر ممالک کے مسلمان اپنی زشتیٔ اعمال اور بے حوصلگی کے باعث غیروں کے محکوم ہیں، آج سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ہم ہر ملک بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو ایک ایسے جھنڈے کے نیچے جمع کر دیں جہاں فرقہ دارانہ اختلاف سے ہم کو دوچار نہ ہونا پڑے، عالمگیر اسلامی اخوت کا جو درس ہمارے پاک مذہب نے ہم کو دیا تھا اوسے یاد رکھنے اور اوس پر عمل کرنے کی ضرورت آج سے زیادہ کبھی نہ تھی۔ اگر اشتراکیت کے اصول مختلف روسی اقوام کو متحد کر سکتے ہیں، اگر جمہوری طریق حکومت امریکہ (یونائیٹڈ اسٹیٹس) کی مختلف النسل آبادی کو ایک کر سکتا ہے، اگر فسطائی اور نازی مسلک مختلف ممالک کو ایک نقطہ پر جمع کر سکتے ہیں، اگر جاپانی پیش نامہ (پروگرام) جس کا تعلق پوربی ایشیا کی ہم وزن خوشحالی (co-prosperity sphere) سے ہے، بعض ممالک کو جاپان کا ہم نوا بنا سکتا ہے تو اسلامی اخوت اور بین الاسلامی اتحاد کی تجاویز کو اقتضائے وقت کی بموجب عملی جامہ پہنانا اور اسلامی فرقہ دارانہ اختلاف کو دنیاوی جد وجہد اور کاروبار سے بالکل جدا رکھنا مسلمانانِ عالم کا فرض ہے، تاریخ شاہد ہے کہ غیر مسلم اقوام اسلام کے مختلف فرقوں میں عام اس سے کہ وہ ہندوستان میں ہوں یا بیرونِ ہندوستان، کوئی فرق نہیں کرتیں، سوائے طریقۂ نماز کے (جس میں ہاتھ باندھ کر یا ہاتھ کھول کر نماز پڑھنے کا فرق نمایاں ہے) اور کوئی امر ایسا نہیں ہے جس سے کسی غیر مسلم کو معلوم ہو سکے کہ کون سنّی ہے اور کون شیعہ۔

دونوں فرقوں کا بیک وقت عروج اور زوال مختلف ممالک کے شیعہ اور سنی فرقوں کا بہ یک وقت عروج اور بہ یک وقت تنزل بھی اس بات کی نا قابل انکار دلیل ہے کہ دونوں کی قسمتوں کے فیصلہ کے لئے قدرت نے ایک مشترک قانون قرار دیا ہے، تمام ان مسائل کا اثر دونوں فرقوں پر بالکل یکساں ہے جن کا تعلق تمدن، معاشرت، اخلاق، زبان، ادب، رسم و رواج، اور قومی روایات سے ہے، درحقیقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خالق ذوالجلال والاکرام نے دونوں فرقوں کی قسمتیں ناقابل جدائی طریقہ سے باہم جکڑ دی ہیں، اگر کسی وقت میں ایک فرقہ کو شادابی نصیب ہوئی ہے تو دوسرا بھی سرسبز نظر آتا ہے، اور اسی طرح ایک کی ابتلا دوسرے کے لئے بھی مصیبت ثابت ہوئی ہے، اسلامی تاریخ کے مطالعہ سے بخوبی واضح ہو جائے گا کہ یہ قاعدہ ہر زمانہ میں قائم رہا ہے، سلطنت مغلیہ کا انتہائی عروج شیعہ سیاست دانوں اور مدبروں کے ہاتھوں تکمیل کو پہنچا، شہنشاہ عالمگیر کو بعض مورخ متعصب بتاتے ہیں، مگر یہ یاد رہے کہ موصوف کا معتبر مشیر نعمت خاں عالی اور معتمد سپہ سالار میر جملہ تھا، بیرم خاں کے بغیر ہمایوں کے لئے خاندان مغلیہ کا اقتدار قائم کر لینا ناممکن تھا، اسی طرح مصر کے فاطمی خاندان نے خلافت عباسیہ کے ساتھ ساتھ قوت و اقتدار حاصل کیا، ترکی کے مشہور سلاطین نامور شاہان ایران کے ہم عصر تھے، بدقسمتی سے جب زوال آیا تو اس کا اثر بھی ترکی اور ایران پر یکساں پڑا، اور روس نے دونوں سلطنتوں کی قطع برید کر کے ترکی اور ایران کے بہت سے صوبوں کو ہڑپ کر لیا۔

مذہب اور حکومت کا ایک دوسرے پر اثر آج یورپ کی سرزمین پر دنیا کی تاریخ کی غالباً سب سے بڑی اور ہولناک لڑائی ہو رہی ہے، اسلامی ممالک اپنی آزادی برقرار رکھنا چاہتے ہیں مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں، ایک طرف کھائی ہے، تو دوسری طرف کنواں۔ مصر میں تو انگریزی فوجوں کا جماؤ ابتدائے جنگ سے ہی ہے، اب عراق، شام، اور ایران پر بھی انگریزی فوجوں کا تسلط ہو گیا ہے، ۱۹۱۴ء-۱۸ء کی لڑائی کے بعد تو انگلستان نے عراق اور

ایران کے ساتھ بدعہدی نہیں کی اور معاملہ صاف رکھا، خدا کرے اس دفعہ بھی انجام بخیر ہو اور لڑائی کے خاتمہ پر اسلامی ممالک کی آزادی میں کسی طرح کا کوئی خلل نہ پڑے، ٹرکی کا حال اس وقت یہ ہے کہ بشعر

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی　　اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

ٹرکی لڑائی میں ہرگز شریک ہونا نہیں چاہتا مگر تنگ آمد بہ جنگ آمد کے مصداق بہت ممکن ہے کہ اوسے بھی دونوں فریقوں میں سے ایک کا ساتھی بننا پڑے، آثار یہ ہیں کہ ٹرکی شریک جنگ ہوا تو انگلستان کا ساتھ دے گا، میرے ایک جلیل القدر ترک دوست نے نومبر ۱۹۴۱ء میں مجھ سے کہا تھا کہ اٹلی والوں نے بڑی غلطی کی کہ جرمنوں کے ساتھی ہوکر لڑائی میں شریک ہوئے، میں نے جواب دیا کہ لڑائی میں کل کے دشمن آج کے دوست اور کل کے دوست آج کے دشمن ہوتے ہیں، لڑائی میں شرکت کا اصول اس زمانہ میں صرف یہ ہے کہ ہر ملک اوس فریق کا ساتھی ہوتا ہے، جس کی فتح اور کامیابی کو وہ اپنے لئے مفید سمجھتا ہے، اطالویوں نے سمجھا ہوگا کہ اون کا فائدہ اسی میں ہے کہ جرمنوں کو فتح ہو، کہنے لگے جو اصول آپ نے بیان کیا وہ صحیح ہے، مگر یہاں حالت یہ ہے کہ جرمنوں کو فتح ہو یا شکست مگر اٹلی کا ہر صورت میں نقصان ہے، شکست کے نقصانات تو محتاج بیان نہیں ہیں لیکن جرمنوں کو فتح بھی ہو تو بھی ہٹلر کا اثر اٹلی اور اٹلی کے مقبوضہ ممالک میں اتنا بڑھ جائے گا کہ مسولینی کے خواب کی تعبیر اولٹی ہو جائے گی۔ خدا ٹرکی پر اپنا فضل کرے اور ترکوں کو اتاترک مصطفیٰ کمال کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، میں یہ نہیں کہتا کہ اسلامی ممالک کی آزادی کا خاتمہ ہو جانے کے بعد (خدا وہ دن نہ لائے) اسلام کا خاتمہ ہو جائے گا، بقول علامہ اقبال سہ

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے　　نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے　　پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

کشتیِ حق کا زمانہ میں سہارا تو ہے　　عصرِ نو رات ہے دھندلا سا ستارا تو ہے

لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ روح میں قوت عمل صرف اوس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک کہ وہ کالبد خاکی کے اندر ہے، حکومت جانے کے بعد یہودیوں کا جو انجام ہوا وہ آج ہمارے پیش نظر ہے، آج سے دو ہزار برس پہلے بودھ مذہب کا شمار دنیا کے سب سے بڑے مذہبوں میں تھا، حکومت گئی تو نتیجہ یہ ہوا کہ بودھ مت آج برما میں، چین میں، جاپان میں، سیام میں، غرض کہ مشرق بعید کے سارے ممالک میں پھیلا ہوا ہے، مگر خود اپنے وطن یعنی ملک ہند میں مسافر بلکہ اجنبی ہے، اندلس میں مسلمانوں کا جو حشر ہوا اوس سے دنیا ہمیشہ عبرت حاصل کرے گی اور مسلمانان عالم کی گردن میں جب تک موجودہ نکبت کا طوق ہے وہ اوس اسلامی عظمت کی یاد جس نے آٹھ سو برس تک یورپ میں شمع توحید روشن رکھی، ان الفاظ میں تازہ رکھیں گے ؎

روئے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونناب بار
وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار
ہے زمین قرطبہ بھی دیدۂ مسلم کا نور
ظلمت مغرب میں جو روشن تھی مثل شمع طور
(اقبال)

مذہب اور حکومت کا چولی دامن کا ساتھ ہے، غیر کا محکوم ہونے کے بعد مذہب رہ سکتا ہو مگر زندہ نہیں رہ سکتا۔ بقول اکبر الہ آبادی ؎

نہ ہو مذہب میں جب زور حکومت
تو وہ کیا ہے فقط اک فلسفا ہے

اب تو اسلام کے زندہ رہنے کے لالے پڑے ہوئے ہیں، سنی وشیعہ اختلافات کا کیا سوال ہے۔ ایسے نازک وقت میں تو گرفتار ابوبکر وعلی والا اعتراض اپنے اوپر عائد ہونے دینا، اور اسلامی فرقوں کے باہمی اختلافات کو بڑھانا، خواہ وہ لکھنؤ میں ہوں یا دیوبند میں امروہہ میں ہوں یا سہارنپور میں، اسلام کے ساتھ غداری ہے۔

میری یہ حالت ہے کہ خوش عقیدہ سنی دادا کا پوتا اور آزاد خیال شیعہ باپ کا بیٹا ہوں، توحید اور معاد اور نبوت پر اپنے عقائد کا ذکر اوپر کر چکا ہوں، بقیہ مسلک یہ ہے کہ نماز ہاتھ کھول کر پڑھتا ہوں، لیکن جب کبھی ایسا موقع پیش آجاتا ہے کہ سنیوں کی نماز جماعت ہو رہی ہو اور

میرے کپڑے پاک ہوں تو وضو کر کے سنی امام کے پیچھے نیت باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہوں اور جماعت کے ساتھ ہاتھ کھول کر نماز[1] ادا کرتا ہوں، باوجود شیعہ ہونے کے سید الشہدا امام حسین کے غم میں رونے کو داخلِ ثواب نہیں سمجھتا، لیکن ہجرت کے چوتھے[2] سال سے اب تک جتنے مسلمان دنیا میں پیدا ہوئے ہیں اون میں حسین کو سب سے بڑا اور سب سے اچھا یعنی افضل سمجھتا ہوں، اور جانتا ہوں کہ سبطِ نبی کی میدانِ کربلا میں قربانی کے بغیر اسلام کا وہی حشر ہوتا جو دین موسوی کا سامری کے ہاتھوں حضرت موسیٰ کی عارضی عدم موجودگی میں ہوا تھا، گو سامری نے سونے کا بچھڑا بنایا، تاہم جب تک اوس میں جان نہ پڑی یہودی اپنے دین پر قائم رہے تعجب ہے کہ یزید کے بخشے ہوئے سونے چاندی میں گو جان نہ تھی مگر اوس نے جاہلیت کے رسم و رواج میں دوبارہ جان ڈال کر پیکرِ اسلام کو ایسا کھلونا بنا ڈالا کہ امام حسین اس آڑے وقت میں اپنی جان نہ دے دیتے تو برائے گفتن اسلام کا نام رہتا، لیکن یزید بن امیر معاویہ اور ولید بن یزید بن عبد الملک جیسے خلفا اور اون خلفا کے عامل اور سپہ سالار عبید اللہ ابن زیاد اور مسلم ابن عقبہ اور حجاج[3] ابن یوسف جیسے سفاکوں کے کرتوت کی ظلمت صدیوں تک نورِ اسلام کی شعاعوں کو اہلِ عالم تک نہ پہنچنے دیتی، شعر - رہتی ردائے شام کی ظلمت ہی دین پر : ہوتا نہ تو تو صبح نہ ہوتی زمین پر - (جوش ملیح آبادی) اسلام کی تاریخ میں معرکۂ کربلا ہی وہ واقعہ ہے جو ظلم و ستم، جور و تعدی، شر و باطل کے ہر طوفان میں مظلوموں، حق پرستوں اور راستبازوں

---

[1] دونوں فرقوں میں ایسے علما گذرے ہیں جنہوں نے ایک فرقہ کے امام کی امامت میں دوسرے فرقہ کے ماموم کا جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا جائز قرار دیا ہے، مذہبی رواداری کے دائرہ کو وسعت دینے کے لئے میری رائے میں دونوں فرقوں کی روشن خیال اور تعلیم یافتہ جماعت کو اس جواز سے فائدہ اوٹھانا چاہیے۔

[2] سنہ چار ہجری امام حسین کا سالِ ولادت ہے۔

[3] عیب می جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو۔ حجاج برا خوش بیان خطیب اور فصیح مقرر تھا۔ اعراب بھی پہلی مرتبہ اوس نے ہی لگائے۔

کا سفینہ رہا ہے، حق و باطل کے مقابلہ میں جب باطل کو عارضی غلبہ ہوا ہے، مغلوب حق پرستوں نے ہمیشہ یہ کہہ کر باطل سے دبنے سے انکار کیا ہے کہ جب سردار دوعالم کے نواسے نے ذلتیں سہیں طرح طرح کی تکلیفیں برداشت کیں یہاں تک کہ اپنی جان دے دی مگر باطل کے آگے سر نہ جھکایا تو ہم معمولی آدمیوں کو حق کی خاطر ذلتیں سہنے اور تکلیف اوٹھانے میں کیا عار آسکتی ہے مولانا محمد علی جوہر نے کیا سچی بات کہی ہے۔ شعر

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے — اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

خواجہ معین الدین اجمیری کی حقیقت شناس اور معرفت بین نظر میں امام حسین کے کارنامہ کی جو عظمت ہے اوس کی صراحت کا یہ کے واجب الاحترام بزرگ نے جن کے وعظ و پند سے بے شمار آدمی دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے حسب ذیل رباعی میں فرمائی ہے۔

شاہ است حسین و بادشاہ است حسین — دین است حسین و دیں پناہ است حسین
سر داد و نداد دست در دستِ یزید — حقّا کہ بنا ءِ لا الٰہ است حسین

ترجمہ۔ حسین دین کے سردار اور بادشاہ اور دین کے پناہ دینے ولے ہیں، حسین نے سر کٹوا دیا مگر اپنا ہاتھ بیعت کے لئے یزید کی طرف نہ بڑھایا، قسم خدا کی حسین لا الٰہ الا اللہ کی جڑ ہیں، چار مصرعوں میں خواجہ صاحب علیہ الرحمۃ نے جس خوبی سے اظہار حقیقت کیا ہے وہ ایک دفتر کے برابر ہے۔

رسومِ محرم کی اصلاح

ہندوستان میں تعزیہ داری کا رواج صدیوں سے ہے، دراصل تعزیہ مظلومِ کربلا کی ضریح کی شبیہ ہے، جس کے بنانے پر کوئی معقولی یا شرعی اعتراض وارد نہیں ہوسکتا، مغربی ممالک میں تو قوم کے محسنوں اور بڑے آدمیوں کے مجسمے تیار کئے جاتے اور قوم کی رہبری کے لئے صدیوں تک بڑی احتیاط سے رکھے جاتے ہیں ہندوستان میں بھی مشکل سے کوئی تعلیم یافتہ مسلمان ایسا نکلے گا جس کے پاس اوس کے بزرگوں عزیزوں یا دوستوں کی تصویریں نہ ہوں، بہت سے مسلمانوں کے گھروں میں سرسید علیہ الرحمۃ

نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک یا مولانا محمد علی و مولانا شوکت علی یا انور پاشا اور غازی مصطفیٰ کمال اتاترک کی تصویریں بڑی نمایاں اور ممتاز جگہ رکھی ملیں گی، ہم اپنے پاس تصویر اوس شخص کی رکھتے ہیں جس سے ہم کو محبت ہو یا جس کا احترام ہمارے دل میں ہو، ہادیٔ برحق کے جری، غیور اور مظلوم نواسہ سے عام مسلمانوں کو محبت ہے، بات کی پچ یا سقائی مصلحتوں کے اقتضا سے اگر قطع نظر کر لی جائے تو ایسا مسلمان تو بڑی مشکل سے ملے گا جس کے دل میں جگر گوشۂ رسول الثقلین یعنی امام حسین کا احترام نہ ہو، ایسی صورت میں تعزیہ داری پر اعتراض کرنا ایسا فعل ہے جس کی معقولیت اوسی شخص کو نظر آسکتی ہے جس کو اُلٹا دکھائی دیتا ہو، میں نے جو کچھ کہا ہے اوس کا تعلق تعزیہ داری سے ہے، رہی تعزیہ پرستی اوس کی اسلام میں ویسی ہی ممانعت ہے جیسی قبر پرستی کی اور میری ناچیز رائے میں تعزیہ پرستی اور قبر پرستی میں کچھ فرق نہیں ہے، عشرہ محرم میں ہر سال مسلمان بڑی رقم خرچ کرتے ہیں، مجالس محرم کا قائم رکھنا اس لئے ضروری ہے کہ بغیر اوس کے معرکۂ کربلا کی اہمیت ایک تاریخی واقعہ سے زیادہ نہ رہے گی، اور رفتہ رفتہ قوم وہ اعلیٰ مذہبی اور اخلاقی سبق بھول جائے گی جس سے قوم کو ہمارے موجودہ تنزل کے دور میں بھی طرح طرح کے دنیادی فائدے حاصل ہوئے ہیں، جب مختلف اصلاحی تحریکوں کے باوجود ہمارے ہندو بھائیوں نے گنگا اشنان اور دسہرہ کے میلوں کو دوگنی چوگنی ترقی دی ہے تو نہایت ناعاقبت اندیشی ہوگی اگر ہم اصلاح کے جھوٹے جوش میں اوس قومی تنظیم کا خاتمہ کر دیں جو محرم کی بدولت ہم کو حاصل ہے اور جس کی قدر صحت جسمانی کی طرح ہم کو اوس وقت معلوم ہوگی جب مرض یعنی ملکی ہنگامے ہماری گردن دبائیں گے، اسی کے ساتھ یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ ہماری مالی حالت گذشتہ چالیس برس میں اور زیادہ خراب ہو گئی ہے، روپیہ کی قیمت کم ہو جانے کے باعث کھانے پینے اور پہننے کے اخراجات بڑھ گئے ہیں - جوں جوں اولاد بڑھتی جاتی ہے پرانے خاندانوں کی موروثی جائداد کی آمدنی کم ہوتی جاتی ہے، سب سے مقدم لڑکوں اور لڑکیوں کی

تعلیم کا خرچ ہے، جو چالیس برس پہلے سے دوگنا بلکہ تگنا ہو گیا ہے، ان حالات میں محرم کا خرچ بدستور قدیم جاری رکھنے کی کوئی صورت نہیں ہے، اگر ہم زندگی کی دوڑ میں پھسڈی رہنا نہیں چاہتے تو ہمارا فرض ہے کہ اخراجات میں کمی کریں، مثلاً محرم میں جو شخص ہر سال سو روپے صرف کرتا ہے وہ پچاس روپے خرچ کرے، اور بقیہ پچاس روپے اپنی اولاد یا غریب رشتہ داروں کی تعلیم میں لگائے، رشتہ داروں کی امداد میں ایسی فیاضی سے کام لینا جس سے وہ خود اپنی روٹی کمانے کی فکر سے غافل ہو جائیں نہایت غلط طریقہ ہے، لیکن ہر شخص بالخصوص ہر مسلمان کا فرض ہے کہ مقدور بھر غریب رشتہ دار طلبا کی تعلیم کے لئے مالی امداد دے، غریب رشتہ دار نہ ہونے کی صورت میں اسلامی ہائی اسکولوں کی مدد کرنا ہمارا فرض ہے، بہت سے ضلعوں میں اسلامیہ ہائی اسکول قائم ہو گئے ہیں، بعض اضلاع میں لڑکیوں کی تعلیم کے لئے بھی دور اندیش مسلمانوں کی کوشش سے ہائی اسکول اور مڈل اسکول بن گئے ہیں مقتضائے حالات یہ ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم کی طرف خاص توجہ کی جائے، ہمارے اسکولوں کی خواہ وہ لڑکوں کی تعلیم کے لئے ہوں یا لڑکیوں کی تعلیم کے لئے، مالی حالت خراب ہے، اگر کسی ضلع میں اسلامی اسکول نہ ہو تو اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ اور بعض اور ایسے اسکول موجود ہیں جن کی حیثیت مقامی نہیں بلکہ مرکزی ہے، اور جن کی مالی مدد کرنے سے قوم کو ہم کثیر فائدہ پہنچا سکتے ہیں، یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ محض محرم کے خرچ کی بچت ہماری تعلیمی ضروریات کو پورا کر سکتی ہے، سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ شادی بیاہ وغیرہ کی تقریبوں میں نمود بے بود حاصل کرنے کے لئے جو روپیہ خرچ کیا جاتا ہے، اوس میں بھاری کمی کی جائے، میں خود اس الزام سے نہیں بچ سکتا، اپریل ۱۹۴۱ء میں برخوردار حمزہ علی کی شادی میں جتنا روپیہ خرچ کرنے کا میرا قصد تھا اوس سے تگنا خرچ کرنا پڑا، بات یہ ہے کہ بیگم رضا علی (حمزہ کی والدہ) کا انتقال ہو چکا ہے، میری لڑکی (بیگم نقوی) کا حوصلہ بھی ایسا ہی بڑا ہے، جیسا اون کا دل، یہ دونوں چیزیں اون کو میراث میں اپنی دادی سے ملی ہیں۔ شادی کا بیشتر انتظام بیگم نقوی کے ہاتھ میں تھا، اونہوں نے دھڑلے سے روپیہ خرچ کرایا

میں نے اونہیں اس لئے نہیں رد کا کہ کوئی یہ نہ کہے کہ ماں کے مرجانے کے باعث باپ اولاد کی طرف سے غافل ہے، اگر ایسے آدمی کی بات جس کے حال پر خود را فضیحت و دیگراں را نصیحت والا مقولہ عائد ہوتا ہو ناقابل توجہ نہ سمجھی جائے تو میں یہ کہوں گا کہ مصرعہ من نہ کردم شما حذر بکنید

میری پہلی شادی بالکل سادہ طریقہ سے ہوئی تھی، دوسری شادی میں بھی جو خاص حالات اور غیر ملک میں ہوئی غیر معمولی اہتمام نہ تھا، ہاجرہ خاتون (بیگم نقوی) کی شادی میں شان و شوکت نہ تھی۔ مگر بالکل سادگی بھی نہیں برتی گئی، رقص و سرود کی محفل کسی شادی میں نہیں ہوئی۔

بنی عباس کی سیاست

مظلوم کربلا کے غم میں رونے کا مسئلہ بھی ہماری توجہ کا محتاج ہے، بنی عباس کے دور میں صدیوں تک یہ حالت رہی کہ بنی فاطمہ سے عقیدت رکھنا یا محبت کرنا بڑا سخت سیاسی جرم تھا، بنی فاطمہ پر عباسیوں کے خلاف سازش کرنے کا الزام بڑا کارآمد ہتھیار تھا جس سے عباسی کام لیتے تھے، واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ اس الزام میں حقیقت کم تھی اور پراپگنڈے کا عنصر غالب تھا، یزید بن معاویہ کی وفات کے بعد حصین بن نمیر نے امام زین العابدین کو خلیفہ بنانا چاہا، مگر انہوں نے انکار فرمایا، ابوسلمہ نے ابراہیم بن محمد عباسی کی وفات کے بعد امام جعفر صادق سے خلافت منظور کرنے کی خواہش کی مگر انہوں نے بھی منظور نہ کیا، با ایں ہمہ بنی فاطمہ اور علوی سادات عباسیوں کی زیادتیوں کا شکار رہے متوکل بن معتصم نے (زمانہ خلافت ۲۳۲ھ ہجری تا ۲۴۷ھ ہجری) تو یہاں تک کیا کہ امام حسین اور اون کے ساتھیوں کے مزار مسمار کراکر اون پر کھیتی کرادی، بنی فاطمہ انسان تھے فرشتے نہ تھے اگر اون میں سے معدودے چند نے تشدد سے عاجز آکر حکومت کے خلاف سازشیں شروع کردیں تو اس میں کوئی بات انسانی فطرت کے خلاف نہ تھی، عباسیوں نے عوام کے مذہبی جذبات کو برافروختہ کرکے اور خون حسین کے قصاص کا مدعی بن کر خلافت حاصل کی تھی، وہ مذہب کی قوت کو جانتے تھے، حکومت کی جڑیں مضبوط ہو جانے پر انہوں نے یہ التزام رکھا کہ ہادی برحق کی بیٹی کی اولاد جو باپ کی طرف سے بھی قریشی اور ہاشمی ہونے کا شرف رکھتی تھی مرجع امت

نہ بننے پائے، خلیفہ ہارون الرشید نے جن وجوہ سے آل برامکہ کو تباہ و برباد کیا اون میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ برمکی بنی فاطمہ کے بہی خواہ اور اون سے عقیدت رکھنے والے سمجھے جاتے تھے، حکومت کو اپنی اولاد یا خاندان میں قائم و برقرار رکھنے کا جذبہ کوئی نیا جذبہ نہیں ہے، ابتدائے آفرینش سے بنی نوع انسان کی اون نسلوں اور خاندانوں نے جو طاقتور تھے یہ کوشش کی ہے کہ وہ حاکم اور بقیہ انسان محکوم رہیں۔ بنی عباس اور بنی فاطمہ یا آل علی میں تو کئی پیڑھیوں کا فرق تھا، خود بنی امیہ نے عمر ابن عبد العزیز کے ساتھ جو کچھ کیا اوس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جس خاندان کو حکومت حاصل ہو جائے وہ تمام جائز و ناجائز ذرائع حکومت کو اپنے خاندان میں برقرار رکھنے کے لئے اختیار کرتا ہے عمر ابن عبد العزیز اموی نسل کے بہترین خلیفہ تھے جنہوں نے اپنے مختصر دور حکومت میں خلافت کی سادگی کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی علم و فضل میں نہایت بلند پایہ رکھنے کے ساتھ ساتھ اون کے اتقا، منصف مزاجی و خدا ترسی کے واقعات حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت علی کی خلافت کا مقدس دور یاد دلاتے ہیں، اون کے عہد تک حضرت علی اور اون کی اولاد کو برسر منبر برا بھلا کہا جاتا تھا، اس فعل کو شرعی اصطلاح میں سب و شتم کہتے ہیں، حضرت عمر ابن عبد العزیز نے اس طریقہ کو روکنے میں ایسے تدبر، فرزانگی اور دوراندیشی سے کام لیا کہ اون کی وفات کے بعد بھی پھر اس مذموم طریقہ نے رواج نہ پایا۔

باغ فدک کے معاملہ میں بھی بنی فاطمہ کے ساتھ انصاف کا برتاؤ کیا، خود بنی امیہ کے پاس جو بڑی بڑی جاگیریں تھیں اون کی آمدنی بقدر ضرورت بنی امیہ کے لئے جائز رکھی، بقیہ آمدنی بیت المال میں داخل ہونے کا حکم دے دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ بنی امیہ نے یہ دیکھ کر کہ اس خدا ترس اور منصف مزاج خلیفہ کا دور اگر عرصہ دراز تک قائم رہا تو اون کی حکومت معرض خطر میں پڑ جائے گی عمر ابن عبد العزیز کو زہر دے کر آئندہ خطرات کا خاتمہ کر دیا، بعینہ یہی صورت خلیفہ مامون الرشید کے عہد میں دوبارہ پیش آئی، مامون الرشید نے امام علی رضا کو اپنا ولی عہد اور جانشین مقرر کیا تھا، ولی عہدی کا اعلان ہوتے ہی بنی عباس نے چاروں طرف سے

خفیہ سازشیں شروع کر دیں، ابراہیم بن مہدی (مامون الرشید کا چچا) کھلم کھلا خلافت کا دعویدار بنا، مامون الرشید کی ہوش مندی کے باعث دشمنوں کو اوس کے مقابلہ میں ناکامیابی ہوئی مگر بنی عباس نے امام علی رضا کے مقابلہ میں وہی آلہ استعمال کیا جس کے ذریعہ سے قاتل بغیر اپنی صورت دکھائے یا خون کا ایک قطرہ بہلئے مقتدر اور بے گناہ ہستیوں کو موت کی نیند سلا دیتے ہیں، یعنی امام علی رضا کی زندگی کا بھی بنی عباس نے زہر کے ذریعہ سے خاتمہ کر دیا، میری ناچیز رائے میں عمر ابن عبدالعزیز کو بقیہ خلفائے بنی امیہ پر اسی طرح ترجیح اور فضیلت حاصل ہے جس طرح مامون الرشید کو بقیہ خلفائے بنی عباس پر ہے، انسانی فطرت کو بدلنا عمر ابن عبدالعزیز یا مامون الرشید کے اختیار سے باہر تھا، یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ وہ مذہب کا زمانہ تھا، اور بالعموم عباسیوں نے آل نبی اور اولاد علی کی محبت اور غم حسین میں گریہ و بکا کو غیر اسلامی شعار قرار دیا تھا، اس درازدستی کا دفاعی جواب صرف یہ ہوسکتا تھا کہ ذکر حسینؑ اور غم حسینؑ کو موجب ثواب قرار دیا جائے، چنانچہ اہل بیت اور حامیانِ اہل بیت نے عباسیوں کی جارحانہ کارروائی کی مدافعت کا یہی طریقہ اختیار کیا، جو بالکل صحیح اور درست بلکہ ضروری اور لازمی تھا، عباسیوں نے اپنی سیاست کو مذہب کا جامہ پہنایا تھا، بنی فاطمہ اور اون کے دوستوں کا معرکۂ کربلا کے مذہبی پہلو پر زور دینا اس لئے بھی حق بجانب تھا کہ کربلا کی لڑائی فی الحقیقت امام حسینؑ اور یزید کے درمیان نہ تھی، بلکہ یہ مقابلہ نور اور تاریکی، نیکی اور بدی، خیر اور شر بالمختصر حق و باطل کے درمیان تھا، یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ اہل بیت نبوی اور اون کے پیرو مذہبی معاملات میں عباسیوں کا مسلمانوں کو اپنی منشا اور مصلحت کے مطابق عقیدہ رکھنے پر مجبور کرنے کو اسلامی تعلیم کے منافی سمجھتے تھے، اور واقعۂ کربلا کی اصلی اہمیت سے مسلمانوں کو آگاہ کرنا اپنا فرض جانتے تھے، ہمارے بزرگوں کی جن میں شیعہ اور سنی[1] دونوں شامل تھے برابر

---

[1] دیکھو سر الشہادتین مصنفہ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب مرحوم محدث دہلوی، مطبوعہ مطبع مجتبائی سنہ ۱۳۰۹ ہجری، موصوف نے سنہ ۱۲۳۹ ہجری میں وفات پائی۔ شاہ صاحب نے اپنی کتاب جس عربی شعر پر ختم کی ہے اوس کا ترجمہ یہ ہے۔ کیا حسین کے قاتل یہ امید رکھ سکتے ہیں کہ قیامت کے دن اون کے نانا۔ ان آدمیوں کی شفاعت کریں گے۔

یہ کوشش رہی کہ مسلمان کربلا کی یاد تازہ رکھیں اور اوس کی اہمیت کو سمجھیں اور خدا کے فضل سے اون کی یہ سعی بار ور ہوئی، گو اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ تاریخ میں کوئی مثال ایسی نہیں ملتی جس میں امت نے کسی نبی کا دین اختیار کرلینے کے بعد اوس نبی کے کنبہ کے ساتھ ایسے ظلم اور بے رحمی کا برتاؤ کیا ہو جیسا کہ مسلمانوں نے اپنے نبی کے انتقال کے پچاس سال کے اندر خاندان نبوت کے ساتھ کیا، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ کسی قوم نے اپنے نبی کی آل کی ایسی عظیم الشان یادگار قائم نہیں کی جیسے مسلمانوں نے واقعۂ کربلا کو زندہ رکھا ہے، یہ سچ ہے کہ مسلمانوں کی وہ بے رحمی اسلامی تاریخ کا سب سے بڑا اور بدنما داغ ہے مگر اس میں بھی کلام نہیں کہ تشکر کا یہ غیر فانی جذبہ جس کا اظہار ہر ملک اور ہر نسل کے مسلمان بڑے جوش و خروش سے ہر سال محرم میں کرتے ہیں، دنیا کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا، اس پاک اور متبرک جذبہ نے اسلام کے چہرہ کو چار چاند لگا دیئے ہیں اور اس بدنما داغ کو بھی وہ لازوال نور عطا کردیا ہے جو اس وقت تک مشعل ہدایت کا کام دے گا جب تک دنیا میں حق و باطل اور نیکی و بدی میں امتیاز باقی ہے۔

کیا رونا ثواب ہے

اب دنیا نے نیا پلٹا کھایا ہے، بہت سے ملکوں میں جہاں مسلمان حاکم تھے اب وہ غیروں کے محکوم ہیں، مذہب کے بارے میں حکمران مغربی قوموں نے ایک خاص پالیسی اختیار کر رکھی ہے ہر مذہب کے پیرو بعض حدود کے اندر اپنے شعائر اور مراسم بجالاسکتے ہیں، غم حسین میں رونے پر کوئی پابندی نہیں ہے، معرکۂ کربلا کے فلسفہ پر غور کیجیئے، رونا موجب ثواب اس لئے قرار دیا گیا تھا کہ رونے کی ممانعت تھی، در اصل ممانعت اور گریہ و بکا کی فضیلت (یعنی ثواب) میں علت و معلول کی نسبت تھی، علت باقی نہ رہنے کی صورت میں معلول کا قائم رکھنا بے معنی بات ہے، گو میرے نزدیک موقع محل کی رقت قلب ایسا وصف ہے جس کا شمار انسان کے اعلیٰ اوصاف میں کیا جاتا ہے، اور کربلا کے روح فرسا حالات سن کر اگر کسی محب اہل بیت کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوجائیں تو اوس پر کسی ذی فہم کو اعتراض نہیں ہوسکتا تاہم گریہ و بکا کو موجب ثواب سمجھنے کے دو تاریک پہلو ہیں، ایک یہ کہ اکثر جاہل مسلمان یہ سمجھتے

ہیں کہ ہر سال محرم میں تھوڑے سے آنسو بہا لینے سے اون کے سال بھر کے گناہ دھل جاتے ہیں، بعض عیسائی فرقوں کو اپنے عقیدہ کی بموجب حضرت عیسیٰ کے قطرات خون کا سارے نصرانیوں کے گناہوں کا کفارہ قرار دے دینا مبارک ہو مگر اس مذموم اور مخدوش طریقہ کی پیروی کسی اسلامی فرقہ کے لئے ہرگز جائز نہیں ہو سکتی، دوسری خرابی یہ ہے کہ رونے کو کار ثواب قرار دینے سے ریا اور تصنع کے دامن کو بڑی وسعت ہو جاتی ہے، کربلا کا واقعہ ایسی عظیم الشان اہمیت رکھتا ہے کہ مسلمان تو درکنار غیر مسلم بھی اوس سے استفادہ حاصل کر سکتے ہیں، مگر رونا تو یہ ہے کہ رونے کی فضیلت نے کربلا کے اصلی سبق کو مسلمانوں کی آنکھوں سے ایسا اوجھل کیا ہے کہ سینہ کوبی کرنے والوں اور ہائے آقا ہائے مولا کہہ کر اور دہاڑیں مار کر رونے والوں کو کبھی بھولے سے بھی اس کا خیال نہیں آتا کہ حسین علیہ السلام نے بحیثیت باپ، خاوند بھائی، چچا، ماموں، رشتہ دار، دوست، میزبان اور سردار قوم کے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بحیثیت انسان کے جن اعلیٰ اوصاف کا اظہار بڑے نازک وقت میں کیا اوس کی پیروی اور روزمرہ کی زندگی میں نبی کے نواسہ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی جائے، رسوم محرم کی اصلاح کے سلسلہ میں سب سے زیادہ ضرورت اس کی ہے کہ گریہ وبکا پر زور دینے کی بجائے ذاکر مجالس محرم میں ذکر حسین اس غرض اور مقصد سے کریں تاکہ سامعین کو صاف معلوم ہو جائے کہ حسین علیہ السلام نے اپنی زندگی کے آخری سال میں جو کچھ کیا، کیوں کیا، اور اون سب باتوں کا ہم مسلمانوں سے کیا دینی اور دنیوی تعلق ہے، میرے دوست سید آل رضا صاحب ایڈوکیٹ لکھنؤ نے جو مرثیہ حال میں کہا ہے وہ اس قابل ہے کہ سب مسلمان بچوں کی نوک زبان پر ہو، یہ بتانے کے بعد کہ غم حسینؑ کیا چیز ہے کہتے ہیں کہ ؎

شرط لیکن ہے کہ اس ذکر کی حرمت بھی رہے — شان مظلوم رہے، شان شجاعت بھی رہے
جان دی شاہ نے جس پر وہ صداقت بھی رہے — ہم سے جو مانگی تھی ملحوظ وہ نصرت بھی رہے
دل کے یہ نقش عمل سے ہوں اُبھرنے والے — مرتے مرتے ہمیں بھولے نہیں مرنے والے

حق پرستی سے نہ ہونے دے جو غافل وہ غم　　جس سے تھرائے پرستاریٔ باطل وہ غم
خود بنے اپنے سمندر کا جو ساحل وہ غم　　جو رہے ضامنِ شائستگیٔ دل وہ غم

دلِ گدازی میں شجاعت جو سکھاتا جائے
سوگواروں کو سپاہی بھی بناتا جائے

اپنے منہ میاں مٹھو ایران میں عشرہ محرم کی ریاکاری نے جو گل کھلائے تھے اوس کا بھی تھوڑا سا حال سن لیجئے، بدقسمتی سے آج ہم ہندی مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ ہم ترکوں کو سچا مسلمان سمجھتے ہیں، نہ ایرانیوں کو، ہماری سبک سری نے ہمیں یہ یقین دلا رکھا ہے کہ ٹرکی میں اسلام کا خاتمہ اتاترک مصطفیٰ کمال نے کیا، اور ایران میں رضا شاہ پہلوی نے، ہمارے نزدیک نجدی عرب ناخدا ترس شقی اور سفاک ہیں، اون کو دین اسلام سے کیا واسطہ شامی اور مصری یورپ کی تہذیب و شائستگی کے حلقہ بگوش ہیں۔ اس لئے اون کا قول و فعل قابلِ اعتبار نہیں ہوسکتا، ترکستان کے مسلمان جاہل ہیں اور ہمیشہ سے برائے نام مسلمان چلے آئے ہیں، اون کو دین اسلام کی مقدس تعلیم سے بہت تھوڑا تعلق ہے، شمالی افریقہ کے اسلامی ممالک کی زبان عربی ہو مگر اسلامی تعلیم سے وہ اوسی قدر دور ہیں جس قدر اون کی زبان مکہ اور مدینہ کی عربی سے مختلف ہے، عراق اور فلسطین کے لوگ مذہب سے تھوڑا بہت ضرور واقف ہیں مگر ان دونوں ملکوں کی آبادی اس قدر قلیل ہے کہ اس کا کوئی خاص اثر عالم اسلام پر نہیں پڑسکتا قبروں اور تعزیوں کی پرستش کرنے والے اور عورتوں کے برقع کو خانہ کعبہ کے غلاف کی طرح باعثِ برکت سمجھنے والے نادان لیکن جوشیلے افغانی سرحدی اور ہندی مسلمانوں کو اون کی توہم پرستی نے یقین دلا رکھا ہے کہ سابق شاہ امان اللہ خاں نے افغانستان کو بے دین کرنا چاہا تھا مگر خالق ذوالجلال کے عظمت و جلال نے شاہ موصوف کے شر سے افغانستان کو محفوظ رکھا۔ ان سب بے بنیاد اعتراضوں کا ماحصل یہ ہے کہ دنیا کے اگر کسی ملک میں سچا اسلام موجود ہے تو وہ بزعمِ خود ہمارے ملک یعنی ہندوستان میں ہے، ہم اپنے کو اسلام کا اجارہ دار جانتے ہیں اور دیگر

اسلامی ممالک پر طعن و تشنیع کا بغیر شرکت غیرے و سا ہمت دیگرے ہم اپنے کو حق دار سمجھتے ہیں، اس زعم باطل کا نتیجہ یہ ہوا کہ گو ہندوستان کی سرزمین سے سرسید احمد خاں جیسا مصلح اور مجدد اوٹھا جس کی جامعیت کی نظیر سوائے سید جمال الدین افغانی کے پچھلی صدی کی دنیائے اسلام میں نظر نہیں آتی، تاہم ہماری بے حوصلگی اور نا عاقبت اندیشی نے سرسید احمد خاں کی اصلاحی تحریک کا پورا فائدہ اوٹھانے سے ہمیں باز رکھا، آمدم برسر مطلب، میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہندوستان کی طرح ایران میں بھی عشرہ محرم کی عزاداری نے توہم پرستی کی صورت اختیار کرلی تھی، رضا شاہ کی تخت نشینی کے کے پہلے جس شان و شوکت سے مجالس محرم منعقد ہوتی تھیں، روضہ خوانوں کو (ایران میں ذاکروں کو روضہ خواں کہتے ہیں) جو اجرت روضہ خوانی کی دی جاتی تھی اور تقسیم تبرک اور شرکائے مجلس کی ضیافت میں جس طرح بے دریغ روپیہ خرچ کیا جاتا تھا اوس کا مذاق ایک ایرانی شاعر نے اپنی ایک نظم میں اوڑیا ہے، یہ نظم رضا شاہ کے دور سے پہلے کی لکھی ہوئی ہے، اور پروفیسر براؤن کی مشہور کتاب ایران کی ادبی تاریخ کی چوتھی جلد کے صفحہ ۱۸۲ لغایت ۱۸۴ میں موجود ہے، نظم کی طوالت کے باعث افسوس ہے کہ میں سارے اشعار یہاں نقل نہیں کرسکتا لیکن بعض اشعار مع ترجمہ کے درج کئے جاتے ہیں، شعروں کے انتخاب میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ مضمون کا سلسلہ نہ ٹوٹنے پائے۔

کنوں بشنو از من یکے داستاں — کہ رنگیں تر است از گل بوستاں
کسانے کہ گیرند عزائے حسینؑ — بہ مجلس نشینند باشور و شین
گروہے ز مردان اشکم پرست — ز جام طمع جملہ بے خویش و مست
یکے زاں میاں گو ید اے ہمرہاں — پسندیدہ یاران کار آگہاں
من و حاجی عباس رفتیم دوش — سوئے بزم آں شخص سبزی فروش
نہ بود اندراں مجلس مختصر! — بجز چاہی و قہوہ چیزے دگر
نشستن دراں بزم نہ بود روا — کہ بے قند و چاہی نہ دارد صفا

خداوند از آں بندہ خورسند نیست | کہ در مجلس اش شربتِ قند نیست
ولیکن بہ روزی دہِ انس و جاں | فلاں جاست بزمے چو بزمِ شہاں
عجب مجلسِ خوب و راحت فزاست | یقیں دانم آں مجلسِ بے ریاست
زنی ہیچ قلیان ہائے بلور | کہ یابد دل از قلقلِ وے سرور
رود عطرِ تمباکویش چند میل | درخشد بہ سر آتشش چوں سہیل
نہ خواہد دراں جاشود آب صرف | بہ جز شربتِ قند و لیموں و برف
نمود است بانیِ عالی جناب | ز ہر کشورے ذاکرے انتخاب
یک از ذاکراں میرزا کاشی است | کہ گویند او روضہ خواں بانئی است
دگر زاں کساں ذاکرِ رشتی است | کہ دریائے آواز را کشتی است
ز کرمان و از یزد و کرماں شہاں | ز شیراز و از شوستر و اصفہاں
ہمہ موسیقی داں و خوش صوت و نغز | بود دیگراں قشر و ایشاں چو مغز
حقیقت عجب مجلسِ بے ریاست | بہ جانِ شمار فتن آں جا بجاست

ترجمہ (۱) آیئے میں آپ کو ایک قصہ سناؤں جس کی رنگینی باغ کے پھول سے بھی بڑھ کر ہے ، (۲) جو لوگ امام حسینؑ کی عزاداری کرتے ہیں وہ مجلس میں بیٹھ کر دہاڑیں مار کر روتے ہیں (۳) پیٹو آدمیوں کی ایک جماعت ایسی ہے جس کو لالچ نے آپے سے باہر اور مست بنا دیا ہے ، (۴) ان میں کا ایک اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے اے دوستو تم سب تو دنیا کے معاملات سے باخبر ہو ، (۵) کل میں اور حاجی عباس اوس کو تخڑے کے ہاں مجلس میں گئے تھے (۶) وہ مجلس اس قدر سادہ تھی کہ وہاں سوائے چائے اور قہوہ کے اور کوئی چیز نہ تھی ، (۷) ایسی مجلس میں بیٹھنا اس لئے روا نہیں ہو سکتا کہ بغیر قند اور چائے کے کچھ لطف نہیں آتا ، (۸) خدائے پاک اوس بندہ سے خوش نہیں ہوتا جس کے ہاں مجلس میں قند کا شربت نہ ہو ، (۹) لیکن اوس خدا کی قسم جو انسانوں اور جنوں کو روزی دیتا ہے ، فلاں جگہ ایسی مجلس

ہوتی ہے جو بادشاہوں کے شایان شان ہے۔ (۱۰) وہ مجلس ایسی اچھی ہے اور اس میں آرام کا اس قدر سامان ہے کہ مجھے پورا یقین ہے کہ وہاں ریا (بناوٹ) کو دخل نہیں ہے۔ (۱۱) پیتے وقت بلور کے پیچوانوں کی نے سے وہ آواز نکلتی ہے کہ دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ (۱۲) میلوں تک تمباکو کی خوشبو پھیل جاتی ہے اور چلم کے سر پر آگ مثل سہیل [۵۱] ستارے کے چمکتی ہے۔ (۱۳) اس مجلس میں کوئی پانی نہیں پیتا بلکہ سب آدمی قند نیبو اور برف کا شربت پیتے ہیں۔ (۱۴) عالی جناب بانیِ مجلس نے ہر ملک کے منتخب ذاکر بُلائے ہیں۔ (۱۵) ان ذاکروں میں سے ایک مرزا کاشی ہیں جو بےنظیر مرثیہ خواں ہیں۔ (۱۶) دوسرے ذاکر رشت سے تشریف لائے ہیں۔ رشتی صاحب کو دریائے ذاکری کی کشتی سمجھنا چاہیئے۔ (۱۷) کرمان اور یزد اور کرمان شاہ۔ شیراز۔ شوستر اور اصفہان۔ (۱۸) ان سب جگہوں کے خوش الحان موسیقی داں آئے ہوئے ہیں جو مثل گری (مغز) کے ہیں جن کے مقابلہ میں اور ذاکروں کو چھلکہ (پوست) سمجھنا چاہیئے۔ (۱۹) سچ یہ ہے کہ عجب پُرخلوص [۵۲] مجلس ہے آپ کے سر کی قسم وہاں ضرور چلنا چاہیئے۔

کربلا کا سبق ہماری پستی کی انتہا یہ ہے کہ بارہا میری اس گذارش پر کہ شہید کربلا کی سچی یادگار یہ ہے کہ مسلمان بجائے گریہ و بکا کے جگر گوشۂ رسول ؐ کے عمل کی پیروی کریں۔ مجھے دس میں سے نو مرتبہ جواب ملا ہے کہ بھلا ہم گنہگار خاصان خدا کی برابری کیسے کر سکتے ہیں۔ یہ جواب دو حال سے خالی نہیں یا تو ہماری قوم معرکۂ کربلا کے سبق کو پس پشت ڈالنے کے بہانے ڈھونڈتی ہے یا حسین علیہ السلام کے کارنامہ کو ایسا معجزہ تصور کرتی ہے جو انسانی قوت سے باہر ہے اگر پہلی بات صحیح ہے تو امام حسین ؑ کا مقدس نام ہم کو اپنی زبان پر لانا شہید کربلا کی توہین کرنا ہے دوسری توجیہہ ہماری قوم کی کم حوصلگی اور پست ہمتی کا بیّن ثبوت ہے۔ امام حسین ؑ کا کارنامہ انسان کا کارنامہ ہے وہ اپنا اور اپنے عزیزوں اور رفیقوں کا سر کٹوانے اور گھر بار

---

[۵۱] عام عقیدہ تھا کہ سہیل ستارہ یمن میں طلوع ہوتا ہے لہٰذا اس کی تاثیر سے چمڑے میں خوشبو پیدا ہو جاتی ہے۔

[۵۲] فارسی لفظ بے ریا ہے۔ سبحان اللہ۔ اس بے ریائی کا کیا کہنا مصرع۔ برعکس نہند نام زنگی کافور۔

لڑائی پر مجبور نہ تھے اگر چاہتے تو یزید سے صلح کر کے اپنی جان بچا سکتے تھے۔ ۲ شعبان ۶۰ھ کو روانگی مدینہ سے لیکر ۲ محرم ۶۱ھ کو میدان کربلا میں ورود کے وقت تک امام حسینؑ نے جو کچھ کیا ان سب باتوں کے اندر وہی جذبات پائے جاتے ہیں جو مصیبت کے وقت ہر انسان کے دل میں موجود ہوتے ہیں۔ بدرجہ مجبوری وطن چھوڑنا مکہ معظمہ جانا اور خدا کے گھر میں امن ڈھونڈنا پھر مکہ کی حالت دیکھ کر خانہ خدا کی حرمت کے خیال سے وہاں سے قبل از وقت چل دینا اور باپ کے دارالخلافت کوفہ کی طرف جہاں کے لوگوں نے دعوت دی تھی اور جنہوں نے امام کی اعانت کا وعدہ کیا تھا روانہ ہونا۔ حر ابن یزید ریاحی کی مزاحمت سے مجبور ہو جانا اور لب دریا خیمہ زن ہونا یہ سب ایسے امور تھے جن میں کوئی بات انسانی طاقت کے باہر نظر نہیں آتی۔ غور سے دیکھا جائے تو بعینہ یہی نوعیت ان تمام واقعات کی ہے جو دسویں محرم کو میدان کربلا میں ظہور پذیر ہوئے۔

جبر و قدر کا مسئلہ جبر و قدر کے مسئلہ کی تعبیر نے صدیوں تک عالم اسلام میں ہیجان برپا رکھا میری ناچیز رائے میں ہر وہ فعل جس کے کرنے کو فاعل اپنا اعلیٰ مذہبی یا اخلاقی فرض سمجھے اور جس کے کرنے پر بلا خوف نتائج اس کو اصرار ہو۔ گو ظاہر بینوں کی نظر میں اس فعل سے فاعل کی مجبوری معلوم ہوتی ہو لیکن اس کو اختیار کی بہترین مثال سمجھنا چاہیئے۔ یہ ظاہری مجبوری دراصل قوت اور اختیار اور احساس ذمہ داری سے پیدا ہوتی ہے اس لئے وہ مجبوری نہیں ہوتی۔ احساس ذمہ داری کے باعث جو طریق کار انسان سوچ سمجھ اور جان بوجھ کر اختیار کرے اُسے مجبوری کہنا الفاظ کو من مانے معنی پہنانا بلکہ لفظوں کے ساتھ کھیل کرنا ہے شرقی چاندپوری نے اپنے ایک شعر میں جبر و قدر کی حدود کو بڑی خوبی سے واضح کیا ہے کہتے ہیں ؎ مری مجبوریوں کو کون جانے ۔۔ میں خود مختار ٹھہرایا گیا ہوں۔ حکیم سقراط زہر کا پیالہ پینے پر مجبور نہ تھا اپنے مذہبی عقائد کی تھوڑی سی تبدیلی سے اہل وطن کی خوشنودی حاصل کر سکتا تھا مگر وہ گرگٹ جیسے رنگ بدل کر اپنی جان بچا لیتا تو آج دنیا اُسے

کیا کہتی۔ ہر آدمی دنیا میں رہنا چاہتا ہے مگر جو انسان کسی اہم مذہبی یا اخلاقی فرض کی ادائگی میں دنیا میں نہ رہنے کو دنیا میں رہنے پر اس غرض سے ترجیح دے کہ اس کا عمل آنیوالی نسلوں کے لئے چراغِ ہدایت کا کام دے۔ وہ اولاد آدم کا سچا محسن اور زندہ جاوید ہے۔ اور اُس کی شہرت پر قیامت تک آتش کا یہ شعر صادق آئے گا ؎

امانت کی طرح رکھا زمیں نے روز محشر تک ٭ نہ اِک مُو کم ہوا اپنا نہ اِک تارِ کفن بگڑا

امام حسینؑ حضرت ختم المرسلینؐ کے نواسے تھے اُن کی ذمہ داری سقراط سے کہیں زیادہ تھی اس لئے امام حسینؑ کے اختیار نے نانا کی اُمت کی ہدایت کے لئے وہ صورت اختیار کی جو ظاہر بینوں کو مجبوری کے ملبوس میں نظر آتی ہے۔ بعض مرثیہ گو شعرا نے حقیقت کے چہرے سے پردہ اُٹھایا ہے مگر افسوس ہے کہ ایسے اشعار کی طرف توجہ کم کی جاتی ہے۔ مرزا اوؔج لکھنوی فرماتے ہیں ؎

جب اُس کی (خدا کی) راہ میں تلواریں سر پہ چلتی ہیں ٭ تو اختیار میں مجبوریاں نکلتی ہیں۔ شرقی اور اوؔج دونوں کا مطلب ایک ہے مگر معرکہ کربلا کے حوالہ نے اوؔج کے شعر کا اصلی مفہوم زیادہ واضح کر دیا ہے۔ جوؔش ملیح آبادی کا وجودِ باری تعالیٰ کے بارے میں جو عقیدہ ہو اُس سے مجھے سروکار نہیں ہے وہ جانیں اور اُن کا پیدا کرنے والا لیکن شہید کربلا کی کرامت دیکھئے جوؔش نے اپنی جوشیلی نظم موسومہ "حسین اور انقلاب" میں امام حسینؑ کے ارادہ کی عظمت کا بیان ایک بند میں کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جوؔش کی باریابی اگر کبھی خانہ خدا (مکہ معظمہ) میں ہوئی تو وہ کربلا کے راستہ سے ہوگی۔ جوؔش شہید کربلا کی اس صفت کو قوتِ رادوری کہیں یا طاقتِ پیغمبری مانیں میرے نزدیک تو یہ سب کچھ حضرت ختم المرسلین کے پیارے نواسہ کی قوتِ بشری کے کارنامے تھے حضرت جوؔش غور کریں باری تعالےٰ کیسا قدرت والا ہوگا جس نے حسین جیسا صاحبِ عزم انسان پیدا کیا۔ جوش کا بند ملاحظہ ہو۔

ہر چند ایک شاخ چمن میں ہری نہ تھی ٭ ماتھا عرق عرق تھا لبوں پر تری نہ تھی
باطل کی ان بلاؤں پہ بھی چاکری نہ تھی ٭ یہ داوری تھی اصل میں پیغمبری نہ تھی

رنگ اُڑ گیا حکومتِ بدعت شعار کا
عزمِ حسینؑ، عزم تھا پروردگار کا

معجزے اور انسانی کارنامہ کا فرق انسان کو فرشتوں پر فضیلت اس لئے حاصل ہے کہ اس میں قوتِ ارادی موجود ہے اور نیک یا بد۔ خیر یا شر کرنے پر قادر ہے۔ برخلاف اس کے خالقِ اکبر نے فرشتوں کو جو فطرت عطا کی ہے اس میں شر اور بدی کا مادّہ نہیں ہے۔ حسینؑ خدا کے اُن خاص بندوں میں ہیں جن کو فرشتوں پر فوقیت حاصل ہے مگر یہ سمجھنا کہ دسویں محرم کو امام حسینؑ نے جو کچھ کیا وہ اس کے کرنے پر اسی طرح مجبور تھے جس طرح فرشتوں کے لئے جناب باری کی تسبیح و تہلیل کرنا لازمی ہے بڑی غلطی ہے۔ انسانی کارنامہ اور معجزہ میں یہ عظیم الشان فرق ہے کہ اول الذکر انسان کا اختیاری فعل ہوتا ہے جس کی ذمہ داری سراسر اس پر عائد ہوتی ہے چاہے کرے چاہے نہ کرے۔ بخلاف اس کے معجزہ قادرِ مطلق کے اس بعید از فہم اظہارِ قوت کا نام ہے جس کا مشاہدہ اہلِ عالم کو کسی خاص انسان کی وساطت سے کرایا جائے۔ اہلبیت نبوی کے اسی طرح کے کارنامے اور بھی ہیں جن کو معجزہ کہنا فی الحقیقت اُن کارناموں کی عظمت کو گھٹانا ہے۔ مثلاً حضرت علیؑ اور جناب فاطمہؑ نے تین دن متواتر اپنے حصّہ کا کھانا سائل کو عطا کیا اور محض پانی پی کر روزہ پر روزہ رکھا۔ معجزہ ہونے کی صورت میں اس معاملہ کے اندر خدائے بزرگ و برتر کی قدرت کا جلوہ نظر آتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس معاملہ کو جیسا کہ وہ حقیقتاً تھا انسانی کارنامہ سمجھئے۔ دن بھر کی بھوک کے بعد انسان کی جو حالت ہوتی ہے اس کا اندازہ کیجئے اور پھر محض پانی پی کر دوسرا روزہ رکھنے سے جس قدر ناتوانی ہو سکتی ہے اس کو پیشِ نظر رکھئے۔ دوسرے دن شام کو روزہ کھولنے کے بعد جناب سیّدہ اور حضرت علی مرتضٰے کی جو حالت ہوئی ہوگی اُس کا قیاس اپنے نفس پر کیجئے اور سوچئے کہ پھر تیسرے دن مغرب کے وقت سائل کو اپنا کھانا دے دینا کیسا دشوار کام ہے۔ امام حسینؑ کے لاجواب ایثار اور بے نظیر اظہارِ جرأت کا درجہ

معجزے سے کہیں بالاتر ہے۔ حضرت خیر البشر کے نواسہ نے یہ مثال دنیا کے سامنے اس لئے قائم کی تھی کہ جب آئندہ حق و باطل۔ خیر و شر کا مقابلہ ہو تو مسلمان اس راستہ پر چلیں جو امام حسینؑ نے اختیار کیا تھا۔ معجزہ کہہ کر معرکۂ کربلا کی اہمیت کو گھٹانا اور صداقت اور حق کا جو راستہ سید الشہداء نے بتایا ہے اُس پر نہ چلنے کے بہانے ڈھونڈنا ایسا الزام اپنے ذمّہ عائد کرنا ہے جو آنسوؤں سے ہرگز نہیں دُھل سکتا۔ اگر مجالس محرم کا مآل رقت کی بجائے واقعات کربلا اور ائمہ ہُدیٰ کی زندگی کے حالات سے سبق آموزی قرار دیا جائے تو اس ضروری اصلاح کے فوائد چند ہی سال میں قوم کو محسوس ہونے لگیں گے۔ بڑی دشواری یہ ہے کہ مجلس کا مآل رقت سمجھا جاتا ہے۔ شہدائے کربلا کے سوانح حیات سے بہت کم مسلمان واقف ہیں۔ خود سید الشہداء کے اُن حالات کا ذکر مجلسوں میں کیا جاتا ہے جب سن مبارک سات آٹھ سال سے زیادہ نہ تھا اُس کے بعد سنہ ساٹھ ہجری کے آخر میں مدینہ سے روانگی کا ذکر کر کے کربلا کے حالات پر بیان کو ختم کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ مقدس زندگی ایسے حالات سے بھری پڑی ہے جن سے واقف و آگاہ ہونا مسلمانوں کی دینی و دنیوی سود و بہبود کا باعث ہے۔

ذاکری کی اُجرت ہم خرما و ہم ثواب گریہ و بُکا کا ایک اور تاریک پہلو یہ ہے کہ رونے کے لئے رُلانے والوں کی ضرورت ہے۔ بانیان مجلس ہر سال محرم و چہلم میں ذاکروں کو لکھنؤ اور دیگر مقامات سے بُلاتے اور مجالس پڑھنے کا معقول معاوضہ اُن کو دیتے ہیں عرصہ سے ہم خرما و ہم ثواب کی مثل ذاکروں پر صادق آتی ہے اور بعض حضرات کا مستقل پیشہ ذاکری ہے۔ بیس[2] برس ہوئے مدرسۃ الواعظین کی انتظامیہ کمیٹی نے میری موجودگی میں یہ طے کیا تھا کہ ذاکر مجلس پڑھنے کی اُجرت نہ لیں۔ تحریک تو منظور ہو گئی مگر اس پر عملدرآمد نہیں ہوا۔ اب حالت بد سے بدتر ہو گئی ہے۔ ذاکر بانیان مجلس سے معاملہ اسی طرح چکاتے ہیں جس طرح گھوڑے یا موٹر کا سودا بائع اور مشتری کے درمیان ہوتا ہے بعض قصبوں میں

اب بھی رواج ہے کہ باہر کے ذاکر نہیں بُلائے جاتے خود قصبہ کے حضرات مرثیہ خوانی کرتے اور حدیث پڑھتے ہیں۔ یہ طریقہ بڑا اچھا ہے۔ گریہ و بُکا کو اگر داخل ثواب بھی سمجھا جائے تو بھی خلوص شرط ہے۔ باہر کے ذاکر رُلانے کی اور حاضرین مجلس رونے کی تیاری خاص طور پر کرتے ہیں جو نہایت قابل اعتراض ہے۔ رونے کی تیاری کرنا اور رونا آئے یا نہ آئے لیکن آنسو بہانا یا آنسو بہانے کی کوشش کرنا ایسے ریائی اور خلوص سے بہت بعید ہے بقول غالب ؎

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے ✦ نالہ پابندِ نَے نہیں ہے

یہ سچ ہے کہ جو لوگ باہر کے ذاکروں کو کثیر معاوضہ دے کر بُلاتے ہیں وہ اپنے نزدیک اپنا روپیہ نیک کام میں صرف کرتے ہیں۔ بڑی ضرورت ہے کہ اس معاملہ کی طرف علماء اور مجتہدین توجہ فرمائیں اور لوگوں کو فہمائش کریں کہ مجلسیں پڑھنے کے لئے اجیر ذاکروں کو نہ بُلایا جائے بلکہ جس قصبہ یا شہر میں مجلس ہو وہاں کے مقامی حضرات اس خدمت کو انجام دیں۔ اس طریقہ سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ مقامی حضرات کے مجلس پڑھنے سے اُن کے ادبی مذاق کی صحیح تربیت ہو سکے گی اور ذوقِ سخن اور علمی معلومات کے خزانچی باہر والے نہ رہیں گے بلکہ مقامی حضرات کو بھی مذہب اور علم اور ادب کی طرف توجہ دلانے اور ہم وطنوں میں ذوق سلیم پیدا کرنے کے موقعے ملیں گے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ رسومِ محرم کی اصلاح ہوگی اور ضرور ہوگی اور بقول شہنشاہ عالمگیر برادران نامہربان کے تشدد اور خشونت سے نہیں بلکہ برادران مہربان کے (جن کی تعداد برادران نامہربان سے پچاس گنی ہے) سچے تعاون اور شہید کربلا کے احسان مند پیروؤں کی پُرخلوص اصلاحی جد و جہد سے ہوگی۔

گیارھواں باب

ہوس محبّت اور عشق۔ ایران کی امرد پرستی۔ ہمارے ملک کی اُلٹی گنگا۔ اُردو اور غیر فطری شاعری کی میراث۔ اُردو میں آپ بیتی۔ کچھ اپنے متعلق۔ لیڈی رضا علی مرحومہ۔ محبّت کا طوفان اور عداوت کے شعلے۔ عام مُشاعروں کی حالت شملہ کا یادگار پرائیویٹ ادبی جلسہ۔ حُسن و محبّت کی آنکھ جیتی جاگتی تصویریں

میں حسرت و حیرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے آ، کچھ بھی نہیں، پایاب ہیں ہم (شاد عظیم آبادی)

ہوس، محبّت اور عشق اس باب کو گلستاں کا باب پنجم سمجھنا چاہیئے۔ میں عرصہ تک سوچتا رہا کہ دل کے معاملہ کا اعمال نامہ میں ذکر کروں یا نہ کروں۔ خلاق عالم نے جو نعمتیں انسان کو عطا فرمائی ہیں اُن میں محبت کا درجہ اونچا اور بہت اونچا ہے۔ وہ انسان تو مشکل سے ملے گا جس کا دل محبت سے خالی ہو۔ ماں باپ کو اولاد کے ساتھ جو محبّت ہوتی ہے اس میں حضرت رب العٰلمین کی وہ شان جلوہ گر ہے جسے اندھا بھی دیکھ سکتا ہے۔ اس کے بعد وہ محبت ہے جو بہن بھائی کو ایک دوسرے سے یا بھائی کو بھائی سے یا بہن کو بہن سے ہوتی ہے۔ اس قسم کی محبت نے جو اثر میری زندگی پر ڈالا اُس کا تذکرہ کر چکا ہوں۔ اس وقت اس محبّت کا بیان منظور ہے جو ایسے مرد اور ایسی عورت کے درمیان ہو جن کے باہم میاں بی بی یا عاشق و معشوق کے تعلقات قائم ہونے کو سوسائٹی روا رکھتی ہے یا کم از کم ایسے تعلقات پر سختی سے معترض نہیں ہے۔ بڑی خرابی یہ ہے کہ محبت ایسا پاک اور انسان کی زندگی پر ایسا گہرا اثر ڈالنے والا جذبہ ہے کہ اس کے سمجھنے میں بسا اوقات غلطی واقع ہوتی ہے۔ یہ جذبہ اگر نیچے پھسلے تو اس کا نام حیا سوز ہوس ہے جس سے ہر بھلے آدمی کو بچنا چاہیئے۔ اگر اس جذبہ کی پیدا کرنے والی وہ بے غرضانہ اور پُرخلوص کشش ہو جو طالب کو مطلوب اور مطلوب کو طالب بنا کر ایک دوسرے کے دل میں جگہ دیتی ہے

اور جس کشش کی فولادی زنجیر سوسائٹی کے بعض رسمی ڈھکوسلوں کے سوتی بندوں سے کہیں زیادہ مضبوط ہے تو اس جذبہ کا نام محبّت ہے جس کے سرور کے آگے اچھی سے اچھی شراب کا نشہ بے حقیقت ہے۔ جلام محبّت کی روح پرور اور جاں بخش حقیقت کس طرح سمجھاؤں اور سوائے اس کے کیا کہوں کہ۔ مصرعہ ذوق ایں بادہ نہ دانی بخدا تا نہ چشی۔ ترجمہ۔ بغیر پیئے آپ اس کیف سے واقف ہو ہی نہیں سکتے۔ اگر محبت اپنی ارتقائی منزلیں طے کر کے، دو دلوں کو ایک یا دو قالبوں کو ایک جان کر دے تو وہ عشق کا مرتبہ ہے اس مرتبہ کے بھی دو درجے ہیں۔ عشق مجازی اور عشق حقیقی۔ عشق مجازی کا دوسرا نام غم ہے۔ اہل غم کی تعریف جناب شاد عظیم آبادی نے اس شعر میں فرمائی ہے ؎

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں، نایاب ہیں ہم ؛ تعبیر ہے جسکی حسرت و غم، اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

عشق حقیقی کی دولت اولیاء اللہ کو ملی جن کا ظہور میری ناچیز رائے میں ہر ملک اور ہر ملت میں ہوا اور ہوتا ہے۔ محبت اور عشق مجازی کی صورت بدقسمتی سے ایرانی اور بسا اوقات ہماری اُردو شاعری نے ایسی خوفناک اور بھیانک بنا رکھی ہے کہ بھلے آدمی اسکے قریب جاتے ہوئے ڈرتے یا جھجکتے ہیں۔

ایران کی امرد پرستی اردو زبان نے اپنا سرمایہ فارسی سے حاصل کیا ہے یا ہندی سے۔ فارسی کی شاعری کا بڑا نقص یہ ہے کہ قدیم روایات کے باعث جس کی چھان بین کا یہ موقع نہیں ہے مرد کا عاشق مرد ہوتا ہے جو صریحاً قانون قدرت کے خلاف ہے۔ کاغذ کے پھول میں ہزار خوبیاں ہوں مگر قدرتی خوبی میں وہ گیندے کے پھول (گل صد برگ) کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ایرانی شاعری نے جو درجۂ کمال حاصل کیا غالباً اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ جذبات کے غیر فطری ہونے کے باعث شاعروں کی تمام تر توجہ اس پر رہی کہ کلام کے زور، بندشوں کی چستی، مضمون آفرینی، نادر تشبیہوں اور دل آویز استعاروں سے الفاظ میں وہ اثر پیدا کریں جو اس حقیقت پر پردہ ڈال سکے کہ مرد کا عاشق مرد ہے۔ بالفاظ دیگر محبوب کی عمر کا وہ زمانہ منتخب کیا گیا جب امرد ہونے کے باعث اس کی صورت شکل عورت سے ملتی جلتی ہے البعض من چلوں نے محبوب کے خط کو بھی سراہا مگر یہ جدت عوام کو پسند نہ آئی اور بالآخر ٹھہر کر رہ گئی یا یوں سمجھئے کہ خط کی جدت کو شیشے یا چینی کا وہ

ظرف سمجھا گیا جس میں بال آجائے اور کسی نے اُسے قابل التفات نہ سمجھا۔

ہندی کی الٹی گنگا اردو نے بقیہ سرمایہ ہندی سے لیا۔ ہندی کی یہ حالت ہے کہ وہاں اُلٹی گنگا بہتی ہے یعنی عورت عاشق ہے اور مرد معشوق محبت و عشق کی یہ ترتیب بھی قانون قدرت کے خلاف ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ پریم کی لوری کا اثر عورت کے دل میں وہ مسرت اور اُس کی آنکھوں میں وہ سکون اور اطمینان کا وہ نشہ پیدا نہیں کرتا جو مرد کو حاصل ہوتا ہے مگر نظر غور سے دیکھیئے تو شرم و حیا ہر ملک میں اور خاص طور سے ہمارے ملک میں عورت کا قدرتی زیور ہے ہندوستانی عورت بلالحاظ اس کے کہ امیر ہو یا غریب جذباتِ محبت کو ہرگز دل سے زبان تک نہیں آنے دیتی۔ وہ خاوند کے لئے جان دے دیگی مگر زبان سے کبھی یہ نہ کہے گی کہ "پیارے رام پرشاد میں تم پہ مرتی ہوں"۔ ہمارے تمام وہ گیت جو گانے والوں یا گانے والیوں کی زبان پر ہیں یا جو بڑے اہتمام سے ریڈیو سے سُنائے جاتے ہیں ایرانی امردپرستی کی طرح ہمارے جذبات کو خوبی اور خوش اسلوبی سے ظاہر اور واضح نہیں کرتے بلکہ اس کی بجائے حقیقت پر پردہ ڈالتے ہیں۔ ہندی کا ایک گیت ملاحظہ ہو:-

برہن کا گیت اُڑ جا دیس بدیس رے طوطے اُڑ جا دیس بدیس ؛ میں جاؤں تجھ پہ بلہاری۔ برہ کی میرے لگی کٹاری روٹھ گئے موسے گردھاری۔ چلے گئے پردیس رے طوطے اُڑ جا دیس بدیس ؛ تارے گن گن رات بتاؤں دن میں پل بھر چین نہ پاؤں آنسو پیتی رہوں غم کھاؤں۔ لے جا یہ سندیس رے طوطے اُڑ جا دیس بدیس ؛ ملجائیں تو ان سے کہنا۔ دوبھر ہو گیا تم بن رہنا تج دیا سارا گہنا دہنا جوگن کا ہے بھیس رے طوطے اُڑ جا دیس بدیس (اندرجیت شرما) بھلا کوئی غیرت دار اور شریف طبع ہندو عورت ہے جو پیا کی یاد میں اس طرح آپے سے باہر ہو کر مست ہتھنی کی طرح چنگھاڑے۔

اُردو اور غیر فطری شاعری کی میراث نتیجہ یہ ہے کہ باپ اور ماں دونوں طرف سے غریب اُردو کو غیر فطری شاعری کی میراث ملی۔ ہر ملک میں عشق و محبت کے درخت کو ملکی رسم و رواج وہ گرمی پہنچاتے ہیں جو قدرتی درختوں کو سورج سے پہنچتی ہے اور شاعری اس درخت کی آبیاری کرتی ہے۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے رسم و رواج اور اندازِ شاعری نے محبت کو ایسا صنم بنا دیا ہے جس کے پوجاری عالم خیال میں صرف شاعر ہو سکتے ہیں۔ محبت کا وجود ہمارے یہاں محض شاعری میں ہے

اگر کوئی شخص عملی زندگی میں محبت کا جام پینا چاہے تو رسم و رواج اُسے ہوا و ہوس کا بندہ قرار دیتے ہیں۔ اگر کسی سے محبت ہی تو شعر کہنا شروع کر دیجئے اور اس پردہ میں جو مزاج چاہے کہیئے کوئی روک ٹوک نہیں ہے میر تقی فرماتے ہیں ؎

دیوانگی میں مجنوں میرے حضور کیا تھا ÷ لڑکا سا اُن دنوں تھا اس کو شعور کیا تھا

میر صاحب بڑے اعلیٰ خصائل کے انسان تھے اپنی نسبت انہوں نے ایک شعر میں بالکل بجا فرمایا ہے

؎ صورت پرست ہوتے نہیں معنی آشنا ÷ ہے عشق سے بتوں کے مرا مدعا کچھ اور

میر صاحب فی الحقیقت معنی آشنا تھے اور جو دعویٰ انہوں نے کیا ہے وہ ان کو زیب دیتا تھا۔ مجھے تو یہ شکایت ہی کہ ہمارے رسم و رواج نے ہر نو آموز اور نو مشق شاعر کو یہ حق دیا ہے کہ مجنوں کے کان کاٹے اور اپنے اصلی یا فرضی ولولہ محبت کی داستان سے سمندر پاٹنے اور کوہ پر دریا بہانے کا دعویٰ کرے لیکن کوئی درد آشنا دل اپنی داستان غم صراحتاً یا کنایتاً نثر میں بیان کر کے اپنے دل کو تسلی دینا چاہے تو اُسے ہوس پرستی کے الزام کی جواب دہی کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

اُردو میں آپ بیتی اُردو میں آپ بیتی لکھنے کا رواج نہیں ہے جو انگریزی داں حضرات سیاسی چسکے کے باعث اپنے حالات لکھتے ہیں وہ انگریزی میں خامہ فرسائی کرتے ہیں اور جن نامور انگریزوں نے اپنے حالات خود اپنے قلم سے لکھے ہیں اُن کتابوں کو اپنے لئے بہترین نمونہ سمجھتے ہیں۔ پہلے میرا بھی قصد تھا کہ یہ کتاب انگریزی زبان میں لکھوں اور اگر میرا مقصد صرف سیاسی دریا میں غوطہ لگانا ہوتا تو غالباً اپنے خیالات انگریزی ہی میں قلم بند کرتا مگر غور و خوض کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ مُلکی زندگی کا دائرہ سیاست کے حلقہ سے کہیں زیادہ وسیع ہے، جزو ہمیشہ کُل میں داخل اور شامل ہوتا ہے لہذا مناسب یہ ہی کہ اپنے زمانہ کی ملکی زندگی کی تصویر اپنے اہل ملک کی خدمت میں پیش کر دوں سیاسی مسائل کے نقش و نگار آپ ہی اُس میں آجائیں گے، اُردو کو میں نے انگریزی پر اس لئے ترجیح دی ہے کہ ہر قوم کی تہذیب شائستگی اور اُس قوم کی زبان کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے جس طرح دریائے ڈینیوب اور خلیج بسکے (Biscay) کے درمیان جو ممالک واقع ہیں اُن کی

تہذیب شائستگی ملتی جلتی ہے اسی طرح ان ممالک کی تہذیب شائستگی کو بھی جن کی شرقی حد دریائے
اراودی اور غربی حد بحیرۂ روم ہے ایک ہی لڑی کے موتی سمجھنا چاہیئے۔ ملکی رسم و رواج۔ معاشرتی
حالات۔ ادبی نکات۔ مذہبی مسائل حُسن و عشق کی کشمکشوں۔ نامرادوں کی تمناؤں۔ بے پڑھے
لکھوں کی بے زبان آرزوؤں مفلسوں اور ناداروں کے خاموش آنسوؤں کا بیان اُردو میں ہی ہو سکتا
ہے جو ملک کی سب سے بڑی۔ سب سے جامع اور سب سے زیادہ زوردار زبان ہے۔ انگریزی میں ان سب باتوں
کا لکھنا ایسا ہی اٹل بے جوڑ اور بے سود ہوتا جیسی انڈین نیشنل کانگریس کی یہ توقع کہ پریسیڈینٹ روزولٹ
ہندوستان کو آزادی دلائیں گے یا جناب مسولینی عربوں کی یا اسلام کی حمایت اور معاونت کریں گے۔
میں نے یہ کتاب اُردو میں لکھی ہے تاکہ میرے ملکی بھائیوں کو معلوم ہو جائے کہ انیسویں صدی عیسوی کے آخر اور
بیسویں صدی کے پہلے نصف حصّہ میں ان کے ایک ہم وطن کی نظر میں ملکی زندگی کا کیا حال تھا۔

کچھ اپنے متعلق کسی ایسے شخص کے لئے جس کا کم و بیش چالیس برس تک ملک کی سیاسی زندگی
سے تعلق رہا ہو اپنی داستان محبت بیان کرنا اور اُس کو کتاب کی صورت میں اپنی زندگی میں شائع کرنا بڑا
دشوار کام ہے۔ مُلّا عبدالقادر بدایونی کی جُرأت کی داد دینی چاہیئے کہ ان کے تقدس نے اُس آفت جان
کے حالات قلمبند کرنے سے باز نہ رکھا جس سے اُنہوں نے دل لگایا تھا مگر اس زمانہ میں چھاپے کا فن
ایجاد نہیں ہوا تھا اور مُلّائے موصوف کو اطمینان تھا کہ اُن کی کتاب ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں نہ پہنچے گی۔
اب حالت یہ ہے کہ بات مُنہ سے نکلی اور پرائی ہوئی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ کسی کو الزام دینے کا مجھے حق نہیں ہے
میں تو خود یہ کتاب اس لئے لکھ رہا ہوں کہ لوگ اسے پڑھیں اور میری بابت جو رائے چاہیں قائم کریں۔
تفصیلی واقعات بیان کرنے کا نہ یہ وقت ہے نہ موقع۔ ہاں ایسے واقعات کے اجمالی ذکر سے شاید ناظرین
کو دلچسپی ہو جن کا دیرپا اثر میری زندگی پر ہوا۔ کہتے ڈرتا اس لئے ہوں کہ بقول غالب سے

ارباب الہوس نے حُسن پرستی شعار کی ٭ اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

میں ایشیائی محبت یعنی معشوق کی بے تکی جفا اور عاشق کی مجنونانہ وفا کا قائل نہیں ہوں نہ میرے نزدیک
اس وفا اور جفا کا وجود ایرانی شاعروں کے تخیل کے سوا دنیا میں کہیں تھا نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔
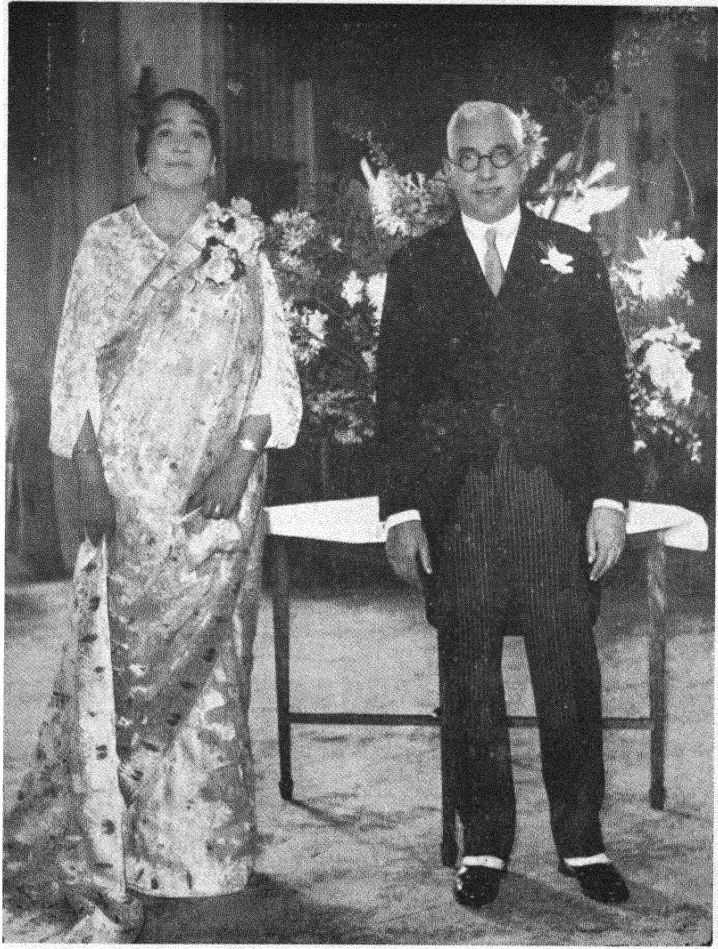
(دهنی طرف) سر سید رضا علی　　　　(بائیں طرف) لیڈی رضا علی
یہہ فوٹو جنوری ۱۹۳۶ء میں بہ مقام جہانسبرگ (جنوبی افریقہ) شادی کے تھوڑی دیر بعد لیا گیا -

بچا قیس اور بھائی فرہاد کے نام لیوا اگر اس زمانہ میں کچھ ہوں تو اُن کے لئے جگہ جگہ پاگل خانے موجود ہیں میرا طریقہ بقول حضرت داغ ہمیشہ یہ رہا ہے ؎

اے داغ اپنی وضع ہمیشہ یہی رہی ✤ کوئی کھچا کھچے کوئی ہم سے ملا ملے

غلط فہمی رفع کرنے کے لئے اتنا اور کہہ دوں کہ میں کبھی بگلا بھگت نہیں بنا بلکہ مجھے تو اس میں مزہ آتا ہے ؎

زہے رندی کہ پامالش کند صد پارسائی را ✤ زہے تقویٰ کہ با ایں جبہ و دستار می رقصم

ترجمہ:- میری رندی نے پارسائی کا دامن چاک کر ڈالا میری پرہیزگاری کو دیکھئے کہ عمامہ بر سر اور قبا در بر کرکے بھری محفل میں ناچتا ہوں میں ملک ہند کے سارے صوبوں سے واقف ہوں، برہما کا سفر رنگون سے لیکر بھامو تک کر چکا ہوں۔ یورپ کے دو سفر کئے اور دو مرتبہ جنوبی افریقہ گیا۔ مجھے یورپ کے تقریباً سارے ملکوں سے واقفیت ہے، سال بھر کے قریب یورپ کے مختلف ملکوں میں رہنے کا موقع ملا اور میں نے آنکھیں کھول کر سب چیزیں دیکھیں اور کان لگا کر سب باتیں سنیں۔

لیڈی رضا علی مرحومہ

شعر: شکوہ کروں ترا کہ شکریہ ائے بے التفات دوست ✤ جو نہ کہیں بھی جھک سکا تو نے وہ سر جھکا دیا

اس کتاب میں دل کا سب سے بڑا معاملہ درج ہے۔ جنوبی افریقہ دوسری مرتبہ میں ۱۹۳۵ء کے شروع میں گیا تھا تین سال وہاں رہا۔ وہاں پہنچے دو مہینے گذرے تھے کہ مس پونو ویلو سامی کا (بعد کو لیڈی رضا علی ہوئیں) کمبرلی میں مہمان ہوا اور میں نے شادی کا تہیہ کر لیا۔ لیڈی صاحبہ کے حالات لکھنے کے لئے ایک مستقل کتاب چاہیئے۔ اُن کو مجھ سے اور مجھ کو اُن سے محبت نہیں بلکہ عشق تھا، وہ آج دنیا میں نہیں ہیں مگر بہ مصداق مصرعہ ”شور بلبل کم نہ گردد گرد گل از چمن“۔ جو پھول شادی سے قبل وہ مجھے روزانہ کمبرلی سے ڈربن ہوائی ڈاک سے بھیجا کرتی تھیں اُن کی سوکھی پتیوں سے (جو اب تک میرے پاس محفوظ ہیں اور جب تک زندہ ہوں محفوظ رہیں گی) عالم خیال میں تقریباً ہر روز ایک نیا چمن آراستہ کرتا ہوں اور پونو کی یاد کے سایہ میں بیٹھ کر گھنٹہ دو گھنٹے محبت کا مالا جپتا ہوں۔ وہ میرے لئے اجرام فلکی کا آفتاب تھیں جس پر میری نظر اس لئے پڑی تھی تاکہ جنوبی افریقہ کے زمانہ قیام میں میری نظر چھوٹے چھوٹے چمکتے دمکتے تاروں پر

نہ پڑے، میں کبرلی کو اپنی دنیائے عشق کا کعبہ سمجھتا ہوں جس نے مجھے عمل سفلی یعنی ناپائدار محبت کی زنجیر سے رہائی دلا کر اسم اعظم سکھایا مئی ۱۹۳۵ء میں کبرلی پہنچ کر میری حالت بقول مرزا رسوا لکھنوی یہ ہوئی کہ۔

شعر کعبہ میں جا کے بھول گیا راہ دیر کی ؛ ایمان بچ گیا مرے مولا نے خیر کی

لیڈی صاحبہ کے انتقال کے بعد اب اپنا حال یہ ہے کہ ؎

میں بلبل نالاں ہوں اِک اُجڑے گلستاں کا ؛ تاثیر کا سائل ہوں محتاج کو داتا دے[۱]

محبت کا طوفان اور عداوت کے شعلے

محبت اور عداوت کا جذبہ ایسے ایسے رنگ اختیار کر سکتا اور ایسے ایسے نتائج ظہور میں لا سکتا ہے جو بظاہر کسی صاحبِ عقل انسان کا کام معلوم نہیں ہوتے۔ دنیا میں محبت نے جو گل وقتاً فوقتاً کھلائے ہیں اس کا حال تاریخ کی مستند کتابوں میں درج ہے۔ یہاں جذبۂ نفرت و عداوت کے دو واقعات کا ذکر غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ۱۸-۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں عربوں نے جس طرح خفیہ سازش میں شرکت کر کے ترکوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اس پر بیرونی ممالک کے تمام مسلمان عربوں کو قابل نفرین و ملامت سمجھتے ہیں لیکن یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ اس تصویر کے دو رُخ ہیں۔ ایک رُخ مذہبی ہے اور دوسرا سیاسی۔ مذہب اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان بلا امتیاز رنگ و نسل و ملک کے برابر ہیں اور اُن کے حقوق یکساں ہیں۔ عربوں کو جتنا چاہیئے الزام دیجئے مگر یہ نہ بھولیئے کہ اس مقدس اسلامی تعلیم کو تُرک بہت پہلے پس پشت ڈال چکے تھے اور ملک عرب کے جن حصّوں پر ترکوں کا تسلط تھا اُس میں حکومت نے عربوں اور ترکوں کے درمیان کم و بیش وہی امتیاز قائم کر رکھا تھا جو سلطنت برطانیہ نے ہندوستان میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان قائم کر رکھا تھا اور جو اس وقت تک ملک میں بڑی حد تک موجود ہے۔ جنگ عظیم کے زمانہ میں ملک شام میں ایک بڑا حاکم تھا جو نسلاً آدھا عرب تھا اور آدھا ترک۔ یہ افسر باوجود کارگزار اور مستعد اور قابل ہونے کے نسلی عصبیت کا شکار رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترقی کے وہ موقع اس کو نہیں دئے گئے جس کا

---

[۱] اقبال نے کلام میں اثر ہونے کی دعا مانگی ہے۔ میں بھی دست بدعا ہوں کہ خدا میرے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں اثر دے۔

بہ لحاظ اپنی قابلیت کے وہ مستحق تھا۔ ترکی حکومت کی زیادتی اور ناانصافی تیر کی طرح اس کے دل میں کھٹکتی رہی۔ امن وامان کے زمانہ میں تو خاموش رہا مگر شریف حسین کی بغاوت کے بعد انگریزوں سے مل گیا اور اُس کی غداری ترکوں کے لئے بہت مضر ثابت ہوئی۔ دوسری مثال اس سے بھی زیادہ سبق آموز ہے اُسی زمانہ میں ایشیائے کوچک کا ایک عامل (گورنر) ترک تھا جس کی منگنی ایک ترکی خاتون سے ہوئی تھی۔ شادی ہونے سے پہلے عربوں کی بغاوت کی آگ جگہ جگہ ملک میں بھڑک اُٹھی ترک عامل بڑا محب وطن تھا اور اُس نے مقدور بھر بغاوت کی چنگاریوں کو دبانے اور ترکی گورنمنٹ کی مدد کرنے کی کوشش کی۔ انسان کی زندگی میں اتفاقات اکثر پیش آتے ہیں بعض رنج کے حالات ایسے رونما ہوئے کہ ترکی عامل کو اپنی منگیتر کو یہ بتانا پڑا کہ یہ بیل منڈھے نہ چڑھے گی یعنی وہ شادی نہ کر سکے گا۔ وہ خدا کی بندی یہ جواب سنکر آگ بگولا ہو گئی۔ جہاں عورت کی محبت اُس بادل کی طرح برستی ہے جو چند گھنٹوں میں جل تھل بھر دے وہاں اُس کی عداوت کا جذبہ بھی بجلی کی خاصیت رکھتا ہے اور جو چیز سامنے آجائے اُسے آن کی آن میں جلا کر خاک سیاہ کر ڈالتا ہے۔ ترک عورت نے اپنے طوطا چشم چاہنے والے سے جو بدلہ لیا وہ انتقام کی حد سے کہیں آگے نکل گیا۔ جو فوجیں لام پر ہوتی ہیں اُن کا محکمہ جاسوسی ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتا ہے۔ انگریزی فوج کے محکمہ جاسوسی نے اس موقع سے پورا فائدہ اُٹھایا جاسوس اُس ترک خاتون کے پاس گئے اور اس نفرت کی پتلی نے جس کی آمد و رفت اس وقت تک سادہ لوح ترکی عامل کے یہاں تھی نہایت خفیہ کاغذات اور نقشے بدنصیب چاہنے والے کے آہنی بکس ہیں سے نکال کر جاسوسوں کے حوالہ کر دئے اور جاسوسوں نے وہ تمام دستاویزیں فوٹوگراف لینے کے بعد خاتون کو واپس کر دیں۔ جنگ عظیم کی مشہور جاسوسہ ماتاہری کے کارنامے اب تک لوگوں کی زبان پر ہیں مگر اس ننگ قوم ترکی خاتون کی کارستانی پر گمنامی کا وہ پردہ پڑا ہوا ہے جس کی وہ مستحق تھی۔ ترکی خاتون کی غداری کا سبب یہ تھا کہ گو آج سے تیس برس پہلے ترکوں میں قومیت کا احساس انور پاشا مرحوم اور انجمن اتحاد و ترقی کے سرگرم ممبروں کی جدو جہد کے باعث پیدا ہو گیا تھا مگر اُس وقت تک اس قومی احساس کی زنجیر بہت کمزور تھی۔ خدا غازی مصطفےٰ کمال اتاترک کی

روح کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے جس نے ترکوں کو قومی نکبت اور ابتذال کے گڑھے سے نکال کر کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ ترکوں نے اپنے جذبہ حب وطن کا جو ثبوت موجودہ لڑائی میں دیا ہے وہ تمام ایشیا کے لئے (خواہ ترک اپنے کو ایشیائی سمجھیں یا نہ سمجھیں) باعثِ فخر ہے۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ ترکی خاتون کی منافرت کے جذبہ نے ترکوں کے ہرے بھرے باغ کو جو آگ لگائی اس کے آخری منظر پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔ انگریزی محکمۂ جاسوسی اس خدمت کے صلہ میں ایک بڑی بھاری رقم اس غدّارہ کو دینا چاہتا تھا جس کے منظور کرنے سے اُس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جس نے میرا دل جلایا تھا اُس سے بدلہ لے کر میں نے اپنا دل ٹھنڈا کر لیا سو نے چاندی کی مجھے پروا نہیں ہے۔ اس قصہ کے سیاسی پہلو کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو کسی اُردو شاعر نے جو کہا تھا وہ اس انتقام کی دیوی نے پورا کر دکھایا۔ ؎

چین تجھ کو نہ ملے میرے ستانے والے ؛ تو بھی ٹھنڈا نہ رہے دل کے جلانے والے

شملہ کی ادبی محفلیں۔ عام مشاعروں کی حالت

داغِ دل دکھلا رہے ہیں اپنا رنگ + میرے سینہ کی صفائی دیکھئے (سید محمد لکھنوی)

پُرانا مقولہ ہے کہ پہاڑ کی چڑھائی اور اُترائی دونوں پر لعنت۔ ممکن ہے ریل کی ایجاد کے پہلے یہ کہاوت کسی حد تک سچ ہو مگر اب تو یہ حالت ہے کہ شملہ اور اوٹک منڈ تک دھوئیں کی گاڑی (ریل) اُڑی چلی جاتی ہے۔ بقیہ پہاڑی شہروں کی اگر آپ سیر کرنا چاہیں تو ریل کے اسٹیشن سے بس یا کرایہ کی موٹر میں بیٹھ کر چند گھنٹے میں جہاں آپ جانا چاہیں پہنچ سکتے ہیں۔ میں پہلی مرتبہ شملہ ۱۹۱۳ء میں گیا تھا۔ ۱۹۲۱ء سے کونسل آف اسٹیٹ۔ پبلک سروس کمیشن اور اسمبلی کی ممبری کے باعث ہر سال گرمی کے موسم میں کئی مہینے تک شملہ میں رہتا ہوں۔ خدا آباد رکھے بڑی پُر لطف بستی ہے ہر مذاق کے آدمی موجود ہیں شعر و سخن کا چرچا ہے سخن فہم حضرات کثرت سے موجود ہیں سخن گویوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ شملہ کے مشاعرے مشہور ہیں ان کی بنا شیخ عبدالقادر نے ڈالی۔ شیخ صاحب کے ذوق سخن و ادب سے سارا ملک واقف ہے۔ اردو اس لب و لہجہ سے بولتے ہیں کہ ناواقف آدمی سے بات چیت کریں تو اُسے گمان نہیں ہو سکتا کہ شیخ صاحب کا وطن دہلی نہیں ہے۔ میرے دوست مسٹر غلام محمد

بھی (اب حیدرآباد دکن میں فنانس منسٹر ہیں) عرصہ تک سرکاری ملازمت کے تعلق سے شملہ میں رہ چکے ہیں وہ بھی علم دوست ہیں اور لکھنؤ اور دلی کی زبان بولتے ہیں۔ اپنے شملہ کے قیام کے زمانہ میں مسٹر غلام محمد اور دیگر احباب کی امداد سے میں نے سر عبد القادر کی سنت کو جاری رکھا یعنی ہر سال شملہ میں محفل مشاعرہ منعقد کی۔ دہلی لکھنؤ۔ لاہور اور الہ آباد کے مشاعرے مشہور ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ شعر و سخن کی جو قدر وہ حضرات کرتے ہیں جو گورنمنٹ ہند کی سکریٹریٹ میں سرکاری عہدہ دار یا ملازم ہیں اس کی مثال میں نے کسی اور شہر میں نہیں پائی۔ ان حضرات کی تین خصوصیات ہیں ایک تو یہ کہ بالعموم انگریزی کپڑے اچھے پہنتے ہیں خال خال آپ کو ایسے لوگ بھی ملیں گے جو شلوار کے ساتھ قمیص پہنتے ہیں، کالر اور ٹائی قمیص کے گلے کا ہار ہوتے ہیں اور اوپر سے انگریزی چھوٹا کوٹ وہ سماں باندھتا ہے کہ اگر ٹامس کارلائل آج زندہ ہوتے اور لباس کے بارے میں اپنی مشہور کتاب انہوں نے موجودہ زمانہ میں لکھی ہوتی تو شملہ کے ان جدت پسند اشخاص کا بیان ایک مزید باب میں ضرور کرتے۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ میں ہندوستانی لباس پر معترض ہوں ہر قوم کا حق ہے کہ اپنے قومی لباس پہ فخر کرے میں خود بہت سے موقعوں پر ٹھیٹ ہندوستانی لباس پہنتا ہوں ہر ملک کے لباس کی وضع قطع میں اس ملک کے موسمی حالات کو بہت کچھ دخل ہے۔ البتہ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ جس ملک کا لباس پہنئے اُسی طرح پہنئے جس طرح اُس ملک کے رہنے والے پہنتے ہیں۔ شلوار کے ساتھ کالر ٹائی لگانا یا آڑے پاجامے کے اوپر فراک کوٹ پہننا اُسی قسم کی بدمذاقی ہے جس کا ارتکاب انگریزی داں نوجوان اُردو بولتے وقت انگریزی کے بالکل غیر ضروری الفاظ ٹھونس کر کرتے ہیں۔ ممکن ہے یہ پوشاکی بدعت سر سید احمد خاں مرحوم کے زمانہ میں اس وجہ سے رَوا رکھی گئی ہو کہ اس زمانہ میں انگریزی لباس کو عوام مغربی تہذیب و شائستگی کی ظاہری علامت سمجھتے تھے۔ مہاتما گاندھی کے پولیٹکل مسلک سے یہاں بحث نہیں ہے لیکن مہاتما جی کا ملک پہ یہ بڑا احسان ہے کہ انھوں نے ہم ہندوستانیوں کو عزت نفس کا سبق سکھایا اور بتایا کہ ہم ہندوستانیوں کے لیے باعث افتخار ہماری اپنی ہی تہذیب و شائستگی ہو سکتی ہے غیروں کے طریقے اختیار کرنے سے ہمارا وہی حشر ہوگا جو اُس نادان کوّے کا ہوا جو بڑی آب و تاب سے مور کے پر اپنے جسم پہ لگا کر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ وہ کوا نہیں

بلکہ مورہے۔ ہاں تو میں کہہ یہ رہا تھا کہ گورنمنٹ ہند کی سکریٹریٹ کے ملازم عموماً انگریزی لباس پہننے کا اچھا سلیقہ رکھتے اور عمدہ لباس پہنتے ہیں۔ دوسری صفت ان حضرات کی یہ ہے کہ اولاد کی تعلیم پر اپنی حیثیت سے زیادہ روپیہ خرچ کرتے ہیں اور مجھے بڑی مسرت ہے کہ مسلمان اہلکار بھی اپنی لڑکیوں کو پڑھنے کے لئے اسکول میں اُسی شوق سے بھیجتے ہیں جس طرح لڑکوں کو۔ تیسری خصوصیت وہ عزت اور قدر ہے جو یہ حضرات شاعروں اور ادیبوں کی کرتے ہیں۔ موجودہ زمانہ کی مادہ پرستی کا اثر دیکھئے اکثر آدمی یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ وہ کماتے ہیں وہ سب اُن کے اور اُن کی اولاد کے لئے ہے۔ کسی اُستاد کا شعر ہے۔ ؎

گر جاں طلبی مضائقہ نیست ٭ زر می طلبی سخن درین ست

ترجمہ:۔ اگر مجھ سے آپ جان مانگیں تو حاضر ہے لیکن دشواری تو یہ ہے کہ آپ مجھ سے روپیہ مانگتے ہیں خدا کا شکر ہے کہ شملہ کے حضرات اس شعر پر عامل نہیں ہیں شملہ کے عہدے دار اور اہلکار ملک کے مختلف صوبوں کے باشندے ہیں مگر بلالحاظ اس کے کہ وہ پنجاب کے رہنے والے ہیں یا یو۔پی کے۔ بہار اُنکا وطن ہے یا سرحدی صوبہ۔ حیدرآباد اُن کا مولد و مسکن ہے یا راجپوتانہ۔ اردو زبان کو ترقی دینے کا جوش اُن کے دلوں میں موجزن ہے۔ میں نے شملہ کے بہت سے مُشاعروں اور ادبی جلسوں کی صدارت عرصہ تک کی ہے میرا تجربہ یہ ہے کہ مشاعروں اور ادبی جلسوں کے انعقاد کے لئے حضرات شملہ اپنی حیثیت سے بڑھ چڑھ کر روپیہ دیتے ہیں اور چندہ دینے والے ہندو اور مسلمان دونوں ہوتے ہیں۔ دوسری قابل ذکر بات ان حضرات کا صحیح مذاق ہے ناممکن ہے کہ پھڑکتے ہوئے شعر کی داد نہ ملے نومشق شاعروں کی ہمت بندھاتے ہیں اور سائل۔ بیخود دہلوی صفی۔ ثاقب۔ جگر۔ حسرت موہانی۔ سیماب اکبرآبادی۔ حیدر دہلوی۔ جوش ملیانی اور حفیظ جالندھری جیسے اساتذہ فن یا اہل کمال کا نہایت ادب کرتے ہیں۔

شملہ کا یادگار پرائیویٹ ادبی جلسہ کچھ عرصہ ہوا شملہ میں زبردست مُشاعرہ ہوا تھا جس میں شرکت کے لئے بہت سے نامور شاعر باہر سے آئے تھے مشاعرہ کے ایک دو دن بعد میں نے اُن شاعروں کو جو اُس وقت تک شملہ میں موجود تھے معہ چند ادیبوں اور سخن فہم دوستوں کے کھانے پر مدعو کیا، کوئی پچیس[25] حضرات

موجود تھے۔ کھانا فرش پر اس ہوٹل کے جہاں میں مقیم تھا ایک بڑے کمرہ میں تھا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میری درخواست پر شاعروں نے اپنا اپنا جدید کلام پڑھ کر سنایا۔ بڑے مشاعروں کو کھوٹا کھرا کلام پرکھنے کی کسوٹی سمجھنا چاہیئے لیکن بڑے جلسوں میں جہاں مجمع زیادہ نہ ہو اور سخن فہم بھی موجود ہوں شاعروں کو عموماً وہی داد ملتی ہے جس کا مستحق اُن کا کلام ہو۔ بڑے مشاعروں میں عام طور پر دو نقص ہوتے ہیں، ایک تو بعض اوقات ہڑبونگ ایسی ہوتی ہے کہ شعر آخر صف کے بیٹھنے والوں کو سنائی نہیں دیتا۔ خیر یہ کمی تو لاؤڈ اسپیکر کے استعمال سے ایک حد تک رفع ہو سکتی ہے۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ خوش گلو شاعر اپنا کلام ترنّم کے ساتھ پڑھ کر سناتے ہیں جس کے باعث عوام کو شعر کے حُسن و قبح کے جانچنے کا موقع نہیں ملتا بلکہ اندازِ موسیقی اُن کی تمام تر توجہ اپنی طرف کھینچتا اور حاضرین کو مسحور کر لیتا ہے۔ زبان یا معاملہ کا شعر ہو تو ترنم اُس کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے اکثر اساتذۂ فن اس جدت کو بدعت سمجھتے ہیں اور سچ بات بھی یہی ہے کہ شعر کے حُسن و قبح کا صحیح اندازہ اُسی وقت ہو سکتا ہے جب شاعر اس کا اثر بڑھانے کے لئے بیرونی امداد کا طالب نہ ہو۔ شاعری و موسیقی دو جداگانہ فن ہیں موسیقی بھی بڑا اعلیٰ فن ہے لیکن غزل خوانی میں موسیقی کی امداد لینا ویسا ہی قابلِ اعتراض ہے جیسا حُسن کی نمائش[1] میں دو ایسی عورتوں کی شرکت جن میں سے ایک کا لباس بہت خوشنما اور خوش وضع ہو جسم پر زیور بھی خوبصورت اور قیمتی ہو پاؤں میں اونچی ایڑی کا پیرس کا بنا ہوا اسی روپے قیمت کا سنہری جوتہ ہو اور دوسری کے جسم میں دہلی کلا تھ مل کی دس روپے کی بھدی ساڑھی اور پاؤں میں لکڑی کی چپل ہو جس کا تسمہ نواڑ کا ہو۔ جس طرح حسینہ کی ظاہری ٹیپ ٹاپ یعنی لباس اور زیور کا دیکھنے والوں پر اثر پڑتا ہے اُسی طرح ترنم عوام کو اپنی طرف مائل رکھتا ہے۔ عام حالت یہ ہے کہ مشاعرہ

---

[1] مغربی ملکوں میں اب نیا طریقہ یہ رائج ہوا ہے کہ ہر سال حُسن کی نمائش ہوتی ہے جس میں خوبصورت عورتیں شریک ہوتی ہیں اور پنچ یہ طے کرتے ہیں کہ اس امتحان مقابلہ میں شرکت کرنے والیوں میں سب سے زیادہ حسین کون ہے اور دوسرا، تیسرا، چوتھا اور پانچواں نمبر کس کا ہے۔ پنچوں کی رائے میں جو خاتون سب سے زیادہ حسین قرار پاتی ہے اُسے سال بھر تک ملکۂ حُسن کے نام سے پکارتے ہیں۔

جس قدر بڑا ہو گا خوش گلو شاعر کو اُسی قدر داد زیادہ ملے گی۔ بج کے جلسہ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اول تو آواز سب حاضرین تک پہنچتی ہے اس کے علاوہ ترنم سے جو سماں بڑے مشاعروں میں بندھتا ہے وہ بج کے جلسوں میں اس لئے نہیں پیدا ہوتا کہ ایسے جلسوں میں سخن فہم اصحاب کی تعداد نسبتاً بہت زیادہ ہوتی ہے۔ غرض کہ اس رات کو شاعروں کے چیدہ کلام نے وہ اثر پیدا کیا جسے میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ غزل خوانی کے بعد بعض شاعروں نے اپنے قصیدوں اور مثنویوں کے چیدہ اشعار بھی پڑھکر سنائے جس سے لطف دوبالا ہو گیا۔ جب سارے شاعر اپنا کلام پڑھ چکے تو ایک صاحب جو خود بھی اچھے ادیب ہیں کہنے لگے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سارا بار شاعروں کے کندھوں پر ہی کیوں پڑے یہاں متعدد ادیب اور ہماری سوسائٹی کے آسمان کے بہت سے چمکتے ہوئے تارے بھی موجود ہیں، وہ اپنی داستانِ عشق و محبت کا کچھ حال بیان فرمائیں مگر شرط یہ ہے کہ جو شخص آپ بیتی بیان کرے اُس کی داستان اسی مجمع تک محدود رہے اور آج کے جلسہ کے باہر کہیں بیان نہ کی جائے۔ یہ سُن کر پہلے تو سکوت کا عالم رہا پھر کچھ سرگوشیاں شروع ہوئیں چند منٹ بعد ایک صاحب ہمت کرکے بولے اگر سب صاحب اس بات پر متفق ہوں کہ کہیں اور چرچے نہ ہوں گے تو میں اپنی زندگی کا اک سچا قصہ بیان کرنے کے لئے تیار ہوں۔ سارا مجمع ان کو بغور دیکھنے لگا، چہروں سے ٹپکتا تھا کہ حسن و عشق کے ولولے بعض دلوں کو گدگدا رہے ہیں کہ آج کی صحبت سے فائدہ اٹھا کر اپنی اپنی داستانِ درد و غم کہہ ڈالیں مگر افشائے راز کا خوف مانع ہے۔ سب نے کہا ہم عہد کرتے ہیں کہ آج کی رات ہم جو کچھ سنیں گے وہ کبھی زبان پر نہ آئے گا، اس عہد و پیمان نے سب کو مطمئن کر دیا اور چند صاحبوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک سچا واقعہ بیان کرنے کا وعدہ کیا۔ جو قصے دوستوں نے اس رات کو بیان کئے وہ ذیل میں درج ہیں۔ میں نے ان حکایتوں میں اپنی طرف سے کچھ رد و بدل نہیں کیا ہے جو واقعہ جس طرح بیان کیا گیا اُسی طرح لکھ دیا ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ نفس مطلب کو میں نے اپنے الفاظ میں ادا کیا ہے جس کے لئے مجھے کوئی معذرت پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت غالب فرماتے ہیں ؎

مطلب ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام ؎ چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو ؎ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

آپ بیتی سنانے والوں کا کچھ سراپا اور بعض حالات زندگی بھی بیان کئے گئے ہیں لیکن مجھے اقرار ہے کہ چہرے کی تصویر اصل صورت سے اس قدر مختلف ہے کہ جو مہمان اس شب کی محفل میں شریک تھے ان کو بھی پتہ نہ چلے گا کہ کس دوست کی تصویر کونسی ہے اس موقع پر بہزاد اور مانی کی ریس کرنا صریحاً اُس معاہدہ کے خلاف ہوتا جس کے اطمینان پر دوستوں نے اپنے حالات بیان کئے تھے لہٰذا ناظرین کو جتا دینا میرا فرض ہے کہ داستان گویوں کے سن و سال، خط و خال کاروبار اور اشغال کے بیان سے دھوکا نہ کھائیں۔ قیصر ولیم کی سی اوپر چڑھی ہوئی بل دار مونچھیں، فرش پر بیٹھنے کا عادی نہ ہونا، مغربی تہذیب و شائستگی کے رنگ میں ڈوبا ہونا، بیرسٹری کے ساتھ پولیٹکس سے لگاوٹ، گھوڑ دوڑ، سینما اور کلکتہ شیر بازار کٹ کے تذکرے، برہمو سماج کے مندر میں مذہبی مضامین پر تقریریں، یونیورسٹیوں کے کنووکیشن میں سالانہ خطبے، مہمان نوازی کا تنگ مزاجی پر غلبہ، یہ سب اور اسی قسم کی اور باتوں کو ناظرین اتنا پتہ نہ سمجھیں بلکہ داستان گویوں کے چہروں پر یہ نقاب اس لئے ڈالی گئی ہے کہ اصلی نقش و نگار ظاہر نہ ہونے پائیں۔ عاشقوں کی پردہ پوشی کے بعد معشوقوں کے حالات قلم روک کر لکھنا میں نے غیر ضروری سمجھا ساری وارداتیں بے کم و کاست لکھدی گئی ہیں اور نقل مطابق اصل کے ہے۔

حُسن و محبت کی جیتی جاگتی آٹھ تصویریں

پہلے دوست کی عمر کوئی تیس سال کی ہو گی بڑے خوش مزاج تھے سر کے تو سب بال سیاہ تھے مگر کنپٹی میں خال خال کوئی بال سفید تھا، خوب بڑی مونچھیں تھیں جن کو قیصر ولیم سابق شہنشاہ جرمنی کی طرح بل دے کر اوپر چڑھا رکھتے تھے۔ دوستوں کا حلقہ وسیع تھا شہرت تھی کہ عاشق مزاج ہیں۔ کہنے لگے پہلا زخم ہمیشہ یاد رہے گا، وہ بلا کی خوبصورت تھی دیس دیس اور ملک ملک کے آدمیوں سے ملنے کے باوجود یاد نہیں آتا کہ اس جیسی خوبصورت آنکھیں میں نے کسی اور کی دیکھی ہوں، سچ تو یہ ہے کہ اس کی آنکھیں دیکھ کر میر تقی کے اس شعر کا مطلب سمجھ میں آیا ؎

میرؔ اُن نیم باز آنکھوں میں ٭ ساری مستی شراب کی سی ہے

گورا چٹا رنگ سوتواں ناک جُٹی بھویں۔ نہایت پتلے ہونٹ۔ بوٹا سا قد۔ چھریرا بدن۔ بڑی بذلہ سنج اور حاضر جواب تھی، اُس بدقسمت طبقہ میں زندگی بسر کرتی تھی جس کا پیشہ حُسن فروشی ہے، گانا تو واجبی ہی واجبی جانتی تھی مگر اکثر مجروں میں رونق محفل کے لئے بلائی جاتی تھی۔ میری عمر اس زمانہ میں کوئی بائیس تیئس سال کی ہوگی۔ پہلی مرتبہ میں نے اُسے ایک مجرے میں دیکھا دل میں گُدگُدی پیدا ہوئی نوجوان دوستوں کا مجمع تھا میں نے مقدور بھر کوشش کی کہ ؎

ہاں اے نگاہِ شوق مناسب ہے احتیاط ٭ ایسا نہ ہو کہ بزم میں چرچا کرے کوئی۔ (رسوا)

مگر ایک دوست تاڑ گئے کہنے لگے آپ دور سے کیا درشن کر رہے ہیں قریب آجایئے۔ خاموشی کے یہ معنی ہوتے کہ میرے دل میں چور ہے میں کھسک کر بیدی کے قریب جا بیٹھا اور اُس کی طرف دیکھ کر اور بظاہر اُن دوست کو مخاطب کرکے یہ شعر پڑھا ؎

رہی نہ گفتہ مرے لب پہ داستاں میری ٭ نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری (میرؔ)

کچھ دن آنا جانا رہا میرا دل چاہتا تھا کہ اس شمع رو کا پروانہ بنوں مگر میں نے اپنی طبیعت کو روکا شادی ناممکن تھی۔ پیشہ ور عورت سے دوستی کرنے میں بدنامی تھی علی گڈھ چھوڑے تھوڑا ہی زمانہ ہوا تھا اور مجھے علی گڈھ کی عزت کا بڑا خیال تھا خدا نے فضل کیا بھاری پتھر دیکھا چوم کر چھوڑ دیا۔

دوسری تصویر۔ دوسرے دوست کی باری آئی۔ وہ سنبھل بیٹھے فرش پر بیٹھنے کے عادی نہ تھے جب تک شعر خوانی ہوتی رہی وہ پہلو بدلتے رہے اب جو آپ بیتی کی نوبت آئی تو انھیں کو نہ اطمینان ہوا پہلے سخت کالر ٹھیک کیا پھر بائیں ہاتھ سے ٹائی سنبھالی۔ شعر تو معمولی کہتے تھے مگر انشا پرداز اچھے تھے۔ عمر میں پہلے داستان گو سے پانچ چھ برس بڑے تھے، شادی نہیں کی تھی لوگوں کا خیال تھا کہ انھوں نے کہیں دل لگایا تھا مگر ناکامی ہوئی اب شادی نہ کریں گے، انہوں نے اپنی حکایت اس طرح بیان کی۔ میری محبوبہ کی آنکھیں بہت بڑی تھیں مگر اُن میں نہ شراب کی مستی تھی نہ نگاہ میں تیر کی چبھن۔ رنگ اور قد کم و بیش ایسا ہی تھا جیسا میرے نوجوان دوست کی (پہلے دوست

کی طرف اشارہ کرکے بتایا) دلبر کا جسم البتہ بھاری تھا بڑی بھولی صورت تھی ایک شریف گھرانے کی خاتون تھی کوئی پچیس سال کی عمر ہوگی خاوند کا انتقال ہوچکا تھا جس نے زمینداری لین دین بہت سی دولت اور تین چار بچے چھوڑے تھے کاروبار کی دیکھ بھال خود کرتی تھی۔ لین دین کا کام اسکی نگرانی میں ایک منیم اور زمینداری کا کام ایک مختار عام کرتا تھا۔ ایک روز مختار عام کی شکایت کرنے میرے گھر پر آئی اور مجھ سے مدد کی طالب ہوئی۔ مختار عام نے بہت سارا روپیہ خورد برد کر دیا تھا۔ شکایت کرتے وقت آنسو ڈبڈبا رہے تھے جس سے اس کی صورت اور بھی دل فریب ہوگئی تھی۔ میں نے اُسے پہلے دیکھا تھا مگر بات چیت کی نوبت نہیں پہنچی تھی دوستی ہوگئی اور عرصہ تک رہی۔ وہ اپنا مذہب چھوڑ کر مسلمان ہونے پر راضی تھی بشرطیکہ میں شادی کرلوں، شادی میرے حق میں غیر مفید اور اُس کے لئے نہایت مضرت رساں تھی۔ میں نے سمجھانے کی کوشش کی اس کی سمجھ میں آیا لیکن دوستی بدستور قائم رکھی۔ بڑی سادہ مزاج اور ہنس مکھ تھی شراب کی شوقین تھی۔

تیسری تصویر۔ تیسرے محب مغربی تہذیب و شائستگی کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ چہل سالہ ہونے کے باوجود لڑکوں جیسی شوخی اُن کے مزاج میں تھی۔ صورت بُری نہ تھی انگریزی لباس بہت اچھا پہنتے تھے سر میں بائیں طرف انگریزی وضع کی مانگ بڑے اہتمام سے نکالتے تھے، ساری تعلیم ہندوستان میں حاصل کی تھی مگر طور طریقے ایسے تھے کہ اُن کے آگے یورپ کے تعلیم یافتہ ہندوستانی مات تھے فرمانے لگے میری بُت حیلہ جو انگلو انڈین تھی خاصہ لمبا قد۔ خوب بھرے ہوئے بازو اور پنڈلیاں۔ اُبھرا ہوا سینہ نشیلی آنکھیں۔ بہت لمبے لمبے بالکل سیاہ بال۔ غسل کرکے جب بال سکھانے کے لئے دونوں شانوں پر ڈالتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ پری نے جوگن کا بھیس بدلا ہے طبیعت میں بلا کی شوخی تھی بڑی محل شناس بلکہ زمانہ ساز تھی رونا اور ہنسنا دونوں اس کے آگے کھیل تھے، وہ زمانہ سینما کا نہ تھا اگر اس زمانہ میں جوان ہوتی تو فلم کی دنیا میں خوب نام پیدا کرتی۔ خاوند سے تعلق نہ تھا غالباً طلاق ہوگئی تھی۔ ایک انگریزی اسکول میں معلّمہ کی خدمت انجام دیتی تھی، دو بچّے تھے ایک لڑکا اور ایک لڑکی دونوں اسکول میں پڑھتے تھے۔ اپنی آمدنی کا کثیر حصّہ اولاد کی تعلیم میں خرچ کرتی تھی اور بہت اچھی ماں

تھی ہلکی خوشبوؤں سے اُسے رغبت تھی کیلی فورنیا کی پوست کا عطر خاص طور سے پسند تھا میرے ساتھ کبھی کبھی کھانا بھی کھاتی تھی موٹاپے کے آثار نمایاں تھے اس لئے میٹھی چیزیں کھانے سے پرہیز کرتی تھی لیکن میٹھی باتیں کرنا خوب جانتی تھی موقع محل سے لگاوٹ کے تانے میں بے اعتنائی کا بانا بن کر آتش شوق کو تیز کرنے کے لئے عجب قسم کا پردہ میرے اور اپنے درمیان میں حائل کر دیتی تھی ایشیائی شاعری کے معشوق کی بڑی اچھی مثال تھی اس سست پیمان کے دس وعدوں میں سے دو تین سے زیادہ کبھی وفا نہ ہوئے۔

چوتھی تصویر۔ چوتھے صاحب ایک بڑے کامیاب بیرسٹر تھے۔ شعر و سخن کا بڑا ذوق تھا۔ اُن کی داستان سُن کر معلوم ہوا کہ صرف عدالت میں مقدمات جیتنے کی ہی انہوں نے مشق نہیں کی تھی بلکہ پری وشوں کے دل موہ لینے کا ڈھب بھی ان کو خوب آتا تھا عمر کوئی پچاس اور پچپن سال کے درمیان ہوگی انہوں نے کسی قدر فخریہ انداز سے اپنا قصہ کہنا شروع کیا۔ پری سے ایک بڑے ہوٹل میں ملاقات ہوئی اُسکی شان دلبری نے مجھے کھینچا بڑی پیاری صورت تھی۔ میانہ قد نازک جسم جنوبی اٹلی کے باشندوں کا سا رنگ۔ آنکھیں کیا تھیں نرگس کے کٹورے تھے لباس اس سلیقہ کا پہنتی تھی اور مختلف رنگ آپس میں کچھ ایسا میل کھاتے تھے کہ جی چاہتا تھا اُسے دیکھا کیجئے۔ عمر چالیس کے قریب ہوگی پھر بھی حُسن کا یہ عالم تھا کہ ممکن نہ تھا وہ ہوش رُبا کسی طرف سے گذرے اور نگاہیں چاروں طرف سے اُس کی بلائیں نہ لیں۔ انگریزی ادب سے خوب واقف تھی اور ہمارے ملک کی کئی زبانیں جن میں اُردو بھی شامل ہے بے تکلف بولتی تھی مشرقی اور مغربی دونوں تہذیبوں کی ماہر تھی یورپ کے ملکوں کی سیر و سیاحت کر چکی تھی ہمارے ملک کے تقریباً سب صوبوں کے حالات سے واقف تھی، جس مضمون پر جی چاہے گفتگو کیجئے وہ برابر کی ٹکر لیتی تھی۔ ایک بڑے معزز خاندان میں پیدا ہوئی اور ایک دوسرے نہایت معزز خاندان میں بیاہی گئی۔ گفتگو میں سادگی کے باوجود غضب کی ادا تھی بڑی شخصیت کی خاتون تھی عزت نفس کا بڑا خیال تھا اسی کے ساتھ خودداری کی بھی قدر کرتی تھی ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ وہ بہت سے دوستوں اور بعض عزیزوں کے ساتھ ایک مشہور ہوٹل کے گول کمرہ میں بیٹھی ہوئی تھی بات چیت ہو رہی تھی کہ میں جا پہنچا میں چند منٹ ہی بیٹھا ہونگا

کہ وہ یہ کہہ کر اُٹھ کھڑی ہوئی "معاف کیجئے میں نے ان صاحب کے ساتھ سینما جانے کا آج شام کو وعدہ کیا ہے۔" میرے ساتھ سینما جانے کے وعدہ کی کوئی اصلیت نہ تھی مگر وہ جانتی تھی کہ اُس مجمع میں زیادہ دیر تک بیٹھنا مجھے گراں گذرتا میں نے زبان سے کچھ نہیں کہا تھا لیکن وہ تاڑ گئی کہ میری نظریں کہہ رہی ہیں ؎

سمجھ لے آنکھوں ہی آنکھوں میں گر سمجھنا ہے ٭ مری زباں سے نہ کہلا کہ آرزو کیا ہے۔ (داغ)

میں نے جب کبھی اُسے مدعو کیا سیکڑوں میل کا سفر کر کے مجھ سے ملنے آئی۔ سچ تو یہ ہے کہ محبت و عشق کی دنیا ایسی ہی وفا کیشوں کے دم سے قائم ہے۔ ہدایت علی خاں بدر کی روح معاف کرے میں نے موصوف کے مشہور شعر میں تھوڑا سا تصرّف[1] کر لیا ہے ؎

دل کو تسخیر کئے لیتا ہے یہ نقشِ وفا ٭ کس طرح سینہ سے اُن کو نہ لگائے کوئی

پانچویں تصویر۔ پانچویں دوست کی عمر تو زیادہ نہ تھی مگر دنیا کے معاملات کا وسیع تجربہ رکھتے تھے انگریزی گورنمنٹ کی ملازمت سے زندگی شروع کی پھر چند سال وکالت کی اُس سے برداشتہ خاطر ہوئے تو ایک خاصی بڑی ہندوستانی ریاست میں ایک معقول عہدے پر ممتاز اور والی ملک کی ناک کا بال رہے۔ ہز ہائینس کی مسند حکومت سے علیٰحدگی پر کلکتہ شیر مارکٹ میں قسمت آزمائی کی اور خوب روپیہ کمایا۔ سجیلے جوان تھے جہاں گھوڑ دوڑ ہوتی اکثر وہاں دو چار خواتین دوستوں کے ساتھ شریک ہوتے گھوڑوں پر بازی بدتے اور سَو ہارتے تو پانسو جیتتے تھے۔ بڑے متواضع اور مہماں نواز تھے اس لئے کسی نے گھوڑ دوڑ میں اُن کی غیر معمولی کامیابی کا راز معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی سینما کے بھی بڑے شوقین تھے اور عام خیال تھا کہ فلم سازی کی تجارت میں بھی ان کا بہت سا روپیہ لگا ہوا ہے۔ فلم سازی سے اُن کا کوئی تجارتی تعلق ہو یا نہ ہو لیکن سینما کی شاید ہی کوئی نوجوان اور طرحدار ایکٹرس ہو جسے وہ اچھی طرح نہ جانتے ہوں ریڈیو کی حسین گانے والیوں سے بھی اُن کے مراسم تھے۔ گرمی کا موسم شملہ، نینی تال، منصوری اور ڈلہوزی کی تفریحوں یا کبھی کبھی کشمیر کی سیر و سیاحت

---

[1] بدر کا اصل شعر یہ ہے ؎ دل کو بے چین کئے دیتا ہے جوبن کا اُبھار ٭ کس طرح سینہ سے اُن کو نہ لگائے کوئی

کی نذر کرتے تھے۔ اُن کی کوٹھی مہمانوں سے کھچا کھچ بھری رہتی تھی جن میں صنف نازک کی مستقل اکثریت ہوتی تھی۔ ان تمام اشغال پر طرہ یہ ہے کہ شاعروں اور ادیبوں کی قدر اور اُن کی مالی امداد بھی کرتے تھے بڑے حکام رس تھے گورنر جنرل کی ایگزیکٹیو کونسل کے ممبروں سے لے کر مقامی میونسپل کمشنروں تک سب سے اُن کے مراسم تھے جن سے مراسم نہ تھے اُن سے بھی یاد اللہ ضرور تھی انھوں نے اپنی کہانی شروع کی۔

لوگ مجھے ہر دیگی چمچہ سمجھتے ہیں۔ یہ موقعہ اقرار یا انکار کا نہیں ہے۔ جو شہرت مجھے حاصل ہے اس سے مجھے کاروبار میں بڑی مدد ملتی ہے بہرحال ناں کہنے کا کیا محل ہے دوستوں نے اپنی کامیابی کی داستانیں بیان کی ہیں میری ناکامیابی کا قصہ سنئے شاید حُسن و محبّت کی دنیا میں میری ذلّت کا یہ سب سے بڑا شاہکار ہے جسے میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ مجھے غور کرنے کے بعد بھی یاد نہیں آتا کہ میں نے جس جسینہ سے محبّت کی ہو اُس کے دل میں اپنی جگہ نہ پائی ہو لیکن ایک فتنہ نے میرے ساتھ جو سلوک کیا وہ قابلِ عبرت ہے۔ ستائیس اٹھائیس سال کی عمر ہو گی۔ میانہ قد۔ بہت نازک جسم۔ کُھلتا گندمی رنگ۔ خوب چوڑی پیشانی۔ لمبی بھویں۔ بڑی خوبصورت آنکھیں جو ہر وقت مخمور معلوم ہوتی تھیں۔ نہایت پتلی کمر۔ چوٹی کے بال گھٹنوں تک۔ آواز بڑی شیریں۔ ہمارے ملک کے پڑوس میں ایک ملک ہے وہاں پیدا ہوئی مگر غالباً آٹھ دس سال کی عمر میں ہندوستان آگئی تھی اُردو بہت اچھی بولتی تھی اور لب و لہجہ سے یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ کسی غیر ملک میں پیدا ہوئی ہے۔ مجھے اُس کی بھولی صورت پر دھوکا ہوا۔ بیگم کی نئی نوکرانیوں میں بھرتی ہوئی تھی اور ہماری کوٹھی پر رہتی تھی میں نے ڈورے ڈالنے شروع کئے وہ کبھی آنکھ سے آنکھ لڑاتی تھی کبھی نظریں نیچی کر لیتی تھی۔ سمجھ میں آیا کہ خدا کی بندی کے دل میں کیا ہے۔ ایک دن میرا بہرا بیمار تھا وہ صبح کے وقت میرا ہاتھ مُنہ دُھلوانے غسلخانہ میں آئی میں نے موقعہ غنیمت سمجھا اور بات چیت کرنے لگا معلوم ہوا خاوند سے طلاق ہو چکی ہے۔ قریب کا عزیز کوئی نہیں ہے نوکری کر کے اپنی گذر کرتی ہے۔ سینا پرونا بھی جانتی ہے۔ سلیقہ شعار اور خوددار عورت تھی ناخواندہ ہونے کے باوجود سوجھ بوجھ اچھی تھی۔ جب مراسم بڑھے تو معلوم ہوا کہ یہ عجیب و غریب عورت ایسا پھول ہے جسے آپ دور نہیں بلکہ قریب سے بھی دیکھ سکتے ہیں لیکن یہ گوارا نہیں کہ کوئی خوشبو سونگھے

بقول آغا شاعر دہلوی ؂

پھول رکھا ہے مگر سونگھ نہیں سکتے ہیں ✦ آپ ہی آپ مسلتا ہے کوئی دل اپنا

ہنسی کم تھی مگر جب ہنستی تھی تو رخساروں کی ہلکی لہریں بڑی پیاری معلوم ہوتی تھیں۔ اُس کا سارا جادو آنکھوں میں بھرا تھا نگاہیں تیر تھیں لیکن اسے حقیقت سمجھئے یا میرا حُسن ظن قرار دیجئے میں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ اُس نے تیر نظر سے میرا کلیجہ چھیدنے کی قصداً کوشش کی ہو۔ اظہار محبت یکطرفہ ہوتا تھا میں نے جب کبھی پیار کیا اُسے پتھر کی مورت کی طرح بے حس و حرکت پایا اپنے جذبات پر بلا کا قابو حاصل تھا۔ کئی مہینے اسی طرح گذرے میرا شمار بدصورتوں میں نہ تھا اچھے کپڑے بدن پر سجتے تھے اُس زمانہ میں اچھے کپڑے پہننے کا مجھے شوق بھی تھا۔ یہ سب کچھ تھا مگر وہ الگ تھلگ ہی رہی۔ روپے کی بھی اُسے مطلق پرواہ نہ تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت سے معمے حل کئے ہیں مگر یہ عورت ایسی پہیلی تھی جسے میں نہ بوجھ سکا اُسے پتے کی تلاش میں رہا۔ بالآخر ایک دن اُسے تھوڑا سا متوجہ پاکر میں نے کہا کہ اوس سے پیاس نہیں بجھ سکتی ہم کب تک ایک دوسرے سے جدا رہیں گے آزاد ہونے کے باوجود اپنی جوانی اور حُسن سے کیوں فائدہ نہیں اُٹھاتیں مصرعہ۔ دل سرور ہا بتل ہوئی گرم ۔ والامضمون کب تک رہے گا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگی غیر عورت سے آپ اور کیا چاہتے ہیں آپ کی خاطر میں نے جو کچھ کیا وہ بھی مجھے نہ کرنا چاہیئے تھا اگر آپ کے جی ہوس پکائی ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے اللہ رکھے آپ کی بیگم صاحبہ موجود ہیں۔ میں نے کہا تمہیں ہمارے گھر رہتے سال بھر ہو گیا اس گھر میں رہنے کا لطف یہ ہے کہ میری ہو کر رہو۔ بولی آپ آقا ہیں جو خدمت میرے سپرد ہے اُس سے باہر نہیں لیکن کسی اور بات کا خیال دل سے نکال ڈالئے میرے ہاتھ پاؤں خدمت کے لئے حاضر ہیں مگر میرا جسم میرا ہے قاضی کے دو بول پڑھائے بغیر یہ آپ کا نہیں ہو سکتا۔ آج تک میں دوٹوک بات کہنے سے بچتی رہی آپ کے نمک کا پاس تھا مگر اب آپ نہیں مانتے اس لئے مجھے صاف بات کہنی پڑی۔ میں نے جواب دیا مجھے آج تک یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے یا نہیں اگر محبت ہے تو میری بات مانو میں اس کا انتظام کر دوں گا کہ تمہاری بقیہ زندگی آرام و آسائش سے کٹے

رہا نکاح۔ یہ میرے بس کی بات نہیں۔ میری بیوی بچے موجود ہیں بھلا یہ تو سوچو اگر میں دوسرا نکاح کر لوں تو دنیا کیا کہے گی۔ تیور بدل کر بولی خدا سرکار کا بھلا کرے ایمان کی کہیئے اگر میں بغیر دو بول پڑھوائے اپنا تن بدن سرکار کی سپرد کر دوں تو دنیا مجھے کیا کہے گی۔ آپ بڑے آدمی ہیں آپ کی عزت بھی بڑی ہے میں بہت چھوٹی آدمی ہوں اور میری طرح میری عزت بھی چھوٹی ہے۔ مگر ہم دونوں کو اپنی اپنی آبرو یکساں پیاری ہے۔ بیوی بن کر رہنے میں مجھے عذر نہیں مگر جھوٹے موتی کی جتنی قدر ہوتی ہے وہ سرکار کو معلوم ہے۔ مجھے سخت تعجب بھی ہوا اور مایوسی کے ساتھ مسرت بھی ہوئی۔ تعجب تو یہ تھا کہ دس بارہ روپے ماہوار کی ملازمہ اور یہ حوصلے۔ مایوسی لازمی تھی اس کی آنکھوں میں جادو تھا اور میں چاہتا تھا کہ وہ آنکھیں میرے سوا کسی اور کو محبت کی نظر سے نہ دیکھیں۔ خوشی یہ تھی کہ ہندوستان کے اس غریب طبقہ میں بھی جس کا مایۂ ناز اُس کی نسلی شرافت نہیں ہے ایسی اولوالعزم عورتیں موجود ہیں جو اپنی عزت نفس کو دنیا وی آرام و آسائش سے کہیں زیادہ عزیز رکھتی ہیں۔ یورپ میں ایسی تعلیم یافتہ عورتیں موجود ہیں جن کو بوس و کنار پر اعتراض نہیں مگر آگے الفظ۔ یہ عورت بے پڑھی لکھی مگر نہایت بااصول تھی۔ میری زندگی میں اس قسم کا یہ پہلا تجربہ تھا اور میری پہلی شکست تھی جو ہمیشہ اس لئے یاد رہے گی کہ جس نے مجھے شکست دی وہ معمولی طبقہ کی ایک بے پڑھی لکھی غریب عورت تھی۔ ظالم نے کمال یہ کیا کہ باوجود میری کرید کے یہ نہ بتلایا کہ اُسے مجھ سے محبت ہے یا نہیں میرا خیال ہے کہ یا تو محبت کے چوچلوں سے واقف نہ تھی یا کہیں دھوکا کھا چکی تھی۔ اس کے بعد وہ ہمارے یہاں کچھ عرصہ تک رہی اور میں نے ہمیشہ اُس کی وہ عزت کی جس کا اُس نے اپنے کو مستحق ثابت کر دیا تھا۔

چھٹی تصویر چھٹے دوست بڑی آن بان کے آدمی تھے۔ سن رسیدہ تھے اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکے تھے پہلے پروفیسر تھے پھر ٹھیکہ داری شروع کی اور ۱۹۱۴-۱۹ء کی جنگ میں خوب روپیہ کمایا ٹھیکہ داری کا شغل اب بھی جاری تھا۔ بڑے اچھے ادیب تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ شعر بھی کہتے ہیں مگر اس کا اقرار خود انہوں نے کبھی نہیں کیا عربی اور فارسی دونوں زبانوں کے ایم۔ اے تھے اُن کی انگریزی قابلیت مسلم تھی۔ کبھی کبھی شملہ میں انگریزی ادب شاعری پر لکچر بھی دیتے تھے۔ ہر سال برہمو سماج کے مندر میں کسی

نہ کسی مذہبی مضمون پر تقریر کرتے تھے۔ کمزور کی ہمیشہ حمایت کرتے تھے۔ مشرقی تہذیب کے دل دادہ حضرات کے سامنے مغربی تہذیب کی خوبیاں بیان کرتے تھے اور جن ہندوستانیوں نے مغربی معاشرت اختیار کرلی ہے ان کے مدمقابل ہو کر مشرقی تہذیب کی نفاست۔ باریکیوں اور دلفریبیوں کو سراہتے تھے۔ دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا جس میں کانگریس والے مسلم لیگ والے ہندو مہا سبھائی ماسٹر تارا سنگھ کی سکھ پارٹی کے ارکان پنجاب کے اتحادی (Unionists) ۔رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو کا الگ تھلگ رہنے والا سیاسی نورتن اور مسٹر فضل الحق کی معجون مرکب پارٹی کے ممبر داخل تھے۔ اُن لوگوں میں تھے جو سب کی سُنتے اور اپنے من کی کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی عجیب و غریب حکایت اس طرح بیان کی :-

وہ پردہ نشین تھی۔ بیگم (میری بی بی) سے بہنا پا تھا۔ بیگم خود سختی سے پردہ کی پابند تھیں۔ کہا کرتی تھیں ہمارے مُلک کی سب شریف عورتیں پردہ میں رہنا چاہتی ہیں اور یہی بات اُن کے لئے مفید بھی ہے مگر اس کا کیا علاج ہے کہ بقول اکبر الہ آبادی مردوں کی عقل پر پردہ پڑ گیا ہے۔ خدا وہ دن نہ لائے کہ میں اپنی آنکھ سے شریف گھرانوں کی بہو بیٹیوں کو غیر مردوں کے ساتھ سینما جاتے یا چوک کی دُکانوں سے سامان خریدتے دیکھوں۔ وہ اکثر بیگم سے ملنے آتی اور گھنٹوں بیٹھی رہتی تھی خدا بخشے بیگم فرشتہ صفت انسان تھیں بیگم کو مجھ سے عشق تھا اُن کی رائے میں مجھ جیسا معصوم صفت مرد دنیا میں کوئی نہ تھا غالباً وہ اس کو بھی میری کرامت سمجھتی تھیں کہ اس قدر بھولے پن کے باوجود میں نے دنیاوی کاروبار میں کامیابی حاصل کی۔ بیگم کی رائے میں کسی پردہ نشین عورت کو حق نہ تھا کہ مجھ سے پردہ کرے وہ اپنی سہیلیوں سے کھلم کھلا کہتی تھیں کہ "ان سے (مجھ گنہگار سے مطلب تھا) کیا پردہ ہے تم اگر اُن سے دو بدو باتیں کرنا چاہو تو وہ نیچی نظریں کرکے تم سے باتیں کریں گے تمہاری طرف نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھیں گے"۔ ممکن ہے اس شوخ پردہ نشین کے دل میں خیال آیا ہو کہ بڑے بگلا بھگت بنتے ہیں ذرا میں بھی تو دیکھوں۔ ایک دن بیگم سے کہنے لگی "آپ کئی مرتبہ کہہ چکی ہیں کہ آپ کے میاں بڑے نیک ہیں میں آج اُن کے سامنے آؤں گی چار کے وقت اُنہیں اندر بلا لیجیئے۔ جی

چاہیے تو چاء بھی زنانہ میں ہم سب کے ساتھ پئیں"۔

میں دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کوئی ساڑھے چار بجے شام کا وقت ہو گا کہ بیگم آئیں اور کہنے لگیں میری ایک سہیلی تمہارے سامنے آنا چاہتی ہیں اندر چلو اُن سے ملو چاء بھی ہم سب کے ساتھ پی لینا۔ میں نے پوچھا مجھ سے ملنے کی شائق کون صاحب ہیں بیگم نے پتہ بتایا پہلے تو میں نے اوپر کے دل سے انکار کیا مگر بیگم کے اصرار پر اُن کے ساتھ اندر آیا۔ عجب سماں دیکھا ؎

ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی ؛ اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی،

اُس کی عمر کوئی بائیس سال کی ہو گی خوبصورتوں میں تو اس کا شمار نہ تھا مگر اس کی جوانی نے صورت میں وہ دلفریبی پیدا کر دی تھی کہ خود حُسن کو رشک تھا۔ لباس ٹھیٹ ہندوستانی وضع کا تھا سا ٹھن کا ڈھیلا آبی پاجامہ۔ پیازی چُست کُرتہ۔ چکن کا سفید دوپٹہ۔ زیور بہت کم تھا مگر جتنا تھا بہت سلیقہ کا تھا کانوں میں چھوٹے[1] چھوٹے بندے تھے میں نے کن انکھیوں سے کئی مرتبہ اُس کی طرف دیکھا بیگم چاء کے اہتمام میں مشغول تھیں۔ کہنے لگی بیگم صاحبہ کا بڑا اصرار تھا دیکھئے آج میں آپ کے سامنے آ ہی گئی۔ میں نے جواب دیا میں بھی غیر نہیں ہوں بیگم کے حکم کا بندہ ہوں یہاں حاضر ہونے کا حکم ملا میں حاضر ہو گیا۔ بولی جب آپ کالج میں لکچر دینے آئے تھے میں نے آپ کو دیکھا تھا مسلمان عورتیں اور لڑکیاں چقوں کے پیچھے تھیں میں بھی وہاں موجود تھی۔ میں نے کہا خدا بھلا کرے آپ نے سچ بات کو بے نقاب کر دیا مگر یہ کونسا انصاف ہے کہ عورتیں مردوں کو چق میں سے دیکھیں اور مرد شرفِ زیارت سے محروم رہیں خود سب کچھ دیکھنا اور اپنے آپ کسی کو نظر نہ آنا یہ تو وہ شان ہے جس کے آگے ہم سب کے سر جھکتے ہیں۔ پردہ اچھی

---

[1] خدا انگریزی مذاق کا بھلا کرے اب تو ہماری خواتین چار انچ سے کم لمبے بندے پہننا اپنی شان کے خلاف سمجھتی ہیں۔ جس عورت کے خاوند کا مرتبہ جتنا زیادہ ہو گا بندے بھی اسی قدر لمبے ہونگے معلوم ہوتا ہے جھومر کے دن بھی پھریں گے۔ دیکھئے جھومر کو بندوں کی سرداری کی عزت کب نصیب ہوتی ہے۔

چیز بھی ہے اور بُری۔ .... بیگم نے میری بات کاٹ کر کہا زبان سے جو چاہو کہو مگر یہ تو بتاؤ کتنے مرد اس قابل ہیں جن کے سامنے کوئی شریف عورت بے پردہ آسکے۔ بات بڑھانے سے کچھ فائدہ نہ تھا میں ہنسنے لگا۔ بیگم نے اسے میری شکست کی علامت قرار دیا وہ اور اُنکی مہمان خوب ہنسیں۔ لڑکیوں کے کالج میں مسز اینی بیسنٹ کا لکچر تھا میری بڑی لڑکی وہاں گئی ہوئی تھی چھوٹی لڑکی جسکی عمر نو دس سال کی تھی موجود تھی پردہ کی بحث میں وہ غیر جانبدار رہی میرا ساتھ دیا نہ اپنی ماں کا (اب اس کی شادی ہو گئی ہے اور وہ پردہ نہیں کرتی) بیگم نے چاء بنا کر ہم سب کو دی اور آدھ گھنٹہ تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ بیگم کی سہیلی دو بچوں کی ماں تھی سترہ سال کی عمر میں ایک ہونہار نوجوان ڈاکٹر سے شادی ہوئی وہ غریب ساڑھے تین سال بعد جنگی بخار کی بھینٹ چڑھ گیا۔ نوجوان بیوہ اپنے بھائی کے یہاں رہتی تھی میں نے اپنے دل کو ٹٹولا تو محسوس ہوا کہ میرے دل میں اس کی جگہ ہے۔ شاعروں کی زبان میں میرے دل کا اس وقت یہ حال تھا کہ بقول نواب فقیر محمد خاں گویا لکھنوی ؎

صندلی رنگ پہ میں مرہی گیا ؛ دردِ سر کس کا کہ یاں سر ہی گیا

اہل دل تھوڑے بہت صاحب کشف بھی ہوتے ہیں اُسی کشف کے زور سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ اس کا دل بھی کچھ نہ کچھ متاثر ہے۔ وہ ہفتہ میں ایک مرتبہ بیگم سے ملنے ضرور آتی تھی۔ کئی مرتبہ بیگم کی موجودگی میں اُس کے ساتھ چاء پینے کا اتفاق ہوا۔

ایک دن ایسا موقع ہوا کہ بیگم معہ دونوں لڑکیوں کے اپنی کسی خاتون دوست کے یہاں چاء پینے گئی تھیں اور راما کو ساتھ لے گئی تھیں۔ وہ آئی اور حسب معمول سیدھی کوٹھی کے زنانہ حصہ میں چلی گئی۔ آدمی نے مجھے اطلاع کی میں پہنچا وہ اُلٹے پاؤں واپس جانے کے لئے تیار تھی۔ میں نے کہا جلدی کیا ہے بیگم آتی ہوں گی اتنے آپ چاء میرے ساتھ پیجئے پہلے تو اُس نے پس و پیش کیا پھر کہنے لگی ساتھ چاء پینے میں کیا مضائقہ ہے بیگم صاحبہ نے تو خود ہی آپ سے میرا پردہ توڑ دیا ہے میں یہ سہارا پاکر بیٹھ گیا نوکروں سے پردہ تھا نتیجہ یہ ہوا کہ نوکر کا سارا کام

مجھے خود ہی کرنا پڑا۔ وہ ایف۔ اے پاس صاحب استعداد اور بڑی خوش سلیقہ تھی ذوق سخن رکھتی تھی کہنے لگی اپنے کچھ شعر سنائیے۔ میں نے کہا میں شاعر نہیں ہوں۔ بولی پھر تمام دنیا آپ کو شاعر کیوں کہتی ہے۔ مصرعہ۔ زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو۔ میں نے جواب دیا شعر کا پہلا مصرعہ یعنی بُرا کہے جسے عالم اسے بُرا سمجھو۔ اگر آپ پڑھتیں تو مجھے انکار کی جرأت نہ ہوتی۔ جذبات کی صحیح اور موثر ترجمانی کا نام شاعری ہے اگر آپ جذبات کی سچی تصویر دیکھنا چاہیں تو میں نثر میں شاعری کرنے کے لئے حاضر ہوں مسکرا کر بولی نثر کی نہیں بدی۔ اپنے شعر نہیں پڑھتے تو استادوں کا کچھ کلام سنائیے میں نے یہ شعر پڑھا ؎

تم سے کچھ کہنے کو تھا بھول گیا　∴　جانے کیا بات تھی کیا بھول گیا

شعر بہت پسند آیا دوبارہ مجھ سے پڑھوایا اور خود بھی ایک دفعہ پڑھا۔ پوچھا کس کا شعر ہے کیا زبان ہے۔ یہ تو دہلی کا رنگ ہے لکھنؤ کے بعض نامور شعرا نے تو مضمون آفرینی اور رعایت لفظی کے ذوق میں شعر کو معما بنا دیا اور سچ تو یہ ہے کہ ناسخ کے شاگردوں کی نازک خیالی استعاروں کی تہ میں ڈوب کر غائب ہو گئی۔ میں نے کہا نظام رامپوری کا شعر ہے بڑے پایہ کے استاد تھے۔ پھر میں نے ایک اور شعر پڑھا ؎

دلِ پُر داغ کا ہم حال کہیں کیا تم سے　∴　پھول دیکھا ہے کبھی لالۂ صحرائی کا

شعر سُن کر جھومنے لگی۔ دو مرتبہ خود پڑھا پوچھا کس کا شعر ہے۔ میں نے کہا اس کے مُصنّف اُسی لکھنؤ کے رہنے والے تھے جن کی مضمون آفرینی اور نازک خیالی آپکو ناپسند ہے۔ تعشق لکھنوی مرثیہ گو تھے لیکن غزل گوئی میں بھی اُن کا پایہ بہت بلند ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ مرثیہ سے غزل بہتر کہتے تھے افسوس ہے اُن کی غزلوں کی ملک نے پوری قدر نہیں کی۔ بولی معاف کیجئے آپ میرا مطلب غلط سمجھے میں لکھنؤ کے اساتذۂ فن کے کلام کی بڑی قدر کرتی ہوں لکھنؤ والوں نے زبان کو ایسا صاف کیا اور سنوارا کہ معمولی بولی سے باقاعدہ زبان ہو گئی۔ میر انیس سچ فرماتے ہیں ؎

مری قدر کر اے زمینِ سخن　∴　تجھے بات میں آسماں کر دیا

میں نے بعض دشوار پسند لکھنوی شعرا کی طرف اشارہ کیا تھا جن کی جولانی طبع کوہ کندن وکاہ برآوردن

کی مصداق تھی یہ شعر تو غضب کا ہے آپ کو تعشق کے اور شعر یاد ہوں تو سنائیے۔ میں نے تعشق مرحوم کی غزل کا مطلع پڑھا ؎

اپنا مزار متصل در بنائیں گے ⁂ اک گھر تمہارے گھر کے برابر بنائیں گے

اُس نے بہت داد دی اور کہا اس غزل کا کوئی اور شعر یاد ہے۔ میں نے جواب دیا آپ اجازت دیں تو ایک شعر اور سناؤں جس میں تعشق کے اعجاز کلام نے میرے جذبات کی ترجمانی کی ہے بولی پڑھیئے میں نے کہا سنئے اور یقین مانیئے ؎

اُفتادہ رہنے دی تھی زمیں دل کی اس لئے ⁂ اُمید تھی کہ آپ یہاں گھر بنائیں گے

نیم باز آنکھوں سے مجھے دیکھا پھر نیچی نظریں کرکے بولی آپ تو اساتذہ کا کلام اس طرح پڑھتے ہیں گویا آپ ہی کے شعر ہیں میں شعر کا مطلب تھوڑا بہت سمجھتی ہوں اپنی طرف سے کچھ نہ کہیئے صرف شعر پڑھیئے۔ مجھے یہ ادا جس میں حسن و جوانی نے شوق و محبت کو تنبیہ کی تھی بہت پسند آئی جی تو چاہتا تھا کہ کہوں۔ مصرعہ۔ تم جو بگڑے اِک نیا انداز پیدا ہو گیا مگر عورت کی خودداری کی میں نے ہمیشہ قدر کی ہے ٹھوکر کھا کر میں سنبھلا اور کہا تعمیل ارشاد کی جائیگی۔ بولی اب اور شعرا کا کلام سنائیے میں نے پہلے کمرہ کے فرش پر چاروں طرف نگاہ دوڑائی پھر اُنگلی کا اشارہ اُس کے پاؤں کی طرف کرکے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا "آپ کے پاؤں کے نیچے" اُس نے فوراً اپنا پاؤں ذرا سا اٹھا کر دیکھا۔ میں نے کسی قدر افسوس کے لہجہ میں ٹھہر کر کہا "دل ہے" اور پورا مصرعہ دوبارہ پڑھ دیا اور اُسی کے ساتھ مصرعہ ثانی بھی پڑھا ؎

آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے ⁂ اِک ذرا آپ کو زحمت ہوگی (صفی)

ؔ میرے داماد سید ابوطالب نقوی علی گڈھ کے کلکٹر ہیں انگریزی رسم و رواج کے مطابق مسٹر اے۔ ٹی نقوی آئی۔ سی۔ ایس کے نام سے مشہور ہیں۔ امتحان پاس کرنے کے بعد تربیت (ٹریننگ) کے لئے انگلستان بھیجے گئے اور دو سال وہاں رہے اس زمانہ میں شعر بھی کہتے تھے انگلستان کے زمانہ قیام میں طالب نے کئی نظمیں لکھی ہیں ایک غزل اسی زمین میں ہے جس کے دو شعر درج کئے جاتے ہیں۔

دردِ دل رات مصیبت ڈھائی ⁂ اب جو اٹھا تو قیامت ہوگی

ٹھہرئے ٹھہریے دنیا طالب ⁂ اس پہ طرہ کہ قیامت ہوگی

تیوری چڑھا سر پر آنچل سنبھال کہنے لگی پہلے آپ مجھے شعر کا مطلب سمجھاتے تھے میں نے ٹوکا تو اب آپ کے پڑھنے کی شان یہ ہے کہ میر سوز کی طرح خود مضمون کی صورت بن جاتے ہیں سوز نامی اُستاد تھے اُن کی اور بات تھی اگر شعر سُنانے ہوں تو سیدھی طرح پڑھیئے جیسے مولوی فضل الحسن حسرت موہانی پڑھتے ہیں۔ میں نے معذرت کے لہجہ میں کہا معاف کیجیے پھڑکتا ہوا شعر تھا مجھ سے رہا نہ گیا“۔ یہ کہکر میں نے چند شعر پڑھے جن میں کے بعض یہ تھے۔

دل میں کتنے مسودے تھے مگر ؛ ایک پیش اُن کے روبرو نہ گیا (میر)

دل کے لئے اُلفت کی قیدیں ہی مناسب تھیں ؛ دیوانہ یہ ایسی ہی زنجیر کے قابل تھا

دل میں اک اضطراب باقی ہے ؛ یہ نشانِ شباب باقی ہے (ہوش)

آپ اپنی بے وفائی دیکھئے ؛ ہم سے اور ایسی رُکھائی دیکھئے (صبا)

تیری گلی میں میں نہ پھروں اور صبا چلے ؛ یوں ہی خدا جو چاہے تو بندہ کا کیا چلے (درد)

نہیں ہے چاہ بھلی اتنی بھی دعا کر میر ؛ کہ اب جو دیکھوں اُسے میں بہت نہ پیار آئے (میر)

کہنے لگی جب میں کالج میں پڑھتی تھی تو ہماری پرنسپل نے جو ایک انگریز خاتون اور کیمبرج یونیورسٹی کی ایم۔اے تھیں ایک دن بتایا تھا کہ بعض فلسفیوں کا خیال ہے کہ خدا نے زبان انسان کو اس لئے دی ہے تاکہ وہ اپنے خیالات اور جذبات کو چھپا سکے میں سوچ رہی تھی کہ کیا آپ بھی اُنھیں لوگوں میں سے ہیں میں نے کہا کاش آپ کی بدگمانی صحیح ہوتی اور میں اس کا مستحق ہوتا۔ مگر یہاں تو یہ حال ہے کہ ؎

مثلِ نَے ہر استخواں میں درد کی آواز ہے ؛ کچھ نہیں معلوم یارب سوز ہے یا ساز ہے (میر سوز)

میں اور وہ دونوں ایک ہی سوفے پر بیٹھے ہوئے تھے اور میرے سگار کا دُھواں اُڑ کر اُسکی طرف جارہا تھا میں سوفے پر سے اُٹھ کر برابر کی کرسی پر بیٹھ گیا اور دُھویں کی زحمت کی اُس سے معذرت کی عورتوں پر بعض چھوٹی چھوٹی باتوں کا بڑا گہرا اثر ہوتا ہے میری یہ بات اس کو بہت پسند آئی کہنے لگی نہیں مجھے کچھ تکلیف نہیں ہے آپ شوق سے سگار پیجیے۔ میں نے میر کے یہ دو شعر پڑھے ؎

دور بیٹھا غبار میرؔ اُن سے ٭ عشق بن یہ ادب نہیں ہوتا

سوندیم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی ٭ کوسوں اُس کی اَور گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا

میرا مطلب سمجھ گئی مگر بات یہ کہہ کر ٹالی۔ میر صاحب کا کمال دیکھیے چھوٹی بحر ہو یا بڑی جو مضمون باندھتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لئے وہی بحر سب سے بہتر ہے لفظیں کیا ہیں نگینے جڑے ہیں اور نے کیا مزہ دیا ہے اُس کی جگہ دوسرا لفظ نہیں آ سکتا مگر یہ لفظ تو اب متروک ہے۔ میں نے کہا آپ کا خیال صحیح ہے میر کے زمانہ کے بہت سے الفاظ اب متروک ہیں یہ لفظ بھی اُنھیں متروکات میں سے ہے جیسا آپ نے تھوڑی دیر ہوئی فرمایا تھا زبان کی اصلاح۔ صفائی اور شستگی کے لئے ہم سب لکھنؤ کے اساتذۂ فن کے احسان سے کبھی سُبکدوش نہیں ہو سکتے۔ ہنسکر بولی آج سارا دن آپ شعر ہی پڑھیں گے بات چیت کے لئے کوئی اور مضمون نہیں رہا۔ میں نے کہا معاف کیجئے سیکڑوں ہزاروں واقعات گذر رہے ہیں۔ زار روس تخت سے اُتار دیئے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ بالشویکوں نے اُنھیں اور اُن کے خاندان کو قتل کر دیا۔ سابق قیصر جرمنی کا شغل آج کل یہ ہے کہ درخت کاٹتے اور لکڑیاں پھاڑتے ہیں۔ مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم نے خلافت کمیٹی کے وفد کو شرف باریابی عطا کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ مہاتما گاندھی کا دعویٰ ہے کہ وہ مولانا شوکت علی کی جیب میں رہتے ہیں جہاں سے نکل کر مہاتما جی دہلی کی جامع مسجد کے منبر پر جلوہ گر ہوتے اور نمازیوں کو تلقین کرتے ہیں کہ شعر۔

زاہد وہ دن سے چرچا حق پرستی کا ہوا ٭ ورنہ کعبہ میں سدا ذکر صنم ہوتا رہا

ہجرت کا زور شور ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سوائے علمائے کرام کی مقدس جماعت کے جن کی فہرست میں مولانا شوکت علی کا نام آجکل اونچا بلکہ بہت اونچا یعنی دوسرے نمبر پر ہے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس دار الحرب (ملک ہند) کو چھوڑ کر کسی دار الاسلام میں پناہ لے۔ مہاجر کی سہولت کے خیال سے اُس کی جائداد اور کاروبار ٹھکانے لگانے کی اہم خدمت خلافت کمیٹی نے اپنے ذمہ لی ہے۔ پریزیڈنٹ ولسن کے مشہور چودہ نکات نے سادہ دل لوگوں کی نظر میں چودہ طبق روشن کر دیئے

سلہ اور کے معنی ہیں طرف۔ جانب۔ سمت

تھے اب پھر وہی حال ہے کہ چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات۔ خود پریذیڈنٹ ولسن کو دن میں تارے نظر آ رہے ہیں یعنی اہل امریکہ پریزیڈنٹ موصوف کی سخت مخالفت کر رہے ہیں۔ دُنیا کے یہ سب اہم مسئلے ہیں لیکن ان سب پر مقدم اپنا معاملہ ہے یعنی ؎

یہ بیکسی کا ہے عالم کہ سرگزشت اپنی ؏ کوئی سُنے نہ سُنے ہم سُنائے جاتے ہیں (اثر لکھنوی)

گھنٹہ بھر تک بڑی پُرلطف صحبت رہی وہ بڑی آن بان والی تھی صاف بتایا کہ چوری چھپے کی مُلاقات مجھے پسند نہیں ہے میں نے کہا اس کا علاج آسانی سے ہو سکتا ہے شہر میں ایک اچھا مکان کرایہ پر لینے سے یہ دقت رفع ہو سکتی ہے۔ سنیچر کی شام یا اتوار کے سہ پہر کو وہاں تشریف لائیے دو گھڑی ہنس بول لیں گے ساتھ چلے چلیں گے وہاں سے کوٹھی پر آئیے اور بیگم سے ملئے اگر کسی اور دن آپ آنا چاہیں تو دو سطر کا خط ڈاک میں میرے نام بھیج دیجئے میری تجویز منظور کی شہر میں مکان کا انتظام ہو گیا ہفتہ میں ایک دفعہ ضرور ملاقات ہوتی تھی بڑی خوبی کی عورت تھی سینہ میں جذبات کا طوفان برپا رہتا تھا مگر مجھ پر ظاہر نہ ہونے دیتی تھی جو کچھ کہنا ہوتا صاف نہ کہتی اشارہ کنایہ سے کام لیتی کبھی موقعہ کا کوئی شعر پڑھ دیتی ہنس کر کہا کرتی تھی کہ یہ طریقہ میں نے آپ سے سیکھا ہے۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا آپ ساڑی بھی پہنتی ہیں یا نہیں جواب دیا جب وہ (شوہر) زندہ تھے اکثر پہنتی تھی اب بہت کم پہنتی ہوں۔ بھائی جان روشن خیال ہیں انہیں تو کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن مسلمانوں میں اب بہت سے طریقے ہندوؤں کے رائج ہیں مغل بادشاہ ہندو راجاؤں کی بیٹیاں بیاہ کر لائے راجپوت شہزادیاں اپنے ساتھ میکے کی ریت رسم لائیں بیوہ دوسرا عقد نہ کرے۔ رنگین کپڑے نہ پہنے۔ مہندی اور عطر نہ لگائے میلی کچیلی رہے کھانا جو مل جائے کھالے۔ غور کیجئے اس سے تو ستی کی رسم ہی اچھی تھی ایک مرتبہ ہی آگ کے دریا میں سے گذر کر بیڑا پار ہو جاتا تھا ملکی رسم و رواج نے بیوہ کی زندگی کو تپ دق کی بیماری بنا رکھا ہے جو عمر بھر جلا جلا کر اُس کا خون چوستی ہے۔" سات آٹھ دن بعد میں نے چار ساڑیاں اور چھ سات بلاؤس[1] اور جمپر[2] پیش کئے جس کے

---

[1] ویسٹ انگریزی وضع کے زنانہ کرتے۔ ... وس اور زنانہ کوٹ کو جمپر کہتے ہیں۔ ہمارے ملک کی خواتین بلاؤس یا جمپر کو ساڑی کے ساتھ پہنتی ہیں۔ بلاؤس اور جمپر میں کبھی پوری آستین ہوتی ہے کبھی آدھی اور کبھی آستین بالکل نہیں ہوتی آستین کا رکھنا نہ ہونا پہننے والی کے مذاق پر منحصر ہے۔

لینے سے اُس نے یہ کہہ کر قطعی انکار کر دیا کہ میرے آپ کے مراسم اُس وقت تک ہی قائم رہ سکتے ہیں جب تک
اُس میں ذاتی غرض شامل نہ ہو خدا کی گنہگار ہیں اب بھی ہوں۔ وہ سب دیکھتا اور اپنی ساری مخلوق کا
حال جانتا ہے مجھے سزا دے تو یہ اُس کی معدلت ہے بخش دے تو شانِ رحمت ہے۔ خیر یہ معاملہ تو میرے
اور اُس ذات اقدس کے درمیان ہے جس نے مجھے پیدا کیا اور جس کے قبضہٗ قدرت میں میری جان ہے
مگر سنئے محبت کے آئینہ کو سونے چاندی کی آلائش سے ہمیشہ زنگ لگ جاتا ہے آپ کے دئے ہوئے
کپڑے پہن کر میں خود اپنی نظر میں مجرم دکھائی دوں گی۔ اگر آپ کو ساڑی پسند ہے تو میں اپنے کپڑوں
میں سے ساڑیاں نکال کر کبھی کبھی پہن لیا کروں گی۔ میرے پیش کئے ہوئے کپڑے اس غیور خاتون کو
نہ لینا تھے نہ لئے۔ جب میں کوئی تحفہ پیش کرتا تو یہی جواب ملتا "آپ اپنے پاس رکھ لیجئے۔ مجھے ابھی
ضرورت نہیں ہے جب ضرورت ہوگی میں خود مانگ لوں گی"۔ تین سال میں بہزار منت وسماجت
اُس نے چار پانچ تحفے لئے ہوں گے۔ مجھے اُس سے محبت تھی جوں جوں اُس کے عادات وخصائل
سے مجھے زیادہ واقفیت ہوتی گئی محبت بڑھتی گئی کسی ہفتہ میں ملاقات نہ ہوتی تو میں نہایت بےچین
رہتا تھا سچ تو یہ ہے کہ اگر دو جورو والوں کا حشر میں اپنی آنکھ سے نہ دیکھ چکا ہوتا تو اُس سے نکاح
کر لیتا بیگم کی نظر میں میں گشتنی اور گردن زدنی ضرور قرار پاتا مگر خاندانی بیویوں کی قوتِ عفو وتحمل
کی کیا تعریف کی جائے مہینہ ڈیڑھ مہینے میں بیگم کے غصہ کی آگ دھیمی پڑ جاتی۔ مجھ کو تو معافی کا
پروانہ عطا ہو جاتا لیکن میں جانتا تھا کہ سیج کی مکھی بھی بُری ہوتی ہے یہاں تو خود بیگم کی سہیلی
جس کے ساتھ بیگم نے سوائے بھلائی کے کوئی بُرائی نہیں کی تھی آدھی سیج کی حقدار بن جاتی اس لئے
بیگم عمر بھر اس کی صورت دیکھنے کی روادار نہ ہوتیں اور میری بقیہ عمر بیگم کے سامنے اُن کی ہاں میں ہاں
ملانے اور اُن کے بیٹھ پیچھے نئی نویلی کی ناز برداری میں صرف ہو جاتی۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے وہی
کیا جو ان حالات میں ہر ذی شعور انسان کو کرنا چاہیئے یعنی دوسرے نکاح کے خیال کو دل سے
بالکل نکال ڈالا۔

ایک دن کہنے لگی میں جانتی ہوں کہ آپ میری مدد کرنا چاہتے ہیں ایک کام کیجئے اگر ہو سکے تو البتہ

انتظام کر دیجئے کہ مجھے کسی سکول میں معلّمہ کی جگہ مل جائے۔ بھائی جان مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں اور میرا
اور میرے بچوں کا سارا خرچ اٹھاتے ہیں بھابی جان بھی بڑی نیک مزاج ہیں میرے بچوں کو اپنی
اولاد کی طرح سمجھتی ہیں مجھے ان کے گھر رہتے ڈیڑھ برس ہونے آیا۔ مگر آئندہ کے لئے اپنا اور اپنے بچوں کا
بار اُن پر ڈالنا نہیں چاہتی ہر چاہنے والے کا سینہ محشرستان خیال ہوتا ہے اُس کے جذبۂ خودداری
نے مجھے بے تاب کر دیا اور مصرعہ۔ دل[1] کچھ اس صورت سے تڑپا مجھ کو پیار آ ہی گیا۔ بولی آپکو کیوں
تعجب ہوا جس آدمی میں خودداری نہ ہو میرے نزدیک تو وہ انسان نہیں ہے۔ میں نے کہا کاش ہمارے
ملک کے تعلیمیافتہ عورت اور مرد آپ کی طرح عزّتِ نفس کی حرمت کرتے۔ بیگم لڑکیوں کے کالج کی
انتظامیہ کمیٹی کی ممبر ہیں اور خدا کے فضل سے کالج کے معاملات میں اُن کی رائے اکثر مانی جاتی ہے
آپ اُن سے ذکر کر دیجئے باقی میں دیکھ لوں گا اُس نے بیگم سے تذکرہ کیا بیگم تو اُس کا دم بھرتی تھیں
ایک روز مجھ سے کہنے لگیں تم نے کبھی یہ بھی سوچا کہ میری سہیلی کی گذر کیسے ہوتی ہے۔ آپ ہے اور
دو بچے ہیں بھائی کی تنخواہ پر سب کی گذر ہے۔ بھائی بھی اللہ رکھے صاحبِ اولاد ہے۔ یہ لڑکی
بڑی بات والی ہے کسی کا احسان لینا نہیں چاہتی۔ میں نے انجان بن کر کہا تھوڑی بہت مالی
مدد تو تم بھی کر سکتی ہو۔ بگڑ کر بولیں تمہاری عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں جو سگے بھائی کا احسان لینا نہیں
چاہتی وہ میرا روپیہ لے لیگی مردوں کا عجیب حال ہے اپنے کو افلاطون سمجھتے ہیں سمجھ خاک بھی
نہیں ہوتی۔ بیگم کے مزاج کا پارہ اونچا دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ میری دلربا کا کام اب بن جائے گا
میں نے کہا میری سمجھ میں تو کوئی ترکیب نہیں آتی۔ آخر وہ کیا چاہتی ہے۔ جواب دیا کسی سکول
یا کالج میں معلّمہ کی جگہ پر اُس کا تقرر ہو جائے تو بہت اچھا ہے۔ میں نے کہا وہ ٹائپ کرنا نہیں

---

[1] حضرت جگر کا شعر ہے ؎ کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا ؎ دل کچھ اس صورت سے تڑپا ان کو پیار آ ہی گیا
پہلا مصرعہ اس لئے نظر انداز کیا گیا کہ اس قصّہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ مصرعِ ثانی میں ایک لفظ کی
جو ترمیم میں نے کی ہے اس میں معشوق کو پیار آنے کے بجائے عاشق کو پیار آیا۔ بات تو وہی ٹھیک ہے جو جگر نے کہی
ہے اور ندرت بھی اُسی میں ہے مگر عاشق کا جذبۂ بے اختیار کس کے روکے رُک سکتا ہے۔

جانتی ورنہ انگریزی کا کام تو میرے دفتر میں بھی کافی ہے۔ کہنے لگیں آپ اُس غریب کے حال پر کرم کیجئے ہمارے گھر اُس کا ہر روز آنا مناسب نہیں ہے نہ معلوم دنیا کیا سمجھے اور بھائی راضی ہو یا نہ ہو بالآخر بیگم نے اور میں نے مشورہ کرکے اُسے لڑکیوں کے کالج میں سوا سو روپیہ ماہوار کی جگہ دلوادی۔ وہ میری بڑی احسان مند ہوئی میں نے کہا سب کیا دھرا بیگم کا ہے اُن کا شکریہ ادا کیجئے میں نے تو صرف بیگم کی ہاں میں ہاں ملائی ہے۔ کچھ عرصہ بعد میں نے بیگم سے کہا اب تو تمہاری سہیلی برسرکار ہے اس کی شادی کیوں نہ کرادو میری رائے پسند آئی محکمۂ حساب کتاب (Indian audit & accounts) میں ایک مسلمان گریجویٹ ملازم تھا تین سو روپیہ تنخواہ تھی بیوی کا انتقال ہوچکا تھا تین بچے چھوڑے تھے وہ شادی کرنا چاہتا تھا بیگم کی ایک سہیلی کے ذریعہ سے بات چیت طے ہوئی اور بھائی کے اور ہم سب کے مشورہ سے اُس کا نکاح ہوگیا بیگم نے چار سو روپیہ کا جڑاؤ ہار تحفہ میں دیا۔ آخری ملاقات کا نقش میرے دل سے کبھی نہیں ہٹ سکتا اُس دن مجھے معلوم ہوا کہ عورت کے جذبات کا تلاطم شدت میں سمندر کے طوفان سے کم نہیں ہے۔ شادی کے بعد بھی وہ کبھی کبھی ہمارے گھر آتی تھی مگر مجھ سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ میں نے شادی اس لئے کرائی کہ اس سے دوستی رکھنے میں میرا تو فائدہ تھا مگر وہ تباہ و برباد ہوجاتی۔ بلکہ رسم و رواج کا یہ حال ہے کہ بن بیاہے مرد اور عورت کے باہم اگر محبت ہو تو مرد زیادہ قابل الزام نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن رائے عامہ کا سارا نزلہ عضو ضعیف یعنی عورت کی طرف رجوع ہوتا ہے یہ بڑی بے انصافی ہے۔ مرزا رسوا کہتے ہیں ؎

لذت معصیتِ عشق نہ پوچھ ٭ خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی

میں لذت معصیت عشق کو بڑی محبوب بلا سمجھتا ہوں اور اب اُس کی یاد سے دل بہلاتا ہوں۔

ساتویں تصویر۔ ساتویں دوست انگریزی گورنمنٹ کے بڑے معزز عہدے پر ممتاز تھے۔ انگریزی، اُردو، فارسی تینوں زبانوں میں ید طولیٰ رکھتے تھے سالانہ کنووکیشن کے موقعہ پر کئی یونیورسٹیوں کے طلباء کو خطاب کرچکے تھے اعلیٰ عہدہ پر پہونچ جانے کے باوجود بڑے سادہ مزاج تھے سینہ پر ہاتھ رکھ کر درد دل کی

داستان اس طرح بیان کرنے لگے ؎

مرا یارے ست سنگیں دل ستمگر سست پیمانے ؛ قیامت قامتے زنار دارے نامسلمانے

ترجمہ۔ میرے محبوب کے سینہ میں دل کی جگہ پتھر ہے عاشقوں کے ستانے میں اُسے لطف آتا ہے اُس کا وعدہ کبھی پورا نہیں ہوتا۔ اُس کے قد پر نظر ڈالئے تو قیامت سامنے آکھڑی ہوتی ہے اُس کا زنار کمند کا کام دیتا ہے غرضکہ میرے صنم پرست صنم کی نرالی شان ہے۔

میں نے جس سے چاہت کی اُسے برسوں نباہا اور سوائے ایک جیلہ جو کے جس کی یہ کہانی ہے کسی نے میرے ساتھ بے وفائی نہیں کی۔ جس سے دل لگایا اُسے صاف بتا دیا کہ ؎

دل تابع کشش تھا کشش تابع جمال ؛ ہاں ہاں محبت آپ سے کی اور ضرور کی

اُن وفا کیشوں کا احسان عمر بھر مانوں گا جو مطلوب ہونے کے باوجود میری طالب ہیں۔ کب کی بات ہے کہاں کی بات ہے اور کس کا ذکر ہے یہ سب باتیں منظر عام پر نہیں لائی جا سکتیں گورا رنگ، سڈول جسم، آنکھیں بڑی تو نہ تھیں مگر ان میں بلا کی کشش تھی۔ طبیعت کی متانت اور سنجیدگی پر شوخی غالب تھی بعض عورتوں کا حُسن تو غیر معمولی نہیں ہوتا مگر ادا کچھ ایسی ہوتی ہے کہ ملنے والا بے قابو ہو جائے انگریزی میں اس ادا کا نام مرد و عورت کی باہمی کشش

Sex attraction ہے فارسی شاعری کو عاشق کی خوبیوں میں صرف وفا سے سروکار ہے باقی اللہ اللہ خیر صلا۔ مگر اس میں کلام نہیں کہ یہ کشش مرد میں بھی ہو سکتی ہے ہم ایک دوسرے کو عرصہ سے جانتے تھے مگر ملنے جلنے کا زیادہ اتفاق نہیں ہوا تھا۔ عجیب حالات میں ملاقات ہوئی، یہ بتانا ذرا مشکل ہے کہ ابتدا اُس کی طرف سے ہوئی یا میری، غالباً مصرعہ۔ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ والا مضمون تھا بڑی عالی خاندان تھی نامی گرامی اور دولتمند گھرانے میں پیدا ہونا دودھاری تلوار ہے جہاں اُس سے بہت سے فائدے پہنچتے ہیں وہاں بعض اوقات نقصان بھی پہنچ جاتا ہے۔ اُسے اپنے خاندانی اعزاز پر بڑا ناز تھا خاوند سے بھی بگاڑ اسی احساس برتری نے کرایا تھا میر تقی مرحوم جس طرح شعر پڑھ کر سُناتے تھے اُس کی

نسبت مولوی محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ شعر پڑھتے تھے اور مُنہ پھیر لیتے تھے یہی کیفیت بسا اوقات اس تنک مزاج خاتون کی ہوتی تھی خلوت میں بھی شان بے نیازی نکلتی تھی، کبھی کبھی اُس کا دل گرما جاتا تھا تاہم اکثر اوقات بقول اکبر الٰہ آبادی برف کی قاش ہی رہتا تھا۔ جب بے تکلفی ہو[1] تو مجھے معلوم ہوا کہ مصرعہ۔ اِک آفتِ جہاں ہے لگانے بجھانے میں۔ ایک دن کہنے لگی اگر میرے تمہارے دل مل جائیں تو مسلمان ہونے اور تمہارے ساتھ شادی کرنے کے لئے تیار ہوں۔ میں نے جواب دیا جلدی کیا ہے پہلے یہ تو دیکھ لو کہ میرا تمہارا نباہ بھی ہو سکتا ہے یا نہیں مسلمان ہونے کی ایک ہی ہوئی میں تمہارا چاہنے والا ہوں۔ اسلامی مشنری (مُبلّغ) انہیں بھی مردوں کو خود غرض اور بے وفا سمجھتی تھی۔ شراب پیتی تھی نشہ تو کم ہوتا تھا مگر اُس کے سرور میں بڑے مزے کی باتیں کرتی تھی۔ انگریزی خوب بولتی تھی، معاملات کو سمجھتی تھی لیکن وسیع نظر نہ رکھتی تھی۔ کچھ زمانہ اِس طرح گزرا اور مجھے معلوم ہو گیا کہ ؎

اس بلائے جاں سے آتش دیکھئے کیونکر بنے ٭ دل سوا شیشے سے نازک دل سے نازک خُو دوست

غیروں کے ساتھ اُسے گھوڑ دوڑ میں بھی میں نے کبھی کبھی دیکھا۔ ناگوار تو مجھے ہوا مگر کچھ کہنا میں نے مناسب نہ سمجھا۔ ایک مرتبہ فرمائش کی کہ ایک دن کے لئے مجھے کہیں باہر لے چلو یہاں پڑے پڑے جی اُکتا گیا ہے۔ یہ سُن کر مجھے بڑا تعجب ہوا اُس کا دماغ آسمان پہ رہتا تھا آج جو میں نے اُس دماغ دار کو کرۂ زمین پہ پایا تو کھٹکا کہ ؎

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام ٭ ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں (غالب)

تاہم اندھا کیا چاہے دو آنکھیں میں نے کہا ضرور باہر چلیں گے۔ چلّے کی سردی تھی جنگ کا زمانہ تھا اور جہاں ہم تھے وہاں موٹر ملنے میں دشواریاں ہوتی تھیں میری موٹر کی اُس زمانے میں مرمّت ہو رہی تھی بہر نہج میں نے موٹر کا انتظام کیا روانگی کا وقت آیا اور موٹر اس سیماب مجسم کی قیام گاہ پہ حاضر کر دی گئی۔ جوں جوں وقت گذرتا جاتا تھا میری بے تابی بڑھتی جاتی تھی آنکھیں پھاٹک پہ لگی ہوئی تھیں کہ پیام آیا میری طبیعت خراب ہے افسوس ہے میں آپ کے

ساتھ نہیں چل سکتی"۔ میری مایوسی کا عالم نہ پوچھئے ؎

خیال آرزو ہی تھا کہ یاس نے یہ دی خبر ٭ وہ کعبہ تیرا ڈھے گیا ابھی جو بن چکا نہ تھا

اب اس ستم ظریفی کو دیکھئے شام کے وقت دریافت حال کے لئے تشریف لائیں میں سمجھ گیا کہ لگاوٹ (نیچے مہرانی) کی باتیں کرنے اور مجھے اپنے دام میں مبتلا رکھنے کے لئے قدم رنجہ فرمایا ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے مصرعہ۔ سنگ است بجائے خویشتن سنگ۔ ترجمہ۔ پتھر تو اپنی جگہ پتھر ہی رہے گا۔ میں اس آفت جان سے بچ کے کمرے میں ملا کرتا تھا اُس روز میں نے گول کمرے میں ملاقات کی اور بغیر ضرورت کوئی نہ کوئی بہانہ نکال کر کئی مرتبہ نوکر کو بُلایا تاکہ خلوت کا موقع نہ ملے۔ پہلے میرے چہرے کی طرف بغور دیکھا پھر وعدہ خلافی کی معذرت شروع کی اب اس شان دلربائی کو دیکھئے تھی تو معذرت مگر ہر ہر لفظ سے ٹپکتا تھا کہ بے قصور میں بھی نہیں ہوں معلوم ہوتا تھا اس جھگڑے کو اس طرح چُکانا چاہتی ہیں کہ پچاس فی صدی فردگذاشت اُن کی اور پچاس فی صدی تقصیر میری مان لی جائے۔ میں نے میر کا شعر پڑھا ؎

میر صاحب ہی چوکے اے بدعہد ٭ ورنہ دینا تھا دل قسم لے کر

واقف ملتانی کا یہ شعر بھی میں نے سُنایا اور توڑ مروڑ کر اُنہیں مطلب سمجھایا ؎

مکدر گر نہ گردی با تو گویم ٭ کہ با مُشت غبار من چہ کردی

ترجمہ۔ اگر خفا نہ ہو تو ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ یہ بتاؤ کہ مجھ غریب کی مُٹھی بھر ہڈیوں کو تم نے کھلونا کیوں بنا رکھا ہے۔

ارشاد ہوا تمہیں شعر تو بہت یاد ہیں مگر یہ شعر موقعہ کا نہیں ہے۔ مجھے تمہاری خاطر منظور نہ ہوتی تو اس وقت کیوں آتی۔ تم تو ذرا سی بات کا بتنگڑ بناتے ہو باہر کسی اور دن چلیں گے۔ میں نے آرزو لکھنوی کا یہ شعر پڑھا ؎

بھولے بن کر حال نہ پوچھو، بہتے ہیں اشک تو بہنے دو
جس سے بڑھے بے چینی دل کی، ایسی تسلی رہنے دو

بگڑ کر بولیں کچھ عرصہ ہوا تم نے فارسی کا ایک مصرعہ سنایا تھا۔ میں فارسی نہیں جانتی۔ مصرعہ تو یاد رہا نہیں مطلب یہ تھا کہ جو آدمی بات بات میں بگڑے اُس کا علاج کسی کے پاس نہیں ہے۔ (مصرعہ۔ ہر دم آزردگی غیر سبب را چہ علاج۔ کی طرف اشارہ تھا) اور ہاں یہ تو بتاؤ کہ رسوا لکھنوی کے اس شعر کا کیا مطلب ہے ؎

کسی طرح سے ہو تسکین شوق کیسا رشک ٭ ملیں گے آج ہم اُن سے رقیب سے مِل کے

دو تین ہفتے ہوئے ایک اور شعر بھی تم نے مجھے سنایا تھا ؎

کیوں کر یہ کہیں منت اعدا نہ کریں گے ٭ کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کرینگے (میر)

اگر ان شعروں کا مطلب وہی ہے جو میں سمجھی ہوں تو تم اُس پر عمل کیوں نہیں کرتے۔ میرا دل پہلے ہی بیٹھ چکا تھا اس سوال کے یہ معنی تھے کہ وہ غیروں سے ملیں میں دیکھا کروں اور کچھ نہ کہوں۔ ممکن ہے اب سے پچاس برس بعد ہمارے ملک کے معاشرتی طور طریقے بدل جائیں اور مہر و محبت کے لئے ایسی کمپنیاں قائم کی جائیں جن کا سرمایہ مشترک ہو یعنی جوائنٹ اسٹاک کمپنی۔ اگر یہی لیل و نہار رہے تو سنہ ۱۹۹۳ء کے عاشق مزاج اور حسن پرست حضرات دیاشنکر نسیم کے اس شعر پر جو انہوں نے اپنی مشہور مثنوی میں ایک بالکل مختلف موقعہ پر لکھا ہے کاربند نظر آئیں گے۔ شعر

پیاری کا جو اپنے ہو پیارا ٭ کیونکر ستم اُس پہ ہو گوارا

آج بھی انگریزی داں ہندوستانیوں کے حلقوں میں بعض اوقات اُس غیر فطری رواداری کی مثالیں ملتی ہیں جو اب تک براعظم ایشیا میں بُری اور بہت بُری سمجھی جاتی ہے۔ لیکن میں تو ایسی مخلوق کو خواہ وہ معشوق ہو یا عاشق بے خوشبو کا پھول، بے بہار کا چمن، بے روشنی کا چراغ، بے حدت کا انگارہ اور بے پرواز کا پرند سمجھتا ہوں اُن کے طنز آمیز سوال نے میرا دل توڑ دیا کچھ پتہ نہ چلا کہ کیا کہہ رہا ہوں زبان سے صرف اتنا نکلا "پریم کا دیا آج سویرے بجھ گیا اب تمہارے بالے بل سکتا ہے نہ میرے۔ پرمیشور تمہیں سکھی رکھے۔" اس اعلان جنگ کے بعد خط لکھنے کا کیا موقع تھا۔ میں نے خط لکھا نہ پھر ملاقات ہوئی کبھی کبھی دوستوں سے خیریت البتہ معلوم کر لیتا ہوں خدا کرے جہاں رہیں خوش رہیں۔

اپنا حال اب یہ ہے کہ عالم خیال میں اُس سنگدل سے کبھی کبھی اس طرح بات چیت ہو جاتی ہے۔

قطعہ۔ بھاتا ہی نہیں ہے دل کو واللہ۔ کہنا یہ بار بار ترا

کس کا غم تجھ کو کھا گیا ہے۔ تیرا ناداں یار ترا (میر سوز)

اس قصہ نے آٹھویں دوست کو تڑپا دیا کہنے لگے آپ کی داستان ہماری حکایت سے ملتی جلتی ہے۔ وہ تو اپنا قصہ کہنے کے لئے بیتاب تھے مگر رات کے بارہ بجنے والے تھے میں نے کہا بارش ہو چکی ہے خوب سردی ہے چاء اور قہوہ تیار ہے شوق فرمایئے سگرٹ اور سگار اطمینان سے سلگایئے پھر حکایت اور مزہ دے گی۔ سب کو یہ رائے پسند آئی۔ چاء اور قہوہ کا دور شروع ہوا نہ پینے والوں کو بادہ و ساغر کے قدرداں کم ظرف سمجھتے ہیں۔ اس یک طرفہ فیصلہ کی تنقید کا یہ محل نہیں ہے مگر یہ تو میں نے اکثر دیکھا ہے کہ ہم تہی دست یعنی نہ پینے والے چائے کی ایک پیالی میں ہی چھلک اُٹھتے ہیں۔ اب جلسہ میں وہ گرمی پیدا ہو گئی جو بادۂ شبانہ کی سرمستیاں یاد دلاتی تھی۔ آٹھویں صاحب ایک بڑے سرکاری عہدہ سے پنشن لے چکے تھے گرمی کا موسم اکثر شملہ اور کبھی کبھی منصوری میں گزارتے تھے۔ تنک مزاج تھے۔ لیکن اُن کی مہماں نوازی نے تنک مزاجی پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ دنیا کے بہت سے ملکوں کی سیاحت کر چکے تھے اُن کے یہاں کی دعوتوں اور پارٹیوں میں خواتین کی تعداد بسا اوقات مردوں سے زیادہ ہوتی تھی۔ موصوف کے دوستوں میں خواہ وہ کسی صنف کے ہوں بدصورت آدمی مشکل سے ملتا تھا۔ بڑی نفیس طبیعت اور ستھرا مذاق تھا بہت سے اردو فارسی شعر یاد تھے اہل مجلس کو مخاطب کر کے فرمانے لگے شعر

کیوں اہل حشر ہے کوئی نقاد سوز دل ؂ لایا ہوں دل کے داغ نمایاں کئے ہوئے۔ (فانی بدایونی)

دنیا کے سب بڑے مذہبوں کا تذکرہ ہو اگر آپ حضرات دین موسوی کو بھول گئے۔ میری مراقا یہودن تھی احباب اُسے بنی اسرائیل کا چاند کہتے تھے پہلے دوست کی دوست جیسی آنکھیں۔ دوسرے دوست کی محبوبہ یعنی مختار عام کی سرکار کی سی بھولی صورت۔ ناز و غمزہ ادا و شوخی میں اینگلو انڈین خاتون سے بھی سوا۔ شان دلبری اور لباس کی خوش سلیقگی کا کیا بیان کروں وہ جب مختلف رنگوں کا لباس زیب تن کر کے میرے ساتھ سینما جاتی تھی تو دیکھنے والوں کو معلوم ہوتا تھا گویا دھنک کا ٹکڑا زمین پر اُتر آیا ہے اور بجلی کی

اُس قوت سے جس کی ماہیت ابھی سائنس کے عالموں سے مخفی ہے سڑک پر چکور کی چال چل رہا ہے۔ امان علی سحؔر نے اپنے ایک شعر میں دو رنگوں کا سماں باندھا ہے ؎

گھٹا اور بجلی میں ہے آج چوٹ ٭ ہے آبی دوپٹے میں لچکے کی گوٹ

میری برق وش کبھی کبھی میری خاطر سے ساڑی بھی پہنتی تھی اور اُس کی ساڑی اور بلاؤس میں ساتوں رنگ ہوتے تھے بھلا ان کے آگے آبی دوپٹے میں لچکے کی گوٹ اس زمانہ میں کیا نظر میں سماتی بشروع شروع میں اُس نے میرے ساتھ پیمان وفا ایسا ہی نباہا جیسا میرے دوست سابق ٹھیکہ دار صاحب کی محبوبہ نے۔ کج ادائی اور بے اعتنائی میں اُس گل رعنا سے کم نہ تھی جس نے شادی کا سبز باغ دکھا کر میرے دوست مسٹر...... کے چمن آرزو کو آگ لگائی۔ میرے دوست نے اپنے قصہ کو یہ کہہ کر ختم کیا ہے ؎

کس کا غم مجھ کو کھا گیا ہے ٭ تیرا ناداں یار تیرا۔ اُن کی آس ابھی نہیں ٹوٹی ہے اور ایشیائی عاشق کی شانِ وفا کا اقتضا بھی یہی ہے۔ تاہم میں تو اپنے محترم دوست کو یہی مشورہ دوں گا۔

قطعہ۔ معمور ہے خدا کی عنایت سے مے کدہ ٭ ساقی اگر نہیں ہے نہ ہو مے سے کام ہے

بیتابؔ پی، تجھے بھی خدا نے دئیے ہیں ہاتھ ٭ یہ خم ہے، یہ سبو ہے، یہ شیشہ، یہ جام ہے

(عباس علی خاں بیتابؔ رامپوری)

پری سے ملاقات کا حال سنیئے۔ ایک بڑے شہر میں رات کے وقت ایک دوست نے خوب بڑی بوفے[1] دعوت

---

[1] اسپتو نئی دنیا ہے اور نئے طریقے۔ کھانے کی دعوتوں میں پہلے میز کرسی لگ جاتی تھی اور مہمان اطمینان سے بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے اب یہ نیا طریقہ ایجاد ہوا ہے کہ میز پر قابوں میں کھانا چن دیا جاتا ہے کرسیوں کی نشست نہیں ہوتی کھانے کی میز کے قریب چینی کی خالی رکابیوں یعنی پلیٹوں کا انبار ہوتا ہے رکابیوں کی طرف بڑھئے تو نوکر ایک خالی رکابی آپ کے حوالہ کردے گا رکابی ہاتھ میں لیکر کھانے کی میز پر سے جو کھانا یا کھانے مرغوب ہوں چمچہ سے اپنی پلیٹ میں لے لیجئے اور وہاں سے ہٹ کر (تاکہ آپ دوسرے کھانا لینے والوں کے سد راہ نہ ہوں) کھڑے کھڑے کھانا شروع کر دیجئے پلیٹ آپکے ہاتھ میں ہوگی اور لقمہ منہ میں۔ پلیٹ رکھنے کے لئے کوئی چیز نہ ملے گی بلکہ پلیٹ کی نگہداشت آپکا فرض ہے اگر پلیٹ پھسلی یا آپ کے ہاتھ سے چھوٹی تو سمجھ لیجئے کہ آپکے کپڑوں کا کیا حشر ہوگا۔ اس قسم کی دعوت کی بڑی صفت یہ ہے کہ اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ یعنی جو چاہے لیجئے اور کھائیے انگریزی میں ایسی دعوت کو بوفے Buffet کہتے ہیں۔ ایسی دعوتوں کا رواج یورپ میں عرصہ سے ہے ہمارے ملک میں یہ رسم پانچ چھ برس سے آئی ہے اصل میں اس طریقہ کا تعلق کاک ٹیل Cocktail پارٹیوں سے تھا۔ رات کے کھانے میں بوفے کا رواج اس لئے ہوگیا ہے کہ انگریزی طریقہ کی دعوتوں میں میز اور کرسیوں سے بہت سی جگہ گھر جاتی ہے جس کے باعث زیادہ مہمان نہیں بلائے جاسکتے۔ بوفے میں بڑا فائدہ یہ ہے کہ معمولی کمرہ میں بھی بیس پچیس مہمان آسکتے ہیں۔

کا اہتمام کیا۔ بوفے دعوت کو کاک ٹیل[1] پارٹی کی چھوٹی بہن سمجھنا چاہیئے۔ اپریل کا مہینہ تھا اور چاندنی خوب چٹک رہی تھی ایک ہم مشرب نے میری ملاقات اس حور وش سے کرائی آواز تو بڑی شیریں تھی مگر ہم روشنی سے کسی قدر فاصلے پر بیٹھے ہیں اُس کی صورت اچھی طرح نہ دیکھ سکا۔ دو تین دن بعد ایک دوست کے یہاں چائے کی دعوت میں میری اُس کی پھر ملاقات ہوئی بڑی پیاری صورت تھی۔ ملک ہسپانیہ (اسپین) میں پیدا ہوئی اور فرانس میں تربیت پائی۔ فرانسیسی تو مادری زبان تھی اسکے سوا ہسپانوی اور انگریزی بھی خوب بولتی تھی گانے کی شوقین تھی اور بہت اچھا گاتی تھی۔ میں نے اُسے اپنے یہاں کھانے پر بلایا اور کھانے کے بعد ہم دونوں سینما گئے۔ ظالم کی باتوں میں غضب کی لگاوٹ تھی سب کچھ کہتی اور اس کے اثر کو دو فقروں کی گریز میں مٹا دیتی تھی۔ اس شب کو سینما میں جو تصویر دکھائی گئی اس میں گانے کا حصّہ غالب تھا۔ دو تین چیزیں سُن کر تو خاموش رہی مگر جب یہ سلسلہ اور بڑھا تو کہنے لگی کہ انگریزی زبان موسیقی سے مناسبت نہیں رکھتی۔ میں یورپ کی تین زبانیں بلا تکلف بولتی ہوں اور دو تین زبانیں اور سمجھتی ہوں۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ جس نے ہم سب کو پیدا کیا ہے اگر اُس کے سامنے گانا ہو تو اطالوی زبان میں گاؤ۔ اور اگر اُس ذاتِ اقدس سے باتیں کرنی ہوں تو فرانسیسی زبان میں باتیں کرو۔ یہ سُنکر میں نے اُس سے تو کچھ نہ کہا مگر دل میں سمجھ گیا کہ بڑے سلیقے کی خاتون ہے۔ ہم دونوں ایک ہی شہر میں مقیم تھے رفتہ رفتہ مراسم بڑھے اور دوستی ہو گئی۔ دو ڈھائی برس تک دوستی رہی۔ اُس کے سر کے بال بہت لمبے نہایت باریک اور بالکل سیاہ تھے بھنی سرائیل

---

[1] شراب کباب کی دعوت کا نام کاک ٹیل پارٹی ہے۔ مختلف قسم کی شرابیں اور طرح طرح کے انگریزی کباب گزک بڑی بڑی میزوں پر چن دئے جاتے ہیں اور بہت سے نوکر خوانوں میں یہ شرابیں اور گزک لئے پھرتے اور ہر مہمان کے پاس جاتے اور یہ چیزیں پیش کرتے ہیں۔ کاک ٹیل پارٹی عام طور سے دو ڈھائی گھنٹہ تک رہتی ہے اور پینے والے کباب اور گزک کی مدد سے خوب خوب پیتے ہیں۔ یورپ کی کاک ٹیل پارٹیوں میں دو سو سے لیکر ہزار آدمیوں تک کا اجتماع ہوتا ہے دہلی کی کاک ٹیل پارٹیوں میں بھی دو سو ڈھائی سو مہمانوں کا مجمع غیر معمولی بات نہیں ہے۔ جو مہمان ان پارٹیوں میں خوب کھاتے اور پیتے ہیں وہ رات کا کھانا یا دیر سے کھاتے ہیں یا بالکل نہیں کھاتے۔

کے چاندکی کس کس ادا کا ذکر کروں چاندنی رات میں جب وہ اپنی دراز زلفوں کو میرے شانوں پہ بکھیرتی تھی تو مجھے یہ محسوس ہوتا تھا گویا میں اس دنیا میں نہیں کسی اور عالم میں ہوں۔ دل کی بے تابی سے مجبور ہو کر میں نے اُسے چند شعر بھی یاد کرائے تھے ایک شعر یہ تھا ؎

زباں اس کی جو شب بھر مرے دہن میں رہی ؛ تو صبح تک وہی لذّت ہر اک سخن میں رہی

میری جہاں تعیناتی تھی وہ بھی ایک بڑا شہر تھا وہ جب اُس شہر میں آتی تھی تو میری مہمان ہوتی تھی میری رضا جوئی کو مقدم سمجھتی تھی۔ محبت کے چوچلے نرالے ہوتے ہیں۔ یوں تو غالبؔ کا یہ شعر کہ ؎

پڑھتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز ؛ لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

میرے حال پر صادق نہ آتا تھا بلکہ مکتب غم دل میں بخیال خود معلمی کے فرائض انجام دینے کا میں اپنے کو اہل سمجھتا تھا مگر یہاں یہ حالت تھی کہ ؎

بلائے جاں ہے غالبؔ اُس کی ہر بات ؛ عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

مجھے یہ خیال ہو گیا کہ اُسے مجھ سے محبت ہے۔ وہ اُس اُمت میں سے تھی جس نے اپنے نبی کے ساتھ جو کچھ کیا اُس کے حالات مذہبی کتابوں میں درج ہیں۔ قصہ کوتاہ ایک موقع آیا میں نے اُسے محبت کی ترازو میں تولا اور کم وزن بلکہ بہت کم وزن پایا۔ میری پنشن ہو چکی تھی کئی مہینے دل پر جبر کیا پھر نہ رہا گیا ایک دن مجھے اُس سے صاف کہنا پڑا کہ صفی لکھنوی فرماتے ہیں ؎

دل میں رکھئے تو کدورت کہلائے ؛ مُنہ سے نکلے تو شکایت ہو گی

شکایت کرنا بُرا ہے مگر بات دل میں رکھنا اُس سے بھی بُرا ہے۔ مجھے تم سے کئی ضروری باتیں کہنی ہیں جس کے بعد میں نے وہ سب باتیں بصراحت بیان کر دیں۔ طالب کو مطلوب سے ایک ہی شکایت ہوتی ہے اور وہی شکایت مجھے اپنی محبوبہ سے تھی۔ یعنی بقول انیسی شاملو ؎

؎ وفا آموختی از ما بہ کارِ دیگراں کردی ؛ ربودی گوہرے از ما نثارِ دیگراں کردی

ترجمہ۔ وفا کا سبق میں نے تمہیں سکھایا اب وہ سبق غیروں کے کام آ رہا ہے۔ جو بیش بہا موتی تم نے مجھ سے چھینا تھا اب اُسے اوروں کے سر پر نچھاور کر رہے ہو۔

میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ آئندہ میری تمہاری دوستی کا انحصار تمہارے جواب پر ہے۔ وہ بھلا کب ہار ماننے والی تھی اُلٹے الزام مجھ ہی کو دینے لگی۔ بسا اوقات محبّت کا انجام مُفارقت ہوتا ہے بالخصوص جب ایک طرف ایوانِ وفا کی بنیادیں جذبۂ محبت پر قائم ہوں اور دوسری جانب طلسمِ اُلفت کی تعمیر مصلحت وقت اور ذاتی اغراض کے ریت پر ہوئی ہو۔ یہی صورت یہاں بھی پیش آئی مگر میں پنشن یافتہ ہوں اپنے ان دوست کی طرح (ساتویں دوست کیطرف اشارہ کرکے کہا) کسی بڑے عُہدے پر مامور نہیں ہوں جناب کو ابھی آس لگی ہوئی ہے میں اُس بُت سامری فن سے جس کے شعبدوں نے رقیب نوازی کے صحرائے بے برگ و بار کو عرصہ تک میری نظر میں وادیٔ نیل یعنی وفا کیشی کا گلزار بنائے رکھا صفائی نہیں چاہتا۔ میری حالت تو اب یہ ہے کہ بقول جگر مراد آبادی ؎

بلبل ہمہ تن خوں شدہ گل شد ہمہ تن چاک ÷ اے وائے بہاری اگر ایں است بہارے

ترجمہ۔ بلبل کا سارا جسم لہولہان ہے اور گلاب کے پھول کا جگر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے اگر اسی کا نام فصل بہار ہے تو مجھے خاک اُڑانی چاہیئے۔"

میری ڈائری:۔ جب یہ مجلس ختم ہوئی ہے رات کا ایک بج چکا تھا۔ میں نے دوستوں کو رخصت کیا۔ آخر کی دونوں داستانوں سے سب متاثر معلوم ہوتے تھے۔ یہ عجیب بات ہے کہ انسان غم سے بچنا بھی چاہتا ہے اور دوسروں کی داستان غم و درد میں اُسے مزہ بھی آتا ہے۔ اِدھر احباب روانہ ہوئے اُدھر مجھے فکر دامنگیر ہوئی کہ حُسن و محبّت کی یہ آٹھ جیتی جاگتی تصویریں کہیں زمانہ کی دست برد کی نذر نہ ہو جائیں۔ مَیں نے اپنی ڈائری نکالی اور لکھنے بیٹھ گیا۔ میری ڈائری کے اندراجات مختصر ہوتے ہیں لیکن ان حالات کو میں نے کسی قدر تفصیل سے لکھا۔ مصرعہ۔ لطیف بود حکایت دراز تر گفتم۔

مولف بحیثیت پریسیڈنٹ آل انڈیا مسلم لیگ اجلاس بمبئی دسمبر ۱۹۲۴ء

۱۹۳۰ء - مولف پبلک سروس کمیشن کی ممبری کے سرکاری لباس میں

بارہواں باب

اہلِ کمال کی پانچ نسلیں۔ مومن کے ساتھ آزاد کا سلوک۔ مومن کے کلام کا انتخاب۔ میر حسن اور نواب مرزا شوق۔ مغربی شعبدہ بازی کا اثر ہمارے بزرگوں پر۔ اُردو کی ادبی حیثیت۔ چمن اُردو کی باغبانی۔ انگریزی داں جماعت اور اُردو کی خدمت کا جوش۔ اُردو کا سرمایۂ زر قتل۔ ادبی معیار کو قائم رکھنے کی ضرورت۔ اُردو رسم خط۔ حروف ملانیکی دشواریاں اور کتابت کی اصلاح۔ چار تجویزیں۔ اُردو ہندی اور ہندوستانی۔ زبان کا اکھاڑا اور ادب و سیاست کی کشتی۔ تھیٹر اور ڈرامہ نویسی۔ ہندوستان اور سینما۔ ہمارے زمانہ کا مذاق۔

ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سَرا ٭ صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

بڑائی کسے کہتے ہیں | دنیا میں بڑائی اور عظمت کی ہمیشہ قدر ہوئی ہے اور ہمیشہ ہوگی۔ اصلی بڑائی اور عظمت کا جوہر ذاتی قابلیت ہے۔ وصف اضافی اور ہنر ذاتی میں زمین و آسمان کا فرق ہے، حضرت علی مرتضیٰ فرماتے ہیں "مرد وہ ہے جو کہے میں ایسا ہوں نہ وہ جو یہ کہے کہ میرا باپ ایسا تھا"۔ جب تک شخصی حکومت کا دور رہا بادشاہ کا بیٹا بھی بالعموم بادشاہ ہوتا تھا فرمانروا کی حیثیت سے ہر بادشاہ مرجع خلائق۔ ظل الٰہی اور اَن داتا کہلایا جاتا تھا۔ اختیار و اقتدار بادشاہت کا لازمی جزو ہیں۔ عام حالت یہ ہے کہ ہر بادشاہ کو اختیار و اقتدار حاصل ہوتا ہے لیکن یہ ضرور نہیں ہے کہ ہر بادشاہ بڑا آدمی بھی ہو۔ کمال کے لئے کسی خاص علم یا فن یا ہنر مثلاً فرمانروائی، سیاست مُدن۔ تدبیر منزل۔ ہندسہ۔ ہیئت۔ سپہ گری۔ فقہ۔ حدیث۔ شعر و شاعری۔ ادب

تاریخ۔ فلسفہ۔ طبیعیات یا ریاضی کی قید نہیں ہے۔

نامور خاندانوں کے مشہور بادشاہ

دنیا کے جن شاہی خاندانوں میں پے در پے دو یا تین بڑے بادشاہ پیدا ہوئے اُن کی تعداد بہت کم ہے بلاشبہ عرب کی حکومتوں میں یہ فخر سب سے پہلے بنی عباس کو حاصل ہوا۔ ایشیائے کوچک اور روم کے ترکی خاندان میں جو آلِ عثمان کے نام سے مشہور ہے اور ایران کے صفوی خاندان میں متعدّد عالی حوصلہ اور جلیل القدر فرماں روا ایسے گذرے ہیں جن کو تاریخ نے اپنے پہلو میں بڑی عزّت اور احترام کے ساتھ جگہ دی ہے۔ ہندوستان میں یہ عزّت آلِ تیمور کے نصیب میں آئی کہ ہمایوں سے لیکر عالمگیر اوّل تک سلسلہ وار پانچ فرمانروا اس شان و شوکت۔ دبدبہ اور منزلت کے گذرے جن کے عظیم الشان کارناموں سے حسد کی آنکھ میں ہمیشہ خیرگی۔ رشک کے دل میں کبھی تنگی اور کبھی فراخی اور آنے والے ہم مرتبہ انصاف پسند حکمرانوں کی ہمّت میں بلندی۔ حوصلہ میں وسعت اور قوتِ عمل میں مقناطیسی تاثیر پیدا ہو گی۔ جہاں اگلے زمانہ کے بادشاہوں کی ذمہ داری بڑی اہم تھی وہاں یہ آسانی بھی تھی کہ انصاف پسند رعایا خسروِ وقت کے اچھے کاموں کی قدر کرنے میں ذرا پس و پیش نہ کرتی تھی بلکہ ایسے موقعوں پر سکوت کو ناشکر گزاری کا ہم معنی سمجھتی تھی۔ شعر و شاعری اور ادب کی دنیا میں کمال حاصل کرنے کے لئے ایک زمانہ چاہیئے۔ بقول جانؔ صاحب[1]

---

[1] میر یار علی نام۔ جانؔ تخلّص۔ تخلّص کی مُناسبت سے جان صاحب کے نام سے شہرت پائی۔ ریختی کے مُسلّم الثبوت اُستاد تھے۔ جانؔ صاحب کا دیوان یا کلّیات اس قابل نہیں کہ بہو بیٹیوں کو پڑھنے کے لئے دیا جاسکے تاہم ایسے شعر بھی ملیں گے کہ جس کا مزاج چاہے حالی اور آزاد کی رسمی اخلاقی کسوٹی پر کس لے۔ جانؔ صاحب کے دیوان کا مطلع اور دو شعر سُنیئے جو اُن کے مخصوص رنگ میں ہیں مگر کون ہے جو سُنکر لطف اندوز نہ ہو۔ ؎

شان میں اللہ کی مطلع ہو وہ دیوان کا ٭ جیسے بسم اللہ پھاٹک ہے بُوا قرآن کا

سوکن نے پائجامہ پہنا ہے گل بدن کا ٭ پھولوں میں تُل رہا ہے کانٹا مرے چمن کا

اے جانؔ میرے داغوں کی پاتا نہیں اُبھار ٭ ہے جھاڑ کے نکالتا ہر سال مور پنکھ

شعر:- کمال منہ کا نوالا نہیں ہے بی نعمت ؛ خمیر چینی کا بارہ برس میں اُٹھتا ہے

ناموَر شعرا کی پانچ نسلیں یہ عزت بھی ہندوستان کو نصیب ہوئی کہ ایک ہی خاندان میں یکے بعد دیگرے پانچ شاعر یہاں کی خاک سے ایسے اُٹھے جو اپنے اپنے زمانہ کے اربابِ کمال میں شمار کئے جاتے تھے اور جن میں سے دوٗ شعر و شاعری کی صفِ اوّل میں ہمیشہ کرسی نشین رہیں گے اور بقیہ تین میں سے دو کو دوسری صف میں اور

بقیہ صفحہ ۴۳۲ افسوس ہے کہ اس صاحب کمال نے ریختی میں اپنا وقت ضائع کیا تاہم اُردو زبان کی جو بیش قیمت خدمت جان صاحب نے کی وہ قابل تذکرہ ہے۔ ناسخ کے شاگردوں کی استعارہ بندی مضحکہ انگیز حد کو پہنچ گئی تھی کچھ دنوں تک یہ رنگ خوب پھیلا۔ قائل کا شعر ہے:-

چھرّہ چلا فلک پہ بُتِ خانہ جنگ کا ؛ چھوٹا ہے نیل گاؤ پہ کتا تفنگ کا

میر علی اوسط رشک، ناسخ کے ممتاز شاگرد تھے۔ استعارہ سے جو بھونڈا کام رشک نے لیا اُس کی مثال ملاحظہ کیجئے۔ شعر۔ چاول الماس۔ گوشت لختِ جگر ؛ فرقتِ یار میں پلاؤ نہیں۔

جانؔ صاحب اس ادبی بدعت کے سخت مخالف تھے۔ اُنہوں نے متعدد اشعار میں رشک کا مضحکہ اُڑایا ہے۔ ایک شعر یہاں درج کیا جاتا ہے:- ؎

دور سے چھیڑے ہلاؤ نہیں ؛ رشک بیٹھا ہے بن بلاؤ نہیں

(دیکھو حیاتِ جاودانی یعنی سوانح حیات شیخ امیر اللہ تسلیم مرحوم مؤلفہ مولوی ضمیر الدین عرش صفحہ ۴۰)

لکھنؤ کے ناموَر شعرا بھی رشک کی اس جدّت طرازی کے مخالف تھے نتیجہ یہ ہوا کہ رشک اور اُن کے ہم خیال ناکام رہے اور زبان اس نئی زد سے محفوظ رہی۔ جانؔ صاحب کے بعض اشعار میں اُس دور کی بدمذاقی کا صاف حوالہ اور اُس کی شکایت ہے۔ کہتے ہیں:- شعر

معنی کے بدلہ رہ گئی اب شعر میں جگت ؛ اے جانؔ ہنو انگر کھا ہاتھی کے تھان کا

بڑے آزاد خیال تھے۔ شیعہ ہونے کے باوجود متعہ کی حقیقت یوں کھولی ہے:- شعر

نکاحی بیاہی کو چھوڑ بیٹھے متاعی رنڈی بٹھا کے گھر میں ؛ بنایا صاحب امام باڑہ خدا کی مسجد کو تم نے ڈھا کر

پانچویں فرد کو تیسری صف میں کہیں نہ کہیں ضرور جگہ ملے گی۔ اس خوش نصیب خاندان کے مورث میر غلام حسین ضاحک تھے جو مرزا رفیع سودا سے ٹکّر لیتے تھے۔ سوّدا نے تو ہجائیہ نظموں کی ضربیں اُن پہ لگائیں مگر کچھوے کی طرح اُن کے کمال کے پوست نے اُن کی شہرت کی محافظت کی۔ ضاحک اپنے زمانہ کے باکمال شعرا میں شمار کئے جاتے تھے۔ افسوس ہے کہ کلام بہت کم دستیاب ہوتا ہے موصوف کے بیٹے میر حسن کی مثنوی سحرالبیان اُردو کی لاجواب مثنوی ہے۔ مثنوی اسم بامسمیٰ ہے اُس زمانہ کی مثنویوں کی عالیشان عمارت کا سنگ بنیاد جادو کے طلسم۔ آدم زاد سے پریوں کے عشق وہوس کی داستانیں اور جنوں اور دیووں کے بعید از فہم کارنامے ہوا کرتے تھے۔ میر حسن اپنے ماحول سے قدرتی طور پہ متاثر تھے شہزادہ بے نظیر کی سواری کے لئے کل کا گھوڑا بنانا پڑا تاہم مثنوی کی امتیازی شان یہ ہے کہ گو جنوں اور پریوں کا تذکرہ ہے لیکن خود میر حسن کے انداز کلام۔ خوبی بیان شیرینی زبان اور مناظر قدرت اور انسانی جذبات کی جیتی جاگتی تصویروں کا جادو پڑھنے والے کو مسحور کرتا ہے۔ کمال یہ ہے کہ جتنی مرتبہ چاہیئے پڑھیئے ہر بار نیا لطف حاصل ہوتا ہے۔ خلیق نے عشق و تعشق کی خیالی دنیا میں ہوش سنبھالا اور اپنے نتیجہ فکر کی آرائش سے عاشقانہ شاعری کے بازار کی رونق بڑھائی لیکن انجام پہ نظر رکھ کر دنیا کو دین کے ہاتھ پہ فروخت کر دیا اور مرثیہ گوئی کے آسمان پہ ایسا درخشاں تارہ ہو کر چمکے جو پہلے کبھی نظر نہ آیا تھا۔ انیس کے کمال پہ فن شعر و شاعری اُس وقت تک فخر کرے گا جب تک ہماری زبان صفحۂ ہستی پر باقی ہے۔ لسان الحق حضرت انیس کے صاحبزادہ میر خورشید علی نفیس بھی بڑے اچھے مرثیہ گو تھے مگر انیس کا کمال ایسا سوا سو فٹ اونچا عظیم الشان اور گنجان درخت تھا کہ اُس کے آگے پچیس تیس سال پہلے کے ستر اسی فٹ بلندی کے بڑے بڑے درخت پست قامت معلوم ہوتے تھے۔ نفیس کی مرثیہ گوئی کو ایسا پودا سمجھنا چاہیئے جو اس عظیم الشان اور گنجان درخت یعنی انیس کے سایہ میں اُگا جب خلیق اور ضمیر جیسے بڑے بڑے درختوں کی بلندی دیکھنے والوں کی نظر سے گر گئی تو اِس نئے ہرے بھرے پودے یعنی نفیس کے قد کی راستی اور پتوں

کی خوبصورتی اور شادابی پر کون دھیان دیتا۔ اس وقت ان پانچوں باکمال شاعروں یعنی میر ضاحک میر حسن خلیق، انیس اور نفیس کے کلام کا موازنہ مقصود نہیں ہے بلکہ قابلِ تذکرہ بات یہ ہے کہ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ باپ کے کمال کی دستار سر پر رکھنے کا بیٹا بھی اہل ہو۔ یکے بعد دیگرے تین نسلوں کے اہل کمال ہونے کی مثالیں اور بھی کم ملیں گی میر ضاحک کے نصیبوں کا کیا کہنا۔ اُن کی خوش نصیبی گردن بلند کر کے چار دانگ عالم کو دیکھتی مُسکراتی اور دھیمی آواز میں پوچھتی ہے۔ "اے اہل ارض اس کرہ میں جہاں پہلے ہم رہتے تھے کتنے خاندان ایسے ہیں جہاں کمال کی پانچویں[1] پیڑھی آسمان سے یہ کہہ سکے کہ۔ مصرعہ۔

اے فلک دیکھ زمیں پر بھی ستارے نکلے"

مُومن کے ساتھ آزاد کا سلوک

مولوی محمد حسین آزاد نے جو سلوک نظیر اکبر آبادی کے ساتھ کیا اُس کا اجمالی ذکر پچاسویں صفحہ پر ہو چکا ہے۔ نظیر تو آگرہ کے رہنے والے تھے لیکن لطف یہ ہے کہ آزاد نے گھر کے پیروں کو تیل کا ملیدہ بھی نہ دیا۔ آبِ حیات کے پہلے ایڈیشن

---

[1] ابن خلدون عالم اسلام کے بڑے بلند پایہ مورخ تھے اپنی مشہور تاریخ کے مقدمے میں شرافت حسبی کی بحث کے دوران میں لکھتے ہیں "حسب یعنی خاندانی شرافت اکثر چوتھی نسل میں زائل ہو جاتی ہے کیونکہ جو شخص خاندان کا بانی ہوتا ہے اس کو خوب معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کیسی کیسی مشقتوں سے یہ عزت حاصل کی ہے اس لئے وہ ان محاسن اور خوبیوں کو جس کے ذریعہ سے اس کو امتیاز حاصل ہوا ہے کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتا پھر اس کا بیٹا جس نے باپ کا طریقہ دیکھا ہے ان محاسن اور خوبیوں کی قدر کرتا ہے جس سے باپ کو یہ رتبہ حاصل ہوا تھا اور وہ بھی اکثر باپ ہی کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ اب تیسری نسل آتی ہے اور وہ محض تقلیداً باپ دادا کی ڈگر اختیار کرتی ہے لیکن ابھی تک خاندانی عظمت کا طلسم ویسا ہی بندھا رہتا ہے اور بظاہر دادا اور پوتے کے طریقے میں کچھ فرق معلوم نہیں ہوتا۔ مگر چوتھی نسل میں وہ طلسم بالکل ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ نسل باپ دادا کی خوبیوں کو ملیا میٹ کر دیتی ہے۔ چوتھی پشت کی قید بہ اعتبار اکثر کے لگائی گئی ہے ورنہ بعض گھرانے اس سے بھی پہلے بگڑ جاتے ہیں۔" دیکھو حالی کا مضمون "حسب اور نسب" پرچہ تہذیب الاخلاق مورخہ یکم محرم ۱۳۱۲ھ صفحہ ۶۲

میں مومن کا کوئی تذکرہ نہیں تھا اس فروگذاشت پر جب چاروں طرف سے لے دے ہوئی تو طبع ثانی میں جو معذرت آزاد نے کی وہ عذر گناہ بدتر از گناہ سے کم نہیں ہے۔ فرماتے ہیں" میں نے ترتیب کتاب کے دنوں میں اکثر اہل وطن کو خطوط لکھے اور لکھوائے وہاں سے جواب صاف آیا۔ وہ خطوط بھی موجود ہیں۔ مجبوراً اُن (مومن) کا حال قلم انداز کیا" عبدالرحمٰن ہدہد کے حالات سے کم و بیش چھ صفحے سیاہ کرنا اور مومن جیسے سلیمان اقلیم سخن کی ہوا بھی صاحبان فہم کو نہ دینا بجائے خود ایک طلسم ہے جس زمانہ میں آزاد نے کتاب لکھی ہے مومن کے بہت سے دیکھنے والے اور کافی جاننے والے زندہ تھے۔ مومن نے ۱۲۶۸ھ ہجری میں وفات پائی۔ تین سال بعد آزاد کے اُستاد شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ نے سفر آخرت کیا۔ آزاد کی بچپن سے یہ حالت تھی کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ خاقانی ہند کی شاگردی کا شرف حاصل ہونے کے باعث صاحبانِ کمال کی خدمت میں رسائی تھی۔ حالیؔ کا خیال بالکل درست ہے کہ "آزاد نے ابتدائے سن تمیز سے ایک ایسی جامع کتاب لکھنے کا ارادہ کیا ہوگا اور وقتاً فوقتاً جہاں جو سرمایہ ملا اُس کو احتیاط کے ساتھ ضبط کیا ہوگا ورنہ ایسے تفصیلی حالات جو کتابوں میں درج نہ ہوئے ہوں اور صرف افواہ خلائق پر جاری ہوں کسی طرح اس ترتیب کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتے"۔ بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایسا کھوجی مومن کے حالات سے بے خبر رہا ہو۔ اس کے علاوہ غالبؔ کے تذکرے کے تحت میں عبداللہ خاں اوجؔ کے جو حالات لکھے ہیں اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کی زندگی میں آزاد "بندی شوقین" تھے۔ بدگمانی بُری چیز ہے مگر مجھے تو اصلیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ مومن کی شہرت کو بڑھنے سے دو قوتوں نے روکا۔ دونوں قوتوں کی طاقت مسخر کہ ایک مگر دائرۂ عمل جدا جدا تھے۔ ایک قوت وہ تھی جسے ذوقؔ کے شیدائیوں کا رشک کہنا اور دوسری قوت وہ تھی جسے غالبؔ کے فدائیوں کا جذبۂ رقابت سمجھنا چاہیئے۔ دونوں کا مقصد ایک تھا۔ خدا بخشے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ نے گلشن بے خار میں حق شاگردی و دوستی ادا کیا مگر نقارخانہ

لہ مقالات حالی حصہ دوم صفحہ ۱۴۷-۱۴۸ شائع کردہ انجمن ترقی اُردو ۱۹۳۶ء

میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ ممکن ہے ایک وجہ یہ بھی ہو کہ جہاں ذوق نے سفر زندگی کی تین کم ستر اور غالب نے تین اوپر ستر منزلیں طے کیں وہاں مومن کو چمنستانِ عالم کی صرف باون[۵۱] بہاریں دیکھنی نصیب ہوئیں۔ پندرہ بیس برس اور زندہ رہتے تو غالباً ایمان شاعری کے پیاسوں کو مومن جیسے سرچشمۂ کمال کی طرف رجوع کرکے اپنی پیاس بجھانے اور مومن کے ہاتھ پہ بیعتِ کلام کرنے کا موقع مل جاتا۔

حالیؔ کا مضمون

آبِ حیات کی طبعِ ثانی میں سابقہ فردگذاشت کی جس طرح آزاد نے تلافی کرنا چاہی ہے اُس پر خود مومن مرحوم کا یہ شعر یاد آتا ہے

شعر۔ کسی نے گر کہا مرتا ہے مومن ؛ کہا میں کیا کروں مرضی خدا کی۔ خود تو کچھ نہ لکھا اگر مولوی الطاف حسین حالیؔ سے مضمون لکھایا۔ اُس میں بھی جہاں مزاج چاہا آزاد نے کتر بیونت کرلی خود فرماتے ہیں "میں نے فقط بعض فقرے کم کیے جن سے طولِ کلام کے سوا کچھ فائدہ نہ تھا اور بعض عبارتیں اور بہت سی روایتیں مختصر کردیں یا چھوڑ دیں جن سے اُن کے نفسِ شاعری کو تعلق نہ تھا باقی اصل حال کو بجنسہ لکھ دیا۔" حالیؔ فرشتہ صفت آدمی تھے اُنھوں نے مضمون میں کمی بیشی کرنے کا اختیار آزاد کو دے دیا ہو گا۔ ممکن ہے حالیؔ نے یہ سوچ کر اختیار دیا ہو کہ آبحیات کے صفحوں کو مومنؔ کے حالات سے سادہ رکھنے کی بہ نسبت یہ بہتر ہے کہ تھوڑا بہت تذکرہ آجائے لیکن کسی مُصنّف کا اپنی کتاب کے لئے کسی مشہور ادیب سے کوئی مضمون لکھانا۔ کتاب میں صاحب مضمون کی صورت ناظرین کو "الطاف وکرم" کے نہایت ہی باریک پردے میں صاف دکھانا اور پھر مضمون کو من مانی کاٹ چھانٹ کرنے کے بعد کتاب میں جگہ دینا میری ناقص رائے میں ایسا طریقہ ہے جو اخباروں کے ایڈیٹروں کے لئے جائز ہو مگر ائمۂ ادب کی شان کے شایاں نہیں ہے۔ آزاد کا مرتبہ اُردو نثر کی انجمن میں

---

[۵۱] مقالاتِ حالی حصّہ اوّل کے صفحہ ۲۶۶ پر جو نوٹ ہے اس میں غلطی سے مومن کی عمر ۳۵ برس اور سال پیدائش ۱۲۳۳ھ بتایا گیا ہے صحیح سنِ ولادت ۱۲۱۵ھ ہے مومن نے ۵۲ یا ۵۳ سال کی عمر پائی۔

بہت بلند ہے مگر حالی کا رتبہ بھی نہایت اونچا ہے۔ اگر اس انجمن کی مذاقِ سلیم صدر نشینی کرے اور آزاد کو دہنی طرف پہلی صف میں پہلی کرسی پر بٹھائیے تو بائیں جانب پہلی صف میں حالی کو بھی بہت ممتاز جگہ دے گا۔ میں آزاد کو طریقت ادب کا خضر سمجھتا ہوں تاہم یہ بات نہ بھولنی چاہیئے کہ مضمون لکھنے کی درخواست آزاد نے کی تھی لہٰذا اس موقع پر آزاد کی حیثیت سکندر کی تھی اور حالی رہبر یعنی خضر تھے۔ خضر کے بتائے ہوئے راستہ میں اپنی طرف سے تبدیلی کرنا سکندر کے لئے جائز نہیں ہو سکتا۔

مومن کا کلام اور آزاد خدا معاف کرے بد گمانی کا دامن اور پھیلتا اور گناہ سمیٹتا ہے لیکن حقیقت نگار کا فرض ہے کہ چاند سورج میں جو داغ ہیں اُن سے بھی چشم پوشی نہ کرے۔ بڑی دشواری یہ ہے کہ مومن کے کلام کا انتخاب بھی معمولی ہے اُس سے بہتر انتخاب متعدد تذکروں میں جو آبِ حیات کے پہلے یا بعد لکھے گئے موجود ہے آزاد فرماتے ہیں کہ حالی نے مومن کے حالات تو مرتب کر کے بھیجے"۔ لیکن کلام پر رائے نہ لکھی اور باوجود التجائے مکرر کے انکار کیا اس لئے بندہ آزاد اپنے فہم قاصر کے بموجب لکھتا ہے" معلوم نہیں حالی نے کن وجوہ سے کلام پر اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا۔ یادگار غالب کی اشاعت کی نوبت تو کئی سال بعد آئی لیکن حالی نے اُستاد کے سوانح حیات لکھنے کا قصد بہت پہلے کیا ہوگا اور مواد جمع کرنے میں مشغول ہوں گے۔ قرینہ یہ ہے کہ یادگارِ غالب کے مصنف کی شاگردانہ عقیدت نے نقش ثانی باندھنے سے اس لئے ہاتھ کھینچا کہ اُستاد کی تصویر کے مقابلہ میں جس کو منظر عام پر رکھنے کا پہلے سے تہیہ کر چکے تھے وہ اپنے قلم سے کوئی اور تصویر کھینچنا جذبہ وفاداری و حق گذاری کے منافی سمجھتے تھے۔ اگر حالی مومن کی شاعری پر تنقید کرتے تو چیدہ کلام پیش کرنے کا بھی موقع مل جاتا۔ مجھ جیسے کم فہم کا آزاد کے

---

۵۱ آبِ حیات صفحہ ۴۲۹۔ طبع یازدہم۔ مطبوعہ مطبع کریمی لاہور۔ حسب فرمائش آغا محمد طاہر نبیرۂ حضرت آزاد مرحوم۔

انتخاب پر معترض ہونا چھوٹا منھ بڑی بات ہے مگر اسے کیا کیجئے کہ خلش باقی رہتی ہے۔ اور رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ آزاد نے انتخاب کرنے میں آزادی برتی ہو مگر انصاف سے کام نہیں لیا۔ ہم کو آزاد کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ مومن کے ساتھ پہلے ایڈیشن میں جو زیادتی اُنہوں نے روا رکھی تھی وہ طبع ثانی میں تھوڑی بہت رفع کر دی تاہم آزاد نے اپنے قلم سے جو کچھ لکھا ہے اُس میں جوش و خروش کا کہیں پتہ نہیں۔ بیش تر تو بیرے بود بسرے داشت والا معاملہ رکھا ہے کہیں کہیں تعریض کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ آزاد کی شوخی طبع کا کیا کہنا۔ راجہ اجیت سنگھ کا مومن کو ہتھنی دینا کوئی اہم واقعہ نہ تھا لیکن اس صاحبِ کمال کے کمال کی داد دینی چاہیئے کہ مومن کو آبِ حیات کے پہلے دربار میں شرفِ باریابی سے محروم رکھنے کے باوجود اس دربار میں ہاتھی کے لئے گنجائش نکال لی۔ آزاد نے ہتھنی کا واقعہ نہایت اختصار کے ساتھ لکھا تاہم لطیفہ یہ ہے کہ لطیفوں کے سلسلہ میں اوج دہلوی کا وہ ہجائیہ شعر بھی درج کر دیا جس کی بد مذاقی اور بدنمائی کا داغ عرض و طول میں ہاتھی کے ڈیل ڈول سے کم نہیں ہے مومن جیسے قانع مُستغنی اور خوددار[1] آدمی کی ہجو میں اوج کا شعر آبِ حیات کے سدا بہار گلشن میں ہمیشہ کانٹے کی طرح کھٹکے گا۔ سچ ہے ہر جا کہ گل است خار است۔

کاش فرشتے اہلِ دل ہوتے

ابھی ابھی میرے کان میں ایک آواز آئی میں اُدھر متوجہ ہوا دو نورانی صورتیں تھیں مگر صاف نظر نہ آتی تھیں آواز بھی عجیب و غریب ہونے کے باوجود الفاظ سے میرے کان ناآشنا نہ تھے۔ میں نے ہمہ تن گوش ہو کر سنا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کراماً کاتبین کہہ رہے ہیں" اے بندۂ خدا۔ مصرعہ۔ تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو۔ اپنی کہانی لکھتے لکھتے مومن کا قصہ لے بیٹھا۔ دلّی والے جانیں اور آزاد۔ آپس

---

[1] خودداری کا یہ عالم تھا کہ راجہ کپور تھلہ نے ساڑھے تین سو روپے ماہوار تنخواہ پر بلایا مگر معلوم ہوا کہ وہاں ایک گویّے کی بھی یہی تنخواہ ہے۔ مومن نے کہا جہاں میری اور گویّے کی برابر تنخواہ ہو وہاں نہ جاؤں گا۔ دیکھو حالی کا مضمون آبِ حیات میں۔ آبِ حیات طبع یازدہم صفحہ ۴۲۵۔

میں نمٹ لیں گے۔ تجھے کس نے بیچ بدا ہے۔" اتنے میں آنکھ کھل گئی۔ دیکھا کہ میں نئی دہلی میں اپنے پلنگ پر لیٹا ہوں پاس کی چھوٹی میز پر اعمال نامہ اور قلم دوات رکھے ہیں۔ میں نے آنکھیں مل کر غور کیا اور یہ رائے قائم کی کہ فرشتے معصوم ہیں اور میں گنہہ گار۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں بجا و درست ہی ہو گا لیکن فرشتے اس خاک کے پتلے کے دل کی تڑپ کا حال کیا جانیں۔ شعر

تو اے کبوتر بام حرم چہ می دانی ÷ طپیدن دل مرغان رشتہ بر پارا

ترجمہ:۔ "خانہ خدا کی چھت کی پناہ میں رہنے والے کبوتر۔ تجھے ان پرندوں کے دل کی دھڑکن کا کیا حال معلوم ہو جن کے دونوں پاؤں میں رسّی بندھی ہے۔" آدم خاکی نژاد میں جہاں بے شمار کمزوریاں ہیں وہاں یہ خوبی بھی ہے کہ اس کے پہلو میں دل ہے اور دل میں درد۔ اس کیف کو فرشتے کیا جانیں۔ خواجہ میر درد نے کیا خوب کہا ہے۔ شعر

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو ÷ ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

مولانا حالی فرماتے ہیں۔ شعر۔ چیست انسانی طپیدن از تپ ہمسائگاں ÷ از سموم نجد در باغِ عدن پژماں شدن۔ ترجمہ:۔ انسانوں کی مصیبت کا اثر قبول کرنے اور اُن کے دُکھ درد میں شریک ہونے کا نام انسانیت ہے۔ سچّی انسانیت یہ ہے کہ اگر نجد میں لُوئیں چلیں تو باغِ عدن کے پھُول (رہنے والے) مُرجھا جائیں۔ مسجودِ ملائک کی فطرت نہ زیادتی کی روادار ہے نہ ناانصافی کی طرفدار۔ خواہ زیادتی اور ناانصافی انجان پنے کی ہی کیوں نہ ہو۔

مومن غالب کی نظر میں

غالب کی رائے میں مومن بہت اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے مرزا فرماتے ہیں[1]

ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود ÷ باد در خلوت شاں مشک فشاں از دم شاں

مومن و نیر و صہبائی و علوی وانگاہ ÷ حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شاں

ترجمہ:۔ چمن ہند کے شاعروں میں ایسے ایسے گل سرسبد ہیں جن کے دم سے اُنکی خلوتوں کی فضا بھی

---

[1] یادگار غالب مطبوعہ مطبع انوار احمدی الہ آباد صفحہ اوّل۔

مشک کی طرح مہکتی ہے۔ مومن اور نیرؔ اور صہبائی اور علوی اور حسرتی (شیفتہ) اور اشرف اور آزردہ اس زمانہ کے سب سے بڑے اہلِ کمال ہیں۔ یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ مصرعہ کے وزن کے لحاظ سے غالب نے مومن کا نام پہلے رکھا ہے۔ اگر نیرؔ کا نام پہلے اور مومن کا اس کے بعد رکھا جائے تو بھی مصرعہ کا وزن بدستور قائم رہے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جن ارباب کمال کے نام اس شعر میں آئے ہیں اُن میں مومن کو غالب سب سے بڑا شاعر سمجھتے تھے۔ مولوی حالی یادگار غالب میں فرماتے ہیں[۵۱]۔ "اسی طرح مومن خاں کا جب یہ شعر سُنا۔ شعر:۔ تم مرے پاس ہوتے ہو گویا ؛ جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ تو اس کی بہت تعریف کی اور یہ کہا کاش مومن خاں میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر مجھ کو دے دیتا۔ اس شعر کو بھی غالب نے اپنے متعدد خطوں میں نقل کیا ہے۔" مومن کی وفات کا غالب کو جو صدمہ ہوا اس کا اندازہ مرزا کے اس شعر سے ہوگا۔ شعر۔ کافر باشم اگر بہ مرگ مومن ؛ چوں کعبہ سیہ پوش نہ باشم تا عمر ترجمہ :۔ اگر مومن کے غم میں مُدت العمر کعبہ کی طرح میں سیاہ کپڑے نہ پہنوں تو کافر ہو جاؤں۔ لفظ مومن دعوے کی دلیل ہے جس نے شعر میں عجب لطف پیدا کر دیا ہے۔

مومن کے کلام کا انتخاب

اچھا مومن سے رخصت ہونے کے پہلے دہلی کے آخری اسلامی دور کے اس باکمال شاعر کے چند شعر بھی سُن لیجیئے۔ شوخی۔ لطفِ محاورہ۔ نازک خیالی۔ مضمون آفرینی سب کچھ موجود ہے۔ ہیر پھیر[۵۲] کے شعر دیکھنے ہوں تو آبِ حیات میں مُلاحظہ کیجیئے۔ کاش اس کتاب میں اتنی گنجائش ہوتی کہ میں پوری غزلیں درج کر سکتا صرف چالیس شعر بطور مشتے نمونہ از خروارے نقل کیئے جاتے ہیں مختلف رنگوں کے

---

[۵۱] یادگار غالب مطبوعہ مطبع انوار احمدی الہ آباد صفحہ ۸۴

[۵۲] یہ الفاظ میرے نہیں ہیں بلکہ آزاد کی رائے میں جس خوبی سے مومن ایک شے کو کسی صفتِ خاص کے لحاظ سے ذات شے کی طرف منسوب کرتے اور اس ہیر پھیر میں شعر میں لطف پیدا کرتے ہیں وہ مومن کے کلام کی خاص صفت ہے۔ آبِ حیات صفحہ ۴۲۹

اشعار منتخب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور کسی غزل کے دو شعر سے زیادہ نہیں لئے ہیں۔ اگر شکایت نہ سمجھی جائے تو اتنا اور کہہ دوں کہ آزاد کی نظرِ انتخاب ان میں سے کسی ایک شعر پہ بھی نہیں پڑی کیا اس کے ذمّہ دار بھی حالی ٹھیرائے جا سکتے ہیں۔ اپنے نزدیک میں نے مومن کے بہترین اشعار میں سے انتخاب کیا ہے۔ اگر اور اساتذہ فن سے مومن کا مقابلہ کرنا مقصود ہوتا تو مومن کا ہر طرح کا کلام درج کرنا لازم آتا۔ زمانہ نے اس باکمال شاعر کے ساتھ جو بے اعتنائی برتی اُس کی یہاں تھوڑی بہت تلافی مقصود ہے۔ دکھانا صرف یہ ہے کہ انجمن سخن میں مومن کو بھی اُسی مسند پہ بیٹھنے کا استحقاق ہے جہاں مذاقِ سلیم نے غالب اور ذوق ناسخ اور آتش کو جگہ دی ہے۔ اِس وقت یہ بحث نہیں ہے کہ مسند پہ کون کہاں بیٹھے۔

انتخاب کلام مومن :-

۱۔ غصے سے تیرے ڈرتا ہوں رضا کی تیرے خواہش ہے
نہ میں بیزار دوزخ سے نہ میں مُشتاق جنت کا

۲۔ اُس نقشِ پا کے سجدہ نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

۳۔ خدا کی یاد دلاتے تھے نزع میں احباب
ہزار شکر کہ اُس دم وہ بدگماں نہ ہوا

۴۔ اُلجھا ہے پاؤں یار کا زُلفِ دراز میں
لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

۵۔ یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا
میں الزام اُن کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

۶۔ بوسے دمِ غضب لئے اُلٹی سمجھ تو دیکھ
جو بل پڑا جبیں پہ۔ تمنا کو لب ہوا

۷۔ نہ مانو گا نصیحت۔ پر نہ سنتا میں تو کیا کرتا
کہ ہر ہر بات میں ناصح تمہارا نام لیتا تھا

۸۔ گو آپ نے جواب بُرا ہی دیا و لے
مجھ سے بیاں نہ کیجئے عدو کے پیام کو

۹۔ اس حال کو پہنچے ترے قصّے سے کہ اب ہم
راضی ہیں گر اعدا بھی کریں فیصلہ اپنا

۱۰۔ چشمِ غضب سے شورۂ قتل کھل گیا
جو بات دل میں تھی وہ نظر سے عیاں ہے اب

۱۱۔ مر چُک کہیں کہ تو غمِ ہجراں سے چھوٹ جائے
کہتے تو ہیں بھلے کی وہ لیکن بُری طرح

۱۲۔ خنجر کو نہ توڑ سخت جانی
پھر کس کو گلے لگائیں گے ہم

۱۳۔ وصلِ بُتاں کے دن تو نہیں یہ کہ ہو وبال
مومن نماز قصر کریں کیوں سفر میں ہم

۱۴۔ ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا
جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں

۱۵۔ ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے
صیّاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

۱۶۔ ہیں غیر مرے نکلنے سے خوش،
گویا کہ میں اُن کا مدّعا ہوں

۱۷۔ کیسے گلے رقیب کے کیا طعنِ اقربا؟
اپنا ہی دل نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

۱۸۔ مانگا کریں گے اب سے دُعا ہجرِ یار کی
آخر تو دشمنی ہے اثر کو دُعا کے ساتھ

۱۹۔ اللہ رے گمرہی بُت و بُت خانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبہ کو اِک پارسا کے ساتھ

۲۰۔ ہنگامِ وداع آہ گلا کاٹ رہے تھے
کیا کھینچتے دامن کو ترے کام میں تھا ہاتھ

۲۱۔ توبہ گنہہ عشق سے فرمائے ہے واعظ
یہ بھی کہیں دل دے کے گنہگار رہا ہے

۲۲۔ کیونکر یہ کہیں منّتِ اعدا نہ کریں گے
کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے

۲۳۔ چھڑکے ہے کان ملاحت لون کیا
خود لپٹ جا سینۂ افگار سے

۲۴۔ شکوۂ دشمنی کریں کس سے
واں شکایت ہے دوست داری کی

۲۵۔ پیغام بر رقیب سے ہوتے ہیں مشورے
سُنتا نہیں کسی کی یہ کہنے کی بات ہے

۲۶۔ ذکر کر بیٹھے بُرائی سے ہی شاید میرا
اب وہ اغیار کی صحبت سے حذر کرتا ہے

۲۷۔ خیالِ خوابِ راحت ہے علاج اس بدگمانی کا!
وہ کافر گور میں مومن مرا شانہ ہلاتا ہے

۲۸۔ میرے تغیّرِ رنگ کو مت دیکھ
تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

۲۹۔ رشکِ دشمن کا فائدہ معلوم
مفت جی کا ضرر نہ ہو جائے

۳۰۔ رہتے ہیں جمع کوچۂ جاناں میں خاص و عام
آباد ایک گھر ہے جہانِ خراب میں

۳۱۔ رشکِ دشمن بہانہ تھا سچ ہے
میں نے ہی تم سے بے وفائی کی

۳۲۔ یوں بنا کر حالِ دل کہنا نہ تھا
بات بگڑی میری ہی تقریر سے

۳۳۔ چھوٹ کر کہاں۔ اسیرِ محبّت کی زندگی
ناصح! یہ بندِ غم نہیں قیدِ حیات ہے

۴۴۔ ہنس ہنس کے وہ مجھ سے ہی مرے قتل کی باتیں — اس طرح سے کرتے ہیں کہ گویا نہ کریں گے
۴۵۔ شب ہجر میں کیا ہجوم بلا ہے — زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے
۴۶۔ جاں گئی پر نہ گئی جور کشی، — بعد مُردن بھی دباتے ہیں مجھے
۴۷۔ مومن آؤ تمہیں بھی دکھلادوں — سیر بُت خانے میں خدائی کی
۴۸۔ کام جز اُلفت نہیں اے کاتبِ اعمال یاں — فائدہ حرفِ مکرر کی بھلا تحریر سے؟
۴۹۔ دامنِ قاتل کو وقتِ قتل کیونکر چھوڑتا — بے کسی سے جان تھی اپنی کفن کی فکر میں
۵۰۔ عذابِ ایزدی جانکاہ ہے مانا بس اب مومن — خدا کے واسطے ذکرِ ستم ہائے بتاں کیجئے

میر حسن اور نواب مرزا شوق

مثنوی میں نواب مرزا شوق لکھنوی کا درجہ بہت بلند ہے رسمی ادبی عقیدہ کے اتباع میں مجھے میر حسن کی مثنوی سحر البیان کے اوپر پھول چڑھانا ہوں گے۔ سب بزرگ اور ناقدانِ سخن یہی کہتے چلے آئے ہیں کہ میر حسن کی مثنوی اُردو زبان میں لاجواب ہے۔ مولانا حالی نے مقدمہ شعروشاعری میں سحر البیان کو بہت سراہا ہے مگر شوق کی مثنویوں کا جس آب و تاب سے ذکر کیا ہے اُس سے پتہ چلتا ہے کہ من بھائے مُنڈیا ہلائے والی مثل ہے۔ دل تو مولانا کا چاہتا ہے کہ میر حسن اور شوق کے گلے میں جو ہار پہنائیں وہ بالکل یکساں ہوں پھول بھی ایک ہی قسم کے ہوں۔ رنگ بھی مختلف نہ ہو اور بو باس (خوشبو) بھی ایک ہی طرح کی ہو۔ مگر مولانا اپنے زمانہ کے مذاق سے مجبور ہیں۔ سرسید علیہ الرحمۃ کے حواریوں میں اُن کا ممتاز مرتبہ تھا علی گڑھ کی اصلاحی تحریک کا اثر اُس زمانہ کے بزرگوں پر یہ ہوا تھا کہ ہر چیز کو انگلستانی عینک لگا کر دیکھتے تھے اور ادبی۔ معاشرتی اور سیاسی مسائل کی صحت کا جو معیار انگریزوں نے ہندوستان میں قائم کیا تھا اُسے اپنے اوپر واجب الاتباع سمجھتے تھے۔

سچ تو یہ ہے کہ وہ زمانہ عمل (Action) کا تھا اب ردِ عمل (Reaction) کا دور ہے۔ مولانا حالی نے زہرِ عشق کو تو پسند فرمایا مگر بہارِ عشق اور فریبِ عشق کی عُریانی

سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ شوق کے روزمرہ بے ساختگی، شیریں بیانی اور معاملہ بندی کو علی گڈھ
کی اصلاحی پاک دامنی کی قربان گاہ پر ذبح کر ڈالا۔ کاش موصوف انگریزی ادب اور شاعری سے
پوری طرح واقف ہوتے اگر وہ شیکسپیر کی ریپ آف لوکریشیا (Rape of lucretia)
ملٹن کی کتاب جنّت سے اخراج (Paradise Lost) اور مشہور نظم دُلہن کا پہلی رات
کا اقبال (Brides Confession of The first night) کا مطالعہ کر چکے ہوتے
تو ان کو معلوم ہوتا کہ انگریزی شاعری میں بھی ایسے گندے اور فحش خیالات موجود ہیں جنکے
آگے فریبِ عشق اور بہارِ عشق کی کچھ حقیقت نہیں۔ سرسید احمد خاں کی اصلاحی تحریک
کی بڑی کمزوری یہ تھی کہ مغربی ممالک کے حالات۔ طرزِ معاشرت اور ادب پر بغیر کافی عبور
رکھے ہمارے بزرگ ہر مغربی چیز کو ہندوستانیوں اور بالخصوص مُسلمانوں کے لئے
ذریعۂ نجات سمجھتے تھے۔

اینگلو انڈین مُصنّفین کی کورانہ تقلید

میں یہ نہیں کہتا کہ کلام کی عریانی اچھی چیز ہے تاہم میری ناچیز رائے میں یہ بڑا ظلم ہوگا۔ کہ
انگلستان تو اپنی ادبی عریانی پر بغلیں بجائے جسمانی عریانی پر ناچے اور ہم اس عریانی کے
باعث اپنے اعلےٰ درجہ کے کلام کی خوبیوں کو قطعاً نظر انداز کر دیں۔ عریانی کا معاملہ رسم
و رواج کا معاملہ ہے۔ کہیں یہ کلام کی عُریانی کی صورت میں نظر آتا ہے کہیں جسمانی برہنگی
کے جلوے دکھاتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ ہر ملکے و ہر رسمے۔ اپنے رسم و رواج۔ تہذیب و شائستگی
روایات اور ادبی مذاق کے معاملہ میں اپنے کو مغلوب اور مغربی اقوام کو غالب مان لینا
اُس غلامانہ ذہنیت کا بدترین ثبوت ہے جس کے خلاف ملک ہند کے کونے کونے چپہ چپہ میں
آج عَلمِ بغاوت بلند ہے۔ خود مولانا حالی اپنی ایک نظم میں فرماتے ہیں:-

جا کے کابُل میں آم کا پوُدا ⁂ کبھی یہ واں چڑھ نہیں سکتا
آکے کابُل سے یاں بہی اور انار ⁂ ہو نہیں سکتے بارور زنہار

کابل کی سرحد ہمارے مُلک سے مِلی ہوئی ہے شمالی ہند اور کابل کی آب وہوا میں فرق ہے مگر بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ مولانا حالی فرق مکان کے اثرات سے ہمیں متنبہ کرتے ہیں مگر سخت تعجب ہے کہ موصوف کو یورُپ کی جسمانی برہنگی ستر پوشی اور یورپ کے ادب و کلام کی عُریانی فلسفیانہ نزاکتوں سے مملو نظر آتی ہے۔ افسوس ہے کہ اصلاحی پاکدامنی کے جوش و خروش نے موصوف کو اتنا موقع نہ دیا کہ سحر البیان اور فریبِ عشق یا بہارِ عشق کے اشعار کا جو ایک ہی مضمون پر ہیں مقابلہ فرماتے مجھے تسلیم ہے کہ مناظر قدرت اور انسانی جذبات کی تصویر کسی مثنوی میں ایسی کامل نہیں ہے جیسی میر حسن نے کھینچی ہے مگر بیساختگی معاملہ بندی بمضمون کی شوخی اور سوال وجواب کی نوک جھونک میں نواب مرزا شوق کا پلہ بھاری ہے۔ فریبِ عشق اور بہارِ عشق میں بَلا کی آمد ہے۔ محاورے اس خوبی سے باندھے ہیں کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے والا سچ مچ محبوب سے باتیں کر رہا ہے اور شکوہ شکایت یا وصل و خلوت کے مزے لے رہا ہے۔

اسکاٹ نے اپنی ایک نظم میں ایک مُغنی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مذہبی تقدس کے ٹھکم برداروں نے اس غریب کے بربط کو مخرب اخلاق قرار دیا تھا۔ یہی سلوک لکھنؤ کے تنگ خیال اور تنگ نظر گندم نما جو فروشوں نے شوق کی مثنویوں کے ساتھ کیا۔ انگریزی حکومت اودھ میں نئی نئی قائم ہوئی تھی۔ حکومت کے کان بھر کر ان مثنویوں کی طباعت اور اشاعت بند کرادی مگر ادبی جواہر ریزوں کا خواص ہیرے جیسا ہوتا ہے۔ ہیرے کو زمین میں دفن کر دیجئے اور دو سو برس بعد نکالئے آب و تاب میں مطلق فرق نہ آئے گا یہی حالت ان مثنویوں کی ہے۔ عرصہ سے یہ مثنویاں پھر چھپنے لگی ہیں اور یہ دونوں مثنویاں معہ زہرِ عشق اور لذتِ عشق کے لکھنؤ کے کتب فروشوں کے یہاں ملتی ہیں۔ زہرِ عشق میں دنیا کی بے ثباتی اور انسان کا انجام جس مؤثر اور پُردرد طریقہ سے بیان کیا گیا ہے اس کے لگ بھگ بھی کوئی مقام سحر البیان میں نہیں ہے۔

مغربی شعبدہ بازی کا اثر ہمارے بزرگوں پر

حالیؔ بڑے راست گو بزرگ تھے مغربی علوم و فنون کی جو ہیبت ہمارے بزرگوں کے دلوں پر چھاگئی تھی اُس کا تذکرہ حالیؔ نے حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے۔" حق یہ ہے کہ جو شخص ایک ایسی وسیع اور علمی۔ شائستہ اور باقاعدہ زبان سے جیسی کہ انگریزی ہے شاعرانہ خیالات کو لے کر ایک ایسی محدود اور بے قاعدہ اور ناکامل اور غیر علمی زبان میں جیسی کہ اُردو ہے ادا کرتا ہے۔ اس کی مشکلات کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو واقعی اس کا ہمدرد ہے[۱]۔"

انبیائے ماسلف کے زمانہ میں نافرمان اُمتوں پہ خدا کا قہر وبا اور قحط اور زلزلہ کی صورت میں نازل ہوتا اور ان کا ستیاناس کرتا تھا۔ حضرت رحمۃ اللعالمین کی بعثت کے بعد سے غضب الٰہی اور صورتوں میں نازل ہوتا ہے۔ جب قادر مطلق کسی ملک یا قوم کو عذاب الیم میں مبتلا کرنا چاہتا ہے تو کسی غیر قوم کو حاکم بنا کر اُس پر مُسلّط کرتا ہے۔ بدیسی راج کا سب سے زہریلا اثر یہ ہے کہ مفتوح قوم کی نظر میں اپنی خصوصیات ذلیل اور ادنیٰ اور فاتح قوم کی تمام باتیں شان دار اور اعلےٰ معلوم ہوتی ہیں۔ طالب علمی کے زمانہ میں خود میری یہ حالت تھی کہ ٹینی سن۔ کیٹس۔ شیلی اور بائرن کو فن شاعری کے عجیب و غریب رُکن سمجھتا تھا حالانکہ فارسی میں سیکڑوں اور اُردو میں درجنوں شاعر ایسے موجود ہیں جن کا مرتبہ دنیائے شعر میں ان چاروں انگریز شاعروں سے بلند تر ہے۔ میں اور میرے ساتھی شکسپیر پڑھتے تھے اور جھومتے تھے۔ کوئی تعریف ایسی نہ تھی جس کا ہم شکسپیر کو مستحق نہ سمجھتے ہوں شکسپیر کے کمال کا آج بھی مجھے اعتراف ہے مگر انسانی جذبات۔ قدرتی مناظر اور فطری کیفیات کی جو تصویریں خدائے سخن حکیم فردوسی اور لسان الحق میر انیس نے کھینچی ہیں اُن کا شکسپیر کی بہترین تصویروں سے موازنہ کیجئے تو مشرق کی نقاشی اور مغرب کی مصوری میں وہی فرق نظر آئے گا جو تاج محل اور سینٹ پال کے گرجا گھر میں ہے

---

[۱] دیکھو مقالات حالی حصہ دوم صفحہ ۱۴۳

یا جو قطب مینار کو نیلسن کے ستون واقع ٹریفل گر اسکوئیر سے یا لال قلعہ دہلی کی چھوٹی سنگ مرمر کی مسجد کو لندن کے ماربل آرچ سے مابہ الامتیاز بناتا ہے۔ حالی کے زمانہ میں یورپ کی وہ دھاک تھی کہ ہم انگریز شاعروں اور ادیبوں کا انگریز مدبروں اور حاکموں کی طرح جو احترام کرتے تھے اس میں ہیبت کا جزو غالب تھا مغرب نے سائنس اور اُن تمام فنوں میں جن کا تعلق سائنس سے ہے جو ترقی کی ہے وہ دلیل کی محتاج نہیں ہے اُس کا بہترین ثبوت یورپ کا عالمگیر تسلّط ہے۔ رہے یورپ کے دوسرے علوم۔ اُنکی کیفیت یہ ہے کہ جو تصویر علوم مذکورہ کی ہماری آنکھوں کے سامنے آئی اُس کا پس منظر انگریزی حکومت اور مغربی سیاسی اقتدار تھا۔ اس پس منظر نے ہماری آنکھوں میں وہ چکاچوند پیدا کی کہ تصویر کے حسن و قبح کو بغور دیکھنے کا ہمیں موقع نہیں ملا۔ جو بزرگ یعنی ہمارے لیڈر تصویر کے زیادہ قریب تھے اور جن کی آنکھوں میں پس منظر کی نہایت تیز روشنی نے ہماری نظر سے بھی زیادہ خیرگی پیدا کر دی تھی، انہوں نے باواز بلند کہا کہ تصویر اپنی خوبی میں لاجواب ہے۔ پہلے تو ہم یہ آواز سُنکر برہم ہوئے مگر بزرگوں کی نیک نیتی اور صداقت میں شک وشبہہ کی ہرگز گنجائش نہ تھی۔ رفتہ رفتہ ہم کو بھی بدیسی تصویر میں طرح طرح کی خوبیاں نظر آنے لگیں۔ اسے مغرب کی نظر بندی کا ہنر کہیئے یا ہماری سادگی سمجھیے نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب کے سوا ہر بدیسی چیز ہماری نگاہ میں قابل احترام قرار پائی۔ اور ہر دیسی چیز میں مین میکھ نکالنے لگے۔ یہاں تک نوبت پہنچی کہ ۱۸۹۳ء میں ایک مُسلمان عرصہ دراز تک انگلستان میں قیام کرنے اور بعد از خرابیٔ بسیار بیرسٹری کا امتحان پاس کرنے کے بعد ہندوستان واپس آئے تو فرمانے لگے "جب سے انگلستان سے واپس آیا ہوں مجھے اس ملک کے (بدقسمت ہندوستان سے مطلب تھا) آدمی لونڈے معلوم ہوتے ہیں"۔ دیسی چیزوں کی حقارت اور بدیسی چیزوں کی عظمت کا یہ وہی مصنوعی یا عارضی جذبہ ہے جس کا مذاق فرانس کے مشہور ڈراما نویس مولیر (Molière) نے

اپنے ایک ڈرامے میں اُڑایا ہے۔ مولیر نے ایک کھیل میں ایک فرانسیسی عالم کا تذکرہ کیا ہے جو فرانسیسی چیزوں سے بیزار اور بدیسی باتوں کا طرف دار تھا۔ ایک شخص اُس عالم کے پاس آتا ہے اور عرضِ مطلب کرتا ہے۔ عالم اس سے کہتا ہے "تم مجھ سے فرانسیسی میں بات چیت کرنا چاہتے ہو لہذا بائیں جانب آجاؤ میں دہنے کان سے صرف غیر ملکی زبانوں کے کلام اور علمی مسائل سُنتا ہوں اور بایاں کان بیہودہ اور ذلیل مادری زبان کے لئے مخصوص ہے" مولوی حالی کی جو رائے میں نے اوپر درج کی ہے اُس کا اظہار موصوف نے آدھی صدی سے زیادہ گذری تب کیا تھا۔ اب پس منظر کی روشنی اتنی دھیمی ہو گئی ہے کہ مغربی تصویر کے نقوش کی اصلیت ہم کو نظر آنے لگی ہے مولیر کی طرح آج ہندوستانی صنّاع بھی ہماری غلامانہ ذہنیت پر اس طرح طعنہ زن ہے ؎

ملٹن کی تصانیف کے کرتے رہو چرچے — اور غالب و اقبال کو نظروں سے گرا دو
محفل میں اگر ذکر انیس آئے زباں پر — ہومر کو وہیں تختِ صدارت پہ بٹھا دو
جس بزم میں ہو حافظ و خیام کی توصیف — شیلی کی کوئی نظم وہاں پڑھ کے سُنا دو

(حرماں خیر آبادی)

سر سیّد کا نورتن | سر سیّد احمد خاں علیہ الرحمۃ کے نورتن یعنی حلقہ احباب میں بڑے بڑے اہلِ کمال تھے، اعلےٰ خصائل کے اعتبار سے مولوی حالی کا درجہ بہت اونچا تھا اُن کی خدمت اور صحبت نوجوانوں کے لئے سبق آموز تھی مزاج نہایت سنجیدہ اور متین تھا موصوف کی تصانیف کی طرح بات چیت میں بھی کھلاوٹ (شگفتگی) بہت کم ہوتی تھی اُنکے برخلاف مولوی نذیر احمد بڑے ہنسوڑ تھے ظرافت کا یہ عالم تھا کہ اُن کی صحبت میں روتا آدمی بھی ہنس پڑتا تھا۔ نواب محسن الملک کے انتقال کے بعد مُسلمانوں کا من حیث القوم خیال تھا کہ محسنُ الملک کے جانشین نواب وقارُ الملک ہوں مگر تھوڑی سی جماعت نواب اسمٰعیل خاں رئیس دتاولی کو (جو سر سیّد کے بڑے گہرے دوست تھے اور جن کے مکان پر سر سیّد نے

علی گڈھ میں وفات پائی) سکرٹری کالج کے عہدہ کا اہل سمجھتی تھی لہذا کالج کے بہی خواہوں نے وقار الملک کے حق میں ووٹ حاصل کرنے کی زبردست کوشش شروع کی۔ ایک قاصد دہلی بھیجا گیا۔ دہلی میں چند ٹرسٹی رہتے تھے ان سب نے اپنی اپنی پراکسی[1] پر دستخط کردئے کہ ووٹ وقار الملک کو دیا جائے۔ مولوی نذیر احمد کی خدمت میں بھی قاصد حاضر ہوا۔ دریافت فرمایا کون کون صاحب اُمّیدوار ہیں قاصد نے حالات گذارش کرتے ہوئے وقار الملک کی بہت تعریف کی۔ مولوی نذیر احمد خاموشی کے ساتھ قاصد کی تقریر جو ایک طرح کا لکچر تھا سُنتے رہے۔ جب وہ کہہ چکا تو بآوازِ بلند بولے "لعنت ہے اُس قوم پر جس کا سرِ دالہ کمبو ہو۔ خیر لاؤ کاغذ کہاں ہے میرے دستخط کرالو۔" اس موقع پر قومیّت کا حوالہ دینا بالکل غیر ضروری تھا لُطف یہ ہے کہ مولوی نذیر احمد وقار الملک کے بڑے پکّے حامی اور طرفدار تھے مگر مزاج کی رفتار کو کون بدل سکتا ہے، یہ ناممکن تھا کہ موقع ملے اور چٹکی نہ لیں۔ مولوی نذیر احمد ہر سال ایجوکیشنل کانفرنس کے موقع پر لکچر دیا کرتے تھے اُن کے لکچر اس پایہ کے ہوتے تھے کہ بعض حضرات کانفرنس میں شرکت زیادہ تر اس وجہ سے کرتے تھے کہ موصوف کا لکچر سُننے کا موقع ملے گا۔ چھوٹے چھوٹے فقرے سہل الفاظ۔ محاوروں کے بادشاہ تھے۔ ظرافت کوٹ کوٹ کے بھری تھی۔ کبھی کبھی ظرافت کا رنگ اتنا گہرا ہو جاتا تھا کہ ثقہ سُننے والوں کو پسینہ آجائے۔ مولوی شبلی عمر کے لحاظ سے سرسیّد کے جلیس نہ تھے لیکن سید صاحب کی صحبت کا شرف اُنکو حاصل ہوا تھا وہ مولوی حالی کی طرح خشک مزاج تھے نہ مولوی نذیر احمد کی طرح ظریف اور بذلہ سنج۔ لیکن طبیعت میں بلا کی چلبلاہٹ تھی۔ شوخیٔ طبع کا اندازہ اُن کی کتابوں سے ہوتا ہے جنمیں عطیہ بیگم اور زہرا بیگم کے نام کے خطوط جو اب چھپ گئے ہیں خاص طور سے قابلِ تذکرہ ہیں۔ روزمرّہ کی بے تکلف بات چیت میں یہ شوخی اور بھی مزہ دیتی تھی میرا خیال ہے کہ حالی کی نثر کی تصانیف

---

[1] پراکسی دستخط شدہ تحریری رائے ہوتی ہے جس کے ذریعہ سے جماعت متعلقہ کے کسی فرد کو اختیار دیا جاتا ہے کہ دستخط کرنے والے کی طرف سے ووٹ دے۔

کی عمر شبلی کی تصانیف سے کہیں زیادہ ہوگی مگر شبلی کی طرز ادا اور شوخی نے عوام کی نظر میں جو مقبولیت حاصل کی وہ حالی کے ٹھوس اور عالمانہ انداز بیان کو نصیب نہ ہوئی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے کلام کی طرح آنیوالا زمانہ حالی کی تصانیف کی وہ قدر کرے گا جو موصوف کی زندگی میں نہیں ہوئی۔

اُردو کی ادبی حیثیت

ترا قامت بنا کر صانع قدرت نے فرمایا
کہ یہ فتنہ رہے گا دو قدم آگے قیامت سے (نجم الدین برق)

جدت طرازی دو دھاری تلوار ہے فنی تخلیق اور جدت طرازی کی علم ادب میں بھی اُسی قدر گنجائش ہے جتنی اور فنون لطیفہ میں ہے۔ مغربی زبانوں کے استعارے۔ تشبیہیں اور کہاوتیں اگر لطیف پیرایہ سے اُردو میں لائی جاسکیں تو اس سے ہماری زبان کے سرمایہ میں قابل قدر اضافہ ہوگا۔ مغربی زبانوں کے بعض الفاظ کو بھی اُردو میں رواج دینے پر ہمیں اعتراض نہ ہونا چاہیئے۔ ساتھ ساتھ یہ بھی احتیاط رکھنی چاہیئے کہ غیر زبانوں کے جن الفاظ کا چبھتا ہوا ایسا ترجمہ ہوسکتا ہو جس سے غیر زبان کے لفظوں کا مفہوم بخوبی ادا ہوسکے وہاں اُردو الفاظ سے کام لینا چاہیئے۔ اگر مغربی زبانوں کے غیر ضروری الفاظ کی زد سے تحفظ نہ کیا گیا تو اُردو بجائے ٹکسالی زبان ہونے کے بمبئی کے کرافرڈ مارکٹ اور کلکتہ کے نیو مارکٹ کی بولی بن جائے گی۔ آج جو دشواریاں ہمارے سامنے ہیں اُن سے عربوں کی فراست دانشمندی اور دوربینی کا پتہ چلتا ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایران کی فتح کے بعد سے ہی غیر زبانوں کے الفاظ کو مُعرّب کرنے کے طریقہ کی بُنیاد پڑ گئی تھی۔ خلفائے عباسیہ کے دور میں جب یونانی علوم وفنون کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوا اور دور دراز ممالک اسلام کے جھنڈے کے نیچے آئے تو عربوں نے تنگدلی سے کام نہیں لیا بلکہ غیر زبانوں کے ضروری الفاظ کو مُعرّب کرکے اُن پر تسلّط کر لیا۔ اور اس بے نظیر ادبی تدبّر سے کام لیکر اپنی زبان کو کھوٹ لگنے سے باز رکھا۔ حکومت زندہ کرامت ہے جس کا ادنیٰ کرشمہ یہ ہے کہ حکمراں قوم زندگی کے تمام شعبوں میں اپنے گرد ایسا حصار کھینچ سکتی ہے جو کسی غیر قوم کے توڑے نہیں ٹوٹ سکتا۔ ہماری موجودہ

حالت یہ ہے کہ کوئی ادارہ ایسا نہیں ہے جو غیر زبانوں کے الفاظ کو ترجمہ یا تھوڑی بہت ردوبدل کے بعد اُردو میں داخل کر سکے یعنی نارد (بروزن مُعرّب) بنانے کے جواز کا فتویٰ دے سکے۔ تاہم شاعروں کے کلام۔ ادیبوں کی انشاپردازی اور ادبی انجمنوں[۱] کی جدوجہد کے باعث ہر سال اُردو کے سرمایہ میں نئے الفاظ کا اضافہ ہوتا ہے۔

نئے الفاظ کی کھپت مجھے مسرت ہے کہ جن الفاظ کو مقبولیتِ عام کی سند حاصل ہوتی ہے وہ ہماری زبان میں کھپ جاتے ہیں مثلاً کیریکٹر کا ترجمہ کردار۔ Aggression (جارحانہ اقدام) کا ترجمہ درازدستی کیا گیا ہے۔ دراز دستی نیا لفظ نہیں ہے۔ حافظ شیرازی فرماتے ہیں شعر:- بزیر دلق ملمع کمندہا دارند ÷ درازدستیٔ ایں کوتہ آستیناں بیں۔ حافظ نے گو درازدستی کو اسی معنی میں استعمال کیا ہے جو نئی طرز کے لکھنے والوں کا مفہوم ہے تاہم شعر کی جان کمند کے ساتھ الفاظ درازدستی اور کوتہ آستیناں ہیں۔ اب اُردو میں درازدستی مستقل لفظ ہے جس کے معنی مُعیّن ہیں۔ کیریکٹر کا ترجمہ کردار بھی بُرا نہیں ہے۔ جہاں ناٹک میں کھیل کرنے والے کا تذکرہ ہو کردار سے اظہارِ خیال بخوبی ہوتا ہے مگر جہاں ان تمام اوصاف کا حوالہ دینا مقصود ہو جن کے اجتماع سے کسی فرد کی شخصیت یا شان خصوصی قائم ہوتی ہو وہاں میرے نزدیک کیریکٹر کا زیادہ موزوں ترجمہ سیرت ہے۔ دونوں ترجمے اپنی اپنی جگہ مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے بھی اس کتاب میں بعض الفاظ ایسے استعمال کئے ہیں جنکی سند اساتذہ کے کلام میں اگر مجھ سے طلب کی جائے تو میں نہ پیش کر سکوں گا مثلاً انگریزی لفظ Inequality کا ترجمہ میں نے "نابرابری" کیا ہے۔ انگریزی داں حضرات اپنی تقریروں اور تحریروں میں یہ لفظ اکثر استعمال کرتے ہیں اور انگریزی لفظ اِن اَیکوالٹی کا

---

[۱] اس سلسلہ میں انجمن ترقی اُردو خاص طور پر قابلِ تذکرہ ہے۔ پہلے انجمن کا صدر مقام حیدرآباد تھا اب چند سال سے صدر دفتر دہلی میں آ گیا ہے۔

مفہوم نابرابری سے پورے طور پر ادا ہوتا ہے۔ غیر مساوات کا لفظ ہماری زبان میں موجود ہے مگر خیال کا اظہار پورے طور پر اس سے نہیں ہوتا مثلاً کوئی شخص اگر فردوسی کا مقابلہ امام غزالی سے کرے تو اُس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ مقابلہ برابر کی چیزوں کا ہوسکتا ہے نابرابر اشیاء کا مقابلہ صحیح نہیں ہوسکتا۔ اگر برابر اور نابرابر کی بجائے مساوی اور غیر مساوی کے الفاظ استعمال کئے جائیں تو اصل مفہوم ادا نہ ہوگا۔ نقطۂ نظر کے الفاظ بھی اب عموماً اُردو میں بولے اور لکھے جاتے ہیں۔ مثلاً بیچنے والے اور خریدنے والے کا نقطۂ نظر مختلف ہوتا ہے۔ خالص اُردو میں یہ خیال اس طرح ظاہر کیا جاسکتا ہے کہ فلاں معاملہ کو بایع یا مشتری کی حیثیت سے دیکھیئے مگر نقطۂ نظر کے الفاظ اس لئے قابل ترجیح ہیں کہ بایع یا مشتری کی حیثیت پر جو زور ان الفاظ میں ہے وہ لفظ حیثیت میں نہیں ہے مثلاً اگر یہ کہنا مقصود ہو کہ زید اُردو زبان کی خدمت کرنا چاہتا ہے اور اس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جن انگریزی الفاظ کے ترجمہ کی ہماری زبان میں کھپت ہے اُن کو اُردو میں داخل کرنے پر ہم کو اعتراض نہ ہونا چاہیئے تو اس خیال کا اظہار بغیر نقطۂ نظر کے الفاظ لائے بھی ہوسکتا ہے مگر نقطہ نظر کے بچے تلے دو لفظوں سے یہ مطلب جس صحت اور خوبی سے ادا ہوتا ہے وہ لفظ حیثیت سے نہ ہوسکے گا۔ اسی قبیل کے چند اور الفاظ بھی ہیں نے بعض موقعوں پر استعمال کئے ہیں ممکن ہے فن بلاغت کے ماہران الفاظ کو غریب کہیں۔ مگر یہ الفاظ نئے نہیں ہیں نہ کانوں کو ناگوار معلوم ہوتے ہیں۔ اور میرے نزدیک ہماری زبان میں وہ ایسے ہی ٹھیک بیٹھتے ہیں جیسے انگوٹھی پر نگ۔

ایک معاملہ اور ہے جس کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے بعض حضرات کا خیال ہو کہ دہلی اور لکھنؤ کے شاعروں اور ادیبوں کی زبان کی سند لینا اور محاوروں میں اُن کی پیروی کرنا اُردو زبان کے دائرہ کو محدود کر دینا ہو۔ ابتدا سے دہلی والے باہر کے اہل کمال کے معاون اور حامی رہے ہیں میرے عزیز دوست خواجہ محمد شفیع صاحب بی۔ اے کو تو یہاں تک اصرار ہے کہ جو صوبہ یا ملک کا خطہ اُردو کی خدمت میں جان و دل

مصروف ہو وہاں کے شاعر اور ادیب جو کچھ لکھیں اسے سند مانا جائے اور سارا ملک اُس کا تتبع کرے۔
خواجہ صاحب دلی کے ہونہار اور ممتاز انشا پرداز اور ایک ادبی ذوق رکھنے والے خاندان کے
چشم و چراغ ہیں طبیعت کی ذہانت اور شوخی بے ساختہ قلم سے ٹپکتی ہے میں اس رواداری اور
فراخدلی کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ دلّی والوں کی انہیں اداؤں نے تو اُردو داں پبلک کو
اُن کا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ بقول نواب کلب علی خاں مرحوم مصرعہ۔ انہیں باتوں پہ تو سو جان
سے قربان ہوں میں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ کا تعلق ملک کے خاص خاص صوبوں یا
حصّوں سے نہیں ہے بلکہ زبان اردو کی ادبی شان سے ہے۔ رائے قائم کرتے وقت یہ ہرگز
نہ بھولنا چاہیئے کہ اگر ہر خطۂ ملک نے اپنے اپنے رواج اور خواہش کی مطابق اجتہاد شروع کر دیا
تو پچاس ساٹھ سال کے اندر اُردو کی مرکزی ادبی حیثیت کو وہ نقصان پہونچے گا جس سے
اردو بجائے ملک ہند کے قریب قریب سب مسلمانوں اور بہت سے ہندوؤں کی مشترکہ زبان
ہونے کے صوبائی بولی ہو جائے گی اور اس طرح ہمارا قومی شیرازہ درہم برہم ہو جائے گا۔
دنیا کے ہر شائستہ ملک میں ادبی زبان معمولی زبان سے مختلف ہوتی ہے۔ ہر ملک نے اپنے لئے
جداگانہ ادبی معیار قائم کیا ہے۔ جس پر اُس ملک کے حالات۔ روایات۔ رجحانات
اور قدیم تاریخ نے گہرا اثر ڈالا ہے۔

اُردو زبان کے دو مرکز

ہندوستان میں لکھنؤ اور دہلی۔ اور فرانس میں پیرس کی
زبان مستند مانی جاتی ہے۔ مگر یہ لازمی نہیں ہو کہ ہر ملک
میں دارالسلطنت کی زبان ٹکسالی زبان سمجھی جائے۔ حضرت خاتم المرسلینؐ کی بعثت کے
زمانہ میں عرب کے بادیہ نشینوں کی زبان بڑی مستند سمجھی جاتی تھی۔ لندن کے عوام کی زبان لہجہ
اور طرز ادا کے اعتبار سے اس قدر ناقص ہو کہ اس کا جداگانہ نام یعنی کاکنی (Cockney)
رکھ دیا گیا ہے۔ اپنی اپنی ڈفلی اور اپنے اپنے راگ کی مثال اور جہاں کہیں صادق آتی ہو
مگر ادب اور زبان کے معاملہ میں اس مثال پر کاربند ہونا نہایت مخدوش ہے۔ لارڈ کرومر کے

زمانہ میں مصر کے ادبی انتشار کا بھی وہی عالم تھا جو آج اُردو کا ہندوستان میں ہے یوں تو شمالی مصر اور سوڈان دونوں حکومتوں کی زبان عربی ہے مگر لب ولہجہ اور الفاظ کے طریق استعمال میں عظیم الشان فرق ہے۔ فتح سوڈان کے بعد ایک جماعت ملک میں ایسی موجود تھی جو چاہتی تھی کہ سوڈان کے مدارس میں تعلیم اُسی عربی میں دی جائے جو سوڈان میں بولی جاتی ہے۔ لارڈ کرومر کی سیاسی سرگرمیوں پر تبصرہ کرنے کا یہ محل نہیں ہے مگر میرے نزدیک موصوف نے مصریوں کی یہ بڑی قابل قدر خدمت کی کہ سوڈان کے مدرسوں میں تعلیم کے لئے وہی عربی چُنی جو ادبی یا ٹکسالی عربی ہے۔ ہمارے ملک میں گورنمنٹ کا اس مسئلہ سے تعلق نہیں ہے یا یوں سمجھئے کہ اپنی مصلحتوں کی بنیاد پر گورنمنٹ نے اپنے کو اس مسئلہ سے بے تعلق بنا رکھا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ اہم ادبی کام جو اور ملکوں میں حکومت انجام دیتی ہے اُس کا بار اُن افراد اور انجمنوں کے کندھوں پر عائد ہوتا ہے جو اُردو کو اس درجہ پر پہونچانے کی متمنی ہیں جو آج انگریزی اور فرانسیسی۔ جرمن اور روسی زبانوں کو دُنیا میں حاصل ہے۔ اُردو زبان کو خودرَو درخت سمجھنا بڑی غلطی ہے۔ اگر یہ درخت خودرَو ہو تو بھی یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ دو سو برس تک مسلسل اس درخت کی آبیاری۔ غور و پرداخت اور متروکات کی قینچی کے ذریعہ سے بدنما۔ کمزور یا سوکھی ہوئی شاخوں کی کاٹ چھانٹ میر۔ سودا۔ انشا۔ مصحفی۔ درد۔ آتش۔ ناسخ۔ اسیر۔ مومن۔ غالب۔ ذوق۔ انیس۔ دبیر۔ وزیر۔ داغ اور امیر جیسے کامل باغبانوں نے کی ہے۔ اب خدا کے فضل سے یہ درخت جوبن پر ہے۔ ہر طرف شاخوں کے باترتیب پھیلاؤ نے قدیں غضب کا روپ پیدا کر دیا ہے بڑی بڑی شاخوں کی راستی نے انہیں چوٹی کا مصاحب اور ہمنشین بنا رکھا ہے۔ پتوں میں عجیب شادابی ہے۔ تیز ہوائیں پتوں کے ہلنے سے دیکھنے والوں کے دل میں عجب سرور پیدا ہوتا ہے۔ پھل بھی ایسے خوش ذائقہ آتے ہیں کہ دہلی اور لکھنؤ سے کہیں زیادہ ان کی مانگ لاہور۔ حیدرآباد۔ پشاور۔ پٹنہ۔ کلکتہ۔ بمبئی اور مدراس میں ہے۔

چمن اُردو کی باغبانی

ان حالات میں یہ تجویز کہ باغبانی کے فرائض باری باری سے ہر صوبہ انجام دے بڑی نادانی ہے۔ باغبانی کی خدمت اُسی کے سپرد ہوگی جو اس خدمت کا اہل ہو خواہ وہ رہنے والا پنجاب کا ہو یا حیدرآباد کا۔ کلکتہ اُسکا وطن ہو یا مدراس۔ اُردو ادب کے دربار میں سب قدر دانوں کو باریابی کا حق یکساں حاصل ہے یہاں نہ مذہب و ملت کی قید ہے نہ نسلی اور مقامی حیثیت کچھ امتیاز رکھتی ہے۔ میر حسن اور دیا شنکر نسیم کا نام اُس وقت تک زندہ رہے گا جب تک اُن کی اولاد معنوی یعنی مثنویاں دنیا میں باقی ہیں۔ اُردو ناول نویسی کی بنجر زمین میں رتن ناتھ سرشار اور عبد الحلیم شرر کی جودت اور جدت نے جس طرح خوبصورت درخت۔ خوش رنگ اور خوشبودار پھول اور رنگ اور انوکھی بیلیں لگا کر اُسے تختۂ کشمیر بنایا اُس کے باعث سیر کرنے والوں کے دلوں میں ان دونوں صاحبان کمال کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی۔ باغبانی کی خدمت پر تقرر مقبولیتِ عام کے ہاتھوں سے ہوتا ہے۔ ادبی دنیا میں مقبولیت حاصل کرنا مُصنف شاعر یا ادیب کے تمام تر ذاتی کمال پر منحصر ہے۔ سیاسی دنیا کے انتخابات میں یہ بڑا نقص ہے کہ کامیابی کا دارومدار ذاتی قابلیت پر نہیں ہوتا۔ روپیہ۔ اثر۔ دباؤ۔ لالچ۔ جذبۂ محبت و عداوت۔ آئندہ کی اُمیدیں۔ پولیٹکل پارٹیوں سے لگاؤ یا بے تعلقی غرض کہ کونسل اور اسمبلی کے انتخابات میں اتنے مختلف عنصر پس پردہ اور کھلم کھلا داخل اور شامل ہوتے ہیں کہ چناؤ کو اگر سیاسی عقائد کا وقتی بازاری بھاؤ کہا جائے تو بے جا نہیں ہے برخلاف اس کے مقبولیت عام کے معیار میں پورا اترنے میں ان باتوں کو اس لئے دخل نہیں ہے کہ ادبی حلقہ انتخاب اس قدر وسیع (یعنی براعظم ہند کا آدھے سے زیادہ حصّہ) اور ادبی رائے دہندوں کی آبادی اس قدر کثیر (یعنی کروڑوں کی تعداد) ہے کہ کسی خود غرض مُصنف یا شاعر یا اس کے طرفداروں کی رسائی سارے ملک یا ساری اُردو داں پبلک تک اس طرح ہرگز نہیں ہوسکتی کہ اُن کی رائے پر بے جا اثر ڈالا جاسکے۔ ثبوت میں درجنوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ مگر میں

دنیائے شاعری کی صرف دو جید ہستیوں کا تذکرہ کرنا کافی سمجھتا ہوں شمس الدین ولی خواہ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے ہوں یا احمد آباد میں خواہ دکن کے رہنے والے ہوں یا گجرات کے۔ مگر دہلی سے سوائے اس کے کہ چند سال وہاں رہے اُن کا اور کچھ تعلق نہ تھا۔ تاہم ولی کو اُردو شاعری میں کم و بیش وہی مرتبہ حاصل ہے جو فارسی داں دنیا نے فردوسی کو دیا ہے۔ اقبال بھی نہ دہلوی تھے نہ لکھنوی۔ مگر دہلی اور لکھنؤ اور سارے ملک نے مقبولیت کا تاج اقبال کے سر پر رکھا اور جو قدر موصوف کی خود اُن کی زندگی میں ملک نے کی اور بجا طور سے کی اُس کی مثالیں اُردو شاعری میں بہت کم ملیں گی۔

بات ناتمام رہ گئی مجھے کہنا یہ مقصود تھا کہ مقامی اور صوبائی کاؤں کاؤں کی زد سے اُردو اُس وقت تک محفوظ نہیں رہ سکتی جب تک کہ موجودہ ادبی معیار کو سختی کے ساتھ برقرار نہ رکھا جائے معیار کے لئے مرکز کی ضرورت ہے۔ پہلے ادبی مرکز صرف ایک تھا یعنی دہلی۔ ڈیڑھ سو پونے دو سو برس سے لکھنؤ کی زبان کو بھی مرکزیت حاصل ہے۔ بعض حضرات مانیں یا نہ مانیں مگر سچ تو یہ ہے کہ لکھنؤ میں ادبی اصلاحوں کی ابتدا مصحفی نے کی ناسخ کی روح اگر یہ دعویٰ کرے کہ ؎

میں نے تکمیل کو پہونچائے فصاحت کے اُصول ؛ میری ترمیم کا محتاج ہر افسانہ رہا۔ (حیدر دہلوی)

تو اُس پر سارے منصف مزاج زبان دانوں کو صاد کرنا پڑے گا ناسخ کے کلام میں اثر نہ سہی مگر اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ ناسخ کے قائم کئے ہوئے اُصول و قواعد کو مقبولیت عام حاصل ہوئی۔ جتنا کام ناسخ نے ناتمام چھوڑا تھا اُسے آتش۔ اسیر۔ وزیر اور دہلی کے بعض نامور شعراء نے پورا کیا یاد رکھنے کے قابل بات یہ ہے کہ زبان کی اصلاح کی تحریک لکھنؤ میں شروع ہوئی اور بیشتر لکھنؤ کے شاعروں اور ادیبوں نے اُسے درجہ تکمیل کو پہونچایا۔ زبان کے معاملہ میں دہلی کا مرتبہ وہی ہے جو ملک گیری اور نو آبادیاں قائم کرنے کے مسئلہ میں انگلستان کا ہے۔ دکن والوں کا اُردو زبان کی دنیا میں وہی رتبہ ہے جو اہلِ پرتگال اور اہلِ اسپین کا کرۂ ارض کی حکمرانی کی تاریخ میں ہے ان دونوں قوموں نے کرۂ ارض

کے بہت سے ممالک دریافت کیئے اور وہاں اپنی حکومت بھی قائم کی لیکن انجام کار چراغ انگلستان ہی کا جلا میری ناچیز رائے میں زبان کو پاک صاف رکھنے کے لیئے ان دونوں مرکزوں کا قائم رکھنا اور اُن کی پیروی کرنا ضروری ہے۔ دہلی اور لکھنؤ کے صاحبانِ کمال نے محاوروں، بندشوں اور حروفِ جار کے استعمال کے اُصول بڑی محنت اور کاوش سے قائم کیئے۔ بڑی دشواری یہ ہے کہ ہماری زبان میں تذکیر و تانیث کا تعلق صِرف اسما ہی سے نہیں ہے بلکہ فعل اور صفت اور حروفِ جار کے استعمال میں بھی اس فرق اور امتیاز کی پابندی لازمی ہے۔ بعض الفاظ کے استعمال بالخصوص تذکیر و تانیث کے بارہ میں دہلی اور لکھنؤ والوں میں اختلاف ہے، جائز ہے کہ ان الفاظ کے استعمال میں دہلی کی پیروی کی جائے یا لکھنؤ کی مگر جن الفاظ کے استعمال میں دونوں مرکز مُتحِدُ الخیال ہیں، وہاں ذاتی ادبی اجتہاد سے کام لینا میرے نزدیک اُردو کے ساتھ دوستی نہیں دشمنی ہے۔ دہلی اور لکھنؤ کی سَنَد نہ مانی جائے تو زبان شُترِ بے مہار ہو جائیگی اور شتر سوار یعنی اُردو بولنے اور لکھنے والے کہاں سے کہاں پہونچ جائینگے۔

صاحب قاموس اور عرب خاتون

صاحب قاموس مجدالدین بن یعقوب فیروز آبادی[۱] کا قصہ مشہور ہے، عربی کے جیّد عالم تھے اور عجمی ہونے کے باوجود بڑی اچھی عربی بولتے تھے۔ ایک عرب خاتون سے نکاح کیا اُس کے عزیز مولوی صاحب کو عرب

[۱] ابو طاہر مجدالدین محمد ابن یعقوب بمقام کازرون جو شیراز کے قریب ہے ۷۲۹ھ ہجری میں پیدا ہوئے اور فیروز آبادی کے نام سے شہرت پائی۔ سلطان احمد ابن اویس کی دعوت پر ۷۹۴ھ ہجری میں بغداد پہونچے۔ سال بھر بعد جب امیر تیمور نے شیراز پر قبضہ کیا تو اس زمانہ کے ارباب کمال کے ساتھ فیروز آبادی بھی فاتح کے حضور میں باریاب ہوئے اور تعدادِ افزائی کا شرف حاصل کیا۔ ۷۹۶ھ ہجری میں سلطان الملک الاشرف نے یاد فرما کر مورد الطاف خسروانہ کیا۔ فیروز آبادی نے دو حج کیئے اور عرصہ تک مکہ معظمہ کے قریب ایک قریہ میں سکونت رکھی۔ عرب خاتون سے نکاح مکہ معظمہ میں کیا تھا اُس زمانہ کے عجم عرب عورتوں کو زوجیت میں لانا اپنے لئے ایسا ہی باعثِ افتخار جانتے تھے جیسا اب سے تیس چالیس برس پہلے ہمارے ملک کے نوجوان جو تعلیم کے لئے انگلستان جاتے تھے انگریز بیوی کا دُم چھلا ساتھ لانا اپنے لئے ہم عصروں میں موجب امتیاز یا دنیادی فلاح و بہبود کا کارگر منتر سمجھتے تھے۔ میرے ایک دوست نے انگلستان میں انگریز عورت سے شادی کی اس کی وفات کے بعد دوسری اور دوسری کے مر جانے پر تیسری شادی کی۔ یہ دونوں بیویاں بھی انگریز تھیں۔ انگریز بیوی کے شوہر ہونے کو میرے دوست دنیادی ترقی کا زینہ سمجھتے تھے اور غالباً اُن کا یہ خیال غلط نہ تھا۔ فیروز آبادی نے ۸۱۷ھ ہجری میں اٹھاسی سال کی عمر میں وفات پائی۔ موصوف کی تصنیفات کثیر ہیں جن میں قاموس سب سے زیادہ مشہور ہے۔ فیروز آبادی نے یہ بے نظیر کتاب صرف تین سال میں مُرتّب کی تھی۔

سمجھ کراس مناکحت پر راضی ہوگئے۔ رات کو جب خلوتِ صحیحہ کا وقت آیا تو مولوی صاحب نے بیوی سے مخاطب ہو کر کہا "اقتلی السراج" کہنا یہ مقصود تھا کہ چراغ گل کردو۔ جو الفاظ کہے اُن کا ترجمہ ہے چراغ کو قتل کردو۔ وہ چراغ کو قتل کرنے کی بجائے تلوار لے کر مولوی صاحب کے قتل پر آمادہ ہو گئی اور آگ بگولا ہو کر بولی "تم ہرگز عرب نہیں ہو خلافِ محاورہ عربی بولتے ہو، عرب ہوتے تو "اطفی السراج" (چراغ کو پھونک مار کر گل کردو) کہتے۔ اقتلی السراج نہ کہتے۔ دھوکہ دے کر مجھ سے نکاح کر لیا۔ یا تو مجھے طلاق دو ورنہ ابھی گردن اُڑا دوں گی"۔ اُس غیور عرب خاتون نے کھڑے کھڑے وہیں بزورِ شمشیر طلاق حاصل کی۔

اُردو کا سرِ بازار قتل یہ تو آج سے چھ سو برس پہلے کی عرب کی داستان تھی اب ہندوستان کا قصہ سُنیئے۔ دن رات اُردو سرِ بازار قتل ہوتی ہے اور کسی کی مجال نہیں کہ قاتلوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھ سکے، نئی پود یعنی بیشتر تعلیم یافتہ اصحاب جن کا سرمایۂ ناز انگریزی کی شُدبُد ہے یہ سمجھتے ہیں کہ مغربی خیالات کو ہندی زبانوں کا جامہ پہنا کر ملک کے سامنے پیش کر دینے سے ملکی ادبی سرمایہ میں بڑا اضافہ ہو جائے گا۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ مغربی زبانوں کا ترجمہ مشرقی زبانوں میں کرنا بڑا کٹھن کام ہے۔ جس ترجمہ کو ہماری ملک کی زبانوں کے محاوروں اور طرزِ ادا سے دور کا بھی تعلق نہ ہو اُس کی نظر فریب انگریزی قسم کی جلدوں سے کتب فروشوں کی دُکان کی تزئین ہونا ممکن ہے لیکن اُن جلدوں کو صاحبانِ ذوقِ سلیم کے کتب خانوں میں جگہ ملنا ایسا ہی دشوار ہے جیسا راوی کے سیلاب کا انارکلی تک پہونچنا۔ قیامت تو یہ ہے کہ بعض نچلی طبیعتیں مغربی تخیل کو اُردو زبان کا ملبوس پہنانے پر قناعت نہیں کرتیں بلکہ انگریزی کے لفظوں کا لغوی ترجمہ کر کے عبارت میں وہ زور پیدا کرنا چاہتی ہیں جو خاص الفاظ کی ساخت اور سیاقِ عبارت کے اثر سے انگریزی تحریر میں پایا جاتا ہے۔ کچھ مہینے ہوئے میں ایک کتاب[1] کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ دیباچہ میں مؤلف نے "ترقی پسند ادب" کی ضرورت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کتاب مختلف

---

[1] کتاب کا نام ہے "نئے زاوئے"، مکتبۂ اُردو لاہور میں چھپی ہے۔

مضامین کا مجموعہ ہے۔ مولف نے ایک مضمون میں ایک عورت کے جذبات اور حالات کی تصویر کھینچی ہے۔ فرماتے ہیں "یہ خلا جو اچانک سوگندھی (عورت کا نام ہے) کے اندر پیدا ہو گیا تھا" اس نقاشی پر اگر مذاق سلیم سر پیٹے تو کچھ بے جا نہیں ہے۔ لفظ "خلا" غالباً "Vacuum" کا ترجمہ ہے جس کا استعمال اس موقعہ پر بے محل ہے۔ لفظ "اندر" Within کا ترجمہ ہے جو اور بھی نامناسب ہے مؤلف کا مطلب جو کچھ بھی ہو مگر جو تصویر انہوں نے کھینچی ہے وہ بڑی کریہہ ہے۔ اسی خیال کا اظہار اگر انگریزی کے چیدہ الفاظ میں کیا جائے تو خوبی سے خالی نہ ہوگا۔ مگر لفظی ترجمہ نے اُردو عبارت میں عجب بدمذاقی پیدا کر دی ہے۔ ایک زبان کے خیال یا محاورہ کا دوسری زبان میں لفظی ترجمہ کرنا بعض اوقات بجائے لطافت پیدا کرنے کے عبارت کو ثقیل اور خیال کو بھدا بلکہ کبھی کبھی گھناؤنا بنا دیتا ہے۔ پنجاب اور حیدر آباد والے جو بے نظیر خدمت اُردو زبان کی کر رہے ہیں میں اُس کی دل سے قدر کرتا ہوں اُن کی قوتِ عمل صوبجات متحدہ اور دہلی والوں کے لئے قابلِ تقلید ہے۔ میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ جن خطوں نے اقبالؔ اور داؔغ جیسے باکمال شاعر پیدا کئے وہ ایک دن اُردو کا مرکز ہو کر رہیں گے۔ البتہ میری گذارش یہ ہے کہ جو حضرات اُردو کو ایک وسیع۔ جامع اور شیریں زبان کا درجہ دیکر چاہتے ہیں کہ اُس کا شمار دنیا کی قابل قدر اور ہمہ گیر زبانوں میں ہو اُن کا فرض ہے کہ زبان کے ادبی معیار کو قائم رکھیں اساتذہ کلام و ادب اور ائمہ فن کے قائم کئے ہوئے اصول کی پیروی کریں اور سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ ادبی اختراعات اور غیر زبانوں کے تخیل اور الفاظ اور طرزِ ادا کو اُردو میں اس طرح ہرگز ترویج نہ دیں جس پر اصحابِ ذوق کو ان حضرات سے علامہ اقبالؔ کے الفاظ میں یوں خطاب کرنا پڑے۔ شعر

چھپ نہ جائے دیکھنا باریک ہے نوکِ قلم ⁂ پھر پڑا رہ دے گا اے نو واردِ اقلیمِ غم

ادبی معیار کو قائم رکھنے کی ضرورت

یہ خیال ہرگز صحیح نہیں ہے کہ محکوم قوم اپنی زبان قائم نہیں رکھ سکتی۔ ۲۱ سنہ ہجری کی جنگ نہاوند میں

عربوں نے فتح ایران کی تکمیل کی۔ خلافتِ عباسیہ کے زمانہ میں حکومت کی زبان عربی تھی گو ایرانیوں نے عربی میں بڑی دستگاہ حاصل کی لیکن اپنی مادری زبان کو کبھی نہیں چھوڑا جن حالات میں عربی کی ملاقات فارسی سے ہوئی تھی اُس کے لحاظ سے عربی کے بے شمار الفاظ کا فارسی میں رائج ہونا ناگزیر تھا تاہم اس میل جول سے فارسی کا نقصان کم ہوا اور فائدہ زیادہ۔ عربی الفاظ کے داخلہ سے فارسی کی وسعت اور جامعیّت کو بہت ترقی ہوئی جس کا تھوڑا سا اندازہ شاہنامہ سے ہوتا ہے۔ فردوسی پکّا وطن پرست تھا۔ وہ قدیم ایران کے بادشاہوں کے کارناموں کو بڑی آب و تاب سے دکھانا اور شاہنامہ خالص فارسی زبان میں لکھنا چاہتا تھا۔ تاہم بہت سے عربی الفاظ لینے پڑے۔ ناقدوں اور مُبصّروں کے تخمینہ کی بموجب شاہنامہ میں آٹھ اور دس فی صدی کے درمیان عربی الفاظ موجود ہیں۔ اُردو نے اپنی پونجی عربی، فارسی اور سنسکرت کے بھرپور خزانوں سے حاصل کی ہے۔ بھاشا کے روپہلی الفاظ نے اس سرمایہ میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ رفتہ رفتہ انگریزی کے الفاظ بھی زبان میں داخل ہو رہے ہیں۔ انگریزی اور دوسری زبانوں کے الفاظ سے ایک حد تک ریزہ کاری کا کام لیا جا سکتا ہے۔ جو انگریزی الفاظ اُردو میں کھپ سکتے ہیں اُن پر ہم کو اعتراض نہ ہونا چاہیئے بقدرِ ضرورت ایسے الفاظ کی صورت میں تبدیلی کرنے اور مُتاثر د بنانے کے مسئلہ پر بحث ہو چکی ہے۔ ادبی اُردو کا معیار بڑی حد تک قائم ہو چکا ہے۔ سب سے بڑی ضرورت اس وقت یہ ہے کہ مُلک میں مرکزی ادبی اُردو کو پھیلایا جائے اور صوبوں کی مخصوص طرزِ ادا اور محاوروں کو مقامی حدود کے اندر رکھا جائے۔ اگر آسٹریلیا۔ کینیڈا۔ جنوبی افریقہ اور نیوزی لینڈ جیسے دور دراز ممالک انگریزی کا ادبی معیار قائم رکھ سکتے ہیں تو بڑی ناعاقبت اندیشی ہوگی اگر ہم ہندوستان میں رہ کر جہاں آمد و رفت۔ خط و کتابت اور تبادلۂ خیالات کے آسان ذرائع ہم کو حاصل ہیں مختلف صوبوں میں ادبی اُردو کے مختلف معیار قرار دیں۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ مختلف صوبوں کی روزمرّہ کی بات چیت میں ایسے الفاظ یا جملے بولے جائیں جو کسی صوبہ کی خصوصیّت ہیں اور

جن کے معنی سے دوسرے صوبے ناواقف ہیں۔ جنوبی افریقہ میں بھی ایسے انگریزی الفاظ اور جملے بولے جاتے ہیں اور جہاں تک مجھے معلوم ہے آسٹریلیا اور کینیڈا کی بھی حالت یہی ہے لیکن ان نوآبادیوں کے کسی مصنّف یا شاعر کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں آسکتی کہ اگر وہ کوئی کتاب یا نظم لکھے تو اُس میں ایسے الفاظ، جملے یا محاورے درج کرے جن پر انگریزی ادب نے منظوری کا ٹھپا نہ لگایا ہو۔ ہر بڑی تحریک کو خواہ وہ سیاسی ہو یا غیر سیاسی ایک خاص بلندی اور وسعت حاصل کرنے کے بعد اُن قوتوں کا مُقابلہ کرنا پڑتا ہے جن کا رُجحان انتشار کی جانب ہوتا ہے بعض اوقات نہایت نیک نیت لوگوں کی بھی یہ رائے ہوتی ہے کہ اجتماع کے بجائے انتشار سے اُس تحریک کو زیادہ فائدہ پہونچ سکتا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ سارے حامیانِ تحریک کا ایک ہی ڈگر پر چلنا اُس تحریک کی قوت اور زور کو محدود کردیتا ہے۔ قوتِ عمل کے جوش میں وہ یہ حقیقت بھول جاتے ہیں کہ ہر وہ کوشش جس کا انجام مرکز کی کمزوری ہو مخدوش اور نامسعود ہے۔ صوبجات مُتحدہ (یو۔پی) کے بہت سے اضلاع کی زبان دہلی اور لکھنؤ سے مختلف ہے۔ اس مُعاملہ میں دہلی اور سہارنپور کی باہمی مُغائرت اُس اجنبیت سے کم نہیں ہے جو لکھنؤ اور کھیری کے درمیان میں ہے۔ اس کے باوجود کسی ضلع کو سرتابی کا خیال بھی پیدا نہیں ہوا اور یہ خیال کیسے پیدا ہوتا۔ وہ جانتے ہیں کہ بقول علاّمۂ اقبال۔ شعر:۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں ❊ موج دریا میں ہے اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

جدّت پسندی ایسا ہتھیار ہے جس سے بہت سے میدانوں میں مُفید کام لیا جاسکتا ہے مگر زبان کے میدان میں اس ہتھیار سے آنکھیں بند کرکے کام لینا زبان کی گردن پر کُند چُھری چلانا ہے اگر ہر نسل موجودہ محاورے ترک کرنا اور نئے الفاظ، جملے اور محاورے گھڑ کر یا دوسری زبانوں سے لے کر زبان میں داخل کرنا شروع کردے تو ہر عہد کی زبان دوسرے عہد کی زبان سے مختلف ہوجائے گی۔ اور ہمارے زمانہ کی لکھی ہوئی کتابیں سو برس بعد کسی کی سمجھ میں نہ آئیں گی۔ یہ بڑا مخدوش اُصول ہے جس کی ہر زباں داں کو سختی سے مخالفت کرنا چاہیئے۔

اگر ایرانیوں اور انگریزوں نے اس اصول پر عمل کیا ہوتا تو آج فردوسی کی چاسر اور شکسپیر کا سمجھنے والا دنیا میں مشکل سے ملتا۔ احتیاط سے کام لیا جائے تو بعض حدود کے اندر جدت پسندی مفید ہو سکتی ہے لیکن زبان کے معاملہ میں بغیر قدامت پرستی کے نہ ادبی اصول قائم ہو سکتے ہیں نہ صرف و نحو کے قواعد بنائے جا سکتے ہیں۔ نہ فصاحت اور بلاغت کا معیار زیادہ دنوں چل سکتا ہے۔ لکھنؤ والوں نے جدت پسندی کے دو تجربے کئے ایک زمانہ تھا کہ لفظی رعایت کی پابندی لکھنؤ کا خمیر بن گئی تھی اور نازک خیالی نے لکھنؤ کے گلی کوچوں میں طوفان برپا کر رکھا تھا۔ لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ اِدھر لفظی رعایت کا خمیر بگڑا اُدھر نازک خیالی استعاروں کی تہ میں ڈوب کر رہ گئی۔ وہ نازک خیالی اور مضمون آفرینی جو تبلیغ معنی سے قاصر رہے اور متکلم کے مفہوم کو سامع کے ذہن تک نہ پہونچا سکے کھوٹے سکّے سے زیادہ قیمت نہیں رکھتی۔ ان دونوں مثالوں سے ہمارے زمانہ کے جدت پسند ادیبوں اور ادبی انقلاب پسند انشا پردازوں کو عبرت حاصل کرنی چاہیئے۔ پچھلے پچاس برس میں اُردو کو جو رفعت اور وسعت حاصل ہوئی ہے اُس کا پتہ مولوی حالؔی مرحوم کے مقدمہ شعر و شاعری سے ملتا ہے۔ اس مقدمہ کو لکھے ہوئے پچپن برس ہوئے۔ حالؔی اُردو کی مرکزی اور ادبی حیثیت کو قائم رکھنا قوم کا فرض سمجھتے تھے مگر اُس وقت ترقی کے راستہ میں جو رکاوٹیں حائل تھیں اُن سے متاثر ہو کر حالؔی نے لکھا تھا "کوئی زبان تمام ملک میں یکساں طور پر اُس وقت تک شائع نہیں ہو سکتی جبتک کہ مندرجہ ذیل ذریعے ملک میں مہیّا نہ ہوں۔ ۱۔ اُس زبان کی معتبر اور جامع ڈکشنری کا تیار ہونا۔ ۲۔ اُس کی جامع گریمر کا مُرتّب ہونا۔ ۳۔ اُس میں کثرت سے نظم و نثر کی کتابوں کا تصنیف و تالیف ہو کر شائع ہونا۔ ۴۔ اُس زبان کے اخبارات و رسائل کا تمام اطراف و جوانبِ مُلک میں اشاعت پانا۔ ظاہر ہے کہ نہ آج تک اُردو کی کوئی جامع اور مستند ڈکشنری تیار ہوئی ہے اور نہ اس کی کوئی ایسی گریمر لکھی گئی ہے جس سے زبان کو سیکھنے میں کافی مدد ملنے کی اُمید ہو۔ اُردو میں تصنیف و تالیف کا رواج اور اخبارات وغیرہ کی اشاعت زیادہ تر بیس پچیس برس سے ہوئی ہے اور اس قدر

قلیل مدت زبان کی ترویج کے لئے کافی نہیں ہو سکتی"۔

حالی نے جو دشواریاں محسوس کی تھیں خدا کا شکر ہے کہ ملک کے اہلِ علم۔ اہلِ قلم اور اہلِ کمال کی کوششوں کے باعث یکے بعد دیگرے سب رفع ہو چکی ہیں اُردو میں لغت کی متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں اس فن کے پیشوا مولوی سید احمد صاحب دہلوی تھے جن کی جامع اور مستند کتاب فرہنگ آصفیہ کا اُردو لغت کی کتابوں میں وہی مرتبہ ہے جو مجد الدین فیروز آبادی کی مشہور کتاب قاموس کا عربی میں ہے۔ ڈاکٹر عبد الحق صاحب بھی اُردو لغت لکھ رہے ہیں اور جو مقبولیت اُن کی اُس ڈکشنری کو حاصل ہوئی ہے جو انگریزی سے اُردو میں ہے اُس کے لحاظ سے اُمید کی جاتی ہے کہ اُن کی اُردو لغت اہلِ ملک کے لئے بہت مفید ہو گی۔

صرف و نحو کی کتابوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ آرزو لکھنوی کی کتاب نظام اُردو اس قابل ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں کے ایم۔اے کے کورس میں داخل کی جائے۔ مصنف نے دریا کو کوزہ میں بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرے نزدیک بڑی ضرورت ہے کہ حضرت آرزو کے نقشِ قدم پر چل کر کوئی صاحبِ کمال اس مبحث پر ایسی مبسوط کتاب لکھے جسے ہماری یونیورسٹیوں کے بی۔اے یا منشی فاضل بآسانی سمجھ سکیں۔ نظم و نثر کی ہر سال سیکڑوں کتابیں شائع ہوتی ہیں یہ سچ ہے کہ نثر کی کتابوں کا عام معیار کافی بلند نہیں ہے مگر یہ خصوصیت تنہا ہمارے ملک کی نہیں ہے یورپ میں معمولی کتابوں کی بھرمار ہندوستان سے کہیں زیادہ ہے جوں جوں ملک میں تعلیم پھیلے گی تالیف و تصنیف کا ذوق بڑھے گا اور ہر طرح کی کتابیں شائع ہوں گی۔ مذاق سلیم اچھی کتابوں کو معمولی تصنیف و تالیف کے انبار سے اسی طرح چُن لے گا جیسے اناج بھوسی سے جُدا کیا جاتا ہے۔ گذشتہ پندرہ بیس سال میں اُردو میں بہت سی اچھی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں سید مسعود حسن رضوی کی کتاب "ہماری شاعری" اور حکیم ناطق لکھنوی کی "نظم اُردو" قابلِ ذکر ہیں چھاپہ خانہ کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اُسکے ذریعہ سے ہر طرح کے مصنفوں اور مؤلفوں کو اپنے خیالات پبلک کے سامنے پیش کرنے کا موقع ملتا ہے۔

پچاس ساٹھ برس پہلے شاعروں کی تعداد زیادہ نہ تھی نثر کی کتابیں لکھنے والے اور بھی کم تھے اب خدا کے فضل سے شاعروں۔ ادیبوں۔ انشاپردازوں اور فسانہ نگاروں کی تعداد معقول ہے اُردو اخباروں کی یہ کثرت ہے کہ اگر آج مولوی حالی صاحب زندہ ہوتے تو اُردو میں جتنے روزانہ اخبار صرف دہلی سے شائع ہوتے ہیں اُن سب کو بھی اطمینان کے ساتھ پڑھنے کا وقت نہ ملتا۔ ہفتہ وار اخبار اور ماہواری رسالے اس کے علاوہ ہیں۔

بدمذاقی کی ایک اور وجہ

انگریزی داں جماعت کی بدمذاقی کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ اساتذہ کے نادان دوست اُن کا کلام چھاپنے سے پہلے اُس عہد کی خصوصی زبان کو تبدیل کرکے ہمارے زمانہ کی اُردو کے الفاظ درج کر دیتے ہیں یہ نادان دوست اتنا نہیں جانتے کہ اُردو نے جو ارتقائی منزلیں اب تک طے کی ہیں اُن کا حال پڑھنے والے کو صرف اُس وقت ہی معلوم ہو سکتا ہے جب متروکات اور خاص خاص ترکیبیں جو اب مستعمل نہیں ہیں اُسی طرح درج کی جائیں جس طرح اساتذہ کے قلم سے نکلی تھیں مثلاً میر تقی کا مشہور شعر ہے ؎

میر کے دین و مذہب کو تم کیا پوچھو ہو اُن نے تو ٭ قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

اُردو کے نادان دوست جن کا جوش اُن کی استعداد اور مذاق سے کہیں زیادہ قابل قدر ہے پہلے مصرعہ کو بالعموم اس طرح اصلاح دے کر چھاپتے ہیں۔ میر کے دین و مذہب کو تم پوچھتے کیا ہو اُس نے تو۔ حالانکہ میر کے اصلی مصرعہ کے پھڑکتے ہوئے الفاظ "تم کیا پوچھو ہو" اور "اُن نے تو" ہیں جن کی بڑی خوبی اُن کی بے ساختگی ہے اس کے علاوہ ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس دور کی زبان کیا تھی۔ انگلستان میں اگر کوئی مطبع چاسر اور شکسپیر کے کلام میں موجودہ انگریزی زبان کے اقتضا کی بموجب تبدیلیاں کرکے چھاپے تو ایسی کتاب کو کوئی کوڑیوں کے مول نہ لے۔ اُردو پرانی زبان نہیں ہے تاہم ڈھائی سو تین سو برس پہلے کا اردو کلام موجود ہے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ادبی بے بضاعتی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ

وہ زبان اُردو کی تاریخ اور وقتاً فوقتاً زبان میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں اُس سے ناواقف ہیں اور اصلاح زبان کے ولولہ میں میرؔ اور سوداؔ کی خصوصیتوں اور ترکیبوں کو آج کل کی زبان کے سانچے میں ڈھالنا اور لکھنؤ کی دیدہ زیب کامدانی اور ڈھاکہ کی نازک ململ میں کھدر کا بدنما پیوند لگانا چاہتے ہیں جیسا ہر زبان کے ابتدائی دَور میں ہوتا ہے۔ اگلے وقتوں کی اُردو نثر کی کتابیں تعداد میں نظم سے بہت کم ہیں تاہم اگر آپ ایسی کتاب دیکھنا چاہیں جو آج سے تخمیناً ڈیڑھ سو برس پہلے اُس زبان میں لکھی گئی جو آج ملک میں رائج ہے تو میر امّن دہلوی کی کتاب باغ و بہار (قصّہ چہار درویش) پڑھیئے۔ ڈاکٹر عبدالحق صاحب کے بقول "یہ اردو نثر کی اُن چند کتابوں میں سے ہے جو ہمیشہ زندہ رہنے والی ہیں"۔ مرزا رجب علی بیگ سرورؔ نے اپنی کتاب فسانہ عجائب پچیس برس بعد لکھی اور اُس زمانہ کے مذاق کے موافق خوب لکھی مگر کتاب میں کوئی جدت نہیں ہے۔ عبارت رنگین مسجع اور مقفیٰ ہے۔ فارسی استعاروں اور تشبیہوں کی اس درجہ بھرمار ہے گویا فسانہ عجائب کسی فارسی قصّہ کا ترجمہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ فسانہ عجائب کو باغ و بہار سے وہی نسبت ہے جو کاغذی آرائش کو اُن تروتازہ خوشبودار پھولوں سے ہوتی ہے جن کی باغبانی خود قدرت نے کی ہو۔ موجودہ ادبی بدمذاقی کی ذمہ داری ایک حد تک اُن مطبعوں پر بھی عائد ہوتی ہے جو اساتذہ کا کلام غلط اور بہت غلط چھاپتے ہیں ایسے مطبع جو متقدمین و متوسطین کے صحیح دیوان اور کلیّات چھاپنے کی کوشش کریں اور روپیہ خرچ کرکے موجودہ اہلِ کمال سے اُن دواوین اور کلیات کی صحت کرائیں بہت کم ہیں۔ ملک کی ناداری کے باعث عام مطبع والوں کی عموماً کوشش یہ رہتی ہے کہ اساتذہ کا مجموعہ کلام کم سے کم قیمت پر عوام کے ہاتھ فروخت کرسکیں، صحت کا خیال نہیں ہوتا میرے نزدیک بڑی ضرورت ہے کہ کوئی ادارہ یا انجمن صحیح کلام چھپوانے کی ذمہ داری اپنے اوپر لے۔ مطبع نول کشور نے اب سے ساٹھ ستر برس پہلے اُس زمانہ کے اربابِ کمال کی خدمات حاصل کیں اور بہت سی کتابیں بڑی تحقیق کے بعد شائع کیں۔ مولوی فضل الحسن حسرت موہانی

کے اُستاد مولوی امیر اللہ صاحب تسلیم بھی اُن بزرگوں میں تھے جنہوں نے مطبع نول کشور میں کتابوں کی تصحیح کی خدمت عرصہ دراز تک انجام دی۔ اپنی طالب علمی کے زمانے میں آئین اکبری کا ایک نسخہ میں نے دیکھا تھا جس کو مطبع نول کشور نے سرسید احمد خاں مرحوم سے صحت کرانے کے بعد شائع کیا تھا اُس نسخہ میں سید صاحب کی لکھی ہوئی بہت سی یادداشتیں حاشیہ پہ درج تھیں۔ یورپ اور امریکہ میں یہ کام بڑی بڑی یونیورسٹیاں کرتی ہیں، انگلستان میں شاعروں اور ادیبوں کا کلام اور تصنیفات آکسفرڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیاں بڑی صحت اور اہتمام سے شائع کرتی ہیں۔ ہندوستان میں بھی خوش قسمتی سے اس کام کی انجمن ترقی اُردو۔ جامعہ ملیہ اور بعض دیگر اداروں نے ابتدا کر دی ہے۔ اگر کوئی انجمن، مکتبہ یا ادارہ مولوی فضل الحسن حسرتؔ کی خدمات حاصل کر سکے تو یہ کام بڑی خوبی سے انجام پا سکتا ہے۔ یوں تو نثر کی بھی بہت سی کتابیں غلط چھپی ہیں مگر میرؔ اور سوداؔ، مومنؔ اور ذوقؔ۔ ناسخؔ اور آتشؔ۔ انیسؔ اور دبیرؔ جیسے اساتذہ کا کلام جس بے احتیاطی سے مطبع والے شائع کرتے ہیں اُسے دیکھ کر دل بہت کڑھتا ہے۔ غالبؔ نے اپنی زندگی میں دیوان نہایت صحت کے ساتھ چھپوایا تھا۔ شرح نویسوں کی جدت پسندی نے شکسپیر کے شارحین کی طرح وہ بال کی کھال اُتاری ہے کہ مرزا زندہ ہوتے تو عش عش کرتے۔ اگر سخن فہم اور سخن شناس حضرات چاہتے ہیں کہ اور شعراء کے ساتھ بھی انصاف برتا جائے اور اُن کا کلام مسخ شدہ صورت میں پبلک کے سامنے پیش نہ ہو تو صحیح طباعت کی طرف جلد سے جلد توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

کیا اُردو فٹ بال ہے؟

جدت طراز طبیعتوں اور ترقی پسند ادب کے مدعیوں نے آج کل اُردو کو فٹ بال بنا رکھا ہے۔ یوں تو آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے کس کس کی شکایت کی جائے مگر ان نام نہاد ترقی پسند ادیبوں میں انگریزی داں حضرات پیش پیش ہیں اور آگے بڑھانے کی نیت سے اُردو ادب کی فٹ بال کو ٹھوکر لگانا اپنا قومی فرض سمجھتے ہیں مصلحان ادب کی یہ جماعت بڑی جوشیلی ہے۔ ہماری

بڑی خوش قسمتی ہے کہ اس جماعت کی اول صف کے مورچہ جمانے والوں میں ہندو مسلمان دونوں نظر آتے ہیں میں اس جماعت کی جدوجہد کی دل سے قدر کرتا ہوں اور دعا دیتا ہوں کہ بمصرعہ :۔ اللہ کرے حسن رقم اور زیادہ۔ مگر اتنا یاد رہے کہ ادب کی خوبصورت عمارت فٹ بال کا میدان نہیں ہے فٹ بال میں بے تحاشا ٹھوکریں لگانے سے کھیلنے والے منزل کے قریب پہونچ سکتے ہیں لیکن ادبی عمارت کے نقش ونگار اور پچے کاری میں یورپ کے گہرے اور بے روپ رنگ بھرنا ایسا ہی نامرغوب مکروہ اور بدنما ہوگا جیسی گورمنٹ ہند کے محکمہ آثار قدیمہ کی وہ ناشکور کوششیں جو اُس نے دہلی اور آگرہ کے قلعوں کے نازک کام کی مرمت کرنے، سنگِ مرمر میں سیمنٹ اور سنگ اسود میں مسالے اور کول تار کا جوڑ لگانے اور اس طرح کانے کو اندھا بنانے میں صرف کی ہیں امتداد زمانہ اور وحشیوں کے دستِ تظلم نے ان دونوں بے نظیر عمارتوں کے بعض حصّوں کو کانا بنا دیا تھا محکمہ آثارِ قدیمہ کے عملِ جراحی نے انہیں چوپٹ اندھا کر دیا۔ مجھے ڈر ہے کہ انگریزی داں مصلحانِ ادب کے ہاتھوں اُردو کا بھی کہیں یہی انجام نہ ہو۔ میرے نزدیک اُردو کی اصلاح یا اُس کے دائرہ کو وسیع کرنے کی کوشش میں سینہ زوری اور شدّت سے کام لینے کا دردناک نتیجہ یہ ہوگا کہ بجائے خدوخال پر زیادہ روپ برسنے کے اُس کی صورت مسخ ہو جائے گی اور امتداد زمانہ کے ساتھ جن جن صوبوں کی زبان اس وقت اُردو ہے وہاں ہر صوبہ کی بولی جُداگانہ ہو جائے گی۔ اس وقت سب سے زیادہ ضرورت یہ ہے کہ رسم خط کی اصلاح کی جائے۔ ہمارا رسم خط وہی ہے جس میں عربی یا فارسی لکھی جاتی ہے۔ اس رسم خط کا برقرار رکھنا لازمی ہے۔ اگر اس رسم خط کی بجائے کوئی ایسا رسم خط اختیار کیا جائے جو بائیں جانب سے دہنی طرف کو لکھا جاتا ہے تو اُردو پاک صاف زبان نہ رہے گی اور بالآخر اُس زبان سے مغلوب ہو جائے گی جس کا رسم خط اختیار کیا جائے گا۔

اُردو زبان کا تعلق موجودہ رسم خط سے

رسم خط کی تبدیلی کا مسئلہ یورپ کی کورانہ تقلید کے باعث پیدا نہیں ہوا بلکہ فی الحقیقت اُردو رسم خط پر ایک ایسا زبردست اعتراض وارد ہوتا ہے جس کا حتی المقدور دفع کرنا ہمارا فرض ہے۔ یہ اعتراض اُردو۔ فارسی اور عربی تینوں کے رسم خط سے تعلق رکھتا ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ جس طریقہ سے حروف ملا کر لفظ ان تینوں زبانوں میں بنائے اور لکھے جاتے ہیں اُس کے سیکھنے میں بچّوں اور اُن طلبا، کا جو ان تینوں زبانوں کی تحصیل کرنا چاہیں بڑا وقت صَرف ہو جاتا ہے۔ یہ دشواری صِرف بچّوں اور طلبا تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس زمانہ میں جو تحریک خواندگی بالغان کی ہو رہی ہے اُس کے پھیلانے میں موجودہ رسم خط کے باعث غیر معمولی دشواریاں پیش آتی ہیں جس شخص کی عمر تیس اور چالیس سال کے درمیان ہے اُس کو حروف شناسی اور عبارت پڑھنے میں جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اُن کے علاوہ حروف کے ملانے اور یہ یاد رکھنے میں کہ کون حرف کس کس حرف سے جائز طور پہ ملا کر لکھا جاسکتا ہے۔ لکھنے والے کے دماغ پہ غیر ضروری بار پڑتا ہے۔ ناگری کے حامیوں کی طرف سے اُردو رسم خط پر جو اعتراض کئے جاتے ہیں اُن میں ہمیشہ اس اعتراض کو مُقدّم رکھا جاتا ہے۔

ترکوں نے لاطینی رسم خط کیوں اختیار کیا

میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ ناگری کے طرفداروں کا یہ اعتراض کلیتاً نیک نیتی اور صداقت پہ مبنی ہے مگر ہم کو یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ اتاترک مصطفٰے کمال نے جن وجوہ سے مُتاثر ہو کر عربی رسم خط کی بجائے لاطینی رسم خط کو اختیار کیا اُن میں سب سے بڑی وجہ یہی دشواری تھی جو حروف ملانے کے باعث ان تمام زبانوں میں پائی جاتی ہے جو عربی یا فارسی رسم خط میں لکھی جاتی ہیں۔ اس مسئلہ پر متعدد ترکوں سے میری گفتگو ہوئی ہے جن میں مسٹر بورائے Boray کا نام خصوصیت سے قابلِ تذکرہ ہے۔ مسٹر بورائے

دو سال سے ہندوستان میں ٹرکی کے ٹریڈ کمشنر ہیں اور شملہ اور دہلی میں رہتے ہیں۔ اِن سب حضرات کی ذاتی علم کی بُنیاد پر یہ رائے ہے کہ ترکی میں لاطینی رسمِ خط جاری کرنے کا یہ اثر ہوا ہے کہ تعلیم بالغان نہ صرف ملک میں بڑی سُرعت سے پھیل گئی ہے بلکہ اسکول اور کالجوں کے زمانہ تعلیم کی میعاد میں بھی معتد بہ کمی واقع ہو گئی ہے۔ میں ترکی زبان سے ناواقف ہوں اس لئے اُس تجربہ کے بارہ میں جو اتا ترک نے لاطینی رسمِ خط کو اختیار کرنے میں کیا کسی قطعی رائے کا اظہار نہیں کرسکتا البتّہ اتنا جانتا ہوں کہ ہمارے حالات ترکوں کے حالات سے بالکل مختلف ہیں۔ اتحادِ نسل و مذہب و لباس و تاریخ و روایات و تہذیب و شائستگی کے باعث جو زبان بھی ترک اختیار کریں گے وہ سارے ملک کی زبان ہو گی اور اُس زبان کی حریف ٹرکی کی کوئی اور زبان نہیں ہو سکتی۔ ہمارے ملک کی یہ حالت ہے کہ انگریزی کے علاوہ جو حکومت کی زبان ہے ہندی بنگالی مرہٹی۔ گجراتی ٹمیل اور پنجابی ایسی زبانیں ہیں جو اپنے کو اُردو کا حریف سمجھتی اور اُردو پر غلبہ حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ ہم کو خارجی اور داخلی دونوں قسم کے حریفوں کا مقابلہ کرنا ہے۔

رسمِ خط کے مُعاملہ میں ترکوں کی تقلید خودکشی ہوگی

اس تمام بحث کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نہ رومن رسمِ خط کو اختیار کرسکتے ہیں نہ اُردو کو ناگری حروف میں لکھنے پر راضی ہو سکتے ہیں۔ ترکوں کی تقلید کرنے کی صورت میں انگریزی سے اور ناگری رسم خط اختیار کرنے کی حالت میں ہندی سے ہماری زبان مغلوب ہو جائے گی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ جوں جوں زمانہ گذرتا جائے گا ہماری زبان کی خصوصیّات جن کا تعلق تلفظ اور املا سے ہے کم ہوتی جائیں گی اور اُن خصوصیّات کی جگہ انگریزی یا ہندی کے الفاظ کا استعمال رفتہ رفتہ رواج پا جائیگا ہرزبان میں الفاظ کے تلفّظ اور معنی کا رسمِ خط سے ایسا گہرا تعلق ہے کہ تلفّظ اور معنی کو رسم خط سے جُدا کرنا بالکل ناممکن ہے مثلاً ہماری زبان میں ظ۔ ض۔ ذ۔ ز۔ چاروں حروف

کم و بیش ہم آواز ہیں اسی طرح ث ۔ س اور ص ۔ کی آواز بھی یکساں ہے ۔ ت اور ط کی آواز بھی ایسی ہی ملتی جلتی ہے جیسی ہ اور ح کی ۔ رومن یا ناگری رسم خط اختیار کرنے کی صورت میں صرف ز ۔ س ۔ ت اور ہ کار آمد حروف رہیں گے بقیہ حروف بے کار ہوجائیں گے ۔ اور اعتراضات کے علاوہ سب سے بڑا اعتراض اس تجویز پر یہ وارد ہوتا ہے کہ اس کو عملی جامہ پہنانے سے املا کے وجود کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے گا ۔

ہر زبان کی خصوصیت اِملا ہے

زبان کے لئے املا کی خصوصیت ایسی ہی لازمی ہے جیسے جوہر کے لئے عرض یا رنگ کے لئے کپڑا یا املا کی خصوصیت تنہا اردو فارسی اور عربی زبانوں میں ہی موجود نہیں ہے بلکہ دنیا کی تمام شائستہ اور ہمہ گیر زبانوں کا سنگِ بنیاد اُن کا املا ہے ۔ انگریزی اِملا کے اصلاح کی کوشش عرصہ دراز سے ہو رہی ہے مگر اس میں مطلق کامیابی نہیں ہوئی نہ آئندہ کسی کامیابی کی اُمید ہے ۔ امریکہ میں البتہ بعض الفاظ کے املا میں تھوڑی سی تبدیلی امریکہ والوں نے کرلی ہے ۔ مگر اس تبدیلی پر انگلستان کے باشندے ہنستے ہیں ۔ ان تمام وجوہ کی بنیاد پر میری قطعی رائے ہے کہ اگر ہم اس ملک میں اپنی تہذیب شائستگی ۔ تمدّن ۔ مذہب تاریخی روایات ادب اور زبان یعنی کلچر کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو ہمارا سب سے اہم فرض یہ ہے کہ موجودہ انقلابی دَور میں اپنے رسم خط میں کسی طرح کی تبدیلی نہ ہونے دیں اور بائیں جانب سے دہنی طرف کو جو زبانیں لکھی جاتی ہیں اُنکی طرف ترکوں کی کورانہ تقلید میں ہرگز توجّہ نہ کریں ۔ میری ناچیز رائے میں ہمارے کلچر یعنی اُن تمام باتوں کا جن کا تعلق ہماری تہذیب و شائستگی ۔ مذہب تاریخی روایات ۔ ادب اور زبان سے ہے انحصار موجودہ رسم خط کو برقرار رکھنے پر ہے ۔

اُردو کتابت کی اصلاح ۔ میری چار تجویزیں

اُردو کے ادیب اِملا کی کسی ایسی تبدیلی پر آمادہ نہیں ہو سکتے جس کا اثر زبان کی

خوبی اور لطافت پر بُرا اثر پڑے بعض تبدیلیاں البتہ ایسی ہیں جن سے بغیر املا کی تبدیلی کے اُردو کتابت کے دائرے کو زیادہ وسیع سہل اور مقبول بنایا جاسکتا ہے۔ اس بارہ میں چار تجویزیں میرے ذہن میں ہیں جن کو اُردو داں پبلک کے سامنے پیش کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ ایک تو یہ ہے کہ حروف جار اور بعض دوسرے سیدھے سادے حروف اور الفاظ کو اور حروف اور الفاظ سے نہ ملایا جائے۔ مثلاً۔ کا۔ کی۔ کے۔ گا۔ گی۔ گے۔ کو اور حرفوں یا لفظوں سے ملا کر اُردو کتابت میں مزید دشواریاں پیدا کرنے سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ دوسری تجویز یہ ہے کہ مُرکّب الفاظ خواہ فارسی کے ہوں خواہ ہندی کے اُن کے حصّے جُدا جُدا لکھے جائیں مثلاً "سمجھدار" کو سمجھ دار۔ "گلچیں" کو گل چیں۔ "آہنگر" کو آہن گر۔ "مہتاب" کو مہ تاب۔ "بیتاب" کو بے تاب۔ "کمیاب" کو کم یاب۔ "راہگیر" کو راہ گیر۔ "طلبگار" کو طلب گار۔ "فیلبان" کو فیل بان۔ "احسانمند" کو احسان مند۔ "المناک" کو الم ناک۔ "خشمگیں" کو خشم گیں۔ "نامور" کو نام ور لکھا جائے۔ مرکب الفاظ کے حصّوں کو علحدہ علحدہ لکھنے سے ایک حد تک کتابت کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ بعض مرکب الفاظ ایسے ضرور ہیں جن کے دونوں حصّوں کا علحدہ علحدہ لکھنا آنکھ کو بھلا نہیں معلوم ہوتا مثلاً۔ گل زار دست خط تن خواہ۔ رُخ سار۔ باغ بان۔ یہ پانچوں مُرکّب الفاظ مثال کے طور پر میں نے پیش کئے ہیں اس قبیل کے اور بھی بہت سے مُرکّب الفاظ ہوں گے جن کے حصّوں کا علحدہ علحدہ لکھنا نظر پر گراں گذرے گا لیکن میرے نزدیک کتابت میں سہولت اور اُردو رسم خط کو وسعت دینے کے لئے یہ مُناسب معلوم ہوتا ہے کہ پُرانے طریق کی بجائے نئی طرزِ کتابت اختیار کی جائے۔ تیسری تجویز۔ اِس اور اُس۔ اِن اور اُن کی کتابت سے تعلق رکھتی ہے۔ موجودہ طرزِ کتابت یہ ہے کہ عام طور پر اِن دونوں لفظوں کے نیچے زیر یا اوپر پیش نہیں لگایا جاتا بلکہ زیر یا پیش کے ساتھ اِن الفاظ کا پڑھنا۔ پڑھنے والے کی مرضی پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ میرے نزدیک مناسب یہ ہے کہ جب اِس یا اِن کا زیر کے ساتھ پڑھا جانا

مقصود ہو تو زیر نہ لگایا جائے اور جب پیش کے ساتھ پڑھا جانا مطلوب ہو تو بجائے پیش کے الف کے بعد واؤ لکھ دیا جائے اسی طرح ایک کم بیس (یعنی ۱۹) اور ایک کم تیس (یعنی ۲۹) کو اونیس اور اونتیس لکھا جائے۔ چوتھی تجویز یہ ہے کہ اگر کسی اسم کے آخر میں ہائے ہوّز یا ہائے مختفی (چھوٹی ہ) ہو تو واحد کو ہ سے اور جمع کو ے (یائے مجہول) سے لکھا جائے۔ مثلاً ایک ڈاک خانہ۔ چار ڈاک خانے۔ ایک درجہ۔ چار درجے۔ ایک ہفتہ چار ہفتے۔

اصلاحِ کتابت کی یہ چاروں تجویزیں نئی نہیں ہیں وقتاً فوقتاً ادیبوں نے اصلاحِ کتابت پر زور دیا ہے اور بعض ضروری باتیں ملک کے سامنے پیش کی ہیں۔ اُردو بڑھنے والی زبان ہے اور ہر بڑھنے والی زبان میں کتابت کی تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔ انگریزی کی کتابت میں گذشتہ ڈیڑھ سو برس میں کافی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔

مَیں نے اصلاحِ کتابت کے بارہ میں اُردو کے بعض ادیبوں سے مشورہ کیا جو تقریباً سب کے سب میری تجاویز کو مُفید سمجھتے ہیں۔ ایک دوست نے جو شوخ طبع بھی ہیں یہ اعتراض ضرور کیا کہ اوس (اسم اشارہ) اور اُوس (شبنم) نیز اون (اسم اشارہ) اور اُون (پشم) کی طرزِ تحریر میں کچھ امتیاز نہ رہے گا۔ میں نے جواب دیا کہ کتابت میں تشابہ ہوں سے بچنا ناممکن ہے مگر سیاقِ عبارت سے ہمیشہ معلوم ہو سکتا ہے کہ کون لفظ استعمال کیا گیا ہے مثلاً (مصرع) پڑ گئی اُوس چمن میں نہ ہوا ہے نہ ہوس۔ سے صاف معلوم ہوتا ہے، کہ لفظ اُوس سے شبنم مُراد ہے۔ اسی طرح (مصرع) اون سے ہم سے رسمِ اُلفت چُھٹ گئی۔ ڈنکے کی چوٹ بتا رہا ہے کہ لفظ اون سے مقصود معشوق ہے نہ کہ بھیڑ کے بال۔

جو چار تجویزیں اصلاحِ کتابت کے بارہ میں مَیں نے پیش کی ہیں اون کا نمونہ ذیل کے خط میں پیش کیا جاتا ہے جس میں حروف اور الفاظ علحدہ علحدہ یا یہ کہوں کہ جدید طرز سے لکھے گئے ہیں۔ اس خط سے معلوم ہو گا کہ ان تبدیلیوں کا اثر ہماری زبان پر انقلابی نہیں بلکہ اصلاحی ہو گا۔

سہارن پور - ۱۷ر جولائی ۱۹۴۳ء

کرم فرمائے بندہ۔ آپ کے خط کا اس قدر انتظار تھا کہ ڈاک خانہ جائے اور ڈاک لانے کے لئے میں نے پرس رام کو کہہ رکھا تھا۔ رات کے وقت معلوم ہوا کہ نام بردہ کو ایک سو تین درجے کا بخار ہے۔ ڈاک لانے کی خدمت کسی اور کے سپرد کی جائے۔ میں نے مہدی علی خاں ساکن حسن پور سے جو اس وقت موجود تھا کہا صبح کی ڈاک تم لانا۔ اُس نے دریافت کیا کس وقت ڈاک بٹتی ہے۔ میں نے کہا موئے اندھیرے جانا بے کار ہے۔ جب سورج پھیل جائے اُس دم گھر سے چلنا۔ مہدی علی سمجھ دار آدمی ہے۔ دن کے ساڑھے آٹھ بجے اُس نے ڈاک لا کر دی جس میں آپ کا خط بھی تھا۔

۱۔ خوب کلاں یہاں دست یاب نہ ہو سکی۔ کالی چرن کو اس وقت خط لکھا ہے کہ شاہ جہاں پور سے اونیں تو لے لیتا آئے۔ راستہ میں نواب گنج ٹھیر کر خوب کلاں حاضر خدمت کرے گا۔

۲۔ فتح یاب خاں توپ خانہ میں ملازمت کے خواہش مند ہیں اپنے دوست کپتان نام وار بیگ کے نام اگر آپ سفارش کا خط لکھ دیں تو اِس ہوش مند اور دیانت دار آدمی کا کام بن جائے۔ وہ اب بھی آپ کا تابع دار ہے آئندہ احسان مند بھی رہے گا۔

۳۔ غزل کے بارہ میں جو رائے آپ نے ظاہر کی ہے بس عین بین میرے دل کی بات ہے خمار کے بغیر مے کشی میں کیا لطف رہے گا۔ سنگ دِل مشکل بسمل سب قافئے اچھے ہیں۔

۴۔ فوجوں کی ریلیں دن رات یہاں سے گذر رہی ہیں جس کے باعث پھل کم یاب ہو گئے ہیں معلوم نہیں کم بخت لڑائی کب تک چلے گی۔ آموں کے پارسل کی رسید ہم رشتہ ہے۔

۵۔ برخوردار سعادت علی دو ہفتے یہاں رہ کر پرسوں بال بچّوں کے ساتھ گول کنڈہ روانہ ہو گئے وہاں سے کلکتہ جائیں گے۔ ایک ہزار میل سے اوپر کا سفر ہے۔

عقیدت مند

فتح علی

کتابت کا جو طریقہ اس وقت رائج ہے اُس کے لحاظ سے بہت ممکن بلکہ اغلب ہے کہ لکھنے والا بہت سے حروف اور الفاظ ملا کر لکھے اور خط نا خواندہ کی کتابت اس طرح کرے۔

سہارنپور۔ ۱۷ر جولائی سنہ ۱۹۴۳ء

کرمفرمائے بندہ۔ آپکے خط کا اسقدر انتظار تھا کہ ڈاکخانہ جانے اور ڈاک لانے کیلئے مینے پرسرام کو کہہ رکھا تھا رات کیوقت معلوم ہوا کہ نامبردہ کو ایکسو تین درجہ کا بخار ہے۔ ڈاک لانیکی خدمت کسی اور کے سپرد کیجائے مینے مہدیعلیخاں ساکن جسنپور سے جو اوسوقت موجود تھا کہا صبحکی ڈاک تم لانا۔ اوسنے دریافت کیا کسوقت ڈاک بٹتی ہے مینے کہا مُنہ اندھیرے جانا بیکار ہے جب سورج پھیلجائے او سدم گھر سے چلنا۔ مہدیعلی سمجھدار آدمی ہے دِنکے ساڑھے آٹھ بجے اوسنے ڈاک لاکر دی جسمیں آپکا خط بھی تھا۔

۱۔ خو بکلاں یہاں دستیاب نہوسکی۔ کالیچرن کو اسوقت خط لکھا ہے کہ شاہجہانپور سے اُنیس تولہ لیتا آئے راستہ میں نوابگنج ٹھیر کر خو بکلاں حاضر خدمت کریگا۔

۲۔ فتحیاب خاں توپخانہ میں ملازمت کے خواہشمند ہیں اپنے دوست کپتان نامدار بیگ کے نام اگر آپ سفارش کا خط لکھدیں تو اس ہوشمند اور دیانتدار آدمی کا کام بنجائے۔ وہ اب بھی تابعدار ہے آئندہ احسانمند بھی رہیگا۔

۳۔ غزل کے بارہمیں جو رائے آپنے ظاہر کی ہے بس عین بین میرے دلکی بات ہے خمار کے بغیر میکشی میں کیا لُطف رہیگا۔ سنگدل مشکل بسمل سب قافئے اچھے ہیں۔

۴۔ فوجونکی ریلیں دن رات یہانسے گذر رہی ہیں جسکے باعث پھل کمیاب ہوگئے ہیں معلوم نہیں کمبخت لڑائی کبتک چلیگی۔ آمونکے پارسل کی رسید ہمرشتہ ہے۔

۵۔ برخوردار سعادتعلی دو ہفتہ یہاں رہکر پرسوں بال بچّوں کیساتھ گولکنڈہ روانہ ہوگئے وہانسے کلکتہ جائینگے ایکہزار میل سے اوپر کا سفر ہے۔

عقیدتمند
فتحعلی

حروف ملانے کی دشواریاں

حروف ملانے سے جو دشواریاں پیدا ہوتی ہیں اُس کا احساس عام طور پر اِس لئے نہیں ہوتا کہ بچپن سے ہم کو حروف اور الفاظ ملانا سکھایا جاتا ہے۔ جس کے باعث غیر ضروری حروف اور الفاظ کو ملا کر پڑھنے اور لکھنے کی عادت ہماری طبیعت ثانی ہوگئی ہے۔ جب میں پبلک سروس کمیشن کا ممبر تھا تو انڈین سول سروس کے امیدواروں کا زبانی امتحان ایک کمیٹی لیتی تھی جس کا میں ہر سال ممبر ہوتا تھا۔ ایک سال مجھے خیال آیا کہ جن امیدواروں نے امتحان میں فارسی لی ہے اُن سے کچھ ایسی عبارت یا شعر پڑھواؤں جس میں غیر ضروری حروف اور الفاظ ملا کر لکھے گئے ہوں خوش خطی کے نمونوں کی ایک کتاب میرے پاس اُس زمانہ میں موجود تھی جس میں فارسی اور اُردو کی رباعیاں اور اشعار مختلف خوش نویسوں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے موجود تھے۔ میں نے بعض امیدواروں سے ایک شعر پڑھوایا جو حسب ذیل طریقہ سے لکھا ہوا تھا۔ شعر:-

چمنمینمستگلردیاں جوپیکیملجھکیہونگے
توپابوسیکوپھرکسکسطرحکیگلجھکیہونگے

جن امیدواروں سے میں نے یہ شعر پڑھوایا اُن میں تقریباً ایک تہائی شعر پڑھ سکے ایک تہائی نے شعر پڑھا مگر کئی منٹ تک سوچنے اور سمجھنے کے بعد اور پھر بھی کچھ لفظ غلط پڑھے اور کچھ صحیح۔ ایک تہائی پڑھنے سے قاصر رہے۔ اِس شعر کی معمولی کتابت درج ذیل ہے:-

چمن میں مست گُل ردیاں جو پی کے مُل جھکے ہونگے
تو پا بوسی کو پھر کِس کِس طرح کے گُل جھکے ہونگے

اُردو اور ہندی اور ہندوستانی اُردو اور ہندی کو اگر بیاہے ہوئے مرد اور عورت کی اولاد سے تشبیہ دی جائے تو ہندوستانی کو بن بیاہی عورت کا بچہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ اِس طرح کی اولاد کی جو گت اکثر بنتی ہے، وہی ہندوستانی کی ہو رہی ہے۔ بچّہ تو بُرا نہیں ہے مگر اِس کو کیا کیا جائے کہ نہ ماں خوش ہے نہ باپ خوش مُسلمانوں کو شکایت ہے کہ ہندوستانی میں سنسکرت کے غیر مانوس اور مشکل الفاظ ٹھونسے جاتے ہیں۔ ہندوؤں کو شکوہ ہے کہ عربی اور فارسی کے موٹے موٹے الفاظ بھرے جاتے ہیں۔ میں عرصہ تک یہ خواب دیکھتا رہا کہ ہندوستانی آگے چل کر مُلک کی مشترکہ زبان ہوگی۔ جنوبی افریقہ سے واپسی کے بعد میری سب سے بڑی اور عزیز سیاسی تمنا یہ تھی کہ ملکِ ہند میں مُتّحدہ قومیّت قائم ہو۔ قومیّت کا سب سے اہم جزو زبان کا اشتراک ہے۔ سیاسی قومیّت جُدا ہونے کی حالت میں بھی ایک زبان بولنے والی قوموں کے درمیان وہ یگانگت ہوتی ہے جو دیگر تعلّقات پر غالب آتی ہے۔ یورُپ کی سنہ ۱۸-۱۹۱۴ء کی جنگ میں امریکہ (یونائیٹڈ اسٹیٹس) نے انگلستان کا ساتھ دیا۔ بعض مُورّخوں کا خیال ہے کہ امریکہ والے فرانس کو بچانے کی نیّت سے شریکِ جنگ ہوئے تھے۔ اِس خیال کی تردید امریکہ کی موجودہ جنگ میں شرکت سے ہوتی ہے۔ امریکی قومیّت کے اصول کو سمجھنا آسان کام نہیں ہے۔ آبادی کی ساخت پر نظر ڈالیئے تو معلوم ہوگا کہ اہلِ امریکہ کا قوموں میں وہی درجہ ہے جو سَت نجے کا غلّہ میں یا جو کھچڑے کا کھانوں میں ہے۔ سب سے بڑی آبادی اُن لوگوں کی ہے جن کے مورث سترہویں اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں انگلستان سے امریکہ جا کر آباد ہوئے تھے تاہم جرمن، اطالوی ہسپانوی اور آئرستانی (آئرِش) نسل کے لوگ بھی بڑی تعداد میں آباد ہیں مگر سارے ملک کی زبان انگریزی ہے جس کے باعث جو رشتہ امریکہ کا انگلستان سے ہے اور ملکوں سے نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہر ملک کی قومیّت کا دارومدار زبان پر نہیں ہے۔ سوئٹزرلینڈ میں تین زبانیں

یعنی فرانسیسی، جرمن اور اطالوی بولی جاتی ہیں۔ کینیڈا میں دو زبانیں رائج ہیں یعنی فرانسیسی اور انگریزی۔ رُوس میں متعدد زبانیں رائج ہیں اور رُوس کی بعض سوویٹ جمہوریتوں میں تعلیم اُسی زبان میں ہوتی ہے جو اُس جمہوریت میں بولی جاتی ہے۔ اِن تمام باتوں کے باوجود اِس حقیقت سے انکار نہیں ہوسکتا کہ اتحادِ زبان کا مسئلہ صرف اُس جذبہ سے کم ہے جو لوگوں کے درمیان ایک ہی گورنمنٹ کی رعایا یا ایک ہی حکومت کا شہری ہونے سے قائم ہوتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ بعض اوقات اتحادِ زبان کا رِشتہ اُس رِشتہ سے بھی زیادہ مضبوط ہوتا ہے جس میں ایک ہی حکومت کے شہری باہم منسلک ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں نسل، مذہب اور طرزِ معاشرت کے اتنے کثیر اور اہم اختلافات موجود ہیں کہ میرے نزدیک جب تک ملک کی کثیر آبادی کی ایک ہی زبان نہ ہوگی اُس وقت تک متحدہ ہندی قومیت کا تخیل کیسا ہی دلفریب کیوں نہ معلوم ہو مگر حاصل نہیں ہوسکتا۔ لالہ لاجپت رائے کے تذکرہ میں میں نے کسی جگہ لکھا ہے کہ ہر ہندی جس کو چند سال تک مغربی ممالک میں رہنے کا موقع ملے خالص وطن پرست ہوجاتا ہے۔ جنوبی افریقہ سے واپسی کے بعد میں بھی وطن پرستی کے جذبہ میں ڈوبا ہوا تھا میرا خیال تھا کہ ہائی اسکول کی تعلیم شروع سے لیکر آخر تک ہندوستانی میں ہو اور سرِ دست مدراس۔ بنگال۔ مہاراشٹر اور بعض دیگر خطوں کو چھوڑ کر باقی تمام صوبوں میں تعلیم ہندوستانی زبان میں دی جائے میری مُراد ہندوستانی سے وہ زبان ہے جس میں سنسکرت۔ عربی اور فارسی زبانوں کے غیر مانوس اور مشکل الفاظ نہ ٹھونسے جائیں۔ اب بھی ان تینوں زبانوں کے لفظوں سے ہندوستانی بھری پڑی ہے آئندہ بھی ان زبانوں کے ایسے الفاظ جن کی ہندوستانی میں کھپت ہے لے لئے جائیں مگر زبان کے دائرہ کو وسیع اور عوام کے لئے سہل بنانے کی غرض سے ہندوستانی کو سنسکرت یا عربی اور فارسی کی لونڈی بنانے کی کوشش ہرگز نہ کی جائے۔ شیخ چلّی کی طرح میں اپنے منصوبوں میں محو تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ ہندوستانی کو ہائی اسکول کی تعلیم کی مشترکہ زبان بنا کر رسم خط کے

مسئلہ کو اس طرح طے کیا جائے کہ اسکول کی درسی کتابیں فارسی رسم خط اور ناگری رسم خط دونوں میں چھاپی جائیں اور طالب علم کو اختیار دیا جائے کہ جس رسم خط کی لکھی ہوئی کتاب چاہے پڑھے۔ یونیورسٹی کی تعلیم کے بارہ میں میرا خیال یہ تھا کہ ہندوستانی میں اس قدر صلاحیت اور جامعیت نہیں ہے کہ وہ پیچیدہ ادبی اور علمی مسائل کے اظہار کا بار اٹھا سکے اِس دشواری کا حل میں نے اپنے ذہن میں یہ سوچا تھا کہ یونیورسٹی میں داخل ہونے کے بعد ہر طالب علم بجائے ہندوستانی کے اُردو یا ہندی لے سکے۔ مشرق کی اعلیٰ ادبی زبانوں یعنی فارسی۔ عربی یا سنسکرت کا علم اگر طالب علم حاصل کرنا چاہے تو بجائے اُردو یا ہندی کے ان تینوں میں سے کسی ایک زبان کے پڑھنے کا اسے اختیار دیا جائے۔ میرے نزدیک یہ ایسی تجویز تھی جس سے نہ مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس لگتی تھی نہ ہندوؤں کے۔

زبان کا اکھاڑا اور ادب و سیاست کی کُشتی

متحدہ قومیت کے جذبہ نے مجھے دو برس تک اِس خواب پریشان میں مُبتلا رکھا۔ رفتہ رفتہ میری آنکھوں سے پردے اُٹھتے گئے اور مجھے معلوم ہوا کہ زبان کا قضیہ ہماری بدقسمتی سے محض زبان کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ اُس کا سنگِ بُنیاد دراصل سیاسی غلبہ حاصل کرنے کی خواہش ہے۔ مسٹر کرشن پرشاد کول[۱] لکھتے ہیں "اُردو اور ہندی کا جھگڑا پُرانا ہے، اِس جھگڑے کی بِنا سیاسی بلکہ قومی ہے۔ یہ ادبی قضیہ نہیں۔ یہاں اس واردات کی سرگزشت کے سرسری بیان کا بھی موقع نہیں تاہم احباب کو یہ یاد دلانا بے محل نہ ہوگا کہ اِس قضیہ کا شور پہلے پہل اُس کے بعد سُننے میں آیا۔ کہ جب سرسیّد مرحوم نے کانگرس کی مخالفت اِس

---

[۱] دیکھو مضمون "اُردو ہندی اور ہندوستانی" جو ہندوستانی اکیڈیمی کے تماہی رسالہ ہندوستانی کے اپریل ۱۹۳۶ء کے پرچہ میں صفحہ ۱۰۹ پر شائع ہوا ہے۔ میں نے پوری عبارت اس لئے نقل کردی ہے تاکہ قابل مضمون نگار کا صحیح مفہوم معلوم ہو سکے۔

صوبہ میں شروع کی تھی اِس جھگڑے کا تانتا بعد میں مُسلم لیگ اور ہندو سبھا کی شکل میں جاری رہا اور اب بھی جاری ہے۔ غرض کہنے کی یہ ہے کہ اس جھگڑے کی بنا قومی تعصّب یا سیاسی اختلاف سے پڑی"۔ مسٹر کول کی ہمّت قابل داد ہے کہ اُنہوں نے سچی بات صاف طور سے کہہ دی۔ البتّہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دو جماعتوں میں جن کا مذہب بدقسمتی سے مختلف ہے۔ پولیٹکل اختلاف پیدا ہو جانے کی صورت میں اگر ایک جماعت دوسری جماعت سے اِس طرح انتقام لے کہ پولیٹیکل اختلافات کے باعث مُشترکہ زبان کو چھوڑ کر اپنی خالص زبان کو جس سے دوسری جماعت ناآشنا ہے مُلک کی مشترکہ زبان بنانے کی کوشش کرے تو اِن دونوں جماعتوں میں اتحادِ عمل کی اُمّید کہاں تک جائز ہو سکتی ہے۔ ان حالات میں اتحادِ عمل کے خواب کی تعبیر مصرعہ۔ ایں خیال است و محال است و جنوں۔ کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتی۔ میری ناچیز رائے میں اُردو کے حامیوں اور قدردانوں کا ہندوستانی کو مُلک کی مشترکہ زبان بنانے کی کوشش کرنا اپنے کو بڑے خطرہ میں ڈالنا ہے۔ اِس کوشش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستانی کو تو مشترکہ زبان بننے کا درجہ حاصل نہ ہوگا اُردو کو البتّہ اُن نئے تجربوں کے باعث جو مُلک میں کئے جا رہے ہیں سخت نقصان پہونچ جائے گا اور ہمارا حال یہ ہوگا کہ دُبدھا میں دونوں گئے مایا ملی نہ رام۔ وجہ صاف ہے ہندوستانی ایسا بچّہ ہے جس کا باپ اُردو ادب اور ماں ہندی یا بھاشا ہے۔ بدقسمتی سے بچّہ نے سوا دو برس تک کانگریسی وزارتوں کی چھاتی کا دودھ پیا ڈھائی تین برس کے بچہ کی بساط ہی کیا ہوتی ہے مگر ماں کے دودھ کا اثر دیکھیے ماں کے عروج کے زمانہ میں اس ننھی سی جان (ہندوستانی) نے کھیل کھیل میں باپ (اُردو ادب) کی مونچھیں کھینچیں اور کان پکڑے باپ نے مُنہ چُوما تو "ماتا جی ماتا جی۔ مجھے اشنان کراؤ پوتر کرو" کے شور سے سارے مُلک کو سر پر اُٹھا لیا۔ سچ پوچھیے تو بچّہ کو الزام دینا ناواجب ہے بچّے کو جیسا اٹھائیے اُٹھے گا۔ یہ حالت اکثر اُن بچّوں کی ہوتی ہے جن کی ماں روپے والی اور اختیار والی اور باپ شریف مُفلس ہو۔

کانگریسی ماں کے تو بہت سے مشغلے تھے اب وہ اور دھندوں میں لگی ہوئی ہے بچے کی طرف زیادہ توجہ آج کل نہیں ہے۔ کچھ عرصہ سے بچہ باپ کو کبھی کبھی ابا جان کہہ کر پکارنے لگا ہے قبلہ و کعبہ نے اِس اظہار محبت سے دھوکا کھایا تو سر پکڑ کر رو دیں گے۔ سرِ دست بچہ نہ ماں سے بگاڑنا چاہتا ہے نہ باپ سے لیکن انجام کار دونوں میں سے جس کا پلّہ بھاری دیکھے گا اُسی کا ہو رہے گا۔

ناٹک یا تھیٹر اور ڈرامہ نویسی

اُردو میں ڈرامہ نویسی کی ابتدا امانت نے ۱۸۵۳ء میں اندر سبھا لکھ کر کی انگریزی پولیٹیکل اثر تو اس تصنیف سے پچاس سال پہلے اتنا پھیل چکا تھا کہ لارڈ موائرا کی شہ پر غازی الدین حیدر بادشاہ بن بیٹھے تھے مگر ہماری شاعری اور ادب اُس وقت تک مغربی اثرات سے بالکل محفوظ تھے جس کی سب سے بڑی دلیل خود اندر سبھا کا خاکہ (پلاٹ) اور اُسکے کردار ہیں۔

یونان اور ہند کے ڈرامے ڈرامہ جس یونانی لفظ کی بدلی ہوئی صورت ہے اُس کے معنی ہیں روپ بھرا یا سوانگ کیا یا کھیل کھیلا۔ تھیٹر بھی یونانی زبان کے ایک لغت سے مشتق ہے اُس لفظ کے معنی ہیں دیکھنے کی جگہ یعنی منظر۔ اہلِ یونان نے ڈرامہ نویسی میں بڑا کمال حاصل کیا تھا جو کھیل حاضرین کے سامنے پیش کیا جاتا تھا اُس کے تین اصول حکیم ارسطو (ارسطاطالیس) نے عالمانہ تحقیقات اور غور و خوض کے بعد قائم کئے تھے۔ یہ تینوں اصول تہری مطابقت (اتحادات ثلاثہ) کے نام سے مشہور ہیں، وہ اصول یہ تھے مطابقت زماں (وقت)، مطابقت مکاں (مقام)، مطابقت عمل پہلے اصول کا مفہوم یہ تھا کہ جتنے وقت یا عرصہ میں کوئی واقعہ ظہور پذیر ہوا ہو کھیل یا تماشہ کے دکھائے جانے میں بھی اُسی قدر وقت یا عرصہ لگے۔ ارسطو کے دوسرے اصول کے یہ معنی تھے کہ جس جگہ کوئی واقعہ گذرا ہو اُس جگہ کی ہو بہو تصویر ناظرین کے سامنے پیش کی جائے۔ اتحاد عمل کا یہ مطلب تھا کہ کھیل کرنے والا اپنے جذبات کا اظہار گفتار و کردار یعنی بات چیت اور چشم و ابرو کے اشارے اور اعضائے بدن کی حرکت و سکون سے اُسی طرح کرے جیسا اُس شخص نے کیا تھا جس کی وہ نقل اُتار رہا ہے۔ ملک ہند میں آریوں نے ڈرامہ نویسی کے فن کو بڑی ترقی دی۔ مہابھارت اور رامائن کے بہت سے حصے اس فن کی اچھی مثالیں ہیں شکنتلا کے

ناٹک کا جو کالی داس نے گیارہویں صدی عیسوی میں لکھا تھا دنیا کے بہترین ڈراموں میں شمار ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اس ناٹک کا جواب دنیا کے کسی اور ملک کے ڈراموں میں مشکل سے ملے گا اگر موجودہ نسل جاننا چاہتی ہو کہ قدیم اہل ہند نے فنون لطیفہ کی اس شاخ میں کتنی ترقی کی تھی تو اسے شکنتلا کا ناٹک ضرور پڑھنا چاہیئے۔
اسلامی شریعت کے احکام کی جو تعبیر ہمارے اُن علما نے کی جن کی جدوجہد کے باعث علم فقہ کی تدوین ہوئی اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ موسیقی اور ڈراما دونوں ممنوع قرار دیئے گئے۔ مذہب کی قوت بڑی زبردست قوت ہے تاہم حقیقت یہ ہے کہ فطرتِ انسانی عارضی طور پر مذہبی قوت یا کسی اور طاقت سے مغلوب ہو جائے لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ اس غلبہ کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ اموی حکومت اور عباسی خلافت کے زمانہ میں علما کے احکام کے باوجود موسیقی اپنا راگ گاتی رہی اور عباسیوں کے دور میں فن موسیقی کے بڑے بڑے اہل کمال پیدا ہوئے ڈرامے کا فن البتہ کس مپرسی کی حالت میں رہا جس کی وجہ یہ ہے کہ قدیم عرب میں یہ فن موجود نہ تھا نہ اُن ملکوں میں جن پر اسلام کے بعد عربوں کا تسلط ہوا یا جن سے عربوں نے میل جول بڑھایا اس فن کی نمایاں ترقی ہوئی تھی، کچھ زمانہ تک ایران میں عشرۂ محرم کی عزاداری کے سلسلہ میں معرکۂ کربلا کے بعض واقعات ایسی صورت میں البتہ پیش کئے جاتے تھے جس میں ناٹک کا شائبہ تھا مگر یہ کام خالص مذہبی کام سمجھا جاتا تھا اور جو لوگ اُس میں شریک ہوتے تھے اُن کی نیت حصولِ ثواب تھی اس لئے یہ فن ایران میں بھی نہ پنپا۔ ہمارے ملک میں دسہرہ کے زمانہ میں البتہ شری رام چندر جی کی لنکا والی مہم کے حالات ناٹک کی صورت میں پیش ہوتے رہے مگر اہل ادب نے اس طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی اور بدقسمتی سے یہ فن جہاں پہلے تھا وہیں رہا بلکہ اور بھی گھٹ گیا۔

ہندوستان کے بھانڈ اور نقّال باقاعدہ تھیٹر نہ ہونے کے باوجود سوانگ کھیلنے اور نقلیں اُتارنے کے فن کو ہمارے ملک میں بھانڈوں اور نقّالوں نے اختیار کیا اور اچھی ترقی دی غالباً اس فن کی ابتدا محمد شاہ رنگیلے کے زمانہ میں ہوئی۔ فرماں روایان اودھ کے عہد میں بھانڈوں کا ایک مستقل طائفہ دربار سے وابستہ تھا جو کشمیری کے نام سے موسوم تھے اس جماعت میں بعض بہت اچھے نقّال یعنی کھیل کرنے والے پیدا ہوئے۔ کھیل کا خاکہ (پلاٹ) بسا اوقات پہلے سے طے کر رکھتے تھے مگر فی البدیہہ

جو کچھ کہتے تھے اُس سے ذکاوت، ذہانت، فہم و فراست اور جولانیٔ طبع کا پتہ چلتا ہے۔ لکھنؤ کے بھانڈوں کا لطیفہ مشہور ہے کسی نواب کی محفل میں بڑی اچھی نقل کی نواب صاحب نے خوش ہو کر دوشالہ انعام میں دیا۔ دوشالہ پُرانا تھا ایک بھانڈ دوشالہ کو بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ دوسرے نے کہا کیا دیکھ رہے ہو جواب دیا دیکھ نہیں رہا ہوں پڑھنے کی کوشش کر رہا ہوں دوشالہ پر کچھ لکھا ہے۔ دوسرے نے کہا پڑھو ہم بھی سنیں کیا لکھا ہے۔ پہلے بھانڈ نے کہا لو میں نے پڑھ لیا اس پر لکھا ہے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ دوسرے نے کہا بڑے نادان ہو غلط پڑھ رہے ہو۔ دوشالہ تو محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانہ سے پہلے کا ہے اس پر پورا کلمہ شریف لکھا ہوا نہیں ہو سکتا۔ نواب صاحب کی بھری محفل میں بڑی کرکری ہوئی نو دولتے ہوتے تو آپے سے باہر ہو جاتے مگر پوتڑوں کے رئیس تھے۔ اس حاضر جوابی کے صلہ میں ایک نیا دوشالہ دیکر بھانڈوں کو راضی کیا۔

میری طالب علمی کے زمانہ میں کاشی پور[۵۱] کے بھانڈ بھی مشہور تھے اور خوب نقل کرتے تھے۔ اُس زمانہ میں بھانڈوں کی عام حالت یہ تھی کہ ظرافت سے تہذیب پناہ مانگتی تھی اُمرا کے بیاہ شادی کی تقریبوں میں مشہور گانے ناچنے والیوں کے ساتھ بھانڈ بھی بُلائے جاتے تھے اور گانا ختم ہونے پر نقلیں کرتے تھے بہت عرصہ ہوا ایک محفل میں بھانڈوں نے جو نقل کی تھی مجھے یاد ہے ایک بھانڈ خاوند بنا تھا اور دوسرا جورو۔ کسی بات پر بدمزگی ہو گئی اور جورو نے خاوند کو مارنا شروع کیا۔ اہلِ محفل میں سے کسی نے یہ نادانی کی کہ بآواز بلند کہا "اور مار" خاوند نے فوراً جواب دیا "مار نیک بخت مار۔ یہ تیرا بھائی بھی بولا اب کیوں نہ مارے گی"۔ بعض نقلیں اچھی ہوتی تھیں مگر عموماً گندے اور فحش الفاظ کی اس قدر بھرمار ہوتی تھی کہ ظرافت سے خوش ہونے کے بجائے اکثر اہلِ محفل کی طبیعتیں مکدر ہو جاتی تھیں۔ تھیٹر نے بھانڈوں کو نقصان پہونچایا اور سینما اور ریڈیو نے غریبوں کا خاتمہ کر دیا۔ اپریل ۱۹۴۱ء میں برخوردار حمزہ علی کی شادی کے موقع پر کندرکھی کے بھانڈ بھی آئے تھے معلوم ہوا تعداد میں پچیس ہیں۔ اتنی بڑی جماعت کی گذر شادی بیاہ کے انعام و اکرام سے نہیں ہو سکتی۔ اس گروہ کو کوئی اور پیشہ اختیار کرنا چاہیئے۔

---

۵۱ کاشی پور پہلے ضلع مراد آباد میں تھا مگر غدر کے پیشتر ضلع نینی تال میں شامل کر دیا گیا اور اب اُس ضلع کا جزو ہے۔

ہندوستان میں تھیٹر کا نیا دور

ناٹک اور ڈرامہ نویسی کی طرف اس زمانہ میں ہمارے ملک کی جو توجہ ہے اس کے لئے ہم انگلستان والوں کے مرہونِ منت ہیں ہمارے ملک پر انگلستان کے تسلط کا یہ نتیجہ ہوا کہ جو چیزیں انگلستان سے ہندوستان میں آئیں اُن میں ناٹک اور ڈرامہ نویسی بھی ہیں۔ علی گڈھ کالج کے چندہ کے لئے خود سر سید احمد خاں علیہ الرحمہ نے ایک ناٹک کیا تھا جس میں کھیل کرنے والے خود اُن کے رفقا اور احباب تھے۔ اب اس کھیل کی ایک تصویر (فلم) بن گئی ہے اور حیدرآباد دکن اور بعض دیگر مقامات کے سینماؤں میں دکھائی جا چکی ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ تصویر ابھی تک دہلی میں نہیں دکھائی گئی۔ اب سے اسّی برس پہلے بمبئی میں کئی تھیٹر قائم ہو چکے تھے جب میں علی گڈھ میں پڑھتا تھا تو بمبئی کی دو مشہور تھیٹر کی کمپنیاں یعنی اولڈ ایلفریڈ اور نیو ایلفریڈ شمالی ہندوستان کا دورہ کیا کرتی تھیں یہ کمپنیاں بڑے بڑے شہروں میں جن میں لاہور، لکھنؤ اور الہ آباد قابل ذکر ہیں اپنے کھیل دکھایا کرتی تھیں۔ مگر ان کمپنیوں کے تماشوں کی سب سے زیادہ قدر اُجڑی ہوئی دلّی نے کی میں نے خود بھی ۱۸۹۹ء یا ۱۹۰۰ء میں ان کمپنیوں کے تماشے دیکھے تھے۔ اولڈ ایلفریڈ کمپنی کا ایک ایکٹر دس بارہ سال کی عمر کا ایک خوش گلو لڑکا تھا اُس کا ایک گیت "اہا مجھے درد جگر نے ستایا" ایک تماشہ میں میں نے بھی سُنا تھا دلّی والوں کو یہ گیت بہت پسند تھا۔ تماشوں کی زبان بمبئی کی اُردو تھی جو ادبی اُردو تو نہ تھی مگر ہمارے زمانہ کی ہندوستانی سے بدرجہا بہتر تھی۔ تھیٹر کا حال ہمارے ملک میں یہ تھا کہ انگریزی موسیقی کے اتباع میں اُسی وضع کا سیدھا سادا اگر بے ہنگم گانا بجانا اور بے تکی شاعری کافی تھی مگر کھیل یعنی ایکٹنگ کی خوبی بہت کم پائی جاتی تھی۔ تھیٹر کی ساری غرض تفریح تھی۔ کھیل دیکھ کر لوگ جتنا زیادہ ہنستے اور خوش ہوتے تھے کھیل اُسی قدر اچھا اور کامیاب سمجھا جاتا تھا۔ بڑی خرابی یہ ہوئی کہ ذوقِ سلیم رکھنے والے اہلِ ادب اور اہل قلم نے تھیٹر کی طرف توجہ نہ کی۔ دنیا کا قاعدہ ہے کہ کوئی کام پڑا نہیں رہتا۔ جو لوگ کسی خاص کام کے کرنے کے اہل ہیں جب وہ بے اعتنائی برتتے ہیں تو وہ کام ان لوگوں کے ہاتھ میں آ جاتا ہے جو اس کے کرنے کی خاص صلاحیت نہیں رکھتے۔ اسی اصول کے ماتحت تھیٹر میں

شاعروں کا مرتبہ تک بندوں کو حاصل ہوا اور انشا پردازوں کی جگہ ایسے نثر نگاروں کو ملی جنکی عبارت میں گو کوئی ادبی خوبی نہ تھی لیکن ایسا لوچ ضرور تھا جو عوام کو اپنی طرف مائل کر سکے۔

ہندوستان اور سینما اب تھیٹر کی جگہ سینما نے لی ہے۔ پہلے تصویریں خاموش ہوتی تھیں اور جو گفتگو اب سینما کے ایکٹر اپنی زبان سے کرتے ہیں وہ ۱۹۱۵ء میں عبارت میں لکھدی جاتی تھی۔ تاکہ حاضرین کو معلوم ہو جائے کہ ایکٹر کیا کہہ رہا ہے۔ جب خاموش تصویروں کا رواج ہوا ہے اُسی وقت جاننے والوں کی یہ رائے تھی کہ سینما تھیٹر کا نہایت خوفناک رقیب ثابت ہوگا۔ بولنے والی تصویروں کی ایجاد کے بعد اس رائے کی صحت میں کسی کو شک شبہہ باقی نہ رہا۔ اُنیسویں صدی عیسوی کے آخر اور بیسویں صدی عیسوی کے شروع میں تھیٹر کی سب سے زیادہ قدر انگلستان اور فرانس میں تھی۔ ان دونوں ملکوں میں بڑے اچھے اچھے ایکٹر پیدا ہوئے۔ ایکٹنگ کی سب سے بڑی تعریف یہ ہے کہ وہ قانونِ قدرت کے مطابق ہو مثلاً خوشی کے موقع پر نہ صرف الفاظ ایسے ہوں جن سے مسرّت ظاہر ہوتی ہو بلکہ اندازِ کلام، لب لہجہ بلکہ خود چہرہ سے بشاشت ٹپکے۔ اسی طرح رنج و غم کے موقع پر ساری باتیں ایسی ہونی چاہئیں جو حُزن و ملال سے مُناسبت رکھتی ہوں۔

ہماری تصویروں کی خامیاں اس بات کا خیال رکھنا بھی نہایت ضروری ہے کہ کھیل میں جس زمانہ کے حالات کا تذکرہ ہو اُن حالات کو اُسی زمانہ کے نقطۂ نظر سے بیان کیا جائے مثال کے طور پر ایک تصویر کا تذکرہ کرتا ہوں جس نے ملک میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کی تھی۔ پُکار اچھی تصویر تھی جو شملہ میں ہفتوں اور دہلی میں مہینوں دکھائی گئی۔ میں نے شملہ میں یہ تصویر پہلی مرتبہ ۱۲ ستمبر ۱۹۳۹ء کو دیکھی تھی اُس کے بعد دوستوں کے ساتھ دو مرتبہ اور دہلی میں یہ تصویر دیکھی۔ تصویر میں عدلِ جہانگیری کے حالات دکھائے اور بیان کئے گئے ہیں۔ تصویر تو اچھی ہے مگر بعض خامیاں ایسی ہیں جو اُن حضرات کی نظر میں ضرور کھٹکیں گی جو شہنشاہ جہانگیر کے عہد کی تاریخ سے واقف ہیں۔ اس تصویر میں حاضرین دربار شہنشاہ کی خدمت میں سات مرتبہ جُھک کر آداب بجالانے کی بجائے لکھنوی طریقہ کا سلام کرتے ہیں یعنی آداب بجالاتے وقت

جس قدر جھکتے ہیں وہ اُس سے زیادہ نہیں ہے۔ جتنا لکھنؤ میں خورد بزرگوں کو تسلیم کرتے وقت یا چھوٹے درجہ کے آدمی بڑے درجہ کے آدمیوں کو آداب بجالاتے وقت جھکتے ہیں۔ بادشاہ کے سامنے ادب سے اتنا جھکنا کہ آدمی دوہرا ہوجائے کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ مورخوں نے لکھا ہے کہ ملکہ وکٹوریا کے ایک وزیر اعظم اتنا جھک کر تسلیم کرتے تھے کہ وزیر اعظم کی ناک اُن کی دونوں ٹانگوں کے بیچ میں پیچھے کھڑے ہونے والے کو نظر آتی تھی۔ شہنشاہ سے ہم کلام ہوتے وقت بھی درباری اپنا طریقہ ایسا پُر ادب نہیں رکھتے جو سلطنت مُغلیہ کے دور میں رائج تھا۔ ایک سے زیادہ موقع پر شہنشاہ جہانگیر ننگے سر درباریوں سے گفتگو کرتے ہیں۔ حالانکہ اب سے پچاس برس پہلے تک ہمارے بزرگوں کا برہنہ سر کسی مجمع میں آنا یا بغیر عمامہ یا پگڑی باندھے یا ٹوپی پہنے معمولی آدمیوں سے گفتگو کرنا ایسی ہی عجیب و غریب بات تھی جیسا آج کل کسی اُمیدوار ہندوستانی کا محض قمیص اور پتلون پہن کر کسی بڑے انگریز افسر کی خدمت میں ملازمت کی درخواست پیش کرنا۔ بعض درباریوں کا لباس بھی اُس عہد کے درباری لباس سے مطابقت نہیں کھاتا۔ یعنی اچکن فراک کوٹ کی طرح اونچی ہے۔ حالانکہ اُس عہد کا درباری لباس جسے عام طور پر جامہ کہتے تھے نہایت نیچا ہوتا اور تقریباً ٹخنوں تک پہونچتا تھا۔ کلکتہ میوزم میں کچھ تصویریں موجود ہیں جن سے شاہان مغلیہ کے زمانہ کے لباس اور دربار خاص اور دربار عام کے آداب کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ بارہ برس ہوئے کلکتہ میوزم میں میں نے ایک البم (تصویروں کا مجموعہ) بھی دیکھا تھا جو ایک دولتمند ہندو رئیس نے میوزیم کو کچھ عرصہ کے لئے عاریتاً دے دیا تھا۔ میں دولتمند نہیں ہوں مگر یہ البم مجھے مل جاتا تو میں دو ہزار روپے قیمت دینے کے لئے تیار تھا۔ مجھے کلکتہ میں معلوم ہوا تھا کہ اس البم کی اصلی قیمت بہت زیادہ ہے۔ اُن خوش قسمت رئیس کے ہاتھ وہ البم کوڑیوں کے مول آگیا تھا۔ شہنشاہ جہانگیر کے حضور میں جو لوگ پیش ہوتے ہیں اُن کی پیشی کے وقت بھی معمولی الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں حالانکہ ان ہندوستانی ریاستوں میں جہاں مغلیہ دور کے درباری آداب کچھ تھوڑے بہت اب بھی رائج ہیں جب کوئی شخص والیِ ملک کی

خدمت میں پیش ہوتا ہے تو چوبدار آواز دیتا ہے "ادب سے، نگاہ روبرو، حضرت فرمانروائے دولت سلامت، آداب بجالاؤ"..... سینما کی تصویر تیار کرنے کا معاملہ ذوق سلیم کا معاملہ ہے جس طرح باکمال شاعر اثر پیدا کرنے کے لئے وہ لفظ یا الفاظ استعمال کرتے ہیں جو جذبات کی بہترین تصویر کھینچ سکیں اُسی طرح فلم (تصویر) بنانے والوں کا فرض ہے کہ جس زمانہ کے حالات بیان کرنا چاہتے ہیں اس کی صحیح نقاشی کریں جو فلم آج کل تیار کئے جاتے ہیں وہ بیشتر دورِ حاضر سے تعلق رکھتے ہیں اور اگر احتیاط برتی جائے اور توجہ سے کام لیا جائے تو ہمارے اپنے زمانہ کے جذبات کی ترجمانی اور حالات کی نقاشی زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تصویریں وہ خامیاں نسبتاً بہت کم ہیں جو اُن تصویروں میں ہوتی ہیں جن میں دو سو یا تین سو برس پہلے کے واقعات دکھائے جاتے ہیں۔ نجمہ دہلی میں جولائی اور اگست ۱۹۴۳ء میں دکھائی گئی۔ اس تصویر کے ذریعہ سے لکھنؤ کے نوابوں کی طرز معاشرت پبلک کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن جب تاریخی حالات کسی تصویر میں بیان کئے جائیں تو تصویر تیار کرنے والوں کا پہلا فرض ہے کہ سب باتیں اسی طرح پیش کی جائیں گویا وہ واقعہ دو سو یا تین سو یا دو ہزار برس پہلے یعنی جس عہد کا وہ واقعہ ہو اُس عہد میں ظہور پذیر ہوا تھا اور حاضرین اُن سب حالات اور واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ اور اپنے کانوں سے سُن رہے ہیں تھیٹر اور سینما کے ایکٹروں کی بڑی صفت یہ ہے کہ بناوٹ سے کام نہ لیں خوشی ہو یا رنج، معمولی بات چیت ہو یا اہم گفت و شنید ان سب باتوں میں اپنی طرز بیان، اپنا انداز، اپنے طور طریقے، لب و لہجہ سب وہی رکھیں جو روزمرّہ کی زندگی میں ہم سب برتتے ہیں۔

ہمارے زمانہ کا مذاق موجودہ زمانہ میں سینما کی ایسی تصویریں بہت پسند کی جاتی ہیں جن کا مقصد اصلاحی ہو مثلاً چھوت چھات کی بُرائیاں، عقد بیوگان کی اہمیت، بہو کے ساتھ ساس کی زیادتی، مغربی طرز معاشرت اختیار کرنے کے نقصانات غریبوں کے ساتھ امیروں کی، مزدوروں کے ساتھ سرمایہ داروں کی اور کاشتکاروں

کے ساتھ زمینداروں کی بدسلوکی، تعلیم بالغان کی ضرورت، آزادی کی خوبیاں اور غیروں کا محکوم ہو کر رہنے کی ذلتیں جن تصویروں میں دکھائی جائیں اُن کو عموماً مقبولیت حاصل ہوتی ہے اور ایسی تصویروں کی بعض اوقات ہفتوں تک اور کبھی کبھی مہینوں تک مانگ رہتی ہے۔ ہندوستان کی طرح جو ملک زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں وہاں سینما اور ریڈیو سے تعلیمی اور اصلاحی کام لیا جانا قدرتی بات ہے۔ اب سے پچاس برس پہلے تعلیم مدرسوں، اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں تک محدود تھی۔ اب اُن درسگاہوں کے علاوہ نئے ذریعے پیدا ہو گئے ہیں۔ ہزاروں میل کا فاصلہ ہونے کے باوجود نامی گرامی پروفیسروں کے لکچر، مشہور مدبّروں کی تقریریں اور واجب التعظیم مذہبی پیشواؤں کے وعظ آپ گھر بیٹھے ریڈیو پر سُن سکتے ہیں۔ یہ تو شنیدہ کی کیفیت تھی اب دیدہ کا حال سُنئے۔ سینما نے ہمارے نظامِ زندگی میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ جو باتیں ہفتوں تک بچّوں کے ذہن نشین کرائی جاتی تھیں اب وہ سینما کی تصویریں دیکھ کر منٹوں میں یاد کر لیتے ہیں برسوں کا کام مہینوں میں ہو جاتا ہے۔ میرے نواسے رضا کمال نے پونے چار سال کی عمر میں سینما کے کئی گیت یاد کر لئے تھے۔ اِس عمر کے بچّوں کی زبان توتلی ہوتی ہے کمال کی زبان سے یہ گیت بڑے پیارے معلوم ہوتے تھے۔

پارسیوں نے تھیٹر کے تجارتی امکانات اور منافع کا صحیح اندازہ کر کے کئی کمپنیاں غدر کے بعد بنائی تھیں دہلی میں پہلا تھیٹر ۱۸۶۰ء میں خورشید جی بلّی والا نے قائم کیا تھا طلب رسد کے اصول کے مُطابق بعض اہلِ قلم نے بھی اِس طرف توجّہ کی سیّد مہدی حسن احسن لکھنوی نے شکسپیر کے چند ڈراموں کا ترجمہ کیا بعض اور حضرات نے بھی ڈرامے لکھے یا انگریزی ڈراموں کے ترجمے کئے لیکن ہماری زبان میں مغربی طریقہ کی ڈرامہ نگاری کا مستقل اور باقاعدہ رواج دینے والے پہلے شخص آغا حشر کشمیری تھے پنڈت برج موہن کیفی دہلوی نے بھی دو اچھے ڈرامے لکھے ہیں۔ آرزو لکھنوی کی توجّہ بھی کچھ عرصہ سے اس فن کی جانب ہے۔ ڈاکٹر عابد حسین، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، انصار ناصری، فضل حق قریشی اور سید امتیاز علی تاج کے نام موجودہ ڈراما نگاروں میں قابلِ تذکرہ ہیں۔ یہ نئی منزل ہے اور "ہنوز منزل دور است" کے باوجود ہمارے ڈراما نویسوں نے اگر مذاقِ سلیم کو رہبر بنایا تو اُمید ہے کہ منزل کے دوراہوں اور چوراہوں پر نہ بھٹکیں گے بلکہ جہاں جانا مقصود ہے اُسی طرف قدم بڑھائیں گے۔

تیرہواں باب

سید واحد علی صاحب مرحوم ۱۹۱۱ء کا دہلی دربار، باپ کی محبت، میری متاہل زندگی اور اولاد، حمزہ علی، میرا دوسرا عقد، مراد آباد کا سیاسی وقار ۱۹۱۶ء میں۔

سیّد واحد علی صاحب مرحوم

میرے والد سید واحد علی صاحب کا بیشتر وقت مضمون نویسی اور انشا پردازی میں صرف ہوتا تھا شعر بھی کہتے تھے۔ جب میری بسم اللہ ہوئی ہے تو دو سہرے کہے تھے جن کے بعض اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ دونوں نظموں میں قصیدے کا رنگ غالب ہے۔

والد صاحب کا کلام:۔

واہ کس رنگ سے آئی ہے گلستاں میں بہار ؛ قابل دید ہیں ہر ایک چمن کے اشجار
نونہالانِ چمن کا ہے نکیلا جوبن ؛ رشکِ فردوس و ارم کیوں نہ ہو صحنِ گلزار
پھول سب سرخ ہیں سرسبز ہے ڈالی ڈالی ؛ ساری خلقت میں مسرت کے عیاں ہیں آثار
گلشنِ دہر میں سُرخی نے کیا ہے یہ عمل ؛ جس طرف دیکھا زمیں آئی نظر لالہ زار
قہر کا حُسن تو کوپل سے پھٹا پڑتا ہے ؛ کھا کے میٹھا چمن آرا تھا اسی دن پہ اُدھار
جلوہ گر قطرۂ شبنم نہیں برگِ گل پر ؛ موتی کرتی ہے صبا پھول کے عارض پہ نثار

دوسرا سہرہ بھی اسی زمین میں لکھا تھا چار شعر اُس کے بھی نقل کئے جاتے ہیں:۔

آمدِ فصلِ بہاری سے ہے پھولا گلزار ؛ غنچۂ دل کو کھلاتے ہیں گلوں کے رخسار
بلبلیں جھومتی ہیں کھا کے ہوائیں ٹھنڈی ؛ حمدِ معبود میں ہے فاختہ گرم گفتار
موتیئے کی وہ مہک بادِ صبا لائی ہے ؛ جسکی خوشبو پہ ہے سو جان سے خود مشک نثار
حوض کے آب مصفا کا ہے نکھرا جوبن ؛ نازو انداز سے موجوں کی ہے بانکی رفتار

والد صاحب قبلہ نے غزلوں اور قصیدوں کا بھی ایک مجموعہ چھوڑا تھا میرا قیام اُس زمانہ میں الہ آباد میں تھا۔ افسوس ہے کہ وہ مجموعہ ایک غیر متدین رشتہ دار کے ہاتھ آگیا اور اس لڑکے نے جس کی زندگی مصرعہ۔ بدنام کنندۂ نکونامے چند۔ کی مصداق تھی وہ مجموعہ اونے پونے خدا جانے کس کس کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ افسوس ہے کہ

جناب مرحوم کا بیشتر کلام اس طرح تلف ہوگیا صرف چند قصیدے میرے پاس ہیں اُن میں سے ایک قصیدے کے چند شعر یہاں لکھے جاتے ہیں :-

آئی ہے بادِ صبا پھول چلا صحنِ چمن ؛ رنگ لایا ہے نئے طور سے اب کے گلشن
درِ مےخانہ پہ زُہّادِ زمانہ آئے ؛ مستیاں کرنے لگے آج سے پھر توبہ شکن
سَرو نے آج نئے سر سے جو بدلا جوڑا ؛ حسن رخسار بڑھا دیکھ کے بانکی چتون
کونپلیں پھوٹیں ہرا ہوگیا پتّا پتّا ؛ اور لگی ٹھنڈی ہوا باغ میں چلنے سَن سَن

آموں کا شوق

قبلہ وکعبہ کو آم کا بڑا شوق تھا بڑی محنت کر کے مختلف مقامات سے قلمیں جمع کر کے کئی قلمی باغ لگائے۔ اپنے ہاتھ سے قلم لگانے کے بڑے ماہر تھے اور ہمیشہ سیدھی قلم باندھتے تھے۔ ایک پُرانے تخمی درخت کا پھل پسند آگیا قلم لگانے کے لئے یہ اہتمام کیا کہ تین گز اونچا ٹی کا چبوترہ درخت کے نیچے بنایا گیا تاکہ تخمی پودا بڑے درخت کی شاخ تک جس کی قلم لینا چاہتے تھے پہنچ سکے اُن کے لگائے ہوئے قلمی باغ کمر خمیدہ نہیں ہیں بلکہ درختوں کے قدمیں ایسی ہی راستی ہے جیسی والدصاحب کی طبیعت میں تھی۔ دیکھنے والے کو بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ تخمی آموں کے باغ ہیں۔ مجھے اپنی بدشوقی پر بڑا افسوس ہے۔ جو درخت کسی وجہ سے تلف ہوجاتا ہے مجھے اس کی جگہ نیا درخت لگانا بھی نہیں میسر آتا نواب حامد علی خاں صاحب مرحوم والی رام پور سے والد صاحب کے مراسم تھے۔ اکثر رام پور جاتے تھے۔ بعض اوقات ایک ایک مہینہ یا اس سے بھی زائد رام پور میں قیام رہتا تھا۔ قبلہ وکعبہ کی نواب صاحب مرحوم بڑی قدر کرتے تھے۔

سنہ ۱۹۱۱ء کا دہلی دربار

باپ کو بیٹے سے جو محبت ہوتی ہے اُس کا تذکرہ میر انیس نے ایک جگہ ان الفاظ میں کیا ہے۔ ؎ آرام جگر راحتِ دل قوتِ جاں ہے۔ پیری میں یہ طاقت ہے کہ فرزندِ جواں ہے ؛ مغربی ملکوں کی زبانوں میں بیٹے کو بیٹا کہتے ہیں اگر مہر پدری کے دریا میں بہت طُغیانی ہوئی تو اُس کی سب سے اونچی اور بڑی لہر یہ ہے کہ باپ بیٹے کو "میرے پیارے بیٹے" کہہ کر جذبات کے بحری سفر کو ختم کردے۔ فارسی زبان میں بیٹے کے لئے لختِ جگر اور نورِ چشم الفاظ ہیں جن کی صوری اور معنوی خوبیوں کو ہر باپ کا دل جانتا ہے۔ میں تو اکلوتا بیٹا تھا والد صاحب کو مجھ سے بڑی محبت تھی ظاہری للّو پتّو اُن کا طریقہ نہ تھا۔ محبت کا اظہار صرف موقع محل پر ہوتا تھا۔ سنہ ۱۸۹۵ء میں مسلمانوں کا انگریزی اخبار پنجاب آبزرور جو لاہور سے نیا نیا نکلا تھا میرے نام جاری کرادیا تھا تاکہ مجھے انگریزی زبان سے واقفیت پیدا ہو۔ اسکول کی درسی کتابوں کے علاوہ انگریزی کتابوں کا مطالعہ کرنے کی اہمیت اکثر مجھے بتاتے تھے سنہ ۱۹۱۱ء کے دربار دہلی میں شرکت کا میرا قصد نہ تھا جب مجسٹریٹ ضلع نے دربار کے ٹکٹ کے لئے مجھ سے پوچھا تو میں نے کہہ دیا کہ میرے لئے ٹکٹ کا انتظام غیر ضروری

ہے میرا قصد دہلی جانے کا نہیں ہے۔ ہمارے مُلک میں جن بچّوں، کی دادی دادا زندہ ہوتے ہیں اُن کے ماں باپ کو اولاد پر زیادہ اختیار نہیں ہوتا۔ حکومت دادا دادی کی ہوتی ہے۔ والدہ صاحبہ نے ایک روز فرمایا کہ میرا ابّجّن (میرے لڑکے حمزہ علی سے مُراد تھی) ضرور دربار میں جائے گا بادشاہ آرہے ہیں اگر بنو (حمزہ کا پیار کا نام بنو میاں ہے) نہ گیا تو بڑا ہو کر لوگوں کا طعنہ سُننا پڑے گا کہ لو انھوں نے دہلی دربار بھی نہیں دیکھا تھا۔ مجھے حکم ہوا کہ انتظام کرو ماں کا حکم ٹالنا میرے لئے ناممکن تھا مکان کی تلاش دہلی میں شروع کردی۔ دن بہت کم رہ گئے تھے۔ بارے جوں توں کر کے بھاری کرایہ پر مکان ملا۔ جب مکان مل گیا تو میں نے حمزہ علی کے علاوہ (حمزہ کی عمر اُس زمانہ میں کوئی ساڑھے تین سال کی ہوگی) اپنے ساتھ نذیر حسین (بیگم صاحبہ مرحومہ کے بھائی ہیں آج کل اُناؤ میں ڈپٹی کلکٹر ہیں) اور مولوی علی محمد کو لیا (علی محمد اُس وقت مُنصف تھے اب پنشن یافتہ ڈسٹرکٹ وسیشن جج ہیں سُنا ہے کسی زمانہ میں گھوڑوں کے شوقین تھے) غرضکہ ضروری ساز و سامان کے ساتھ ہم دہلی پہونچے اور ہم چاروں اُسی مکان میں ٹھیرے جو کرایہ پر لیا تھا۔ باورچی اور نوکر میرے ساتھ مُراد آباد سے گئے تھے والد صاحب بھی دہلی تشریف لے گئے تھے مگر اُنھوں نے ہمارے ساتھ ٹھیرنا پسند نہ فرمایا اپنے ایک دوست کے یہاں فروکش ہوئے۔ حمزہ کا ایک پُرلطف قصّہ یاد آیا۔ ہمارا مکان جامع مسجد کے جنوب میں اُردو بازار کے پیچھے تھا مکان سے جامع مسجد نظر آتی تھی ایک روز حمزہ نے کئی آدمیوں کو جامع مسجد کے مینار پر چڑھا دیکھا۔ تھوڑی دیر غور سے دیکھتے رہے پھر مجھ سے پوچھا "کا بائی جال یہ تچ مُچ کے آدمی ہیں" (کیا بھائی جان یہ سچ مچ کے آدمی ہیں)؟ ہم سب ہنسنے لگے حمزہ کو ہماری ہنسی ناگوار ہوئی میں نے یہ کہکر بات ٹالی کہ "ہاں میاں سچ مچ کے آدمی ہیں ہم بھی کسی دن مینار پر چڑھیں گے اور تم کو بھی لے چلیں گے۔"

باپ کی مُحبّت

دربار ۱۱ دسمبر کو تھا بڑی سخت سردی تھی۔ ۱۰ دسمبر کو سہ پہر کے وقت والد صاحب تشریف لائے اور مجھ سے دریافت کیا کل تم دربار میں جارہے ہو۔ میں نے عرض کیا میرے پاس ٹکٹ نہیں ہے۔ کلکٹر نے تو دریافت کیا تھا مگر میرا قصد دہلی آنے کا نہ تھا میں نے ٹکٹ کو منع کردیا۔ یہ سُن کر چُپ چاپ اُٹھ کر چلے گئے۔ صبح کے چار بجے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا میری بھی آنکھ کُھل گئی۔ دروازہ کھولا تو والد صاحب اندر داخل ہوئے فرمایا "لو یہ تمہارا ٹکٹ ہے دربار میں جانے کی تیاری کرو۔" بعد کو معلوم ہوا کہ سرِ شام وہ ہمارے صوبہ کے کیمپ میں پہنچے جو کنگسوے[1] (Kingsway) کے قریب تھا۔ مسٹر گیسکل جو مُراد آباد میں اسسٹنٹ مہتمم بندوبست رہ چکے تھے اور والد صاحب کے دوست تھے کیمپ کے منتظم تھے اُن سے کہہ کر میرے لئے ٹکٹ حاصل کیا اگر اور اصحاب بھی ٹکٹ کے خواہاں تھے

---

[1] یہ جگہ دہلی شہر کے شمال و مغرب میں پانچ چھ میل فاصلے پر واقع ہے سنہ ۱۹۱۱ء کے دربار کی یاد تازہ رکھنے کے لئے وہاں ایک پختہ مینار بنا دیا گیا ہے۔

اس وجہ سے رات کے تین بجے تک والد صاحب کو انتظار کرنا پڑا۔ آخری علالت کے زمانہ میں دو نرسیں خدمت کے لئے متعین تھیں مگر اُٹھانے بٹھانے اور کروٹ بدلوانے کی خدمت میرے سپرد تھی۔ ایک نرس نے سہارا دے کر اُٹھانا چاہا تو اُس کو منع کیا اور فرمایا مجھے رضا اُٹھائے گا۔ تیسری جنوری ۱۹۲۰ء کو بمقام مُراد آباد جہاں علاج ہو رہا تھا اس دار فانی کو خیرباد کہا اور دوسرے دن کندرکھی کے اُس قلمی باغ میں جس کو بڑے شوق سے لگایا تھا دفن ہوئے۔ لاش کو میں نے اور میرے بڑے چچا حاجی میر فدا علی صاحب اور دو اور عزیزوں نے غسل دیا تھا اور وہ کفن پہنایا تھا جو بڑے چچا صاحب خود اپنے لئے کربلا سے لائے تھے۔ قبر میں[1] بھی ہم چاروں نے اپنے ہاتھوں سے اُتارا تھا۔ غسل دیتے وقت بڑے چچا صاحب نے کہا تھا "آپ چل دئے پیچھے پیچھے میں بھی آتا ہوں"۔ پونے دو برس کے اندر یعنی ستمبر ۱۹۲۱ء میں یہ پیشینگوئی پوری ہوئی اور دونوں بھائی اُس دُنیا میں باہم بغلگیر ہو گئے جہاں ہم سب کو رہنا ہے۔ خدا والد صاحب اور چچا صاحب کو اپنی رحمت کے پھولوں کی سیج پر آرام سے سونا نصیب کرے۔

میری متاہل زندگی اور اولاد

میری پہلی بیوی صغیر فاطمہ تھیں جن کے حالات صفحہ ۲۰۶ و ۸۳ پر درج ہیں اُن سے دو اولادیں ہیں بڑی لڑکی ہے اور چھوٹا لڑکا۔ لڑکی کا نام ہاجرہ خاتون اور لڑکے کا نام حمزہ علی ہے۔ دونوں بچّوں کے نام والد صاحب قبلہ نے رکھے تھے ہاجرہ نے کراسٹھویٹ گرلس کالج الہ آباد میں بی۔ اے تک تعلیم پائی۔ شروع جون ۱۹۲۹ء میں ابوطالب نقوی کے ساتھ جنہوں نے اُسی سال انڈین سول سروس کا امتحان پاس کیا تھا ہاجرہ کی شادی ہو گئی۔ ہاجرہ کے تین اولادیں ہیں دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ سب سے بڑی لڑکی کا نام خالدہ خاتون اور دوسری لڑکی کا نام خدیجہ خاتون ہے۔ سب سے چھوٹا لڑکا ہے جس کا نام رضا کمال نقوی ہے۔ میں ترکوں کی زندگی کو ہندوستانی مُسلمانوں کے لئے قابل تقلید جانتا اور ترکوں کو شیر خدا علی مرتضیٰ اور خالد بن ولید کے نقشِ قدم پر چلنے والا مُسلمان سمجھتا ہوں۔ ایک موقع پر نواب حامد علی خاں مرحوم والی رامپور نے ایک جلیل القدر انگریز حاکم سے جو ترکوں کی معاشرتی زندگی پر معترض تھے کہا تھا

---

[1] میرے نزدیک باپ کی میّت کو غسل و کفن دینا خود بیٹے کا فرض ہے حضرت خیر البشرؐ کے جسد مطہر کو حضرت علی حضرت عباس اور حضرت عباس کے بیٹوں نے غسل دیا تھا لیکن اسلام کی بہت سی پاک روایتوں کے منور چہرہ کو ایرانی اور رومی تزک احتشام کے پردے نے ہم سلمانوں کی آنکھوں سے اوجھل کر دیا ہی آخری مغلیہ دور میں تو بادشاہ کی لاش کو اُس کا جانشین ٹھکرا آتا تھا۔ لکھنؤ کے کھاتے پیتے شیعہ بھی لاش کو ہاتھ نہیں لگاتے بلکہ مغربی ملکوں کی طرح لاش کو غسل دینے کفنانے اور قبر میں اُتارنے کا کام پیشہ وروں سے لیتے ہیں۔ معاذ اللہ۔ علی ابن ابی طالبؑ کی پیروی کا ادعا اور یہ عمل۔ مصرعہ۔ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا۔

"اگر ترک شراب خوار ہیں تو بھی اسلام پر وہ جس طرح اپنے کو تصدق کرتے اور سرفروشی اور جاں بازی
کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں اُس کا میرے دل میں اتنا احترام ہے کہ اگر انور پاشا رام پور تشریف لائیں
تو میں خود کمر بستہ ہو کر اُن کی خدمت میں جامِ شراب پیش کرنے کی عزت حاصل کر دوں۔" انور پاشا
کے تذکرہ میں مجھ جیسے ناکارہ آدمی کا اپنے جذبات کو ظاہر کرنا ایسا ہی ہے جیسی اُس بڑھیا کی حالت تھی
جو بازارِ مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام کی خریداری کے لئے سوت کی انٹی لے کر پہونچی تھی۔ بہر طور
خلافت سے بے تعلق ہو جانے کے باوجود بھی میں ترکوں کو ایسا ہی واجب التعظیم اور لائق احترام سمجھتا ہوں
جیسا نواب صاحب مرحوم سمجھتے تھے۔ ہم ہندوستانی مسلمانوں اور ترکوں میں وہی فرق ہے جو زمین اور
آسمان میں ہے یعنی ہماری زبان چلتی ہے اور اُن کی تلوار۔ حاصل کلام یہ ہے کہ میری بڑی نواسی
کا نام مشہور ترکی ادیب و مدبّرہ خالدہ خانم کے نام پر خالدہ رکھا گیا۔ میرے نواسے کی پیدائش کی
تاریخ ۱۱ نومبر ۱۹۳۸ء ہے ایک دن پہلے اُس غیور اور اولوالعزم اور بہادر ترک کا انتقال ہو چکا تھا
جس کی بے نظیر ہمت و شجاعت نے مسٹر لائڈ جارج کی وزارت کا خاتمہ کر کے چھوڑا۔ ارحم الراحمین
اتاترک مصطفےٰ کمال کی روح پر رحمت نازل کرے میں نے مرحوم کے نام پر اپنے نواسے کا نام کمال رکھا
ہے۔ کمال نہایت ذہین بچہ ہے ایک قصہ سنئیے کمال کی عمر ساڑھے تین سال کی تھی ہاجرہ مع اپنے بچوں
کے دہلی میں میرے یہاں آخر مارچ ۱۹۴۲ء میں مقیم تھیں۔ کمال کے والد نے اپنا ریڈیو سٹ جو بغیر ایریل
کے چلتا ہے میرے پاس بھیج دیا تھا بچے شریر تو ہوتے ہی ہیں میاں کمال نے اُلٹا پلٹا چلا کر ریڈیو
خراب کر دیا۔ جاپانی فوجیں برہما میں بڑھ رہی تھیں اور میں دن میں دو تین مرتبہ ریڈیو پر خبریں
سنا کرتا تھا۔ کمال کی اِس کارستانی پر میں نے اُس کو کئی مرتبہ ڈانٹا۔ دو تین مرتبہ تو خاموش رہا آخر
تنگ آ کر کہنے لگا "ریڈیو کچھ آپ کا تھوڑا ہی ہے۔" ہاجرہ نے اُس کے ساتھ سختی کرنی چاہی میں نے روکا۔
کمال نے حفاظتِ خود اختیاری میں جو کچھ کہا اُس کی ذمہ داری اُس پر نہیں بلکہ مجھ پر عائد ہوتی تھی
ایک یا زیادہ سے زیادہ دو مرتبہ تنبیہ کرنی کافی تھی مگر میں نے اس معاملہ کو اتنا بڑھایا کہ مجبوراً کمال
نے مجھے یاد دلایا کہ جو نقصان اُس نے کیا ہے اپنے باپ کا کیا ہے۔

حمزہ علی

میرے بیٹے حمزہ علی کا نام والد صاحب قبلہ نے رکھا تھا۔ حمزہ بڑا قوی بچہ تھا (اب بھی
بفضلہ قوی ہے) اس مناسبت سے قبلہ و کعبہ نے اُس کا نام حضرت ختم المرسلین
کے اُس بہادر چچا کے نام پر رکھا جس سے مبارز طلب ہو کر شجاعانِ عرب میں سے کسی جنگجو کو میدان
سے زندہ پلٹنا نصیب نہیں ہوا۔ حمزہ ایف۔ اے پاس کر کے انگلستان گئے اور اپنی والدہ کی علالت کے
باعث ۱۹۳۲ء میں ہندوستان واپس چلے آئے۔ اپنی والدہ کی طویل علالت کے دوران میں حمزہ نے
مرحومہ کی جس طرح خدمت کی اُس کی توفیق جناب باری ہماری قوم کے سب نوجوانوں کو عطا فرمائے

حمزہ کو بی۔اے پاس کرنے کے بعد کالٹیکس کمپنی میں ایک معقول جگہ مل گئی تھی۔ اب تخمیناً دو برس سے محکمہ سپلائی میں ڈپٹی اسسٹنٹ کنٹرولر آف پرچیز کے عہدہ پر مامور ہیں۔ میری والدہ کا انتقال شروع اکتوبر ۱۹۲۸ء میں بمقام شملہ ہوا۔ ایک خاتون نے کربلا کا کفن جو خود انہوں نے اپنے لئے رکھا تھا مرحومہ کی تکفین کے لئے عنایت کیا۔ مرحومہ کی وصیت کی بموجب اُن کے جنازہ کو میں اور میری پہلی اہلیہ اور ہاجرہ کندرکھی لے گئے اور والد صاحب قبلہ کی قبر کی برابر دفن کیا۔ میری پہلی بیوی صغیر رضا بیگم نے ۲۲ دسمبر ۱۹۳۳ء کو دو برس کی علالت کے بعد وفات پائی۔ میرا ارادہ جنازہ کو کندرکھی لیجانے کا تھا مگر ہاجرہ اور حمزہ کی رائے کے بموجب مُراد آباد میں کچہری کے قریب جو قبرستان مسجد کے ٹھیک پس پُشت ہے وہاں دفن کیا۔ ہاجرہ اور حمزہ کی رائے صحیح تھی۔ مُراد آباد کے دورانِ قیام میں ہم سب کو اکثر قبر پر جانے اور فاتحہ پڑھنے کا موقع ملتا ہے۔

میرا دوسرا عقد میں نے دوسرا نکاح جنوبی افریقہ میں بمقام جہانسبرگ مس پونو ویلو سامی کے ساتھ ۱۶ جنوری ۱۹۳۶ء کو کیا۔ لیڈی رضا علی کے والد کمبرلی کے ایک باا‌ثر اور دولتمند سوداگر تھے۔ اس مُناکحت کے مفصل حالات کتاب کے دوسرے حصہ میں بیان کئے جائیں گے بعض کوتاہ اندیش غیر مُسلموں نے جن کا لیڈر ایک پارسی تھا اس ازدواج کے خلاف شورش کی مگر میں نے طے کر لیا تھا کہ اس معاملہ میں مُداخلت کا حق نہ ہندوؤں کو حاصل ہے نہ گورنمنٹ ہند کو۔ لارڈ ولنگڈن کا ممنونِ احسان ہوں کہ انہوں نے اس معاملہ کو میرا نج کا معاملہ قرار دے کر مداخلت سے انکار کر دیا۔ لیڈی ولنگڈن نے میری قابل قدر مدد فرمائی اور مبارکباد کا تار بھیجا۔ میرے نزدیک عقد کو روکنے کا حق صرف ہاجرہ اور حمزہ کو حاصل تھا۔ میں نے ان دونوں کو کئی مہینے پہلے اپنے ارادہ سے مطلع کر دیا تھا اور لکھ دیا تھا کہ اگر تم دونوں کو یا دونوں میں سے ایک کو میری تجویز سے اختلاف ہو تو میں اپنے ارادہ سے باز رہوں گا ورنہ اور کوئی طاقت مجھے اس ارادہ کی تکمیل سے نہیں روک سکتی۔ ہاجرہ نے بواپسی ڈاک اور حمزہ نے دو ہفتہ بعد اطلاع دی کہ اُن دونوں کی اُس بات میں عین خوشی ہے جس میں میری خوشی ہو۔ خدا بخشے لیڈی صاحبہ نے میرے دونوں بچوں کو بالکل اپنی اولاد کی طرح سمجھا۔ ۱۶ مارچ ۱۹۴۲ء کو لیڈی صاحبہ نے بمقام کیپ ٹون وفات پائی۔ مصرعہ۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔ مرحومہ تین سال سے علیل تھیں مگر افسوس ہے کہ اُن کی شدید علالت کی اطلاع مجھے ایسے بے وقت ہوئی کہ ہوائی جہاز سے بھی میرا کیپ ٹون پہونچنا ممکن نہ تھا۔ اپریل ۱۹۴۱ء میں حمزہ علی کی شادی ضلع لائلپور کے ایک مُعزز سید خاندان میں ہوئی میری بہو انور جہاں سلیقہ شعار لڑکی ہے میٹریکولیشن پاس ہونے کے باوجود گھر کا سب انتظام خود کرتی ہے اور میری والدہ صاحبہ مرحومہ اور بیگم صاحبہ مرحومہ (میری پہلی بیوی) کی طرح

اپریل ۱۹۴۱ء - حمزہ علی کی شادی کے بعد گروپ فوٹو

(دائیں سے بائیں کو بیٹھے ہوئے) مس خدیجہ خاتون - بیگم ہاجرہ نقوی

بیگم حمزہ علی - مس خالدہ خاتون

(دائیں سے بائیں کو کھڑے ہوئے) رضا کمال نقوی (نانا کی گود میں) سر سید رضا علی

سید حمزہ علی

کھانا بھی بہت اچھا پکانا جانتی ہے۔ حضرت ربّ العالمین نے جو انعامات مجھے اِس دُنیا میں عطا
فرمائے ہیں اُس کا شکر ادا کرنا میرے امکان سے باہر ہے۔ کس کس احسان کا ذکر کروں۔ جناب
باری کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ حمزہ جیسا سعید بیٹا اور ہاجرہ جیسی رشید بیٹی اُس نے مجھے عطا
فرمائی اپنے داماد ابو طالب نقوی کا حال کسی دوسری جگہ لکھ چکا ہوں لیڈی رضا علی کہا کرتی تھیں
تم بڑے خوش قسمت ہو اولاد بھی اچھی ہے اور داماد بھی اچھا ہے۔ اپنی نواسیوں اور نواسہ کا تذکرہ
کر چکا ہوں۔ ۱۶ر فروری ۱۹۴۲ء کو پوتہ پیدا ہوا جس کی عمر اس وقت اُنیس مہینہ کی ہے
میرے دادا میر ہادی علی صاحب مرحوم بڑے خوش اقبال اور عالی حوصلہ بزرگ تھے اُن کے نام
پہ اور نیز اپنے نام پر میں نے اس بچّہ کا نام ہادی رضا علی رکھا ہے۔ میرے پوتے کی صورت بہت
اچھی ہے۔ گوری رنگت بڑی بڑی آنکھیں اور گھونگر والے بھورے بال بڑے اچھے معلوم ہوتے ہیں
بڑا خوش مزاج اور محل شناس ہے۔ جب میرے کمرے میں آکر میرے کاغذ اُلٹ پلٹ کر دیتا ہے
اور میں اُسے ڈانٹنا چاہتا ہوں تو بڑی پیاری آواز سے دادا ابا کہہ کر میرے گلے میں باہیں ڈال دیتا ہے۔
ہندی مثل سچ ہے مُول سے بیاج پیارا ہوتا ہے۔ خدا کرے جلد وہ میری کتاب پڑھنے کے قابل ہو جائے۔

مُرادآباد کا سیاسی وقار ۱۹۱۶ء میں

مُرادآباد اُن شہروں میں ہے جہاں مُسلمانوں کی آبادی ہندوؤں سے کہیں زیادہ ہے ضلع مُرادآباد
میں مُسلمانوں کی جتنی بڑی آبادی ہے اُتنی بڑی آبادی صوبہ کے کسی اور ضلع میں نہیں ہے۔ قومی کاموں
کے ہر شعبے میں مُرادآباد اُس زمانہ میں پیش پیش رہتا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ لکھنؤ کے بعد جو ہماری قومی
جدوجہد کا مرکز ہے اور جہاں آل انڈیا مُسلم لیگ کا اُس وقت دفتر تھا مُرادآباد کو سب ضلعوں سے
زیادہ سیاسی اہمیت حاصل تھی، مُرادآباد کو یہ امتیازی درجہ چند مخلص کام کرنے والوں کی کوشش سے
حاصل ہوا تھا جن میں مولوی (سر) محمد یعقوب خان بہادر مسٹر مسعود الحسن، خان بہادر قاضی شوکت حسین
خاں اور مولوی محمد محسن کے نام خاص طور سے قابلِ تذکرہ ہیں۔ خُدا اِن سب کو اپنے جوارِ رحمت میں
جگہ دے۔ اُس دَور کے مُرادآبادی مُسلمان نوجوانوں کی حالت یہ تھی کہ کام خود کرنے کے باوجود اپنا
نام نہ چاہتے تھے بلکہ اپنے ساتھیوں کو مستحق ستائش ٹھیراتے تھے۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ اُس پانچ
چھ برس کے عرصہ میں میں نے اپنے ساتھی کام کرنے والوں کو کوئی مشورہ دیا ہو اور انھوں نے
اُسے نہ مانا ہو۔ ۱۳ر اکتوبر ۱۹۱۶ء کو مَیں مُرادآباد کو خدا حافظ کہہ کر ہائی کورٹ میں وکالت کرنے کی
غرض سے الہ آباد چلا گیا اُس سے چند ہفتے پہلے میرے کہنے کی بموجب مولوی محمد یعقوب کا انتخاب
مُرادآباد میونسپلٹی کے چیرمین کی حیثیت سے ہو چکا تھا اس انتخاب سے سوائے مولوی عبدالسلام کے
سب رضامند تھے۔ عبدالسلام کی رائے تھی کہ بجائے محمد یعقوب کے مسعود الحسن چیرمین منتخب کیے جائیں

میں نے اِس رائے کو اس لئے نہ مانا کہ ایسا کرنے سے مُراد آباد کے مُسلمانوں میں ایسا اختلاف ہو جاتا جس سے تفرقہ کا پیدا ہو جانا اغلب تھا تاہم اس وقت مجھے یہ نہ معلوم تھا کہ مسعود الحسن خود بھی چیرمینی کے خواہش مند ہیں، جب میں نے پارٹی کے اراکین کے سامنے محمد یعقوب کا نام پیش کیا تو مسعود الحسن نے اُس سے موافقت ظاہر کی جس سے میں نے قدرتی طور پر یہ نتیجہ نکالا کہ وہ قومی مفاد کی خاطر اپنی ذات پر محمد یعقوب کو ترجیح دینے کے لئے تیار ہیں۔ اگر عبدالسلام کو جن کی عمر اُس وقت پچیس چھبیس برس سے زیادہ نہ تھی وکیل بنانے کی بجائے مسعود اپنی خواہش مجھ پر ظاہر کر دیتے تو اس مسئلہ کا حل دشوار نہ تھا۔ میری یہ رائے قائم ہو چکی تھی کہ یعقوب اور مسعود کے درمیان توازن اس طرح قائم رکھا جائے کہ یعقوب کو میونسپلٹی کا چیرمین بنا دیا جائے اور صوبہ کی کونسل کا جب آئندہ انتخاب ہو تو کوشش کی جائے کہ مسعود کونسل کے ممبر منتخب ہو جائیں میری یہ خواہش خواب کے حدود سے نکل کر کئی سال پہلے عملی جامہ پہن چکی تھی اور سنہ ۱۹۱۲ء میں وقت کے وقت میں نے مسعود الحسن کو اُن کے گھر سے بُلوا کر موصوف کی نامزدگی ممبری کونسل کے لئے میونسپلیٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے حلقہ سے کرائی تھی۔ گو مسعود تین یا چار ووٹ سے ہار گئے تھے مگر اُن کا نام اُس سلسلے میں پبلک کے سامنے آ چکا تھا محمد یعقوب نے تین برس تک چیرمینی کی خدمات اچھی طرح انجام دیں البتہ اُن سے یہ شکایت پبلک کو رہی کہ وہ اکثر و بیشتر معاملات میں سرکاری حکام بالخصوص ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا اثر قبول کرتے ہیں اپریل سنہ ۱۹۱۹ء میں چیرمینی کا انتخاب دوبارہ ہوا اور مجھے یہ معلوم ہو کر نہایت صدمہ ہوا، کہ میونسپلٹی کے مُسلمان ممبر دو پارٹیوں میں منقسم ہو گئے جن میں سے ایک پارٹی کے امیدوار مسعود الحسن اور دوسری پارٹی کے امیدوار محمد یعقوب تھے۔ میں الہ آباد سے مُراد آباد آیا اور باہمی مصالحت کی کوئی کوشش اُٹھا نہیں رکھی آخر میں میں نے اپنی ممبری کونسل کا استعفا لکھ کر مسعود کے حوالہ کر دیا اور اُن سے کہا کہ ابھی چیرمینی کے انتخاب میں پانچ چھ روز باقی ہیں تم یہ استعفا کونسل کے سکرٹری کے پاس بھیج دو یعقوب کو باہمی مصالحت کے ذریعہ سے چیرمین منتخب ہو جانے دو اور خود اپنا انتخاب میری جگہ کونسل کی ممبری پر کرا لو۔ لیکن بدقسمتی سے مسعود الحسن اُس زمانہ میں مسٹر معظم علی مرحوم، قاضی عبدالغفار (محمد یعقوب کے بہنوئی) اور مولوی عبدالسلام کے زیر اثر تھے۔ چاروں صاحبوں نے باہمی صلاح و مشورہ کے بعد میری تجویز کو رد کر دیا اور میں یہ شعر اپنے دل میں پڑھتا ہوا الہ آباد واپس چلا گیا ؎

دل کے پھپھولے جل اُٹھے سینہ کے داغ سے ؛ اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

تاریخ مقررہ پر انتخاب ہوا اور مسعود نے یعقوب کو شکست دی۔ اِس شکست کو اُس انتشار اور پراگندگی کا سنگِ بنیاد سمجھنا چاہیئے جس کے شکار مُراد آباد کے مسلمان عرصہ تک رہے۔

مسعود اور یعقوب جیسے دو عزیز دوستوں کے باہمی تصادم سے مسلمانان مُراد آباد کو یقین ہوگیا کہ مقامی لیڈروں میں قومی فلاح و بہبود کا جذبہ اس قدر ادھلا ہے کہ اُس کی جلد کھرچنے سے ذاتی اغراض کا کالا خون صاف نظر آتا ہے آگے چل کر مُراد آبادی زندگی کے اس انتشار اور پراگندگی نے جمود کی صورت اختیار کرلی۔ خدا کا شکر ہے کہ ۱۹۲۳ء میں میری رائے پر عمل کرنے کے باعث محمد یعقوب کا انتخاب مرکزی لیجسلیٹو اسمبلی کی ممبری پر ہوگیا جس سے ۱۹۱۹ء کی شکست کی تلافی ہوگئی مگر پولیٹکل زندگی کے چمن کے اکثر پھول مُرجھا گئے اور اُن کی جگہ بڑے بڑے کانٹے نکل آئے، مرکزی اسمبلی کے انتخاب سے محمد یعقوب کے پاؤں کا کانٹا تو نکل گیا مگر کام کرنے والوں کے دلوں میں اُس کی چُبھن باقی رہی۔ بقول نوح ناروی سے

خارِ صحرا تو کفِ پا سے نکل ہی جائیں گے ؏ آپ وہ کانٹا نکالیں جو ہمارے دل میں ہے۔

افسوس ہے کہ دل کا کانٹا نہ نکلنا تھا نہ نکلا۔ ۱۹۱۶ء کا پولیٹکل تھیٹر برائے نام اب بھی قائم ہے مگر ایکٹر جیسا کہ ہونا چاہیئے موجودہ زمانہ کے نوجوان ہیں۔ ان کام کرنے والوں میں بعض کی سمجھ بوجھ اچھی ہے اور پولیٹکل کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں مگر دنیا میں اور بالخصوص موجودہ دنیا میں بڑی سے بڑی قابلیت بغیر قوتِ عمل کے اُس خوبصورت عورت کی طرح ہوتی ہے جو بانجھ ہو۔ مُراد آباد کے حالات میں بہت کچھ تبدیلی ہوچکی ہے اب جمود کا قائم رہنا بے معنی بات ہے۔ کام کرنے والوں کا فرض ہے کہ اس دورِ جمود کا خاتمہ کرکے مُراد آباد کی گذشتہ سیاسی عظمت کو دوبارہ قائم کریں۔

قصباتی زندگی کے فوائد اور نقصانات کی بحث میں میں نے کندرکی کے اُن سب مسلمان اور ہندو نوجوانوں کے حالات لکھ لئے تھے جنہوں نے مغربی تعلیم حاصل کی ہے بعض اور حضرات کا بھی تذکرہ تھا۔ مگر کتاب کا پہلا حصّہ اس قدر طویل ہوگیا ہے کہ اُن حالات کو دوسرے حصّہ میں اشاعت کے لئے روکنا پڑا۔ یہاں صرف ایک صاحب کا تذکرہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ چودھری سید سراج احمد صاحب کو رفاہِ عام کے کاموں میں ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ کندرکی ریلوے اسٹیشن پر ریل کی دُہری تہری لین ڈلوانے اور اسٹیشن پر پردہ نشین عورتوں کے لئے زنانہ مُسافر خانہ بنوانے میں موصوف نے بڑی جدوجہد کی اور مجھے مسرّت ہے کہ اُن کی محنت ٹھکانے لگی۔ اُن کی کوشش سے اسٹیشن پر تار گھر بھی کھول دیا گیا ہے۔ بزرگوں کے صحیح حالات جمع کرنے میں بھی موصوف نے مجھے قابلِ قدر مدد دی۔ اور جن کتابوں کے اصلی مسودے یا پُرانے نسخے اُن کے پاس تھے وہ نہایت خندہ پیشانی سے خود لاکر مجھے دکھائے۔

چودھواں باب

برٹش گورنمنٹ کے خطابات اور پبلک۔ سر رضا علی یا سید رضا علی؟ اگست ۱۹۴۲ء کے ہنگامے۔ نرمی اور سختی کا مرکب نسخہ۔ حکومت کا بادہ اور کانگریس کا ظرف۔ کانگریس اور شہنشاہ عالمگیر کی پیروی۔ مہاتما گاندھی کا برت تین ہندوستانی ممبروں کا استعفےٰ۔ اُلٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس اَدا کے ساتھ۔ آزادی کا صحیح مفہوم۔ ۱۹۱۷ء کے حالات کا مُقابلہ موجودہ حالات سے۔ ہمارے دعوے کا اخلاقی پہلو۔ انگلستان کی قوت اور ہمارا غلط اندازہ۔ کانگریس والوں کا موجودہ اضطرار۔ بعض اہم پولیٹیکل واقعات مُسلمان اور سرکاری عہدے۔ پبلک سروس کمیشن۔ یورپ کے دو سفر۔ روس کی سیاحت۔ شاہ دگ اعشق کے دربار میں جنوبی افریقہ کی کہانی۔ روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد۔

برٹش گورنمنٹ کے خطابات اور پبلک

۱۹۲۶ء میں شملہ میں سرکاری مکان نہ ملنے کے باعث میں نے نجی کے طور پر سمر ہل (Summer Hill) میں کوٹھی کرایہ پر لی تھی۔ سر الگزینڈر مڈیمین (Sir Alexander Muddiman) کی کوٹھی بہت قریب تھی۔ ایک دفعہ میں نے اُن کی دعوت کی۔ چار ہم گھر کے آدمی تھے یعنی بیگم صاحبہ مرحومہ۔ میری لڑکی ہاجرہ خاتون (پیاری بی بی) میرا لڑکا حمزہ علی (ننھو میاں) اور میں۔ پانچویں سر الگزینڈر مڈیمین تھے۔ بیگم صاحبہ انگریز ڈاکٹروں سے پہلے گفتگو کر چکی تھیں۔ مگر بغیر پردہ کسی انگریز کے سامنے آنے اور اُس کے ساتھ کھانا کھانے کا اُن کو یہ پہلا موقع تھا۔ وہ انگریزی نہیں جانتی تھیں اور سر الگزینڈر ہندوستانی بولنے سے گھبراتے تھے مگر بڑی کوشش کر کے بیگم صاحبہ سے ہندوستانی میں برابر بات چیت کرتے رہے کھانے کے بعد ہم سب گول کمرہ (ڈرائنگ روم) میں جا کر بیٹھے۔ سر الگزینڈر کا برتاؤ میری بیوی بچّوں کے ساتھ ایسا رہا گویا ایک قریبی رشتہ دار کی دوسرے قریبی رشتہ دار کے یہاں دعوت ہے مجھ سے انگریزی میں کہنے لگے "تمہاری بیوی بڑی وجاہت اور وقار کی خاتون ہیں۔ ایسی خاتون کے نام سے پہلے لفظ لیڈی ضرور ہونا چاہیئے۔" میں ہنسنے لگا۔ سی۔بی۔ای (C.B.E) کا خطاب مجھے ڈیڑھ برس پہلے

جنوبی افریقہ کی خدمات کے صلہ میں مل چکا تھا کسی اور خطاب کی مجھے تمنا نہ تھی۔ عہدہ دار ہونے کی حیثیت سے ملکی خدمات انجام دینے کے صلہ میں اگر خطاب ملتا تو مجھے ضرور خوشی ہوتی تاہم بغیر اہم ملکی خدمات انجام دیئے نائٹ کا خطاب لے کر اُس کے عوض میں اپنی آزادی کو خیر باد کہنا مجھے منظور نہ تھا۔ ہمارے ملک میں خطاب یافتہ حضرات کو عوام شبہہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ خطاب جس قدر بڑا ہوتا ہے پبلک کی بے اعتمادی اسی نسبت سے بڑھ جاتی ہے۔

سر رضا علی یا سید رضا علی؟

ایک قصہ سناؤں۔ مولانا شوکت علی کے انتقال پر دہلی کے پارک میں تعزیتی جلسہ ہوا دس بارہ ہزار آدمی موجود تھے میرے دوست مولانا ظفر علی خاں جلسہ کے صدر تھے۔ مُقرروں کی فہرست میں میرا بھی نام تھا جب میری باری آئی تو مولانا نے فرمایا اب اس تحریک کی تائید سر رضا علی کریں گے۔ مجھے جنوبی افریقہ سے واپس آئے چھ سات مہینے ہی گذرے تھے میری ساری زندگی سیاسی معاملات میں گذری۔ چوٹ دینے اور چوٹ کھانے میں مجھے لطف آتا تھا اور آتا ہے۔ میرا نام سُن کر جلسہ کی یہ حالت ہو گئی جیسے کسی کو سانپ سونگھ جائے۔ مَیں تاڑ گیا کہ یہ زہر میرے خطاب نے پھیلایا ہے۔ مَیں نے جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "میرے محترم دوست صدر جلسہ نے میرا تعارف آپ سے میرا نام سر رضا علی کہہ کر کرایا ہے۔ میرا اصلی نام رضا علی ہے اور سید وہ خطاب ہے جو رب العزت نے اُس وقت مجھے عطا فرمایا جب میں پیدا ہوا۔ عرفی نے اپنے ایک قصیدہ میں وصفِ اضافی کا تذکرہ کیا ہے خطاب وصفِ اضافی بھی ہو سکتا ہے اور اضافی عیب بھی۔ حالات پر منحصر ہے۔ خیر اس بحث کو جانے دیجئے مگر ایک بات ضرور یاد رکھئے وہ یہ کہ اگر آپ سر رضا علی کا سر کاٹ ڈالیں تو وہ بھی اُسی عزت و احترام کا مستحق قرار پائے گا جو آپ کسی اور قومی خادم کا کرتے ہیں۔ میرا سر حاضر ہے کاٹ ڈالئے۔ مصرعہ۔ سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی۔
ترجمہ :۔ دوستوں کا سر آپ کے خنجر کی مشق کے لئے حاضر ہے"۔ مجھے کہنا یہ مقصود تھا کہ سر رضا علی کا سر کاٹ لیجئے تو رضا علی رہ جاتا ہے۔ یہ وہی دہلی تھی جس میں مَیں نے پہلی تقریر یکم اکتوبر ۱۹۱۳ء کو کر کے نواب حامد علی خاں مرحوم والی رامپور کے جلسہ کو درہم برہم کیا تھا۔ وقت کے وقت سر کاٹنے کی بات کچھ ایسی میری سمجھ میں آئی اور مَیں نے اُس خیال کو کچھ ایسے الفاظ میں پیش کیا کہ جلسہ کو میری بات بہت پسند آئی اور گو تعزیت کا جلسہ تھا مگر جب میں نے لالہ شنکر لال صاحب کی تقریر کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہم مسلمانوں کو آزادی کا سبق غیر مسلم کیا سکھائیں گے۔ آزادی تو ہماری گھُٹی میں پڑی ہے۔ ہمارے آگے آزادی کے گیت گانا بقول نسیم۔ مصرعہ۔ سورج کو چراغ ہے دکھانا۔ تو جلسہ اس قدر گرمایا کہ کچھ لوگوں نے تحسین و آفرین کی تالیاں بجانا چاہیں جن کو میں نے ہاتھ کے اشارہ سے روک دیا اور دبی زبان سے کہا کہ آپ کے دلوں میں آپ کی بے بسی نے جذبات کا طوفان برپا کر رکھا ہے (وہ کانگریسی وزارتوں کا زمانہ تھا) مگر یہ نہ بھولئے کہ آج کا جلسہ تعزیتی جلسہ ہے۔

اگست ۱۹۴۲ء کے ہنگامے

آج ۲۹ اگست ۱۹۴۲ء ہے۔ پچھلے تین ہفتے میں جو ہنگامے برپا ہو چکے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں بد امنی نہیں ہوئی۔ موجودہ زمانہ کی کسی بڑی حکومت کے لئے جو آن کی آن میں فنا کرنے والے آلاتِ حرب سے مسلح ہو نہتی محکوم قوم کی شورش کو دبا دینا مشکل کام نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ گورنمنٹ کانگریس کو فنا کر سکتی ہے مگر تحریک آزادی کو نہیں مٹا سکتی۔ تحریکِ آزادی کو عشق اور کانگریس کو حُسن یا تحریکِ آزادی کو روح اور کانگریس کو جسم سمجھنا چاہیئے۔ بقول شاعر ؎

حُسن بے بُنیاد باشد عشق بے بُنیاد نیست ٭ شورِ بلبل کم نہ گردد گر رود گل از چمن،

ترجمہ:- باغ میں اگر گلاب کا ایک پھول بھی نہ رہے تو بھی بلبل کی آہ و زاری جاری رہے گی۔ معشوق کی خوبصورتی چند روزہ ہے مگر سچا جذبۂ عشق عاشق کے دم کے ساتھ ہے۔ گورنمنٹ اور کانگریس کا اب تک کئی دفعہ مقابلہ ہو چکا ہے۔ پہلا معرکہ ۱۹۱۹ء میں رولیٹ بل کی بدولت ہوا۔ وزیر ہند مسٹر مانٹیگو تھے موصوف یہودی انگریز تھے اور اُن جیسا ہندوستان کا مخلص دوست میں نے اپنے تجربے میں کسی انگریز کو نہیں پایا۔ رولیٹ بل کی اصلی بُنیاد انگلستان کی وہ غلط پالیسی تھی جس کی رو سے انگلستان کے مُدبّر اور وزراء یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کو تھوڑے بہت پولیٹیکل حقوق دینا اور انگریزی اقتدار قائم رکھنے کے لئے ساتھ ساتھ سختی نہ برتنا کمزوری پر محمول کیا جائے گا۔ اور تو اور جان مارلے بھی جو اپنے علم و فضل۔ وسیع پولیٹیکل تجربے اور مسٹر گلیڈسٹن کے دوست اور چیلے ہونے کے باعث برٹش پبلک میں نہایت واجب الاحترام تھے۔ نرمی کے نسخہ میں بعض درشت ادویہ کا شامل کرنا ہم ہندوستانیوں کے مزاج کو اعتدال پر لانے کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔

نرمی اور سختی کا مُرکّب نسخہ

نرمی اور درشتی کے اس مرکّب نسخہ کا تجربہ انگلستان کے لبرل فریق کی وزارتوں نے آئرلینڈ (ایرا) میں عرصہ تک کیا تھا اور جو لبرل وزیر ہندوستان کے ساتھ اپنی ڈگر کی بموجب ہمدردی رکھتے یا ہندوستان کی بعض شکایات رفع کرنا چاہتے تھے اُن کے نزدیک بھی نرمی اور درشتی کی جو دورنگی پالیسی آئرلینڈ میں برتی گئی تھی، اُس کے ذراسے حصہ کی ہمارے ملک میں ابتداً ہندوستان کو قانع بنانے کے لئے کافی تھی۔ اگر لارڈ چیمسفرڈ کی بجائے ہندوستان کا والسرائے لارڈ منٹو۔ لارڈ ہارڈنگ۔ لارڈ ریڈنگ یا لارڈ اِرون جیسی سوجھ بوجھ کا آدمی ہوتا تو رولیٹ بل کا قضیہ اس قدر طوالت نہ پکڑتا مگر لارڈ چیمسفرڈ کے صحیح القویٰ ہونے کے باوجود اُن کی سیاست لنگڑی تھی جس کو مصنوعی ٹانگ یا بیساکھی کی ضرورت تھی۔ بدقسمتی سے موصوف نے سر مائکل اوڈائر لفٹنٹ گورنر پنجاب کو پولیٹیکل میدان کا سفر کرنے کے لئے بیساکھی

بنایا نتیجہ یہ ہوا کہ جلیان والا باغ کے ہولناک اور پُردرد واقعہ کے بعد شملہ اور دہلی سے چل کر بچشم خود حالات دیکھنے کے لئے امرت سر بھی نہ پہونچ سکے۔ جلیان والا باغ میں بہت سے بے گناہ مشین گن اور بندوقوں کا شکار ہوئے۔ اِتلاف جان کے مسئلہ کے علاوہ جس طرح سر مائیکل اوڈوائر کی دہشت انگیزی اور تخویف پسندی نے ہندوستانیوں کو من حیث القوم ذلیل کیا اُسے کوئی خوددار قوم عرصہ دراز تک نہیں بھول سکتی بسٹر مانٹیگو نے ان زخموں پر مرہم لگانا چاہا اور دسمبر ۱۹۱۹ء میں بہت سے بے گناہوں کو جو بمصداق کر تو ڈر نہ کر تو خدا کے غضب سے ڈر۔ قید کی سزا بھگت رہے تھے یا ریگیولیشن نمبر ۳ ۱۸۱۸ء کی بموجب محبوس تھے قید فرنگ سے رہائی دی۔ دوسرا معرکہ ۲۲-۱۹۲۱ء میں ولی عہد سلطنت برطانیہ یعنی پرنس آف ویلز کی ہندوستان میں آمد کے سلسلہ میں واقع ہوا۔ اس موقع پر بہت سے کانگریسی لیڈروں پر بشمول پنڈت موتی لال نہرو بسٹر سی۔ آر۔ داس۔ مولانا ابوالکلام آزاد فوجداری مقدمات چلائے گئے اور ملزموں کو بالعموم تین مہینے سے چھ مہینے تک کی سزائے قید دی گئی ۱۹۲۲ء کے شروع میں خود مہاتما گاندھی گرفتار کئے گئے اور عدالت نے انہیں طولانی قید کی سزا دی۔ اس مقابلہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۲۳ء کے الکشن میں سوراج پارٹی نے نمایاں کامیابی حاصل کی تیسری سیاسی جنگ کی ابتدا دسمبر ۱۹۲۹ء میں ہوئی۔ مہاتما گاندھی نے ڈانڈی سے خروج کرکے نمک سازی اور سول نافرمانی شروع کی جس کا انجام اُس مصالحت پر ہوا جو لارڈ اردن نے مہاتما جی سے کی۔ افسوس ہے کہ ۱۹۳۱ء کی راونڈ ٹیبل کانفرنس منعقدہ لندن میں مہاتما جی نے شرکت کرکے کانگریس کو اس شعر کا مصداق بنا دیا شعر

سچ ہے کہ پہلے بھی نہ تھی کچھ قدر و منزلت ٭ پر شب کی منتوں نے ڈبو دی رہی سہی

شروع ۱۹۳۲ء میں اُن کی لندن سے واپسی کے قبل بعض کانگریسی لیڈروں نے کاشتکاروں کو لگان نہ ادا کرنے کا مشورہ دیا تھا گورنمنٹ مُفاہمت سے بیزار اور موقع کی منتظر تھی۔ لارڈ ولنگڈن کی گورنمنٹ نے کانگریس کو خلاف قانون جماعت قرار دیکر مہاتما گاندھی اور تقریباً سارے کانگریسی لیڈروں کو گرفتار کرلیا اور چوتھی پولیٹیکل لڑائی شروع ہوگئی۔ ایک سال کے اندر جیسا پہلے بھی ہو چکا تھا گورنمنٹ نے بہ خیال خود کانگریس کی طاقت کا خاتمہ کردیا مگر ۱۹۳۴ء کی اسمبلی کے الکشن میں پھر کانگریس والوں نے نمایاں کامیابی حاصل کی اور ۱۹۳۷ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے ماتحت صوبوں کی کونسلوں کے انتخاب میں کانگریس کو حیرت انگیز کامیابی ہوئی جس کے بعد سات آٹھ صوبوں میں کانگریسی وزارتیں قائم ہوئیں۔ یورپ کی کورانہ تقلید کا مُنہ کالا ہو فسطائی۔ نازی اور اشتراکی پارٹیوں کی نقل اُتارنے میں کانگریس ہائی کمانڈ نے جس کوتہ اندیشی تنگدلی اور انتہائی نارواداری سے کام لیا اُس پر سیاسی فراست اور جذبہ حُبِّ وطن ہمیشہ ماتم کریں گے۔

حکومت کا بادہ اور کانگریس کا ظرف

افراد کی طرح مجموعہ افراد کے اصلی امتحان کا صحیح وقت وہ ہوتا ہی جب وہ ناکامی کا شکار ہو، یا کامیابی کا سہرہ اُس کے سر ہو۔ تجربہ سے معلوم ہوا کہ گو کانگریس ناکامی کا اثر جلد قبول نہیں کرتی لیکن کامیابی کے ایک جام میں مدہوش و بدمست ہوجاتی ہے۔

کامیابی کا صحیح ایشیائی تخیل یہ ہے کہ شعر۔ لیتے ہیں ثمر شاخِ ثمر ور کو جھکا کر ٭ جھکتے ہیں سخی وقتِ کرم اور زیادہ۔ مگر لطف یہ ہے کہ کانگریس کا درخت جب بار در ہوا تو اُس کی سب سے نیچی شاخ اتنی بلند ہو گئی جتنی اونچی پھل دینے والے درختوں کی عموماً چوٹی ہوتی ہے۔ کاش میرے دوست مسٹر آصف علی نے جو خود دہلی کے باشندہ اور اُردو کے اچھے انشا پرداز ہونے کے علاوہ سخن فہم اور سخن سنج ہیں اُس زمانہ میں کانگریسی ارباب بست و کشاد کو مُغلیہ خاندان کے آخری تاجدار کے اس شعر کے معنی سمجھائے ہوتے۔ شعر

ظفر آدمی اُسکو نہ جانئے گا وہ ہو کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا ٭ جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

یادِ خدا کا معاملہ تو خدا اور کانگریس کے درمیان ہے یہاں بحث حق العباد سے ہے۔ سر ایس۔ پی۔ سنہا نے (بعد کو لارڈ سنہا ہوئے) ایک اسپیچ میں انگریزوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا "اصول حکمرانی اور طریق دوکانداری میں بڑا فرق ہے۔ دوکانداری کے طریقے برت کر تم ایک عظیم الشان سلطنت کو نہیں چلا سکتے۔" اگر کانگریس محض دوکانداری کے ڈھب ہی برتتی تو بھی شاید بعض مسلمان گاہکوں کی کچھ تھوڑی بہت ڈھارس بندھی رہتی مگر کانگریس کی فرمانروائی کے اصول معجونِ مُرکب تھے۔ کچھ طریقے سوویٹ روس سے منگائے گئے تھے کچھ اِس بُنیاد پر کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے انگریزی حکومت سے حاصل کئے گئے تھے کچھ الہامی تھے جو مہاتما گاندھی کی وساطت سے ہندوستان کی مخلوق تک عالم بالا سے پہنچے تھے اور کچھ خود پنڈت جواہر لال نہرو نے گھڑے تھے۔ کانگریسی وزارتیں کیا تھیں کباڑی کی دوکان تھی۔ البتہ دوکان کا مالک ایک شخص نہ تھا بلکہ مختلف دوکانوں پر مختلف تختے لٹک رہے تھے کسی تختہ پر "کانگریس کا دھن" اور کسی پر "دیش کی سیوا کرنے والوں کا مال" ہندی میں لکھا ہوا تھا۔ خال خال کسی دُکان پر اُردو کا تختہ بھی نظر آتا تھا جس کی عبارت ہندوستانی میں یہ تھی "مہڈن (محمڈن) پرش اور دیویوں کے ہاتھ سودا یہاں بِھروکت (فروخت) ہوتا ہے۔" لطف یہ تھا کہ قیمت نقد نہ لی جاتی تھی بلکہ جس شخص کو کوئی چیز خریدنی ہو وہ ایک ٹکٹ پیش کرتا تھا یہ ٹکٹ مقامی کانگریس کے دفتر سے اونے پونے داموں میں حاصل ہو سکتا تھا بغیر ٹکٹ پیش کئے دوکان سے کوئی چیز نہ مل سکتی تھی۔ ٹکٹ صرف اُن لوگوں کو ملتا تھا جن کا تعلق بلا واسطہ یا بالواسطہ کانگریس سے تھا۔

کانگریس اور شہنشاہِ عالمگیر کی پیروی

شہنشاہ عالمگیر کے بارہ میں خود غرض مُصنّفوں نے بقول مولانا شبلی مشہور کر رکھا ہے۔ مصرعہ:۔ کہ عالمگیر ہندو کُش تھا ظالم تھا ستمگر تھا۔ اگر ہندوستان کو آزادی حاصل ہو گئی تو آئندہ خود ہندو مورّخین کی تحقیقات سے ثابت ہوگا کہ شہنشاہ مرحوم پر ہندو کُشی اور ستمگری کا الزام محض بے بُنیاد ہے۔ ہاں عالمگیر میں ایک کمزوری ضرور تھی وہ یہ کہ حکومت میں وہ باپ یا بھائی۔ بیٹے یا بھتیجے۔ مُسلمان یا ہندو کسی کی شرکت گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ باپ کو نظر بند اور بھائیوں کو قتل کرانے کا ذمّہ دار یہی جذبہ تھا۔ آگے چل کر اس جذبہ نے یہ کرشمے دکھائے کہ جہاں عالمگیر نے سیواجی اور مرہٹوں کی قوت کو توڑا یا توڑنا چاہا وہاں دکن کی

اسلامی حکومتوں کا بیخ و بُن سے استیصال کرنے میں بھی کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ انگریزی کی مثل ہے کہ کسی شخص کی تقلید کرنا اُس شخص کو جس کی تقلید کیجائے خراج تحسین وستائش ادا کرنا ہے بسنہ ۱۹۳۷ء میں کانگریسی ہائی کمانڈ نے دوسری پولیٹیکل پارٹیوں اور بالخصوص مسلم لیگ کے تعاون کو ٹھکرانے اور خالص کانگریسی وزارتیں قائم کرکے دوسری پارٹیوں اور جماعتوں کو اپنا تابع فرمان بنانے کی جو نا کام کوشش کی وہ ہو بہو عالمگیر کی تقلید تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ عالمگیر کے حالات کتابوں میں پڑھے اور کانگریسی وزارتوں کے کارنامے موجودہ نسل نے اپنی آنکھوں سے دیکھے بمصرعہ۔ ترا دیدہ و یوسف را شنیدہ۔ عالمگیر نے تمام جذبات پر قابو حاصل کر لیا تھا مگر شہنشاہ موصوف جذبہ رقابت کا قابل افسوس شکار رہے وہ نہیں چاہتے تھے کہ فرمانروائی کی معشوقہ کے چہرہ پر سوائے اُن کے کسی اور کی نظر پڑے۔ بعینہ یہی حالت کانگریس کی تھی وہ کسی کو شریک حکومت کرنا نہیں چاہتی تھی اور اُس کا مقولہ یہ تھا (حضرتِ داغ کی روح اس تصرّف کو معاف کرے) شعر

شرکتِ عیش نہیں چاہتی طینت میری ÷ غیر کی ہو کے رہے یا شبِ عشرت میری

یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ عیش و عشرت سے مُراد لذیذ غذا اور اچھا لباس ہے اگر چھوٹے معاملات کا بڑے معاملات سے مقابلہ کرنا قابلِ اعتراض نہ سمجھا جائے تو اتنا اور کہہ دوں کہ ذاتی آرام و آسائش کا خیال عالمگیر کو کانگریسی وزیروں سے بہت کم تھا۔ کانگریسی وزیر کو تو مفت کے مکان اور مُفت کی موٹر کے علاوہ ملکی خزانہ سے پانچسو روپے ماہوار ملتا تھا مگر عالمگیر اپنے ذاتی خرچ کے لئے خزانہ سے کچھ نہ لیتے تھے بلکہ ادبی اشغال یا کتابت سے جو کچھ کماتے تھے اُس سے گزر کرتے تھے۔ شعر میں تصرّف کرکے عیش و عشرت کے الفاظ جو میں نے درج کئے ہیں اُن سے مقصود حکومت اور نشۂ حکومت ہے۔ کانگریسی وزارتوں نے اپنے دورانِ حکومت میں بہت سے اچھے کام بھی کئے جن کی میں دل سے قدر کرتا اور اُن وزارتوں کو مستحق ستائش سمجھتا ہوں لیکن خالص کانگریسی وزارتیں بنا کر جو عظیم الشان غلطی کانگریس ہائی کمانڈ نے کی تھی اس کی جسامت میں دن دونی رات چوگنی بڑھوتری کا ہونا اس وجہ سے لازمی تھا کہ ہر جاہل اور نا فہم کانگریس والا اپنے کو شریک حکومت یعنی حاکم اور دوسری پولیٹیکل پارٹیوں بالخصوص مسلمانوں کو محکوم سمجھتا تھا۔ علامہ اقبال نے ہمارے ملک کے جمہوری نظام کے بارے میں کیا ہی سچی پیشین گوئی کی تھی ؎

لہ کانگریسی وزارتوں نے مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک کیا اُس کی تفصیلات کا بیان اس لئے نہیں کرنا چاہتا کہ بقول درد۔ شعر۔ مت کہیں عیش تمہارا بھی منغص ہو جائے ÷ داستاں درد کو محفل میں نہ تم یاد کرو۔ ایک قصہ سُن لیجئے جس سے معلوم ہو جائے گا کہ خود ایمان دار کانگریس والے کیا رائے رکھتے تھے۔ بسنہ ۱۹۳۸ء کے آخر میں لکھنؤ کے ایک آزاد مزاج کانگریسی ہندو نے اپنے ایک بے تکلف مُسلمان دوست سے دورانِ گفتگو میں کہا تھا " ارے صاحب۔ میاں لوگ ڈیڑھ برس میں ہی بو کھلا گئے۔ ہم کو دیکھئے سات سو برس تک آپ نے ہماری چھاتی پر مونگ دَلی مگر ہمارے دَم خم میں فرق نہ آیا۔"

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام ٭ جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب ٭ تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

چوری چورا سے کہیں بڑی غلطی

چوری چورا کے واقعہ کے بعد مہاتما گاندھی نے تسلیم کیا تھا کہ عدم تعاون کی تحریک کو عوام میں پھیلا کر انہوں نے جو غلطی کی وہ جسامت میں کوہ ہمالیہ سے کم نہ تھی اگر مہاتما جی کانگریسی وقار کی دیوی کی پوجا اُسی جوش سے کرنے کا سبق گذشتہ بیس برس میں نہ سیکھ گئے ہوتے جس طرح انگریزی شہنشاہیت بے گناہوں کو اپنے وقار پہ قربان کرتی ہے تو اُن کا فرض تھا کہ اس بات کو تسلیم کرتے کہ سنہ ۱۹۳۷ء میں وزارتیں بناتے وقت مسلم لیگ سے سمجھوتہ نہ کرنے اور خالص کانگریسی وزارتیں قائم کرنے میں اُنہوں نے یا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے جو غلطی کی اُس کے آگے چوری چورا ہیچ ہے۔ یہ معاملہ تنہا لیگ کی شرکتِ حکومت کا نہ تھا بلکہ مسلمانوں کے اعتماد حاصل کرنے کا تھا۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا اور کانگریس کی عاملانہ زیادتیاں بڑھتی گئیں مُسلمانوں کا یقین پختہ ہوتا گیا کہ اُن کے کانگریس سے نباہ کی کوئی صورت نہیں ہے۔ آج کانگریس والے مسٹر جناح کو جتنا چاہیں الزام دیں مگر میں ملکی معاملات کے ذاتی تجربہ کی بُنیاد پر یہ کہنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ پاکستان کے خیال اور تحریک کو وجود میں لانے والے بہ ظاہر مسٹر جناح اور فی الحقیقت پنڈت جواہر لال نہرو، مسٹر گاندھی اور کانگریس کے وہ اہل الرائے ہیں جنہوں نے مُسلم لیگ کو گیاہ ضعیف سمجھکر سنہ ۱۹۳۷ء میں ٹھکرایا لطف یہ ہے کہ سوا دو برس حکومت کرنے کے بعد اُنہیں انگشت بہ دنداں ہو کر یہ کہنا پڑا کہ۔ مصرعہ۔ مارا ازیں گیاہ ضعیف ایں گماں نہ بود۔ بڑی خرابی یہ ہوئی کہ کانگریس نے مُسلم لیگ کو غیر سمجھ کر اپنے اور مُسلمانوں کے درمیان اجنبیت اور مغائرت، شبہہ اور بد گمانی۔ بے اعتباری اور بے اعتمادی کی سَدِّ سکندری قائم کر لی جس کے باعث حالت روز بروز بد سے بدتر ہونے لگی۔ خیر مسلمانوں پر سوا دو برس کی گرہ تھی وہ تو نگل گئی مگر کانگریس کی کوتہ اندیشی کے باعث سارے ملک کا ستارہ نحوست بن گیا۔ کانگریس اور لیگ دونوں آزادی چاہتے ہیں لیکن آزادی کا مفہوم جُدا جُدا ہے۔ کانگریس کہتی ہے ہم وہ آزادی چاہتے ہیں جو انگلستان اور امریکہ میں رائج ہے۔ اس طرح کی آزادی میں سیاہ و سفید کی مالک کثرت ہوتی ہے۔ لیگ کا جواب یہ ہے کہ بابا ہم تمہارا تجربہ کر چکے ہیں۔ آزمودہ را آزمودن جہل است۔ اگر تم سیاہ سفید کے مالک ہوئے تو سب سفیدی اپنے حصّہ میں رکھو گے اور ساری سیاہی ہمارے قرعہ میں لگاؤ گے۔ ہم آزادی کے کسی طرح تم سے کم خواہشمند نہیں ہیں لیکن انصاف شرط ہے ایسا کرو کہ خود تمہارے قائم کئے ہوئے اصول سے ہم محروم نہ ہو جائیں۔ جہاں جہاں ہماری اکثریت ہے اُس میں کتر بیونت نہ کرو تم اپنے گھر خوش اور ہم اپنے گھر خوش۔ لیکن اُس بڑے بھائی کی تقلید نہ کرو جس نے چھوٹے بھائی سے تقسیم کے وقت کہا تھا "جو تمہارا ہے وہ میرا ہے کیونکہ ہم دونوں بھائی بھائی ہیں اور میں تمہارا بڑا بھائی ہوں، اور جو میرا ہے وہ تو میرا ہے ہی"۔

مہاتما گاندھی کا برت

آج ۲۸ مارچ ۱۹۴۳ء ہے گورنمنٹ سے کانگریس کی جنگ کا نتیجہ وہی ہوا جس کا اندازہ کانگریس والوں کے سوا بقیہ ہندوستانیوں کو پہلے سے تھا ستمبر ۱۹۴۲ء میں بعض ممبروں کی درخواست پر گورنمنٹ نے لیجسلیٹو اسمبلی کا سیشن دہلی میں منعقد کیا جس میں اسمبلی کی مختلف پارٹیوں نے حالات حاضرہ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ دسویں فروری ۱۹۴۳ء کو اسمبلی کا بجٹ سیشن دہلی میں شروع ہوا۔ اُسی دن مہاتما گاندھی نے اپنا تین ہفتہ کا برت شروع کیا جس سے مُلک میں ایک سنسنی پھیل گئی گورنمنٹ برت کے زمانہ میں گاندھی جی کو رہا کرنے کے لئے تیار تھی مگر اُنہوں نے مشروط رہائی کو منظور نہیں کیا اور صاف کہہ دیا کہ اگر اُنہیں برت کی وجہ سے رہا کیا گیا تو وہ برت نہ رکھیں گے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ اُن کو غیر مشروط رہائی دی جائے جس کو گورنمنٹ نے منظور نہیں کیا۔ مہاتما جی کی عمر چوہتر سال کی ہے۔ برت کے دوران میں اُن کی صحت کی دیکھ بھال چھ ڈاکٹروں کے سپرد کی گئی جن میں سے دو ڈاکٹر یعنی ڈاکٹر بدھان چندر رائے اور ڈاکٹر گلڈر اپنے فن میں باکمال ہونے کے علاوہ مہاتما جی سے بڑی عقیدت رکھتے ہیں۔ برت کے پہلے ہفتہ کے ختم پر جو خبریں مہاتما جی کی صحت کے متعلق شائع ہوئیں اُن سے تشویش پھیل گئی اسمبلی میں اُن کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا اور کانگریس کی قابل افسوس نامہربانیوں کا جو اثر ملک کی مختلف سیاسی پارٹیوں پر ہوا ہے اُس کی یہ عبرت انگیز مثال ہے کہ رہائی کے مطالبہ کی تائید مُسلم لیگ جیسی مُحبِّ وطن جماعت نے بھی نہیں کی خود ہندو مہاسبھا پارٹی کے سب ممبروں کی تائید بھی اس مطالبہ کو حاصل نہ ہوسکی اور بالآخر بھاری کثرتِ رائے سے یہ مطالبہ نامنظور ہوا۔ برت کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ گورنر جنرل کی ایگزیکیٹو کونسل کے تین ممبروں یعنی سر ہومی مودی، مسٹر ایم۔ ایس۔ آنے اور مسٹر این۔ آر۔ سرکار نے بطور احتجاج استعفیٰ دیدیا۔ یہ تینوں ممبر قابل اور اُس حد تک آزاد تھے جتنا کوئی ہندوستانی ممبر موجودہ دستور کے ماتحت ہوسکتا ہے۔ اسٹینڈنگ ایمگریشن کمیٹی (Standing Emigration Committee) کا ممبر ہونے کی حیثیت سے مجھے مسٹر آنے کے کام کا صحیح اندازہ کرنے کے بہت سے موقعے ملے اور جس ہمت سے موصوف نے اپنے اُن بھائیوں کے حقوق کا تحفظ کیا جو ہندوستان کے باہر انگریزی نوآبادیوں اور مقبوضات میں بس گئے ہیں وہ قابل ستائش ہے اس جگہ یہ بتادینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۲۱ء سے یہ محکمہ ہندوستانی ممبر کے سپرد رہا ہے اور میں ہندوستانی ممبروں کے کام کی قدر و قیمت سے اس لئے واقف ہوں کہ میں پہلی مرتبہ ۱۹۲۲ء میں اس کمیٹی کا ممبر مقرر ہوا تھا۔ یہ محکمہ جن ممبروں کے سپرد رہا اُن کی خصوصیات یہ ہیں۔

ایگزیکیوٹو کونسل کے بعض ہندوستانی ممبروں کی خصوصیات

سر بی۔ این۔ شرما بڑے مہمان نواز تھے اور نوآبادیوں کے رہنے والے جو انگریز یا ہندوستانی دہلی یا شملہ آتے تھے اُن کو دعوتیں خوب کھلاتے تھے۔ سر محمد حبیب اللہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے

کہ اُنہوں نے پیڈیسن ڈیپوٹیشن کو جنوبی افریقہ بھیجکر اُس ملک کے بے بس ہندوستانی باشندوں کی تکالیف کو
جو وہاں کی پارلیمنٹ کے نت نئے قوانین اور وزارت اور صوبائی گورنمنٹوں کی ہندوستانیوں کے حقوق
کو پامال کرنے والی ھَل مِن مزید کی پکار سے ہوتی تھیں بڑھنے سے روکا ڈیپوٹیشن کے سکرٹری کی حیثیت
سے مسٹر گرجاشنکر باجپئی نے جو خدمات انجام دیں ان کو بھی نہ بھولنا چاہیئے گورنمنٹ ہند اور جنوبی افریقہ
کی گورنمنٹ کے درمیان کیپ ٹون کا معاہدہ بھی سر محمد حبیب اللہ کے زمانہ میں ہوا اور سرکاری اور غیر
سرکاری نمائندوں کا جو ڈپوٹیشن ۲۷-۱۹۲۶ء میں جنوبی افریقہ گیا تھا اُس کے صدر خود سر محمد حبیب اللہ تھے
سر فضل حسین نے اپنے زمانہ ممبری میں جنوبی افریقہ کی گورنمنٹ کے اقتدار اور عظمت سے مرعوب ہونے
کے باوجود مقدور بھر کوشش کی کہ کیپ ٹون کے مُعاہدے کو عملی جامہ پہنانے میں ہندوستانیوں کے
مفاد کو پیش نظر رکھیں۔ سر جگدیش پرشاد نے سر فضل حسین کی قائم کی ہوئی پالیسی پر چلنے کی کوشش کی
لیکن دونوں کے طریق کار میں اتنا فرق ضرور تھا کہ سر فضل حسین سرکاری عہدہ قبول کرنے سے پہلے پبلک معاملات
کا وسیع تجربہ رکھتے تھے لیکن سر جگدیش پرشاد اکثر معاملات کو اُس عُہدہ دار کے نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے جو
عمر بھر انڈین سول سروس کا ممبر رہا ہو۔ سر گرجاشنکر باجپئی کا عہد ممبری بہت مختصر رہا اُن کو اس خاص
مسئلہ کا بڑا وسیع تجربہ تھا اگر اس عہدہ پر پانچ برس تک رہنے کا اُن کو موقع مل جاتا تو ممکن تھا اپنے
اہلِ وطن کی کوئی قابل قدر خدمت انجام دے سکتے لیکن جو مُعاہدہ موصوف نے گورنمنٹ ہند کی طرف سے
برہما کے ساتھ کیا اُس پر مُلک نے اُنہیں قابلِ مُبارکباد نہ سمجھا لنکا کی گورنمنٹ سے جو گفت وشنید سر
گرجاشنکر نے شروع کی تھی اُس پر بھی پبلک کو یہ بدگمانی تھی کہ سری رام چندر جی کے نام لیوا کے دل پر
راون کے اہلِ وطن کا رُعب چھا گیا ہے

تین ہندوستانی ممبروں کا استعفٰی

مسٹر آئنے میں وہ صفت موجود ہے جس کی مُلک کو اس وقت
سب سے زیادہ ضرورت ہے یعنی کیریکٹر۔ میری ناچیز رائے
میں اعلےٰ دماغی قابلیت رکھنے والوں کی اس وقت ملک میں کمی نہیں ہے لیکن مصرعہ۔
نیست جز انساں دریں عالم کہ بسیار ست و نیست۔ ایسے آدمیوں کی نہایت کمی ہے جو غیروں کا اثر
قبول نہ کریں جن کا فعل اُن کے قول سے مطابقت رکھتا ہو اور جس بات کو وہ اپنے نزدیک حق سمجھتے
ہوں اُس پر آخر تک اڑے رہیں۔ انگریزی گورنمنٹ مختلف طریقوں سے ہندوستانیوں پر اثر ڈال سکتی
ہے ایک نہایت مجرّب اور کارگر طریقہ یہ ہے کہ آزاد رائے ہندوستانی کی شکر سے زیادہ شیریں معقولیت
اور معقول پسندی کو سراہا جائے جن ہستیوں پر یہ نسخہ آزمایا جاتا ہے بسا اوقات اُنکی یہ حالت ہوتی ہے

شعر: نظر بہ ظاہر و صیّاد در خفا خفت است ؛ فریب خوردہ چہ داند بلا کجا خفت است۔ (نظیری)

ترجمہ۔ شکار کی نظر ظاہری چیزوں پر ہوتی ہے اور شکاری گھات میں ہوتا ہے جو شکار دھوکہ میں مبتلا

ہو اُسے کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ مصیبت کا چنگل اُس کا ٹینٹوا کہاں دبائے گا (نظیری کے دوسرے مصرعہ میں اصل رسیدہ کے بجائے ہیں نے الفاظ فریب خوردہ موقع کی مناسبت کے اعتبار سے لکھ دئے ہیں) سر ہومی مودی اور مسٹر سرکار باخبر، محنتی اور ملکی مفاد کا خیال رکھنے والے ممبر تھے۔ اگست ۱۹۴۱ء میں اپنے عہدہ کا چارج لینے کے بعد جب سر ہومی مودی شملہ آئے ہیں تو میں نے مبارکباد دیتے وقت اُن سے کہا تھا عوام کا خیال ہے کہ آپ پینتالیس فی صدی انگریز چالیس فیصدی پارسی اور پندرہ فی صدی ہندوستانی ہیں خیر یہ تو مذاق تھا حقیقت یہ ہے کہ سر ہومی مودی اور مسٹر سرکار دونوں نے آزادی اور قابلیت سے اپنے اپنے عہدہ کے فرائض انجام دئے۔ جہاں اتنی بڑی آبادی کی آزادی کا سوال ہو جتنی ہمارے ملک کی ہے وہاں تین آدمیوں کے گورنمنٹ میں رہنے یا نہ رہنے کا مسئلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ گورنمنٹ کی پالیسی کے خلاف استعفے کے ذریعہ سے اظہار ناراضی کرنا کوئی نئی بات نہیں ہے ۱۹۱۹ء میں گورنمنٹ ہند اور لارڈ چیمسفرڈ کی اُس پالیسی کے خلاف جو پنجاب میں برتی جا رہی تھی سر سنکرن نائر نے استعفے دیکر دنیا کو یہ بتا دیا تھا کہ وہ اس پالیسی پر سختی سے معترض ہیں۔ پچھلے دو سال میں لارڈ لنلتھگو نے ایگزیکیوٹو کونسل کے ہندوستانی ممبروں کی تعداد میں دو مرتبہ اضافہ کیا ہے۔ جون ۱۹۴۱ء میں تین ہندوستانی ممبر تھے اگست ۱۹۴۳ء میں یہ تعداد بڑھ کر دس ہو گئی لیکن جون ۱۹۴۱ء میں جو محکمے تین ہندوستانی ممبروں کے پاس تھے وہی دس ہندوستانی ممبروں کے درمیان تقسیم کر دئے گئے۔ محکموں کی تعداد میں کوئی معتدبہ اضافہ نہیں ہوا۔ فنانس (مالیات)۔ ہوم اور ریلوے جیسے ضروری محکموں پر انگریز ممبر بدستور قابض ہیں۔ ہندوستانیوں کے ساتھ گورنمنٹ کا یہ برتاؤ اُس پالیسی کا خاکہ ہے جو کانگریسی گورنمنٹوں نے اپنے دورانِ وزارت میں مسلمانوں کے ساتھ برتی۔ سچ ہے۔ چاہ کن را چاہ درپیش۔ جو دوسروں کو کنوئیں میں دھکیلنا چاہے گا وہ آپ اُس میں گرے گا۔

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت

خدا کا شکر ہے کہ برت مہاتما گاندھی کا جان لیوا ثابت نہیں ہوا۔ انگریزی گورنمنٹ نے اس معاملہ میں جو پالیسی برتی اُس سے کانگریس اور گورنمنٹ کے درمیان اختلافات کی جو خلیج تھی وہ وسیع سے وسیع تر ہو گئی جس طرح کانگریس اور کانگریس کے ہوا خواہوں نے۔ تنگ آید بہ جنگ آید۔ پر اگست ۱۹۴۲ء میں عمل کیا اُسی طرح گورنمنٹ بھی برت کے موقع پر کیل کانٹے سے لیس ہو گئی تھی اور برت کے معاملہ میں گورنمنٹ نے جو پالیسی اختیار کی اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ گورنمنٹ بھی۔ تنگ آید بہ جنگ آید۔ کے لئے تیار تھی۔ بعض باخبر حضرات کا خیال ہے کہ مہاتما جی کانگریسی تحریک کو تقویت پہنچانے کے لئے جان دینے پر آمادہ تھے مگر جب اُنہوں نے دیکھا کہ اُن کی موت پر رقیب (گورنمنٹ) کے گھر گھی کے چراغ جلیں گے تو اُنہوں نے یہ طے کر لیا کہ جو رقیب چاہتا ہے وہ نہ ہونے دیں۔ میں ذاتی طور پر مہاتما جی کی بڑی

عزّت کرتا ہوں اور سیاسی معاملات میں اُن سے اختلاف رکھنے کے باوجود میرے نزدیک اُن کا شمار دنیا کی سب سے بڑی پانچ چھ ہستیوں میں ہے۔ تخمیناً چالیس کروڑ انسانوں کی آزادی کا مسئلہ (خواہ وہ آزادی برٹش کامن ویلتھ کے اندر رہ کر حاصل ہو یا اُس کی حدود کے باہر نکلنے سے) دنیا کا بڑا اہم اور ضروری مسئلہ ہے۔ کاش مہاتماجی کے دل پر اس حقیقت کا نقش ہوتا کہ کانگریس ملک کے لئے ہے نہ کہ ملک کانگریس کے لئے۔ فسطائی یا نازی یا بالشویکی اصول ہندوستان جیسے ملک میں نہیں چل سکتے۔ ہمارے ملک کی سیاسی نجات ایسے شخص کے ذریعہ سے نہیں ہو سکتی جو کانگریس کے علاوہ اور تمام پولیٹیکل پارٹیوں کے تعاون کو ٹھکرائے۔ نویں اگست کے واقعات کے سلسلہ میں جو حالات ملک میں پیش آئے اور جس طرح جان اور مال کا نقصان ہوا اُس کے بعد مہاتماجی کا جان دینے یا انگلستان کو متاثر کرنے کی نیت سے برت رکھنا دانشمندی کا کام نہ تھا بلکہ اُس پر نوح ناروی کا یہ شعر صادق آتا ہے ؎

جوشِ جنوں کا عالم محدود کب رہا ہے ؛ دامن میں ہاتھ اُلجھے نکلے جو آستیں سے

اُلٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ

مسلمانوں سے کانگریس یا کسی اور پولیٹیکل جماعت کی یہ شکایت بالکل بے جا ہے کہ انہوں نے مہاتما گاندھی کی رہائی کے مطالبہ میں ساتھ نہیں دیا یا مسٹر جناح کو مہاتماجی سے ملاقات کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے تھی یا مئی سنہ ۱۹۴۳ء میں جب گورنمنٹ نے مہاتماجی کی تحریر مسٹر جناح کے پاس بھیجنے سے انکار کیا تو مسٹر جناح کو مہاتماجی کا ساتھی ہو کر گورنمنٹ سے لڑائی لڑنا چاہیئے تھی یہ سب باتیں ایسی ہیں جن کو شکایتوں کا جامہ پہنا کر مسلمانوں کو بدنام کیا جا سکتا ہے اور ان فرضی شکایتوں پر اخباروں میں طول طویل مقالے لکھے جا سکتے ہیں چنانچہ کانگریسی اور کانگریس سے ہمدردی رکھنے والے اخباروں نے لمبے چوڑے مضامین ان مسائل پر لکھے بدقسمتی سے اب رائے سازی (پروپیگنڈے) کا زمانہ ہے جو بات ایک کثیر جماعت مل کر کہے سمجھا جاتا ہے کہ وہی مانی جائے گی۔ کانگریسی اخباروں میں سے کسی نے یہ سمجھنے یا سمجھانے کی کوشش نہیں کی کہ کانگریس اور گورنمنٹ کی موجودہ لڑائی میں آخر مسلم لیگ کسی فریق کا ساتھ کیوں دے یا مہاتماجی کی رہائی کا مطالبہ کیوں کرے یا مہاتماجی کی تحریر رد کئے جانے پر مسٹر جناح آستینیں چڑھا کر کیوں گورنمنٹ سے دست و گریباں ہو جائیں کیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے ۸ اگست سنہ ۱۹۴۲ء کا رزولیوشن منظور کرنے کے پہلے آل انڈیا مسلم لیگ سے مشورہ کر لیا تھا۔ کیا مہاتماجی یا ورکنگ کمیٹی کے طریق کار میں کوئی ایسی تبدیلی ہوئی ہے جس سے یہ سمجھا جائے کہ اگر مسٹر جناح مہاتماجی سے ملنے جائیں تو مابہ النزاع مسائل آسانی سے طے ہو جائیں گے۔ کیا مہاتماجی کی تحریر میں جو انہوں نے گورنمنٹ کے پاس اس غرض سے بھیجی تھی کہ مسٹر جناح کے پاس بھیجدی جائے کوئی بات ایسی درج تھی جس میں اختلافی مسائل کے حل کا کوئی دُور اُفتادہ اشارہ بھی ہو۔ اگر ان سب سوالات کا جواب نفی میں ہے تو

ان سب باتوں سے صرف ایک ہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے اور وہ نتیجہ یہ ہے کہ یہ سب ہنگامہ اس لئے برپا کیا جا رہا ہے اور مصرعہ۔ اُلٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ۔ ان فرضی شکایتوں کا طومار اس لئے باندھا جا رہا ہے کہ کانگریس اور گورنمنٹ کی لڑائی میں مُسلمانوں کو بھی لپیٹ لیا جائے۔ اگر کانگریس اور لیگ کے درمیان اتحاد کی کوئی صورت پیدا ہو جائے تو میرے نزدیک لیگ کا فرض ہوگا کہ کانگریس کا ساتھ دے مگر اس زمانہ میں اتحاد کا سنگِ بنیاد دو یا دو سے زیادہ پارٹیوں یا قوموں یا ملکوں کا مشترک مفاد ہے اگر کسی سیاسی مسئلہ کا اثر دونوں پر یکساں مُفید یا مُضر ہے تو اتحاد ہو سکتا ہے لیکن جب ایک فریق کسی بات کو اپنے لئے مُفید اور دوسرا فریق اسی بات کو اپنے لئے مُضر سمجھتا ہو تو جب تک دونوں فریقوں کا نقطۂ نظر ایک نہ ہو اتحاد کے گیت گانا اور اُسکی خوبیاں بیان کرنا ایسا فعل ہے جس کے جواز کا فتویٰ ممکن ہے موجودہ فن سیاست کا پنڈت دے سکے لیکن راست بازی اور راست کرداری کا دارالعلم ہرگز اسے روا نہ رکھے گا۔ مہاتما جی اور دوسرے کانگریسی لیڈر ۸ اگست ۴۲ء۱۹ کے پہلے آزاد تھے اور مُسلم لیگ سے مُفاہمت کی گفتگو شروع کر سکتے تھے لیکن ہمارے ملک کی سیاسی فہم و فراست اور دور اندیشی کا یہ حال ہے کہ لیگ سے بات چیت کرنا تو درکنار پنڈت جواہر لال نہرو نے امریکہ کے ایک اخبار میں جو مضمون لکھا تھا اُس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اپریل ۴۲ء۱۹ میں سر اسٹیفرڈ کرپس سے کانگریسی لیڈروں کی مُفاہمت کی ناکامیابی کا اصلی سبب یہ تھا کہ کانگریسی لیڈروں کو یہ بدگمانی تھی کہ سر اسٹیفرڈ کرپس کی شرائط کو منظور کرنے سے مُسلمانوں کو پاکستان عملی طور سے مل جائیگا۔ خدا خوش رکھے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کے لئے سوائے اس کے کیا کہوں شعر۔ رہبرانِ خود گم راجز دُعا چہ فرمایم ؛ پاشکستہ وحیراں ماندہ در وطن تنہا (یاس یگانہ)۔ ترجمہ۔ جو رہبر آپ ہی کھوئے ہوئے ہوں اُن کے لئے سوائے دُعا کے اور میری زبان سے کیا نکلے۔ خود اپنے پاؤں توڑ کر غریب حیران ہیں کہ ہم باوجود وطن میں ہونے کے اکیلے رہ گئے۔ اپریل سے لے کر آخر جولائی ۴۲ء۱۹ تک کانگریس "پاشکستہ وحیراں" رہی اُس کے بعد کے واقعات کی تصویر "ماندہ در وطن تنہا" میں موجود ہے۔ مُسلمان سر اسٹیفرڈ کرپس کی اُس تجویز سے جس کا تعلق صوبوں کی از سر نو تقسیم سے تھا مطمئن نہ تھے تاہم انہوں نے کرپس صاحب کی تجاویز کو رد نہیں کیا۔ میری ناچیز رائے میں کرپس صاحب کی مذکورہ بالا تجویز اس قابل ضرور تھی کہ مُسلم اور غیر مُسلم دونوں فریق اُس کا تجربہ کر کے دیکھتے۔ باوجود اکثریت کے ہمارے ہندو بھائیوں کا اصرار کہ کوئی ایسی سیاسی تبدیلی عمل میں نہ آئے جس کا اثر بہ خیال خود اُن کی موجودہ چودھرایت پر مُضر ہو بڑی نادانی اور کوتہ اندیشی ہے۔ مُسلمانوں کے طریق کار سے ہندو بھائیوں کو سبق لینا چاہیئے۔ مُسلمانوں کی آبادی مُلک میں کم و بیش ایک چوتھائی ہے اس کے باوجود وہ اپنے حقوق کا کوئی ایسا تحفظ نہیں چاہتے جس کی مثال مغربی ممالک میں موجود نہ ہو۔ کانگریس نے اب تک جو کچھ کیا ہے اُس کی ذمہ داری خود کانگریس پر ہے۔ کام بگڑ جانے کی صورت میں دوسروں کے سر پر الزام تھوپنا اور موجودہ حالات میں مُسلم لیگ اور مسٹر جناح کے رویہ کو قابل اعتراض قرار دینا بڑی ناانصافی ہے۔

آزادی کا صحیح مفہوم

کانگریسی وزارتوں نے اپنے سوا دو برس کے عہد حکومت میں کانگریسی ہائی کمانڈ کے زیر قیادت جو درگت مسلمانوں کی بنائی تھی اُس کے بعد مسلم لیگ کی اس پالیسی پر کسی ذی ہوش یا منصف مزاج آدمی کو اعتراض نہیں ہو سکتا کہ کانگریس اور گورنمنٹ کی باہمی جنگ میں مسلمان علیحدہ رہیں اور کسی فریق کا ساتھ نہ دیں۔ گورنمنٹ نے ۹ اگست ۱۹۴۲ء سے اب تک جو پالیسی کانگریس کے ساتھ برتی ہے اُس سے اور نیز مہاتما جی کے فروری ۱۹۴۳ء والے برت سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ مہاتما جی اور کانگریس کو یہ معلوم ہو گیا کہ کانگریس کی طرف سے مسلمانوں پر ۱۹۳۷ء کی خشت باری میں انگریزی گورنمنٹ کے سکوت کے یہ معنی نہ تھے کہ جب کانگریس خود انگریزی گورنمنٹ پر اینٹیں پھینکے تو گورنمنٹ پتھر سے اُس کا جواب نہ دے اگر کانگریس کا یہ خیال تھا کہ ہر حالت میں گورنمنٹ اُس کی حمایت کرے گی تو اب اُس کی آنکھیں کھل گئی ہونگی۔ میری عرض تو مہاتما جی اور کانگریس کی خدمت میں یہ ہے :۔

شعر۔ خدا کو مان پیارے آ۔ کسی کا آشنا مت ہو ٭ نہ ہو گا وہ تمہارا جس طرح تم یار کس کے ہو؟ (میر سوز)

تم یار کس کے ہو۔ کی ترکیب ملاحظہ ہو۔ مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کے لئے اِس سے بہتر الفاظ نہیں مل سکتے۔ اِس شعر کے یہاں درج کرنے سے میرا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ ہم ہندو مسلمان آپس میں دست و گریباں رہیں مسلمان ہندوؤں کو الزام دیں اور ہندو مسلمانوں کے سر چھپّر ارکھیں۔ کاش ہم سب آزادی کا صحیح مفہوم سمجھیں اور اُس حاسد کی تقلید نہ کریں جس کو کسی بزرگ نے ایسا عمل بتا دیا تھا کہ اُس کے بعد جو دُعا مانگے قبول ہو جائے لیکن جو شئے دُعا مانگنے والے کو ملتی تھی اُس سے دوگنی پڑوسی کے حصّہ میں آتی تھی۔ دُعا مانگ کر حاسد نے بہت سا سونا چاندی جمع کیا اور جب یہ معلوم ہوا کہ پڑوسی کے گھر سونے چاندی کی دوگنی مقدار پہونچ گئی تو اپنے کانے ہونے کی دُعا مانگی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کانا اور پڑوسی اندھا ہو گیا۔ آزادی اور غلامی کی زندگی میں سفید اور سیاہ بلکہ آسمان اور زمین کا فرق ہے سچ تو یہ ہے کہ آزاد ہو کر دُنیا میں ایک دن جینا سو برس کی غلامی کی زندگی سے بہتر ہے۔ ایک دن کو سو برس پر ترجیح دینا بظاہر شاعرانہ تخیل معلوم ہوتا ہے مگر آزاد قومیں اور وہ دل جنہیں غلامی کی بےبسی اور ذلّت کا سچّا احساس ہے بخوبی جانتے ہیں کہ اس میں کوئی مُبالغہ نہیں ہے۔

صلح کے بعد کی دُنیا

صلح کے بعد کا یوروپ

جنگ کے بعد دُنیا میں بہت سی تبدیلیاں ہوں گی۔ پیشینگوئی کرنا ہمیشہ بڑا دشوار کام سمجھا گیا ہے تاہم تمام تر موجودہ قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لڑائی میں انگلستان، امریکہ، روس اور چین کی فتح ہو گی۔ سوال یہ ہے کہ فتح کے بعد کیا ہو گا یعنی شرائط صلح کن اصولوں پر قرار دی جائیں گی۔ انگلستان کی خارجی پالیسی جس کا سنگ بُنیاد مدّت دراز سے توازن قوت (بیلنس آف پاور) رہا ہے غالباً اِسے رَوا نہ رکھے گی کہ فرانس بہت زیادہ کمزور ہو جائے یا پولینڈ اپنے

زبردست پڑوسیوں کا بوقتِ ضرورت آئندہ مقابلہ کرنے کے قابل نہ رہے۔ یوگوسلاویہ، یونان، ڈینمارک، ہالینڈ اور کسی حد تک بلجیم نے جو قربانیاں دی ہیں اُس کا صلہ اطالوی سلطنت کی قطع و برید سے اگر دیا جائے تو خلاف توقع نہ ہوگا فرانسیسی سلطنت کی کانٹ چھانٹ بھی ہوگی میڈاگاسکر پر ابھی سے جنوبی افریقہ کا دانت ہے۔ چیکوسلوویکیا کے قومی ولولوں کی تکمیل انگلستان اور سوویٹ روس کی خارجی پالیسی کے منافی نہیں ہے، بلکہ اُس کی معاون ہوگی۔ رومانیا کے وسیع علاقے اور صوبے بھی آئندہ ضرورتوں اور مصلحتوں کے مطابق تقسیم کے لئے دست یاب ہوں گے۔ بلقانی ملکوں کے جغرافیائی حدود میں تبدیلیوں کا ہونا لازمی ہے ان تبدیلیوں میں سوویٹ روس کا زبردست ہاتھ نظر آئے گا اور سچ تو یہ ہے کہ موجودہ جنگ کے بعد جو صلح کی کانفرنس ہوگی اُس سے دنیا کو معلوم ہو جائیگا کہ سوویٹ روس کا دعوی اشتراکیت زر خالص ہے یا اُس میں آدھے سے زیادہ شہنشاہیت کی کھوٹ ملی ہوئی ہے۔

اگر ایشیا کے ساتھ انصاف نہ کیا گیا

ایشیا کا حال یہ ہے کہ جاپان نے ایشیائی قوموں کی برابر کی خوشحالی (کو پراسپیریٹی) کی جو نظر فریب اور خوبصورت تصویر پیش کی تھی اُس کے باوجود ایشیائی ممالک نے بالعموم اتحادی طاقتوں کا ساتھ دیا ہے اگر ہندوستان یا کسی اور ملک میں کچھ جماعت ایسے آدمیوں کی بھی تھی جنہیں ۱۹۴۲ء میں جاپان کے ساتھ ہمدردی تھی تو آج اُن کی یہ حالت ہے کہ شعر۔ امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر ؛ کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا (یاس یگانہ)۔

آج ۱۰ نومبر ۱۹۴۳ء ہے اور حالت یہ ہے کہ گو ایشیائی ممالک نے انگلستان کی مدد ابتدائے جنگ سے کی ہے نیز اٹلی کی جنگ میں شرکت کے بعد ہندوستانی فوجوں نے جس بہادری سے اطالوی فوجوں کا مقابلہ اور بالآخر اُن کا قلع قمع کیا وہ دنیا پر روشن ہے غیر تیار اور کم تعداد ہونے کے باوجود بھی ہندوستانی دستوں نے جاپانی فوج کے مقابلہ میں ہمت نہیں ہاری افغانستان، ایران، عراق، فلسطین، شام، سعودی عرب اور مصر یہ سب کڑیاں اُس زنجیر کی ہیں جس نے انگلستان کی حمایت میں لوہے کی دیوار کا کام دیا اور انگلستان اور امریکہ کا پشتی بان ہو کر نازی اور اطالوی فوجوں کو عربی ایشیا میں داخل نہیں ہونے دیا۔ ہندوستانی سپاہیوں کی بہادری اور جرأت، عزم اور استقلال کے علاوہ عرصہ سے ہمارا ملک رسد اور اُس ضروری سامان کے بہم پہونچانے اور بعض اُن آلاتِ حرب کے بنانے اور تیار کرنے کا اڈا بنا ہوا ہے جن کے بغیر لڑائی جاری نہیں رہ سکتی۔ یہ تو تصویر کا ایک رُخ ہے اب دوسرے رُخ پر نظر ڈالئے۔ اٹلانٹک چارٹر کے اعلان سے ایشیائی ممالک پر افسردگی چھا گئی چین کی بے مثل قربانیوں کے باوجود ماسکو کانفرنس میں شرکت کی دعوت چین کو نہیں دی گئی۔ عربی النسل ممالک کی پریشانی کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنا وفاق (فیڈریشن) علحدہ قائم کر رہے ہیں۔ ہندوستان کے لئے مسٹر چرچل فرما چکے ہیں کہ وہ اس لئے وزیر اعظم نہیں ہوئے ہیں کہ تیرّ الٹ کر سلطنت برطانیہ کی دوکان کا دیوالہ نکالیں۔ کل ۹ نومبر کو لندن میں لارڈ میئر کی طرف سے

سالانہ رسمی دعوت تھی۔ دعوت میں مسٹر چرچل نے تقریر کی تھی جسے برٹش براڈ کاسٹنگ کمپنی نے نشر (براڈ کاسٹ) کیا تھا۔ میں نے ریڈیو پر یہ تقریر پوری سنی اور مجھے تعجب ہوا کہ مسٹر چرچل نے سلطنت برطانیہ کی دوکان کا بیڑا لٹنے کے استعارہ کو اس موقع پر بھی دُوہرایا ڈومی نین کے درجہ کے ممالک نے لڑائی میں جو امداد دی ہے اُس کا بھی وزیر اعظم کی کل والی تقریر میں تذکرہ تھا مگر ہندوستان نے لڑائی میں جو مدد دی ہے اُس کا اشارتاً یا کنایتاً بھی ذکر نہ تھا۔ مسٹر چرچل بیڑا لٹنے اور دیوالہ نکالنے کے فقرہ کے ایسے ہی دلدادہ معلوم ہوتے ہیں جیسے مسٹر لائڈ جارج انڈین سول سروس کے آہنی چوکھٹے (اسٹیل فریم) والے جملہ پر مفتوں تھے معلوم نہیں لڑائی کے بعد ایشیا اور بدقسمت ہندوستان کا کیا حشر ہوگا اگر صلح کی کانفرنس نے دنیا کے ممالک کو دو درجوں میں تقسیم کیا ایک وہ جو مغربی ممالک کی طرح خود مختاری اور فرمانروائی (Independence) کا استحقاق رکھتے ہیں اور دوسرے وہ جن کے قرعہ میں پُرانی تہذیب شائستگی کا وارث ہونے کے لحاظ سے آزادی یعنی فریڈم (Civil Liberty) اس شرط سے لگائی جائے کہ تسلّط کسی اور کا ہو تو موجودہ لڑائی دنیا کے لئے گذشتہ سو برس کی سب سے بڑی بلا و آفت اور ناقابل برداشت مصیبت ثابت ہوگی۔

سنہ ۱۹۱۷ء کے حالات کا مقابلہ موجودہ حالات سے

سنہ ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور لیگ نے ہندو مسلم مفاہمت کے لئے اپنی اپنی کمیٹی مقرر کردی تھی یہ بڑی عاقبت اندیشی اور دانشمندی کا کام تھا جس طرح آج انگلستان کے مدبر اور اخبار کہہ رہے ہیں کہ اندرونی تنازعات کا رفع کرنا اور باہمی رضامندی سے آئندہ دستور کا مسودہ تیار کرنا خود ہندوستانیوں کا فرض ہے یہی حالت کم و بیش سنہ ۱۹۱۶ء میں تھی فرق صرف اتنا ہے کہ سنہ ۱۹۱۷ء میں جب مسٹر مانٹیگو وزیر ہند ہندوستان آئے تھے تو سوائے آل انڈیا مسلم لیگ کے ساری پولیٹکل پارٹیوں اور جماعتوں نے اُن کے ساتھ تعاون کیا تھا اور اپنے اپنے خیال اور رائے کی بموجب آئندہ اصلاحات کی تجاویز پیش کی تھیں۔ ہم مسلمانوں نے یہ نادانی کی کہ جب آل انڈیا مُسلم لیگ کے پیش کردہ مسودہ ایڈریس پر جس میں علی برادران کی رہائی کا مطالبہ تھا۔ گورنمنٹ ہند نے ہم سے بھی زیادہ نادانی کا ارتکاب کرکے اعتراض کیا اور چاہا کہ علی برادران کی رہائی کا مطالبہ ایڈریس سے خارج کردیا جائے تو ہم اس درجہ برہم ہوئے کہ مسلم لیگ نے مسٹر مانٹیگو کے روبرو جانے اور ایڈریس پیش کرنے سے انکار کردیا بھلا رہائی کے مطالبہ کا ملک کی آئینی اصلاحات کی تجاویز سے کیا تعلق تھا۔ مسلم لیگ کے ڈیپوٹیشن نے جس کا ایک ممبر میں بھی تھا مسٹر بھوپندرا ناتھ باسو کے ذریعہ سے جو مسٹر مانٹیگو کے ساتھ لندن سے آئے تھے اور جن پر مسٹر مانٹیگو کو بڑا اعتماد تھا پوست کندہ حالات موصوف تک پہونچا دیئے مگر مسٹر مانٹیگو ہم مسلمانوں کی طرح سوڈا واٹر کی بوتل نہ تھے وہ حتی الامکان لارڈ چیمسفرڈ کو راضی رکھنا اور اُن سے کام لینا چاہتے تھے۔ مسلمانوں کی کسی گمنام انجمن کا ایک ایسا ڈیپوٹیشن بھی وزیر ہند کی خدمت میں پیش ہوا

تھا جس نے اپنے ایڈریس میں یہودیوں کو من حیث القوم بے نقط سنائی تھیں مگر مسٹر مانٹیگو کی استقامت میں فرق نہ آیا۔ موجودہ حالت یہ ہے کہ کانگریس نہ صرف سر اسٹیفرڈ کرپس کی تجاویز کو نامنظور کر چکی ہے بلکہ اگست سنہ ۱۹۴۲ء کے معرکہ میں شکست بھی پا چکی ہے۔ سنہ ۱۹۱۷ء میں کانگریس کی پالیسی جن لیڈروں کے ہاتھ میں تھی وہ کانگریس کے موجودہ ارباب بست و کشاد سے زیادہ باخبر، ہوشمند اور دور اندیش تھے۔ یہ سچ ہے کہ موجودہ کانگریس کی قوت عمل پچیس سال پہلے کی کانگریس سے کہیں زیادہ ہے اس قوت عمل کا راستہ ملک کو مہاتما گاندھی نے بتا کر سیاسی حالات میں بڑا انقلاب پیدا کر دیا لیکن تہتی قوموں کو حصول آزادی کے لئے تمام وہ ذرائع استعمال کرنے چاہئیں جن تک اُن کی پہونچ ہے۔

ہمارے دعوے کا اخلاقی پہلو

ان ذریعوں میں ایک بہت بڑا ذریعہ ہمارے دعوی کا اخلاقی پہلو ہے۔ ہمارے ملک میں ایک قوم آباد ہو یا دو قومیں ہندو مُسلمانوں میں اتحاد ہو یا نہ ہو مگر اڑتیس کروڑ سے زیادہ آبادی کے ملک کی قسمت کا فیصلہ ایک ایسی قوم کے ہاتھ میں ہونا جو سات ہزار میل کے فاصلہ پر آباد ہے اور جس کے اور ہمارے درمیان اتحاد مذہب و نسل، رسم و رواج، تہذیب و شائستگی، حالات و روایات کا کوئی رشتہ نہیں ہے اخلاق کے دامن پر ایسا بدنما دھبّہ ہے جس کو مٹائے بغیر نہ جمہوریت اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتی ہے نہ ووٹ کے مل جانے سے انسانی مسرت میں کوئی حقیقی اضافہ ہو سکتا ہے۔ میں کانگریس والوں کی قربانیوں کی قدر کرتا ہوں مگر ہزاروں کی تعداد میں جیل خانہ جا کر یہ سمجھ لینا کہ دلدّر دور ہو جائیں گے بڑی بھول ہے۔ انگلستان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ہمارے دعوے کے اخلاقی پہلو کی مضبوطی سے واقف ہیں سنہ ۱۹۲۳ء میں لارڈ ریڈنگ سے سیاسی مسائل پر میری مفصل بات چیت ہو رہی تھی لارڈ ریڈنگ ذاتی طور پہ ہمارے ملک کو سلف گورنمنٹ یا سوراج دینے کے لئے تیار تھے مگر اس راستہ میں جو رکاوٹیں تھیں اُن پر موصوف نے زور دے کر کہا کہ ہندوستان بیرونی حملوں سے اپنی حفاظت نہیں کر سکتا۔ ہندوستانی ریاستوں کے مسئلہ کا مستقل طور پر حل کرنا بھی سلف گورنمنٹ کی شرط ہے۔ زمیندار اپنے حقوق کا تحفظ چاہتے ہیں۔ ہندو مسلم سوال کے علاوہ اقلیتوں کو اکثریت پر اعتماد نہیں ہے۔ غیر برہمن برہمنوں سے اور اچھوت ان دونوں سے پناہ مانگتے ہیں۔ انگلستان کا بہت سا روپیہ ہندوستان میں لگا ہوا ہے جس کی ادائگی کی ضمانت بھی ضروری ہے۔ لارڈ ریڈنگ نے اِن سب باتوں کو اس آب تاب سے بیان کیا کہ مجھے بےساختہ ہنسی آگئی۔ موصوف کو دنیا کے مُعاملات کا بڑا وسیع تجربہ تھا میرے ہنسنے پر بُرا ماننے کی بجائے فوراً سنبھل کر کہنے لگے "آپ شاید سمجھتے ہیں کہ میں سوراج نہ دینے کے بہانے ڈھونڈ رہا ہوں میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ انگلستان میں بہت سے ایسے آدمی ہیں جو ہندوستان کے ساتھ منافقت برتنا نہیں چاہتے اور آپ کے جائز حقوق آپ کو دینے پر آمادہ ہیں لیکن آپ سب حضرات کا فرض ہے کہ اُن مسائل پر جن کا میں نے تذکرہ کیا ہے

انگلستان کے آپ سے ہمدردی رکھنے والے طبقہ کا اطمینان کریں کہ سوراج ملنے کے بعد ملک میں بدنظمی اور ابتری اور افراتفری نہ پھیلے گی۔" اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی قوت طاقت ہے لیکن میرے نزدیک ابھی تک اہلِ عالم کا صفحۂ ضمیر راستی اور راست روی کے اخلاقی نقوش سے کلیتاً سادہ نہیں ہے۔

انگلستان کی قوت اور ہمارا غلط اندازہ

انگلستان کی طاقت اور ذہنیت کا اندازہ کرنے میں ہم نے ایک سے زیادہ مرتبہ غلطی کی ہے پچھلی جنگ عظیم میں انگریزوں نے سوا چار سال تک جرمنوں کی اُس فوجی مشین کا مقابلہ کیا جس کی نظیر کل پُرزوں کی خوبی کے اعتبار سے دنیا کی تاریخ میں سنہ ۱۹۱۴ء تک نہیں ملتی اور بالآخر اُس مشین کے ٹکڑے ٹکڑے کرڈالے موجودہ جنگ میں انگریزوں کا کارنامہ سنہ ۱۹۱۸-۱۹۱۴ء کی طویل مہم سے بھی زیادہ شاندار اور قابلِ ستائش ہے۔ ذرا غور کیجئے جون سنہ ۱۹۴۰ء سے لیکر جون سنہ ۱۹۴۱ء تک انگلستان بالکل یکہ و تنہا تھا روس کو چھوڑ کر تقریباً سارا یورپ نازیوں کے قدموں کے نیچے تھا دشمن کا دوست ہونے کے لحاظ سے روس سے بھی انگلستان کے تعلقات معاندانہ تھے انگلستان کی محافظ وہی پچیس تیس میل چوڑی پانی کی خندق یعنی انگلش چینل تھی جس کو عبور کرنے سے سنہ ۱۵۸۸ء میں اسپین کا زبردست بیڑا اور اُنیسویں صدی عیسوی کے شروع میں نیپولین کی جان پر کھیلنے والی بحری فوج قاصر رہی سنہ ۱۹۴۰ء میں نئے نئے آلاتِ حرب ایجاد ہوچکے تھے اور مختلف قسم کے جنگی اور فوج کے لے جانے والے ہوائی جہاز اس قدر درجۂ تکمیل پر پہونچ چکے تھے کہ اُن کے ذریعہ سے جرمن انگلستان پر حملہ کرسکتے تھے جیسا کہ جرمنوں نے بعد میں کریٹ پر کامیاب حملہ کرکے اور شمالی افریقہ میں فوجیں پہونچا کر ثابت کردیا۔ نازی فوجیں سنہ ۱۹۴۱-۱۹۴۰ء میں انگلستان پر حملہ کرنے سے کیوں باز رہیں اور نازیوں نے جون سنہ ۱۹۴۱ء میں روس پر جس سے اگست سنہ ۱۹۳۹ء میں وہ دوستی کا معاہدہ کرچکے تھے کیوں اچانک حملہ کیا یہ دونوں معمے ایسے ہیں جن کا حل ان محدود اطلاعات کی بنیاد پر نہیں کیا جاسکتا جو آج دورانِ جنگ میں ہم کو حاصل ہیں یہ دونوں پہیلیاں جنگ کے بعد کا مؤرخ بوجھے گا۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ بے یار و مددگار انگلستان نے پورے سال بھر تک جرمنی اور اٹلی کی متحدہ فوجوں کے مقابلہ میں جنگ جاری رکھی۔ اگر سنہ ۱۹۴۰ء میں جرمنوں کا انگلستان پر حملہ ہوتا تو انگریزی گورنمنٹ کنیڈا جانے اور وہاں سے جنگ جاری رکھنے کیلئے تیار تھی جس بہادری سے انگلستان، ہندوستان، کینیڈا، آسٹریلیا، جنوبی افریقہ اور بعض دیگر ممالک کی فوجیں دشمنوں سے لڑی ہیں اُس کا حال تمام دنیا پر روشن ہے۔ ہمارے جو اہلِ ملک یہ سمجھتے ہیں کہ سو دو سو بم پھینک دینے، ریل کی پٹریاں اُکھاڑنے، ریل کے چھوٹے اسٹیشنوں اور ڈاکخانوں اور بنکوں کو لوٹنے اور اُن میں آگ لگانے، تار کاٹنے، مسافر گاڑیوں کو تباہ و برباد کرنے، دفتروں کو جلانے، اور پولیس والوں یا سرکاری عُہدہ داروں اور مُلازموں یا گورنمنٹ کے طرفداروں کی جان لینے سے وہ انگریزوں کے دلوں میں تخویف اور ہیبت پیدا کرسکتے ہیں اُن کو انگلستان کی تاریخ ایک دفعہ پھر پڑھنی چاہیئے۔

انگریزوں کے قومی استقلال اور ذہنی استقامت کا تذکرہ میں کرچکا ہوں انگریزی کی مثل ہے کہ انگریز

اپنی ہار کبھی نہیں مانتے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہار میں بھی جیت کی اُدھیڑبُن میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں

کانگریس والوں کا موجودہ اضطرار

یہاں یہ حال ہے کہ کانگریس کی گورنمنٹ برطانیہ سے لڑائی چھڑے صرف چودہ مہینہ ہوئے ہیں جس میں کانگریس کی شکست اور گورنمنٹ کی فتح ہوئی۔ آزادی کی جنگ نسلوں تک جاری رہتی ہے لیکن اس شکست نے عام کانگریس والوں اور کانگریس کے ہمدردوں کو ایسا حواس باختہ کر دیا ہے کہ وہ بالعموم اپنی غلطی مان لینے اور گورنمنٹ سے مصالحت کی گفت و شنید کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ ؎

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں ؎ واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

کانگریسی لیڈر ابھی تک محبوس ہیں معلوم نہیں آزاد ہو کر وہ کیا پالیسی اختیار کریں گے۔ جیسا میں اوپر کہہ چکا ہوں انگریزوں کے مقابلہ میں تشدد کی پالیسی کارگر نہیں ہو سکتی۔ میری ناچیز رائے میں ملک میں تنظیم قائم کرنے اور اپنے کو قوی بنانے کے ساتھ ساتھ ہمیں آزادی کے اُس حق پر زور دینا چاہیئے جس کے جواز کو فطرت، مذہب، اخلاق بلکہ خود انسانیت نے تسلیم کیا ہے اگر کانگریس ملکی فلاح و بہبود کو کانگریس پارٹی کے مفاد پر فی الحقیقت ترجیح دیتی ہے تو انجام کار اُسے اپنی پالیسی بدلنا پڑے گی مسلم لیگ سے سمجھوتہ کے دلائل و براہین محتاج بیان نہیں ہیں تاہم کانگریس کو اختیار ہے چاہے سمجھوتہ کرے چاہے نہ کرے۔ البتہ عام کانگریس والوں کی موجودہ بے چینی اور بیتابی، اضطراب اور اضطرار کو ملک کا وہ حصہ آبادی جس کا کانگریس سے کوئی تعلق نہیں ہے اس لئے قابل افسوس سمجھتا ہے کہ اُس سے ہماری ملک کی عزت میں بٹہ لگتا ہے کاش لیڈروں کے رہا ہونے تک وہ سیماب صفت کانگریس والے جو ۸ اگست سنہ ۱۹۴۲ء کے ریزولیوشن کو الہامی صحیفہ کا مرتبہ دیتے تھے اور اب ویسی ہی مستعدی اور سرگرمی سے اُسے باعث تخریب گردانتے ہیں اس سیاسی حقیقت کو سمجھیں کہ مصرعہ۔ نامردی و مردی قدمے فاصلہ دارد۔ ترجمہ۔ بہادری اور بزدلی کے درمیان صرف ایک قدم کا فاصلہ ہوتا ہے۔ بہرنہج سفید جھنڈا بلند کرنے سے پہلے کانگریس کو انتظار کرنا اور یہ دیکھ لینا چاہیئے کہ نئے وائسرائے لارڈ ویول سیاسی گتھی کو سلجھانے کے لئے آمادہ اور مناسب تدابیر عمل میں لانے کے لئے تیار ہیں یا نہیں۔

جب کتاب لکھنے بیٹھا ہوں تو میرا خیال تھا کہ پانسو صفحے سارے حالات بیان کرنے کے لئے کافی ہوں گے یہ اندازہ ایسا ہی غلط ثابت ہوا جیسا اُس شخص کا تخمینہ جو ساٹھ ہزار روپے کی لاگت سے کوٹھی بنانا چاہتا ہے اور پچاس ہزار روپیہ خرچ کرنے کے بعد دیکھتا ہے کہ ابھی نصف کے قریب تعمیر باقی ہے۔

بعض اہم پولیٹکل واقعات

نویں باب میں واقعات کا سلسلہ سنہ ۱۹۱۶ء تک پہونچا تھا میرے دس سال تک الہ آباد ہائی کورٹ میں وکالت کی سیاسی اعتبار سے اُس زمانہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ گاندھی جی کے عزم و ہمت اور اُن کی عظمت کا اندازہ اہل ملک کو سنہ ۱۹۱۷ء میں ہوا جب وہ نیل کے کاشتکاروں کی مدد کے لئے چمپارن صوبہ بہار میں کام کر رہے تھے

چند مہینے پہلے وہ الہ آباد میں ٹھیرے تھے۔ مسز اینی بیسنٹ اور ان کی تحریک ہوم رول کے عروج کا بھی وہی زمانہ تھا۔ کس کس تاریخی واقعہ کا ذکر کروں مسٹر مانٹیگو وزیر ہند ہندوستان آئے دورہ کیا۔ سینکڑوں ہندوستانیوں سے ملک کے آئندہ دستور اساسی کے بارہ میں تبادلہ خیالات کیا۔ کانگریس میں افتراق ہوا پرانے کانگریسی لیڈروں نے لبرل فیڈریشن کے نام سے اپنا پولیٹیکل ادارہ علیحدہ قائم کیا۔ رولیٹ کمیٹی کی رپورٹ پر دو بل امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں پیش ہوئے مسٹر ہارنی مین نے گاندھی جی کو آمادہ کیا کہ رولیٹ بل کے خلاف جو شورش شروع ہوئی تھی اُس کی قیادت وہ کریں شروع اپریل ۱۹۱۹ء میں دہلی جاتے ہوئے مہاتما جی راستہ میں گرفتار کیے گئے دہلی، لاہور، امرتسر، اور گجرانوالہ میں خونریزی ہوئی سر مائیکل اوڈائر لفٹنٹ گورنر اور جنرل ڈائر نے پنجاب کے بعض اضلاع کے باشندوں کو برطانیہ عظمےٰ کی جنگی طاقت کا نمونہ دکھایا۔ سر سنکرن نایر نے گورنر جنرل کی ایکزیکیوٹو کونسل سے استعفےٰ دیا اُن کی جگہ میاں محمد شفیع مقرر ہوئے مسٹر مانٹیگو نے اپنی آئندہ سیاسی ترقی کی امیدوں کو خاک میں ملا کر تمام پولیٹیکل قیدیوں نیز بہت سے اُن ناکردہ گناہ اشخاص کو جو پنجاب کے فسادات کی شرکت کے جُرم میں جیل خانوں میں قید کی سزا بھگت رہے تھے رہائی دی اور فسادات پنجاب کی تحقیقات کے لئے ہنٹر کمیٹی مقرر کی۔ خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلماء کا عروج ہوا مُسلم لیگ عارضی گمنامی کے پردہ میں جا بیٹھی۔ خلافت کمیٹی کے وفد کو جس کے لیڈر مولانا محمد علی تھے مسٹر لائڈ جارج نے لندن میں شرف باریابی بخشا۔ علی برادران اور مولانا حسین احمد پر کراچی میں مقدمہ چلا اور اُن کو سزائے قید دی گئی۔ کچھ مہینے بعد مہاتما گاندھی بھی گرفتار ہوئے اور مقدمہ فیصل ہونے کے بعد قید فرنگ میں پہونچ گئے۔ سوراج پارٹی کا جس کے لیڈر پنڈت موتی لال نہرو اور دیش بندھو سی۔ آر۔ داس تھے ظہور ہوا سوامی شردھانند نے شدھی کے ذریعہ سے ملک کو آریہ ورت بنانے کا بیڑا اُٹھایا بعض ہندو لیڈروں نے سنگھٹن کے دل فریب مگر خون آشام استھان پر ہندو اور مسلمانوں کے موجود الوقت اتحاد کو بھینٹ چڑھا دیا۔ ٹرکی کے بارہ میں اگرچہ ہم ہندی مسلمانوں کی دعا سے دشمنی ہونے کے باوجود اتاترک مصطفےٰ کمال نے ثابت کر دیا کہ تلوار کی دھار وہاں کام کرتی ہے جہاں نالۂ شب گیر عاجز ہو اتاترک مرحوم و مغفور کی فتح کا ایک غیر متوقع نتیجہ یہ ہوا کہ ترک خلافت سے دستبردار ہو گئے اُس کے بعد خلافت کمیٹی کا اثر ہندوستان میں کیسے قائم رہ سکتا تھا نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ سُلطان عبدالعزیز ابن سعود نے ریاض سے نکل کر حجاز پر قبضہ کیا اور سلطان کے وحشی مگر جوشیلے سپاہیوں نے مدینہ منورہ میں بہت سی قبروں کے قبے اور مقامات جن کا مسلمانانِ عالم کی نظر میں بڑا احترام تھا منہدم و مسمار کر دئے۔ اسلام کی تاریخ میں بہت سے افعالِ مذموم کا ارتکاب مذہب کے نام پہ کیا گیا ہے نجدیوں نے بھی ہادیٔ برحق کے محبوب شہر میں وحشیانہ غارت گری اور اہلِ مدینہ پر تشدد کے جواز میں مذہب کی آڑ ڈھونڈی فرقہ وارانہ کشمکش کی ابتدا سوامی شردھانند کر چکے تھے اب ہندو مسلم بلوؤں

کی نوبت آئی۔ مسٹر سائمن معہ اپنے انگریز ساتھیوں کے ہندوستان آئے اور ہندوستانیوں کے معاملات کی اور سنہ ۱۹۱۹ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں جس نئے دستور اساسی کا وعدہ تھا اُس کی تحقیقات اُس کمیشن نے شروع کر دی جس کی خصوصیت یہ تھی کہ اُس کا ایک ممبر بھی ہندوستانی نہ تھا۔ نہرو کمیٹی مقرر ہوئی۔ کمیٹی کی رپورٹ پر مزید اختلافات پیدا ہوئے لکھنؤ میں نہرو کمیٹی کی رپورٹ پر غور و خوض کرنے کے لئے کانفرنس منعقد ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علی برادران نے کھلم کھلا کانگریس اور اپنے کانگریسی ساتھیوں سے قطع تعلق کر لیا۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں مہاتما گاندھی نے ڈانڈی سے خروج کر کے نمک سازی اور سول نافرمانی کا نیا دَور شروع کیا، مارچ سنہ ۱۹۳۱ء میں روٹھے پھر گلے ملے اور کانگریس اور حکومت کے درمیان نزاعی مسائل کا تصفیہ گاندھی اِرون معاہدہ (پیکٹ) کے نام سے ہو گیا۔ اِسی سال کے آخر میں مہاتماجی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کی غرض سے انگلستان گئے۔ میرے نزدیک یہ مہاتماجی کی بڑی غلطی تھی جو پالیسی انہوں نے اختیار کر رکھی تھی اُس کے لحاظ سے خود ہندوستان میں بیٹھ کر اُن کو اپنی شرائط یا تجاویز انگریزی وزارت سے منوانے کی زیادہ اُمید ہو سکتی تھی بہ نسبت اس کے کہ وہ دوڑے ہوئے خود لندن جائیں اور راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے جلسوں میں فاتحانہ لہجہ میں ایسی تقریریں کریں اور ایسے دعاوی پیش کریں جن پر دو تین کے علاوہ باقی ہندوستانی شرکائے جلسہ اُن سے اختلاف بلکہ بیشتر معاملات میں اہم اختلاف رکھتے تھے۔ دوسری غلطی مہاتماجی نے یہ کی کہ اپنے ساتھ سوائے مسز سروجنی نیڈو کے اور کسی کو نہ لے گئے میں نے لیگ آف نیشنس کے جلسوں میں دیکھا ہے کہ کس طرح ہر ملک کا وفد ماہروں کی فوج کی فوج اپنے ساتھ لاتا ہے تاکہ بوقتِ ضرورت اُن سے صلاح و مشورہ کیا جا سکے۔ دور کیوں جائیے فروری سنہ ۱۹۳۱ء میں خود مہاتماجی جب لارڈ اِروِن سے مصالحت کی بات چیت کر رہے تھے تو ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر جہاں وہ مقیم تھے باخبر اور معاملہ فہم کانگریس والوں کا مجمع رہتا تھا جو ہر بات کو پرکھتے اور مسٹر ایمرسن کے پیش کردہ اعتراضات کی جانچ پڑتال کرتے تھے۔ یہ سارے مُعاملات نہایت دلچسپ ہیں جن کا تفصیلی بیان کتاب کے دوسرے حصّہ میں ہی ہو سکتا ہے۔

مُسلمان اور سرکاری عُہدے

آپ بیتی بھی رہ گئی۔ اسلنگٹن کمیشن کے سامنے میں نے دوسری اپریل سنہ ۱۹۱۳ء کو شہادت دی تھی جس میں انڈین سول سروس کے امتحانِ مُقابلہ میں مُسلمان اُمیدواروں کے تقرر کے اہم مسئلہ پر گورنمنٹ کی توجہ دلائی تھی اور ایک مبسوط تجویز پیش کی تھی جس پر عمل کرنے سے اُمیدواروں کا معیار قابلیت گھٹائے بغیر مسلمانوں کی شکایت رفع کی جا سکتی تھی۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں جنگ چھڑ جانے کے باعث اسلنگٹن کمیشن کی رپورٹ بٹے کھاتے میں پڑ گئی۔ دوسری مارچ سنہ ۱۹۲۵ء کو میں نے حسبِ ذیل رزولیوشن کونسل آف اسٹیٹ میں پیش کیا۔

یہ کونسل گورنر جنرل باجلاس کونسل سے سفارش کرتی ہے کہ سرکاری محکموں میں تقرر کے لئے بجائے

موجودہ طریقہ کے حسب ذیل اصولوں پر جلد سے جلد عمل کیا جائے۔

(الف) اُن تمام سرکاری محکموں میں جن میں تقرر امتحان مقابلہ یا نامزدگی (سیلکشن) کے ذریعہ سے ہوتا ہے عُہدوں کا ایک ایسا حصّہ جو کافی اور استحقاق کی مطابق ہو مُسلمانوں کے لئے مقرر کیا جائے۔

(ب) جن محکموں بالخصوص انڈین سول سروس اور انڈین پولیس سروس میں تقرر بذریعہ امتحان مقابلہ ہوتا ہے اُن میں کامیاب اُمیدواروں کی دو فہرستیں یعنی ایک غیر مُسلم امیدواروں کی اور دوسری مسلم امیدواروں کی بنائی جائیں اور ہر فہرست میں سے اُس قدر اُمیدوار نمبر دار بلحاظ نتیجہ امتحان چن لئے جائیں جس قدر خالی عُہدے اُس فہرست کے اُمیدواروں کے لئے کسی سال میں مُعیّن کئے گئے ہوں۔

(ج) کامیاب اُمّیدواروں کی قابلیّت کا ایک ایسا معیار بھی قرار دیا جائے جس سے کم نمبر حاصل کرنے کی صورت میں کسی اُمّیدوار کا تقرر عمل میں نہ آئے۔

سر الکزینڈر میوڈیمین ہوم ممبر نے گورنمنٹ کی طرف سے جواب دیتے ہوئے اعلان کیا کہ مُسلمان اور دیگر اقلیتوں کے تقرر کا مسئلہ زیر غور ہے اور جہاں تک آل انڈیا محکموں کا تعلق ہے گورنمنٹ اقلیتوں کو اُن کا جائز حق دینے کے لئے تیار ہے۔ یہ ہے بُنیاد اُن مسلم حقوق اور جملہ عہدوں اور مُلازمتوں میں مُسلمانوں کے حصّہ کی جس کا نفاذ چند سال سے گورنمنٹ آف انڈیا کے ہر محکمہ میں ہو چکا ہے۔

سنہ ۱۹۲۴ء میں آل انڈیا مُسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ بمبئی کا میں صدر تھا مہاتما گاندھی اور علی برادران بھی لیگ کے اجلاس میں شریک ہوئے تھے اُس سال ملک میں بہت سے فرقہ وارانہ بلوے ہوئے تھے جس کی ذمہ داری بڑی حد تک شدھی اور سنگھٹن کی تحریکوں کے بانیوں پر عائد ہوتی تھی۔

پبلک سروس کمیشن

سوا پانچ سال تک میں پبلک سروس کمیشن کا ممبر رہا اور اس عرصہ میں چھ انگریز اور تین ہندو رفیقوں کے ساتھ وقتاً فوقتاً کام کیا آج ملک کی زہریلی فضا کو دیکھتے ہوئے اُس زمانہ کے واقعات کی یاد میرے لئے کس قدر خوش گوار اور مسرت بخش ہے میرے اور میرے کسی ہندو رفیق کے درمیان اس تمام عرصہ میں کسی ایسے مسئلہ پر اختلاف رائے نہیں ہوا جس کا تعلق فرقہ وارانہ جذبہ داری سے ہو۔ سر وجیا رگھوا چاریا نے ہمیشہ مُسلمان امیدواروں کی مدد کی مسٹر چیٹر جی نے تو یہاں تک کیا کہ بہ اصرار اُس اختلافی یادداشت (نوٹ) پر دستخط کئے جو میں نے ہوم ڈپارٹمنٹ کو مسلمان امیدواروں کے حقوق کے تحفظ کے بارہ میں سنہ ۱۹۳۰ء میں بھیجی تھی تیسرے ہندو ممبر مسٹر درمائیکے جو سر وجیا رگھوا چاریا اور مسٹر چیٹر جی کی قائم کردہ روایات پر بڑی خوشی اور مستعدی سے عامل تھے جب نہرو رپورٹ پر ہندو مسلمانوں کے اختلافات نے بھیانک صورت اختیار کی ہے تو میں دوستوں سے مذاقاً کہا کرتا تھا کہ اگر سیاسی رہنما باہم سمجھوتہ نہیں کر سکتے تو ملک کے آئندہ دستور اساسی مرتب کرنے کا مسئلہ پبلک سروس کمیشن کے ہندوستانی ممبروں کی سپرد اس شرط کے ساتھ کر دیں کہ اگر فیصلہ دونوں

ہندوستانی ممبروں کا متفقہ ہو تو قابل پابندی ہے ورنہ ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا جائے منجملہ چھ انگریز رفیقوں کے دو حضرات معاملات کے طے کرنے میں آزادی اور انصاف سے کام لیتے تھے۔ تیسرے صاحب کا یہ حال تھا کہ شعر :- گہے بر طارم اعلےٰ نشینم ٭ گہے بر پشت پائے خود نہ بینم۔
کبھی ہندوستانیوں کے حقوق کے مسٹر ہیوم سے زیادہ حامی نظر آتے تھے اور کبھی بادشاہ سے زیادہ ملوکیت پسند معلوم ہوتے تھے۔ چوتھے اور پانچویں ساتھی ہر مسئلہ کو اُس محکمہ کے نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے جن سے اُن کا تعلق تھا ان میں سے ایک صاحب کو نوٹ میں ایک قطعی رائے کا اظہار کرنے اور جلسہ کا رنگ دیکھ کر اپنی پہلی رائے کے ٹھیک مخالف ووٹ دینے میں ذرا بھی تامل نہ ہوتا تھا۔ چھٹے رفیق منصف مزاج تھے معاملات کا وسیع تجربہ رکھنے اور روئداد کی بموجب ہر مسئلہ کا فیصلہ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔
اُن معاملات میں جن کا تعلق انتظامی اصولوں سے تھا کمیشن کا گورنمنٹ آف انڈیا کی پالیسی سے متاثر ہونا خلاف توقع نہ تھا لیکن جو اپیل اور استصواب کمیشن کے پاس جاتے تھے اُن کا فیصلہ کمیشن اُسی آزادی سے کرتا تھا جس طرح کوئی ہائی کورٹ مقدمات فیصل کرتی ہے۔ قواعد و ضوابط کی اصطلاح میں کمیشن کی رائے گورنمنٹ پر قابل پابندی نہ تھی مگر کمیشن کی جدوجہد سے یہ ریت رسم (کنونیشن) قائم ہو گئی تھی کہ اپیلوں اور استصوابوں کا آخری فیصلہ گورنمنٹ کمیشن کی رائے کے مطابق کرے۔

یوروپ کا پہلا سفر

میں نے دو مرتبہ یوروپ کی سیر و سیاحت کی سنہ ۱۹۲۹ء میں یوروپ کا پہلا سفر کیا اور گورنمنٹ آف انڈیا کے بھیجے ہوئے وفد میں بماہ ستمبر ممبر کی حیثیت سے لیگ آف نیشنس کے سالانہ جلسہ میں بمقام جینوا شرکت کی۔ چند مہینے پہلے انتخاب عام (جنرل الکشن) میں مزدور پارٹی کی کامیابی کے باعث مسٹر ریمزے میکڈانل وزیر اعظم کا عہدہ سنبھال چکے تھے وزیر ہند مسٹر ویج وڈ بین تھے جن کو ہمارے ملک کے سیاسی ولولوں اور حوصلوں سے بڑی ہمدردی تھی وزیر خارجہ مسٹر ہینڈرسن تھے جو اُن تین حضرات میں سے تھے جنہوں نے مسٹر کیر ہارڈی کی قیادت میں مزدور (لیبر) پارٹی کی بنا ڈالی جب میں لندن پہونچا ہوں اُسی ہفتہ مسٹر ہینڈرسن مصر سے لارڈ لائڈ کو جو مصر کے ہائی کمشنر اور کنسر ویٹو پارٹی کے ممتاز ممبر تھے واپس بلا کر اپنی اصابت رائے اور زبردست کیرکٹر کا ثبوت دے چکے تھے۔ لندن میں بہت سے حضرات سے جن میں وہ وزیر بھی تھے جن کے نام اوپر آ چکے ہیں ملاقات ہوئی پیرس سے جینوا جاتے ہوئے راستہ کی ایک چھوٹی سی بات شاید دلچسپی کا باعث ہو۔ میرا لڑکا حمزہ علی اُس زمانہ میں بسلسلۂ تعلیم انگلستان میں مقیم تھا اور میں اسے اپنے ساتھ جینوا لے گیا تھا۔ ہم سب ہندوستانی وفد کے ممبر اُن ڈبوں میں سفر کر رہے تھے جو پیرس میں ہمارے لئے محفوظ کر دئے گئے تھے صبح کے آٹھ بجے کے قریب ریل ایک چھوٹے اسٹیشن پر ٹھیری میں چائے پینے کا عادی ہوں چاروں طرف نظر دوڑائی میرے ڈبہ سے کچھ دور پلیٹ فارم پر ایک چائے کی دوکان نظر آئی حمزہ ہنوز سو رہے تھے میں چائے

کی دوکان پر پہونچا اور حمزہ کے لئے چائے لانے کی غرض سے ایک گلاس ساتھ لیتا گیا وہاں جا کر دیکھا کہ سلطنت برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر میکڈانل دوکان پر کھڑے چائے پی رہے ہیں اور ایک مگ (تام چینی کا آدھا ڈھکا ہوا پیالہ) اُن کے ہاتھ میں ہے۔ علیک سلیک کے بعد ایک دو باتیں ہوئیں میں نے چائے پی اور میکڈانل صاحب اپنے مگ میں لڑکی کے لئے چائے لے کر اپنے ڈبہ کی طرف چلے گئے۔ میں گلاس میں حمزہ کے لئے چائے لے کر اپنے درجہ میں لوٹ آیا۔ بات تو چھوٹی سی تھی مگر اُس کا مجھ پر بہت اثر ہوا۔ اس واقعہ کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ انگریزوں کی قوم اُس عیش پرستی اور آرام طلبی کی عادی ہو گئی ہے جس کے باعث وہ اب دُنیا میں اپنی حکومت اور اقتدار قائم رکھنے کے قابل نہیں رہی۔ مانا کہ مسٹر میکڈانل ایک زمانہ میں مزدور تھے مگر جو شخص مگ ہاتھ میں لئے اسٹیشن پر چائے خرید رہا تھا وہ اُس وقت سلطنت برطانیہ کا وزیر اعظم تھا۔

رُوس کی سیاحت

اکتوبر ۱۹۲۹ء میں میں نے سودیٹ روس کا سفر کیا ارادہ تو میرا پہلے سے تھا مگر مسٹر ویج ووڈبین اور اُن کی اہلیہ سے بات چیت کرنے کے بعد مُصمّم قصد ہو گیا انگلستان اور بالشویکی روس کے باہم اُس زمانہ میں سفارتی تعلقات نہ تھے یہ تعلّقات مسٹر میکڈانل نے اپنے دوران وزارت میں قائم کئے۔ مسٹر ویج ووڈبین نے بعض روسی دوستوں کے نام خطوط دینے کی آمادگی ظاہر کی میں نے شکریہ ادا کیا اور کہا خطوں کو رہنے دیجئے ہاں روسی اگر مجھے پکڑ کر بند کردیں تو اُس وقت آپ کی امداد کی ضرورت پڑے گی۔ روس گیا دو ہفتے کے قریب ماسکو میں ٹھہرا اور ماسکو سے سو میل کے دائرہ کے اندر بہت سے مقامات کی حالت دیکھی۔ میں نے روس کے سفر کا پروانۂ راہ داری برلن میں حاصل کیا تھا۔ اُس زمانہ میں روسی دو قوموں کو اپنا بہترین دوست سمجھتے تھے، جرمن اور امریکی، انگلستان کو روسی بُرا اور اپنا مخالف جانتے تھے۔ کسی نے سچ کہا ہے اِس عالم اسباب میں کل کے دوست آج کے دشمن اور کل کے دشمن آج کے دوست ہوتے ہیں۔

میں نے یوروپ کے اور بھی بہت سے ملکوں کی سیاحت کی فرانس کے بارے میں یہ رائے کہ وہ مصر آئین شناس شیوۂ پیکار بھی نہیں ۱۵-۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے تجربہ سے غلط ثابت ہو چکی تھی مگر اُس کے "رندِ عالم بیزار" ہونے میں شک و شبہہ کی گنجائش نہ تھی۔ نیس میں سمندر کے کنارے بیٹھ کر میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ ساحل کی چٹانوں کے کسی پتھر کو اگر زبان گویائی مل جاتی تو حُسن و عشق، راز و نیاز، ہوس و محبت، مُسرت و الم کی حقیقی داستانوں سے اہلِ عالم کو پتہ چل جاتا کہ دُنیا کا طِلسم جتنا عجیب معلوم ہوتا ہے اُس سے کہیں عجیب تر ہے خدا جانے کتنے فرہاد ان چٹانوں سے سر ٹکرا چکے تھے کتنے پرویز اِس ساحل پر حیاتِ شیریں سے لذّت اندوز ہو چکے تھے۔ کتنے صحرا نوردوں کا محمل کی تلاش میں اِس ساحل پر گزر ہوا اور لیلائے مقصود سے ہم کنار ہونے

کی بجائے طوفانِ دردوغم کی موجوں کا شکار ہوگئے۔ ۱۹۲۹ء میں جرمنوں کی حالت کس مپرسی اِس مصرعہ کی مصداق تھی مصرعہ۔ ہم ایسے ہیں کہ جیسے کسی کا خدا نہ ہو۔

یوروپ کا دوسرا سفر دوسری مرتبہ یوروپ کا سفر ۱۹۳۶ء میں پیش آیا۔ جنوبی افریقہ کے ڈاکٹروں نے دل کا مرض تشخیص کیا اس زمانہ کے ڈاکٹر بھی بڑے اہلِ کمال ہیں میں تو سمجھا تھا کہ چند مہینے پہلے دل نذر کر کے میں گنگا نہا چکا ہوں مجھے اس مرض سے کیا واسطہ۔ مگر ماہرینِ فن کا زمانہ ہے اُن کی تشخیص کو کون جھٹلائے۔ جولائی کے آخر میں معہ لیڈی رضا علی اور اُنکی بہن مس ٹنکچی سامی کے ڈربن سے جرمن جہاز دلوٹسی میں روانہ ہوکر ہیم برگ پہونچا ہیمبرگ کی خصوصیت بقول جرمنوں کے یہ ہے کہ وہاں سال کے تین سو پینسٹھ دن میں سے تین سو دن ابر اور کُہر گھرا رہتا ہے۔ چار دن ہیم برگ میں ٹھیر کر ہم سب برلن گئے میں تخمیناً سات برس بعد برلن پہونچا تھا اب جرمنوں کی حالت میں عظیم الشان تغیر ہو چکا تھا ۱۹۳۳ء میں اُن کو ناخدا (ہٹلر) مل گیا تھا موجودہ جنگ میں جرمنوں کو شکست ہو یا فتح (تمام آثار شکست کے ہیں)۔ مگر اس میں شبہ نہیں کہ تھوڑے سے زمانہ میں ہٹلر نے اپنی قوم کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا ہٹلر کا حوصلہ قابلِ داد ہے ۱۹۳۸ء تک اُنھوں نے جو کارہائے نمایاں کیئے تھے وہ اس قابل تھے کہ اُن کے نام کو تاریخ کے صفحوں میں مستقل جگہ ملتی مگر بڑی خرابی یہ ہے کہ کسی بلند ہمت فاتح کو یہ پتہ نہیں چلتا کہ حوصلہ کا میدان کہاں ختم ہوتا اور حرص کا لق ودق بیابان کہاں شروع ہوتا ہے۔ حوصلہ اور حرص کے درمیان جو نازک فرق ہے اُس کا امتیاز بسا اوقات فتحمند ہستیوں کو نہیں ہوتا مگر ایک بات ایسی ہے جس کا نظر انداز کرنا کسی فاتح کے لئے جائز نہیں ہوسکتا وہ یہ کہ سو برس کے کرنے کا کام دس برس میں نہیں ہوسکتا برطانیہ کی سلطنت موجودہ زمانہ کی سب سے بڑی سلطنت ہے مگر برطانیہ کی حکومت کو یہ وسعت صدیوں میں ہوئی ہے حکومت کی تدریجی وسعت اور مسلسل نسلوں کی لگاتار خاموش یا بقدر ضرورت خوں فشاں جد وجہد کا دامن حرص کے جسم پر بھی حوصلہ مندی کا پردہ ڈال سکتا ہے مگر بیسویں صدی کا جلد باز حوصلہ مند اگر زمین پر ہوائی جہاز کی رفتار سے چلے اور سابق قیصر جرمنی کی طرح اپنی زندگی میں وہ کام کرنا چاہے جو اور قوموں نے سیکڑوں برس میں کیا ہے تو بڑھنے والی قوم کی سُرخ قبا جس کو اُس نے اپنی حوصلہ مندی کا نشان قرار دیا ہے دوسری قوموں کی نظر میں حرص کے جلاد کا سیاہ لباس معلوم ہوتی ہے۔ جولیس سیزر، چنگیز خاں اور تیمور بہت بڑے فاتح تھے مگر اُن کا زمانہ گزر گیا۔ نپولین نے اُن کی روایات کو تازہ کرنا چاہا لیکن دُنیا کی بڑھتی ہوئی روحانی قوت نے نپولین کے منصوبوں کو بالآخر خاک میں ملا دیا۔ ولہیم قیصر جرمنی کا بھی وہی حشر ہوا جو سو برس پہلے فرانسیسوں کے شاہنشاہ کا ہو چکا تھا موجودہ زمانہ کے کسی فاتح کو اپنی حکومت اور اقتدار کے دائرہ کو مستقل طور پر وسعت

دینے کی اُمید اُس وقت تک نہ رکھنی چاہیئے جب تک اُس کے حوصلہ کے حدود قابلِ برداشت نہ ہوں
فریڈرک اعظم اور بسمارک کی کامیابی کا راز یہی تھا کہ وہ اُسی قدر بوجھ اُٹھاتے تھے جسے لے کر چل سکیں۔
یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ ایک ہفتہ برلن میں قیام کرنے کے بعد ہم ویانا پہونچے جہاں میں نے ڈاکٹر
ون کے بارخ کا علاج شروع کردیا موصوف دل کے امراض کے دُنیا میں سب سے بڑے ماہر سمجھے جاتے
تھے تھوڑے دنوں میں مریض و معالج کے تعلقات کی بجائے دوستانہ مراسم ہوگئے ڈاکٹر ون کے بارخ
قوم کے ڈچ تھے فنی کمال کے علاوہ بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ کئی زبانیں جانتے تھے انگریزی بھی
بلاتکلف بولتے تھے۔ ایک روز مجھ سے کہنے لگے "سر رضا۔ اب آپ ایسے جوان نہیں ہیں جیسے آج
سے بیس برس پہلے تھے۔ جو علاج مجھ سے ممکن ہے کر رہا ہوں مگر یاد رکھئے کہ میں آپ کا ایسا اچھا علاج
نہیں کرسکتا جیسا آپ خود کرسکتے ہیں۔ آپ کے دل میں کوئی خاص خرابی نہیں مگر جو احتیاطیں میں
بتاتا ہوں اُن پر عمل کرنا آپ کا فرض ہے۔" اُس کے بعد ضروری احتیاطیں ایک کاغذ پر لکھ کر دیں
اور دیر تک سمجھاتے رہے۔ سب سے پہلی احتیاط یہ تھی کہ سگار سگرٹ پینا یک قلم چھوڑ دیا جائے۔ میں موصوف
کی بتائی ہوئی سب احتیاطوں پر عامل ہوں مگر تمباکو نوشی نہیں چھوٹتی۔ پہلے سگار پیتا تھا اب
سگرٹ پیتا ہوں۔ مجھ سے سگرٹ نہیں چھوٹتا۔ دُنیا میں ایسے بھی آدمی ہیں جو شراب پینا چھوڑ دیتے
ہیں میرے نزدیک وہ سب خدا کے خاص بندے ہیں۔ ایک قابلِ تذکرہ بات رہ گئی موجودہ جنگ
شروع ہونے سے پہلے ہمارے صاحبِ مقدرت ہندوستانی بھائی ویانا علاج کرانے جاتے تھے ویانا کے
ڈاکٹر تمام دنیا میں مشہور ہیں مریض کو چاہیئے کہ بہترین ڈاکٹر سے علاج کرائے اُن کی فیس زیادہ نہیں ہے
ڈاکٹر ون کے بارخ نے جب بل بھیجا تو مجھے بڑا تعجب ہوا بل میں فی ملاقات جتنے شلنگ درج تھے وہ تقریباً
تیس روپے کے برابر ہوتے تھے۔ ڈاکٹر میلر سے جو آنکھ کے سب سے بڑے ماہر تھے میں نے اپنے لئے
عینک تجویز کرائی تھی اُنہوں نے آنکھوں کا بغور معائنہ کرنے کے دو تین دن بعد عینک کا نسخہ تجویز
کیا اور مجھ سے صرف چالیس روپے کے قریب فیس لی۔ یہ تو چوٹی کے ڈاکٹروں کا حال ہے مگر کوئی بدقسمت
مریض ویانا کے معمولی یا گھٹیا ڈاکٹروں کے ہتھے چڑھ جائے تو کپڑے بیچ کر پیچھا چھڑانا پڑے معمولی
ڈاکٹروں کا یہ حال ہے کہ ہر ہندوستانی کو آغا خان اور مہاراجہ کپورتھلا کا ہم پلہ سمجھتے اور لوٹنے کی
کوشش کرتے ہیں۔ پیرس میں آکر میری سالی مس سامی بیمار ہوگئیں اُن کے علاج کے سلسلہ میں معلوم
ہوا کہ ویانا کی طرح پیرس کے معمولی ڈاکٹر بھی ایک کی جگہ دو یا تین لینے کے فن میں مشاق ہیں۔

لیڈی رضا علی کا یوروپ کا یہ پہلا سفر تھا اُن کو پانچ چھ ملکوں کی سیر کرائی برلن اور پیرس
کے علاوہ اُن کو زیورک، جینوا اور وشی بہت پسند آئے میونک میں ہر ہفتے تین چار دن فوجی جلوس
نکلتے تھے ہٹلر کے ادعائے صلح و آشتی پر بدگمانی شروع ہوگئی تھی اور غیر ممالک کے سیاح یہ تیاریاں دیکھ کر

حیران تھے کہ اس آغاز کا انجام کیا ہوگا شعر۔ مجھے کھٹکا ہوا تھا جب بنائے کعبہ پڑتی تھی ؏ کہ یہ جھگڑے میں ڈالے گا بہت گبر و مسلماں کو۔ نومبر میں لندن پہونچے اور ایک مہینہ سے کچھ زیادہ انگلستان میں ٹھیرے لارڈ زیٹ لینڈ وزیر ہند، لارڈ ہیلی فیکس (لارڈ ارون) مسٹر بٹلر انڈر سکرٹری وزارت خارجہ اور بعض اور ممتاز انگریز حضرات سے ملاقات ہوئی۔

شاہ و گدا عشق کے دربار میں

سابق ملک معظم ایڈورڈ ہشتم نے جب مسز سمسن کے پیچھے راج پاٹ تجا ہے تو میں لندن میں تھا یہ معاملہ انگلستان کے ایک صوبائی اخبار یارک شائر پوسٹ نے اُٹھایا تھا مسٹر بالڈون وزیراعظم اور کنسرویٹو پارٹی نے جو کچھ کیا اُس کا حال اخبار میں پبلک سے پوشیدہ نہیں ہے مگر مجھے سخت تعجب ہوا کہ لیبر پارٹی نے بھی بادشاہ کا ساتھ نہ دیا۔ بادشاہ کا غیر شاہی خاندان کی کسی عورت کے ساتھ شادی کرنا ایسی بات تھی جس کا بظاہر مزدور پارٹی کو اس لئے خیر مقدم کرنا چاہیئے تھا کہ اُس سے اُن امتیازات پر جو طبقہ اُمرا اور عوام کے درمیان انگلستان میں موجود ہیں کاری ضرب لگتی تھی۔ چند ہفتے پہلے سابق بادشاہ ایڈورڈ ہشتم ویلس کا دَورہ کر کے اور کوئلہ کی کانوں میں جو مزدور بے روزگار تھے اُن کے ساتھ دلی اور عملی ہمدردی کا اظہار کر کے پبلک سے خراج تحسین حاصل کر چکے تھے۔ سابق بادشاہ دوستوں اور جاننے والوں سے تعلقات قائم رکھنے میں رسمی قیود و شرائط کی پابندی سے آزاد تھے یہ بھی سب کو معلوم تھا کہ معاملات میں وہ اپنی ذاتی رائے رکھنے والے فرماں روا ہیں۔ آخر الذکر بات سے مزدور پارٹی غیر مطمئن تھی وہ ایسا بادشاہ چاہتی تھی جس کے عادات و خصائل ایک حد تک اس بات کے ضامن ہوں کہ آئندہ مزدور پارٹی اور کسی اور پولیٹیکل پارٹی کے درمیان تصادم ہونے کی صورت میں فرماں روا ناطرف دار اور غیر جانبدار رہے گا اور اُس کے طریقِ کار سے مزدور پارٹی کو نقصان نہ پہونچے گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سابق بادشاہ سے ہمدردی رکھنے کے باوجود مزدور پارٹی نے وزارت کا ساتھ دیا اور پارلیمنٹ کے مزدور ممبروں کی تائید سے ایڈورڈ ہشتم کی تخت سے دست برداری اور ڈیوک آف یارک کی تخت نشینی کا بل ہاؤس آف کامنس سے پاس ہو گیا۔ میں اُس دن ہاؤس آف کامنس میں موجود تھا جس دن بادشاہ کی تخت سے دست برداری کا بل پاس ہوا ہے اُسی رات کو ریڈیو پر اعلان کرنے والے کی زبان میں "ہز رائل ہائنس پرنس ایڈورڈ" انگلستان کا ساحل چھوڑنے سے پہلے قوم سے کچھ کہنا چاہتے تھے میں نے وہ تقریر بھی غور سے سُنی اُس شہزادہ کے لب و لہجہ میں جو چند گھنٹے پہلے دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کا بادشاہ تھا تاسف کی جھلک تک نہ تھی۔ انگریزی کی مثل ہے کہ عشق اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے مطلب یہ ہے کہ لڑائی میں فتح حاصل کرنے اور محبوب کو اپنانے کے لئے جو کچھ نہ کیا جائے تھوڑا ہے مناسب اور نامناسب کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔

سیاسی حلقوں کا فیصلہ ڈیوک آف ونڈسر کے بارہ میں جو کچھ بھی ہو مگر حُسن کی دیوی اور عشق کا دیوتا عرصہ تک ناز کریں گے کہ اس مادیت کے زمانہ میں جب ہر شخص پیسے کا میت یا عظمت و وقار کا بھکاری ہے اُن کے صنم کدہ کے پوجاریوں کی صف میں راج پاٹ پر لات مار ایک بادشاہ بھی کھڑا عالمِ بے خودی میں مالا جپ رہا ہے۔ شعر:۔

یہ وہ عشق خانہ خراب ہے کہ دکھا کے شوکتِ خسروی
سرِ غزنوی کو جُھکا دیا رہِ سرفراز ایاز ہیں،
(اثر لکھنوی)

جنوبی افریقہ کی کہانی

نومبر ۱۹۲۵ء میں پہلی مرتبہ میں جنوبی افریقہ اُس ڈیپوٹیشن کا ممبر ہو کر گیا جو مسٹر پیڈیسن کی صدارت میں لارڈ ہارڈنگ نے اُن ہندوستانیوں کے حالات کی تحقیقات کے لئے بھیجا تھا جو اُس ملک میں بس گئے ہیں۔ ڈیپوٹیشن کے دوسرے ممبر سر دیوا پرشاد سربادھیکاری اور سکرٹری مسٹر گرجا شنکر باجپئی تھے جب ہمارا ڈیپوٹیشن پہونچا ہے تو جنوبی افریقہ کے وزیر اعظم جنرل ہرٹ زاگ اور وزیر داخلہ ڈاکٹر ملان تھے۔ ڈاکٹر ملان اب مخالف پارٹی کے لیڈر ہیں۔ میں جنوبی افریقہ دوبارہ ۱۹۳۵ء میں ایجنٹ جنرل (اب اس عہدہ کا نام ہائی کمشنر ہے) ہو کر گیا اور تین سال تک اِس عُہدہ کی خدمات انجام دیں۔ اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ میری زندگی کے بدترین اور بہترین تین سال کون سے تھے تو میں کہوں گا کہ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۸ء تک کا وہ زمانہ جو میں نے لاچار اور بے بس ہندوستان کا سفیر یا نمائندہ ہو کر جنوبی افریقہ میں گزارا تفصیلی حالات اِس کتاب کے دوسرے حصّہ میں بیان کئے جائینگے مختصر یہ ہے کہ جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کی معاشرتی معاملات میں وہی حالت ہے جو ہمارے ملک میں غریب اچھوتوں کی ہے اور اگر جنت کا یہ تخیل صحیح ہے کہ شعر:۔

بہشت آں جاکہ آزارے نہ باشد ؛ کسے را باکسے کارے نہ باشد

ترجمہ:۔ اُس جگہ کا نام جنّت ہے جہاں انسان کو کوئی تکلیف نہ ہو اور ایک کی ایک کاٹ نہ کرے۔ تو پولیٹیکل، اقتصادی، تجارتی اور کاروباری معاملات میں اُن کی حالت اچھوتوں سے اِس قدر بدتر ہے کہ ہندوستان اچھوتوں کے لئے جنّت ہے اور جنوبی افریقہ ہندوستانیوں کے لئے دوزخ۔ مجھ جیسے مزاج کے آدمی کے لئے سب سے زیادہ تکلیف وہ بات یہ تھی کہ گورنمنٹ آف انڈیا اور برٹش گورنمنٹ کے اثر کے ماتحت ایجنٹ جنرل ہندوستانی نہیں سمجھا جاتا۔ بلکہ اُس کے ساتھ وہی مراعات برتے جاتے ہیں جو اُس ملک میں گوری رنگت کے آدمی کا پیدائشی حق ہیں گویا ایجنٹ جنرل وہ کوّا ہے جس کے جسم کو مور کے پروں سے ڈھک دیا گیا ہے دن رات اپنے تعلیم یافتہ، مہذب و سلیقہ شعار، غیور و دولتمند ملکی بھائیوں کی تذلیل اپنی آنکھوں

لیڈی رضاعلی شادی کا کیک کاٹ رہی ہیں اُن کے پاس سر رضاعلی کھڑے ہیں - یہ اُس ویڈنگ رسپشن کا فوٹو ہے جو ۱۶ جنوری ۱۹۳۶ء کو سر ارنسٹ و لیڈی اوپن ہائمر نے سر رضاعلی اور لیڈی رضاعلی کی شادی کی تقریب میں دیا تھا -

سے دیکھتا ہے اور کچھ نہیں کرسکتا۔ میں نے تین برس جنوبی افریقہ میں اس طرح گذارے کہ شعر۔
صد رفیق و صد ہمدم، پر شکستہ و دل تنگ ؛ دادرا نمی زیبد' بال و پر، من تنہا (یاس یگانہ)
ترجمہ مع مطلب:۔ "سیکڑوں ہزاروں ساتھیوں اور دوستوں کے بال و پر نوچ کے اُنھیں ایسا
مضغۂ گوشت بنا دیا گیا ہے کہ بس جان باقی ہے۔ اے میرے پروردگار میں تنہا بال و پر لے کر
کیا کروں گا۔" انگریز اور ڈچ دوستوں کا تہ دل سے ممنون ہوں کہ مہماں نوازی کے علاوہ انہوں
نے میرے ساتھ ضابطہ کا برتاؤ نہیں کیا بلکہ واقعاً دوستی برتی اور میری شادی کے باعث جب
خود میرے ملکی بھائیوں کی ایک جماعت میرے خلاف ہو گئی تھی میرا ساتھ دیا اور لیڈی رضا علی
کو اور مجھ کو ہوٹلوں اور خود کیپ ٹاؤن کے ایوانِ پارلیمنٹ کے رستوراں (ڈائننگ روم) میں
دعوتیں دیں۔ شادی کے بعد اُسی دن سہ پہر کو سر ارنسٹ آپین ہائمر نے جو لیڈی رضا علی کے
والد مرحوم کے مخلص دوست تھے ایک بہت بڑا ویڈنگ رسپشن (عصرانہ) دیا تھا جس میں مہمانوں
کی تعداد آٹھ سو کے قریب تھی اِس تقریب میں لیڈی رضا علی نے کیک کاٹنے کی رسم ادا کی
تھی سر ارنسٹ آپین ہائمر میرے کی مشہور ڈبیرس کمپنی کے چیرمین اور جنوبی افریقہ کے بڑے
دولت مند تاجر ہیں۔ کروڑوں روپیہ کی حیثیت ہونے کے باوجود ہندوستانیوں کے حقوق
کے حامی اور بڑے منصف مزاج اور خوش اخلاق آدمی ہیں ۱۹۲۵ء سے میری اُنکی دوستی ہے۔
جنرل ہرٹ زاگ اور جنرل (اب فیلڈ مارشل ہیں) اسمٹس کی عنایتوں کا بھی شکریہ کے ساتھ
تذکرہ کرنا میرا خوش گوار فرض ہے جنرل ہرٹ زاگ سے ۱۹۲۵ء کی واقفیت تھی دس برس بعد
جب میں ایجنٹ جنرل ہو کر پہونچا تو موصوف نے پہلی ملاقات میں ہی کہا "آپ اور میں پُرانے
دوست ہیں۔ اتوار کی صبح کو میرے یہاں دوستوں کا اجتماع ہوتا ہے گیارہ بجے دن کی چائے
سب ساتھ بیٹھ کر پیتے ہیں اور لُطفِ صحبت رہتا ہے جب مزاج چاہے آیئے اور ہم سب کے
ساتھ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ٹھیر کر چائے پیجئے۔" ایک اور بات جس سے مجھے بڑی خوشی ہوئی یہ تھی
کہ میرے زمانہ میں جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کے خلاف کوئی قانون پاس نہیں ہوا۔ ۱۹۳۷ء
میں دو نہایت قابلِ اعتراض بل پارلیمنٹ میں پیش ہوئے تھے مگر میں نے نجی کے طور پر جنرل
ہرٹ زاگ کو بتا دیا تھا کہ اگر ان دونوں میں سے کوئی بل پاس ہو گیا تو میں اپنے کو اس کا اہل نہ
سمجھوں گا کہ ایجنٹ جنرل کے فرائض کے بار کو اپنے کندھوں پر اُٹھائے رہوں۔ غلط فہمی رفع
کرنے کے لئے میں نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ میری اس صاف گوئی کو براہِ کرم دھمکی نہ سمجھئے۔ غیر آزاد
ہندوستان کا بے بس و مجبور نمائندہ صاحبِ اختیار جنوبی افریقہ کے طاقتور وزیر اعظم کو بھلا کیا
دھمکی دے سکتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ انجام کار دونوں بل واپس لے لئے گئے۔

لیڈی رضا علی مرحومہ

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

یہ سب باتیں ہمت افزا تھیں مگر میری حقیقی مسرت کا اصلی مرکز لیڈی رضا علی تھیں۔ خاندانی نام مس پونوسامی تھا خدا بخشے عجیب دل و دماغ پایا تھا۔ پیچیدہ اور اہم معاملات کے سمجھنے اور دشوار مسائل کے حل کرنے کی غیر معمولی قابلیت رکھتی تھیں۔ پولیٹکل فضا میں تربیت پائی تھی اُن کے والد کمبرلی کے ایک معزز اور دولتمند تاجر تھے۔ اِس گھرانے کی مہماں نوازی مشہور تھی۔ میں پہلی مرتبہ مئی ۱۹۳۵ء میں مس پونو اور اُنکی ہمشیرہ مس تنگجی سامی کا کمبرلی میں مہمان ہوا اور مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ رات کے کھانے کی دعوت میں بہت سے یورپین جن میں تین میر (Mayor)، پارلیمنٹ کے دو ممبر، چیف مجسٹریٹ اور چند اور مجسٹریٹ، ہیرے کی کمپنی کے منیجر اور کئی ڈائرکٹر اور تین چار ٹون کونسلر (میونسپل کمشنر) تھے معہ اپنی بیویوں کے موجود تھے۔ جنوبی افریقہ کی گورنمنٹ نے مس پونو اور اُن کی بہن کو غیر معمولی حقوق دے رکھے تھے دونوں بہنیں کیپ ٹون، جہانسبرگ اور ڈربن کے بہترین یورپین ہوٹلوں میں ٹھیرتی اور ریل کے اُس حصہ میں سفر کرتی تھیں جو گوری رنگت کی مخلوق کے لئے محفوظ ہوتا ہے۔ مس پونو قوم کی ویش تھیں مگر خرچ مسلمانوں اور راجپوتوں کی طرح کرتی تھیں اُن کا لباس (شادی سے پہلے مغربی لباس پہنتی تھیں) پیرس کے مشہور فرم لبرٹی کے کارخانے سے تیار ہو کر آتا تھا۔ خوش مزاج مگر بڑی غیور تھیں مسز سروجنی نیڈو سے گہری دوستی تھی مہاتما گاندھی بھی کمبرلی میں اُن کے مہمان رہ چکے تھے۔ ہندو مسلم اختلافات کو ملک کے لئے سب سے بڑی مصیبت سمجھتی تھیں۔ جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کو پارلیمنٹ کے انتخاب میں ووٹ دینے کا حق حاصل کرنے کی طرف سب سے پہلے مرحومہ نے شادی کے بعد میری توجہ دلائی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ جنوبی افریقہ کے دَورانِ قیام میں مجھ سے اگر اُس ملک کی ہندوستانی آبادی کی کوئی خدمت بن پڑی ہو تو اسے اُس وجدان کا جو پونو کی سچی محبت نے میرے قلب میں پیدا کر دیا تھا اثر سمجھنا چاہیئے۔

خدا لیڈی رضا علی کو جنت نصیب کرے جب تک زندہ رہیں میرے دل کی

جولائی ۱۹۳۶ء - مس ٹنگچی سامی (ہمشیرہ لیڈی رضا علی)

بلکہ انھیں سفرِ آخرت اختیار کرنے کے بعد اب اُن کی یاد میرے اُجڑے دل میں بستی ہے شعر:۔

تو نہ ہوگا تو ترا درد رہے گا دل میں
یہ نہ ہوگا کبھی خالی مرا پہلو ہو جائے (نجم الدین برقؔ)

دل کی چوٹ بھی عجیب چیز ہے ارحم الراحمین اس چوٹ سے محفوظ رکھے اور اگر دائمی مفارقت کی مصیبت سر پہ آپڑے تو درد و غم کو اپنا بہترین رفیق بنانے کی خدا توفیق عطا فرمائے۔ شعر:۔

بنال بلبل اگر بامنت سرِ یاری است
کہ ما دو عاشقِ زاریم و کارِ ما زاری است (حافظؔ)

اُس خاتون کا تذکرہ کرنے کے بعد جو صحیح معنی میں میری رفیقۂ حیات اور محبوبہ تھی۔ کوئی اور ذکر کتاب کے اس حصہ میں کرنا میرے جذبۂ محبّت کے منافی ہے۔ مجھے تسلیم ہے کہ میری زندگی کی کہانی اور محبّت کی داستان ناتمام رہی آخر اعمال نامہ ہے کہاں تک اختصار سے کام لیا جائے میرا شمار اُن لوگوں میں تھا جو بغیر پیئے جھومتے ہیں۔ جو کچھ لکھ چکا ہوں اُس کا سرور شاید کتاب کا دوسرا حصہ تیار ہونے تک رہے — دوسرے حصّے کے کافی اجزا کا مسودہ تیار ہے۔ بندگانِ خدا سے سرِ دست باتیں ہو چکیں اب یادِ خدا کا وقت ہے۔ شعر:۔

پانی وضو کو لاؤ رُخِ شمع زرد ہے
مینا اُٹھاؤ وقت اب آیا نماز کا (شیفتہؔ)